



وزیراعظم شری راجیوگاندھی ۱۱ اپریل ۱۹۸۷ء کو ضلع سلطان پور میں ترقیاتی سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم
کے بائیں جانب شریمتی سونیا گاندھی اور دائیں جانب وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ اور وزیر ہریجن وسماجی بہبود شریمتی
سروپ کماری بخشی بھی نظر آرہی ہیں۔

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۲ | نمبر ۲

مئی ۱۹۸۷ء

ایڈیٹر: ——— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: ——— شاہنواز قریشی

فون { ایڈیٹر: ——— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: ——— ۴۷۱۰۸

پبلشر
اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

اپنی بات

ملک کی تاریخ میں موجودہ لمحے اندیشوں اور وسوسوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایسا نازک وقت شاید کبھی نہیں آیا جب جمہوری اقدار کو باقی رکھنا زندگی و موت کا مسئلہ بن گیا ہو۔ ایشیا میں ہندستان کا مرتبہ و مقام جس طرح بلند ہو رہا ہے اس پر بعض طاقتیں ناپسندیدگی کا برملا اظہار کرنے لگی ہیں۔ سازشوں کا ایک جال بڑے اہتمام و انتظام سے بنا جا رہا ہے جس میں ہم کو الجھانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ طاقتیں ہمارے قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کا ناپاک منصوبہ تیار کر چکی ہیں ایسے میں بیداری و ہشیاری کی اشد ضرورت ہے اس سازش کے تار و پود بکھیرنے کے لیے قومی یک جہتی کا ہتھیار ہی کارگر ثابت ہوگا۔ قومی یک جہتی کی ضرورت آج سے پہلے کبھی اس قدر نہیں تھی، یہ ملک ہمیشہ جمہوریت پسند رہا ہے۔ اس مقدس سرزمین کو جمہوری انداز حکومت ہی سازگار آتا ہے۔ گنگ و جمن کی اس وادی میں مختلف تہذیبیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ قوس۔ قزح کے حسین و دلنواز منظر کی طرح طمانیت روح بخشتی رہی ہیں۔ رنگ رنگ کی تہذیبوں نے جو دلکشی و رعنائی عطا کی ہے وہ ہمیں بحیثیت قوم ساری دنیا میں ممتاز کرتی ہے۔ خدا کی مشیت یہی ہے کہ ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک میں ملی جلی تہذیبیں پھولے پھلیں۔ مختلف زبانیں، مختلف مذہب مگر وحدت کا تصور لیے ہوئے، ایک دھاگے میں پروئے ہوئے پھولوں کی مانند، ایک زنجیر کی بہت سی کڑیاں ایک دوسرے سے پیوستہ یہی بھارت ورش ہے۔ ان تہذیبوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا، قربتوں کو فاصلوں میں بدلنا، محبت کی جگہ نفاق کو بڑھاوا دینا ایک ایسا قومی جرم ہے جو ناقابل معافی ہے۔ سیکڑوں سال سے کس طرح یہاں کے عوام پیار محبت سے رہتے آئے ہیں، اب آخر ایسا کیا ہو گیا ہے کہ نفرت کی دیوار اٹھنے لگی ہے؟ خدا نخواستہ یہ سلسلہ دراز ہو گیا تو شاید اندھیرے ہمارا مقدر بن جائیں مذاہب انسان کو انسان سے ملانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب حیوانیت کا پیغام نہیں دیتا ہے، پھر مذہب کا غلط استعمال کرنے والوں سے ہم باز پرس کیوں نہیں کرتے؟ تخریبی رجحان رکھنے والوں سے ہمیں دور ہی رہنا چاہیے۔ ملک و قوم کی بھلائی اسی میں ہے۔ ایکتا کا ماحول از سر نو بنانا ہوگا۔ اپنے ملک کی سالمیت ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اس سالمیت کو بچانا ہوگا۔ اس موقع پر یہ شعر برمحل معلوم ہوتا ہے ؎

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

حکومت اتر پردیش خلوص دل سے قومی یک جہتی کا ماحول بنانے کے لیے سرگرم کار ہے۔ وہ ہر سطح پر بدگمانیوں کا سلسلہ ختم کر دینا چاہتی ہے، معاشی پسماندگی بھی قومی یک جہتی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ سرکار شد و مد کے ساتھ مفید منصوبوں کو بروئے کار لاکر معاشی پسماندگی کو دور کرنے کا عزم راسخ کیے ہوئے ہے۔ انشاء اللہ دھندلکوں کی فضا بہت جلد ختم ہو جائے گی اور ہمارے پردیش میں بھائی چارے کا نیا ماحول پیدا ہوگا، امن و امان کی نئی تاریخ لکھی جائے گی مگر شرط یہی ہے کہ ہم سب مل کر سرکار کے تعمیری کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔ اسے اپنا پورا تعاون دیں یہ ہماری ذمہ داری بھی ہے اور ایک مقدس فرض بھی۔ ایک دوسرے پر تنقید کرنے کے بجائے ہم مثبت تعمیری رویوں کو اپنائیں۔ یاد رکھیے اس وقت ہماری ذرا سی لاپروائی بڑی تباہی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے اخلاق، رواداری، محبت کا برتاؤ پھر ہمیں ایک دھاگے میں پرو دے گا اور ہم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دنیا کے ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر دکھائی دیں گے۔

ایڈیٹر

جمیل مہدی

جواہر لال نہرو کی یاد

جب بھی کوئی اہم سوال اُبھرتا ہے، جب بھی کوئی سیاسی یا قانونی بحران پیدا ہوتا ہے، جب بھی کوئی دستوری تنازعہ ابھرتا ہے تو جواہر لال نہرو کی یاد ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے ان کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے، لیکن قدرت کے اٹل قانون کے مطابق نہ تو یادیں کسی انسان کو دوبارہ زندگی دے سکتی ہیں نہ کوئی ضرورت اسے دوبارہ معرکۂ عمل و کار میں واپس لا سکتی ہے۔

آزاد ہندستان کا دستوری ڈھانچہ، اس کا جمہوری مزاج اس کی قانونی فضا اور اس کے لیے بہتر روایات کی فراہمی نہرو نے ہی اپنے ذمہ لی تھی، اور اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی پہلی وزارت میں جماعت اور غیر جماعت کا امتیاز بھی اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ انھوں نے کانگریس کے کٹر مخالف اور نکتہ چیں لوگوں کو وزارت میں شامل کیا تو صرف اس لیے کہ وہ جماعت سے زیادہ ملک کے وقار کو پیش نظر رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہندو مہاسبھا کے لیڈر شیاما پرشاد مکرجی کو بھی وزارت میں شامل کیا، اور کانگریس کے حریف بلکہ رقیب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر کو بھی وزیر قانون بنایا تو صرف اس لیے کہ وہ ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے اور ان صلاحیتوں کو ملک کے مفاد میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔

دونوں عظیم لیڈر ـــــ شیاما پرشاد مکرجی اور ڈاکٹر امبیدکر بہرحال مرکزی کیبنٹ میں نہیں رہ سکے اور بالآخر استعفےٰ دیکر باہر آ گئے۔ ان میں سے ایک ـــ شیاما پرشاد مکرجی نے ایک نئی سیاسی پارٹی کی تشکیل کی اور ڈاکٹر امبیدکر نے ہریجنوں میں بدھ مذہب کی اشاعت کی مہم کا آغاز کیا۔ تاہم، جو کام کہ جواہر لال نہرو ان سے لینا چاہتے تھے، وہ انھوں نے کر دیا اور ہندستانی دستور کے نام پر ایک ایسی دستاویز انھوں نے مرتب کر دی، جو ان کے نام اور کام کو آنے والی بے شمار نسلوں تک زندہ رکھے گی۔

جواہر لال نہرو کی قیادت، ان کی شخصیت اور ان کے نظریات کی قدر و قیمت کے متعدد پہلو قابلِ غور ہیں، وہ ہندستانی جمہوریت کے بانی، سیکولرازم کے مبلغ اور جمہوری اصولوں کے معلم تھے اور اس سلسلے میں ان کی محنت، جدوجہد اور ذوق و شوق کی ایک تاریخی قدر و قیمت ہے، اور ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

غلط طور سے انھیں مغرب پسند کہا گیا ہے۔ ایک زمانے میں انھیں ہندستانیت کا مخالف بھی کہا جاتا رہا ہے، لیکن ان سے زیادہ ہندستانیت کا قدر دان کوئی دوسرا اس ملک میں ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اپنی راکھ کو اس ملک کی دھرتی کا ایک حصہ بنا دیا ہو۔ "ملاپ" کے ایڈیٹر رنبیر، یورپ اور امریکہ کے دورے کے بعد ان سے ملنے گئے تو انھوں نے وہاں کے لوگوں کے مہذب طور طریقوں، اعلیٰ اخلاق اور ایمان داری کی تعریف کی اور ہندستان کے لوگوں کے مقابلہ میں انھیں ارفع و اعلیٰ قرار دیا تو انھوں نے

دیکھا کہ نہرو کا چہرہ غصہ سے تمتا گیا ہے، وہ کچھ جھجکے تو نہرو نے ان سے کہا:

" تو آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ
ہندستان کے لوگوں کو کھینچ کر سمندر
میں پھینک دیں اور انھیں غرق
کردیں اور ان کے بجائے ان ہی
ایمان دار اور مہذب لوگوں کو لاکر یہاں
بسا دیں جن کی آپ تعریف کر رہے ہیں۔"

زمبیر کے چہرے پر خجالت کے آثار ظاہر ہوئے تو نہرو نے انھیں سمجھایا:

" اچھے یا برے، ہندستان کے
یہی لوگ ہیں، جن سے ہندستان کا
ملک بنتا ہے، یہاں کا سماج بنتا
ہے، یہاں کی تاریخ بنتی ہے، اس
لیے ہمیں ان ہی کو عزت دینی ہے
ان ہی کو ٹھیک کرنا ہے تاکہ وہ
دنیا کی قوموں میں اپنا باعزت مقام
بنانے کے قابل ہوں۔"

کئی بار نہرو نے کہا کہ ہندستان کی تاریخ رنگارنگی میں یک رنگی کے اصول کے مطابق ہی عظیم تاریخ بنی ہے
کئی بار انھوں نے کہا کہ ہندو مسلمانوں کی مشترک تہذیب اور مشترکہ جدوجہد نے ہی اس ملک کو ترقی کی معراج تک پہنچایا تھا، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم تاریخ سے سبق لے کر اس مشترکہ تہذیب اور مشترکہ جدوجہد کو نہ صرف باقی رکھیں بلکہ اسے فعال بنانے کی کوشش کریں، جو انگریزوں کی غلامی کے دور میں معطل ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ ہندستان میں تصادم اور باہمی جنگ وجدل کے خوفناک نتائج کا حد درجہ احساس رکھنے والے ایک لیڈر تھے، جو کسی بھی ٹکراؤ، کسی بھی فساد کو مستقبل کے لیے ایک چیلنج سمجھتے تھے ـــــ انھوں نے بے شمار مرتبہ کہا کہ: ـــــ

" فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو میری
گردن شرم سے جھک جاتی ہے
اور میری کیا، ہر اس حسّاس
آدمی کی گردن شرم سے جھک
جانی چاہئے جو تاریخ کا ذرّہ برابر
بھی شعور رکھتا ہے، کیونکہ یہ
ملک ہمیشہ متحد رہ کر ہی
آگے بڑھا ہے اور لڑائی جھگڑوں
اور خانہ جنگی میں پھنس کر
ہمیشہ قعر مذلت میں جا گرا
ہے۔"

وہ ایک ایسے لیڈر تھے جنھوں نے تنگ نظری کے بجائے روشن خیالی، تعصب کے بجائے رواداری اور استحصال کے بجائے فیاضی اور شرافت کی تبلیغ ہی نہیں کی بلکہ اپنی پوری زندگی، ان چیزوں کے ترجمان اور ان چیزوں کی علامت بھی بنے رہے۔
انھوں نے جمہوریت کے نظام کو، سیکولر اور بعد میں سوشلزم کو شامل کر کے، سیکولر اور سوشل اصولوں پر قائم کیا اور اس کے لیے بہتر سے بہتر روایات بھی اپنے عمل اور اپنے پرچار کے ذریعہ فراہم کیں اور پورے سترہ سال ہندستان کے لوگوں میں جمہوری ذوق اور جمہوری شعور کی آبیاری کرتے رہے اور انھوں نے اپنی زندگی میں اس نظام کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ وہ ان کے بعد کی چوتھائی صدی میں بھی ابھی تک ہر آزمائش اور ہر چیلنج سے کامیاب ہو کر نکلنے کی شان دار قوت کا مظاہرہ کرتا رہا ہے اور اسی کو نہرو کا ایک ایسا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کی ہمسری اس ملک کا کوئی دوسرا لیڈر نہیں کر سکتا۔

❋

غزل

وامق جونپوری

جراحتوں میں کوئی فاصلہ نہیں نہ سہی
گلوں سے جسم ڈھکا ہے قبا نہیں نہ سہی

ہتھیلی اشکوں سے تر رکھ دو میرے ماتھے پر
اب اس میں شوخیِ رنگِ حنا نہیں نہ سہی

ہمیں قبول ہے زہراب اس کے ہاتھوں سے
نشاطِ لمس تو ہے، ذائقہ نہیں نہ سہی

ہم اس کی نظروں سے پہچانتے ہیں اپنے کو
ہمارے پاس کوئی آئینہ نہیں نہ سہی

شعورِ دشت نوردی جنوں کا ترکہ ہے
ہے اپنا سایہ بہت نقشِ پا نہیں نہ سہی

ہماری آبلہ پائی ہے جادہ پیمائی
ہماری راتوں میں کوئی دیا نہیں نہ سہی

ہماری منزلِ وجدان منظروں سے پرے
خلائے فاصلوں کی انتہا نہیں نہ سہی

ہمارے لوح و قلم خود ہمارے محور ہیں
ہمارے گرد کوئی دائرہ نہیں نہ سہی

انا کی ہتھکڑیوں میں کسی ہوئی مشکیں
زباں تو چلتی ہے دستِ دعا نہیں نہ سہی

ہماری سمت سخن تلخ و ترش روئے سخن
ہمارا سمت نما خوش نما نہیں نہ سہی

کوئی شناخت اگر قاتلوں کی بتلا دو
سزا نہیں نہ سہی، خوں بہا نہیں نہ سہی

خطوط اپنے جریدوں میں شائع کروانا
ہمارے گھر کا ابھی تک پتا نہیں نہ سہی

یہ شہرِ ماضی ہے رندوں کا پی لو کچھ وامق
بھرے ہیں یادوں کے خم میکدہ نہیں نہ سہی

پروفیسر ڈاکٹر ثمینہ شوکت
حیدرآباد یونیورسٹی
حیدرآباد

اقبال اور علامت آفرینی

بعض اوقات معمولی اور بظاہر بے تکے سوالات بھی ہم کو سنجیدہ غور و فکر پر مجبور کر دیتے ہیں چنانچہ جب مجھ سے یہ سوال پوچھا گیا کہ شرر کے چمکنے کی زیادہ اہمیت ہے یا بجھنے کی ــــ؟ تو میرے سامنے اردو شاعری کا پورا سرمایہ آن موجود ہوا جس میں شرر کے چمکنے اور بجھنے کو تقریباً برابر کی اہمیت دی گئی ہے۔ اس لئے اس سوال کو جانچنے کے لئے محض معروضی یا OBJECTIVE طریقہ ہی کافی نہیں بلکہ موضوعی یا SUBJECTIVE عنصر ہی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ SUBJECTIVE موضوعی عنصر افتادِ طبع پر منحصر رہتا ہے۔ چنانچہ میرے ذہن میں غالب اور اقبال کے یہ دو شعر گونج اٹھے :

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک (غالب)

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں (اقبال)

غالب اور اقبال کے یہ اشعار ان کی اپنی اپنی افتادِ طبع کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس افتادِ طبع اور ندرتِ فکر کو جس نے دونوں کو اردو کے عظیم المرتبت شعراء کی صفِ اول میں جگہ دلائی اور اردو کو دوسری بڑی زبانوں کے ہم پلہ بنا دیا ہے۔

یوں سرسری پڑھ جائیے تو اقبال کا یہ شعر:۔

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

"مٹنے والے ہیں" کی ترکیب کے باعث قنوطیت کا مظہر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ذرا تفصیلی تجزیہ کیجئے تو "فنا" کی ناقابلِ انکار حقیقت کے باوجود "اقبال" اولوالعزمی کا اظہار کرتے ہیں اور راہِ فنا میں بھی رفاقت کی قابلِ تحسین قدر VALUE کی اہمیت جتاتے ہیں۔ ایسے بلند عزائم رکھنے والے کو کون قنوطی کہہ سکتا ہے؟

اب غالب کے شعر کو لیجئے انھیں خود بھی گرمیٔ بزم کے عارضی ہونے کا علم بھی ہے اور احساس بھی لیکن ناپائیداری کے اس احساس سے نہ وہ مغموم ہیں نہ متردد ــــ بلکہ "رقصِ شرر" کی ترکیب استعمال کر کے اس عارضی رونقِ حیات کو قابلِ دید بنا دیتے ہیں۔ یہی ان کی افتادِ طبع بھی ہے جو حوادث میں بھی رجائیت کا دامن نہیں چھوڑتی۔ یہ اندازِ یقین، یہ بذلہ سنجی ان کی انفرادی شان ہے۔ فاقہ مستی کے ایک نہ ایک دن رنگ لانے کے پختہ یقین کے باوصف اس سے دامن کشی ان کی سرشت ہے ہی نہیں۔

یہ افتادِ طبع ادب میں اسلوب یا STYLE کا نام پاتی ہے۔ اسی اسلوب کے باعث انگریزی میں STYLE IS MAN کی کہاوت وجود میں آئی ہے۔ اسلوب اور شخصیت کا یہ امتزاج اتنا گہرا اور واضح ہوتا ہے کہ اس سے خد و خال میں امتیاز کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی باعث ہم کسی شاعر یا ادیب کو "صاحبِ طرز" کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ہم اس کے اسلوب کو دیکھ کر اس کی شخصیت کا سراغ پا لینے کے دعویدار بھی بن جاتے ہیں۔

لیکن میں نے جب اقبال کے شعر

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے

ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

کو دوبارہ پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ بات صرف افتادِ طبع ہی پر ختم نہیں ہو جاتی غالب کے شعر میں " شرر" محض ایک تشبیہ ہونے کے باعث محاکاتِ شعری کا ایک جز ہی باقی رہتا ہے۔ لیکن اقبال کے شعر میں یہ محض ایک تشبیہ نہیں بلکہ علامت ہے منزلِ فنا کی طرف جادہ پیما ہر شئے کی علامت یا SYMBOL۔ اس میں انسان، حیوان نباتات وجمادات سب ہی شامل ہو جاتے ہیں۔

یہ شعر اقبال کے ابتدائی دور کے کلام " بانگ درا" میں ملتا ہے۔ اس طرح گویا یہ اقبال کی فکر کی اس نہج کا آئینہ دار ہے جو مستقبل میں ان کا طرۂ امتیاز ثابت ہوئی۔ یعنے علامت آفرینی کی وہ صلاحیت جو ہر صاحبِ پیام شاعر اور ادیب کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔ اس طرح مستقبل کے اقبال کی ایک جھلک ہمیں " بانگ درا" کے ابتدائی دور ہی میں مل جاتی ہے اس احساس کے باعث میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اردو شاعری میں 'شرر' کے استعمال پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے۔

دیوانِ غالب میں شرر صرف پانچ اشعار میں استعمال ہوا ہے۔ اور ان میں پانچ الگ الگ مفہوم ظاہر کئے گئے ہیں۔

پہلا شعر ہے ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

اس شعر میں غالب نے " غم " اور " شرار" میں یگانگت کا پہلو ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے یعنے غم اگر شرر کی طرح نظر آجانے والی کوئی چمکدار شئے ہوتا تو اس کا دیکھنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ دل کا تو ذکر ہی کیا پتھر سے جھڑنے والے غم کے شرر، پتھر کو دل کی طرح بتا دیتے اور اس غم کے باعث اس سے مسلسل لہو بہتا رہتا۔ اس میں صرف تشبیہ کا انداز ہی نمایاں ہے علامت کا نہیں۔

دوسرے شعر میں کہتے ہیں۔

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

اس شعر میں رقصِ شرر کو ایک موقتی ، عارضی اور ناپائیدار شئے کے مترادف بنایا گیا ہے۔ جب شرر رقص میں آجائے تو ہر چیز کا مل کر فنا ہو جانا ایک بدیہی بات ہے۔ اس شعر میں بھی فنائیت کے اثبات کے باوجود "علامت" یا SYMBOL کا رنگ نہیں بلکہ وہی تشبیہ اور استعارے کا رنگ برقرار ہے۔

تیسرے شعر میں غالب نے شرر کو نقطۂ آغاز بلکہ ماخذ کے مانند ثابت کیا ہے کہتے ہیں۔

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

ہوا کے جھونکوں سے ہی بے وقعت شرر ایک بڑی آگ کا ماخذ بن سکتا ہے۔ اس میں مضمون آفرینی تو ہے علامت آفرینی نہیں۔

چوتھا شعر

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں جو مضمون باندھا گیا ہے وہ میر اور سودا سے لے کر آج تک کے شعراء کے کلام میں بھی عام ہے اس مفہوم کی تکرار سے اردو شاعری پٹی پڑی ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ نے اسے عمومیت سے بلند و بالا کر کے غالب کی انفرادیت کا اثبات کر دیا ہے۔ اس میں انھوں نے شرر باری کے خوش آئند پہلو یعنی 'چراغاں' کا تذکرہ کیا ہے، لیکن یہاں بھی علامت آفرینی کی کوئی علامت نہیں ملتی۔

پانچواں مفہوم جو 'شرر' کے استعمال سے ظاہر کیا گیا ہے نہایت ہی اچھوتا اور اپنی مثال آپ ہے۔ کہتے ہیں

سبزہ ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

روئے شرار خود تشبیہ کے طور پر مستعمل ہوا ہے۔ روئے شرار ہمیشہ چمکیلا اور تازہ دکھائی دیتا ہے۔ شرر کی اس ظاہر و باہر کیفیت کو دیکھا تو سبھی نے ہے لیکن اس کا احساس، ادراک اور اظہار صرف غالب ہی نے کیا ہے۔

اقبال کے اردو کلام میں جو "بانگ درا" "بال جبریل" "ضرب کلیم اور تریو رحیم (اردو) پر مشتمل ہے شرر اور اس کے مترادفات یعنی چنگاری اخگر۔ شرر اور شرارہ تقریباً ۶۰ بار استعمال کئے گئے ہیں شرر یا شرارہ تقریباً ۵۰ بار استعمال ہوا ہے۔ ان میں بعض اشعار میں یہ صرف تشبیہ اور استعارے کا کام انجام دیتا ہے تو بعض میں علامت یا SYMBOL کا جبکہ "دیوان غالب" میں جیسا کہ کہا جا چکا ہے "شرر" کا لفظ صرف پانچ اشعار میں دستیاب ہوتا ہے۔ اور میرا اندازہ ہے کہ اردو کے کسی تنہا شاعر نے شرر کو اتنی کثرت کے ساتھ اور اتنے متنوع انداز میں استعمال نہیں کیا ہے جتنا کہ اقبال نے ـــ

اس تفاوت نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ بات محض اتفاقِ طبع یا اتفاقیہ تشبیہ اور استعارے میں ہی محدود نہیں بلکہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ یعنی اقبال کی علامت آفرینی symbolization ایک طویل سعی ـــ اب یہ مشکور ہے یا نا مشکور تحقیق ہی اس کے بارے میں حرف فیصل ہو سکتی ہے۔

لیکن کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے ہمیں تشبیہ، استعارے، علامت اور اشارہ کا مفہوم متعین کر لینا پڑے گا۔ تشبیہ کسی مشترکہ وصف کے باعث وجود میں آتی ہے۔ ہمیشہ حرف تشبیہ کے ساتھ مثلاً "دل کو آئینہ کی طرح صاف ہونا چاہیئے" یا "میرا دل آئینہ کی طرح صاف ہے"۔ ان دونوں جملوں میں حرف تشبیہ "کی طرح" اور وصف تشبیہ 'صاف' استعمال ہوئے ہیں یہ وصف دل اور آئینہ میں مشترک ہے" تیرا دل تو ہے مگر آئینہ" استعارہ ہے۔ یعنی اس میں حرفِ تشبیہ استعمال نہیں ہوا ہے علامت کے اظہار کے لئے ہم کسی ادبی مثال کی بجائے عالمی طور پر قبول کردہ سرخ انسانی کھوپڑی اور سرخ استخوانی چلیپا کی مثال دیں گے جو موت کے خطرہ کی مثال ہے، جبکہ اشارے کے لئے تیر کا نشانہ کافی ہو سکتا ہے۔ بوائے اسکارٹ تحریک میں ـــ تیر کا یہ اشارہ "اس تیر کی نوک کی سیدھ میں آگے بڑھو" کا حکم یا اشارہ دیتا ہے۔ اشارے کے لئے "عمل" ضروری ہوتا ہے۔

علامت کی پہچان یہ ہے کہ وہ کسی اور شے کی نمائندہ ہے۔ اس بات کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ علامت کسی ایک حاوی مفہوم ہی پر قناعت کرے۔ اور یہ تسلط اتنا مستقل اور واضح ہو کہ ابلاغ اور ترسیل کا حق ادا ہو جائے۔ اور ذہن و فکر کے بھٹک جانے کا کوئی امکان نہ ہو۔

اقبال کے کلام میں "شاہین" اور "جگنو" تسلط کی یہی شان رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں ثانوی درجہ کی علامات بھی ان کے کلام میں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً لالہ صحرا، تنہائی اور ذوق یکتائی کی علامت ہے۔

کیا ہم شرر کو بھی اقبال کی تخلیق کردہ ایک علامت کہہ سکتے ہیں؟ کیا شرر میں تعبیر اور مفہوم کی وحدانیت اس حد تک پائی جاتی ہے جو اسے علامت کا درجہ دلا سکے ـــ ؟؟

ان سوالات کا جواب ہمیں اثبات میں نہیں ملتا۔ یہ لفظ بیک وقت ذم اور مدح دونوں صفات سے مزین ہے۔

اگر ہم شرر کے معنی کا کرنا چاہیں تو حسب ذیل پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

۱:- ایک ایسی چیز جو محض موقتی وجود رکھے۔
۲:- ایک بے وقعت شئے
۳:- آگ کا ماخذ بننے کی صلاحیت رکھنے والی شئے
۴:- ایک کل کا جزو
۵:- تاریکی کو دور کرنے والی شئے
۶:- ایک ایسی شئے جس کا کوئی مقررہ مدار نہ ہو۔ آوارہ
۷:- روشنی کا کمترین درجہ
۸:- صعود کرنے والی شئے
۹:- جلد فنا ہونے والی شئے

غرض مفہومات کی اس کثرت کی وجہ سے شرر علامت مطلق تو نہیں بن سکتا لیکن علامت محدود LIMITED SYMBOL ضرور بن سکتا ہے جو بہر صورت تشبیہ، استعارے بلکہ مجاز مرسل سے بھی بالاتر ہوتی ہے۔

جب ہم اقبال کا یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

تو شرارِ بولہبی کو گمرہی اور عناد کی علامت سمجھے بغیر چارہ نہیں
اسی طرح ذیل کے شعر میں بھی شرار کی علامتی اہمیت برقرار رہتی ہے۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

"شرارِ افلاطوں" علم و حکمت کی علامت بن جاتا ہے۔ اس قسم کی علامت کو ایک موزوں نام دینا ضروری ہے تاکہ اس کی شناخت آسانی سے ہو سکے۔ اگرچہ ایسے الفاظ کے پیچھے کوئی مبسوط فکری نظام یا بنیادی پیام موجود نہیں ہوتا لیکن ذہن میں فکر کی ایک راہ ضرور ہو جاتی ہے۔ جبکہ تشبیہ اور استعارہ ذہن کو اپنے آپ ہی پر مرکوز رکھتے ہیں۔ 'علامت' ذہن کو کسی اور شئے کی طرف منتقل کر کے فکر میں وسعت پیدا کر دیتی ہے مثلاً

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اقبال کے اس شعر میں ذہن شررِ تیشہ سے یک بہ یک محنت کی جہانبانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ کیا اس قسم کے الفاظ کو ہم مضمر علامت POTENTIAL SYMBOL نہیں کہہ سکتے؟ میرے خیال میں اگر اس اصطلاح کو اپنا لیا جائے تو ابہام و تفہیم میں بڑی آسانی ہو جائے گی مثلاً جب ہم اقبال کا یہ شعر پڑھیں گے ؎

غضب ہے عینِ کرم میں بخیل ہے فطرت
کہ لعلِ ناب میں آتش تو ہے شرارہ نہیں

تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ شرارہ ایک مضمر علامت ہے۔ ایک شئے سے دوسری شئے تک منتقل ہونے اور پھر اسے اپنی ہی طرح کا بنا لینے کی صلاحیت رکھنے والی شئے کی مضمر علامت POTENTIAL SYMBOL ہے۔ "جہاں بینی سے کیا گزری شرر پر" ایک مضمر علامت رکھنے والا مصرعہ ہے جس کا مکمل مضمون پورا شعر پڑھنے ؎

گراں ہے چشمِ بینا دیدہ ور پر
جہاں بینی سے کیا گزری شرر پر

پڑھنے کے بعد ہی واضح ہو سکتا ہے اور یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دیدہ ور کو آپ ہی اپنی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔

مضمر علامت کی اصطلاح کو اپنا لینے سے اقبال بلکہ دوسرے اور شعرا کے جستہ جستہ علامتی مضامین کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی مثلاً "مرغِ ہوائی" اور "مرغِ زمینی" دونوں مضمر علامات ہیں۔

اس اصطلاح کو اپنا لینے سے لفظ یا دو لفظی ترکیب ہی نہیں بلکہ کثیر الالفاظ اظہارات کے ابہام و تفہیم میں بھی آسانی ہو جائے گی مثلاً "شاہی اصطبل کی آبرو" ایک مضمر علامت کے سوا کچھ اور نہیں۔

اقبال کی عظمت کا جن عناصر پر دارومدار ہے ان میں دریا کو کوزے میں بند کرنے، بات کو ڈرامائی بنا دینے کے ساتھ ساتھ مضمر علامات کے استعمال کی صلاحیت بھی شامل ہے۔

ان کی مضمر علامات کو پہچاننا اور انھیں تشبیہ اور استعارے سے تمیز کرنا بھی کچھ مشکل نہیں۔ مثلاً

وہ شعلۂ روشن ترا ظلمت گریزاں جس سے تھی
گھٹ کر ہوا مثلِ شرر تارے سے بھی کم نور تر

اس شعر میں شرر بطور تشبیہ استعمال ہوا ہے۔

خفتہ خاک پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا

اس شعر میں "شرار" شخصیت یا روح کا استعارہ ہے۔

ذیل میں اقبال کے چند ایسے اشعار دیئے جا رہے ہیں جن میں شرر اور اس کے مترادفات بطور تشبیہ SIMILE استعارہ METAPHOR اور مضمر علامت POTENTIAL SYMBOL کے استعمال کئے گئے ہیں۔

شرارے وادیٔ ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن
نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخمِ سینائی

میری بساط کیا ہے تب و تاب یک نفس
شعلے سے بے محل ہے الجھنا شرار کا

اس اندیشے سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مغ زادے نہ لے جائیں تیری قسمت کی چنگاری

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کے لئے

ارتباطِ حرف و معنی، اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

شعلے سے ٹوٹ کے مثل شرر آوارہ نہ رہ
کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو
آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرارِ آرزو

اقبال نے اجتماعِ ضدین کے طور پر بھی شرار کو استعمال کیا ہے کہتے ہیں۔

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

لفظ شرر اور اس کے مترادفات کے کثیر النوع استعمال سے اقبال نے جس ندرتِ فکر کا اظہار کیا ہے وہ انھیں اردو کا "عظیم ترین شاعر" بنانے کے لئے کافی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ الفاظ ان کی اس امتیازی علامت آفرینی کی صلاحیت کا بھی ثبوت فراہم کرتے ہیں جو ایک مفکر اور پیامی شاعر کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ ان کی اس امتیازی شان کا احاطہ ہم ان ہی کے الفاظ میں اس طرح کر سکتے ہیں۔

اگر ز آتش دل شرارے بگیری
تواں کرد زیرِ فلک آفتابی

اقبال نے جہانِ شعر پہ بے شک و شبہ آفتاب کا کام کیا ہے۔ جس کا احاطہ ایک اور تقابل سے کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم دورِ جدید کے نمائندہ شاعر فیض کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کے کلام[1] میں شرر کا صرف تین جگہ تذکرہ ملتا ہے وہ بھی اس طرح

۱:۔ اگر شرر ہے تو بھڑکے جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے

۲۔ کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

۳۔ یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں

شرر کا یہ استعمال اقبال ہی سے خوشہ چینی کا آئینہ دار ہے تو عہدِ قدیم کے نمائندہ شاعر خواجہ میر درد کے پورے دیوان میں کل دس بار شرر کا استعمال ہوا ہے[2]

۱:۔ شرار و برق کی سی بھی نہیں یاں فرصتِ ہستی
فلک نے ہم کو سونپا کام جو کچھ تھا شتابی کا

۲:۔ مثل شرر تنگ چشم، ہستی بے بود ہے
دیکھ نہ سکتا اسے تک بھی جدھر دیکھنا

۳:۔ کم فرصتی نے ہستی بے اعتبار کی
شرمندہ تیرے آگے ہیں اے شرر کیا

۴:۔ کوئی کیونکر نظر ملا دے
تنگ چشم شرار ہیں ہم

۵:۔ کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیرِ صحبت صاف طبعوں کی
ہوئی آتش سے گل کی بیٹھتے رشک شرر شبنم

۶:۔ ہر اک سنگ میں ہے شوخئی بتاں پنہاں
خنک ہیں سب یہ پہ دل میں شرار رکھتے ہیں

۷:۔ جلا کر دیکھ نامہ کو حقیقت کر نہیں پڑھنا
محبت کے شراروں نے یہ چھاتی جس طرح بھونی

۸:۔ کروں کس کے ساتھ اے شررِ گرم جوشی
نہ دیکھی زمانے کی تو چشم پوشی

---

[1] "کلیاتِ فیض" ناشر، پرویز بکڈپو۔ دلی۔ اس کلیات میں نقشِ فریادی دستِ تہہ سنگ، سروادی سینا۔ اور ماہنامہ سے کلام کیا گیا ہے۔

[2] "دیوان خواجہ میر درد" مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

۹:۔ ہر آہ شرر بار ہے جوں سروِ چراغاں
کیا آگ الٰہی میرے سینے میں بھری ہے

نمبر دس پر مخمس کے پہلے بند کا آخری مصرعہ ہے
" ہر سنگ میں دیکھو تو شرر ہے"

ان تمام اشعار کو پڑھنے کے بعد بھی ہم کو یہی احساس رہتا ہے کہ اقبال کے استعمال کردہ " شرر" میں جو علامت تک پہنچ جانے کی شان ہے وہ دوسرے شعراء کے پاس نہیں پائی جاتی درد نے شرر کے مفہوم میں "چھپی ہوئی صلاحیت" اور "اکتسابی صلاحیت" کا اضافہ ضرور کر دیا ہے
چنانچہ

ہر اک سنگ میں ہے شوخیٔ بتاں پنہاں
خنک ہیں سب یہ پہ دل میں شرار رکھتے ہیں

چھپی ہوئی صلاحیت کا آئینہ دار ہے اور نمبرہ پر دیا ہوا شعر اکتسابی صلاحیت کا ـــــ

اقبال نے "وحدت الشہود" سے ابتدا کی اور کہا
چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے تازہ ترین مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل فرمائشی تھی اور سرور جہاں آبادی کے منظوم التماس کا ثمر تھی۔ اس فرمائشی غزل میں روایاتی مضامین نظم کرنا کوئی بعید از قیاس بات بھی نہیں لیکن اس کے باوجود غزل میں آمد کا رنگ زیادہ ہے۔ چنانچہ اسی میں ان کا یہ مصرعہ غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں اس بات کا زندہ ثبوت ہے۔

" وحدت الشہود" کے روایاتی صوفیانہ تصور سے آغاز کر کے اقبال نے شرر کو اپنے پیام خودی کا آئینہ دار بنا دیا۔ چنانچہ کہتے ہیں

ہے سوزِ دروں سے زندگانی
اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے" اور اس فروغ جاوداں کا ثمرہ یہ ہو کہ
" خورشید کرے کسب ضیا تیرے شرر سے"

حیات انسانی شب تاریک میں شرر کی نمود ہے۔ خودی کے احساس اور ادراک کے بعد ہی ذہن انسانی پر مقاماتِ وجود وا ہو سکے ہیں جس کے بعد یہ حال ہو جاتا ہے کہ

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اور ایسے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے۔

سودا کے " رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا" کے مقام فریاد سے منزل بہ منزل ارتقا کا یہ عمل جس سے ابلیس یعنے دشمنِ آدم کے جسم میں رعشہ پڑ جائے اور اسے کہنا پڑے

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

ترقی کی معراج ہے۔

یہ شرارِ آرزو مقامِ عبدہٗ ہی کو اپنی منزل آخر بنائے رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج یہ احساس پیدا ہے فقط حلقہ ارباب جنوں میں "د جنوں" بھی مغز ملامت کے طور استعمال ہوا ہے، لیکن اگر یہ اقبال فہمی کا عمل ہی جاری و ساری ہے تو ملت پر خود آگہی کی منزل آسان ہو جائے۔ اقبال خود کہتے ہیں۔

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری

فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن

رُباعیات

محفل میں تری، بات بنا کر خوش ہوں
جذبات کو، نغمات بنا کر خوش ہوں
ٹھہرے گا یہ اک بلبلہ کب تک سرِ آب
میں نفی کو اثبات بنا کر خوش ہوں

آواز، پئے سکوت تو دے یارب!
لقمہ بہ دہانِ حوت تو دے یارب!
تو ہے کہ نہیں، یہ بھلا کس کو معلوم
اپنے ہونے کا ثبوت تو دے یارب!

انکار و اعتراف کا مرکب ٹوٹے
پیمانۂ ایمانِ مذبذب ٹوٹے
اس دن کا انتظار ہے صدیوں سے مجھے
سررشتۂ تشکیک و یقیں کب ٹوٹے

اس غیب کو اب شہود تو دے یارب!
بربط کو ذرا سرود تو دے یارب!
آہٹ ہے نہ جھنکار نہ کوئی دستک
کچھ غلغلۂ وجود تو دے یارب!

خم ہوتے ہیں افلاک، زمیں جھکتی ہے
پیشانیٔ وجدان و یقیں جھکتی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے جو پڑھتا ہوں نماز
خود اپنے ہی آگے یہ زمیں جھکتی ہے

حادث ہوں، بلا چون و چرا یہ تسلیم
ہے درسِ بقا مجھ کو فنا کی تعلیم
یہ کہنگی، کب تھی مجھے مرغوبِ نفس
صد شکر کہ ہستی مری ٹھہری نہ قدیم

جنت مری، کوثر مرا، طوبا میرا
جبریل و خضر میرے، مسیحا میرا
جھکتا ہوں جو سجدے میں تو لگتا ہے مجھے
کرتا ہے طواف خود ہی کعبا میرا

تو چاند سہی، رات کی گرہیں مت کھول
مابعد طبیعات کی گرہیں مت کھول
سلجھی یہ گرہ تو نہ رہے گا کچھ بھی
سرِّ صفت و ذات کی گرہیں مت کھول

قندیلِ عناصر ہوں، جلا دے مجھ کو
خرمن ہوں تیرا، آگ لگا دے مجھ کو
گم کر نہ تپش نامۂ ہستی کا سراغ
بجھنے لگیں شعلے تو ہوا دے مجھ کو

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
سرینگر، کشمیر

مرزا محمد ہادی رسوا

مرزا محمد ہادی نام پہلے مرزا اور بعد ازاں رسوا تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے اسلاف ماژندران سے دلی آئے اور وہاں سے آکر نواب آصف الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ نواب وزیر نے جاگیرات وعطیات سے سرفراز کیا۔

مرزا کی عمر سولہ برس کی تھی کہ ایک ہی سال میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ قرابتداروں نے پریشان کیا۔ والدگرامی آغا محمد تقی علم ریاضی اور نجوم کے ماہر تھے۔ مرزا نے فارسی کی تمام درسیات اور ریاضی میں اقلیدس اور حساب اور احکام نجوم کے بعض رسائل انہی سے پڑھے۔ انھوں نے انگریزی بھی پڑھنا شروع کی۔ انٹرنس کے پرائیویٹ امتحان میں پاس ہوتے ہی رڑکی کالج میں ہندسی کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے اور وہاں اورسیری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اس کے بعد کوئٹہ اور بلوچستان میں ریلوے میں ملازم ہوگئے۔ یہاں ریل کی پٹریاں بچھانے عمارات کے نقشے تعمیر کرنے اور اسٹیشن بنوانے میں مصروف ہوگئے۔ انہی ایام میں مرزا کو اتفاق سے افلاطون کا عربی میں ایک قدیم رسالہ کمسٹری کا ہاتھ آیا۔ اس کا مطالعہ کیا پھر ملازمت سے استعفیٰ دیا گھر کا تمام فرنیچر نیلام کرکے جدید کمسٹری کے آلات ولایت سے منگوائے اور سیدھا لکھنؤ کا رخ کیا۔ یہاں پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان فارسی میں پاس کیا۔ نخاس مِشن اسکول میں فارسی کے استاد مقرر ہوگئے۔ ۱۸۸۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ اور نیشنل یونیورسٹی واشنگٹن (امریکہ) سے کسی مضمون کے صلے

مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی
ولادت سنہ ۱۸۵۸ء وفات سنہ ۱۹۳۱ء

میں پی۔ ایچ ڈی کا ڈپلوما مل گیا۔ مگر اس کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکی۔

مرزا صاحب عربی، عبرانی، یونانی، انگریزی، فارسی، ہندی، سنسکرت زبانوں پر اچھا خاصہ عبور رکھتے تھے۔ مشرقی اور مغربی دونوں علوم پر حاوی تھے۔ ایک مایہ ناز ادیب وشاعر، منطق، فلسفہ وریاضی وہیئت کے ماہر تھے۔ فلسفۂ قدیم وجدید کا نہایت تعمق سے مطالعہ کیا تھا اور اس پر کامل عبور حاصل کرکے اسلامی عقائد وروایت کو نہایت پرزور دلائل سے صحیح فلسفہ کے مطابق ثابت کرنے میں شغف وانہماک رکھتے تھے۔ ۱۸۹۲ء میں مرزا صاحب نے "رسالہ اشراق" جاری کیا۔ اس میں مصنفات افلاطون کا مستقل ترجمہ ماہانہ شائع ہوتا تھا۔ رسالہ ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ منطق اور اخلاق وحکمت کے متعدد رسالے اردو میں اسی رسالے کے ذریعے شائع ہوئے۔ یہ رسالہ اب تک نہیں مل رہا ہے۔ مرزا نے ایک اور رسالہ ۱۹۱۶ء میں "الحکیم" کے نام سے جاری کیا۔ گولاگنج میں سنٹرل اسکول کے سامنے اس کا دفتر تھا۔ وہ ۱۸۹۸ء میں کرسچن کالج لکھنؤ میں فارسی کے پروفیسر تھے۔

مرزا صاحب لکھنؤ کے مشہور آئی۔ ٹی کالج میں شب کو پڑھانے جاتے تھے۔ وہاں کسی سے تعلق خاطر ہوگیا اسی دھن میں مثنوی امید وبیم کہہ ڈالی۔ اس میں تین جزو ہیں۔ جز واول میں ان آرزوؤں کا ذکر ہے جو کبھی

پہلے حصے میں کسی کے تغافل سے شکایت، شکوہ و شکایت کا سلسلہ خود بخود پیدا ہوگیا ہے۔ حصہ دوم میں صنع خدا کی عظمت پر اجمالی نظر ہے انسان کے دل و دماغ کا مختصر بیان ہے۔ حصہ سوم میں طلسم امید و بیم کی ایک نمائش دکھائی گئی۔ مثنوی میں اپنی جوانی کے افسانے بیان کرنے کے بعد ابتدائے عشق یوں کرتے ہیں ؎

پھر ہوا عشق دلِ مضطر کو — دو خبر میرے نصیحت گر کو
ہے ابھی تک وہی آشفتہ سری — چارہ گر آ کے کریں چارہ گری
کوئی تدبیر نکالیں اب بھی — وہی زنجیر نکالیں اب بھی
آج تک سر سے وہ سودا نہ گیا — عشق بازی کا وہ چسکا نہ گیا
راہِ الفت میں مجھے ٹوکیں تو — تو میں جاتا ہوں مجھے روکیں تو

دھجیاں ڈھونڈ کے لائے کوئی
پھر رفوگر کو بلائے کوئی

پوری مثنوی سوائے حصۂ اول کے حکیمانہ خیالات سے مملو ہے۔[۵]

دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں "ہفتہ کرسمس" منایا گیا۔ پروگرام کے تحت ۲۹ دسمبر لکھنؤ کے قیصر باغ کی بارہ دری میں اردو کانفرنس کا دوسرا اجلاس نواب نصیر حسین خاں خیال کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اجلاس میں بہت سے لوگوں نے شرکت کی تھی۔ ان میں راجہ صاحب محمودآباد راجہ جہانگیرآباد، پروفیسر پی گھوشالی، محمد علی جناح، مظہر الحق، مولانا آزاد نواب سر فتح علی خاں قزلباش، مسز نائڈو وغیرہ کے علاوہ پروفیسر مرزا محمد ہادی رسوا بھی موجود تھے۔ اجلاس میں ایک تجویز پیش کی گئی کہ یہ جلسہ گورنمنٹ اور الہ آباد یونیورسٹی سے بہ اصرار درخواست کرتا ہے کہ کالج کے نصاب میں اردو کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے داخل کیا جائے۔ اس کی تائید مرزا رسوا نے نہایت دلچسپ تقریر کے ذریعے سے فرمائی جس میں انھوں نے اسباب پر زور دیا کہ یونیورسٹی کے امتحانات میں السنۂ مشرقیہ کے جو پرچے ہوتے ہیں ان میں یہ ہدایت ہوتی ہے کہ ترجمے یا جواب مضمون انگریزی میں لکھے جائیں اور چونکہ مشرقی ادب کو انگریزی لباس پہنانا دشوار بلکہ محال ہے (یہاں انھوں نے فارسی سے انگریزی ترجموں کی بعض نہایت پرلطف مثالیں بیان کیں جنھیں سن کر لوگ خوب ہنسے) اس وجہ سے یونیورسٹی کی اس ہدایت کا نتیجہ اول تو یہ ہوتا ہے کہ مشرقی علم میں ان طلبہ کو کوئی معقول دستگاہ نہیں ہونے پاتی۔ دوسرے ان کی ذہنی ترقی پر بوجہ اس کے کہ اس کے ذریعہ سے سمجھ کر یاد کرنے کے بجائے رٹنے کی ضرورت زیادہ ہو جاتی ہے نہایت خراب اور مضر اثر پڑتا ہے۔ مرزا صاحب موصوف کی پہلے یہ خواہش تھی کہ کانفرنس کی طرف سے جو رزولیوشن پیش ہو وہ صرف اسی ایک پہلو پر یونیورسٹی کو توجہ دلائے۔۔۔۔۔۔۔ اجلاس کے بعد رات کے ساڑھے نو بجے بزم مشاعرہ قائم ہوئی۔ اس کے صدر باتفاق رائے مرزا رسوا منتخب ہوئے تھے۔[۶]

عزیز لکھنوی لکھتے ہیں کہ مرزا رسوا زمانۂ آخر میں حیدرآباد میں دارالترجمہ میں ملازم ہوئے تھے۔ لیکن پیرانہ سالی کے باوجود دوسرے تیسرے مہینے ضرور لکھنؤ آیا کرتے تھے۔ یہاں امین آباد میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے جب حیدرآباد جانے لگے تو اپنا عظیم الشان کتب خانہ جو تمام عمر کا سرمایہ تھا مدرسۃ الواعظین کو دے دیا۔ حیدرآباد جاتے وقت ایک غزل میں کہا ؎

دلی چھٹی تھی پہلے اب لکھنؤ بھی چھوڑیں
تھے دو ہی شہر اپنے دونوں تباہ نکلے

عزیز لکھنوی یا رسوا کے کسی سوانح نگار نے رسوا کے سفر حیدرآباد کی تاریخ معین کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگست ۱۹۱۹ء میں ان کا تقرر فلسفہ میں عثمانیہ یونیورسٹی میں بہ عہدۂ اسسٹنٹ پروفیسر ہوا تھا اور وہ اسی مہینے میں وہاں جانے والے تھے۔ ان کے تقرر کے بارے میں ایک معاصر اخبار میں اس طرح خبر چھپی تھی۔

"مرزا محمد ہادی صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی"
"ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے کہ لکھنؤ کے نامور فاضل و ادیب جناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب رسوا بی۔ اے کا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی میں بعہدۂ اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ منظور کیا گیا ہے اور مرزا صاحب موصوف عنقریب اپنے عہدے کا چارج لینے حیدرآباد روانہ ہونے والے ہیں۔ مرزا محمد ہادی صاحب کی غیر معمولی قابلیتیں ایسی قدر دانی کی مستحق تھیں اور ہم عثمانیہ یونیورسٹی کی انتظامی کمیٹی کے اراکین کا شکریہ ادا

کرتے ہیں کہ ان کی نظر انتخاب ایک جوہر قابل پر پڑی۔ ہم اپنے مخدوم مرزا صاحب کی خدمت میں بھی اس تقرر پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اور اس کی امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبان میں فلسفہ کی تعلیم دینے کے اس موقع کو ذاتی منفعت سے بڑھ کر قوم و زبان کی خدمت سے دیکھیں گے اور عثمانیہ یونیورسٹی سے اپنا مستقل تعلق قائم رکھنے کی کوشش فرمائیں گے"[۳۱]

جب ۱۹۲۴ء کے اوائل میں جوش ملیح آبادی اپنی ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد پہنچے تو انھوں نے علامہ عمادی اور علامہ طبا طبائی کے علاوہ مرزا رسوا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

"میری یہ بڑی ادبی نمک حرامی ہو گی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبۂ دار الترجمہ کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا اور خصوصیت کے ساتھ علامہ عمادی، علامہ طبا طبائی اور مرزا محمد ہادی رسوا کے فیضان صحبت نے مجھ بے سواد آدمی کو میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوق مطالعہ پر مامور کر دیا اور صحتِ الفاظ و نجابت لہجہ کا جو پودا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی سرزمین پر لگایا تھا۔۔۔ اگر طبا طبائی، مرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پودا کبھی شاداب اور بار آور نہ ہوتا۔ مرزا محمد ہادی صاحب میرے پڑوسی تھے۔ میں دکن آکر پھر ان سے پڑھنے لگا اور اس بار فارسی کے ساتھ ان سے انگریزی ادب اور فلسفے کا بھی باقاعدہ درس لینا شروع کر دیا"[۳۲]

آخر کار مرزا رسوا کا انتقال ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو حیدر آباد میں ہوا۔ اور وہیں دفن ہیں۔ خبیر لکھنوی نے تاریخ کہی ؎

بہر تاریخ وفاتش زد رقم کلک خبیر
در جناں مرزا محمد ہادی عالی صفات[۳۳] ۱۳۵۰ ہجری

اردو ادب میں مرزا رسوا امراؤ جان ادا کی وجہ سے شہرت عام اور بقائے دوام کے درجے پر فائز ہیں۔ ان کی نثر نگاری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ اس لئے ان کی نثر نگاری پر مزید رائے زنی کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہاں صرف وہ تبصرہ پیش کیا جاتا ہے جو امراؤ جان ادا کے شائع ہوتے ہی میر علی اکبر نے ماہانہ ادیب میں کیا تھا۔ اس تبصرہ سے امراؤ جان ادا کے سال اشاعت ۱۸۹۸ء پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ادیب کے پرچے نادر و نایاب ہیں۔ اس لئے ذیل میں پورا تبصرہ درج کیا جاتا ہے۔

"امراؤ جان ادا مصنفہ مرزا رسوا"

"اگرچہ ہم عام ناولوں کے اس طوفان بدتمیزی کے عموماً مخالف ہیں۔ جو فی زمانہ برپا ہو رہا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں عام قاعدہ کے ثابت کرنے کے لئے مستثنیات لازم ہوتی ہیں۔ اور یہ ناول بھی استثنائی فہرست میں داخل ہے۔ لہذا ہم اس کا ریویو ذیل میں درج کرتے ہیں۔ یہ ناول جیسا کہ ٹائیٹل سے ظاہر کیا گیا ہے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں ایک طوائف کی سوانح عمری اسی کی زبانی ہے جس میں لکھنؤ کے طرز معاشرت کی ہو بہو تصویریں، سچے اور اصلی مقامات کے بعینہ نقشے اعلیٰ درجے کے ستھرے مذاق کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ مصنف کا فرضی نام (NOM DE PLUME) مرزا رسوا ہے۔ لیکن مضامین کی بندش، الفاظ کی شگفتگی، خیالات کی نیچرل روانی صاف صاف پکار کر کہہ رہی ہے کہ میں کسی بڑے قادر الکلام انگریزی دان کے قلم سے نکلی ہوں۔

لائق مصنف اپنی ہیروئین کو عجب ناز و انداز اور دلفریب طریقہ سے اسٹیج پر لائے ہیں۔ پردہ اٹھتے ہی ناظرین کو ایک اعلیٰ درجے کا خوشنما سین لکھنوی مشاعرہ کا نظر آتا ہے جس میں ہر مذاق کے لوگ ہیں۔ شاعروں کا کلام، ان کی خوش بیانی، ظرافت، بذلہ سنجی، نوک جھونک، طرز غزل خوانی، ہر شعر پر واہ واہ، غرضیکہ مشاعرہ کے کل ضروری لوازمات کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ گویا تصویر کھینچ دی ہے اور فی الواقع اس مشاعرہ میں جو غزلیں پڑھی گئی ہیں ان کے بعض شعر لاجواب ہیں۔ خصوصاً آغا صاحب کی غزل میں تو اکبر آباد کے مشہور شاعر کالے خاں سفلی مرحوم کے کلام کا لطف آتا ہے۔ جن صاحبوں کو لکھنؤ

کے مشاعرے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے ان کے لئے یہ سین بڑا دلچسپ ثابت ہوگا۔ اسی مشاعرے میں امراؤ جان تشریف لاتی ہیں کیونکہ وہ بھی شاعرہ ہیں اور بعد اختتام حسب فرمائش مرزا رسوا صاحب اپنی سرگذشت یا سوانح عمری کہہ سناتی ہیں جس کا ہر ایک سین برگ بانسے کر وٹن کے رنگ کی طرح سرعت کے ساتھ ہر گھنٹی پر بدلتا جاتا اور نیا سماں دکھاتا ہے۔

یہ ناول محض قصہ ہی نہیں ہے بلکہ بہ نظر غور دیکھا جائے تو وہ نوجوانوں اور خصوصاً شہری امیر زادوں کے لئے ایک گائیڈ یا رہبر ہے جو ان کی شاہزادگی کے غاروں گڑھوں اور کھائیوں سے بچانے میں بڑی مدد دے گا اور اس فرقۂ بنات الشیاطین نے جو دام تزویر ہر شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں بچھا رکھا ہے اس سے محفوظ رہیگا۔

مؤلف نے ناول میں جابجا فی البدیہہ اور برجستہ اشعار بھی لکھے ہیں جن سے حسن زبان دوبالا ہو گیا ہے۔ دوسرا ایک بڑی ندرت یہ کی ہے کہ ہر مضمون کو شعر سے شروع کیا ہے جس سے آئندہ واقعات کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ الغرض اس دلچسپ و دل فریب ناول کی خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن صاحبوں کو اودھ کے دارالسلطنت کی سوسائٹی کے فوٹو دیکھنے، فیشن ایبل مقامات کی سیر کرنے اور لکھنؤ کی زبان کے چٹخارے اور مزے لینے کا شوق ہو وہ عمر قیمت بھیج کر منشی بہادر پرشاد صاحب در بابرادرس امین آباد لکھنؤ سے طلب فرمادیں۔

بعض امور جو ہم کو مصنف صاحب کے غور کے قابل معلوم ہوتے ہیں محض دوستانہ طور پر نہ بہ نظر نکتہ چینی ظاہر کئے جاتے ہیں۔

نواب چھبن صاحب کے ڈوبنے کے متعلق صفحہ ۱۰ پر فن تیراکی کا یہ نکتہ درج ہے کہ جو شخص تیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔ مگر اس کی خبر (REMOTE) دور جاکر صفحہ ۱۸۳ پر ناول کے خاتمہ کے قریب نکالی ہے اس سے طبیعت کو ایک معمولی خلجان ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امراؤ جان کے مکان پر نواب سلطان صاحب اور اودن کا۔ بازخان سے جو تکرار ہوئی اور سلطان صاحب تپنچہ مار کر نلوہ بچ گئے اس کو عقل بہ مشکل قبول کرتی ہے کیونکہ وہ تو قصہ کے بعد ہی غیر آئینی زمانہ تھا۔ گو تو ان کو غریب رئیس چھپنے کا موقع تھا ایک انصاف پسند اور متجسس طبیعت چاہتی ہے کہ اس مقدمہ کی تفتیش ہوتی۔ نواب صاحب کچہری میں گھسیٹے جاتے کہ ذرا طوائف کے گھر جانے کا مزا ملتا۔ شہر میں شہرت اور لوگوں کو عبرت ہوتی

تیسری بات یہ ہے کہ اگر ایک فہرست مضامین دے دی جاتی تو ناظرین جس سبجکٹ کو دوبارہ پڑھنا چاہتے اس کے نکالنے میں آسانی ہوتی۔ اگر فاضل مصنف صاحب مناسب جانیں تو ان امور کا طبع ثانی کے وقت لحاظ رکھیں جس کی نوبت ناول کی عام قبولیت اور ہر دلعزیزی کے خیال سے جلد پہنچنے کی امید ہے"

تصنیفات۔ عزیز لکھنوی نے اپنے مضمون میں رسوا کی ذیل کی تصنیفات کی فہرست درج کی ہے۔ ان میں سے متعدد کتابیں ایسی ہیں جن کا اب کوئی نام و نشان نہیں مل رہا ہے۔

(۱) فطرۃ الاسلام (مطبوعہ) (۲) ہدیہ سینہ در علم کلام (۲۶ جلد، غیر مطبوعہ) (۳) جوزف آف لاجک (ترجمہ) (۴) افلاطون کی حکومت جمہوریہ۔ (۵) کتاب الاخلاق ارسطو (۶) زیچ مرزائی در ہیئت (غیر مطبوعہ) (۷) اسطبال الرفارم (۸) رسالہ در توحید و اثبات واجب الوجود (۹) رسالہ در منطق استقرائی (غیر مطبوعہ) (۱۰) رسالہ در اصول مناظرہ (غیر مطبوعہ) (۱۱) رسالہ در اعمال اصطرلاب (غیر مطبوعہ) (۱۲) رسالہ در علم النفس (غیر مطبوعہ) (۱۳) مصطلحات کیمیا (غیر مطبوعہ) (۱۴) طلسمات (۱۵) امراؤ جان (۱۶) ذات شریف (۱۷) شریف زادہ (۱۸) مرقع لیلیٰ مجنون ڈرامہ منظوم (۱۹) افشائے راز (۲۰) بہرام کی رہائی (۲۱) خونی جورو (۲۲) مثنوی لذت فنا (۲۳) مثنوی بہار ہند (۲۴) مثنوی امید و بیم (۲۵) کلیات اردو (قصائد، مثنویات، غزلیات کا ایک کافی ذخیرہ تھا جس کا پتہ نہیں)۔

مرزا محمد ہادی ابتدا میں مرزا اور بعد میں رسوا تخلص کرنے لگے تھے دنیائے ادب میں وہ اب رسوا کے نام سے ہی شہرۂ آفاق ہیں۔ ابتدائے عمر میں مرزا دبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے مرزا محمد اوج سے تعارف کرایا۔ صرف دو تین غزلیں دکھائیں اس کے بعد مشورہ رہا۔ بقول عزیز:۔

"مرزا کی زبان موجودہ شعرا میں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی جس قدر محاورات پر ان کو عبور تھا ایسی کوئی ہستی ترنج شعرا میں نظر نہیں آتی۔ اس کا سبب ان کے فطری ذوق کے علاوہ ان کی ہمہ دانی اور مختلف صحبتیں تھیں۔ مرزا تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے قصائد بھی کہے، مثنویاں بھی کہیں، غزل

[illegible]

زیادہ نثر لکھی اور ایسی لکھی کہ آج ان کی کتابیں زبان اردو

کا بہترین سرمایہ ہے مرزا کا کلام اگر جمع کیا جاتا تو ایک ضخیم

کلیات ہوتا۔ مگر انھوں نے لاپرواہی برتی۔ یہ جو غزلیں

ملتی ہیں یہ حکیم علی محسن خاں ابر مرحوم کی کوشش سے انھوں

نے بہت سی غزلیں اپنے رسالہ "معیار" میں چھاپ دیں

.... مرزا صاحب کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) کوثر سے دھلی ہوئی زبان شستہ صاف سلیس (۲) انداز میں

بانکپن، (۳) فصحا کے محاورے (۴) خیالات بلند، فلسفیانہ مگر اسی حد تک

جہاں تک غزل متحمل ہو سکے۔ (۵) عاشقانہ رنگ غالب مگر ہر تخیل

ابتذال سے پاک و صاف'

شاعری ـــ مرزا کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ مثنوی امید و بیم میں کہتے

ہیں ؎

چار دن سے نہیں یہ شوقِ سخن   بچپنے سے ہے مجھے ذوقِ سخن

قدردانوں میں ہے عزت میری   نکتہ سنجوں میں ہے شہرت میری

مجھ کو پہچانتے ہیں اہل ہنر   جوہری جانتے ہیں قدرِ گہر

رونقِ بزم سخن ہے مجھ سے   زینتِ صحنِ چمن ہے مجھ سے

مرزا اپنی شرافت نفس میں مشہور تھے۔ وہ نہایت سادہ مزاج،

زندہ دل، احباب پرست، آزاد منش مستغنی اور بے پرواہ تھے۔ ان کا ظاہر

و باطن ایک تھا۔ چنانچہ امید و بیم میں کہتے ہیں ؎

مجھ کو نفرت ہے ریاکاری سے   چڑھ ہے عیاری و مکاری سے

دل سے ہوں خادم ارباب وفا   میری طینت میں نہیں مکر و دغا

میرا مسلک نہیں جز سادہ دلی   مجھکو مطبوع ہے آزادہ دلی

فخر ہے خوبی فطرت پہ مجھے   ناز ہے حسن طبیعت پہ مجھے

جہاں تک معلوم ہو سکا درسوا کا کلام سب سے پہلے شرر کے

دلگداز میں چھپنے لگا تھا۔ راقم الحروف کی نظر سے حسب ذیل طویل نظمیں گزری

ہیں۔

(۱) چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی دانم

حقیقۃ النفس۔ سال اشاعت نومبر ۱۸۹۲ء صفحہ ۱۳ تا ۱۶ (دلگداز)

[illegible]

(۲) بلبل اسیر ۔ دسمبر ۱۸۹۲ء دلگداز

پہلی نظم "حقیقۃ النفس" ۴۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ پوری نظم میں فلسفیانہ امور بڑی نزاکت سے پیش کئے گئے ہیں۔ شرر لکھنوی نظم

کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

"ہمارے معزز اور لائق دوست مرزا محمد ہادی صاحب

مرزا سابق ایڈیٹر "اشراق" نے صرف دلگداز کی عزت افزائی

کی غرض سے یہ بیش بہا نظم مرحمت فرمائی ہے۔ مرزا محمد ہادی

صاحب کے پاکیزہ مذاق اور ان کی فلسفیانہ جودت وذکاوت

سے ایک زمانہ واقف ہے۔ کچھ ضرورت نہیں کہ ہم اپنے ناظرین کی

خدمت میں انھیں دوبارہ انٹروڈیوس کرائیں۔ مگر اپنے دوست کی

نسبت اس قدر ضرور کہہ دینا چاہیئے کہ وہ اردو نظم میں ایک لطیف

اور اصلی جان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس بات میں وہ اچھی طرح

کامیاب ہوتے جاتے ہیں کہ علمی نازک مضامین پوری دلچسپی قائم

رہنے کے ساتھ نظم میں ادا ہو جائیں۔ آئندہ ان کی نازک خیالی

کے اور نمونے بھی ہم دلگداز کے ذریعہ شائع کریں گے"

چونکہ نظم نادر و نایاب ہے اور ایک سو سال قبل چھپی ہے۔ سادگی،
روانی اور لطف زبان اس کی بیش بہا خوبیاں ہیں اس لئے اس کا انتخاب پیش

کیا جاتا ہے ؎

میں کیا ہوں؟ اور کیا ہے مری ابتدائے بود

جانا کدھر ہے؟ اور کہاں سے ملا وجود؟

کب تک کہاں رہوں گا مرا کیا مآل ہے؟

کیسی خوشی ہے مجھ کو؟ یہ کیا ملال ہے؟

کیا اتفاق صرف سے پیدا ہوا ہوں میں؟

ذرّاتِ منتشر سے ہویدا ہوا ہوں میں

شاید کہ ہیں اسی زنِ بیوہ کا ہوں پسر

فطرۃ جسے جہان میں کہتے ہیں سب بشر

تھا باپ اتفاق مرا وہ گزر گیا

میں نامرادِ پیٹ میں تھا جب وہ مر گیا

کس سے کہوں جو حال مرا ہجر طال ہے
اک ماں کا آسرا ہے سو اس کا یہ حال ہے
بڑھیا ہے کور و کرّ ہے بہت بے شعور ہے
سٹھیا گئی ہے ضعف کا ایسا وفور ہے
مرنے کی عمر آگئی مرتی نہیں مگر
میں رات دن ہوں اس کی مصیبت پہ نوحہ گر
دریائے روزگار میں مثل حباب ہوں
ہستی ہی میری کیا ہے میں اک قطرہ آب ہوں
ہوں آگ کا شرارہ کہ جھونکا ہوا کا ہوں
جو کچھ ہوں میں جہاں میں لیکن بلا کا ہوں
مانوں خدا کو میں تو طبیعت پہ حرف آئے
افسوس یہ نظام طبیعات ٹوٹ جائے
اقرار وحی! واہ یہ کیا ضعف عقل ہے
عالم کی پالیٹکس میں کیا مجھ کو دخل ہے
یہ صوم یہ صلوٰۃ یہ امید و بیم ہیچ
یہ برزخ و معاد یہ خلد و جحیم ہیچ
یہ اتقاد زہد و ورع سب فضول ہے
پی شوق سے شراب اگر دل ملول ہے
شرع نبیؐ میں چار نکاحوں کا ہے جواز
لازم کو نیچری کو کرے اس سے احتراز
لیکن زنانِ صاحب تہذیب و مہ لقا
ملئے جو ان سے خلوت و جلوت میں عیب کیا
دیر و حرم کہیں بھی نہیں جائے غیر ہے
ہر جا پہ جلوہ گر ہے وہی طرفہ سیر ہے
سجدہ کرو خود اپنا کہ اچھا ہے مشغلہ
اپنی پڑھو نماز جو گھبرائے دل ذرا
وہ ایک ذات خلوت و جلوت میں ایک ہے
وہ ایک ذات وحدت و کثرت میں ایک ہے
فانی ہے اک جہاں فقط ہے مجھے بقا

ہے ابتدا ازل تو ابد میری انتہا
حافظ نے میری شان میں کیا خوب ہے کہا
"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"
مخدوم ہوں میں سب کا یہ خادم ہیں سب مرے
یہ سب غلط ہے خاک نہیں مجھ کو اختیار
قادر ہے سب پہ قدرتِ خلاقِ روزگار
ناقص ہیں سب کمال ہے اس کی صفات کو
فانی ہیں سب بقا ہے فقط اس کی ذات کو
ہرچند ہے وہ میری عبادت سے بے نیاز
لازم ہے صدقِ دل سے میں اس کی پڑھوں نماز
دانا ہے وہ حکیم ہے وہ کارساز ہے
رحمٰن ہے رحیم ہے بندہ نواز ہے
جس شے کو جیسا چاہیئے ویسا بنا دیا
بندے کو اس کے کام میں جائے کلام کیا
وابستہ اس کے حکم سے ہے انتظام خلق
موقوف اس کے امر پہ ہے اہتمام خلق
مرزاؔ یہ اعتقاد ہے اپنا خدا گواہ
یہ ہے خدا کی راہ یہی ہے نبی کی راہ

ایک اور نظم "فریب وہم" کا انتخاب دیا جاتا ہے۔ یہ نظم ۳۶ اشعار پر مشتمل ہے اور "دلگداز" کے شمارہ نمبر ۱۲ بابت دسمبر ۱۸۸۷ء میں صفحہ ۱۴ اور ۱۵ پر چھپی تھی۔

نظم کا عنوان اس طرح ہے "فریب وہم" مصنفہ مرزا محمد ہادی صاحب مرزاؔ

وہ مطلع صاف وہ گرمی کے دن وہ دھوپ وہ صحرا
اسی عالم میں تنہا کوئی چرواہا تھکا ماندا
شجر کے سائے میں اک جا لیٹا اگر دم بھر
ہوائے سرد کے جھونکے گیاہ سبز کا بستر
وہ صحرا کی ہر اک شے سے طبیعت اپنی بہلاتا
تھکن کے دور کرنے کو وہ چپکے چپکے کچھ گاتا

کوئی ندی اترتا ہو کسی صحرا سے جاتا ہو
کہیں ہوں دیو اور دد کا کسی جا پہ ٹھکانا ہو
خواصیں کچھ جلو میں جیسے گردِ ماہ ہوں تارے
ہر اک کا ان میں وہ عالم کہ صدقے ہوں حسیں سارے
نرالی ان کی پوشاکیں نئے انداز کا جلسا
تفنن کے لئے گانے بجانے کا بھی ہے چرچا
گلے وہ نور کے وہ ان کے گانے کی ادا دلکش
وہ اونچے سُروہ تانیں اور وہ باجوں کی صدا دلکش

دیا کوئی مسافر جانب منزل روانہ ہو
بہت دن کم رہا ہو تھک گیا ہو دُور جاتا ہو
وہ غربت وہ تھکن وہ بے کسی وہ آبلہ پائی
وہ شوقِ منزلِ مقصود اور وہ ناشکیبائی
یکایک طالع برگشتہ جو کچھ راہ پر آئے
درختوں کا ذخیرہ دور سے اس کو نظر آئے
وہ سبزے پر ہر ایک سو لالۂ احمر کھلا جیسے
یہ فرشِ مخملِ سبز اور وہ بوٹے سرخ ریشم کے
کہے دل میں عجب کیفیتِ آب و ہوا ہے اب
وہی جنگل جو تھا وحشت فزا راحت فزا ہے اب
دل مسرور مشکور عنایات سماوی ہو
تو ہم عقل پر اس کی جو اس عالم میں عادی ہو
تصور کو تلاشِ منعمِ اصلی کا دھوکا دے
جلوس نائبِ دشش کا تماشا اس کو دکھلا دے
پہاڑی پر وہ دیکھو سامنے مجمع ہے پریوں کا
وہیں پانی کا ہے اک حوض اور اس میں ہے فوارہ
اسی فوارہ سے چاروں طرف اک فیض جاری ہے
وہ فوارہ نہیں گویا رگِ ابرِ بہاری ہے
وہ پانی مبدعِ شادابیِ کوہ و بیاباں ہے
وہ پانی منبعِ سیرابیِ ہر باغ و بستاں ہے

نوبت رائے نظر (۱۸۶۶ء تا ۱۹۲۳ء) اردو کے اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ ۱۸۹۷ء میں انھوں نے ایک مشہور رسالہ "خدنگ نظر" کے نام سے نظام حیدر آباد کی سرپرستی میں لکھنؤ سے اجرا کیا تھا۔

راقم الحروف کی نظر سے اس کے متعدد شمارے ۱۹۰۳ء تک گزرے ہیں یہ "مخزن" لاہور "ادیب" فیروزآباد "مرقع عالم" ہردوئی کی طرح بڑی آب و تاب سے نکلتا تھا۔ خدنگ نظر کے زیر اہتمام ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس میں پیارے صاحب رشید، آغا محمد وصی علی خاں مظہر شاگرد منیر شکوہ آبادی، حضرت فصاحت حضرت انجم، مولانا صفی، میرزا ذاکر حسین یاس، حکیم بارق، مولوی صادق علی خاں مائل، سید باقر صاحب حمید، سید ابو صاحب جلیس، سید مہدی صاحب جدید، نواب سید عسکری مرزا خاں بلیغ، حکیم علی محسن خاں ابر، سید منجھو صاحب آرزو، مرزا کاظم حسین محشر، مرزا مہدی علی خاں ثمر، سید محمد اصغر رسوا، نواب باقر علی خاں شائق، سید احسن مرزا شمر مہدی، سید اچھے صاحب شہرت، سید عابد حسین عابد، حکیم سید محمد مہدی کمال، خلف حضرت جلال، سید فرزند حسین ذاخر اور ہادی رسوا وغیرہ شعرا نے شرکت کی تھی۔ مصرع طرح غالب کی زمین میں تھا۔

ع ترس آتا ہے کس کس کو مرے حال پریشاں پر

اس مشاعرے کی روداد نظر نے ۲۲ سال کے بعد "یاران طریقت کی یاد" کے عنوان سے چکبست لکھنوی کے زیر ادارت رسالہ "صبح امید" میں ۱۹۲۰ء میں شائع کی۔ یہاں سے یہ مضمون خدا بخش لائبریری جرنل بابت شمارہ ۱۰ اور ۱۱ میں منتقل کیا گیا۔ نظر لکھنوی مرزا ہادی رسوا کی غزل کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ

"پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی۔ اے جو پچھلے سال نظام یونیورسٹی کے پروفیسر کے عہدہ پر حیدرآباد دکن تشریف لے گئے ہیں لکھنؤ کے ان جدت طراز عالی خیال شعرا میں ہیں جنھوں نے طرز جدید کی بنیاد ڈال کر قدیم رنگ سخن کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ آپ کو مرزا اوج ایسے قادرالکلام استاد فن سے تلمذ حاصل تھا۔ ایک عالم اور فلسفی کی حیثیت سے آپ کا پایہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ ذیل

کے اشعار آپ کے فلسفیانہ مذاق اور شگفتگی بیان کے شاہد ہیں۔

نگاہِ مہر ہے عالم کے اجزائے پریشاں پر
ہر اک ذرے کا حق ثابت ہے خورشید درخشاں پر

نہایت خوش ہیں اپنے دل میں ہم ذوقِ جراحت سے
لگائے چارہ سازی کی کوئی تہمت نمکداں پر

نہ تھا ایجاد باراں سے کوئی مطلب مگر یہ تھا
قیامت تک فلک رویا کرے خاک شہیداں پر

فنا کے بعد بھی چھوٹا نہ میں قید تعلق سے
مری تصویر کھچوائی گئی دیوار زنداں پر

کبھی تو اس طرف بھی کوئی بھولے سے نکل آئے
کہاں تک بیکسی رویا کرے گور غریباں پر

دکھاتے جوش وحشت کے مزے تجھ کو بھی اے ناصح
مگر کیا کیجئے قابو نہیں تیرے گریباں پر

مجھے ذوقِ جنوں نے دے کے رخصت ذوق خواری کی
کئے ہیں بارہا احسان اطفال دبستاں پر

سمجھتے کافرانِ عشق کی دشواریاں یہ بھی
اگر طاعت بتوں کی فرض ہوگی اہل ایماں پر

کہیں اب کچھ ہم ایسے شعر مرزاؔ جس میں جدت ہو
کہاں تک حاشیہ لکھا کریں دیوان غالبؔ پر

بقول صاحب تاریخ ادب اردو مرزا صاحب جوانی میں مرزا غالبؔ کے رنگ کو پسند کرتے تھے اور دیوان غالب ان کو قریب قریب کل حفظ تھا۔ ان کی بہت سی غزلیں غالبؔ کی زمینوں میں ملتی ہیں۔[۵] ذیل کی غزل میں میرؔ و غالبؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ غزل میرؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۱۰ء میں عزیزؔ لکھنوی کے مکان پر میرؔ کی شاعری پر ایک پر مغز تقریر کے بعد سوائے سنائی تھی۔

حسن شاہد ہے مری رنگینیٔ تحریر کا
اک ادائے شوخ ہے جو رنگ ہے تصویر کا

ضعف میں شکوہ عبث ہے گردشِ تقدیر کا
بن پڑا وہ ہم سے کب جو کام تھا تدبیر کا

دیکھ میرا حال اگر تو جھوٹ سمجھے عشق کو
سن مری فریاد اگر قائل نہ ہوتا تیر کا

الحذر یہ کام دنیا میں تمہیں سے ہو سکا
چاہنے والے یہ اپنے کھینچنا شمشیر کا

یاد کر لینا کہ اکثر بستیاں ویران ہوئیں
اس خرابے میں خیال آئے اگر تعمیر کا

وضع کے پابند ہم دیوانگی جدت پسند
پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

تھم گئے آنسو نمائش جب ہوئی مد نظر
رک گیا نالہ جو اندیشہ کیا تاثیر کا

طبع نازک پر گراں ہے کیوں مرا سر پھوڑنا
ہم نہ کہتے تھے نہ چھیڑو تذکرہ تقدیر کا

اس غزل گوئی میں وہ تاثیر ہے مرزاؔ کہ آج
سو برس کے بعد عالم نوحہ خواں ہے میرؔ کا[۶]

ذیل میں کچھ غزلیں پیش کی جاتی ہیں جو غالبؔ کی زمینوں میں ہیں۔

شوقِ اظہارِ حریف غم پنہاں نکلا
گرمی ضبط سے نالہ شرر افشاں نکلا

خوش ہیں کیوں دھوم سے میت کے اٹھانے والے
مرنے والے کا بھی آخر کوئی ارماں نکلا

جیتے ہیں وصل کی امید پہ مرنے والے
زندگی کا یہ وسیلہ بہت آساں نکلا

اس دل تنگ کی وسعت مجھے معلوم نہ تھی
میری تقدیر سے گوشے میں بیاباں نکلا

راحتیں طول مرض کی صرف درماں ہو گئیں
زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آساں ہو گئیں[۷]

صورتیں امید کی خواب پریشاں ہوسیں
سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہوگئیں

ان سے کیا لطفِ تعلق ان سے کیا دل بستگی
غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہوگئیں

کچھ دنوں واعظ نے جن کا خود کیا تھا التزام
اب وہ تکلیفیں سراسر جزوِ ایماں ہوگئیں

ناخنِ وحشت نے سینے پر جو کیں گل کاریاں
فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہوگئیں

سیکڑوں رخنے کئے پیدا در و دیوار میں
شوق کی نظریں رقیبِ چشمِ درباں ہوگئیں

عالمِ غربت میں وہ یادِ وطن کی لذتیں
رفتہ رفتہ نذرِ شوقِ خانہ ویراں ہوگئیں

پنجۂ وحشت نے سینہ پر جو کیں گل کاریاں
فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہوگئیں

بے مروت سی جو قبریں کوچۂ وحشت میں تھیں
وہ بھی آخر صرفِ استحکامِ زنداں ہوگئیں

کھل گئے چینِ جبیں سے ان کی بدخوئی کے بھید
جن اداؤں کو چھپاتے تھے نمایاں ہوگئیں

دل میں اب کیا رہ گیا ہے ناامیدی کے سوا
آرزوئیں خون ہو کر نذرِ مژگاں ہوگئیں

چند باتیں وہ جو ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل
اب سنا مرزاؔ کہ وردِ اہلِ عرفاں ہوگئیں

جسے ہو حسنِ ظن تم سے کسی سے بدگماں کیوں ہو
تمہارے عہد میں بدنام دورِ آسماں کیوں ہو

کسی پر جان جاتی ہو تو ضبطِ شوق مشکل ہے
نہ ہو قابو اگر دل پر تو کہنے بن زباں کیوں ہو

جو دل مطلوب ہے اچھا یہ تمہید وفا کیسی
ستم مقصود ہے بہتر تو پھر یہ امتحاں کیوں ہو

اگر مدفن ہے قسمت میں تو بہتر کنجِ عزلت ہے
عدو کا رہگذر کیوں ہو تمہارا آستاں کیوں ہو

مری بے تابیوں کا حال غیروں سے نہ کہنا تھا
تم ایسے ہو تو پھر کوئی کسی کا رازداں کیوں ہو

دل آزاری کو جس کی دلربائی ہم سمجھتے ہوں
توقع اس سے کیسی پھر وہ ہم پہ مہرباں کیوں ہو

حقیقت میں مخاطب ہو نہیں شکر و شکایت کے
تمہیں تم جس کے ہو وہ شکوہ سنجِ آسماں کیوں ہو

فرشتو! جب کسی سے ہو وقوعِ سعیِ لا حاصل
مرے اعمال میں لکھ دو وہ محنت رائیگاں کیوں ہو

کہیں گے حالِ دل مرزاؔ کہیں رمز و کنایت میں
ملا خاطرِ احباب وہ اندازِ بیاں کیوں ہو

---

۱ "مرزا رسوا مرحوم" از عزیز لکھنوی مطبوعہ زمانہ کانپور بابت جنوری، مارچ، اپریل ۱۹۳۳ء۔

۲ العصر لکھنؤ جلد ۶ نمبر ۱ جنوری ۱۹۱۷ء۔

۳ اخبار شیعہ کالج نیوز جلد ۱ مورخہ ۸ اگست ۱۹۱۹ء۔

۴ یادوں کی برات ص ۲۴۴ جوش ملیح آبادی۔

۵ دبستانِ دبیر ص ۵۹۱

۶ "ادیب" فیروز آباد بابت جنوری ۱۸۹۸ء مطبع مفید عالم آگرہ۔

۷ "مرقع عالم" ۱۸۸۸ء میں محمد علی خاں کی ادارت میں ہردوئی سے نکلتا تھا۔

۸ تاریخ ادب اردو ص ۱۳۵۔

۹ ماہنامہ ادب لکھنؤ جنوری ۱۹۳۱ء۔

۱۰ مرزا رسوا مرحوم' زمانہ بابت جنوری ۱۹۳۳ء

شمیم فاروقی

مشعلِ امن

پنڈت جواہر لال نہرو کی یاد میں

پھر تصور پہ اُبھر آئے نقوشِ ماضی
وہی نہرو، وہی رہبر ہمیں یاد آیا ہے
جس کی خوشبو سے معطر ہے یہ گلزارِ وطن
پھر وہی رشکِ گلِ تر ہمیں یاد آیا ہے

اس کے انداز میں ہر حسن تھا جینے کیلیے
عصر کی رُوح تھا، صدیوں کا مقدر وہ تھا
حوصلے اس کے تھے اُڑتے ہوئے پرچم جیسے
مشعلِ امن، اہنسا کا پیمبر وہ تھا

خدمتِ ملت و اقوام تھا مشرب اس کا
اس نئے ہند کی معمار تھی ہستی اس کی
جو ہمیں عظمتِ انساں کا پتہ دیتی تھی
علم و دانش کا وہ مینار تھی ہستی اس کی

مردِ میدانِ عمل، جسمِ عمل، جانِ عمل
اک نئے دورِ تمدن کا نشاں تھا نہرو
یہ وطن ایک حسیں تاج محل ہے جس سے
عہدِ حاضر کا وہی شاہجہاں تھا نہرو

اس نے ہی بخشی ہے حالات کی تاریکی کو
روشنی ایسی، جو مدھم نہیں ہونے والی
جامِ دل میں وہ مئے حبِ وطن بھر دی ہے
جو کسی عہد میں بھی کم نہیں ہونے والی

کوئی لمحہ ہو اسے فکر رہا کرتی تھی
کس طرح گیسوئے دوراں کو سنوارا جائے
کیسے بن جائے بہاروں کا امیں ہر آنگن
کیسے یہ رنگِ وطن اور نکھارا جائے

اس وطن کے لیے دیکھے تھے بہت خواب اس نے
حریت کا وہ امیں تھا وہ نگہبانِ وطن
اس سے بڑھ کر ہمیں غم اور بھلا کیا ہوگا
آج ہم میں نہیں وہ روحِ گلستانِ وطن

ایسا چہرہ کہ بھلانا اُسے آسان نہیں
مہرِ تاباں کی طرح، صبحِ درخشاں کی طرح
آج وہ ہم میں نہیں ہے مگر اس کا پیغام
ہر اندھیرے میں ہے اک شمعِ فروزاں کی طرح

شوکت صدیقی

فنِ شاعری ارسطو کی نظر میں

شاعری کی ابتدا کب ہوئی، یہ بتانا تو مشکل ہے لیکن بقول افلاطون ——— "تمام تر تخلیق یا عدم سے ہستی بنناشاعری ہے اور تمام فنون کے صناع یا خالق شاعر ہیں" ——— وہ اپنے چوتھے مکالمے میں کہتا ہے: ———

" دلکش نظمیں انسانی کوشش کا نتیجہ یا انسان کی پیدا کی ہوئی نہیں ہوتیں بلکہ قدسی اور خدا کی تخلیق کی ہوئی ہوتی ہیں۔ شعرا، تو صرف دیوتاؤں کے ارشاد کا ذریعہ ہوتے ہیں"۔

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ: ———

" شعر کا جذبہ ایک طرح کا جنون ہے جس کا محرک ایک قدسی جذبۂ تخلیق ہے۔ شاعری کے ذریعہ دیوتا اپنا الہام لوگوں تک پہونچاتے ہیں اور شاعری کی بنیاد حق اور حقیقت پر ہونی چاہیے"۔

یہ لکھنے کے باوجود اس نے شعرا کو اپنی "ریاست" سے خارج کر دیا۔

افلاطون کے علاوہ دنیا کے تمام مفکروں نے شاعر اور شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو دفتر تیار ہو جائے۔ مختصراً چند مفکرین کے خیالات پر اکتفا مناسب رہے گا۔

مثلاً فرانسس بیکن (Frances Becon) شاعری کو خواب و خیال کی بات کہتا ہے۔

ڈیکارٹ (Diekant) نے کھلم کھلا شاعری کو بیخ و بن سے مٹا ڈالنے کی تلقین تو نہیں کی مگر اس کو عقل کے تابع رکھنے کی سخت تاکید کی ہے۔ انگلستان کا فلسفی لاک تخیل اور فنونِ لطیفہ کو حواس ظاہری کی چیزیں بتاتا ہے جن کو حق و باطل سے کوئی سروکار نہیں۔ فرانس ہی کا والٹیر جیسا صناع بھی لاک کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔

شیفٹز بیری (Shaftz Berry) اور ہچیسن (Hitcheson) حسن کی حقیقت کے معترف ہیں اور ذوق و وجدان کو عقل اور قیاس سے علاحدہ قوت مانتے ہیں۔ برک وہ پہلا شخص ہے جس نے صناعی اور شاعری کی صحیح قدر و قیمت سے ہم کو آگاہ کیا۔ برک کا اصرار ہے کہ ایک فنی تخلیق انسان کے دل و دماغ پر وہی اثر کرتی ہے جو واقعی دنیا کی کوئی شے کر سکتی ہے۔

افلاطون (Plato) نے شاعری کو "نفسِ حیوانی" کی چیز بتلایا لیکن وائیکو (Vico) نے شاعری کو اسفل السافلین سے ابھارا اور اعلا ترین مقام پر پہنچا دیا اور کہا کہ شاعری شعور کے ارتقا کی تاریخ میں ایک لازمی منزل ہے جو حسن کے بعد اور عقل سے پہلے آتی ہے۔

ونکل مان اور لیسنگ کہتے ہیں کہ جز میں کل دیکھنے کے لیے ایک خاص قوت درکار ہے جو کم و بیش ہر شخص میں موجود ہے لیکن جو شاعر یا کسی صناع میں درجۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ لیسنگ یہ بھی کہتا ہے کہ فنونِ لطیفہ کا کام ہمارے لیے سامانِ مسرت فراہم کرنا ہے منجملہ وہ ارسطو کا ہم خیال ہے اور کہتا ہے:

" المیہ شاعری کی غرض و غایت صرف یہ ہے کہ ہمارے

وغیرہ حیرت، ہمدردی کے جذبات پیدا کر کے ہماری روح کو ابھارے۔"

جرمنی کے نقاد فلسفی کانٹ (Kant) جمالیات اور منطق کو علم انسانی کی دو ہمزاد شاخیں مانتا ہے وہ کہتا ہے:

"دونوں اپنی اپنی جگہ حقائق کی تلاش کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے سورج سمندر میں ڈوب گیا۔ شاعری کی اصطلاح میں یہ اتنا ہی صحیح ہے جتنا طبیعات کی اصطلاح میں غلط ہے۔ شاعری کا کام فضائل اخلاق اور تصورات عقل جیسی غیر محسوس چیزوں کو محسوس کرا دینا ہے بھدی اور کریہہ چیزیں بھی فنون لطیفہ کا موضوع بن سکتی ہیں اس لیے کہ فنون لطیفہ کا کام محض حسین چیزوں کو پیش کرنا نہیں بلکہ چیزوں کو حسین پیرایہ میں پیش کرنا ہے۔"

لیکن شلز نے کانٹ کی داخلی تصوریت سے اختلاف کیا اور اس سے آگے بڑھ گیا۔ وہ کہتا ہے:

"حسن نام ہے زندگی کا مگر یہ زندگی جسمانی نہیں ہوتی بلکہ ایک غیر مادی کیفیت ہوتی ہے۔"

وہ کہتا ہے کہ۔ افلاطون نے فنون لطیفہ کو نقالی اس لیے کہا کہ عہد قدیم میں فنون لطیفہ واقعی نقالی سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ صرف مظاہر قدرت اور حوادث روزگار کو من و عن پیش کر دینا فنون لطیفہ کا تنہا مقصد تھا لیکن آج کل فنون لطیفہ کی جولان گاہ لامحدود ہے شاعر یا مصور ان کو اپنی شخصیات کی نیرنگیوں سے معمور کر کے ان کے اندر ایک نئی شان، ایک نئی قدر و قیمت، ایک نئی زندگی پیدا کر دیتا ہے۔

کروچے اطالیہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ شاعر کا وجدان بیک وقت اور بیک نگاہ زندگی کے پورے بہاؤ پر محیط ہو جاتا ہے۔ فنون لطیفہ میں ہم کو اسی لیے حکمت و فلسفہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔

ارسطو کی بوطیقا (POETICS) وہ پہلی کتاب ہے جو فن شاعری پر تفصیل سے بحث کرتی ہے۔ شاعری کو ارسطو نے ذہن انسانی کا ایک آزاد اور خود مختار عمل قرار دے کر اس کے متعلق بحث کی ہے اور اس کو مذہب یا سیاست کا پابند یا مذہب یا سیاست سے وابستہ نہیں قرار دیا۔ اس کا نقطۂ نظر ہے کہ شاعری اخلاقیات کی پابند نہیں۔ لیکن وہ اپنے استاد افلاطون کی طرح ہر شاعری کو نقل قرار دیتا ہے (اور اب بھی ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ شاعری زندگی کی نقل ہے)۔ اس کے بعد اس نے نقل کے ذریعوں، طریقوں اور موضوعات سے بحث کی ہے۔

ارسطو کے نزدیک شاعری کی ابتدا کے اسباب بھی دو ہیں ایک تو نقل جو انسان کے لیے بالکل فطری شے ہے — "نقل کرنا بچپن ہی سے انسانی جبلت ہے" — نقل سے صرف خوشی ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس سے تعلیم کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ شاعری کی ابتدا کا دوسرا سبب اس کے نزدیک نغمہ یا موزونیت ہے۔ رونے ہنسنے کی طرح گانا بھی قدیم انسان نے بہت جلد سیکھا ہوگا۔ اس کا کہنا ہے کہ ان دونوں اسباب کے ملنے سے قدیم زمانے میں شاعری کی ابتدا ہوئی ہوگی۔

ارسطو کہتا ہے کہ نقل کرنا بچپن سے شروع ہوتا ہے۔ جتنی ٹھیک نقل اتنی خوشی اور اگر نقل نہ ہو تو کاری گری ہوگی۔ پھر وہ کہتا ہے کہ جو سنجیدہ اور عالی سرشت تھے انھوں نے نقلوں کے لیے بلند و بالا کرداروں کے عمل اور کارناموں کو انتخاب کیا۔ لطیف مزاج شعرا نے کمینوں اور قابل نفرت آدمیوں کا خاکہ اڑایا اور ان دونوں قسموں کی شاعری کو وہ ٹریجڈی اور کامیڈی میں بانٹ دیتا ہے۔

ارسطو نے ٹریجڈی کے چھ عناصر بیان کیے ہیں۔ پلاٹ، اطوار، زبان، تاثرات، آرائش اور موسیقی۔

کامیڈی کے متعلق وہ کہتا ہے کہ بُری سیرتوں کی نقل ہے۔ 'بُری' سے ہر قسم کی بدی نہیں بلکہ مضحکہ خیز برائی مراد ہے جو ایک طرح کی بدنمائی یا خرابی ہے۔ وہ اس طرح کا نقص یا بدنمائی ہو جو نہ تو تکلیف دہ ہو اور نہ تباہ کن۔ مثال کے طور پر ایک مضحکہ خیز چہرہ بدشکل اور بگڑا ہوا تو ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ اس کو دیکھ کر



عیدالفطر کے موقع پر گورنر اتر پردیش جناب محمد عثمان عارف کو وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ویر بہادر سنگھ مبارکباد دیتے ہوئے۔

اسپیکر اتر پردیش ودھان سبھا جناب نیاز حسن ۲۲ اپریل ۱۹۸۷ء کو لڑیسی ہاؤس (لکھنؤ) کے اسکرین پرنٹنگ تربیتی سیشن کے اختتام پر تربیت یافتگان سے گفتگو کرتے ہوئے۔



اپنی رہائش گاہ
پر منعقدہ افطار پارٹی
کے موقع پر
وزیر اعلا
شری ویر بہادر سنگھ
شرکاء کا
خیر مقدم
کرتے ہوئے





وزیر اعلا
شری ویر بہادر سنگھ
لکھنؤ سے
روزنامہ قومی آواز
اور
نیشنل ہیرالڈ
کی اشاعت نو
کے آغاز پر
مذکورہ اخبارات
دیکھتے ہوئے



وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ لکھنؤ میں
ریاست برائے پارلی مانی امور شری حکم س
دیبا کول بھی

وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ نوازی ض
کی عمارت کا سنگ



وزیر اعلا
شری ویر بہادر سنگھ
یکم اپریل کو
لکھنؤ کے چار باغ
ریلوے اسٹیشن
پر سگنل دے کر
نئی لکھنؤ۔ بمبئی
وی. ٹی سپر فاسٹ
ٹرین کو روانہ
کرتے ہوئے



آڈیٹوریم کا افتتاح کرتے ہوئے۔ تصویر میں وزیر
اور وزیر ریاست برائے اطلاعات شریمتی
آرہی ہیں



غازی آباد میں سنجے گاندھی میموریل پالی ٹیکنک
بنیاد رکھتے ہوئے



وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ لکھنؤ میں مرکزی غذائی انسٹی ٹیوٹ کے منطقائی مرکز کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے

وزیر تعلیم سید سبط رضی آریہ کنیا مہا ودیالیہ لکھیم پور کھیری میں طالبات کو انعامات تقسیم کرتے ہوئے



تکلیف ہو۔ اس نے کامیڈی کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور ٹریجڈی پر بہت تفصیل سے لکھا۔

وہ جب ٹریجڈی کی وضاحت کرتا ہے تو کہتا ہے کہ تکلیف دہ اور تباہ کن عناصر ٹریجڈی کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ٹریجڈی ایک ایسے عمل کی نقل ہے جو اہم اور مکمل ہو اور مناسب عظمت کا حامل ہو۔ اس کی زبان مزین اور نفیس ہو اور اس عمل کی نوعیت ایسی ہو جو دہشت اور دردمندی کے ذریعہ اثر مرتب کرے۔

بوطیقا کے متعلق عزیز احمد صاحبؒ کہتے ہیں:

"شاید ہی کسی اور کتاب نے دنیا بھر کے ادب پر خصوصاً تنقید پر اثر ڈالا ہو۔ جس زمانے میں جس قوم نے ارسطو کے فلسفہ کی قدر کی اس کتاب کو بھی صحیفۂ آسمانی کے قریب قریب سمجھا۔"

مطالعہ کے دوران میں نے محسوس کیا کہ آج بھی ارسطو کی کتاب اپنی خوبیوں کے باعث یکتا ہے مختصراً اس کے بتائے ہوئے "اطوار و سیرت نگاری کے شرائط"، "دریافت کا طریقہ"، "شاعر کو ہدایات"، "طرزِ ادا"، "زبان کے حصے" آج بھی شاعر کے لئے مشعل راہ کا کام کرتے ہیں۔

ارسطو کہتا ہے: اطوار و سیرت نگاری کے سلسلے میں چار چیزوں کا خیال رکھنا چاہیئے (۱) اطوار اچھے ہوں (۲) اطوار میں تمیز مناسبت کا خیال رکھا جائے، (۳) اطوار میں زندگی سے مشابہت ہو، (۴) ربط۔ اگر نقل کا موضوع کوئی ایسا شخص ہو جس کے اطوار بے ربط ہوں اسے بھی ربط کے ساتھ پیش کیا جائے۔

دریافت کے طریقہ کے سلسلے وہ کہتا ہے سیدھا سادا۔ اکثر و بیشتر شعراء جن میں اپج نہیں ہوتی یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ دوسری وہ دریافتیں جن کو شاعر اپنی مرضی سے ایجاد کرتا ہے۔ تیسری دریافت جو حافظہ کے ذریعہ ہو جیسے کسی چیز کو دیکھ کر پرانی بات یاد آجائے۔ چوتھے وہ دریافت جو دلیل اور حجت پر مبنی ہو۔

ارسطو جب شاعر کو ہدایات دیتا ہے تو کہتا ہے:

"جب ٹریجڈی کا خاکہ تیار کرے تو اپنے آپ کو اس کا ناظر سمجھے، جہاں تک ہو سکے اداکار کی جگہ اپنے آپ کو سمجھے۔"

وہ لکھتا ہے:

"اسی لیے کہتے ہیں کہ شاعری کا متحرک یا تو خداداد فطری عطیہ ہوتا ہے یا دیوانگی کا ہلکا اثر... اگر پہلی صورت ہو تو انسان ہر طرح کی سیرت کی نقل کر سکتا ہے۔ اگر دوسری صورت ہو تو اپنی خودی سے اونچا اٹھ جاتا ہے اور تصور میں جو بننا چاہتا ہے بن جاتا ہے۔"

طرزِ ادا کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اس میں حکم، گذارش، بیان، دھمکی، سوال و جواب جیسی چیزیں شامل ہیں۔ شاعر ان چیزوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو یا ناواقف ہو اس سے اس کے فن پر کوئی الزام نہیں آتا۔

زبان کے حصے بیان کرتے ہوئے وہ 'حرف'، 'رکن'، 'تہجی'، 'حرف عطف'، 'حرف تصرف'، 'اسم'، 'فعل'، 'گردان'، 'جملہ' اور الفاظ کی تعریف کرنے کے بعد کہتا ہے: "لفظ یا تو عام ہو سکتا ہے یا اجنبی یا تشبیہی یا آرائشی یا جدید یا توسیع یافتہ یا مختصر یا مختلف یا تبدیل شدہ۔"

"شاعری کی زبان کی خوبی یہ ہے کہ اس میں صفائی ہو مگر سوقیانہ پن نہ ہو۔ سب سے زیادہ صاف زبان تو وہ ہوگی جس میں صرف روزمرہ کی بول چال کے الفاظ استعمال کیے جائیں لیکن ایسی زبان میں سوقیانہ پن ضرور ہوتا ہے۔"

"شاعری کی زبان فصیح اور اجنبی ہوتی ہے اور عامیانہ محاورات سے احتراز کرتی ہے۔ وہ انوکھے الفاظ استعمال کرتی ہے۔ انوکھے الفاظ سے مراد اجنبی، تشبیہی، توسیع یافتہ، لیکن کوئی عام الفاظ بالکل استعمال نہ کرے تو اس کا کلام یا تو معمہ بن جائے گا یا مجذوب کی بڑ۔ اگر صرف تشبیہی ہی ہوں تو معمہ

بن جائے گا اور صرف اجنبی الفاظ ہوں تو مجذوب کی بڑ معلوم ہوگا۔ الفاظ ملا جلا کر تناسب سے استعمال کیے جائیں۔"

ارسطو کا کہنا ہے کہ زبان کو سلیس بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ توسیع یافتہ مخفف یا تبدیل شدہ الفاظ کا استعمال کیا جائے کیونکہ اس طرح عام فہم الفاظ کی صورت ذرا بدل دی جائے تو انوکھا پن پیدا ہو جاتا ہے جس سے طرز بیان میں رفعت پیدا ہوتی ہے اور ان کے سوا جو عام الفاظ ادا ہوتے ہیں ان کی وجہ سے سلاست بھی باقی رہتی ہے۔ اس طرح کے انوکھے الفاظ کے استعمال میں میانہ روی کی بڑی ضرورت ہے۔ کسی نظم کے تشبیہی الفاظ بدل کر ان کی جگہ صرف عام الفاظ رکھئے تب نظم پھیکی ہو جائے گی۔ تناسب اور موقع سے مرکب الفاظ یا اجنبی الفاظ استعمال کرنا بڑی خوبی کی بات ہے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تشبیہات کے استعمال پر قدرت ہو کیونکہ صرف یہی ایک ایسی چیز ہے جو حاصل کرنے سے نہیں حاصل ہو سکتی دو مختلف چیزوں سے مشابہت کو محسوس کر لینا خداداد ذہانت کی نشانی ہے۔"

نظم کے ان حصوں میں جہاں عمل کی رفتار سست ہے، زبان بہت آراستگی سے استعمال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان حصوں میں تاثرات یا اطوار سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ برخلاف اس کے جہاں اطوار و تاثرات کے اظہار کا موقع ہے وہاں بہت آراستہ زبان استعمال نہ کی جائے ورنہ دوسری خوبیاں واضح نہ ہو سکیں گی۔

چونکہ شاعر کسی مصوّر یا کسی صناع کی طرح نقل کرتا ہے اس لیے اس کی نقل کے موضوع تین ہی طرح کے ہو سکتے ہیں:۔

(۱) یا تو وہ چیزوں کو اس طرح پیش کر سکتا ہے جیسی وہ تھیں یا ہیں۔

(۲) یا جیسی کہ وہ سمجھی جاتی ہیں یا بیان کی جاتی ہیں۔

(۳) یا جیسی انھیں ہونا چاہیے۔

شاعر کا ذریعہ اظہار الفاظ ہیں خواہ وہ عام ہوں، یا انوکھے یا تشبیہی، یا زبان کی ان مختلف تبدیلیوں اور جدّتوں سے آراستہ جن کے استعمال کا حق شاعر کو ہے۔

مزید برآں یہ کہ صحیح ہونے کا معیار شاعری میں کچھ اور ہے، سیاست اور دوسرے فنون میں کچھ اور۔ عام طور پر ناممکنات کے استعمال کو تین بنیادوں پر جائز سمجھا جا سکتا ہے:۔

۱۔ اگر ان سے شاعری کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ اگر ان سے واقعات جیسے ہیں اس سے بہتر معلوم ہو سکتے ہیں۔

۳۔ یا اگر رائے عامہ ان کو تسلیم کر سکتی ہے۔

غرضکہ ارسطو نے اپنی اس کتاب میں شاعری کی قسمیں نقل کے موضوع، نقل کے طریقے، شاعری کی ابتدا کے اسباب، قدیم ترین شاعری کی قسموں سے لے کر ٹریجڈی اور کامیڈی، رزمیہ شاعری، ان کی تعریف، ان کے عناصر، آزاد شاعری، مقفا شاعری، تنقید اور خصوصًا نظری تنقید کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہاں تک کہ اعتراض اور ان کے جواب دینے کے اصول تک بتا دیئے۔ اور میرا خیال ہے کہ جہاں تک ادب اور فن تنقید کا تعلق ہے آج بھی کوئی اور کتاب ارسطو کی بوطیقا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ کتاب نمونۂ ہدایت بنی ہوئی ہے اور اپنی خوبیوں کے باعث یکتا ہے۔

حواشی

[1] استاد ادبیات اُردو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز۔ لندن

جعفر ملیح آبادی

اے میرے وطن جاگ

اے محفلِ علم و ادب و شعر و سخن جاگ
اے منبعِ عرفان و خبر، معدنِ فن جاگ
اے دلکش و گلریز بہاروں کے چمن جاگ
اے رشکِ عدن، رشکِ عدن، رشکِ عدن جاگ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن جاگ

کب تک تری دھرتی پہ یہ افلاس کا ڈیرا
کب تک تجھے گھیرے گا مصائب کا اندھیرا
کب ہوگا نمودار فراغت کا سویرا
کب تک تری تقدیر کے سورج پہ گہن، جاگ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن جاگ

ڈر ہے کہ ڈبو دے نہ کہیں تیرا سفینہ
اِن تنگ نظر فرقہ پرستوں کا قرینہ
نفرت کا فسوں توڑ، بجھا آتشِ کینہ
اے امن کے گلزار، اخوت کے چمن جاگ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن جاگ

جس نے تجھے انگریز کے چنگل سے چھڑایا
وہ دبدبہ و رعب شہی جس نے مٹایا
جس نے تری زنجیرِ غلامی کو گلایا
پھر لے کے وہی حوصلہ شعلہ فگن جاگ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن جاگ

افلاس کے طوفان کا رُخ موڑ دے اُٹھ کر
سرمایہ پرستی کا فسوں توڑ دے اُٹھ کر
ادبار کے عفریت کا سر پھوڑ دے اُٹھ کر
پھر وادیِ کشمیر سے تا ارضِ دکن جاگ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن جاگ
اے میرے وطن جاگ

جوھر امیٹھوی

جواہر لال نہرو

تیرا کردار ضیا بار نگینے کی طرح
تو نے سکھلایا ہے جینا ہمیں جینے کی طرح

تیرے افکار سے بیدار ہوئے اہلِ وطن
تیرے اخلاق نے سیراب کیا ہے گلشن

تیرے ایثار نے وہ راہِ عمل دکھلائی
رہنمائی میں تری قوم نے منزل پائی

تو نقیب اور علم دار تھا آزادی کا
گلشنِ ہند کو نکہت نے تری مہکایا

تو نے روشن کیے دنیا میں وفا کے پہلو
تو نے سلجھا دیے ماحول کے اُلجھے گیسو

تجھ کو تسلیم کیا سارے جہاں نے رہبر
وطنیت کا زمانے میں اُبھارا پیکر

تو رہا دہر میں سورج کی طرح تابندہ
تیرا کردار ہے تاریخِ جہاں میں زندہ

غزل

کمال احمد صدیقی

۲۰ - راؤز ایونیو
نئی دہلی

اسے بھرتا رہے، پیتا رہوں، یہ جام ہے ساقی
وہ تیرا کام ہے ساقی، یہ میرا کام ہے ساقی

نظامِ کائنات اک رقصِ زودِ ایام ہے ساقی
نہ کچھ آغاز ہے ساقی، نہ کچھ انجام ہے ساقی

اس آئینے میں تیرا عکس ہے، یہ جام ہے ساقی
شرابِ سرخ، رخسارِ شفق آشام ہے ساقی

سحر کیا ہے، صبوحی ہے، طلوعِ جام ہے ساقی
شفق کیا ہے، حبابِ بادۂ گلفام ہے ساقی

خیال ایسا بھی ہوتا ہے، جو بالکل بھول جاتے ہیں
اچانک ذہن میں آجائے تو الہام ہے ساقی

ہے اسرار آشنا لیکن کوئی دعویٰ نہیں کرتا
ترا مےخوار اپنی ذات سے بےنام ہے ساقی

حیا آتی ہے، اک تجویز ہے، کیسے کہوں تجھ سے
ترے لب ہائے لعلیں پر نچھاور جام ہے ساقی

مئے کہنہ کی آمیزش سے اس کو خوش ادا کر دے
بہت ہی تند ہے، شاید ابھی یہ خام ہے ساقی

یہ میں کیا دیکھتا ہوں محتسب رشوت میں پیتا ہے
یہ جس میں پی رہا ہے وہ تو میرا جام ہے ساقی

عقیدے ٹوٹے کوزوں کی طرح سڑکوں پہ بکھرے ہیں
لہو بہتا ہے انسانوں کا اک کہرام ہے ساقی

گدائے میکدہ ہے، گو اسے دنیا میسر تھی
کمالؔ اک رندِ خوش اوقات و خوش انجام ہے ساقی

وحید دیوانہ

کمہار نزد چنیاری کوٹھ

میں نے سوچا تھا وہ میری ہر خوشی ہو جائے گا
کیا خبر تھی ایک دن پھر اجنبی ہو جائے گا

میرے اس کے درمیاں کچھ فاصلہ بھی تھا ضرور
یہ نہ سوچا فاصلہ یہ دائمی ہو جائے گا

میں تو بادل ہوں ہمیشہ پیاس بھڑکاتا پھروں
پیاس سے ہنس کر جو گزرے گا ندی ہو جائے گا

حوصلہ، امید، حسرت، آرزو، ارمان، خواب
میں سمجھتا تھا وہ میری زندگی ہو جائے گا

گھر سے جب وہ ساتھ نکلا تھا تو مونس تھا مرا
کیا خبر تھی راستے میں اجنبی ہو جائے گا

مدتوں ملتی رہی جس سے نظر کو روشنی
کیسے مانوں اب وہ وجہِ تیرگی ہو جائے گا

قرب بھی حد سے زیادہ دل کو پہنچاتا ہے چوٹ
آج ہے نزدیک تو کل دور بھی ہو جائے گا

تو کسی دن اس اداس آنگن میں میرے آ کے دیکھ
میرے گھر میں تیرا چہرہ چاندنی ہو جائے گا

ہم نہ کہتے تھے کہ اتنی بے رخی اچھی نہیں
تیرے غم میں وحید دیوانہ کبھی ہو جائے گا

اقبال متین
کہانی۔ اے۔ ٹی۔ ۲
دودھ گاؤں کالونی۔ پوچارم
آندھرا پردیش

افسانہ

پلنگ کی پٹی

مجھے تو اس کی اُداسیاں اکھر اکھر گئیں۔ عید جیسی عید
اور شہزادی بیگم تھی کہ جیسے دنیا بھر کا دلدر پھر سے پرپوت رکھا ہو
——— وقت بے وقت ہنسنے والی، بات بے بات کے بتیسی باہر
کیسے پان کی دھڑی دکھلانے والے دانت۔ گول مٹول سُرخ چہرہ،
جیسے شاہ خاور مشرق سے شہر بدر کیا گیا ہو یا مغرب میں جنگ
ہار کر آخری سلام کر رہا ہو ——— چہرے کا لطافت بالکل ایسے ہی
مان لیجئے وہ شاہ خاور تھے، یہ بھی تو شہزادی بیگم تھیں ———
زمانہ سکون سے سونے دیتا اور وقت پر جاگنے، ہنسی میں غموں کی
ڈھکی چھپی آمیزش نہ ہوتی۔ جیسا نام تھا ویسے ہی شاہانہ دن رات
ہنستے تو شہزادی کا چہرہ ڈھلتے سورج کا سرخ توانہ بن جاتا۔

کئی بار یوں ہوا کہ میں پوچھتی رہتی اور وہ ٹالتی رہتی ـ مجھے
کبھی کرید کرید کر تہہ تک پہنچنا کچھ جی کو نہ بھاتا۔ یوں بھی اپنی ہی ملازمہ کا
اتنا کچھ خیال کم ہی بی بیاں کرتی ہیں۔ مجھے احساس تھا اور یہ احساس
کچھ اس طرح جڑ پکڑتا گیا کہ شہزادی بیگم جسے میں کچھ لاڈ کچھ اختصار
کی سہولت کے لیے شہزاد پکارتی تھی نہ عورت کا دل اپنے سینے
میں رکھے ہے نہ دوسری کے سینے میں ٹٹولے۔ اچھی بھلی قہقہے لگاتی
شہزاد پلک جھپکاتے، پتھر کی ایسی مورتی بن جاتی جسے صدیوں
بعد کھدائی میں زمین کی تہیں کھول کر نکالا گیا ہو ——— چہرے پر
بیتے ہوئے زمانوں کی خراشیں ——— جی چاہتا، بس چلے تو اُٹھا کر
آثار قدیمہ کی طرح گھر کے کسی گوشے میں اس گٹھیلی عورت کو رکھ دیا
جائے۔ پھر پلٹ کر کوئی نہ دیکھے ——— گرد سے اَٹی ہوئی، مکڑی
کے جالوں سے ڈھکی ہوئی شہزاد کی ہاتھ بڑھا کر کوئی گرد تک نہ
جھاڑے۔ جی جل کر رہ جاتا۔

بچوں کے اسکول سدھارنے کے بعد جب وہ بھی دفتر
سدھار جاتے تو میں کسی نہ کسی کتاب میں پناہ لیتی۔ شہزاد جب دیکھتی
کہ میں اپنی مصروفیات ختم کر کے کتاب اٹھا لیتی ہوں تو پھر اس کے
سینے نہیں چڑھتی۔ اور اس کا موڈ ہوتا کہ فراغت کے یہ لمحے کچھ میری
دلجوئی کے بہلانے اس کے اپنے دل بہلاوے کا سامان بھی مہیا
کریں تو وہ مجھے چھیڑتی۔

"کچھ سنا بی بی آپ نے۔؟"

"انسان جانور سے بدتر کوئی مخلوق ہو گیا ہے"

"کوئی سیکل پر جا رہا تھا۔ لڑکا۔ بڑے چاؤ سے نام پوچھا۔
چاقو لگا دیا"

"کوئی غریب کسی سینما ہال کا ملازم تھا ——— سُنا کہ اپنی ہی دُنیا
میں مست کھڑا دیوار پر پوسٹر چپکا رہا تھا۔ پہناوا دیکھا اور گھونپ دیا
پھر ا پیچھے سے"

"یہ مردانگی نہیں ہوئی بی بی۔ یہ تو درندگی سے بھی گھٹیا کوئی شے
ہے۔ مجھ سے اگر کوئی کہے کہ ——— شہزادی بیگم تیرے شوہر نے
خدانہ خواستہ، خدانہ کردہ کسی کا سر پھاڑ دیا ہے تو بی بی، میں اپنا دل

گی نہیں۔ مرجاؤں گی شرم سے ۔۔۔ میرا خاوند بھیڑیا نہیں ہوسکتا اور اگر ہوسکتا ہے تو اللہ میں اس کی بیوی نہیں ہوں!"

بی بی آپ نے وہ تقریر سُنی ہوگی نا ۔۔۔ سرکار امن کمیٹیاں بنا رہی ہے ۔ گھر گھر پھر کر لوگوں کو امن کمیٹی والے لوگ دلاسہ دیں گے سمجھائیں گے کہ مل جل کر پیار سے رہنے میں ہماری بھلائی ہے۔

ہاں تو بی بی میں کہہ رہی تھی آپ نے ریڈیو سے وہ تقریر سُنی ہوگی بڑا اچھا سا نام تھا بولنے والے کا۔

کچھ دیر شہزاد سوچتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔

"اونہہ بھئی پڑے اس بھول پر ۔۔۔ اچھا سا نام تھا۔ خیر نام سے کیا کام ہمیں بی بی۔ لیکن بات کیا پتے کی بتلائی ہے۔"

کہا ۔۔۔ "سرکار فرماتے تھے"۔

"کیا سمجھیں؟ ۔۔۔ سرکار سے مراد گورنمنٹ سرکار نہیں، سرکار دو عالم کے سرکار ہمارے نبیؐ"

کہا۔ "سرکارؐ فرماتے تھے کہ مومن وہی ہے جس کا پڑوسی دن کو سکون و اطمینان سے رہے اور رات چین کی نیند سوئے۔"

"اللہ ان مردوں نے مذہب کو سمجھا ہی نہیں۔ کون سا مذہب ہے جس نے نفرت کرنا کبھی سکھلایا ہو۔ رام لچھمن کو لے لو گرونانک کو لے لو۔ ہمارے نبی کا فرمان تو سُنا ہی دیا ہے ۔۔۔ اصل بات یہ ہے بی بی کہ مت ماری گئی ہے اس مرد ذات کی۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ عورت پیدا ہوئی"۔

"بی بی ۔ او بی بی ۔ ماں جنم دیتی ہے تو کس کس طرح دُعائیں دیتی ہے اپنے ننھے کو ۔۔۔ سوچتی ہے بڑا ہوگا تو پڑھ لکھ کر اچھا آدمی بنے گا۔ مدرسے، کالج سب کچھ دن دونی بڑھ رہے ہیں۔ پھر بھی یہ کیا ہے بی بی کہ مرد میں چھپا ہوا بھیڑیا اپنے خونخوار دانت نسوڑے پھرتا ہی رہتا ہے۔ آدمی پہلے آدمی بن لے بس اور کچھ نہیں انسان بننا تو بڑی بات ہے ۔۔۔ میں کہوں بھیڑیا تو نہ رہے۔"

"بی بی! سچ کہتی ہوں نا۔"

"بالکل سچ کہتی ہو شہزاد۔ آدمی کا دل اچھا رہے تو وہ مردِ کار کو مدد اپنا سکے ہے۔ کتابیں علم عطا کرتی ہیں اور علم آدمی کو انسان بناتا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ایسے محلے، ایسی کالونیاں جہاں پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت ہو، اس قسم کے جھگڑے فساد سے پاک رہتے ہیں۔ کسی بھی مذہب کی تعلیم کو سمجھنے کے لیے بھی آخر تھوڑا بہت علم تو چاہیے ہی"۔

شہزاد ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔

میں نے لمبی لمبی ابراے ڈری کی سوئیوں کے ساتھ وہ میز پوش اٹھا لیا جس کے بارڈر میں نے مکمل کیے تھے اور کونوں پر پھولوں کے پنسل اسکیچ بھی بنا لیے تھے۔

شہزاد اپنے کام میں لگ گئی۔

میں میز پوش پر جھکی سوچ رہی تھی کہ شہزاد جو ہنستے بولتے دُکھی ہوجاتی ہے۔ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی اس کی زندگی کی ایسی محرومی چھپی ہوئی ہے جس کا اظہار وہ کبھی نہیں کرتی۔ سارے ہی مردوں کے تعلق سے اس کے جانبدارانہ خیالات سُن کر میں سوچنے لگی کہ شہزاد کے شوہر کا سلوک شاید اس سے اچھا نہیں ہے جو وہ اندر سے دُکھی ہے۔ ویسے شہزاد نے کبھی اپنے شوہر کی برائی نہیں کی تھی۔ کبھی ذکر آ بھی جاتا تو میرے خاوند میرے خاوند کہہ کر وہ اپنے میاں کی تعریف ہی کرتی۔

کچھ دنوں سے میں ایک بات محسوس کر رہی تھی۔ شہزاد ذرا زیادہ ہی کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی۔

میں نے کہا چائے کے لیے پانی چڑھا دو۔

وہ مجھے پلانے کے لیے گلاس میں پانی لے آئی۔

میں نے کہا۔ "شہزاد! بچوں کے کپڑے الگنی سے اُتار لو، سوکھ گئے ہوں گے۔"

اس نے صاف ستھرے کپڑے جو خود اس نے دھوئے تھے الگنی سے اُتار لیے اور انھیں پھر سے دھونے بیٹھ گئی۔

میں نے ذرا تلخی سے تیز آواز میں کہا:

"کیا کرتی ہو شہزاد؟"

اس نے چونک کر اپنے حواس درست کیے۔ میرے سامنے آکر اس طرح کھڑی ہوگئی جیسے مجسمہ نصب کر دیا گیا ہو۔

میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ اپنے آنچل سے آنسو خشک کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

شہزاد نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا ـــــ "بی بی میں بہت مجبور ہو گئی ہوں، ورنہ میں آپ سے کبھی نہ کہتی ـــــ بابا لوگوں کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ صاحب کا دفتر بھی ہے۔ میں جانتی ہوں لیکن کیا کروں۔"

"لیکن بات کیا ہے"۔؟

"مجھے پانچ چھ روز کی چھٹی دے دیجیے"۔

"تم اسی ماہ دو روز جا چکی ہو۔ یاد ہے نا تمھیں؟"

"اسی لیے تو پوچھ نہ سکتی تھی بی بی ـــــ آپ جانتی ہیں کہ میں کام سے پیچھے نہیں ہٹتی۔!"

"پھر ایسی کیا ضرورت آ پڑی ہے تمھیں؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے کہا "بیٹھ جاؤ"۔

وہ بیٹھ گئی۔ ذرا سنبھلی تو میں نے اسے پانی پلایا۔

شہزاد نے ایسی احسان مند نظروں سے مجھے دیکھا کہ میرا جی بھر آیا۔

"کہو۔ کیا دکھ ہے تمھیں۔؟"

اس نے تھم تھم کر کہنا شروع کیا،

"میرے خاوند برے آدمی نہیں ہیں بی بی ـــ ایک لت انھیں بہت بری ہے۔ کتنی ہی منتیں کیں۔ پیر پکڑ کر سمجھایا کئی بار۔ اپنی بچی کا واسطہ دیا۔ وہ بھی دل گیر ہو کر سن لیتے ہیں۔ لیکن گھر لوٹتے ہیں تو نشے میں دھت رہتے ہیں۔ پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو گھر سے چلا تھا تو فرشتہ تھا۔ شام ہوتے ہوتے اس پر کیا افتاد پڑتی ہے۔ رات کو گھر لوٹتا ہے تو بھیڑیا لگتا ہے ـــ مجھ سے برا سلوک کرتے کرتے اب تو وہ بچی کو بھی گالی گلوچ کرنے لگے ہیں۔ لاکھ منع کرو۔ لاکھ سمجھاؤ بس ایک ہی رٹ لگائے رہتے ہیں۔ مجھے تو ہر پینے والا ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا لگے ہے

بی بی۔ بہت سنا ہے میں نے، رنگ والوں کی جو پیتے ہیں۔ سارے پکڑ رکھا ہے، سنا ہے۔

نشیبی بستی سے یہی آوازیں اٹھتی ہیں۔

"یہ لال پری ہے میری، تو کیا جانے کہ یہ کیا ہے"۔

بس یہی رٹ لگائے رہتے ہیں بی بی ـــ بوتل بتلا بتلا کر صحن میں کھڑے نشے میں دھت لہراتے رہتے ہیں۔ وہ بوتل بھی خالی ہوتی ہے۔ کبھی پیندا ہی نہیں ہے تو کبھی گردن ٹوٹی ہوئی ہے۔ جانے کہاں گھورے سے اٹھا لاتے ہیں۔ سنتی ہوں اب تو پلاسٹک کے پیکٹ میں ملتی ہے۔ بچے دودھ پلاسٹک کے پیکٹ کا پئیں۔ باپ دارو پلاسٹک کے پیکٹ کی۔ اب شیشے کی جگہ پلاسٹک نے لے لی ہے اور یہ ہیں کہ وہی دہرائے جائیں۔

"یہ کئی ہزار کی بوتل ہے ری۔ میں تجھے اور تیری بیٹی کو، سب کو اس میں بند کر سکتا ہوں۔ ساری دنیا بند ہے اس میں۔ تو بھی بند ہے اس میں، میں بھی بند ہوں اس میں۔"

آدھی آدھی رات تک وہ اسی طرح بڑبڑاتے ہیں۔ اڑوس پڑوس میں سب تنگ آ گئے ہیں ہم سے۔ ایسی نظروں سے ہمیں دیکھتے ہیں کہ جی چاہتا ہے زمین پھٹ جائے اور سما جائیں ہم۔ اس کے علاوہ گالیاں بھی بکے جاتے ہیں۔ آپ کے آگے میں کیسے دہرا سکتی ہوں بی بی۔

ادھر کچھ دنوں سے شدید بیمار ہیں میرے خاوند۔ ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ جگر سڑ کر رہ گیا ہے۔ ہفتہ بھر جی جائیں تو ذرا امید بندھے گی۔ میری بچی بھی دواخانے میں ان کے پلنگ کی پٹی بن کر رہ گئی ہے میں چاہتی ہوں میں بھی ان کی خدمت ......" اور وہ جملہ پورا کیے بغیر بلک اٹھی۔

بی بی! اللہ سمجھے اس کئی ہزار کی بوتل کو۔ اس بوتل نے میری بچی کا سہاگ بھی پی لیا ہے۔ جو کچھ جوڑ جوڑ کر ان سے چھپا کر اس کی شادی کے لیے جمع کیا تھا وہ سب ان کی بیماری پر صرف ہو گیا ہے میری بچی ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگتی ہے۔

"اللہ میرے ابا کو اچھا کر دے۔ اللہ میری امی کا سہاگ قائم رکھے۔

خاموش قنوجی

دہلی دواخانہ قنوج

سرسید احمد خاں

وہ سرسید کہ جس کو قوم کا معمار کہتے ہیں / مصافِ علم و دانش کا علمبردار کہتے ہیں
وہ سید جس نے بہرِ قوم ہر سو ہاتھ پھیلایا / وہ سید جس نے ملت کو سدا پڑھنے پہ اکسایا
وہ سید جس نے ملت کے لیے اک دقت ہی کھایا / ودیعت کر دیا ملت کو جس نے اپنا سرمایا
وہ سرسید کہ جس نے قوم کے طعنے سنے برسوں / وہ سرسید کہ جس نے کفر کے فتوے سنے برسوں
بالآخر عزمِ راسخ اس کا اک دن رنگ لے آیا / علی گڑھ علم و دانش کی نئی صبحیں لیے ابھرا
وطن کے گوشے گوشے کو منور کر دیا جس نے / دلوں میں ملتِ بیضا کے عرفاں بھر دیا جس نے
جہالت کے اندھیروں میں جلا کر مشعلِ عرفاں / دیا ہے ملتِ مرحوم کو جینے کا اک امکاں
رہا محدود بھارت تک نہ اس کا فیضِ عرفانی / ضیائے علم نے بخشی ہے غیروں کو بھی تابانی
یہ مانا آج تو ہم میں نہیں ہیں علم کے گوہر / ترا نقشِ قدم ہر ہر قدم ہے قوم کا رہبر
جہاں کے گوشے گوشے میں اجالا کر دیا تو نے / وقارِ آدمیت اور بالا کر دیا تو نے
عقیدت ہے جنھیں سید سے وہ میدان میں آئیں / خلوص و جذبۂ ایثار ان راہوں میں اپنائیں
فروغِ علم کا جذبہ ابھاریں نوجوانوں میں / جلائیں علم کی شمعیں غریبوں کے مکانوں میں

الٰہی جذبۂ ایثار بھر دے قلب میں میرے
کوئی خاموش سے بھی خدمتِ علم و ادب لے لے

راجیندر بہادر موج

فتح گڑھ - یو.پی

غزل

تیر آنے لگے وہاں سے
تھی امیدِ وفا جہاں سے
دیکھ لیں مرے آنسوؤں کو
کیوں نہیں کچھ مری زباں سے
کتنے ناداں ہیں پھینکتے ہیں
کنکری شیشے کے مکاں سے
ان سے کیا بات ہو سکے جو
بات کرتے ہیں آسماں سے
میری ہر سعی رائیگاں ہے
الٹے پڑنے لگے ہیں پانسے
ہو نہ ہو مصلحت ہے کوئی
کیوں وہ لگتے ہیں مہرباں سے
عزم محکم ہو تو رہیں گی
بجلیاں دور آشیاں سے
اتنی تفریق برگ و گل میں
یہ شکایت ہے باغباں سے
تھا وہی موڑ سمتِ منزل
راستہ بھولے ہم جہاں سے
نازشِ کارواں تھے ہم بھی
پوچھ لو گردِ کارواں سے
ڈوب کر پار ہوں گے اے موج
عشق کے بحرِ بیکراں سے

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی
بزریا ملاظریف - رام پور

محمد علی جوہر کی ایک کمیاب نظم

مولانا محمد علی کی شخصیت ایک عرصہ تک موضوع بحث رہی ہے۔ حسرت کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ وہ بحیثیت شاعر اتنے زیادہ مشہور ہوئے کہ ان کی سیاسی شخصیت دب کر رہ گئی لیکن مولانا محمد علی کی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ وہ بحیثیت سیاسی رہنما ہمارے سامنے اس طرح ابھرے کہ ان کی ادبی زندگی کے بہت سے پہلو عوام کی فکر و نظر کا محور نہیں بن سکے۔

مولانا محمد علی کی زندگی کا جائزہ لیجئے تو محسوس ہوگا کہ ان کی زندگی کے ہر شعبے پر ایک ایسے جذبہ کا غلبہ ہے جو ملک و ملت کے درد سے بھرا ہوا ہے۔ وہ سرسید تحریک کے پروردہ اور ذہنی اعتبار سے شبلی کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

مولانا چونکہ تاریخ کے طالب علم تھے اس لئے انھوں نے اپنے ماضی کی طرف دیکھا اور اسلامی تاریخ سے کچھ علامتیں لیں۔ اسی لئے جدو جہد آزادی کو انھوں نے جہاد تصور کیا۔ اور کربلا اور متعلقاتِ کربلا کو انھوں نے علامتی طور پر ہندستان کی آزادی کے وسیع تر معنٰی میں استعمال کیا:

ع پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابنِ علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے

ع اس باغ میں خزاں کا نہ ہوگا گذر کبھی
کیا رنگ دیکھئے ابھی دکھلائے کربلا

مولانا محمد علی کی ادبی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے ہوا۔ انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھا بھی ہے:

"میں نے دس برس کی عمر میں، لغو و فضول شعر مگر بامعنٰی اور موزوں کہے تھے۔"[1]

مولانا کی تاریخ ولادت ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء (رامپور) ہے اس لیے مولانا محمد علی کی شاعری کا آغاز ۱۸۸۸ء میں ہوا۔ لیکن ان کے مجموعہ میں ۱۸۹۷ء سے قبل کا کلام شامل نہیں ہے۔ مولانا کو بچپن سے ادبی ماحول ملا، ان کے خاندان کے بیشتر افراد، رامپور میں، ایک ہی محلے کوچہ لنگر خانہ میں رہتے تھے۔ مکانات ایک دوسرے سے ملحق تھے، اور مکانات میں زنان خانوں اور دیوان خانوں میں آمدورفت کے لیے راستے تھے۔ روز ادبی محفلیں ہوتیں۔ مولانا نے تحریر بھی کیا ہے:

"ہمارے بڑے چچا کا مردانہ مکان تھا۔ یہاں ریاست رامپور کے ہر طبقے کے لوگوں کا تانتا لگا رہتا.... چونکہ ہم روہیلوں میں سے نہ تھے جن کی دلچسپیاں عام طور پر علمی، ادبی کم اور فوجی زیادہ ہیں۔ اس لیے ہمارے چچا دوسرے رامپوریوں کے مقابلہ میں کچھ

زیادہ ہی ان اہلِ علم و ادب کو اپنے وہاں
مدعو کرتے تھے جنھوں نے سیاسی انقلابات
کے ہاتھوں دہلی اور لکھنؤ کے درباریوں
کی تباہی کے بعد نواب رامپور کے دربار
میں پناہ ڈھونڈھی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ان کی عالمانہ فاضلانہ باتیں
میری عمر کے بچوں کی سمجھ سے بالا تھیں
لیکن ان سے مجھ میں کم از کم ایک ادبی
استعجاب و تجسس ضرور پیدا ہوا۔ جیسے
بڑی عمر کے چچیرے بھائیوں کی صحبت سے
مزید تحریک ملی۔"[3]

ان ادبی محفلوں کے علاوہ، مولانا نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہاں شعرگوئی اور تصنیف و تالیف کا ذوق تھا۔ حافظ احمد علی شوق مولانا کے حقیقی چچا تھے۔ جنھوں نے "تذکرۂ کاملانِ رامپور" کے علاوہ ادبی اور تحقیقی مضامین تحریر کئے۔ عظمت علی خاں مولانا کے چچا اور خسر تھے جن کے اشعار کو محمد علی نے "ہمدرد" میں مثالوں میں پیش کیا ہے۔

محمد علی کے حقیقی برادرِ بزرگ ذوالفقار علی گوہر کو داغ سے تلمذ حاصل تھا۔ جنھوں نے داغ پر کئے گئے اعتراضات کا جواب اپنے مضامین میں دیا ہے۔

مولانا محمد علی کی وفات کے بعد مولانا شوکت علی نے ۲۹ مارچ ۱۹۳۲ء سے مولانا محمد علی کی ابتدائی زندگی پر ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا تھا۔ جو قسط وار روزنامہ 'خلافت' میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مولانا شوکت علی تحریر کرتے ہیں:

"محمد علی بہت چھوٹا تھا تو بھائی کے ہمراہ داغ
مرحوم کے پاس جاتا تھا اور ان کے بعض اشعار
جو یاد کئے تھے ان کو سناتا تھا۔ اور وہ بہت
محبت سے اسے اپنی گود میں بٹھاتے تھے۔
اور اس کے بھولے منھ سے اپنے شعر سن کر

وط ہوئے۔

ابتدا میں مولانا کے کلام پر داغ کا اثر بھی موجود ہے:

یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
ظلم کا نام ستمگر نے حیا رکھا ہے

یہ اثرات علی گڑھ کے ابتدائی دور میں بھی رہے۔
مولانا محمد علی لکھتے ہیں:

"علی گڑھ میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق"۔[4]

لیکن رفتہ رفتہ داغ کا اثر زائل ہونے لگا اور سفرِ یورپ نے محمد علی کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دیں اور پورے ملک میں اقبال کی شاعری کی جو بازگشت تھی مولانا اس سے بھی متاثر ہوئے۔

مولانا محمد علی کے مجموعۂ کلام کے تقریباً ۹ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ سب سے آخری ایڈیشن "سخن جوہر" مرتبہ اختر بستوی اتر پردیش اردو اکادمی نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ اس میں مرتب نے ایک ایسی غزل کی بھی نشاندہی کی ہے۔ جو مولانا کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود مولانا کا بہت سا ایسا کلام ہے جو مختلف گلدستوں، جنتریوں رسالوں و اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں مولانا کی شاعری پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک ایسی نظم کی نشاندہی کرنا ہے جو 'اولڈ بوائے' علی گڑھ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ رسالہ ستمبر ۱۹۱۱ء سے شائع ہونا شروع ہوا اس کے پہلے شمارہ میں اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے ایڈیٹر ابو حامد عشرت تحریر کرتے ہیں:

"... اولڈ بوائز کیا ہیں۔ ان کے دلی جذبات
مطمع نظر اور مقاصدِ زندگی کیا ہیں۔ ان سے بہت
ہی کم لوگ واقف ہیں۔ ... اولڈ بوائز کالج
کے ہی بارآور شجر ہیں۔ اور اس کی آئندہ ترقی
انھیں کی سعی، متانت و سنجیدگی، کوشش اور
ذاتی قابلیت سے وابستہ ہے۔" (ص ۳ تا ۵)

'اولڈ بوائے' کے اجراء کے بعد یہ رسالہ جیسے ہی ان طلبا تک پہنچا جو علی گڑھ مدرسۃ العلوم سے وابستہ رہے تھے، یا یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے تھے، انہوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور اپنے جذبات کا اظہار نظم و نثر میں کیا۔ مولانا محمد علی کی یہ نظم بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ جو ان کے مجموعۂ کلام میں نہیں ملتی۔

زمانہ جن کو بھلا چکا تھا وہ پھر فسانے سنائے تونے
ہوئے تھے جو دل محو نقشے ہمیں دوبارہ دکھائے تونے
بہت سنبھل کر بگڑ گئے تھے ہزاروں مل کر بچھڑ گئے تھے
بہت سے بگڑے ہوئے سنبھالے بہت سے بچھڑے ملائے تونے
سبق اخوت کا بھول بیٹھے تھے گم گئی تھی کتاب الفت
پڑھایا آموختہ دوبارہ پرانے گر پھر بتائے تونے
یگانے بیگانے ہو گئے تھے رہی تھی یاروں میں بھی نیاری
مگر بلا کا اثر ہے تجھ میں پرانے اپنے بنائے تونے
ہوا تغافل کی چل رہی تھی چمن میں مرجھا رہی تھیں کلیاں
ہوا چلائی کچھ ایسی آکر کہ سوکھے غنچے کھلائے تونے
اگرچہ تھے کچھ نیاز والے مگر زیادہ تھے ناز والے
نیاز والوں کو گر نوازا تو لاکھوں روٹھے منائے تونے
کہیں قیامت کا صور پھونکا کہیں پکارا ہے قم باذنی
ہزاروں سوتے جگائے تونے ہزاروں مردے جلائے تونے
مگر یہ طرفہ ہے ابر رحمت چلا ہے کاشی سے سمت کو یل
یہ کیسی گنگا بہائی الٹی یہ کیا کرشمے دکھائے تونے

(اولڈ بوائے: اکتوبر ۱۹۱۰ء ۲، جلد ا، ص ۲۱)

۱؎ محمد سرور (مرتب): خطوطِ محمد علی، ص ۱۹۵، ۱۶ اگست ۱۹۱۶ء

۲؎ عبدالماجد دریابادی: محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق ۱/ ص ۹۴

۳؎ محمد سرور: محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز؛ ص ۶۶ (ترجمہ)

۳؎ My life a fragment. Mohd Ali.

۴؎ حافظ احمد علی شوق۔ ۱۰ شعبان ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۸۶۲ء رامپور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں ریاست رامپور کے ایک رسالے میں جمعدار، ۱۸۸۹ء میں منصرم نزول ۱۸۹۹ء میں سرکاری کتب خانہ موجودہ رضا لائبریری رامپور میں منصرم بعدہٗ ناظم اعلیٰ رہے۔ ان کی قلمی چیزیں رضا لائبریری میں موجود ہیں۔

۵؎ عظمت علی خاں۔ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ۔ ولادت، انتقال ۱۹۰۶ء منشی امیر اللہ تسلیم نے تاریخ کہی:

بحوران جناں تسلیم رضوان گفت تاریخش
رئیس جم حشم آمد امیر کامراں آمد

نمونۂ کلام:

عظمت بڑے بڑے ہیں مزے راہِ عشق میں
چل تو سہی، بڑھا تو قدم، دیکھ تو سہی

(ہمدرد: ۲۳ مئی ۱۹۲۵ء)

۶؎ داغ کے اس شعر

۷ دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا
اس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

پر اہلِ لکھنؤ نے اعتراض کیا تھا کہ "آخر مجھے کیا کرنا"، حیدرآباد کی اردو ہے داغ حیدرآباد کیا گئے کہ اردو دہلی میں ہی چھوڑ گئے۔ ذوالفقار علی گوہر نے "البشیر" اٹاوہ کے اخبار میں اس کا جواب تحریر کیا تھا۔ داغ نے اس مضمون کی تعریف کرتے ہوئے ذوالفقار علی گوہر کو ایک خط تحریر کیا تھا۔ جو رسالہ 'مخزن' لاہور۔ اگست ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔

(۷ انشائے داغ: مولانا احسن مارہروی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۱ء ص ۲۵ تا ۱۲۷ سلسلہ ۱۵۳)

۸؎ محمد سرور: خطوطِ محمد علی؛ ص ۴۷

سیدہ نسیم چشتی
(فلیٹ ۴۰ ای (تیسری منزل)
ذاکر باغ ۔ اے ۔ ٹاور
اوکھلا روڈ ۔ نئی دہلی

بدلتے موسم

ہنسو تو سارا زمانہ ساتھی، مگر نہ پوچھے گا کوئی آنسو
پہن لو پوشاک مسکراتی، سنوار ڈالو اداس گیسو

بڑا ہی ظالم ہے وقت دیکھو نہ پھر یہ چل جائے چال کوئی
رکھو ہمیشہ تم اپنے شانوں پہ اپنی ہمت کی ڈھال کوئی

اندھیرے خوابوں کو اپنی پلکوں سے دور جھٹکو کہ وقتِ شب ہی
لٹے مسافر ہیں اس یقیں پر کہ پاس سوتے ہیں اپنے سب ہی

بدلتے موسم کے ساتھ بدلے گا یوں ہر انساں نگاہ اپنی
کہ پتہ پتہ خزاں میں جیسے بکھر کے لیتا ہے راہ اپنی

ذرا سا اک موڑ بس مڑو تم اس ایک پل تک رکا ہوا ہے
وہ ہاتھ چوما ابھی جو تم نے اسی میں خنجر جھکا ہوا ہے

ڈاکٹر نفیس نقی
سرونج ۴۶۴-۲۲۰ (ایم۔پی)

عرضِ ہنر

میری تخیل کے نو بہ نو زادیے
زلف رخسار تارے شفق چاندنی
کیف و مستی میں ڈوبی شب ماہ وہ
دستِ سیمیں پہ رکھا ہوا اک سبو
زرد چہرے پہ ابھری شکن در شکن
آنکھ میں بیتے وقتوں کی محرومیاں
بھوک کے ہاتھ سے کھیت کٹتا ہوا
اور جلتی ہوئی ریت پر نقشِ پا
کتنے خاکے
لہو سے تراشے
اور کتابوں میں ترتیب دینا گیا
پھر بھی
عرضِ ہنر کا صلہ نہ ملا
دیکھ کر وقت کی
بے حسی اے خدا
دل کی گہرائیوں سے نکل کر لہو
آنکھ میں بھر گیا
میرے شاہکار سب
ریت میں دھنس گئے

غزل

جس کے بھی سامنے سے وہ جلوے گزر گئے
اس کی نگاہِ شوق کو بیکار کر گئے

تنہا ہوں راہِ زیست میں اب کارواں کہاں
کچھ دور چل کے سب مرے ساتھی ٹھہر گئے

ناکامیٔ حیات کا یہ رخ تو دیکھئے
ہم جیتے جی یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ مر گئے

ترتیبِ برگِ گل سے ہے رعنائیٔ بہار
گلشن میں خاک اڑے گی اگر یہ بکھر گئے

تارے فلک پہ ہیں نہ اب آنسو مژہ پہ ہیں
آخر شبِ الم کے سہارے کدھر گئے

مجھکو تو کچھ نظر نہیں آتا تو ہی بتا
پیشِ نظر تھے جو ابھی کشفی کدھر گئے

کشفی لکھنوی
شاہی مسجد راج بھون
لکھنؤ

غزل

وہ ہماری گفتگو کو ناروا کہتے رہے
ہم انھیں شیریں بیاں رنگیں نوا کہتے رہے

ہم کو عرفانِ حقیقت تھا مگر کیا کیجئے
مصلحت بھی راہزن کو رہنما کہتے رہے

ڈوبنے والوں میں کیا کوئی خدا والا نہ تھا
اہلِ کشتی ناخدا ہی ناخدا کہتے رہے

یہ نہ سوچا دل پہ کیا گزرے گی اہلِ درد کے
جو بھی ان کے دل میں آیا برملا کہتے رہے

اپنے کردار و عمل پر بھی کبھی ڈالیں نظر
ہر مصیبت کو جو قسمت کا لکھا کہتے رہے

ہم تو کیا ہیں رہبروں کی گرمیٔ گفتار پر
ہوش والے مرحبا صد مرحبا کہتے رہے

آشیاں کی سست بنیادی کہوں گا میں اسے
لوگ جس کو عظمتِ برقِ بلا کہتے رہے

زندگی بھر آپ کی یادیں شریکِ غم رہیں
کم نظر تھے جو ہمیں بے آسرا کہتے رہے

خونِ مفلس کی تجارت تھی شبابؔ انکا شعار
خود کو جو غم آشنا درد آشنا کہتے رہے

ڈاکٹر عبدالنعیم
شبابؔ کاسگنجوی
ٹی ٹی ای۔ ناردرن ریلوے
بریلی جنکشن

غزل

خطیبِ وقت جو شعلہ بیان لگتا ہے
وہ اپنے گھر میں بہت بے زبان لگتا ہے

کوئی تو آئینۂ شخصیت یقینی ہو
جسے بھی دیکھئے وہم و گمان لگتا ہے

کہیں بھی دور تلک سائباں نہیں ملتا
تمہارا شہر تو میرا مکان لگتا ہے

رہو سفر میں تو ہر گام پُل صراط ملے
جو گھر میں ٹھہرو تو اک امتحان لگتا ہے

رسولِ وقت یہی ہجرتوں کا موسم ہے
کہ اپنا گھر بھی پرایا مکان لگتا ہے

کل اس کو آئینہ دینے کی یہ سزا پائی
وہ آج مجھ سے بہت بدگمان لگتا ہے

تمام شہر کو مجھ سے ہی کیوں شکایت ہے
تمام شہر مرا خاندان لگتا ہے

کبھی کبھی تو کوئی شخص میری بستی میں
پرانے وقتوں کی اک داستان لگتا ہے

محمد احمد صدیقی
سول کورٹ کمپاؤنڈ — امروہہ

افسانہ

مظہر انصاری
محلہ گنگرہ کلاں شاہجہانپور
یوپی

بڑا آدمی

سوا پانچ بج گئے تھے۔ پانچ بجے میں نے دفتر چھوڑ دیا تھا میری سائیکل موضع نور پور کی طرف تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ نور پور شہر سے دس کلومیٹر جنوب کی سمت واقع ہے۔

میں ہمیشہ ہی پانچ بجے دفتر چھوڑ دیتا ہوں۔ کیونکہ جس سڑک سے گزر کر نور پور جاتا ہوں وہ جنگل کے درمیان سے ہو کر گزرتی ہے جنگل گنجان ہے اور اس میں چور لیٹرے چھپے رہتے ہیں۔ جو مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ لوٹ مار کا خوف مجھے ہمیشہ ہی پانچ بجے دفتر چھوڑنے کے لیے مجبور کرتا رہا ہے۔ نور پور میں میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ شہر میں ملازمت کرتا ہوں۔ میرے تین بچے ہیں۔ بیوی ہے کئی دوست بھی ہیں اور رشتہ دار بھی۔ جو لطف مجھے موضع نور پور میں ملتا ہے وہ شہر میں نہیں۔ شہر میں انسانی زندگی پر بناوٹ کے خول چڑھے رہتے ہیں

اب میری سائیکل جنگل کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ حد نظر تک مجھے سڑک ویران دکھائی دے رہی تھی۔ سورج کی زرد کرنیں درختوں کی بلند ٹہنیوں پر آخری ہچکیاں لے رہی تھیں۔ نومبر کی سرد ہوا ناگوار گزر رہی تھی۔ میں تیزی سے سائیکل چلا رہا تھا۔ تاکہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی نور پور پہنچ جاؤں۔

اچانک سڑک پر مجھے ایک عورت دکھائی دی، میلی سی چادر میں لپٹی لپٹائی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کے دیکھتی۔ ذرا رکتی کچھ سوچتی، پھر تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگتی جیسے کہیں سے چوری کر کے بھاگی ہو۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے نقوش اور چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی طاری تھی۔

جب میری سائیکل عورت کے قریب سے گزری تو اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، کچھ سوچا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔ رکنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کیونکہ سورج ڈوب رہا تھا۔ لیکن ضمیر نے مجھے اندر ہی اندر ملامت کی۔ ذہن نے کہا۔ عورت کی بات سن لے ممکن ہے اسے تیری مدد کی ضرورت ہو۔

میں نے سائیکل روک دی۔ عورت کے قریب پہنچا، وہ گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی اس نے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ کیا جنگل کے اس پار آبادی ہے "جی ہاں" کہہ کر میں نے عورت کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا اس کی آنکھوں میں ریاکاری یا مجرمانہ احساس کا فقدان تھا البتہ خوف کے سائے تھے۔ تاہم مجھے اس کے نیک چلن ہونے کا یقین نہ ہوا۔ دل کہہ رہا تھا۔ وہ لیٹروں کی جاسوس ہے یا پھر عصمت فروش عقل نے دل کی بات نہ مانی کیونکہ عورت کے چہرے پر معصومیت اور سادہ لوحی مسکرا رہی تھی ــ میں نے سائیکل آگے بڑھا دی۔ عورت نے ایک نظر پھر میرے چہرے پر ڈالی اور پوچھا "کیا وہاں مجھے پناہ مل سکتی ہے۔؟"

"مل سکتی ہے" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ کیونکہ میں عجلت میں تھا اور ڈر بھی لگ رہا تھا۔ اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ عجلت سے کام نہ لیجئے میری بات غور سے سن لیجئے میں مصیبت زدہ ہوں۔ سیلاب نے میرے قصبے کا نشیبی حصہ برباد کر دیا ہے۔ اسی حصہ میں میرا گھر تھا۔ شوہر دب کر مر گیا۔ میں جان بچا کر بھاگ آئی۔ تین چار دن سے ادھر ادھر ٹھوکریں کھا رہی ہوں

جہاں بھی جاتی ہوں لوگ میری عزت لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور جھوٹی ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں جاؤں، کس سے مدد چاہوں، کس کو ہمدرد سمجھوں، اور کس کو دشمن۔ یہ دنیا کتنی گھناؤنی ہوگئی ہے۔ ہر شخص کے بدن پر اجلے پن کی چاندنی مسکراتی ہے لیکن دل میں اندھیروں کے غار چھپے ہوتے ہیں۔"

میرا دل عورت کی باتوں سے کچھ پگھلا تاہم میں نے ایک بار پھر سوچا۔ کہیں دھوکہ تو نہیں کھا رہا ہوں۔ عورت مجھے کسی چال کا شکار تو نہیں بنا رہی ہے۔

میں نے اب ذرا نرم لہجے میں عورت سے پوچھا "کیا نام ہے آپ کا۔ کس جگہ رہتی ہیں؟"

"مجھے کلثوم کہتے ہیں۔ قصبہ جلال پور میں رہتی تھی۔ شوہر ضلع پریشد کے ایک اسکول میں پڑھاتا تھا۔ میں خود بھی پڑھی لکھی ہوں۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لیتے چلئے۔"

میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ ابھرا۔ لیکن فوراً ہی ختم ہوگیا۔ عقل نے مجھے مشورہ دیا کہ اکثر نیکیاں مصیبت بن جاتی ہیں ہمدردی کے جذبے کو دل سے نکال دے۔ گھر کی راہ لے۔ کہیں کسی آفت میں نہ پھنس جائے تو۔

میں سائیکل پر بیٹھا اور گھر کا راستہ لیا۔ اب درختوں کی پھنگیوں پر اندھیرا اتر آیا تھا۔ میں نے مڑ کر عورت کو دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی "آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کے لیئے میری بات مان لیجیے اور مجھے اپنے ساتھ لیتے چلیے، مہربانی ہوگی۔"

میں نے عورت کے التجائیہ جملوں کو نظر انداز کر دیا اور تیزی سے سائیکل چلا کر نور پور پہنچ گیا۔

صبح دفتر جا رہا تھا۔ پردھان کے دروازے پر بھیڑ اکٹھا تھی۔ میں نے سائیکل روکی، بھیڑ کے قریب پہنچا۔ پولیس انسپکٹر ساجد حسین بھیڑ کے درمیان کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں بائیں چار سپاہی کھڑے تھے۔ چاروں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔

ساجد حسین اپنے سامنے بیٹھے ہوئے پردھان سے کہہ رہا تھا "کل رات کی بات ہے۔ ایک نوجوان عورت راستے سے بھٹک کر نور پور کی طرف آ نکلی۔ اس کا نام کلثوم ہے۔ وہ پناہ کی تلاش میں تھی کافی اندھیرا ہوگیا تھا۔ ویران سڑک پر اسے غفور مل گیا اس نے کلثوم کے کانوں سے بندے نوچ لیے اور فرار ہوگیا اس کے ساتھ تین غنڈے اور بھی تھے۔ وہ کلثوم کو جنگل میں کھینچ لے گئے۔ باری باری سب نے کلثوم کی عصمت دری کی کلثوم تین مردوں کا تشدد برداشت نہ کر سکی، وہ بے ہوش ہوگئی رات کو پولیس پارٹی جب گشت پر ادھر سے گزری تو سڑک پر تین شخص بھاگے چلے جا رہے تھے پولیس پارٹی نے تینوں کو پکڑ لیا۔ ان سے رات میں سڑک پر بھاگنے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے اپنے آپ کو کسان بتایا۔ مزید یہ بھی کہا کہ انھوں نے اپنے کھیتوں میں یوکلپٹس کے درخت لگا رکھے ہیں جو کافی بڑے ہوگئے ہیں۔ چور رات میں ان کو کاٹ لیتے ہیں اور بیچ ڈالتے ہیں۔ وہ ان ہی لوگوں کو پکڑنے سڑک پر بھاگ رہے تھے۔ غنڈوں کی یہ بات انسپکٹر کو مطمئن نہ کر سکی پولیس ان کو تھانے لے گئی۔ وہاں ان پر سختی کی گئی۔ تب انھوں نے پولیس کو صحیح بات بتائی اور جرم کا اقرار کیا۔ پولیس پھر واپس سڑک پر آئی، جنگل میں کلثوم کو تلاش کیا۔ چند ہی منٹ میں کلثوم مل گئی۔ پولیس اسکو تھانے لے آئی۔ وہ بے ہوش تھی۔ جب ہوش میں آئی تو اس نے اپنے ساتھ ہوئے ظلم کی کہانی پولیس انسپکٹر کو سنائی۔ کلثوم کو ہاسپٹل بھیج دیا گیا ہے۔ غنڈوں نے تھانے میں اپنے نام اور پتے بتا دیئے تھے۔ یہ سب نور پور کے رہنے والے ہیں۔ آپ غفور کی گرفتاری میں میری مدد کیجیے۔ تاکہ کیس جلد از جلد عدالت کے سپرد کر دیا جائے اور غنڈوں کو کڑی سزا دلائی جا سکے۔" پردھان نے جواب دیا "آپ مطمئن رہیئے انسپکٹر صاحب غفور کو جلد از جلد آپ کے سپرد کر دیا جائے گا۔"

میرا دل دھڑک رہا تھا، تحت الشعور میں کلثوم کا معصوم چہرہ ابھر رہا تھا، ضمیر لعنت ملامت کر رہا تھا میں سوچ رہا تھا اگر کلثوم کی بروقت مدد کر دیتا اور اسے اپنے گھر لے آتا تو وہ عصمت دری سے بچ جاتی اس کے بندے بھی نہ چھینے جاتے۔ مجھے غفور پر غصہ آ رہا تھا۔ دفتر جانے میں دیر ہو رہی تھی

اس لیے فوراً سائیکل پر بیٹھا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ کلثوم کی آواز میرا پیچھا کر رہی تھی "آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کے لیے میری مدد کیجیے۔ مجھے اپنے ساتھ لیتے چلیے مہربانی ہوگی۔"

میں غفور کو بخوبی جانتا تھا۔ پڑوس ہی میں رہتا تھا۔ اس کیس سے پہلے اس کے متعلق کوئی شکایت نہیں سنی تھی۔ غنڈوں کی صحبت سے دور رہتا تھا۔ ہمیشہ سے نیک چلن تھا، طالب علمی کے زمانے میں، نورپور سے دس کلومیٹر دور، ایک قصبے کے جونیر ہائی اسکول میں پڑھنے جاتا تھا۔ اسکول کے ماسٹر اسے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تین سال پہلے اس نے ضلع کے ایک انٹرمیڈیٹ کالج سے ہائی اسکول کیا تھا۔

اس کی ماں نے بڑی تکلیفیں اٹھا کر اسے پرورش کیا تھا۔ کھاتے پیتے خاندانوں میں کام کر کے غفور کو تعلیم دلائی تھی۔ اس کا باپ ان دنوں اللہ کو پیارا ہوگیا تھا جب وہ چھ سال کا تھا اور اس کی بہن ناظمہ تین سال کی تھی۔ اس کی ماں اب بھی کام کرتی تھی۔ ناظمہ گاؤں کی عورتوں کے کپڑے سیتی اور خاندان کا پیٹ پالتی۔ غفور نے نوکری تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ رہزنی کرنے سے پہلے بھی وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔

اب ناظمہ کی عمر بیس سال ہو چکی تھی۔ جب بھی ناظمہ کے رشتہ کی بات کہیں سے شروع ہوتی تو جہیز کی سودے بازی پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ کئی برسوں سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ناظمہ اپنی ناداری کا شکار بن کر رہ جاتی تھی۔ راتوں کی تنہائی میں اس کے خیالات کے دریچے کھل جاتے۔ ان دریچوں میں سے ایک خوبصورت نوجوان کا جھلملاتا پیکر ابھر آتا۔ وہ سوچتی رہتی کہ وہ نوجوان جو اس کے خیالات میں ابھرتا ہے کب اسے مل سکے گا۔

چند ہی دنوں میں پردھان نے غفور کو تھانہ میں حاضر کرا دیا اس نے جرم کا اقرار کر لیا۔ پولیس نے اس کو جیل بھیج دیا۔ چند دنوں کے بعد اس کی ماں نے ضمانت کرالی اور وہ گھر آگیا۔

اس دن شام کا وقت تھا۔ میں شہر سے واپس آرہا تھا کہ غفور مل گیا۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے گردن جھکالی، میں اس کے قریب جا پہنچا۔ اس نے گردن اٹھائی۔ مجھے سلام کیا۔ میں نے بغور اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی اور ندامت کے نقوش صاف دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے پر تفکر اور ذہنی پریشانی جھلک رہی تھی۔ میں نے تلخ لہجے میں اس سے کہا "تم پڑھے لکھے ہو کر بھی غنڈہ گردی کرنے لگے اور تم نے ایک کمزور عورت کو لوٹا تم کو ندی یا کنوئیں میں ڈوب مرنا چاہیے تھا۔"

غفور نے گردن جھکالی۔ کہنے لگا "سچ مچ میں نے بڑا خراب کام کیا ہے۔ اب پچھتا رہا ہوں۔ مظلوم کلثوم کی چیخیں کانوں میں گونجتی رہتی ہیں۔ برا ہو اس وقت کا جب میں نے کلثوم کے بندے کانوں سے نوچے تھے۔"

"تمہارے ذہن میں رہزنی کا خیال کیوں پیدا ہوا تھا؟" میں نے اس سے پوچھا۔ دراصل میں اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے ناظمہ کے جہیز کے لیے رقم اکٹھا کرنے کا پلان بنایا اس منصوبے کے سلسلے میں، میں نے یہ پہلا جرم کیا۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ناظمہ کنواری بیٹھی ہے۔ غربت کی وجہ سے اس کی شادی رکی ہوئی ہے۔ جہیز کے لیے میں نے کھیتوں میں مزدوری کی لیکن کبھی دس روپے بھی نہ بچا سکا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں مزدوری کر کے ناظمہ کا جہیز تیار نہیں کر سکوں گا، مجھے ناجائز طریقے سے روپیہ حاصل کرنا ہوگا۔ چنانچہ میں نے ناجائز طریقے سے روپیہ حاصل کرنے کا پلان بنا لیا اور کسی اچھے موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ جس دن میں نے کلثوم کے بندے چھینے اس دن پانچ بجے شام ایک غنڈے نے مجھے اطلاع دی کہ ایک نوجوان عورت نورپور کی طرف آرہی ہے۔ وہ سونے کے بندے پہنے ہے۔ میں تین غنڈوں کے ساتھ سڑک پر جا پہنچا اور بلند جھاڑیوں کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا جب عورت نورپور کے قریب سڑک پر پہنچی تو ہر چیز اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔ ٹارچ کی روشنی سے میں نے کلثوم کے چہرے کو دیکھا وہ سونے کے بندے کانوں میں پہنے تھی۔ پلان کے مطابق میں نے

کلثوم کے کانوں سے بندے نوچ لیے اور نور پور کی طرف بھاگنے لگا
میرے فرار کے بعد تینوں غنڈوں کی نیت خراب ہوگئی۔ انھوں نے
کلثوم کی عصمت دری کی۔ میں نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔ اگر میں وہاں
موجود ہوتا تو غنڈوں کو کلثوم کی عصمت دری نہ کرنے دیتا۔ آپ
میری باتوں کا بھروسہ نہ کیجیے۔ کلثوم سے سب کچھ پوچھ لیجیے سچائی
ظاہر ہوجائے گی۔" کچھ دیر غفور خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا "میں جانتا
ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مجھے جرم کا احساس ہی
نہیں، اقرار بھی ہے۔ بلاشبہ میں گرا ہوا انسان ہوں۔ ذلیل اور کم تر ہوں
لیکن ....." لیکن کیا؟"

لیکن ہمارا سماج بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ایسی تباہ کن رسمیں اپنا لیتا ہے
جن سے غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ملک بدنام ہوتا ہے۔ جہیز بھی ایک
ایسی تباہ کن رسم ہے۔ یہ ہندوستانی عورت کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس
کے تعلق سے ہندوستان میں ہزاروں اخلاقی جرائم ہو رہے ہیں۔ ان
پر ہمارا سماج غور نہیں کر رہا ہے۔ دولت مند خاندان اپنی لڑکیوں کو
ہزاروں بلکہ لاکھوں کا جہیز دے رہے ہیں۔ غریب خاندانوں کی
لڑکیاں گھروں میں بیٹھی قسمت کو رو رہی ہیں۔ وہ یا تو کسی نوجوان
کے ساتھ فرار ہوجاتی ہیں یا ناجائز طریقے اختیار کرتی ہیں۔ وہ
خاموش ہوگیا۔ میں نے کہا "رہزنی کرنے کے بعد اب تم سماج
سدھارک بھی بن گئے ہو۔ میری سمجھ میں تو تمہاری کوئی بات بھی غور
کے لائق نہیں ہے۔ تم نے ایک کمزور عورت کو لوٹا ہے۔ تمہیں
کسی گہری ندی یا گہرے کنوئیں میں چھلانگ لگا دینا چاہیئے۔" میں
جذبات کی رو میں کہتا چلا گیا۔ پھر آگے بڑھ گیا کچھ دور چلنے کے
بعد مجھے اپنے جملوں پر افسوس ہوا۔ میں نے سوچا۔ غفور لاکھ مجرم سہی،
لیکن اس نے ہندوستانی سماج کی بدلتی ہوئی قدروں کے بارے
میں کوئی غلط بات نہیں کی۔ جہیز کی لعنت سچ مچ ہندوستان کے
لیے لعنت بنی ہوئی ہے۔ اس تباہ کن رسم کو روکنے کے لیے
قانون بھی بنایا گیا ہے۔ لیکن اس پر عمل کب ہوگا؟ کب جہیز دینے
اور لینے والے سزا پا سکیں گے۔ ؟ یہ کون جانے؟......"
میں آگے بڑھ گیا۔ غفور کی باتیں میرے ذہن میں مدوجزر کی سی
کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔

تیسرے دن شام کے وقت جب میں دفتر سے نور پور
آیا۔ شام ہوچکی تھی۔ کافی تھک گیا تھا۔ سائیکل چلانا دشوار
ہو رہا تھا۔ بمشکل مکان کے قریب پہنچا۔ گلی میں بھیڑ اکٹھا تھی
میں نے سائیکل کھڑی کی اور بھیڑ کے اندر پہنچا بھیڑ کے اندر غفور
کی ماں بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ غفور کھاٹ پر پڑا تھا۔
اس کے سرہانے ایک اسٹول رکھا ہوا تھا۔ اس پر گیس بتی جل رہی
تھی۔ روشنی میں غفور کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی دکھائی دے رہی
تھیں۔ چہرے پر زخموں کے گہرے نشان تھے۔ ناک کا گوشت
بھی کٹا پھٹا تھا۔ ہاتھ پیر اکڑے اکڑے سے دکھائی دے رہے
تھے۔ روتے روتے غفور کی ماں بے ہوش ہوگئی۔ میرا دل دھڑکنے
لگا۔ کیونکہ زندگی میں اتنا دردناک منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ میں فوراً
بھیڑ کے باہر نکل آیا۔ باہر میرے دوست ظفر صاحب مل گئے
میں نے ان سے پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے ظفر صاحب؟"

ظفر صاحب نے جواب دیا "غفور نے آج اپنے رخساروں
پر چاقو کے کئی وار کیے جس کے نتیجے میں اس کا چہرہ زخمی ہوگیا۔"
یہ حرکت اس نے ندی کنارے کی وہاں اس وقت کوئی موجود
نہیں تھا جو اسے روکتا۔ دس سال کا ایک لڑکا وہاں اپنے
جانور چرا رہا تھا۔ اس نے شور مچایا، تو کچھ لوگ اپنے جھونپڑوں
سے باہر نکلے اور غفور کے پاس پہنچے۔ غفور بے ہوش ہوگیا تھا
اب اسے لوگ کھاٹ پر ڈال کر لائے ہیں۔ اسے جب ہوش
آتا ہے تو وہ بڑبڑانے لگتا ہے۔ کہتا ہے "میں ایک برا آدمی
ہوں، برے آدمی کے چہرے پر کوئی بھیانک نشان ہونا چاہیئے
تاکہ دنیا کے لوگ اسے پہچان سکیں۔"

اسی دن غفور کو ڈاکٹر کو دکھایا گیا پندرہ دن میں غفور
کے چہرے کے زخم ٹھیک ہوگئے۔ لیکن زخموں کے بھیانک نشان
باقی رہ گئے۔ جن کے باعث وہ انتہائی بدصورت دکھائی دینے
لگا۔ اسے اندھیرے میں جو دیکھ لیتا ڈر جاتا۔ بچے اسے دیکھتے
ہی اپنے گھروں میں گھس جاتے اور بھوت بھوت کہہ کر شور مچاتے

غفور پر مقدمہ چلا پہلی پیشی پر میں بھی عدالت گیا۔ کلثوم ٹھیک ہو چکی تھی۔ میں اسے اپنی بیوی کی ایما پر اپنے گھر لے آیا تھا۔ پہلی پیشی میں کلثوم میرے ساتھ تھی۔ عدالت کی کارروائی شروع ہوتے ہی غفور نے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس نے عدالت سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ اسے کڑی سزا دے۔ کڑی سزا کو وہ اپنی خوش نصیبی سمجھے گا۔

میں نے غفور کے چہرے کو حیران کن نظروں سے دیکھا وہ خوش تھا۔ لیکن کلثوم اداس تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد عدالت نے اپنی کارروائی ختم کر دی میں کلثوم کے ساتھ گھر واپس چلا آیا کلثوم گھر آنے کے بعد بھی اداس تھی لیکن میں خوش تھا۔ کیونکہ میں نے زندگی میں غفور جیسا پہلا مجرم دیکھا تھا جس نے انتہائی ایمانداری کے ساتھ جرم کا اقرار کیا۔ اس کے اس اقرار نے میرے دل میں اس کے لیے بے پناہ عزت پیدا کی جسے میں دل میں چھپائے رہا۔

عدالت نے غفور کو دو سال کی سخت سزا سنا دی اور غفور جیل بھیج دیا گیا۔ اس کے ساتھی ملزم بھی جیل بھیج دیئے گئے۔

ایک دن کلثوم نے بڑے ادب کے ساتھ مجھ سے کہا "بھائی جان میں غفور سے ملاقات کرنے جیل جانا چاہتی ہوں۔ آپ کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کروں گی۔" میں نے حیران کن نظروں سے کلثوم کو دیکھا اس لیے کہ وہ اپنے دشمن سے ملنے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی شاید سوچ رہی تھی۔ اگر اسے غفور سے ملنے کی اجازت نہ ملی تو دل شکستہ ہو جائے گی۔

میں کچھ دیر تک اس کے جملے کے بارے میں غور کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ اسے غفور سے ملاقات کرنے کی اجازت دوں یا نہ دوں کافی غور و خوض کے بعد میں نے کلثوم سے کہا "میں تم کو جیل جانے اور غفور سے ملنے کی اجازت دیتا ہوں، لیکن میں تمہارے ساتھ نہ جا سکوں گا ___ کیونکہ غفور نے تم کو لوٹا ہے ___ تم اکیلی چلی جانا"

اسی دن کلثوم غفور سے ملنے جیل گئی۔ شام کو جب میں دفتر سے واپس آیا تو میں نے کلثوم کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اور ایک تیز نظر اس کے چہرے پر ڈالی، یہ جاننے کے لیے کہ وہ خوش ہے یا غمگین۔ اور یہ کہ غفور کی ملاقات نے اس کے ذہن پر کیا اثر ڈالا ہے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ خوش دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا "بھئی غفور سے کیا کیا باتیں ہوئیں ذرا مجھے بھی تو سناؤ" کلثوم کہنے لگی "ان سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے مجھ سے اپنی غلطی کی معافی بھی مانگی ___ ایک بات انھوں نے بڑی لاجواب کہی۔ وہ یہ کہ انھوں نے اپنے چہرے پر اس لیے چاقو مارے تھے کہ اس پر گہرے زخم پیدا ہو جائیں۔ عدالت کی سزا سے پہلے وہ خود کو اپنے ہاتھ سے سزا دے لیں۔ خودکشی کر کے وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ مرنے سے ساری کہانی ختم ہو جاتی ___ انھوں نے اپنے چہرے پر اس لیے بھی زخم پیدا کیے کہ لوگ جب بھی ان کو دیکھیں نفرت سے منھ پھیر لیں اور ان کو اپنا جرم یاد آ جائے۔ یہ بھی یاد آ جائے کہ انھوں نے ایک کمزور عورت کو لوٹ کر انسانیت کی توہین کی ہے۔"

کلثوم کی یہ باتیں میرے لیے غور و فکر کا سبب بن گئیں۔ کئی دن تک میں ان پر غور و خوض کرتا رہا۔ ایک روز کلثوم نے مجھ سے ایک بالکل انوکھی بات کہی "بھائی جان، میرے مرحوم شوہر کی کچھ زمین قصبے میں پڑی ہے۔ میں اسے بیچ کر ناظمہ کی شادی کسی اچھے لڑکے سے کر دینا چاہتی ہوں۔ لیکن آپ کی رائے کے بغیر یہ کام نہیں کروں گی آپ اپنی رائے کا اظہار کرنے کی زحمت کیجیے۔"

مجھ پر تو حیرت و استعجاب کا پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا میری نظریں کلثوم کے چہرے پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ ذہن میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ جب میرے حیرت و استعجاب کا طلسم ٹوٹا تو میں نے اس سے پوچھا "ناظمہ کی شادی اور زمین فروخت کرنے کا مشورہ تم کو غفور نے دیا ہوگا ___ ہے نا یہی بات؟"

کلثوم نے جواب دیا "بھائی جان غفور صاحب نے مجھ سے آج تک ناظمہ کی شادی کی بات نہیں کی۔ ان کو تو یہ بھی نہیں

معلوم کہ قصبے میں میری کچھ زمین ہے"۔

میں نے پھر ایک تیز نظر کلثوم کے چہرے پر ڈالی اور کہا "میں تم کو ناظمہ کی شادی کرنے کی اجازت دیتا ہوں"۔

یکبارگی کلثوم کے چہرے پر خوشی کی چاندنی نکھر آئی اور بات ختم ہوگئی۔

ایک مہینے کے اندر ہی کلثوم نے اپنی زمین ایک کسان کے ہاتھ فروخت کر دی اور ناظمہ کی شادی ایک مزدور خاندان کے خوبصورت لڑکے سے کر دی۔ یہ لڑکا نورپور ہی میں رہتا تھا۔ اور اچھا ٹیلر ماسٹر تھا۔

دو سال گزر گئے — غفور سزا کاٹ کر نورپور آگیا — اپنے چہرے پر زخموں کے مکروہ نشان لیے ہوئے۔ جس دن وہ نورپور پہنچا — اس دن کلثوم بہت خوش تھی۔ کسی وقت میرے بچوں کو چھیڑتی، کسی وقت میری بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ اتوار کا دن تھا۔ میں تمام دن کلثوم کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا اور سوچتا رہا۔ آج وہ اتنی خوش کیوں ہے۔ غور کرنے کے باوجود اس کی خوشی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

اسی دن شام کو جب میں لکھنے کے لیے میز کے گرد کرسی پر بیٹھا تو میری بیوی نے قلم میرے ہاتھ سے لے لیا۔ پیار بھری ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی اور بولی "ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ اجازت ہے؟"

میں نے مذاق کے لہجے میں کہا "فرمائیے، بندہ ہمہ تن گوش ہے۔"

بیوی ہنس پڑی اور بولی "آپ کو کچھ خبر بھی ہے کلثوم غفور سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے بیوی سے کہا "کلثوم پاگل تو نہیں ہوگئی ہے۔ اتنے برے آدمی سے شادی کرنا چاہتی ہے جو مجرم ہے اور جس کے چہرے پر زخموں کے اتنے بھیانک نشان موجود ہیں کہ جن کو دیکھنے سے ڈر لگتا ہے۔ آپ فوراً کلثوم کو میرے پاس لے آئیں۔ میں اسے سمجھاؤں گا کہ وہ اپنی زندگی برباد نہ کرے"۔

میری بیوی فوراً لوٹ گئی۔ میں کرسی سے پیٹھ ٹکا کر نیم دراز ہوگیا اور کلثوم کا انتظار کرنے لگا۔ چند ہی منٹ کے بعد کلثوم میرے سامنے کھڑی تھی۔ اداس اداس سی، خیالات میں کھوئی ہوئی، میری بیوی کلثوم کے پیچھے کھڑی تھی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے ہوئے۔

میں نے تلخ لہجے میں کلثوم سے پوچھا "کیا سچ ہے کہ تم غفور سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

کلثوم نے گردن جھکا لی، چند لمحے کچھ سوچتی رہی، پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی "بھائی جان چہرے کے زخموں سے آدمی کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آدمی کو اندر سے خوبصورت اور بلند کردار ہونا چاہیے۔ غفور نے مجبوراً ایک جرم کیا، جرم کا ایمانداری سے اقرار بھی کر لیا اور عدالت کی سزا سے پہلے اپنے آپ کو خود سزا بھی دے ڈالی۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ دنیا کے ہر انسان کو اپنے اندر چھپے ہوئے زخموں کے بھیانک نشانات دیکھنا چاہیں۔ گستاخی معاف ہو۔ آپ کو اپنے اندر بھی جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں کوئی ایسا بدنما داغ تو نہیں ہے جو انسانیت کشی کی نشاندہی کرتا ہو۔ اگر آپ میری عصمت دری ہونے سے پہلے میری مدد کر دیتے تو آپ کا کیا بگڑ جاتا۔ بخدا یہ کہانی ہی جنم نہ لیتی۔ غفور صاحب کے چہرے کے زخموں کے نشانات پر سچائی کی چھاپ موجود ہے، ان پر انسانیت کا اجالا مسکراتا ہے۔ میں ان سے شادی کروں گی"۔

میرے اندر غصہ کا شعلہ سا لپکا، کلثوم نے اب گردن جھکا لی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ "ایک چھوٹی بہن اپنے بڑے بھائی سے ایک بھیانک چہرے والا شریک زندگی ہی تو مانگ رہی ہے، ہیرے جواہرات تو نہیں طلب کر رہی ہے؟"

میری بیوی مسکراتی ہوئی میرے قریب آئی، میز پر ذرا جھکی میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالیں اور کہا "آپ نے اسے چھوٹی بہن تسلیم کیا ہے، آپ ایک بڑے بھائی کا فرض ادا کیجیے۔ اور اسے غفور سے شادی کرنے کی اجازت دے دیجیے۔ یہ آپ سے میری درخواست ہے"۔

یکبارگی میرے غصہ پر پیار کی شبنم گر پڑی۔ میں فوراً سنجیدہ ہوگیا اور پیار بھرے لہجے میں کلثوم سے کہا "میرے قریب آؤ کلثوم؟"

کلثوم میرے قریب آگئی۔ میں نے شفقت سے اس کے

سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا میری اجازت ہے، خدا کرے تم دونوں زندگی بھر خوش رہو۔"

کلثوم کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے، میری بیوی کے چہرے پر بھی خوشی کی کہکشاں ابھر آئی تھی ____ اور میرے تصوّر میں وہ خوبصورت چہرے ابھر رہے تھے جن پر انسانیت کشی کے گھناؤنے نشانات دکھائی نہیں دیتے ____ ان چہروں میں میرا اپنا چہرہ بھی شامل تھا!

کیف صدّیقی سلطان پوری

صدائے سکوت

بیکراں نیلا سمندر
اس کی آوارہ سی لہروں کو کبھی دیکھو
اور سوچو
چیختے پانی کا جسم،
جھاگ کی صورت میں اپنے کرب کا اظہار کرتا
ساحلوں اور ساحلوں سے دور گزرے حادثوں کا
مرثیہ دُہرا رہا ہے

جاگتا بوڑھا سمندر سو نہیں پاتا
نیند آنے ہی کو ہوتی ہے کہ
کوئی حادثہ
کوئی تغیّر
انقلاب،
یا کوئی خونریز جنگ
یا کسی مجذوب کی ضربِ صدا سے چونک اٹھتا ہے
پھر وہی بیداریوں کا سلسلہ
اور تجربے

●●

اقبال اور علامت آفرینی۔ صفحہ ۱۱ کا بقیہ

حواشی

[1] اقبال اور درگا سہائے سرور۔ مورخہ یکم اگست شمارہ ۲۹ ہماری زبان نوشتہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد :

[2] لسانیات میں علامت کی تعریف یہ ہے " علامت ایک ایسا لفظ یا اظہار ہے جو کسی شئے کا نمائندہ ہونے کے باعث ذہن کو اسی شئے پر مرتکز کر دے۔

اس طرح علامت ایک ہی مستقل شئے کی نمائندہ ہوتی ہے۔ جیسے موت کے خطرے کی علامت سرخ کھوپڑی اور استخوانی چلیپا ____ اس میں نہ زبان کی قید ہے نہ ملک اور نسل و قوم کی۔ مضمر علامت یا POTENTIAL SYMBOL کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے " مضمر علامت ایک ایسا لفظ یا اظہار ہے جو وقتِ واحد میں اس خاص چیز کی نمائندگی کرے جس کا ذکر مطلوب ہے لیکن یہ چیز وقت اور ضرورت کے لحاظ سے تغیر پذیر ہو "

مثلاً ✓ یا TICK کا نشان ایک علامت ہے جو کسی چیز کے صحیح اور درست ہونے کی علامت ہی رہتا ہے

اس کے برخلاف X چلیپا ایک مضمر علامت سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سوال کے جواب کی جانچ کی صورت میں اس کے غیر صحیح ہونے کا نشان بن جاتا ہے تو موٹر ڈرائیونگ کے رہنما اصولوں میں راستوں کی تشریح کے ضمن میں یہ ایک چوراہے کی نمائندگی کرنے لگتا ہے۔

مضمر علامت اقبال کا ایک بڑا قیمتی تحفہ ہے جو انھوں نے اردو شاعری کو عطا کیا ہے۔ اس کے باعث " شرار بولہبی " کی ترکیب میں شرر گمراہی، عناد اور نقصان رسانی کی علامت بن جاتا ہے۔

جبکہ " شرارِ افلاطون " کی ترکیب میں شعلہ سے جائز طور پر منسلک ہونے کی وجہ سے یہاں شرر علم و حکمت کا نشان علامت بن جاتا ہے۔

تو " شررِ تیشہ " کی ترکیب میں یہ محنت کی علامت بن جاتا ہے اور آخرکار " کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں " میں یہی شرر انا اور " خودی " کا نشان بن جاتا ہے

اقبال کی علامت بینی اور علامت آفرینی کی یہ صلاحیت ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں بھی نمایاں تھی جس نے ان سے کہلوایا تھا ؎

خنجرِ ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

ڈاکٹر سلمان عباسی

غزل

اِک مرا دل اور میں اک آپ کا دل اور آپ
ایک مشکل اور میں اک اور مشکل اور آپ

اس طرف موجیں، تلاطم، شورِ طوفاں اور میں
اس طرف اٹکھیلیاں ہیں، ناؤ، ساحل اور آپ

میری منزل ماورائے گردِ رہ کچھ بھی نہیں
آپ کا زادِ سفر منزل ہی منزل اور آپ

منصفی نادم سہی پر قتل کی تفتیش پر
آئینہ ہے درمیاں قاتل مقابل اور آپ

ہر طرف دنیا میں ہیں قاتل ہی قاتل اور میں
ہر طرف دنیا میں ہیں قاتل ہی قاتل اور آپ

رشید قریشی

غزل

اب اور درد کے ماروں کو بے قرار نہ کر
لہو لہان پرندوں کا اب شکار نہ کر

ہمارے شہر میں پتھر کے لوگ رہتے ہیں
ہمارے شہر میں شیشے کا کاروبار نہ کر

ہمارے عہد کی پہچان بے وفائی ہے
ہمارے عہد کے انساں کا اعتبار نہ کر

پکارتا ہے پہاڑوں کا سلسلہ تجھ کو
"جو تجھ کو چھوڑ گیا اس کا انتظار نہ کر"

عمل کا دنیا میں ردِ عمل بھی ہوتا ہے
خود اپنی ذات کا اب اور کاروبار نہ کر

رشید آج کی دنیا عجیب دنیا ہے
کسی سے آج نیا رشتہ استوار نہ کر

سلطان سرور

غزل

سلوکِ دل شکنی یارِ خوش دیار نہ کر
مری قبائے صداقت کو تار تار نہ کر

کہاں پہ صبح ہوئی اور کہاں پہ شب گذری
سفر طویل ہے حالات کا شمار نہ کر

غموں کی دھوپ نے آنکھیں بھی خشک کر دی ہیں
اب آنسوؤں کی گواہی کا انتظار نہ کر

ہزار طرح کے چہرے ملیں گے رستے میں
جدائیوں کے گھنے جنگلوں کو پار نہ کر

علامتوں کی فضائیں بدلتی رہتی ہیں
بڑھا کے دستِ طلب بیعتِ بہار نہ کر

سرورؔ نذرِ رگِ جاں رہا جو اس کے لیے
اب اتنی تلخ کلامی بھی اختیار نہ کر

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے
دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب "اتر پردیش کے لوک گیت"

مصنف: اظہر علی فاروقی ۔ قیمت انتیس روپے پچیس پیسے
ملنے کا پتہ: ڈائرکٹر فار پروموشن آف اردو، ویسٹ بلاک -۸
آر کے پورم، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف اظہر علی فاروقی تھے جو گذشتہ سال انتقال کر گئے لیکن ان کی یہ کتاب ان کے نام کو زندہ رکھے گی۔ اس کے ذریعہ انھوں نے اردو ادب کی ایک بہت بڑی کمی پوری کر دی ہے۔

اس کتاب میں جو چار حصوں پر مشتمل ہے، لوک گیت اور شاعری، لوک گیت کی زبان، لوک گیت اور شہری گیت، لوک گیت کے موضوع اور کرداروں مثلاً ساس اور بہو، نند اور بھوجائی، جٹھانی اور دیورانی، دیور اور بھوجائی کی توضیح کی گئی ہے۔ لوک گیت کی اہمیت، جغرافیائی ماحول، روہیلی، قنوجی، اودھی، گوکل اودھی، بندیلی اور سرحدی بھوجپوری کے مختلف علاقوں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ تقریبات میں گائے جانے والے گیتوں کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب ہمارے ثقافتی اور تہذیبی سرمایے کی محافظ ہے۔ گیٹ اپ، کاغذ اور طباعت عمدہ ہے۔

ضخامت کے پیش نظر قیمت مناسب ہے۔

——— دیا شنکر

نام کتاب: "ننھی منی باتیں" (نظمیں۔ بچوں کے لیے)

شاعر: حیدر بیابانی۔ قیمت: ۶ روپے
ملنے کا پتہ: حیدر بیابانی، اچل پور ضلع ارڈلی (مہاراشٹر)

بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے قوتِ مشاہدہ اور بچوں کی نفسیات کا عرفان ناگزیر ہے۔ زبان و بیان دونوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بچوں سے ان کی سطح پر اتر کر بات کرنا ہوتی ہے۔ اگر بچوں سے بڑے بوڑھوں کے لہجہ میں باتیں کی جائیں تو وہ ان کے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ چنانچہ زبان آسان ہو، خیالات سلجھے ہوئے ہوں اور نہایت سلیس اور صاف طریقہ سے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کیے جائیں۔ پھر آج کے بچے گذشتہ عہد کے بچوں سے بہت مختلف ہیں۔ آج ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما وغیرہ نے صلاحیتوں کو نہ صرف اجاگر کیا ہے بلکہ ان کو وسعت بھی دی ہے۔

بڑی مسرت کی بات ہے کہ حیدر بیابانی نے اس رمز کو سمجھا ہے چنانچہ یہ نظمیں بچوں کی نفسیات کے بغور مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہیں۔ زبان بھی گنگا جمنی ہے اور اردو ہندی کے خوش گوار امتزاج کا نمونہ ہے۔

مجموعی طور پر یہ مجموعہ بچوں کے ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔

——— مُعِینُ الدّین حَسن عَلوی کاکوروی

نام کتاب: "گوکھرو کے پھول" (شعری مجموعہ)

شاعر: ظفر گورکھپوری ۔ قیمت: تیس روپے
ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، علی گڑھ، بمبئی
نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ
رچنا پبلی کیشنز، ایف ۳/۸ نیو میونسپل کالونی، دیونار بمبئی ۴۳

ادھر غزل کی جو بازیافت ہوئی ہے اس نے پھر دنیائے ادب کو جتلا دیا ہے کہ وہ نیم وحشی صنفِ سخن نہیں بلکہ اردو شاعری کی

آبرو ہے۔ وہ غزل جو یگانہ کے بعد ترقی پسند تحریک کی بھول بھلیّوں (تحریک میں غزل کی مخالفت کی طرف اشارہ ہے) میں اپنا راستہ ڈھونڈتی رہی۔ آخرکار ان راستوں پر چل پڑی جو بہت دن سے آنکھیں بچھائے اس کے منتظر تھے۔ اس نے ان تمام علامات اور استعاروں کو جو استعمال ہوتے ہوتے اپنی توانائی کھو چکے تھے، کنارہ کشی اختیار کر کے اور دوسری علامات اور استعاروں کو نئے مفاہیم اور نئے تناظر میں نئی شناخت کے ساتھ اس لشکر کی طرح تیار کیا کہ جس کے سپاہی تو وہی ہوں مگر ہتھیار بدل گئے ہوں۔ جدید غزل کی توانائی، تازگی اور علائم اس بات کے شاہد ہیں کہ اس غزل سے اس غزل کا رشتہ تو ضرور ہے، دونوں کی جڑیں بھی ایک ہیں، لیکن جدید غزل اپنے لہجہ اور اسلوب کی وجہ سے گذشتہ غزل سے مختلف ہے۔ نئی غزل اپنے آپ میں اپنے عہد کی تاریخ بھی ہے اور کہانی بھی۔ یہ تو صرف برتنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اسے تاریخ بنانا چاہتا ہے یا افسانہ یا دونوں کے درمیان کوئی ایسا پُل صراط تعمیر کرنا چاہتا ہے جو اس کی اپنی غزل کی شناخت ہو۔

ظفر گورکھپوری بھی انھیں شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کو اپنے عہد کی تاریخ بھی بنایا ہے اور کہانی بھی۔ وہ اپنے عہد کے فرد اور معاشرے کی سچی داستان بھی شعروں میں اُجاگر کرتے ہیں، اور وہ تاریخ بھی جس میں ہمارا عہد سانس لے رہا ہے۔

اسکائی سکریپروں کے جنگلوں کے بیچ کُکُرمتوں کی طرح پھیلی ہوئی جھونپڑ پٹیوں میں رہنے والا یا فٹ پاتھ پر خود کو اوڑھ کر سونے والا فرد بمبئی کی مہانگری میں کون ہے، اس کی شناخت کیا ہے؟ یہی ظفر گورکھپوری کی شاعری کا سب سے بڑا سچ ہے دُور دراز کے گاؤں اور چھوٹے چھوٹے قصبوں سے آنے والے خوابوں کا پشتارہ اس مہانگری میں کہاں کھو دیتے ہیں، یہ تو ان کو خود پتہ نہیں، لیکن ان خوابوں کو ریزہ ریزہ چننے کے لیے وہ چلتے چلتے اُن اَن دیکھے راستوں پر نکل پڑتے ہیں کہ جہاں ایڑیاں گھس جاتی ہیں اور لہولہان گوکھرو کے پھول ہر پیر کا مقدر بن جاتے ہیں، ان کا سفر

بہت طویل ہے سوچو تو مختصر بھی ہے
رگِ گلاب سے تلوار تک سفر میرا

اور ان کے المیہ کی شناخت

شناخت نام ہے شاید اسی اذیت کا
کہ پانیوں میں رہو، رنگ بھی جُدا رکھو

تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے لے کر بڑے سے بڑے غم تک تمام عمر اس زندگی کو جھیلتے رہتے ہیں جس کو جھیلنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ آسرا ان کو تمام عمر رہتا ہے ؎

زندگی ہے میری سناٹے کا پیڑ
چہچہاتی کوئی چڑیا بھیج دے

اس انحطاط پذیر دور میں جب بڑی شاعری اُردو میں ناپید ہو چکی ہے یہی کیا کم ہے کہ ظفر گورکھپوری جیسے کچھ لوگ اچھی شاعری کر رہے ہیں۔ اُردو شاعری میں جہاں لوگ صرف ایک شعر سے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کر چکے ہوں ظفر گورکھپوری یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ انھیں ہم ایک اچھا اور اہم شاعر سمجھیں۔

ہم آپ تو سائے ہیں جو مٹنے سے بچے ہیں
سنتے ہیں یہ دنیا کبھی آباد بہت تھی

کس حال میں ہے شہر یہ سوچیں گے پھر کبھی
پہلے ذرا پڑوس کا گھر دیکھتے چلیں

گھر کو پہنچے تھے ظفر صاحب کہ زخمی ہو گئے
منتظر آنکھوں نے مارا کھینچ کر ایسا سوال

سالم تھا اپنے گاؤں کی کچی سڑک پہ میں
ٹکڑوں میں کس نے بانٹ دیا بمبئی سے پوچھ

مجھے بستی کے سناٹے میں اکثر یاد آتا ہے
وہ بوڑھا شخص جو افواہ پھیلانے میں ماہر تھا

وقت رستی، آدمی نٹ، عمر چوراہا ظفر
بس تماشہ دیکھ، ورنہ خوار ہو کر آئے گا

——— وقار ناصری

نام کتاب: "خطامعات"
شاعر: شاداں بدایونی، قیمت: بیس روپے
ملنے کا پتہ: دفتر ہماری آواز شکیل منزل۔ بدایوں

احول اور وقت کے ساتھ ساتھ شاعری کا مزاج، انداز، ہئیت اور شکل بدلتی رہتی ہے۔ طویل نظمیں خواہ وہ مرثیہ، مثنوی یا قصیدہ ہوں یا فردوسی کا شاہنامہ، اقبال کا شکوہ، حالی کا مسدس سردار جعفری کا نئی دنیا کو سلام اب ہمارے ادبی افق کا پس منظر بن گئی ہیں۔ جدید تکنیکی دور کی گرفت میں آنے سے ہمارے قدم آواز سے آگے جا رہے ہیں۔ اب لمحوں کی قیمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ عنقریب ایک جملے کے افسانے اور ایک مصرعے کی نظمیں تخلیق ہوا کریں گی۔ لیکن شاداں صاحب نے، جنھوں نے بدایوں کے ایک تعلیم یافتہ خاندان اور شاعرانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں اور بیک وقت حافظ قرآن، صحافی، مہتمم اور شاعر ہیں، اپنی نظمیں عنوان بہ عنوان چار مصرعوں میں کہی ہیں۔ میری مراد ان کے قطعات سے ہے جو ان کی کتاب "خطامعات" کی زینت ہیں۔

زندگی کے رنگارنگ واقعات، حکایات، حادثات، سانحات اور مشاہدات کو ان قطعات میں سمو کر اتنے اختصار سے اشارتاً، کنایتاً یا طنزاً بیان کر دینا شاعر کی فن کارانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ شاداں صاحب ایک دوربین نظر رکھتے ہیں، لیکن وہ ایک دور کے تماشائی نہیں ہیں، انسانوں کے کرب، درد، تڑپ، کسک، چوٹ اور زخم کا انھیں شدید احساس ہے۔ ان کے سامنے ایک پراگندہ سماج ہے منتشر اخلاقی قدریں، دور حاضر کی کثافتیں اور پنہاں چہروں والے افراد ہیں۔ وہ ظالم اور مظلوم دونوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ پرچھائیوں کے پیچھے نہیں دوڑتے، یا صرف تصویر کشی کر کے ان کی شناخت نہیں بتاتے وہ ان کے کرتوت طشت از بام کرنے پر بھی اکتفا نہیں کرتے بلکہ لفظ و بیان سے انھیں زخمی کر دینا چاہتے ہیں چاہے وہ جناب شیخ ہوں، سیٹھ جی ہوں، ڈاکو ہوں یا سپاہی بادشاہ ہوں یا فقیر، رہزن ہوں یا رہبر، ووٹر ہوں یا منسٹر وہ رشتہ داروں، بیگم، ساس، بہو، دوستوں، استادوں شاعروں، صلاح کاروں کے مزاج اور عمل کو بھی نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ سماجی بے اعتدالیوں، خرابیوں اور ناہمواریوں کے بھی وہ نقاد ہیں۔ جیسے جہیز کی لعنت رشوت، نس بندی، ملاوٹ، تعلیم، ریلوے ٹائم، پرمٹ سیاست وغیرہ کے معاملات بلکہ جہاں کہیں انھیں خامی یا بے راہ روی ملتی ہے اسے سدھارنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

شاداں صاحب نے اپنے قطعات میں سلیس شائستہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے جس نے طرز بیان کو شگفتہ، لطیف اور پرکشش بنا دیا ہے۔ یوں تو "خطامعات" میں طنز و تنقید، تعریض و تمثیل، ظرافت، مزاح مختلف رخ اور پیرائے میں جلوہ گر ہیں، لیکن ان قطعات میں سماجی اور ذہنی اصلاح کے دلپذیر پہلو بھی ملتے ہیں جس نے کتاب کی افادیت اور دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے۔

یقین ہے کہ "خطامعات" کو ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔

——— سلطان احمد ناما

نیا دور

جلد ۴۲ نمبر ۳

جون ۱۹۸۷ء

ایڈیٹر: ——— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: ——— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر: ——— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: ——— ۴۷۱۰۸

پبلشر
اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

پہلی بات

حکومتِ اُتر پردیش نے بہتر حُسنِ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ بیس نکات میں جو ریکارڈ کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ ہر طرح لائقِ تحسین و مُبارکباد ہے۔ دو برسوں میں ہمارے پردیش کو بہت کچھ راحت ملی ہے۔ پیچیدہ و دیرینہ مسئلوں کو کافی حد تک نپٹا دیا گیا ہے۔ مانسون کی تاخیر تشویش ناک ضرور ہے مگر ابھی خدا کی رحمت پر کافی بھروسہ ہے کہ اس کا فضل کھیتوں کو ضرور سرسبز و شاداب کر دے گا۔ سرکار پوری طرح چوکس و مستعد ہے اور محدود وسائل کے باوجود عوام کی خوش حالی کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ترقیاتی کاموں کا سلسلہ اگر اسی رفتار سے جاری رہا تو بہت جلد ہم پسماندگی کی دلدل سے نکل آئیں گے۔ دیکھا گیا ہے کہ جب جب کسی تابناک دَور کی آہٹیں سنائی دینے لگتی ہیں کچھ سیاہ نقطے بھی ہمارے ذہنوں کو پراگندہ کرنے لگتے ہیں۔ اِدھر کچھ مُدت سے مفسد عناصر کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں، ان کا منصوبہ پردیش میں انتشار پیدا کرنا ہے، مگر سرکار بیدار ہے، اس کی توجہ پوری طرح اس امر پر ہے کہ مفسدانہ منصوبے پوری طاقت سے ناکام بنا دیے جائیں۔

عوام کا فرض ہے کہ وہ اس نیک کام میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ ملک کی ترقی امن و امان کی مرہونِ منت ہوا کرتی ہے۔ اگر امن و امان کی صورت بگڑتی ہے تو ترقی خود بخود رک جاتی ہے۔

ایک فیصد لوگ بھی یہ نہیں چاہتے کہ آئے دن دنگے فساد کا بازار گرم ہو اور زندگی اجیرن ہو جائے سب ہی آرام اور سکون سے رہنا چاہتے ہیں۔ ہاں مٹھی بھر ایسے شرپسند لوگ ضرور ہیں جو انسانیت کا دامن داغدار بنانے پر تلے ہوئے ہیں اُن کی نشاندہی ہونی چاہیے۔ بے جا جوش و خروش کا سیلاب کبھی کبھی اس طرف بھی مڑ جاتا ہے جدھر گمنامی و تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم یہ سطور لکھتے وقت انتہائی مضطرب و پریشان ہیں۔ ہم انسانیت پر مکمل یقین و اعتماد رکھتے ہیں۔ ہم صرف بھائی چارے کے جذبے کو انسان کی معراج سمجھتے ہیں۔

یاد رکھیے قومی ایکتا ہی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔ ایکتا کی ڈور میں بندھ کر ہی ہم اپنی منزل پا سکتے ہیں۔ سرکار کی مثبت پالیسیوں کی عمل آوری میں تعاون دینا وقت کی پکار ہے۔ عوام کی مدد کے بغیر کوئی سرکار آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان نازک حالات میں عوام کو اپنا تعاون دے کر ہمیں اپنا قومی فرض ادا کرنا ہے۔ اس وقت ہمارا ملک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ بعض بیرونی طاقتیں نہیں چاہتیں کہ ہندستان خوش حالی اور ترقی کے راستے پر گامزن رہے اور اقوام عالم میں ایک نمایاں مقام بنائے، لیکن ہم ان کے ناپاک ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے اور ملک کی سالمیت اور جمہوریت کی حفاظت کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

ایڈیٹر

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مولانا آزاد کا شعری ذوق

شعری ذوق کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے، اس کے لیے کوئی اصول یا ضابطہ طے نہیں کیا جا سکتا۔ میرا ذوقِ شعر آپ کے ذوقِ شعر سے مختلف ہے۔ آپ کو ایک شعر پسند ہے، مجھے نہیں پسند۔ میں کسی شاعر کو بہت اچھا شاعر مانتا ہوں، آپ اسے شاعر تسلیم نہیں کرتے۔ ان تمام حقائق کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بحیثیتِ مجموعی نقّادانِ فن کا خاصی تعداد میں شعراء یا ان کے اشعار کے اچھے یا معمولی ہونے پر اتفاق رائے بھی ہے اور یہی اتفاق رائے بغیر کسی ضابطے کے، میزان بھی ہے اور معیار بھی۔

آج تو نقد و نظر کا قافلہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ نثری شاعری بھی معرضِ وجود میں آگئی ہے، اور ویسے مولانا شبلی نے بھی کہہ دیا تھا کہ شعر کے لیے وزن کی ضرورت نہیں ہے تاہم صوتی معیار شاعری کا ایک معیار رہا ہے اور اچھے شعر کی پہچان میں صوتی آہنگ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میرے لڑکپن کے زمانے میں ذوقِ ادب کی پرورش کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ شاعری میں اُستادی شاگردی یا اصلاحِ شعر کے معاملے کو چھوڑیے، اس کے علاوہ بھی کچھ مدت پہلے تک شعری ذوق کی پرورش کے لیے ماحول کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی جو وجدان کی تربیت کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکے۔ ویسے آج بھی مدرسے، کالج یا یونی ورسٹی میں اُستاد چاہے خود شاعر نہ ہو اس سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ کسی شاعر کا کلام پڑھاتے وقت وہ طلباء کو محض شعر کے معانی ہی سے آشنا نہ کرے بلکہ ایسا فرض ادا کرے کہ طالب علم شعر سے لذت اندوز ہو سکے۔ اور یہ فرض صرف استاد ہی پر آکر ختم نہیں ہو جاتا۔ ادبی محفلوں اور ادبی گفتگو میں بھی اس طرح کی منزلیں طے ہوتی رہتی ہیں۔ جو لوگ شبلی، حالی، سید سلیمان ندوی، ظفر علی خاں، اقبال، حسرت موہانی، غلام رسول مہر، جگر، فراق، محروم، جوش، جمیل مظہری، امجد حیدرآبادی، عبدالمجید سالک، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور اس مزاج کے دوسرے لوگوں کی صحبت میں بیٹھے ہیں وہ اس معاملے میں میرے ہمنوا ہوں گے۔

مولوی سید میر حسن شاعری میں اقبال کے استاد نہیں تھے۔ ویسے مدرسے میں ان کے استاد تھے، لیکن داغ سے بھی پہلے اقبال کے ذوق و شوق کی پرورش مولوی سید میر حسن ہی نے کی۔ انھوں نے "سروِ آزاد" انھیں سبقاً سبقاً پڑھائی اور "سروِ آزاد" نامی کتاب کا انتخاب ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ مولوی سید میر حسن کے سامنے مقصد کیا تھا۔ اقبال کا ابتدائی کلام دیکھیے۔ اس میں تضمین کے اکثر اشعار وہی ہیں جو اقبال نے "سروِ آزاد" میں پڑھے تھے۔

تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ مولانا آزاد کی ذہنی تربیت بھی ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس کی بدولت رچا ہوا ادبی اور شعری ذوق اس ماحول میں بیٹھنے والے کا جزوِ مزاج بن جاتا

کرتا تھا۔ ان کے والد مولوی خیرالدین ایک خاندانی آدمی تھے، مولانا آزاد کا اوڑھنا بچھونا عربی، فارسی اور اُردو ہی رہی۔ ذوقِ شعر تو مبدءِ فیاض ہی سے ملتا ہے لیکن ادبی ماحول اور ادب کا مطالعہ اس ذوق میں جلا پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ تو ماحول کے فیض سے اور کچھ مطالعۂ کتب کے طفیل مولانا آزاد کا شعری ذوق بارہ تیرہ برس ہی کی عمر میں ان کی تخلیقِ شعر کی صورت میں اہلِ نظر کے سامنے آیا۔ اس سلسلہ میں مولانا خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" سنہ ۱۹۰۰ء یا سنہ ۱۹۰۱ء کی بات ہے کہ
بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو "پنچ بہادر"
نکالا کرتے تھے ایک گلدستہ " ارمغان فرخ "
کے نام سے نکالا اور کلکتہ میں بعض شعرار
اس کی ماہواری طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔
ایک مرتبہ اس کی طرح تھی ع
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی
میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی، تین شعر مزخرفات
کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کیے :
نشتر بدل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں پاسبان کی
آزاد! بے خودی کے نشیب و فراز دیکھو
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی "

یہ ان کا بارہ تیرہ برس کی عمر کا کلام ہے اور وہ بھی سنہ ۱۹۰۰ء یا سنہ ۱۹۰۱ء میں کہا ہوا، جب ہندستان بھر میں داغ اور امیر کا طوطی بول رہا تھا اور انہی کے انداز میں شعر کہنا کمالِ فن سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اقبال ایسا شاعر بھی غزل میں اس طرح کے مصرعے کہہ رہا تھا :

چلیے ذرا حضور دوپٹہ سنبھال کے

اس لیے ان اشعار پر تبصرہ کرنے کی عوض میں یہ زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد کے اسی مذکورہ خط میں مندرج خود مولانا کی رائے ان اشعار کے متعلق بیان کردی جائے۔ یہ خط ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۶ء کا ہے گویا مولانا چھتیس برس بعد ان اشعار کا ذکر کرتے ہوئے ان کے متعلق رائے دے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں :

" یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس وقت انہی لغویات نے لوگوں کو متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی جب کہ چھتیس برس گذر چکے ہیں اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اُس وقت محسوس ہوئی تھی جب "ارمغانِ فرخ" میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔"

اس خط میں آگے چل کر مولانا اپنے ایک اور شعر کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ شعر اور اس کا یہ تمام ذکر اکثر مصنفین نے اپنے اپنے مقالات میں بغیر حوالے کے کیا ہے۔ میں یہ شعر اور واقعہ مولانا آزاد کے لفظوں ہی میں بیان کر رہا ہوں جس سے مولانا کی صلاحیتِ شعرگوئی پر نہیں بلکہ صلاحیتِ شعر فہمی پر روشنی پڑتی ہے کیونکہ میرے نزدیک شعرگوئی سے شعر فہمی زیادہ مشکل کام ہے مولانا لکھتے ہیں : ———

" اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خان شوخ رام پوری کلکتہ میں مقیم تھے، انھیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔

ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے، جس کی دکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے چند شعر اسی وقت کہہ دو۔
میں سمجھ گیا کہ امتحان لینا چاہتے ہیں۔

انھوں نے زمین بتلائی ـــــ یاد نہ ہو، شاد نہ ہو،
میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر لکھ کر دیے۔
کہنے لگے، اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے
میں نے ایک شعر اور کہہ دیا ؎

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے "صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی "۔

اب دیکھیے مولانا نے اس شعر کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ یہ شعر اب کس قدر لغو معلوم ہوتا ہے۔ یہ شعر یقیناً اچھا شعر ہے اور ان تین اشعار سے تو کہیں بہتر ہے جو پہلے درج کیے جا چکے ہیں۔!

یہاں مولانا آزاد کی اردو یا فارسی شاعری پر تبصرہ مقصود نہیں ہے، اس لیے یہاں میں ان کے اردو اور فارسی کلام پر بحث نہیں کروں گا ورنہ کہتا کہ نظم اور غزل کے علاوہ رباعی ایسی ظالم صنف سخن پر بھی قادر تھے بلکہ جس قدر اردو میں لکھا اتنا ہی فارسی میں وغیرہ وغیرہ۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ مولانا کی نثر کے بعض حصے ایسے ہیں جن میں شاعرانہ رنگ موجود ہے اور یہ نثر ان کے رچے ہوئے شعری ذوق کی غمازی کر رہی ہے مثلاً "تذکرہ" کا یہ اقتباس دیکھیے:

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی سبزہ اندازی کے لیے دل خون ہوا کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار و خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی۔ آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی کبھی آبِ رواں کی بے قیدی و بے یقینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں اور گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسوؤں اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا پھولوں کو جب کبھی مسکراتے دیکھا تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہ کی، اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی، شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا تو اپنی سنگینی اور بے حسی بھی ضرور یاد آگئی۔ .... بجلیاں کوندتی رہیں، بادل گرجتے رہے لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پشت غفلت کسی بڑے ہی تازیانے کا انتظار کر رہی تھی ؎

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی ورنہ سدا
در قبول تو اس آرزو میں باز رہا"

لیکن اس قسم کی مثالوں سے ابھی بات میں وزن پیدا کرنا ذرا دشوار ہے اس لیے کہ اردو میں ایسے بہت سے نثر نگار ہیں جن کی نثر شاعرانہ انداز کی حامل ہے لیکن ان کا شعری ذوق مشکوک ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو معدوم ہے۔ لیکن مولانا آزاد کے بارے میں چونکہ یہ بات نہیں کہی جا سکتی اس لیے میں نے ان کے بیسیوں شاعرانہ نثر پاروں میں سے ایک بطور مثال کے پیش کر دیا ہے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور سے ظاہر ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کا شعری ذوق منجھا ہوا تھا۔ بہت بلند تھا، متانت اور توازن کی خصوصیات سے لبریز تھا۔ ان کے انتخاب شعر کا معاملہ یہ تھا کہ نثر میں جہاں کہیں شعر یا مصرع لاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شعر یا مصرع اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔ ویسے اچھی نثر کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اس میں اشعار کی بھرمار نہیں ہونی چاہیے (شاعری پر تنقیدی مضمون کی بات دوسری ہے) لیکن ہمارے یہاں ایک ایسا دور گزرا ہے کہ مصنف اپنی نثر کو جگہ جگہ اشعار سے مزین کرتا چلا جاتا ہے۔ ایسے مصنفین میں حضرت نیاز فتح پوری، مولانا غلام رسول مہر اور جناب جوش ملیح آبادی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جوش صاحب کی اشعار سے لبریز

نثر خاصی تصنع آمیز تحریر کا نمونہ ہے نیاز فتحپوری اور غلام رسول مہر کی نثر میں بھی اشعار کا انتخاب وہ جادو نہیں جگا سکا جو مولانا آزاد کے حصے میں آیا ہے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مولانا ان شعروں کا انتخاب پہلے سے کر لیتے تھے جو انھیں اپنی مجوزہ تحریر میں استعمال کرنا ہوتے تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے اس بات کا کوئی ثبوت بہم نہیں پہونچایا۔ لیکن جب ہم مولانا کی نثر پر نظر ڈالتے ہیں اور اس میں موقع و محل کی مناسبت سے برمحل اشعار یا مصرعوں کی شمولیت دیکھتے ہیں تو عبدالرزاق ملیح آبادی کی بات کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں سوال کسی شعر کو نثر میں استعمال کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس کے انتہائی برمحل استعمال کا ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب نثر لکھنے کے دوران شعر خود بخود یاد آجائے۔ پہلے سے جمع کیے ہوئے اشعار وہ بے ساختہ پن پیدا نہیں کر سکتے جو موقع اور محل کی مناسبت سے خود بخود یاد آجانے والے اشعار پیدا کر سکتے ہیں۔ اشعار کے یاد آجانے کا تعلق صرف ذوق شعر ہی سے نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ حافظے سے بھی ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ وہ قسام ازل سے ایک غیر معمولی حافظہ لے کر آئے تھے۔ "غبار خاطر" ہی کو لے لیجیے یہ کتاب کسی کتب خانے میں بیٹھ کے نہیں لکھی گئی جہاں حوالے کے لیے جو کتاب آپ چاہیں آپ کو مل سکتی ہے۔ یہ کتاب قید خانے میں لکھی گئی۔ وہاں حوالے دیکھنے کے لیے کتابیں کہاں؟ وہاں ان کا حافظہ ہی ان کا کتب خانہ تھا اور ان کا وجدان ہی ان کا رہنما۔ اور اس کتاب میں صرف متفرق اشعار ہی نہیں، دس دس مسلسل اشعار اس میں موجود ہیں۔ مولانا کے حافظے کا ذکر کرنے سے، اور انھیں کیا کچھ حفظ تھا، نثر میں بھی اور نظم میں بھی، اس کی مثالیں دینے سے بات اپنے مقصد سے دور جا پڑے گی ورنہ ایسی مثالیں ایک دو نہیں ہیں بیسیوں ہیں۔ راقم التحریر کو خود ان کے حافظے کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا تجربہ ہے۔ اس سلسلے میں نیاز فتحپوری لکھتے ہیں:

" ایک دن عرفی کے اس مشہور قصیدے کا ذکر آگیا:

جہاں بگردم و دردا بہ ہیچ شہر و دیار
نہ یافتم کہ فروشند بخت در بازار

اور مولانا نے اس قصیدے کا حسن بیان کرتے ہوئے پورا قصیدہ زبانی سُنا دیا۔"

دراصل ان کے حافظے کا ذکر شعر کے تعلق سے اس لیے ضروری ہے کہ شعر کے تعلق سے ان کا حافظہ اور شعری ذوق مل کے ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ اردو میں انھیں میر اور غالب کا کلام بہت پسند تھا اور ان کے سیکڑوں اشعار انھیں زبانی یاد تھے اسی سے ان کے ذوق شعر کی بلندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اُردو اور فارسی کے کسی شعر یا مصرعے کے نثر میں استعمال کے متعلق مولانا کی خصوصیت نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں کہیں مولانا نے شعر کا صرف ایک مصرع استعمال کیا ہے اور اس مصرعے کو مکمل شعر کی صورت میں دیکھنے کے لیے میں نے پہلا یا دوسرا مصرع تلاش کیا ہے تو میں ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس شعر کا پہلا یا دوسرا مصرع واقعی اس قابل نہیں ہے کہ اس موقعے پر استعمال کیا جا سکے، یا تو غیر استعمال شدہ مصرع کمزور نظر آیا اور یا وہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے اس مقام کے لیے موزوں نظر نہیں آیا۔ یہ مولانا آزاد کے شعری ذوق کی دقت نظری پر دلالت ہے۔ مثلاً "غبار خاطر" کے ایک خط کا یہ حصہ دیکھیے:

"صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک تناور درخت ہے۔ اس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے پھرتے ہیں۔ انھوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

تو فوراً لبیک لبیک اور "مرحمت عالی زیاد" کہتے ہوئے اس دسترخوان کرم پر ٹوٹ پڑیں گے

یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے"

اب دیکھیے پہلا مصرعہ غالب کا ہے پورا شعر یہ ہے ع

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

اب اس شعر میں پہلے مصرعے کو نظر انداز کرنا اور موقع و محل کی مناسبت کے پیشِ نظر دوسرے مصرعے کو منتخب کرنا مذاقِ انتخاب کی انتہائی لطافت کی دلیل ہے۔ دوسرا شعر حافظ شیرازی کا ہے اور مذکورہ مصرع پہلا مصرع ہے

شہولیت پُر ظریفاں وز ہر طرف نگارے

اس شعر کا دوسرا مصرع یہاں منتخب کرنا پھر اسی مذاقِ انتخاب یا شعری ذوق کی رفعت کا ثبوت دیتا ہے جس کا ثبوت، ہمیں پہلی مثال میں مل چکا ہے۔

استادِ محترم ڈاکٹر سید عبداللہ نے "امامِ عشق و جنوں" کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا جس کے اکثر الفاظ و فقرات آگے پیچھے کرکے ایک ہندستانی مصنف نے اپنی کتاب کے اوراق سجائے ہیں۔ میں اپنے اس مضمون کا اختتام ڈاکٹر سید عبداللہ کے مذکورہ مقالے کے ایک اقتباس پر کرکے اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا تاکہ ایک تو میری بات مکمل ہو جائے دوسرے استادِ محترم کی تحریر ایک بار پھر اپنی اصلی صورت میں قارئین کے سامنے آجائے، لکھتے ہیں: ———

" ابوالکلام آزاد کا ذوق بھی ایک جامِ مرکب ہے اس میں دو متضاد لہریں جمع ہو گئی ہیں، ایک تو ان کا اصلی طبعی رنگ، دوسرے ان کا اکتسابی رنگ ——— ایک میں ان کی جبلت مضطرب نظر آتی ہے، دوسری میں ان کے اکتسابات کی جھلک ہویدا ہے۔ ان دونوں کے اجتماع سے ان دونوں کا ذاتی نظام مرتب ہوا ہے ....

.... عناصر سے قطع نظر ان کے مذاق میں دورِ مغلیہ کے تہذیبی اقدار نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ مذاق کے ان رنگوں کے ساتھ ساتھ عربی ذوق و ذہن کے ریشے بھی سختی سے پیوست ہیں۔ عربی ذہن کی خصوصیت ہے عقیدے کی محکمی اور مجرد افکار کو مجسم بنا دینے کا رجحان اور مغل ایرانی ذوق کی یادگار ہے۔ تخلیقی لطافتوں سے وہ دلچسپی جو ابوالکلام کی تحریروں میں فارسی شاعری سے انتہا درجے کے شغف کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔

" اس میں شک کی مطلقاً گنجائش نہیں کہ ابوالکلام کے نظامِ ذاتیات و عادات کا بڑا حصہ فارسی کی عاشقانہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری سے اثر پذیر ہوا ہے۔ گویا اس جامِ مرکب کا لطیف حصہ انھیں فارسی کی شاعری خصوصاً مغل دور کے ادب سے ملا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس جام کا تند عنصر دین اور عربی اذواق سے ماخوذ ہے ——— یوں اس کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے تخیل میں تندی اور تیزی کے لیے جو طلب تھی اس کی تسکین بڑی حد تک مغلوں کے زمانے کی شاعری نے کی ہے ——— اور اس طرح ان کا وہ ذوق نشو و نما پاتا رہا جس کی اہم ترین غذا وہ شورش انگیز تخیل ہے جس کا بڑا سرمایہ عرفی، فیضی، نظیری اور غالب کی شاعری میں پایا جاتا ہے اور اگر اس کے سرچشمہ ہائے بعید کی تلاش کی جائے تو ہمیں ان کا سراغ حافظ میں بھی مل جاتا ہے۔"

(حواشی صفحہ ۳۶ پر)

شاعر فتحپوری
۸۹/۸۸ جگر اکاڈمی
چمن گنج، کان پور

غزل

ناہم کہوں میں اسے ایسا بھی نہیں ہے
کیا شے ہے محبت وہ سمجھتا بھی نہیں ہے

مانا کہ بہت رابطۂ عشق ہے نازک
ہم توڑ سکیں جس کو وہ رشتا بھی نہیں ہے

ہر شے سے جدا ہے دلِ برباد کی فطرت
جب تک نہ ہو برباد سنورتا بھی نہیں ہے

امید ہے وابستہ مری ابرِ کرم سے
اور ابرِ کرم ہے کہ برستا بھی نہیں ہے

آساں نہیں اس راہِ محبت سے گزرنا
جس راہ میں ہلکا سا اُجالا بھی نہیں ہے

ہر وقت گلستاں پہ خزاں کی ہیں نگاہیں
کھلتے ہوئے پھولوں کا بھروسا بھی نہیں ہے

ہمدردیِ احباب کا کیا ذکر ہے شاعر
اس سمت کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے

واقف رائے بریلوی
۲۳۸، آزری جہان آباد
ساڑتلہ، رائے بریلی

یہ قافلہ ہمارا

انسانیت کا جذبہ ہے رہ نما ہمارا
سب سے جڑا ہوا ہے یہ سلسلہ ہمارا

امن اور شانتی میں دُنیا کی زندگی ہے
منزل ہے یہ ہماری، یہ راستا ہمارا

مچلے ہزار آندھی، اُٹھے ہزار طوفاں!
بڑھتا رہے گا یونہی یہ قافلہ ہمارا

ہم راہ سے بھٹک کر آئیں گے راستے پر
ہم رہ نما ہیں اس کے یہ رہنما ہمارا

نفرت کو دُور کر دو، ہر دل میں نُور بھر دو
جو ہے خدا تمہارا وہ ہے خدا ہمارا

دل پیار کا دیا ہے یہ ایک آئینہ ہے
دیکھو نہ ٹوٹ جائے یہ آئینہ ہمارا

سنگیت، پیار، گنگا، یہ تاج، یہ ہمالہ
ملنا اگر ہے ہم سے یہ ہے پتا ہمارا

جگر سے وابستہ کچھ یادیں

اُردو شاعری میں صنفِ غزل گوئی کو ایک نئی سمت ینے والے عظیم شاعر حضرت جگرؔ مرادآبادی ایک ہمہ گیر اور باوقار خصیت کے مالک تھے۔ جن لوگوں کو موصوف کی مختصر سی رفاقت می میسّر ہوئی ہے ان کی یادوں میں جگر صاحب کا ایک لافانی نقش محفوظ ہے۔

اپنے بچپن میں میں نے جگرؔ صاحب کی "سرشاری" دور بھی دیکھا تھا۔ اُس وقت میں علمی اور ادبی شعور سے بے بہرہ ھا اور شعر فہمی کی صلاحیت سے بھی عاری تھا۔ پھر بھی گونڈہ کے ب بڑے مشاعرہ کی دھندلی سی یاد اب بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ جو ارے اسکول کے احاطہ میں غالباً ۱۹۴۴ء کے آس پاس منعقد را تھا۔ جوشؔ ملیح آبادی، احسان دانش، حفیظؔ جالندھری، اغر نظامی کے ساتھ جگرؔ مرادآبادی نے اپنے انوکھے انداز اور غرادی بانکپن سے اس مشاعرہ میں شرکت کی تھی ——— میں نے پہلے پہل جگر صاحب کو اسی موقعہ پر دیکھا تھا ، مقامی جانبداری ہو، خواہ خوبیٔ کلام کا تاثر۔ اس مشاعرے کے ستور کے ساتھ جگرؔ صاحب کی شخصیت نے ذہن پر ایک نقش بھوڑ رکھا تھا۔ بہرکیف میں آج یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ صرف جگرؔ صاحب کی شخصی مقناطیسیت تھی جو ان کے ہم عصر شعرا سے زیادہ پرکشش ثابت ہوئی۔

غزل کی نزاکتوں اور رومانی کیفیات کا احساس سنِ شعور کو پہنچ کر میرے دل میں پیدا ہوا تو ؎

دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں
کتنا حسیں گناہ کئے جا رہا ہوں میں
گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

ان اشعار کی صدائے بازگشت ہر طرف گونج رہی تھی۔

اصغرؔ گونڈوی سے شرفِ تلمذ نیز ان کی رفاقت و صحبت کے فیوض و برکات سے جگرؔ صاحب کے دل میں تصوّف اور تقدس کی تخم ریزی تو ہو ہی چکی تھی۔ اصغرؔ مرحوم کے انتقال کے بعد جب انھیں موصوف کی آخری خواہش اور وصیت کا علم ہوا کہ شراب نوشی ترک کرنے پر ان کی بیگم نسیم کا دوبارہ عقد جگرؔ سے کر دیا جائے تو اس تعلقِ خاطر کا احساس کر کے جگرؔ صاحب آنسوؤں میں ڈوب گئے تھے اور مشربِ رندی سے تائب ہو کر نسیم سے عقد کر لیا۔ اس طرح سرزمینِ گونڈہ کو جگرؔ صاحب کی مستقل سکونت کا شرف حاصل ہوا۔

جگرؔ صاحب کے پاس بیٹھنے کو بے اختیار جی چاہتا لیکن میری کم فہمی اور کوتاہ علمی قربت حاصل کرنے میں بہت دن مانع رہی۔

علی گڈھ میں میری طالب علمی کے دوران ۱۹۴۹ء میں یونیورسٹی کے مشاعرے میں جگرؔ صاحب تشریف لائے اور گونڈہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کی میزبانی کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ جگرؔ صاحب سے میری قربت کی ابتدا وہیں سے

ہوئی اور موصوف نے مجھے اپنی شفقت سے اس قدر نوازا کہ میں ان کا گرویدہ ہوگیا۔ علی گڑھ سے فارغ ہوکر میں نے گونڈہ میں ہی ۱۹۵۱ء سے وکالت شروع کی۔ ان دنوں جگر صاحب شاعروں میں شرکت کی غرض سے باہر جاتے اور ایک لمبے وقفے کے بعد گھر تشریف لاتے تو شہر کے باذوق لوگوں کا ایک حلقہ موصوف کے گرد ہمیشہ جمع رہتا تھا۔

ایک روز میں بھی حاضر ہوا۔ علی گڑھ کی ملاقات کو دو سال گزر گئے تھے مگر دیکھتے ہی پہچان لیا اور بڑی محبت سے قریب بلاکر بٹھایا، پوچھا:

"علی گڑھ سے کب آئے ۔۔ تعلیم کیسی چل رہی ہے؟"

میں نے عرض کیا:

"حضرت میں تو فارغ التحصیل ہوکر کب کا لوٹ آیا ہوں، یہیں وکالت کر رہا ہوں"۔

جگر صاحب نے مسرت کا اظہار کیا تو ہمت بندھی اور دوسرے تیسرے حاضری دیتا رہا۔ پھر جگر صاحب کو مشاعروں کا سفر درپیش ہوگیا اور تقریباً دو ماہ بعد واپسی ہوئی۔ ایک دن میں گیا تو پھر وہی سوال:

"علی گڑھ سے کب آئے۔ تعلیم ۔۔۔"

میں نے بات کاٹتے ہوئے یاد دلایا ۔۔ "حضرت میں تو اب وکالت کر رہا ہوں"۔

اس بار جگر صاحب کو ہنسی آگئی اور فرمایا:

"بھئی معاف کیجیے گا۔ یاد آیا آپ نے پہلے بھی کئی بار مجھ کو بتایا ہے، مگر یقین نہیں آتا کہ اس صغر سنی میں آپ فارغ التحصیل ہوگئے"۔ ۔۔ اور پھر معاً سنجیدہ ہوکر بولے ۔۔ "میاں ہم لوگوں کے وقتوں میں پختہ عمری میں تعلیم ہوتی تھی اسی لیے علم راسخ ہوا کرتا تھا ۔۔ معاف کیجیے گا آپ شکلاً ابھی بھی اسٹوڈنٹ نظر آتے ہیں"۔

۱۹۵۴ء میں گونڈہ کی ضلعی نمائش کا آل انڈیا مشاعرہ تھا ایک دن قبل محفلِ موسیقی منعقد ہوئی تھی۔ لکھنؤ کی ایک غزل گانے والی خاتون نے محفلِ موسیقی میں خاصا رنگ جمایا تھا، کلکٹر نے ان کو بھی مشاعرے کے اسٹیج پر مدعو کرلیا تھا، حلقہ شعرا میں ایک غیر شاعر خاتون کے آتے ہی جگر صاحب نے لاحول ولاقوۃ پڑھا میں مشاعرے کی نظامت کر رہا تھا۔ جگر صاحب کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار نمایاں ہوگئے اور وہ برہمی سے پہلو بدلنے لگے۔ میں نے جگر صاحب کے مزاج کی برہمی کا سبب بھانپ لیا تھا، اس لیے ان کو اطمینان دلایا کہ ان کی موجودگی میں وہ خاتون مائک پر نہیں آئیں گی۔ چاروناچار پہلے دور تک جگر صاحب بیٹھے رہے اور آخرکار بے دلی سے ایک غزل پڑھ کر شاعرے سے اٹھ گئے۔ دوسرے دن صبح ہم لوگ موصوف کے دولتکدے پر جمع ہوئے تو وہی موضوع گفتگو تھا۔ جگر صاحب نے فرمایا:

"موسیقی اور شاعری دو الگ الگ اور منفرد فنون ہیں۔ موسیقی فنِ شاعری کی محتاج ہے، لیکن اگر یہی لیل و نہار رہے تو غالب اندیشہ ہے کچھ دنوں بعد ہم لوگ شاعر اور گوئیے کا فرق بھی نہ محسوس کرپائیں گے"۔

نازک مزاجی کے ساتھ جگر صاحب بذلہ سنج طبیعت بھی رکھتے تھے اور لطیف مذاق سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ اسی مشاعرے میں آئے ہوئے فنا نظامی جگر صاحب کے ساتھ ہی قیام پذیر تھے صبح کو وہ غسل خانے سے نکلے تو ان کے چہرے پر عجیب سی بدحواسی اور پریشانی کے آثار دیکھ کر جگر صاحب نے پوچھا:

"بھئی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں آپ"۔

فنا صاحب خاموش رہے اور تھوڑی دیر بعد جگر صاحب سے سرگوشی میں پوچھا:

"حضرت! غسل خانہ میں وہ پتلی سی لمبی شیشی میں کیسا تیل تھا؟ میں نے غسل کے بعد سر میں اور داڑھی میں لگایا تو جھاگ نکلنے لگا"۔

جگر صاحب زیرلب مسکراتے ہوئے یکایک سنجیدہ ہوگئے

—— اور فرمایا:

"یہ کیا غضب کر ڈالا —— وہ تو بال صاف کرنے کا روغن ہے"۔

فنا صاحب اپنی داڑھی اور کاکل کا حشر سوچ سوچ کر کافی غمگین ہو چلے تھے کہ تھوڑی دیر بعد جگر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے:

"میاں — آپ فنا صاحب کے ساتھ جایئے اور غسل خانے میں رکھی اس شیشی کی اصلیت انھیں بتا دیجئے۔ ان کی یہ کیفیت دیکھی نہیں جاتی"۔

اور جب میں نے انھیں یقین دلایا کہ وہ بال صفا نہیں بلکہ شیمپو کی شیشی ہے تو انھیں قدرے اطمینان ہوا لیکن اس واقعہ کے ذکر سے تمام دن جگر صاحب اپنا اور احباب کا دل بہلاتے رہے —!!

خودداری اور اپنے وقار کا احساس ہمیشہ جگر صاحب کو دامن گیر رہتا۔ ایک بار شہر کے ایک رئیس تشریف لائے اور جگر صاحب کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اپنے حسن اخلاق کی بنا پر پہلے تو جگر صاحب نے دعوت قبول کر لی لیکن تھوڑی دیر بعد جب موصوف کو یہ علم ہوا کہ اس دعوت میں شہر کے دیگر شعرا بھی مدعو ہیں تو انھیں اس دعوت کی "بنا اہتمام" کا بھی اندازہ ہو گیا اور فوراً جگر صاحب نے معذرت کر لی اور فرمایا: "میں کسی ایسی دعوت میں شریک نہیں ہوتا جہاں کھانے کے عوض میں اشعار پڑھنے کی فرمائش ہو"۔

بے حد اصرار کے بعد بھی جگر صاحب اس دعوت میں شریک نہیں ہوئے۔

جگر صاحب گونڈہ کے بازار میں بھی پیدل نکل پڑتے تھے۔ گھر سے باہر جب بھی نکلتے تو اپنے مخصوص انداز بانکپن کے ساتھ۔ سر راہ ملنے والوں سے بڑے تپاک اور خلوص سے ملتے۔ ہلکا پھلکا سودا سلف بھی خرید لینے میں تکلف نہیں فرماتے تھے۔ اکثر اچھے دیساوری پان کے انتخاب کی خاطر بازار چلے جاتے تھے۔ پان کا جگر صاحب کو بہت شوق تھا۔ بڑے اہتمام سے مختلف اقسام کی تمباکو کے ہمراہ پان کی گلوریاں گھر کے اندر سے بن کر آتی تھیں۔ موصوف خود بھی نوش فرماتے اور احباب کو بھی اصرار کر کے کھلاتے تھے۔ ان دنوں میں تمباکو نہیں کھاتا تھا، اس لیے جب بھی جگر صاحب مجھے پان عنایت کرتے تو ہنس کر فرماتے تھے:

"فَقْتُلُوا" —— (یعنی لیجیے قتل کیجیے) اور وضاحت کرتے ہوئے فرماتے: "بغیر تمباکو کا پان کھانا پان کا قتل کرنے کے مصداق ہے"۔

جگر صاحب کی پرانی رہائش گاہ —— "کاشانۂ جگر" گونڈہ کی چوک بازار سے ملحق ایک مصروف رہگذر پر لب سڑک واقع تھی، پہلے ہی کمرے میں موصوف کی نشست گاہ تھی۔ قدرے کم چوڑائی کا ایک لمبا مستطیل کمرہ انتہائی سلیقہ سے دو رویہ آرام کرسیوں کی قطار کے بیچ ایک خوبصورت ایرانی قالین اور ایک سرے پر بھاری بھرکم نقش دار مسہری پر مخملی چادر اور مخملی تکیہ اور گاؤ تکیے سے آراستہ رہتا۔ معمول کے مطابق جگر صاحب کے مجلسی احباب جب بھی "کاشانۂ جگر" پر حاضر ہوتے تو نشست گاہ کے باہری دروازے پر آویزاں بانس کی رنگین چلمن اور اس کے ہم پلہ ایک دبیز پھولدار پردہ ان کا استقبال کر رہے ہوتے —— کمرے کے اندر کی مسہری پر جگر صاحب سفید ململ کا کرتہ زیب تن کیے مسند کے سہارے نیم دراز کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں غرق نظر آتے۔ آنے والوں کا استقبال موصوف بڑی خندہ پیشانی سے کرتے اور اپنے سامنے رکھی پان کی طشتری اور خاصدان پیش کرتے ہوئے تشریف رکھنے کو فرماتے۔ تمام دن لوگ آتے جاتے رہتے۔ کسی بھی مہمان کو جگر صاحب چائے پلائے بغیر جانے نہیں دیتے تھے۔ چائے کا دور تھوڑے تھوڑے وقفہ پر سارا دن چلتا رہتا۔

ایک دن میں کسی کام سے جگر صاحب کے پاس گیا مجھے عجلت بھی تھی اور گفتگو بھی مختصر تھی۔ بات ختم کر کے

غزلیں

مہدی پرتاپ گڈھی

معرفت ایگزیکیٹو انجینئر
ایریگیشن ڈویژن
پرتاپ گڑھ

یہ میرے گھر کی روایت بہت پُرانی ہے
بنی ہے جان پہ پھر بھی قسم نبھانی ہے

بچا کے رکھی ہے تہذیبِ زندگی میں نے
مرے بزرگوں کی یہ آخری نشانی ہے

چھپاتے رہتے ہیں ہم ایک دوسرے سے بہت
ہر ایک گھر کی مگر ایک سی کہانی ہے

اسے یقین کہ یہ زرد فصل ہے کچھ روز!
میں سوچتا ہوں کہ یہ صرف خوش گمانی ہے

نہ بھول لیجیے مجھے ردّ و قبول کا حق ہے
یہ مت سمجھیے کہ ہر بات میں نے مانی ہے

مرا قلم ہے وقارِ حیات کا مظہر
جو گیت میں نے لکھا ہے وہ جاودانی ہے

رُخِ حیات پہ جو بھی نکھار ہے مہدی
عملِ بشر کا ہے، انساں کی جانفشانی ہے

محشر بریلوی

بی ۳۶۶ ریلوے اسٹیڈیم کالونی
گورکھپور

خونِ دل سے نہ کبھی پانی کو پانی لکھنا
اس سے لکھنا تو لہو رنگ کہانی لکھنا

وقت کے ساتھ خد و خال بدل جاتے ہیں
خط میں اب اپنی کوئی تازہ نشانی لکھنا

اب کے کس حال میں پُروائی کا موسم گذرا
دل پہ اُبھری تو نہیں چوٹ پُرانی لکھنا

ہم لکھا کرتے ہیں اشکوں کو شرارے اے دوست
ہم کو آتا ہی نہیں آگ کو پانی لکھنا

کون پیتا ہے یہاں زہر کو پانی کرکے
ہے کہیں کوئی مرے ظرف کا ثانی لکھنا

جس کی زلفوں کی مہک سے ہوں معطر راتیں
جب بھی لکھنا تو اسے رات کی رانی لکھنا

کب تلک ڈھوؤ گے یہ کہنہ روایت محشر
اب نہ کاغذ پہ کوئی بات پُرانی لکھنا

رمیش چندر دویدی شوق

ہندستان اور قومی یکجہتی

جو لوگ ہندستان کی روحانی تاریخ سے واقف ہیں، انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس ملک کی ایکتا اور یک جہتی کا راز کتنا گہرا ہے۔ اگر ہم ایک نظر دنیا پر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ یہ دُنیا بے ترتیبی اور انمل بے جوڑ چیزوں کا ایک مرکب ہے۔ کہیں دریا، کہیں پہاڑ، کہیں جنگل، کہیں میدان، کہیں سمندر کہیں اونچائیاں، کہیں گہرائیاں، عجیب عجیب اور طرح طرح کے جانور، کہیں تپتا ہوا ریگستان تو کہیں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، طرح طرح کے انسان، مختلف قسم کے درندے اور پرندے۔ ان مختلف اور بہ ظاہر الگ الگ نظر آنے والی چیزوں میں انسان کا دماغ اتحاد اور وحدت تلاش کر لیتا ہے حقیقت ایک ہے جس نے اپنے کو مختلف شکلوں میں ظاہر کیا ہے۔ فراق صاحب نے بالکل صحیح کہا تھا کہ ؎

جو آنکھیں ہوں کسی کے عشق نے سو بھیس بدلے ہیں
نمودِ برگِ گل کیا، مہر و مہ کیا حسنِ انساں کیا

اک قوت ہے غیر مرئی
خلقت ہے اسی کی تھرتھراہٹ

ہندستان خود اس دنیا کی Replica ہے، مختلف مذہبوں کو ماننے والے لوگ، مختلف زبانیں، طرح طرح کے ریت ورواج اور تیوہار، موسموں کے جلوس، رہن سہن اور کھانے پینے کے مختلف طریقے، انگنت ذاتوں کے لوگ۔ ان سب نے ہی مل کر ہندستان کی تشکیل و تعمیر کی ہے۔ خارجی اختلافات اتحاد کا دشمن نہیں ہے۔ جیسے ہمارے مختلف اعضا مل کر ایک جسم بناتے ہیں، بالکل اسی طرح ہندستان کی مختلف ذاتوں یا ان کے رسومات سے ہندستان بنا ہے۔

اس ملک میں شروع سے ہی بیرونی لوگ آتے رہے ہیں ان میں سے زیادہ تر لوگ یہیں بس گئے اور یہیں کے ہو رہے جو واپس چلے گئے، وہ بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر کچھ نہ کچھ ہندستان کو دے کر ہی گئے۔ آج کے ہندستان کی کہانی مختلف قوموں کے میل جول اور ان کی تہذیبی قدروں کے ایک دوسرے میں رچ بس جانے کی رنگا رنگ کہانی ہے۔

ہندستان کی تہذیب کی جڑیں زندگی کی جڑوں کی طرح گہری ہیں۔ آندھیاں آئیں۔ طوفانوں کے حملے ہوئے، ہندستان کی بنیاد اور اس کی جڑوں کو اکھاڑ کر پھینک دینے والے چیلنج اور طاقتیں اپنا سر اُٹھاتی رہیں لیکن یہ ملک ان آزمائشوں سے اُبھرتا رہا اور آگے ہی بڑھتا رہا۔ آندھیاں گزر جانے کے بعد پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ ملک بنگالی، گجراتی، آسامی، اُڑیا، بہاری، پنجابی، راجستھانی، مراٹھی، تامل اور دیگر بہت سے حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود ہماری ایک طویل ملی جلی تاریخ رہی ہے۔ اختلافات کے باوجود ہم مل کر رہتے آئے ہیں۔ آج ستر کروڑ افراد کے اتحاد اور وحدت کو صرف ایک تصور یا ایک کہانی کہہ کر جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

پروفیسر رادھاکمد مکرجی نے اپنی کتاب (Fundamental Unity of India) میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی ہندستان کی تاریخ اور تہذیب کے معماروں نے اختلاف، رنگارنگی اور کثرت میں وحدت کو سمو دیا ہے۔ ہماری مقدس کتابیں ہمارے مہاکاویہ (EPICS) ہمارے فلسفے کی مختلف شاخیں، سارے ہندستانیوں کے لیے یکساں ہیں۔ ہماری موسیقی، ہمارے رقص، ہمارے قوانین، ہماری پریوں کی کہانیاں، ہمارے لوک گیت اور ہماری دیومالا، ہمارے تہوار اور مقدس مقامات، ہمارا کلاسیکی ادب سارے ہندستانیوں کے لیے ہیں کسی ایک فرقے یا ذات کے لیے نہیں۔ تب ان حقائق کی روشنی میں کیا ہندستان کے اتحاد اور وحدت کو جھٹلایا جا سکتا ہے۔ بقول فراق ؎

سر زمین ہند پر اقوام عالم کے فراق
قافلے بستے گئے ہندستاں بنتا گیا

پُرانے وقتوں سے ہی ہندستان تمام انسانیت اور مختلف مذاہب کا مسکن، مختلف طرح کے فلسفوں (چاہے اس میں خدا کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہو یا اس سے انکار ہو) کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ وہ دھرتی ہے جہاں آزادیِ خیال ہے۔ دراوڑ اور آریہ، ہون اور سیتھین، گریک اور عرب، ایرانی اور دوسری بہت سی قوموں نے ہندستان کو اپنا وطن بنالیا اور ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔ سماجی میل ملاپ اور مختلف قوموں کا شیر و شکر ہو جانا ہندستان کی خصوصیت رہی ہے۔

ہمارے غیر ملکی حکمرانوں نے 'ڈیوائڈ اینڈ رول' کی پالیسی اختیار کی۔ انھوں نے باہمی اختلافات اور جھگڑوں کو بڑھاوا دیا۔ انھوں نے ہمارے راستے میں مصیبت کھڑی کر دی جن کے لیے بڑی حد تک ہماری کمزوریاں اور غلطیاں بھی ذمہ دار ہیں۔ وہ ملک دشمن طاقتیں جو غیر ملکی تسلط کے زمانے میں اُبھری تھیں وہ آزادی کے بعد بھی سرگرم رہی ہیں اور ہمیں نقصان پہنچانے کے طریقے اختیار کرتی رہی ہیں۔ ہندستان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے (جو اتحاد اور یک جہتی کا نتیجہ ہے) دنیا کے بڑے سرمایہ دار ملک پریشان نظر آتے ہیں۔ ان سے اس ملک کا اتحاد اور خوشحالی دیکھی نہیں جا رہی ہے۔ وہ ہر وقت ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن سے ہندستان میں جمہوریت کو نقصان پہنچے اور ملک کے ٹکڑے ہو جائیں۔ یہ طاقتیں ملک کے اندر کے غداروں اور مفاد پرست لوگوں کو خرید لیتی ہیں اور قومی یک جہتی کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتی ہیں۔ کبھی مذہب کا نام لے کر، کبھی ملت کا نام لے کر، کبھی صوبائی معاملات کو ابھار کر یہ غیر ملکی طاقتیں باہمی اختلافات کو ہوا دیتی ہیں اور بھائی کو بھائی سے لڑوا دیتی ہیں۔ ہندو مسلمان کا معاملہ، آسام اور پنجاب کا معاملہ، گجرات کا جھگڑا انھیں ملک دشمن طاقتوں کی گندی سازشوں کا نتیجہ ہے۔

یہاں ایک کہانی یاد آرہی ہے جو ایک رکشے والے نے سنائی تھی۔ یہ رکشے والا ایک مسلمان تھا جو میرا دوست بھی تھا۔ کہانی کچھ اس طرح ہے:

• ایک لکڑہارا تھا جو غریب تو تھا ہی، بیوقوف بھی تھا۔ اس لکڑہارے کے پاس ایک بے بینٹ کی کلہاڑی تھی۔ وہ روز سویرے جنگل جاتا تھا اور دن بھر پیڑ کاٹنے کی کوشش کرتا تھا کلہاڑی میں لکڑی کا بینٹ نہ ہونے کی وجہ سے وہ پیڑ پر پوری طاقت سے چوٹ نہ کر پاتا تھا۔ پیڑ پر کچھ گھاؤ چھوڑ کر لکڑہارا خالی ہاتھ گھر لوٹ آتا۔ دوسرے دن جب لکڑہارا جنگل جاتا تو پیڑ کے جسم کا گھاؤ اسے بھرا ملتا اور پیڑ اپنی صحیح حالت میں نظر آتا۔ کچھ دنوں تک یہی سلسلہ چلتا تھا۔ ایک دن ایک آدمی نے اس بے وقوف لکڑہارے کو پیڑ کاٹتے دیکھا تو اسے ہنسی آگئی۔ وہ لکڑہارے کے پاس جا کر بولا:

"تم بڑے بیوقوف ہو، بھلا کہیں بے بینٹ کی کلہاڑی بھرپور چوٹ کر سکتی ہے۔ اس کلہاڑی میں لکڑی کا بینٹ لگاؤ پھر پیڑ کاٹو۔ دیکھو پیڑ کتنی جلدی کٹ جاتا ہے۔"

شام ہو چلی تھی۔ لکڑہارا گھر گیا اور دوسرے دن جب جنگل آیا تو اس کی کلہاڑی میں لکڑی لگی ہوئی تھی۔ جیسے ہی اس نے

کلہاڑی تان کر پیڑ پر وار کرنا چاہا تو پیڑ ہنس پڑا۔ لکڑہارا گھبرا گیا، اس نے پیڑ سے پوچھا:

"کہو بھائی آج تمھیں ہنسی کیوں آئی، آج تک تو کبھی نہیں ہنسے۔؟"

پیڑ نے جواب دیا: "آج میں کٹ جاؤں گا۔!"

"کیوں۔؟" لکڑہارے نے تعجب سے پوچھا۔

"اس لیے کہ آج مجھے کاٹنے میں میرا بھائی بھی لگ گیا ہے۔!" پیڑ نے جواب دیا۔

جب جب یہ کہانی میرے ذہن میں اُبھرتی ہے تب تب ہندستان کی تاریخ آنکھوں کے سامنے سے کسی فلم کی طرح گزرنے لگتی ہے۔ بھائی کو بھائی ہی کاٹ سکتا ہے، دوسرا نہیں۔

ہر ہندستانی کو آنکھ بن کر ایسے لوگوں یا ایسی طاقتوں کی نشان دہی کرنی ہے جو قوم کے جسم کو زخمی کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اکھاڑ پھینکنا ہے۔

ہندستان ہمیشہ عالمی اخوت اور بھائی چارے کا علمبردار رہا ہے۔ اس ملک کی طویل زندگی میں ہزارہا نازک اور خطرناک موڑ آئے جن سے یہ ملک مسکراتا ہوا گزر گیا۔ جتنے لمبے عرصہ تک یہ ملک غلام رہا ہے، دُنیا کے بہت سے ملکوں کی تاریخ اتنے عرصہ پر محیط نہیں ہے۔

یہ ملک عہدِ غلامی میں بھی پنپتا رہا۔ اس ملک نے غلامی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ بقول فراق ؎

انھیں کے دل ہیں امینِ رموزِ آزادی
جو جانتے ہیں اسیری ہے اک فنِ صیاد

ہندستان کی قومی ایکتا کی جڑوں میں رشیوں، منیوں، سادھوؤں، سنتوں، صوفیوں اور مفکروں کی تپسیا اور ریاضت شامل ہے۔ اسی ایکتا کو مضبوط بنانے کے لیے باپوئے قوم مہاتما گاندھی نے اپنی زندگی قربان کر دی تھی اور ابھی کچھ عرصہ پہلے اس ملک کی قومی ایکتا کو عمر جاودانی بخشنے کے لیے اندرا جی نے اس کی جڑوں کو اپنے خون سے سینچا تھا۔ ہماری قومی ایکتا کے محافظ و نگہبان راجیو گاندھی بہت ہی چوکسی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ہماری فوجیں جو پورے ملک کی نمائندگی کرتی ہیں، پوری بیداری کے ساتھ ہماری سرحدوں پر تعینات ہیں۔ ہندستان کا بچہ بچہ چوکس ہے، ذرّہ ذرّہ جاگ اٹھا ہے۔ ملک کے مسائل کو ملک کے لوگ مل جل کر حل کریں گے۔ ہندستان نہ صرف اپنی رہنمائی کرے گا بلکہ دنیا کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جائے گا۔ موجودہ زمانے کے ایک بہت بڑے مؤرخ ٹوائن بی نے لکھا ہے کہ دنیا کی نجات ہندستانی طریقوں سے ہی ممکن ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس ملک کے اکثریتی فرقے پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ اقلیت کے دلوں میں پیار و محبت اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرے ڈری ہوئی یا گھبرائی ہوئی اقلیت ملک کے لیے بہت بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔ نفرت، تفرقہ، خود غرضی یہ سب بربادی کا سبب بن سکتے ہیں۔

یہ ہمارے سیاست دانوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ہندستان میں رہنے والوں کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب لائیں، اور ہر دل میں حبُّ الوطنی کا جذبہ بیدار کریں۔ سائنس والے تو جغرافیائی فاصلوں کو مٹانے کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اب یہ کام سیاست دانوں کا ہے کہ وہ دلوں کی دوریوں اور فاصلوں کو مٹائیں۔

مادرِ ہند کے ایک سو چالیس کروڑ ہاتھ ہیں۔ بتلایئے دنیا کا ایسا کون سا کام ہے جسے اتنے ہاتھ انجام نہیں دے سکتے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہوتے ہوئے بھی ہم ہندستانی ہیں۔ اگر ہندستان کا ہی وجود نہیں رہے گا تو کہاں رہے گا آسام، کہاں رہے گا بنگال۔ ٹیگور نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر تم شودر بناؤ گے تو تم خود ہی شودر ہو کر رہ جاؤ گے ملک خوش حال ہوگا تو ملک کا ہر باشندہ خوش حال ہوگا۔ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھنے کے اصول پر اگر ہم کاربند رہے تو جو بھی ہوگا جو بھی سامنے آئے گا ہم دیکھ لیں گے۔ ✿

سید احمد شمیم

باتیں

تذکرے گُل کے خار کی باتیں
ہیں یہ سب انتشار کی باتیں

فلکِ فتنہ کار کی باتیں
گردشِ روزگار کی باتیں

وقتِ ناسازگار کی باتیں!
عہدِ ناپائیدار کی باتیں

یہ نفاقِ باہم کے افسانے
یہ دلوں کے بخار کی باتیں

بحث و تکرارِ کفر و دیں کب تک
تابکے نور و نار کی باتیں

وہی ماضی کے ظلم و جور کا ذکر
شکوۂ گیر و دار کی باتیں

پک گئے کان جن کو سُن سُن کر
پھر وہی بار بار کی باتیں

کب تک آخر سنائے جاؤ گے
زندگی سے فرار کی باتیں

نکلے زنداں سے ہوگئیں برسیں
پھر بھی ہیں گیر و دار کی باتیں

اپنی بے چارگی کے افسانے
غیر کے اقتدار کی باتیں

بجلیاں راکھ ہو چکیں جل کے
پھر بھی برق و شرار کی باتیں

جب بہار آ چکی تو اب کیوں ہیں
حسرتِ برگ و بار کی باتیں

اب ہے صبحِ طرب گئی شبِ غم
اب یہ کیوں انتظار کی باتیں

اب اُتارو یہ ماتمی ملبوس
کرو سولہ سنگھار کی باتیں

کسی صورت نہیں ہیں اب زیبا
دامنِ تار تار کی باتیں

آؤ صحنِ چمن میں بیٹھ کے اب
کریں مِل جل کے پیار کی باتیں

نگہ و دل کا نام لے کے کریں
جیت کا ذکر ہار کی باتیں

لالہ و گل کا تذکرہ چھیڑیں
وادی و کوہسار کی باتیں

مہکی مہکی سی زُلف کا قصّہ
نکہتِ کیف بار کی باتیں

دل پُر آرزو کے افسانے
شوخیِ چشمِ یار کی باتیں

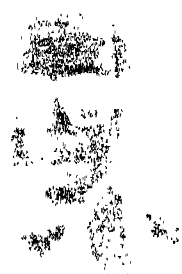
زندگی سے گریز کیا معنی
ہم کریں اس سے پیار کی باتیں

جس کا جی چاہے آئے ہم سے سُنے
تمکنت کی، وقار کی باتیں

صلح کی، امن کی، محبّت کی
باہمی اعتبار کی باتیں

ابدیت سے آشنا ہو جائیں
ربطِ باہم کی پیار کی باتیں

سید احمد قادری
"شبستان" نیو کریم گنج
گیا۔ ۸۲۳۰۰۱ (بہار)



رام لعل کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ

کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی وغیرہ کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اُردو افسانے کی عظمت، وسعت اور وقار میں اپنے فکر و فن، مطالعے و مشاہدے اور احساسات و جذبات سے قابلِ قدر اضافہ کیا ہے ان میں رام لعل کا نام بے حد اہم اور معتبر ہے۔

اپنے افسانوں میں رام لعل نے سماجی، سیاسی، معاشرتی مسائل اور حیات و کائنات کے درد و داغ اور جستجو و آرزو کو بڑے خلوص، سادگی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ رام لعل کسی ازم کے ساتھ وابستہ نہیں، لیکن زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا اپنا ایک نظریہ رکھتے ہیں، اور اپنے داخلی احساسات و جذبات کے فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ "رام لعل کے منتخب افسانے" کے پیش لفظ میں وہ اسی جانب اشارہ کرتے ہیں:۔

"افسانہ لکھنا میرا ایک فطری رویہ ہے۔ لکھنے سے پہلے سوچتا ضرور ہوں۔ لیکن لکھتے وقت طے شدہ نکات بالکل بھول جاتا ہوں۔ کیونکہ ان لمحوں میں کہانی کے کردار اور ان کی کہانی مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ میں تخلیق کو مولڈ (MOULD) کرنے کے بجائے اپنی انگلیوں سے اس کے خد و خال واضح کرنے میں زیادہ یقین رکھتا ہوں، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ انگلیوں کی حرکت ذہن کے حکم کے تابع ہوتی ہے۔"

زندگی کے نشیب و فراز، بولتے ہوئے تیور، عصرِ حاضر کے اُبھرتے ہوئے شواہد و آلام، ذہنوں کا انتشار، جذباتی بے کیفی، ماحول کی سنگینی، ذات کا درد و کرب، احساسِ تنہائی، خوف و دہشت کے ملے جلے اثرات، سفاکانہ اور خونیں واقعات، خود غرضی اور استحصال وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر رام لعل نے بڑے پراثر اور معیاری افسانے لکھے ہیں جن میں فکر کی گہرائی اور فن کی آگہی کو بڑی شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسے کئی افسانے ہیں جنھیں ہم اُردو کے ساتھ ساتھ دوسری مغربی زبانوں کے افسانوں میں فخریہ پیش کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں "چاپ"۔ "قبر"۔ "اکھڑے ہوئے لوگ"۔ "نئی دھرتی پرانے گیت"۔ "میڈلیس بڈھا"۔ "ایک شہری پاکستان کا"۔ "تماشا"۔ "بھیڑ"۔ "اوسی"۔ "نصیب جلی"۔ "کلنڈر"۔ "کتے"۔ "تین بوڑھے"۔ "میلے"۔ "ننھا خدا" اور "معصوم آنکھوں کا بھرم" وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

رام لعل کے افسانوں کے احوال و کوائف کو بہتر طور پر سمجھنے اور ان کے فکر و خیال میں شامل ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی ذاتی زندگی، ان کے ماضی اور ان کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

رام لعل کا بچپن ہی میں ماں جیسی عظیم اور شفیق ہستی سے

محروم ہوجانا، نامساعد حالات کے تحت اپنے آبائی گاؤں کو خیرباد کہنا اور پاکستان سے ہجرت کرنا، لوکوشاپ سے لے کر ریلوے کی کمرشیل ملازمت تک مسلسل تگ و دو۔ یہ وہ تین اہم حادثات اور واقعات ہیں جو رام لعل کے حساس دل و دماغ پر ہمیشہ چھائے رہے اور جن کا اظہار شعوری یا لاشعوری طور پر وہ اپنے افسانوں میں کرتے رہے۔

ماں کے انتقال نے رام لعل کے اندر تنہائی، مایوسی اور محرومی کا احساس پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ماں کی عظمت میں اضافہ بھی کیا۔ "اکھڑے ہوئے لوگ" اور "ماں" اس کی عمدہ مثالیں ہیں، جن میں ماں کی عظمت پوری جذباتیت کے ساتھ موجود ہے۔

"اکھڑے ہوئے لوگ" میں ماں کی نفسیاتی کش مکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ماں کو اپنی بیٹی کی حرکت سے شدید غصہ، دکھ، نفرت اور صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن ممتا اور محبت کے جذبے سے سرشار ماں، بیٹی کے معافی نہ مانگنے اور احساسِ ندامت کے اظہار نہ کیے جانے کے باوجود، نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بیٹی کے گھر پہنچ جاتی ہے۔

> "میرے قدم اسٹیشن کی طرف جانے کے بجائے ان کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ ایسا نہ چاہتے ہوئے بھی میں اسی سمت میں بڑھتی گئی۔ نیم ارادہ، نیم رضامند، بار بار یہی سوچ کر من کو ورغلاتی گئی، ان کے گھر کے سامنے سے ہو کر سیدھی نکل جاؤں گی۔ وہاں ہرگز نہیں رکوں گی۔ کوئی دکھائی بھی دے گیا، تب بھی۔"

اس افسانہ میں پلاٹ سازی، کردار نگاری اور ٹریٹ منٹ TREATMENT کا جو فن کارانہ برتاؤ نظر آتا ہے وہ اس افسانہ کو بے حد اہم بنانے کے ساتھ ایک خصوصیت بھی بخشتا ہے اور بے اختیار اس موضوع پر لکھے گئے عالمی شہرت یافتہ افسانوں کی یاد آتی ہے۔

"ماں" میں ماں کی مفلسی، بے بسی، مجبوری، محرومی، انا، خودداری اور درد و کرب کے بڑے گہرے احساسات و جذبات ملتے ہیں۔ ماں کی غربت اور مجبوری پر پردہ ڈالنے کی رہی کی کوشش اور پھر اس کے انکار اور ماں کا اپنے سونے کی بالیوں کو فروخت کرنا، آج کے بے رحم، بے درد سماج کے ایسے کو پیش کرتا ہے۔

ان دونوں افسانوں کے کردار اور واقعات اجنبی نہیں ہیں، ہر روز ایسے کردار اور واقعات ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ رام لعل نے اپنے مطالعے اور مشاہدے کی گہرائی و گیرائی اور احساسات و جذبات کی زیریں لہروں سے ان افسانوں میں گہری معنویت پیدا کر دی ہے۔

ہندوستان آزاد ہوا تو رام لعل نے اپنے آبائی مکان، گاؤں، گلیوں، کوچوں اور دوست و احباب کو نم آنکھوں سے الوداع کہا اور پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے۔

> "ہندوستان آزاد ہوا، میں لاہور چھوڑ کر کچھ عرصہ ضلع جالندھر، انبالہ اور دلی میں رہ کر بالآخر ۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو بنارس جا پہنچا۔ وہاں ۱۹۵۰ء کے شروع تک رہا، اس کے بعد لکھنؤ آ گیا۔"
>
> ______ (رام لعل - کچھ یادیں)

ہجرت کے درد و کرب کو بھی رام لعل نے بڑی شدت سے محسوس کیا اور وہ ہمیشہ اپنے گاؤں، اس کی گلی کوچے، دوست احباب وغیرہ کی یادوں میں ڈوبے رہے اور ان سے جو ذاتی و جذباتی وابستگی تھی، اسے کبھی فراموش نہیں کر سکے۔ اور اس کا اظہار وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے افسانوں میں کرتے رہے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے اظہار سے ایک روحانی سکون اور طمانیت پاتے ہیں۔

> "پاکستان سے آ کر آخر کتنوں کو یہ عزت نصیب ہوئی ہے۔"
>
> ______ (اکھڑے ہوئے لوگ۔ صفحہ ۳۱)

> "ڈیڈی آپ بہت بور ہیں، اپنے پرانے شہر کا قصہ کیوں لے بیٹھتے ہیں، مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں ہے یعنی ہم نے تو یہیں آ کر ہوش سنبھالا ہے۔ ہم تو اسی شہر کے ہیں۔"

یہ سُن کر بسین صاحب سروج کو اور میری طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگتے۔ اُداس بھی ہو جاتے سوچتے بھی رہ جاتے۔"

———— (اکھڑے ہوئے لوگ۔ ص ۳۱)

"... کسی بے چارے مسلمان کا ہے۔ وہ بھی پاکستان میں کسی ہندو کے مکان میں اپنی عزت آبرو سمیٹے رہ رہا ہوگا۔ اسے بھی کچھ غم ستاتے ہوں گے، اپنوں اور پرایوں کے۔ وہ بھی لوگوں کے بدلتے ہوئے رویّوں کی شکایت کرتا ہوگا۔"

———— (نئی دھرتی پرانے گیت ص ۴۶)

"میں سیدھا پاکستان سے چلا آرہا ہوں۔ یہ سُن کر سرسوتی چونک پڑی، اس کی حیرانی میں اور اضافہ ہوا۔"

———— (ایک شہری پاکستان کا، ص ۶۹)

"یہ موئی اپنی حرکتیں بھول گئی ہے۔ پاکستان سے آنے کے بعد اسے سب نے منع کیا تھا، مسلمانوں کے قبرستان میں ڈیرہ مت جماؤ۔ پر کسی کی سُنتی تب نا!"

———— (جڑیں۔ ص ۹۹)

"یہ صاحب جو ابھی بڑبڑا رہے تھے، سرحد پار کے کسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ آزادی کے بعد ہی ادھر آئے تھے۔ آزادی کو ہمیشہ کوستے رہتے تھے کیونکہ اس میں ان کا سب کچھ تباہ ہوگیا تھا۔ جائداد، بیوی، بچے، بوڑھے ماں باپ۔ اتنے سال گزر جانے پر بھی وہ اپنے وطن کو بھلا نہیں سکے تھے۔ اکثر صبح اُٹھ کر ہمیں اپنے خوابوں کی روئیداد سنایا کرتے۔ خوابوں میں وہ اپنے آبائی مکان پر جانکلتے تھے، جہاں ان کا بچپن بیتا تھا، وہاں وہ اب بھی اپنے پرکھوں اور عزیزوں سے ملتے، جن کے ساتھ اب ان کا کوئی زندہ تعلق نہیں موجود تھا۔"

———— (ریشٹ اِڈمن۔ ص ۱۲۳)

"خط پڑھتے ہی موتا سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غلام سرور نے اسے کبھی بھلایا نہیں تھا۔ اس کا پتہ کئی ذرائع سے دریافت کرتا رہا تھا۔ بیسیوں دوستوں سے پوچھا تھا۔ کسی نے جواب دیا نہ پتہ بتا سکا تھا۔ کسی کسی نے جواب ہی نہیں دیا تھا۔ موتا سنگھ کئی سال ہوئے امرتسر کی ورکشاپ سے تبدیل ہو کر دہلی آگیا تھا۔ کسی کو آسانی سے اس کا پتہ تھوڑے ہی مل سکتا تھا۔ غلام سرور نے اس کے پتے کی کھوج اپنے ملک میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر کی مدد سے کرلی تھی۔"

———— (نصیب جلی۔ صفحہ ۱۶۸)

ان اقتباسات میں افسانہ نگار کی پوری ذات INVOLVE نظر آتی ہے۔ ہجرت کا واقعہ المیہ بن کر سامنے آتا ہے جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر پاتا بلکہ اس میں اس کی ذاتی وابستگی، درد و کرب، ہمدردی، برہمی اور محرومی پوری طرح موجود ہے۔ ان یادوں میں ڈوب کر وہ پناہ تلاش کرتا ہے۔

'ایک شہری پاکستان کا' اور 'نصیب جلی' میں واقعات دو ہیں لیکن موضوع وہی ہے۔ ملک کے بٹوارہ میں دل کا بٹوارہ اور فرقہ وارانہ فساد میں جسم و جاں کے قتل کے ساتھ ساتھ پیار، محبّت اور جذبے کا قتل۔ کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود بلدیو اپنی بیوی کی محبت کو فراموش نہیں کر پاتا ہے اور ادھر غلام سرور اپنے مہربان دوست کی دوستی اور قربانی کے جذبے کو بھولا نہیں ہے۔ احساسات اور جذبات کا حسین امتزاج ان افسانوں کو پُراثر اور اہم بناتا ہے۔

یہ دونوں افسانے فکر و فن کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ چونکہ رام لعل نے ان حادثات اور واقعات کو صرف سنا نہیں ہے بلکہ بہت قریب سے دیکھا اور جھیلا ہے، اس لیے اس میں حقیقی احساسات و

جذبات سے ملکر افسانہ میں روح پھونک دی ہے۔ ابتدا سے انتہا تک قاری پوری طرح ان میں Involve ہوجاتا ہے۔

افسانہ 'قبر' میں ذاتی وابستگی، آبائی گاؤں سے والہانہ لگاؤ، جذباتی رشتہ، بچپن کے دن، اسی زمانے کے دوست احباب اور پچی (کتا) سے پیار —— ان عوامل کا خوبصورت اور فنی اظہار اس افسانے میں ہے۔ افسانہ نگار برسوں سے چھوڑے ہوئے گاؤں میں اچانک پہنچ جاتا ہے اور بھولی بسری یادوں میں کھو جاتا ہے اور گاؤں کے گلی کوچوں میں گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرتا ہے، اپنے بچوں اور بیوی کو ماضی کی باتیں ایک انجانی خوشی، انبساط اور کیفیات کے ساتھ سناتا ہے۔ افسانہ کا اختتام ذہن پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ جب افسانہ نگار کی بیوی جو میکے سے تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی تعلق اور رشتہ برقرار رکھتی ہے، وہ اپنے شوہر کی ذات، یادوں، احساسات و جذبات میں شامل ہوجاتی ہے۔

"قبر اب کہیں نہیں تھی۔ ہر چیز کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ صرف یاد ہی میرے پاس باقی رہ گئی تھی۔ اِدھر اُدھر بے چینی سے دیکھتے وقت میری نظریں اچانک بلقیس کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے تجسس اور اضطراب کے لیے ایک بھرپور تائید موجود تھی۔ تائید اور ہمدردی — میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آگئی اور میرا بازو پکڑ کر آہستہ سے بولی، آپ چاہتے ہیں، ہم لوگ کچھ روز یہاں رہ جائیں۔؟"

—————— (قبر۔ ص ۳۸)

رام لعل کے افسانوں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی شعور کافی بیدار نظر آتا ہے۔ رام لعل نے نچلے اور متوسط طبقے کی گھٹن، بے بسی، بے کیفی، مجبوری، افلاس اور استحصال کو قریب سے دیکھا اور شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ عصرِ حاضر میں ذات کا درد و کرب، گھٹی گھٹی فضا، عدم تحفظ کا احساس، مشینی زندگی، بے کیفی، بے سمتی اور بے چہرگی وغیرہ بھی رام لعل کے افسانوں کے اہم موضوع ہیں اور ان تمام موضوعات پر رام لعل نے ذہنی، فکری بصیرت اور فنی آگہی سے بڑے اہم اور معیاری افسانے لکھے ہیں۔

رام لعل کے افسانوں کا فکری اور فنی پہلو اس وقت سے اجاگر نظر آتا ہے جب رام لعل اپنے تجربے اور مشاہدے کو من و عن بیان کرنے کے بجائے حقیقت اور تخیل کے امتزاج کو پیش کرتے ہیں، اور افسانے کی تشکیل و ترتیب میں موضوع، مواد، فکر اور خیال میں فنی حُسن سموتے ہیں، اور یہ تمام عناصر افسانے کے جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔

'چاپ' میں عصرِ حاضر کا انسان وکاس، ان لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہے جو محرومی اور ناآسودگی کے شکار ہیں۔ وہ دولت حاصل کر کے درد و کرب، غم و یاس اور محرومیوں سے نجات حاصل کر کے سماج اور سوسائٹی میں اپنا ایک اہم مقام بنانا چاہتا ہے:——

"ایک دن پوسٹ مین نے اس کمرے میں دو خط سرکا دیے۔ ایک خط اس کی ماں نے لکھا تھا، وہ سخت بیمار تھی۔ مرنے سے پہلے اسے ایک بار دیکھ لینا چاہتی تھی۔ خط پڑھ کر وکاس کو بہت غصہ آیا۔ پھاڑ کر پھینک دیا۔ کم بخت بڑھیا، تم نے مرنے کے لیے کتنا غلط وقت چُنا ہے! کچھ روز اور ٹھہر جاؤ نا: تمھاری ارتھی کے ساتھ شہر کے سرکردہ لوگوں کا ہجوم ہوگا۔ اس وقت تم مرگئیں تو تمھیں ڈھونے کے لیے چار آدمی بھی مشکل سے ملیں گے۔ بولو، تمھیں کون سی موت پسند ہے؟ ایک رذیل موت یا ٹھاٹھ باٹ والی موت!"

وکاس مکمل آسودگی چاہتا ہے اور وہ دولت کی تلاش (حصول)

ں اپنے ہی لیے قبر کھودتا جاتا ہے اور پھر اس کی تمام کوششیں
پر اُٹھنے کی ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ نڈھال ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم
زدر اور ناتوانی کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنے ہی ہاتھوں
ھودی ہوئی قبر میں سما جاتا ہے۔

رام لعل نے بہت ہی نازک اور اہم موضوع کو بڑی
بصورتی اور فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے اور خاص بات یہ ہے
اس افسانہ کی خوبصورت اشاریت، دل نشیں رمزیت، معنی
ریں تہ داری اور فکری جزئیات و محرکات، افسانہ کو فکر وفن کی بلندیوں
پہونچادیتے ہیں، اور بلاشبہ علامتوں، تشبیہوں یا استعاروں سے
ہام یا ترسیل کا مسئلہ پیدا ہونے کے بجائے ایک خاص قسم کی
فیت اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔

رام لعل کے افسانوں میں عصری حسیت اور جدید تقاضوں
شعور و آگہی کا احساس ملتا ہے اور عصر حاضر کے سماجی، سیاسی
عاشرتی اور نفسیاتی مسائل اور الجھنوں پر بھی ان کی گہری نگاہ ہے
ضمن میں افسانہ 'تماشا'، خوبصورت مثال ہے، جس میں
ج کی مشینی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی زندگی کو 'ٹرین' کا استعارہ
اکر پیش کیا گیا ہے۔ رام ملن پانڈے دورِ حاضر کا پریشان حال
نص ہے جو 'نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ آج کی بھاگتی
ر تیز رفتار زندگی سے ہم آہنگ ہونے کی بھرپور کوشش کرتا ہے
بھی کامیاب بھی ہو جاتا ہے، لیکن وہ زیادہ دنوں تک تیز رفتار
ر بھاگتی ہوئی ٹرین (زندگی) کا ساتھ نہیں دے پاتا ہے اور
خرکار ایک دن اسی 'ٹرین' کا شکار ہو جاتا ہے۔

'بھیڑ'، میں علامتوں یا استعاروں سے کوئی مدد نہیں
گئی ہے لیکن بیانیہ انداز میں جو رام لعل کی خصوصیت،
فرادیت اور عرفان و آگہی کا احساس ملتا ہے وہ دوسروں کے
ماں کم دیکھنے کو آیا ہے۔ 'بھیڑ'، دورِ جدید کا بے حد خوبصورت
ر نمائندہ افسانہ ہے۔ سکون و اطمینان کی بھیڑ میں گم ہے لیکن
ج کا المیہ یہ بھی ہے کہ عصرِ جدید کا انسان اسی بھیڑ میں سکون
ر اطمینان محسوس کرتا ہے۔

"آتم کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر کستی کے
چہرے کا بھی تناؤ دور ہو گیا۔ وہ جلدی سے بھیڑ
میں گھس کر کھڑی ہو گئی۔ ساڑی کا پلو کمر کے
گرد کس لیا اور دونوں ہاتھوں میں پتھر بھی اٹھا
لیے جس طرح دوسرے لوگ گاڑی کے شیشوں
پر برسا رہے تھے"۔

——— (بھیڑ۔ صفحہ ۸۴)

عصر حاضر کی سیاسی تبدیلیوں اور اخلاقی زوال پر بھی رام لعل
نظر رکھتے ہیں، اور وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں جو سیاست
میں، سماج میں اور معاشرے میں تعفن پھیلا رہے ہیں۔ سیاسی
سماجی اور معاشرتی وقار کو مجروح کر رہے ہیں۔ انسانی قدریں،
سماجی رشتے اور معاشرتی تہذیبوں کو پامال کر رہے ہیں۔ ان کا
رام لعل نے بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے اور چونکہ رام لعل ایک
دردمند دل رکھتے ہیں۔ غریبوں اور مجبوروں سے ہمدردی رکھتے
ہیں، اس لیے ایسے واقعات جب وہ پیش کرتے ہیں، تو ان میں
حقیقی اور فطری جھلک نمایاں ہوتی ہے ——— چند اقتباسات
دیکھیے: ———

" ان کا ایم۔ پی ہونا سن کر جھانسی والا انسپکٹر
خوش ہوا تھا۔ اس نے سوچا، ایسے آدمی کے ساتھ
کچھ زیادہ ہی اخلاق سے پیش آنا چاہیے۔ کیا
پتہ کب مہربان ہو جائے! ہم لوگوں کی تقدیر
تو اب انہی کی مٹھی میں رہتی ہے۔"

(ریسٹ ہاؤس صفحہ ۱۱۹)

" ہاں، میں نے اسے اسی جگہ ملنے کے لئے
کہہ دیا تھا۔ اس وقت وہ مونگ پھلی کے بھاؤ اور
ٹرانسپورٹ وغیرہ کے مسائل میں الجھا ہوا ہوگا۔
آئے گا ضرور، کیونکہ اسے میرے ساتھ راجیہ سبھا
کی ممبری کے مسئلے پر گفتگو کرنی ہے۔"
" لیکن اس کے لئے وہ تم سے کیوں بات

کرے گا؟" ریتا کھنڈیوال نے خود ہی اپنے لہجے میں کچھ بڑہی محسوس کی اور وہ سنبھل کر مسکراتی ہوئی بولی۔ "کیا تم واقعی اس کی کچھ مدد کر سکتے ہو"

"کیوں نہیں!" وہ فوراً بول اٹھا۔ "میں اس کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میرے پاس دماغ ہے اور بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ کنٹیکٹس ہیں اور اسے تو صرف بلیک کا ہی روپیہ خرچ کرنا ہے"۔

(تابوت ۔ ص ۳۳-۱۳۲)

"اشوک کی بہت سی شکایتیں کر کے گئی تھی وقت پر گھر نہیں لوٹتا، اپنے رشتے داروں پر بہت جان چھڑکتا ہے، ان کی وقت بے وقت روپے پیسے سے مدد بھی کرتا رہتا ہے"۔

(اکھڑے ہوئے لوگ ص ۳۲)

سیاسی بازی گری، سماجی استحصال، معاشرتی زوال، افراتفری نفرت، احساسِ تنہائی، بے چہرگی اور بے کیفی وغیرہ سے اکتا کر انسان سکون اور اطمینان کا متلاشی رہتا ہے۔ اس سکون اور اطمینان کا متلاشی رہتا ہے۔ اس سکون اور اطمینان کے حصول کے نفسیاتی اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بعض لوگ خود کو پل بھر کے لیے قبر میں محبوس کر لیتے ہیں:

"وہ پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی، کھوئی ہوئی سی۔ پھر جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے جھانکا اور ہاتھ بڑھا کر ایک تابوت باہر کھینچ لیا۔ وہ کتنی دیر تک قبر کی طرح گہرے، خاموش اور ٹھنڈے تابوت کو گھورتی رہی۔ پھر پلنگ لے اتر کر اس کے اندر لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے سینے پر کراس بنایا، سانس بھی روک لی۔ وہ اسی طرح کئی منٹ تک پڑی رہی۔ اسے ایک عجیب سا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اسے اب ہر مصیبت سے مکتی مل گئی ہو"۔

(تابوت ۔ ص ۱۳۴)

رام لعل کے افسانوں میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ جنس کی گھٹی گھٹی فضا بھی ملتی ہے۔ ان کیفیتوں کو پیش کرتے وقت زبردست احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی بھی لغزش افسانہ کو سطحیت سے قریب کر دیتی ہے۔ لیکن رام لعل اس کٹھن مرحلے سے بخیر و خوبی اور کامیابی سے گزر جاتے ہیں:

"عورت کی بہت دور سے ہی خوشبو سونگھ کر عشقیہ کو رس گانے لگتے تھے، اس لیے عورتوں کا وارڈ ان کی پہنچ سے بہت دور بنایا گیا تھا"۔

(آخری خواہش ص ۱۵۴)

رام لعل نے جس عہد، زمانے اور دور میں افسانے لکھے اس زمانے، عہد اور دور کی تلخ حقیقتوں کو وسیع معنوں میں پیش کیا ہے۔ اس لیے آج چالیس برسوں کے بعد بھی ان کے افسانے عصرِ حاضر کی نمائندگی کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ عصری شعور اور عصری حسیت نے رام لعل کو ہمیشہ منفرد بنایا ہے اپنے خاص اسلوب، خوبصورت اسٹائل اور تیکھے و چبھتے ہوئے انداز بیان سے رام لعل نے اردو افسانہ نگاری میں اپنی اہمیت اور عظمت تسلیم کرالی ہے۔ ان کے کئی افسانے ایسے ہیں جو سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

••

اپنے معاونین سے

مضامین اور شعری تخلیقات ہمارے پاس بڑی تعداد میں جمع ہیں، اسلئے ہم فی الحال کسی غیر طلبیدہ مضمون یا شعری تخلیق کی اشاعت پر غور کرنے سے قاصر ہیں۔ کسی مضمون، افسانے یا شعری تخلیق کی رسید ادارے کی جانب سے موصول ہو جانے کے بعد اشاعت کے سلسلہ میں براہ کرم عجلت سے کام نہ لیں۔

(ادارہ)

مشتاق نعیم پوری
ہمدرد ایجنسی۔ نعیم پور

وطن

آج سوچا ہے ترے واسطے اک گیت لکھوں
اے مرے پیارے وطن، پیارے وطن، پیارے وطن

تیرے چرنوں پہ چڑھاتا ہے سمندر جس کو
تیرے ماتھے پہ تلک کرتی ہے سورج کی کرن!
منتر جپتے ہیں تری چوٹی پہ شیو شنکر بھی
تجھ کو اشنان کراتی ہیں تری گنگ و جمن
تیری عظمت کو ہیں سب مانتے دوست اور دشمن
اے مرے پیارے وطن، پیارے وطن، پیارے وطن

گوتم و رام و کرشن، نانک و گوبند و کبیر
دیوتاؤں کے کھلے ہیں تری دھرتی پہ چمن
گونجنے والی اذانوں میں صدائے وحدت
یہیں ٹھہرا گئے چشتی بھی بنا کر مسکن
تیری آغوش مہا پرشوں کا ہے اک مدفن
اے مرے پیارے وطن، پیارے وطن، پیارے وطن

شانتی دیتا ہوا ہاتھ اشوکا کی ہے لاٹ
عظمتوں کی ہے نشانی یہ قطب کا مینار
پریم کی جوت جلاتا ہے ترا تاج محل
دیکھ کر چپ ہیں اجنتا کو جہاں کے فن کار
تجھ پہ قربان مری جان، مرا تن مرا دھن
اے مرے پیارے وطن، پیارے وطن، پیارے وطن

آن پر تیری ہوئے کتنے ہی پرانڑی بلیدان
ظفر و ٹیپو و نانا جی و رانی جھانسی
لاج کو تیری بچانے کے لیے گھر گھر کے
کتنے ہی ویر جواں چڑھ گئے ہنس کر پھانسی
ہے ہمارا بھی یہی تیرے لیے ایک وچن
اے میرے پیارے وطن، پیارے وطن، پیارے وطن

کوئی بھی ملک ہو اور کوئی بھی دشمن آئے
لاش پر سے ہی ہماری وہ گزر سکتا ہے
تیری آغوش میں پل کر جو کرے تجھ سے دغا
موت غدّار کی ہر وقت وہ مر سکتا ہے
ہم ترے واسطے باندھ آئے ہیں اب سر سے کفن
اے مرے پیارے وطن، پیارے وطن، پیارے وطن

کم کسی حال میں یہ شان نہ ہونے دیں گے
اپنی آزادی کو قربان نہ ہونے دیں گے
دل میں ٹھانی ہے کہ ہم جان تو دے دیں گے مگر
پیارے بھارت ترا اپمان نہ ہونے دیں گے
اب یہی عزم، یہی دھن ہے، یہی ایک لگن
اے مرے پیارے وطن، پیارے وطن، پیارے وطن

دیکھنا اور ابھی رنگین بنے گا گلشن
پھول خوشیوں کے نظر آئیں گے میداں ہو کہ بن
چاند تاروں سے سجا جائے گا سارا یہ گگن
دھرتی سوندریہ سے بن جائے گی سپنوں کی دلہن
ہم جو لگ جائیں گے سیوا میں تری ہو کے مگن
اے مرے پیارے وطن، پیارے وطن، پیارے وطن

●●

ہندی افسانہ

چترسین شاستری
ترجمہ: دیا شنکر

قاتل

بہتر یہی ہے کہ اس کا نام مت پوچھیے۔!

گزشتہ چھبیس سال سے اس نام کو دماغ سے اور صورت کو آنکھوں سے دُور کرنے کے لیے دیوانہ وار گھوم رہا ہوں۔ لیکن وہ نام اور صورت بُھلائے نہیں بھولتی۔ سائے کی طرح وہ میرے ساتھ ہے ــــ میں خوف زدہ ہوں، وہ بے خوف ہے ــــ میں روتا ہوں وہ ہنستا ہے ــــ میں فانی ہوں، وہ غیر فانی ہے۔ میں نے نہ اس کا نام سُنا تھا اور نہ اس کو اس سے قبل کبھی دیکھا تھا۔ دلّی میں ہمارے گروپ کی خفیہ مجلس کی میٹنگ تھی۔ اس کی طرف میری توجہ بالکل نہیں تھی، وہ میرے پاس ہی کھڑا ہوا کتے کے ایک نوزائیدہ بچّے کے ساتھ کھیل میں مصروف تھا۔ میرے گروپ کے کارکن نے میرے قریب آکر سنجیدہ لہجہ میں رازداری سے کہا۔

" اس نوجوان کو اچھی طرح پہچان لو ــــ اس سے تمھارا واسطہ پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ کارکن چلا گیا اور میں اس نوجوان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ شاید کارکن ہم دونوں کو کوئی اہم کام سپرد کریں گے۔

میں نے اس شخص سے ہنس کر کہا۔ " یہ کُتّے کا پلاّ کتنا پیارا اور خوبصورت ہے۔"

نوجوان نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا،

"کاش میں اس کا حقیقی بھائی ہوتا۔!"

میں نے قہقہہ لگایا اور وہ مسکرا کے رہ گیا۔ پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور اس دن سے وہ میرا دوست ہوگیا۔

دن گزرتے گئے اور ہم دونوں جلد ہی ایک جان دو قالب ہوگئے۔ بے تکلف اور بے لوث دوستی مزید گہری ہوگئی۔ وہ مجھے اپنے گاؤں بھی لے گیا۔ گاؤں کے ایک کنارے کشادہ جگہ پر اس کا اچھا خاصا بلند مکان تھا۔ وہ گاؤں کے زمیندار کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کی ماں نے دو ہی دن میں مجھے بیٹا کہنا شروع کردیا۔ میں وہاں ایک ہفتہ رہا اور اپنے ہوش میں پہلی بار میں نے وہاں ماں کی ممتا کا احساس بھی کیا۔ پھر میں واپس چلا آیا۔ اب تو اس کے بغیر کہیں میرا جی بھی نہیں لگتا تھا۔ ایک دن جذبات کی رو میں اس نے کہا:

"اگر کسی اچانک حادثہ میں ہم دونوں میں سے ایک عورت کی شکل میں تبدیل ہوجائے تو میں تم سے شادی کرلوں۔"

کارکن سے میں نے پوچھا بھی کہ "تم نے اس سے دوستی کرنے کو کیوں کہا تھا؟" وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا:۔ "وقت آنے پہ معلوم ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے کارکن کے چہرے پر ہمیشہ ایک بُت کی طرح حد درجہ سنجیدگی رہتی۔

ایک دن کھانا کھانے کے بعد اس کا خط ملا جو میری جیب میں آج بھی موجود ہے۔ لیکن کسی کو دکھلاؤں گا نہیں ــــ



گورنر اتر پردیش
جناب
محمد عثمان عارف
۴ جون ۱۹۸۷ء
کو
راج بھون (لکھنؤ)
قائم مقام چیف جسٹس
شری ڈی، این، ح
سے
محو گفتگو ہ



مرکزی وزیر مملکت برائے کپڑا شری رام نواس مردھا ۶ جون کو لکھنؤ میں منعقدہ ایک تقریب میں مجسمہ سازی کے ممتاز
شری اوتار سنگھ پوار کو اعزاز دیتے ہوئے۔ تصویر میں اتر پردیش کی وزیر ریاست برائے اطلاعات شریمتی دیپا کول بھی نظر آرہی



وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ ۲۸ر اپریل کو ضلع الموڑہ میں نو تشکیل شدہ تحصیل بھکیاسین کے دفتر اور رہائشی عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔

وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ ۱۰ر مئی کو لینس ڈاؤن شہر صدی تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے۔





وزیر اعلا
شری ویر بہادر سنگھ
۱۴ ر اپریل کو
گڑھوال ترقیاتی
کارپوریشن کی
جانب سے تعمیر شدہ
ہوٹل کے
افتتاح کے موقع پر
اظہار خیال
کرتے ہوئے۔

وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ ۵ ر اپریل کو ضلع گورکھ پور میں بابو مہا ودیالیہ (پی پی گنج) میں تعمیر ہو
اندرا پریہ درشنی آڈیٹوریم کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے۔





وزیر تعلیم شری سبط رضی ۱۶ جون کو تلک ہال لکھنؤ میں ضلع تعلیم بالغان افسران
کو خطاب کرتے ہوئے ۔



ڈاکٹر اختر بستوی
آل انڈیا ریڈیو گورکھپور
کے
اُردو-ہندی کہانی
سیمینار/ورکشاپ
میں
اپنا مقالہ پیش
کرتے ہوئے

اس کو دیکھ کر راحت کی دو سانس لے لیتا ہوں، آنسو بہا کر دل ہلکا کر لیتا ہوں۔ پرانے بیمار کے لیے جیسے کوئی دوا خوراک بن جاتی ہے اسی طرح میرے درد کے لیے بھی یہ خط خوراک بن جاتا ہے۔!!

میں خط پڑھ بھی نہیں پایا تھا کہ کارکن نے مجھے بلا بھیجا میں اس کے سامنے جا کر سادگی سے کھڑا ہو گیا۔ بارہ پردھان حاضر تھے، فضا پر عجیب سناٹا سا طاری تھا۔ آنے والے بھیانک سچ کا عکس نمایاں ہو رہا تھا۔ میں ایک ہی منٹ میں مزید سنجیدہ اور ارادہ کا پختہ ہو گیا۔ کارکن کی پراسرار نگاہیں میری آنکھوں پر اس طرح گڑ گئیں جیسے لوہے کی گرم سلاخیں آنکھوں میں پیوست کر دی گئی ہوں۔ میں پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا۔ جیسے آنکھوں کی پتلیاں نذرِ آتش ہو گئی ہوں۔ پانچ منٹ کا وقفہ گزر گیا۔

کارکن نے بڑی سنجیدگی سے کہا، ہوشیار! کیا تم تیار ہو؟"

میں دراصل تیار تھا۔ میں چونکا بھی نہیں۔ بہرحال میں اس مجلس کا ایک امیدوار رکن تھا۔ میں نے اس مجلس کے ضابطے کے بموجب سرِ تسلیم خم کر دیا۔ بھگوت گیتا کی سرخ ریشمی جلد والی مقدس کتاب میز پر رکھ دی گئی۔ قاعدہ کے بموجب میں نے اس کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

کارکن نے میرے ہاتھوں سے مقدس کتاب لے لی، ایک لمحہ سناٹا چھایا رہا۔ کارکن نے یکایک میرے دوست کا نام لیا اور ایک ریوالور میز پر میرے سامنے رکھ دیا۔

"ریوالور"!

چھ حروف کا یہ لفظ چھ گولیوں کی طرح میرے دماغ کو چھید گیا لیکن میں کانپا تک نہیں۔ سوال کرنے اور سبب پوچھنے کے لیے پہلے ہی منع کر دیا گیا تھا۔ حسبِ ضابطہ میں نے ریوالور اٹھا کر سینے پر رکھا اور فوراً میں سفر پر روانہ ہو گیا۔

وہ اسٹیشن پر موجود تھا۔ اپنے خط اور میری دوستی پر اسے اتنا یقین تھا کہ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں میں چار روز رہا۔ میرا دماغ سُن ہو گیا تھا۔ دل دھڑک رہا تھا لیکن ہوش و حواس قائم تھے۔

چوتھے دن ناشتہ کر کے ہم دونوں اسٹیشن کی طرف چلے۔ تانگہ نہیں کیا۔ جنگل میں سیر سپاٹے کا خیال تھا۔ مختلف اشعار پڑھ پڑھ کر اس کو سناتا رہا۔ اس مستی کی کیفیت میں وہ میرا ارادہ نہ بھانپ سکا تھا۔ میرے دل میں کیا لاوا ابل رہا تھا، اس کا شائبہ تک اس کو نہ ہوا۔ دھوپ تیز ہو چلی تھی، پسینہ بہہ رہا تھا میں نے کہا:

"چلو کہیں سایہ میں بیٹھیں۔"

سامنے گھنا کنج تھا اسی جگہ بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی جیب سے دو امرود نکال کر اس نے کہا:

"صرف دو ہی بچے تھے، گھر کے باغیچہ کے ہیں۔ یہیں بیٹھ کر کھانے کے لیے لایا تھا، ایک تمہارا ایک میرا۔"

میں نے بغیر کچھ کہے ایک امرود لے لیا اور کھا لیا۔ یکایک میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آدھا امرود کھا چکا تھا اور اس کی لذت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے ریوالور نکالا، گھوڑا چڑھایا اور لرزتی ہوئی آواز میں اس کا نام لے کر کہا:

"امرود پھینک دو۔ ایشور کا نام لو۔ میں تمہیں گولی مارنے جا رہا ہوں۔"!!

اسے یقین نہ ہوا۔ اس نے کہا "بہت اچھا، لیکن اسے کھا تو لینے دو۔"

میرے ہاتھوں سے میرے صبر کا دامن چھوٹ رہا تھا۔ میں نے دبی زبان میں کہا:

"اچھا کھا لو!"

کھا کر وہ کھڑا ہو گیا، سیدھا، سینہ تان کر اس نے کہا:

"اب گولی مارو"!

میں نے کہا: "مذاق مت سمجھو، میں تمہیں واقعی گولی مارنے جا رہا ہوں۔ تم ایشور کا نام لو۔"

اس نے ہنسی ہنسی میں ایشور کا نام بھی لیا اور پھر بظاہر سنجیدگی سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اپنا سینہ دبا کر کہا۔ "ایشور

"ایشور کی قسم! مذاق مت سمجھو، میں تمھیں گولی مارتا ہوں۔"
میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے کہا: "مارو!"

میں ایک لمحہ بھی دیر کرتا تو بے اختیار ہو کر بے عمل ہو جاتا۔ میری ہمت ہر لمحہ جواب دے رہی تھی۔ چنانچہ یکبارگی فضا میں دو آوازیں گونج گئیں۔ وہ کٹے ہوئے پیڑ کے تنے کی طرح زمین پر گر پڑا۔ دونوں گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔

میں وہاں سے بھاگا نہیں۔ خوف کے مارے ادھر اُدھر میں نے دیکھا بھی نہیں، رویا بھی نہیں۔ میں نے اُسکو گود میں اٹھایا اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو چکی تھیں، چشم زدن میں میں نے اپنا کام انجام دے دیا تھا۔ اسے دیر تک گود میں لیے میں اسی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ ابدی نیند سو چکا تھا۔ میری کیفیت بجنسہ اس ماں کی طرح تھی جس کا بچہ گہری نیند سو رہا ہو، اور اس ڈر سے کہ مبادا کوئی آہٹ ہو اور وہ نیند سے جاگ پڑے، میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

آخرکار میں اُٹھا، لکڑیاں چنیں، چتا بنائی، اس کو چتا پر رکھا اور آگ لگا دی، میں اس وقت تک وہیں بیٹھا رہا جب تک کہ وہ جل کر خاکستر نہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں اٹھا اور اسی گمنام مقام پر جا کر کھڑا ہو گیا، بارہوں پردھان وہاں موجود تھے، ریوالور انھیں واپس دے دیا۔ مقصد برآری کا اشارہ پورا ہوا۔ کارکن نے کھڑے ہو کر اسی سنجیدہ لہجہ میں کہا:

"تیرھویں پردھان کی کرسی تمھیں دی جاتی ہے۔"

میں نے کہا، "تیرھویں پردھان کی حیثیت سے میں پوچھتا ہوں کہ اس کا جرم مجھے بتایا جائے۔"

کارکن نے عاجزی کے ساتھ جواب دیا: "وہ ہماری خونی اور تشدد آمیز سرگرمیوں کا دراصل حامی نہیں تھا۔ ہمیں اس پہ سرکاری مخبر ہونے کا شبہ ہو گیا تھا۔"

میں کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔ کارکن نے اسی طرح سنجیدگی سے کہا۔ "نئے پردھان کی حیثیت سے تم اپنی طبیعت سے جو انعام چاہو مانگ سکتے ہو۔"

اب میں رو پڑا۔ میں نے کہا "مجھے میرا عہدنامہ واپس کردو۔ مجھے میرے قول و قرار اور عہد سے آزاد کردو۔ میں اسی مقتول کے گروپ کا ہوں۔ تم لوگوں میں اگر برہنہ شمشیر کے زخم برداشت کرنے کی ہمت نہ ہو تو اپنے کو مادر وطن کا سپوت اور سچا وفادار خادم کہنے سے انکار کردو۔ تمھاری ان ڈرپوک اور خونی حرکتوں سے مجھے نفرت ہے۔ میں قاتلوں اور خونیوں کا ہمنوا صلاح کار اور دوست نہیں بن سکتا۔ تم تیرھویں کرسی کو جلا دو۔"

کارکن نے غصّہ کا اظہار نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اسے غصّہ آیا ہی نہیں۔ بارہوں پردھان بُت بنے بیٹھے تھے کارکن نے اسی سنجیدہ لہجے میں کہا:

"تمھارے ان الفاظ کی سزا موت ہے لیکن مجلس کے ضابطہ کے پیش نظر تمھیں بطور انعام معاف کیا جاتا ہے۔"

میں اٹھ کر چلا آیا۔ سارا ملک چھان ڈالا۔ گھومتا ہی رہا۔ کہیں ٹھہرنے کا نام نہیں لیا۔ چین و آرام، سکون و اطمینان نام کے احساسات ہی مٹ چکے تھے۔ صرف وہ خط ہی مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔

آج بھی وہ خط میری آنکھوں کا نور اور دل کا قرار ہے۔

میری گرفتاری کا وارنٹ بھی نکلا تھا۔ دل میں ایک بار نہیں کئی بار خیال آیا کہ جرم قبول کرلوں اور پھانسی کے تختے پر لٹک جاؤں۔ پھر سوچا کہ مرتے ہی اس بھلے مانس دوست کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گا۔ مرنے میں اب کیا باقی ہے؟

میں جینا چاہتا ہوں، جیتے رہنے کی آرزو شدّت سے میرے دل میں ہے۔ جیتے جی میں اس کو دیکھ اور یاد رکھ سکتا ہوں۔

●●

شکیب رضوی
لکچرر کرائسٹ چرچ کالج
کانپور

طائرِ گم گشتہ

زیب غوری کی یاد میں

اڑتے اُڑتے اور اک طائر فضا میں کھو گیا
شام سے پہلے ہی شاخِ لامکاں پر سو گیا

اک ستارہ اور ٹوٹا، گم ہوا اور اک چراغ
چرخ کی پہنائیوں میں اب نہیں جس کا سراغ

ان کے سینوں میں بھی سارے حوصلے کمہلا گئے
اس کے ہم پرواز طائر تھک کے واپس آ گئے

اُڑتا پھرتا تھا فلک پر کہکشاں تا کہکشاں
قوتِ بازو تھی رشکِ طائرانِ گلستاں!

حوصلوں پر تنگ تھے چرخِ کہن کے فاصلے
نت نئے افلاک اس پرواز کو درکار تھے

سخت کوش و سخت جان و سختیٔ مشکل پسند
وہ اُڑاتا تھا ہنسی میں تلخیٔ نیشِ گزند

وسعتِ لامنتہا کی جستجو کرتا ہوا
نامرادی کو مسلسل جزوِ خو کرتا ہوا!

بے تھکن پرواز سے طوفاں کو سر کرتا رہا
تندیٔ بادِ مخالف میں بھی دم بھرتا رہا!

راحت و غم میں اسی رفتار سے بڑھتا گیا
ہر موافق اور مخالف دھار پر چڑھتا گیا

بڑھ گیا وہ ہر 'درخشاں' سے ضیا لیتا ہوا
میر و باقی کی غزل کو رابطہ دیتا ہوا

پیکرِ شعری سب اس کے زیست سے معمور ہیں
سارے خط و خال روشن نقش سب پُرنور ہیں

ہر مُرقّع سانس لیتا مسکراتا بولتا
استقامت کی نظر سے زندگی کو تولتا

رمز پاتی معنویت سمتِ نو لیتی ہوئی
ہر علامت ساز پر اک داستاں دیتی ہوئی

اس کے نغمے اس طرح بکھرے کہ سمتیں مٹ گئیں
رجعت و تجدید کی وہ ساری بحثیں مٹ گئیں

یوں صدی پر عظمتِ ساعت جتا کر چل دیا
اختصارِ زندگی کو منھ چڑا کر چل دیا

زرد رہ کر بھی زمینِ شاعری زرخیز ہے
بے نوا ہے چاک لیکن سازِ نغمہ بیز ہے

اب تو خلوت میں بھی چھُپ چھُپ کر پڑھا جاتا ہے زیب
کیا ہوا ہر بزم میں اب کیوں گنا جاتا ہے زیب

سہیل کاکوروی

غزل

وہ مجھ سے مل کے بھی روٹھا ہوا ہے
اسے شاید کوئی دھوکا ہوا ہے

ہمارے قتل کا چرچا ہوا ہے
وہ چہرا خوف سے اترا ہوا ہے

میں اس کو وہ مجھے بھولا ہوا ہے
زمانے کا چلن بدلا ہوا ہے

ابھی اُبھری تھیں چیخیں اور آہیں
ابھی کیسا یہ سنّاٹا ہوا ہے

نہ چھیڑو اب کوئی بھولی کہانی
ہمارا دل ذرا سنبھلا ہوا ہے

مجھے تو اپنی بربادی کا غم ہے
تمھارے ساتھ کیا قصّہ ہوا ہے

غزلیں

حبیب ہاشمی
۱۶۲ - جی ٹی روڈ
شیب پور - ہوڑہ - ۲

خموشی کی چھاؤں سے اس طرح رابطہ رکھیے
غموں کی دھوپ کو اپنے لیے ردا رکھیے

قریب ہو کے نہ بنیادِ حادثہ رکھیے
تعلقات میں تھوڑا سا فاصلہ رکھیے

پلٹ کے آئیں گی ماضی کی گم شدہ یادیں
فصیلِ شب کا دریچہ ذرا کھلا رکھیے

پرانے زخموں کی تفصیل جاننے کے لیے
نظر کے سامنے لمحوں کا آئینہ رکھیے

یہ شہر شہرِ ہوس ہے کسی بھی گوشے لیے
یہاں خلوص کا ہرگز نہ آسرا رکھیے

اگر بچانا ہو شیشے کو یورشِ غم سے
تو آپ وحشتِ تمنا میں حاشیہ رکھیے

زمین بوسی پہ مائل ہیں کھوکھلی شاخیں
غرور وقت کا ٹوٹے گا حوصلہ رکھیے

یہ رسمِ خندہ لبی بوجھ بن گئی یارو
چھپا کے کتنا بھلا دل کا آبلہ رکھیے

پرایا غم بھی احاطے میں اپنے جو رکھے
حبیب ایسا نگاہوں کا زاویہ رکھیے

مخمور کاکوروی

بھری محفل میں بھی تنہا بہت ہے
یہ دل ایسے میں گھبراتا بہت ہے

میں اس کو بھول جانا چاہتا ہوں
مگر وہ مجھ کو یاد آتا بہت ہے

تمہیں دنیا کی دولت ہو مبارک
ہمیں ماں باپ کا سایا بہت ہے

نہ چھوڑو شہر میں بچوں کی انگلی
بچھڑ جانے کا اندیشہ بہت ہے

میں سچائی تو لکھ سکتا ہوں لیکن
قلم چھن جانے کا خدشہ بہت ہے

تعصب کے چراغوں کو بجھا دو
اجالا ان کا زہریلا بہت ہے

مرے بازو تو کاٹے جا چکے ہیں
مگر سر آج بھی اونچا بہت ہے

نہ کچھ مخمور کے بارے میں پوچھو
سمندر ہے مگر پیاسا بہت ہے

●

آصف طاہری
۲۳۲/۹۹ - نالہ روڈ - کانپور

ریزہ ریزہ بکھر رہا تھا کون
آخرش مجھ میں مر رہا تھا کون

رات اے ذہن یہ بتا مجھ کو
گفتگو مجھ سے کر رہا تھا کون

شاخِ تخیل پہ پرندوں سا
رفتہ رفتہ اتر رہا تھا کون

خوف کی پھیلتی سیاہی میں
اپنے سائے سے ڈر رہا تھا کون

جان کر لفظ بے معانی سا
مجھ کو پامال کر رہا تھا کون

آخرش ذہن کے افق پر آج
نقش بن کر ابھر رہا تھا کون

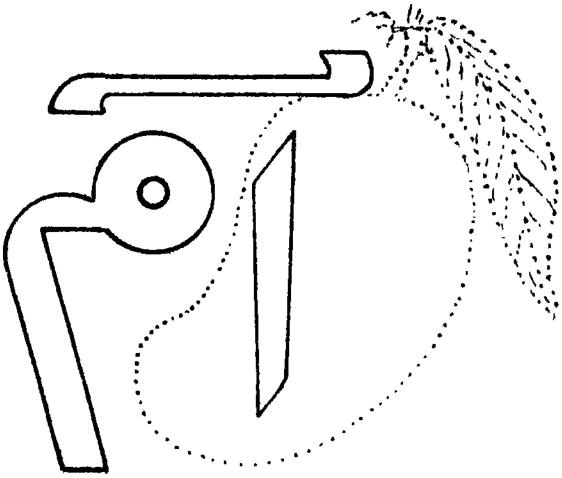
یہ بتا پتھروں کی بستی میں
آئینے سا نکھر رہا تھا کون

میرے اطراف میں ابھی یارو
خوشبوؤں سا بکھر رہا تھا کون

وقت کے سیپ میں بتا آصف
بن کے مثلِ گہر رہا تھا کون

اظہر مسعود رضوی

طنز و مزاح



آم کی فصل شروع ہوتے ہی ہماری عاقبت، عافیت اور تنخواہ تینوں کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔ یہ ایسا پھل ہے جو مٹھاس میں صبر کے پھل سے بڑھ کر ہے اسی لیے ہم اس فصل میں صبر کرنے پر آم کھانے کو ترجیح دیتے ہیں اور باقی ماندہ سال صبر کرنے میں بسر کرتے ہیں۔ جو حضرات بسر اوقات کے لیے صبر کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے وہ بھی دوسروں کے باغوں میں گھس کر علی الترتیب آم اور مار کھاتے ہیں۔ باغباں چوکس ہو تو پھر ثانی الذکر پر ہی اکتفا کرنا پڑتی ہے۔

علمِ باغبانی کی رو سے آم کی صرف دو قسمیں ہوتی ہیں قلمی اور تخمی۔ یوں اس کی اور بھی بہت سی قسمیں ہیں، مثلاً غلط العام، عرفِ عام، نیلام عام اور قتلِ عام وغیرہ۔ خبروں سے معلوم ہوتا ہے آج کل آخری قسم کی طرف رغبت خاصی بڑھ رہی ہے۔

'کھنڈرات' کی طرح آم کو بھی عربی جمع بنانے کا کوئی قاعدہ نہیں نصیب ہوا۔ لیکن جس طرح ترپھلہ کو ہندی سے تازی بنا کر اطریفل کر دیا گیا اسی طرح آم کو عین سے 'عام' کرکے اس کی عربی جمع بھی بنا لی گئی۔ کھٹے میٹھے، چھوٹے بڑے، گدر اور پلپلے بہت سے آم ایک جگہ جمع ہوں تو انھیں 'عوام' کہتے ہیں۔ عمدہ قسم کے شیریں اور نجیب الطرفین قلمی آم 'خواص' کہلاتے ہیں۔ موخر الذکر کے آگے اول الذکر اگر دال پکانے بیٹھے تو کبھی نہیں گلتی۔ آم اور انناس کو ملا کر ایک طرح کا مُربّہ بھی بنایا جاتا ہے جسے 'عوام الناس' کہتے ہیں۔ اس کو کھانے والے کا عام طور پر ستیاناس ہو جایا کرتا ہے۔

بعض آموں کے نام تو ایسے ہیں کہ انھیں کھانے سے پہلے 'جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں' ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی ایسے تعریف کرے: ـــــ

"کس قدر خوبصورت، کیسا لال بھبھوکا رنگ،
کتنی چکنی جلد کہ دیکھے سے نظر پھسلے ـــــ
حُسن آرا ـــــ اسم بامسمیٰ۔"

تو جناب 'چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے'، کسی مست ناز کی تصویر دل میں نہ کھُبے گی! البتہ حُسن آرا کے وصل کی لذّت سے بہرہ یاب ہونے کے لیے بس آپ کو ترکاری منڈی تک زحمت کرنا ہوگی۔

شاخِ طوبیٰ آپ کے مقدر میں ہو کہ نہ ہو لیکن جنّت کے پھل یعنی 'ثمرِ بہشت' سے آپ اسی عالم آب و گل اور اسی کالبدِ خاکی میں متلذذ ہو سکتے ہیں۔

آپ نے کبھی سنا ہے کہ کوئی بنگلور، کلکتہ یا مدراس یا ہو؟ ہاں لوک کہانیوں میں ایسے دیو ضرور ہوتے تھے جو آن واحد میں بستی کی بستی ہڑپ کر جاتے تھے۔ پھر بھی مکان، کوچہ و برزن توان سے محفوظ رہتے تھے۔ مگر ـــ جب چاہیں پورا بمبئی، ہضم کر جائیں!

موہن بھوگ، خاص الخاص، طوطا پری، جوہری، سفیدہ، ثانی گولہ، شہد گنتی، دسہری، فجری، گلاب خاص، بے نظیر ــ اہ وا ـــ نام لیتے ہی منہ میں رس گھلنے لگا۔

بعض دوسرے پھلوں کے مانند آم کے بھی بہت قافیے ہیں۔ مگر دو قافیے ایسے ہیں جو خود آدمی کا قافیہ تنگ کیے رہتے ہیں ـــ کام اور دام ـــ کام کے بغیر دام نہیں اور دام کے بغیر آم نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ ڈگی پٹوا دیتے تھے کہ باغوں میں آم بھرا ہوا ہے ـــ جس کا جتنا جی چاہے لے جائے ـــ ایک زمانہ یہ ہے کہ گٹھلیوں کے بھی دام کھڑے کر لیے جاتے ہیں ـــ گرانی کا یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب سونگھنے کے بھی پیسے پڑا کریں گے! وجہ اس کی کیا ہے؟ کل ہم جس پیڑ کے سائے میں لیٹ کر آم چوستے تھے آج اسی کی کرسی پر بیٹھ کر فاقہ مستی کرتے ہیں۔

مرزا غالب کے اشعار عام فہم نہیں، لیکن خود مرزا غالب بڑے 'آم فہم' تھے۔ آم کی حمایت میں اپنے مربیوں تک پر چوٹ کر جاتے تھے۔ گدھوں سے مرزا کو اسی لیے کد تھی کہ وہ (گدھے) آم نہیں کھاتے۔ اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کھانے کے ساتھ دوسروں کو آم کھلاتے بھی تھے مگر ان کے نزدیک 'حلوہ خوردن را روئے باید' کی طرح آم سے لطف اٹھانے کے لیے بھی طبیعت کا نکتہ رس ہونا ضروری تھا۔ جبھی تو انھوں نے کہا تھا ع

صلائے "آم" ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ڈاکٹروں، خاص کر ہڈی کے ڈاکٹروں کے لیے آم خود اپنے حصول کا ذریعہ پیدا کر دیتا ہے۔ اگر ایک طرف اس کے ہر دانے پر کھانے والے کا نام لکھا رہتا ہے تو دوسری طرف اس کے ہر چھلکے پر گرنے والے کا نام بھی لکھا ہوتا ہے کہتے ہیں آم کے چھلکے کو غرور و نخوت سے سخت نفرت ہے۔ یہ مضمون میر تقی میر نے ایک قطعے میں نظم کیا تھا۔ اس کا پہلا مصرع ہی یاد رہ گیا ہے ع

کل پاؤں ایک آم کے چھلکے پہ آگیا

اکبر الٰہ آبادی کے نام پر امرود یاد آتے ہیں اور جوش ملیح آبادی کا نام سن کر 'فکر و نشاط' کے بجائے سنہری رسیلی دسہریوں کا دھیان آتا ہے۔ مگر کلام پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ کھری، فجری، ہاتھی جھول، مالدہ اور ملغوبہ برس رہے ہیں میٹھے بھی اور پیٹ بھراؤ بھی۔ بعض آم ایسے ہوتے ہیں جن کا نسبی سلسلہ بڑی بڑی ہستیوں سے ملتا ہوا لگتا ہے۔ مثلاً 'انور راٹھور'، پرتھوی راج چوہان اور 'الفانسو' پکاسو کے خاندان کے افراد معلوم ہوتے ہیں۔

ہم میں سے بیشتر محبانِ اردو، گرمی کی چھٹیوں میں اپنے بچوں کو نہایت دیسی قسم کی استانیوں سے اردو پڑھواتے ہیں۔ یہ استانیاں اپنی زبان اور کھجور کے پنکھے کو بے تکان حرکت دیتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ ساکن حروف تک کو پنکھے کی ڈنڈی سے ذرا دھمکا کر متحرک کر دیتی ہیں چنانچہ 'دال' سے 'دَرَخت' اور 'ح' سے 'حَلَق' اکثر سننے کو ملتا ہے۔ استانی جی اگر اونگھنے، پنکھا جھلنے اور چھالیا کترنے کے عمل کو ترک کر کے سارا وقت پڑھانے کے مصرف میں لے آئیں تو ان کی رفتار کے مطابق بچہ چھ سال کی عمر میں پی، ایچ، ڈی کر کے لکچررشپ کے لیے درخواست دے سکتا ہے۔

ہمارے بچوں کی اردو تعلیم کا آغاز چونکہ آم کی فصل میں ہوتا ہے اس لیے انھیں آم کا اچار، آم کا مربہ اور آم کا امرس کھلانے کے ساتھ آم کا قاعدہ بھی پڑھایا جاتا ہے۔ جس طرح آم کے درخت میں ہر سال نئے سرے سے ایک ہی طرح کے آم آتے ہیں ٹھیک اسی طرح ہمارے بچے بھی ہر سال گرمی کی تعطیلات میں

آم کے قاعدے سے اُردو تعلیم از سرِ نو شروع کرتے ہیں۔

آم کی گٹھلی، جب تک اس میں جالی نہ پڑے، بجلی کہلاتی ہے۔ اسے چٹکی میں پکڑ کر دبائیے تو سٹ سے اُچھل جاتی ہے یہ کہہ کر کہ "بجلی رے بجلی، فلاں کی سسرال کدھر ہے؟" اسے دبائیے تو جس طرف یہ اُچھل کر جائے اسی طرف سسرال ہوتی ہے

ایک دفعہ ہمارے ایک دوست نے سسرال کی سمت معلوم کرنے کے لیے بجلی کو دبایا تو یہ اچھل کر چھپر میں اٹک گئی چنانچہ موصوف تاحال کنوارے ہیں۔ شادی کرانے والی ایجنسیاں اسی اچوک طریقے پر عمل کرتی ہیں۔ بسا اوقات ایسے جوڑے دیکھنے کو ملتے ہیں جن کے اتصال میں فہمِ انسانی سے زیادہ بجلی ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ آج کل بجلیوں کا رخ بالعموم مشرقِ وسطیٰ کی جانب رہتا ہے۔

ایک ایرانی سیاح سے ہاتفِ غیبی نے کہا (ایسی اوٹ پٹانگ بات اور کون کہے گا!) کہ ہندستان جا اور آم کھا۔ اس نے کہا "بچشم" اور رختِ سفر باندھ بوندھ ہندستان کی راہ لی اور وہاں پہنچتے ہی پوچھا:

"آم۔؟"

لوگوں نے کہا۔ "وہ کیا بکتا ہے"!

اس نے دیکھا کہ آموں کا ایک بڑا سا ڈھیر لگا ہے اور انبوہِ کثیر خوانِ نعیما کی طرح اس پر ٹوٹا پڑتا ہے۔ اس نے سوچا کہ مرغوبِ عوام یہی سب سے اچھا آم ہوگا۔ (اس سے ثابت ہوا کہ قوتِ خرید اور قیمت کا اشیاء کی فروخت پر کیا اثر پڑتا ہے، اس کی واقفیت اسے قطعی نہیں تھی) پیسے کی پن سیری خرید کر گھر لے آیا (اس کے معنی اس وقت فائیو اسٹار ہوٹل بھی نہیں تھے) سوءِ اتفاق سے وہ نہایت حقیر قسم کا کھٹا تخمی تھا، میٹھا اس میں تھی بھی تو دال میں نمک برابر۔ ایک آم کو منہ میں لگا کر دبایا تو ریشوں میں لپٹا ہوا دو بوند کھٹ میٹھا رس زبان پر ٹپک گیا۔ ہر دانے کا یہی حال۔ تنگ آکر تمام پھل سڑک پر اچھال دیے (اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حال کا ہے) اور مزید سیاحت کا ارادہ ترک کرکے اُلٹے پاؤں وطن واپس پھر گیا۔ وہاں بعد آداب و سلام کے ہاتفِ غیبی نے پہلا سوال یہی کیا کہ

"آم کھایا۔؟"

اس نے کہا "کھایا!"

بڑے اشتیاق سے پوچھا: "کیسا لگا۔؟"

اس نے منہ بنا کر جواب دیا: "اگر داڑھی پر سکنجبین مل کر چوسنا تمھیں اچھا لگے تو ہمیں آم بھی اچھا لگا"!

اس حکایت سے ایک بہت اہم بات معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ ایران میں ہاتفِ غیبی کی مصروفیات گوناگوں ہیں۔ ہمارے یہاں تو مادۂ تاریخ نکالنے کے سوا اسے کوئی کام ہی نہیں!

ضمیر نقوی

غزل

تیرا مریض ہوش میں ہے یا کہ غش میں ہے
حالات کہہ رہے ہیں بڑی کشمکش میں ہے

ہوتا ہے زندگی میں عروج اور کبھی زوال
کیوں سوچتے ہو زیست عجب کشمکش میں ہے

کھنچتا ہے دل جو ملتی ہے اس سے کبھی نظر
اُف کتنی دل کشی نگہِ ماہ وش میں ہے

سنتے بھی ہو ضمیر یہ کیا کہہ رہے ہیں لوگ
تہذیبِ حسن و عشق عجب کشمکش میں ہے

**

میر انیس کا
منسوخ شدہ کلام



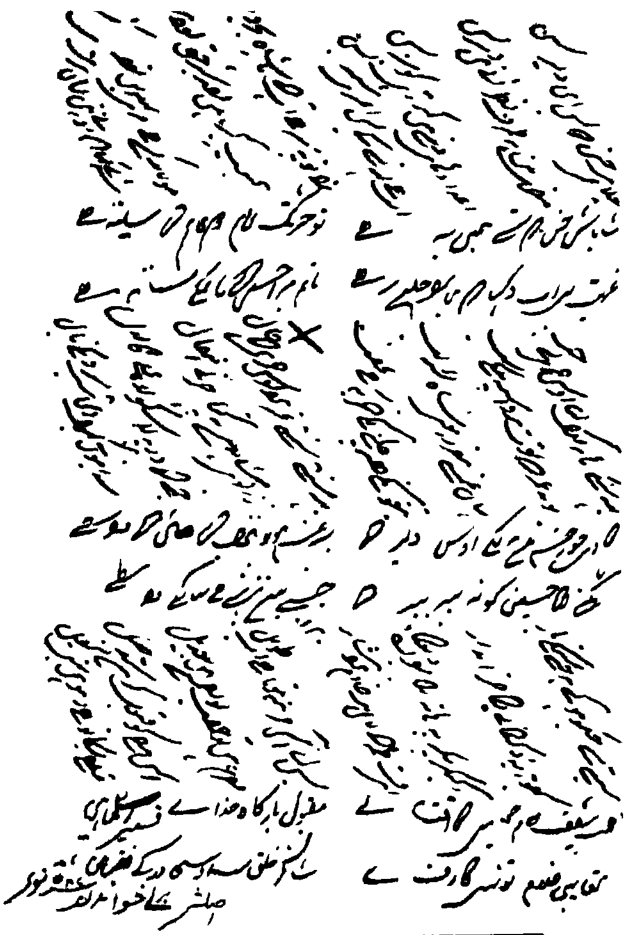
ولی سے جوش و آثر تک اردو شاعری نے کتنے ہی تدریجی مراحل طے کیے۔ زبان و بیان میں ردّ و قبول الفاظ کی کتنی ہی تحریکیں معرضِ وجود میں آئیں پنپیں اور سرسبز ہوئیں، فکر و فن اور تہذیب زبان کے اس طویل تر دور میں منظرِ عام پر جن افراد نے اپنے نقوشِ افکار ثبت کیے ان میں میر انیس کا نام سرِفہرست ہے۔ متعدد جلدوں پر مشتمل مطبوعہ کلام اور بستوں میں محفوظ غیر مطبوعہ کثیر المقدار کلام انیس کی عظمت فکر کی ناقابلِ فراموش دلیل ہے۔ شبلی نعمانی کے قول کے مطابق "میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے ..."

حالی جو اردو شاعری کے مصلح اور فنِ تنقید کے بانی شاعر تھے، انھوں نے بھی جب غائر نظر سے اردو شاعری کے سرمائے کا جائزہ لیا تو وہ بھی میر انیس کے کمالِ فن کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے اور ان کی زباں دانی کے آگے انھیں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا: "میر انیس کو اردو شعراء میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے شاید میر انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں مگر اس کی زبان کو اہلِ زبان کم مانتے ہیں: بخلاف میر انیس کے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر محاورے کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے..." کچھ اسی طرح کا اظہار سر تیج بہادر سپرو نے بھی کیا ہے: "انیس نے جس خوبی سے خارجی واقعات و مقامات کی مناظر کشی کی ہے اس پر صرف انھیں کی وہ داخلی شاعری فوقیت لے جا سکتی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ناقابلِ تقلید زبان میں ہر حساس طبیعت کو متاثر کرتے ہیں، پاکیزہ اور نکھری ہوئی اردو کے ماہر کی حیثیت سے ان کا کوئی ہمسر نہیں۔"

میر انیس کے تذکرہ نگاروں میں مہدی حسن احسن، نظم طباطبائی، مزاج دہلوی، اشہری، امیر احمد علوی کاکوروی، سید مسعود حسن رضوی ادیب، علامہ اختر علی تلہری، ڈپٹی جعفر علی خاں اثر لکھنوی، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری اور ڈاکٹر سید صفدر حسین ممتاز محققین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان تمام حضرات نے اپنے اپنے طور پر انیس کی شاعری کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور بعض نے نئے گوشے تلاش کیے ہیں، انیس کی شاعری

کے بارے میں سید مسعود حسن رضوی فرماتے ہیں: "حقیقت یہ ہے کہ معنوی حیثیت سے یا تاثرات کے اعتبار سے شاعری کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں، انیس کے مرثیے ان سب پر حاوی ہیں۔ شاعری جذبات کی ترجمانی ہو یا خیالات کی، وجدان کی تعبیر ہو یا حیات کی، تخیل کی جولاں گاہ ہو یا محاکات کی، اس کا مقصد فنی حسن کی تخلیق ہو یا انسانی اخلاق کی تکمیل، سکونِ قلب کی تحصیل ہو یا کسی پیغام کی تبلیغ، مختصر یہ کہ شاعری کی جو تعریفیں کی گئی ہیں، اس کے جو محاسن قرار دیے گئے ہیں، اس کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں، ان سب کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا شمار اعلا درجے کی شاعری میں ہوگا۔ ایسی جامع صنفِ سخن انیس کے مرثیے کے سوا اور کون ہے؟ انھوں نے فلسفیانہ بحثیں کرکے صرف ترقی یافتہ دماغوں کے اطمینان کا سامان ہی بہم نہیں پہنچایا ہے بلکہ انسانی کرداروں کے بولتے چالتے مرقعے پیش کرکے دلوں کو اس طرح سے متاثر کیا ہے کہ معمولی فہم کے انسان بھی انیسی تعلیم سے بلا ارادہ اور بغیر خواہش و کوشش کے مستفید ہو سکتے ہیں۔ انسانیت کے بلند ترین معیار کو پیش نظر رکھ کر جس پُر اثر اور عملی طریقے سے میر انیس کے مرثیے نیکیوں کی تعلیم دیتے ہیں، اس کی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔۔۔"

انیس نے ساری عمر شاعری کے معیار کو بلند تر کرنے کی کوشش کی، انھوں نے اپنے مراثی میں نظم کردہ روایات و واقعات کو اپنی تخیلی بلندیوں سے اس حد پر پہنچانے کی فکر کی کہ خود اپنے ہی قول کے مطابق "وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے۔۔" انیس نے اپنے کلام کے بیشتر حصوں میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں کیں اس کا تفصیلی جائزہ ابھی تک کسی محقق نے نہیں لیا۔ راقم السطور کے پیش نظر انیس کے ایک ایسے مرثیے کے اصلاح شدہ کچھ حصے ہیں جو تقریباً ۱۴۲ سال کا طویل زمانہ گزرنے کے بعد بھی انیس شناسوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس تغیر و تبدل سے انیس کی مزاجی کیفیت اور ذہنی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، انیس نے اپنے



عکس تحریر میر انیس

بعض مراثی کے بعض حصوں کو نظری کر دیا تھا اور ان کے بعض بندوں کو منسوخ قرار دیا تھا اسی بنا پر مجھے بارہا خیال آیا کہ کیوں نہ اس منسوخ شدہ کلام کو منظر عام پر لایا جائے، ہو سکتا ہے کہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کو اس حصہ کلام سے کچھ فائدہ ہو جو انیس کے نزدیک کمتر تھے۔ چنانچہ پیش نظر تمام بند غیر مطبوعہ ہیں اور راقم کی تحقیق کے مطابق اب تک کے تمام مطبوعہ کلام انیس میں ان کا کہیں طبع ہونا ثابت نہیں۔ انیس نے ان بندوں کو "نظری" کر دیا تھا اس لیے اس کی نقلیں خاندان میں محفوظ ذخیرے سے باہر نہ جا سکیں۔ پیش نظر مرثیے کے جو حصے نول کشور کی مطبوعہ جلد میں دستیاب ہوئے ہیں مختصر طور پر حوالہ کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں اور

جو غیر مطبوعہ حصے پیشِ نظر ہیں انھیں بھی ان حصوں کے روبرو ربط و ترتیب کے حوالے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مطبوعہ

۱
مہرِ سپہرِ عزّ و شرافت ہے فاطمہؑ
شرحِ کتابِ عصمت و عفت ہے فاطمہؑ
مفتاحِ بابِ گلشنِ جنّت ہے فاطمہؑ
نورِ خدا و آیۂ رحمت ہے فاطمہؑ
رتبے میں وہ زنانِ دو عالم کا فخر ہے[1]
حوّا کا افتخار ہے مریم کا فخر ہے

۲
زہرا کو کیا خدا نے دیے رتبۂ جلیل
خدمت گزار جن کے سرافیل و جبرئیل
اس سیدہ کا کوئی جہاں میں نہیں عدیل
جس کی کفیل فاطمہ اس کا خدا کفیل
ہے فوق اس کے مرتبے کو مہر و ماہ پر
لکھا ہے نام فاطمہ عرشِ الٰہ پر

۳
اللہ ری فاطمہؑ کی بزرگی زہے شرف
بابا ملا تو فخرِ رسولانِ باسلف
شوہر ملا امیرِ عرب اور شہِ نجف
اللہ نے حسینؑ و حسنؑ سے دیے خلف
دونوں امامِ خلق کے حاجت روا ہوئے
مشکل کشا کے بیٹے بھی مشکل کشا ہوئے

۴
وہ فاطمہؑ کہ جو ہے سراپا خدا کا نور
پروانہ جس کے چہرۂ اقدس کا شمعِ طور
گر حور اس کو کہیے تو ہے عقل کا قصور
اس کے قدم کی خاک ہے سرمہ برائے حور
کس کو ملا یہ رتبۂ اعلا جہان میں
بھیجا خدا نے آیۂ تطہیر شان میں

غیر مطبوعہ

۱
کیا مرتبے بتولؑ کو حق نے عطا کیے
لطف و کرم کریم نے لاانتہا کیے
فردوس کے طعام عنایت صدا کیے
نقشِ قدم پہ آنکھ فرشتے ملا کیے
یاں تک خدا کو خاطرِ بنتِ رسولؑ تھی
جس وقت ہاتھ اٹھا کے دعا کی قبول تھی

۲
مردوں میں مرتضیٰؑ کو کیا حق نے انتخاب
اور عورتوں میں فاطمہ زہرا ہے لاجواب
یہ ہیں شفیعِ حشر تو رحمت کا وہ ہیں باب
ہے ایک ماہتاب تو ہے ایک آفتاب
وہ اشرف النسا یہ شرف کائنات کا
دریادہ نور کا یہ سفینہ نجات کا

۳
اللہ ری فاطمہؑ کی بزرگی زہے وقار
حوّا کا فخر حضرتِ مریم کا افتخار
بابا ملا تو فخرِ رسولانِ روزگار
شوہر ملا امیرِ عرب شیرِ کردگار
بیٹے حسنؑ حسینؑ سے عالی جناب ہیں
اک آسمانی نور کے دو آفتاب ہیں

۴
یہ دخترِ رسول کا ہے عزّ و احتشام
لکھا ہے اپنے عرش پہ جس کا خدا نے نام
ہے فاطمہؑ پہ عصمت و عفت کا اختتام
وہ لائقِ درود ہے وہ لائقِ سلام
شہرہ زبس ہے عرش پہ اس نامِ پاک کا
روحانیوں میں شور ہے روحی فداک کا

---

[1] ملاحظہ ہو جلد دوم صفحہ ۳۵ - مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ (قدیم ایڈیشن)

مذکورہ مرثیے کے پانچ بندوں کے بعد بند ۵ اور ۶ مطبوعہ اور قلمی نسخے میں یکساں ہیں لہٰذا عمداً ترک کئے جاتے ہیں — بند ۷ اور ۸ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں صورتوں میں پیش خدمت ہیں۔

مطبوعہ

۷ شمس الضحیٰ علیؑ ہیں تو بدر الدجیٰ ہے یہ
وہ جسم ہے تو جانِ دلِ مصطفیٰ ہے یہ
بحرِ سخا علیؑ، گہرِ بے بہا ہے یہ
عبدِ خدا ہے یہ تو کنیزِ خدا ہے یہ
زاہد ہیں حق پرست ہیں خوش خو ہیں نیک ہیں
دونوں خدا کے فضل سے رتبے میں ایک ہیں

۸ دونوں کا ایک نورِ خدا سے ظہور ہے
ظاہر ہیں ان میں رجس سے ہر ایک دور ہے
ہیں خاصگانِ حق رب ان کا ضرور ہے
وہ نورِ چشم ہے تو یہ دل کا سرور ہے
ناری ہے جس نے دونوں کی خاطر ملول کی
ان کی خوشی، خوشی ہے خدا اور رسولؐ کی

۹ حقا کہ فاطمہؑ کے فضائل ہیں بے شمار
دوزخ پہ اور خلد پہ اس کا ہے اختیار
لکھا ہے ہوگا عرصۂ محشر جو آشکار
اس روز ہوگی نور کے ناقہ پہ وہ سوار
تابندہ ہوں گے لعل و زبرجد زمام میں
حوریں جلو میں ہوں گی ملک اہتمام میں

۱۰ ہو دیگا حق سے حکم شفاعت کا سر پہ تاج
قیمت نہ جس کی ہو سکے کونین کا خراج
ہوئے گی اس سے سب کو شفاعت کی احتیاج
غل ہوگا دیکھو مرتبۂ فاطمہؑ کو آج
کس دبدبے سے بیٹی پیمبرؐ کی آتی ہے
سر کو سواری شافعِ محشر کی آتی ہے

غیر مطبوعہ

۷ گو ہے لقب علیؑ کا شہنشاہِ دوسرا
آفاق میں بتولؑ بھی ہے اشرف النساء
میرا وصی ہے گر میری امت کا پیشوا
ہے فاطمہؑ زنانِ دوعالم کی رہنما
دونوں پہ ایک ساتھ کرم ذوالجلال ہے
وہ نادرِ جہاں یہ عدیم المثال ہے

۸ دونوں ہیں پارۂ جگرِ سیّد البشر
ٹکڑا ہے ایک دل کا تو اک قوتِ نظر
دریائے معرفت کے ہیں دو بے بہا گہر
ہیں ایک آسمانِ شرافت کے دو قمر
ذی مرتبہ ہیں اہلِ کرم ہیں سعید ہیں
یہ بھی شہیدِ ظلم ہیں وہ بھی شہید ہیں

۹ کس کا یہ مرتبہ ہے جو خیر النساء کا ہے
ہر لحظہ سایۂ کرم ان پر خدا کا ہے
جس طرح ان کو سامنا رنج و بلا کا ہے
ویسا ہی اس پہ خاتمہ صبر و بلا کا ہے
اس کے سبب سے مومنوں کی رستگاری ہے
[...] پیاری ہے یہ خدا کی پیاری ہے

۱۰ گو فاقہ کش ہے فاطمہؑ یا ہے شکستہ حال
حق نے کیا ہے اس کو غنی بے متاع و مال
دولت وہ دی کہ جس کو ابد تک نہیں زوال
پایا ہے اس نے فقر میں الطاف ذوالجلال
بخشا ہے عاصیوں کو نہ کیوں رستخیز میں
جنت ہو جس کی ملک میں عقبیٰ جہیز میں

اے مومنو فضائل زہرا ہیں بے شمار
دوزخ پہ اور خلد پہ اس کا ہے اختیار
لکھا ہے ہوگا عرصۂ محشر جو آشکار
اس روز ہوگی نور کے ناقہ پہ وہ سوار
تابندہ ہوں گے لعل و زبرجد زمام میں
حوریں جلو میں ہوں گی ملک اہتمام میں

کوثر پہ ہوں گے ساقی کوثر بہ احتشام
اور دستِ حق پرست میں ہو دیگا ایک جام
فرمائیں گے کہ شوق میں تم جس کے تھے مدام
حاضر ہے یہ شراب پیو گر ہو تشنہ کام
کھینچی ہے جو کہ حشر کی زحمت وہ دور ہو
مجھ کو بھی ہو سرور تمہیں بھی سرور ہو

اک سمت ہوں گی شوق میں حوران حلہ پوش
آویز ہائے لعل و زبرجد میان گوش
گلہائے مشک فام پڑے ہونگے تا بہ دوش
ہو دیگا مومنو کی محبت کا دل میں جوش
سب سے کہیں گے حسرت بوس و کنار میں
آؤ کہ بیقرار تھے ہم انتظار میں

وہ نعمتیں لذیذ وہ اشجار میوہ دار
خود جن کی شاخیں آئیں گی جھک جھک کے بار بار
وہ سیب خوش مذاق وہ شیرینی انار
ہر برگ برگ سے یہ صدا ہوگی آشکار
ہم ان کے ہیں جو دوست بتول و علی کے ہیں
یہ سب ثمر مودّتِ آلِ نبیؐ کے ہیں

مضمون کی طوالت کے پیش نظر دیگر حصوں کو ترک کر کے صرف وہ بند پیش کیے گئے جو بالکل غیر مطبوعہ تھے، میری نظر میں کئی مراثی اور بھی ہیں جن کے بند انیسؔ نے وقتاً فوقتاً تبدیل کیے ہیں۔ اگر اس موضوع پر کام کیا جائے تو کلامِ انیسؔ کے تدریجی ارتقا پر بھی مزید روشنی پڑ سکتی ہے۔

حواشی: مولانا آزاد کا شعری ذوق

صفحہ ۷ کا بقیہ

۱؎ مولانا کا یہ خط جو غلام رسول مہر کے نام ہے، مولانا آزاد کی ایک غیر مطبوعہ تحریر کے عنوان سے اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔ قومی آواز "لکھنؤ اور" مدینہ" بجنور نے اس پر یہی عنوان دیا ہے یعنی "مولانا آزاد کی ایک غیر مطبوعہ تحریر"۔ "آزاد ہند" کلکتہ نے اس خط کا یہ عنوان قائم کیا ہے" اپنی ابتدائی شاعری، اخبار نویسی اور علمی ادبی سرگرمیوں پر مولانا آزاد کا تبصرہ"۔ میں مذکورہ خط کا متعلقہ حصہ مدینہ، بجنور (یکم مئی ۱۹۵۰ء) سے نقل کر رہا ہوں۔ مہر صاحب کی وہ کتاب میرے سامنے نہیں ہے جس میں یہ خط چھپا ہے۔

۲؎ تھا جوشش و خروش اتفاقی ساقی — اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
میخانے نے رنگ روپ بدلا ایسا — میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

غزلیں

تنویر جمال بیب ابادی

جب بھی بدلا ہے نظامِ زندگی حالات نے
وقت سے لکھوائے قصے وقت کی ہر بات نے

دے دیا رنگِ تغزل جب انھیں جذبات نے
کر دیا بیدار محفل کو مرے نغمات نے

اس کو چونکاتی رہیں گی آہٹیں ماحول کی
وقت کی آواز سُن لی جس کے احساسات نے

عالمِ اسباب میں روزِ ازل سے آج تک
صورتیں بدلی ہیں کتنی حسنِ موجودات نے

چھپ گیا تھا چاند تو مبہم سی اُمیدوں کے ساتھ
چند تاروں کا سہارا لے لیا تھا رات نے

دھار پر تلوار کی چلتا تھا میں بھی اے جمالؔ
آزمائش کے لیے گھیرا تھا جب آفات نے

جاوید نسمی

میں خود سے دُور بہت دُور بے قرار رہا
تمام عمر مجھے اپنا انتظار رہا

سُنے گا کون میری داستاں زمانے میں
زباں پہ زور نہ لہجے پہ اختیار رہا

یہ کون تشنہ دہاں تھا فرات جس کے لیے
قریبِ شام بھی موجوں میں انتشار رہا

یہ کون ڈھونڈنے نکلا ہے مجھ کو صحرا میں
نہ قافلہ نہ قبیلہ نہ جب غبار رہا

اسے پسند تھیں میری ضرورتیں کتنی!
وہ شخص میرے لیے کتنا بے قرار رہا

سمجھ نہ پایا زمانہ کبھی کسی غم کو
سدا نشاط کا جاویدؔ اشتہار رہا

راشد صدیقی

معرفت ہفت روزہ "اشتراک"
"تاملی پور خورد گورکھپور"

کیا کہیں کوچۂ دلدار میں کیا ہو کے رہے
کبھی پتھر کبھی آئینہ نما ہو کے رہے

موسمِ گل میں وہ طوفان بپا ہو کے رہے
جس قدر پھول تھے شاخوں سے جدا ہو کے رہے

آندھیوں نے مرے گلدان اُجاڑے لیکن
تیرے اشجار بھی بے برگ و نوا ہو کے رہے

کب تلک دریا کے سینے پہ اُبھرتے رہتے
بُلبلے کی طرح ہم بھی تو فنا ہو کے رہے

ان کی نازک سی ہتھیلی پہ کبھی ہم یارو
نقشِ گُل ہو کے رہے رنگِ حنا ہو کے رہے

کیا کریں پائی ہے کچھ ایسی ہی فطرت راشدؔ
ابنِ آدم ہیں گناہوں کی ردا ہو کے رہے

جسٹس مرتضیٰ حسین
لوک آیکت اترپردیش

شاہ کوکب القادری اور ان کی رباعیات

ہمارے صوبے میں بندیل کھنڈ کا علاقہ اپنی پتھریلی زمین اونچے نیچے ٹیلوں، چٹیل میدانوں اور گرمی کے دنوں میں بے پناہ تپش کے باعث چاہے جتنا سنگلاخ کہا جائے مگر وہاں کی سرخ رومٹی نے زنیکوں صوفیوں، سنتوں، شاعروں، ادیبوں اور جان پر کھیل جانے والے دیش پریمیوں کو جنم دیا ہے ——

صوفی مشرب بزرگ اور کہنہ مشق شاعر جناب شاہ کوکب القادری صاحب کا تعلق بھی اسی مردم خیز خطّے سے ہے۔ وہ ۲۵ر فروری ۱۹۱۲ء کو ضلع جالون کے قصبہ کونچ کے ایک مقتدر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورثِ اعلا سلسلۂ قادریہ کے مشہور بزرگ حضرت خورم شاہ تھے جن کی روحانی عظمت کا یہ ادنیٰ کرشمہ تھا کہ ان کے اشارے پر ان کے باغ کی دیوار کا ایک حصّہ اپنی جگہ چھوڑ کر دس قدم آگے بڑھ آیا تھا۔ ان کی خانقاہ "درگاہ عالیہ" کے نام سے آج بھی مرجعِ خلائق بنی ہوئی ہے۔ ۱۹۳۴ء سے کوکب صاحب اس درگاہ کے سجادہ نشین ہیں۔ اس روحانی منصب کے ساتھ ساتھ وہ قصبہ کی شہری اور سماجی زندگی سے بھی وابستہ ہیں۔ قریب بیس سال تک وہ وہاں کی میونسپلٹی کے ممبر، وائس چیرمین اور چیرمین کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔

کوکب صاحب نے آنکھ کھول کر اپنے گھر میں شعر و ادب کا چلن دیکھا۔ ان کے کئی ایک بزرگ فارسی شعرا میں اپنا مقام رکھتے تھے۔ جو شعر نہیں بھی کہتے تھے ان کی زبان پر مولانا روم، مرزا غالب اور دیگر شعرا کا کلام چڑھا ہوا تھا۔ اس ماحول نے کوکب صاحب کو بارہ برس کی عمر میں فارسی زبان میں شعر کہنا سکھا دیا۔

وقت کے ساتھ اردو شاعری کی مشق بھی بڑھتی گئی۔ وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو خداوندی عطیہ سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے ؎

کوکب مذاقِ شعر خداداد بات ہے
یہ ذوق وہ نہیں جسے پیدا کرے کوئی

پھر بھی ارتقائے فن اور شیریں سخنی کے لیے وہ فکرِ اشعار میں کوہ کنی کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

فکرِ اشعار میں جب کوہ کنی ہوتی ہے
تب میسّر کہیں شیریں سخنی ہوتی ہے

اس مسلسل کوہ کنی اور خداداد ذوقِ شاعری کے ساتھ اگر کسی شاعر کو اپنی اس اہمیت کا احساس ہو کہ ؎

ادبِ وقت کی تاریخ پہ چھا جائے جمود
ایک پل کو جو قلم اپنا سخنور رکھ دے

ان کا ذہن اپنے قلم کی طاقت کے بارے میں اتنا صاف ہو کہ ؎

ہاتھ سے ایک قلم کار کے چھوٹا ہوا تیر
توڑ کر وقت کے شہباز کا شہپر رکھ دے

اور اس کا شاعرانہ ضمیر وقت کے اس مطالبے پر کان بھی

لگائے ہو کر ؎

تیز آندھی میں ہے تہذیب کی پارینہ کتاب
کوئی اُڑتے ہوئے اوراق پہ پتھر رکھ دے

پھر اس کی فنی سربلندی کو جس منزل پر ہونا چاہیے وہی عظمت کوکب صاحب کے کلام کو حاصل ہے ان کی شاعری کی عمر اب ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ یوں تو انھوں نے شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے مگر غزلوں اور رباعیوں پر خاص ریاض کیا ہے۔

شعرائے متقدمین میں کوکب صاحب مرزا غالب سے الہانہ عقیدت رکھتے ہیں جو "پیروی" اور "استفادہ" کی منزلوں سے بڑھ کر "عشق" اور "غلامی" کی حدوں تک پہنچتی ہے، اسی سبب سے کوکب صاحب کے کلام میں ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کے اعتبار سے جگہ جگہ غالبیت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ غالب نے اپنے فارسی کلام کو "نقشہائے رنگ رنگ" اور اردو کلام کو "مجموعۂ بے رنگ" کہا تھا۔ کوکب صاحب کا خیال ہے کہ ملکِ ادب میں غالب کی شہنشاہی وہ مسلّمہ حقیقت ہے جو خانوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی اور مجموعی حیثیت سے ان کا کلام فکر و فن کا ایسا لہلہاتا چمن ہے جس کی حد بندی ممکن نہیں ہے۔
وہ فرماتے ہیں ؎

گلہائے معانی کا چمن ہے غالب
لاریب کہ اک خالقِ فن ہے غالب
ثانی نہیں اقلیمِ ادب میں جس کا
کوکب وہ شہنشاہِ سخن ہے غالب

قریب دو سال قبل کوکب صاحب کی غزلیات کا مجموعہ "دیارِ کہکشاں" کے نام سے منظرِ عام پر آکر سخن فہموں اور سخن سنجوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب اُن کے کلام کا دوسرا مجموعہ "رباعیاتِ کوکب" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں فارسی اور اردو کی چند غزلیں اور متفرق اشعار ہیں مگر زیادہ تر رباعیات ہیں۔

رباعی ایک مخصوص بحر میں چار مصرعوں کی اس مربوط نظم کا نام ہے جس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں فنی حیثیت سے رباعی ایک مشکل صنف مانی گئی ہے۔ کیونکہ رباعی میں شاعر کو مقررہ وزن کا پابند رہ کر کسی ایک جذبے یا خیال کا اظہار اس صناعی سے کرنا ہوتا ہے کہ جو بات کہنی ہے وہ پہلے مصرعہ میں چھیڑی جائے۔ دوسرے اور تیسرے مصرعوں میں آگے بڑھائی جائے اور چوتھے مصرعہ میں کھل کر کہی جائے۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ مذہبی اختلافات کے باوجود ہمارے ملک کے سارے شہری آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ رباعی کے پیکر میں وہ اس بات کو یوں کہے گا ؎

ہم ہندو مسلمان سکھ عیسائی ہیں
ہر دھرم کے ہر دین کے شیدائی ہیں
فرزند ہیں مادرِ وطن کے کوکب
ہندی ہیں ہم، آپس میں سبھی بھائی ہیں

جو بات شاعر کہنا چاہتا تھا وہ اس نے کہی تو چوتھے مصرعہ میں مگر اس کا تانا بانا ابتدائی تین مصرعوں میں اس طرح بنا کہ اُن میں ہم آہنگی بنی رہی اور چوتھا مصرعہ اس بُنائی کے لازمی نتیجے کی شکل میں ابھر کر سامنے آگیا۔

اساتذۂ فن کے نزدیک حسنِ بیان کے اعتبار سے رباعی میں نظم کا دبدبہ بھی ہونا چاہیے اور غزل کی شوخی بھی۔ آنجہانی ضیا فتح آبادی نے فرمایا تھا ؎

نظم کی تمکنت غزل کا خراج
واہ کیا بات ہے رباعی کی

وزن، قوافی اور ردیف کی ساری پابندیوں کے ساتھ چاروں مصرعوں میں وحدتِ خیال باقی رکھنا اور نظم و غزل کے امتزاج کے ساتھ اپنی بات کہہ دینا شاعر کی مہارت اور چابک دستی پر منحصر ہوتا ہے۔ رباعی کے اس رکھ رکھاؤ میں اگر ذرا سا بھی فرق آجائے تو رباعی، رباعی نہیں رہ جاتی، قطعہ بن جاتی ہے
رباعی کو عربی شعراء نے بھی اپنایا تھا مگر فارسی شعراء نے اسے جی کھول کر گلے لگایا۔ وہ اسے ترانہ یا دوبیتی بھی کہتے

تھے۔ فارسی میں رُباعیات کہنے والوں میں عمر خیام کا نام خاص شہرت کا حامل ہے۔ اس نے زہد و رندی کے لوازمات ظاہری کو علامتوں کے طور پر استعمال کرکے صوری اور معنوی اعتبار سے اپنی رُباعیوں کو اتنا سنوارا اور نکھارا کہ وہ گنجینۂ اخلاق بن کر الہامی عظمتوں کی حامل ہو گئیں۔ ان کے ترجمے آج دنیا کے ہر ترقی یافتہ ادب میں ملتے ہیں۔ اُردو شعراء میں بہتوں نے عمر خیام کی رُباعیوں کے ترجمے کئے ہیں اور خود بھی بلند پایہ رباعیاں کہی ہیں۔

کوکب صاحب رُباعی کے میدان میں عمر خیام کا لوہا مانتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ذہنی کاوش "رباعیات کوکب" کو بہ یادِ عمر خیام اس عقیدت کے ساتھ نذر کیا ہے ؎

خیّام وہ پیغمبر و دانائے کلام
ہر حرف رُباعیات جس کا الہام
تاریخ ہے انتساب کی از سرِ ہوش
"گنجینۂ اُردو ہے یہ نذرِ خیّام"

کوکب صاحب نے عمر خیام کی بہت سی رُباعیوں کا ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے کچھ اس مجموعہ میں شامل ہیں اور کوکب صاحب کی فن کاری کا مظہر ہیں۔ عمر خیّام کی ایک مشہور رُباعی ہے جس میں اس نے ایک مردِ پیر اور زنِ فاحشہ کی گفت گو کی آڑ میں پارسانہ ریاکاری پر یوں طنز کیا ہے ؎

پیرے بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی
کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم
تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی

اس مکالمے کے پیکر و رُوح کا لحاظ رکھتے ہوئے کوکب صاحب نے اس کا ترجمہ اس عنوان سے کیا ہے کہ ہر سننے والا یہ سمجھے کہ عمر خیام اُردو بولنا سیکھ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

اک پیر نے یہ فاحشہ عورت سے کہا
کیوں تو نے راہِ راست سے منھ کو موڑا
عورت نے کہا جیسی ہوں میں ظاہر ہوں
کیا آپ کا باطن بھی ہے صورت جیسا؟

یہی انداز ان سب رُباعیوں کا ہے جو ترجمے کی شکل میں مجموعے میں شامل ہیں۔

کوکب صاحب کی دیگر رُباعیات بھی جذبات کی گرمی، خیالات کی ندرت، الفاظ کی بندش اور وقت کی پکار کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔ شعر چاہے جس رنگ کا ہو اس کے پردے سے شاعر کا شخصی کردار جھانکتا رہتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار کوکب صاحب نے بھی غزل کے ایک شعر میں یوں کیا ہے ؎

فن ہی فن کار کے کردار کا آئینہ ہے
ورنہ فن کار کے کردار میں کیا رکھا ہے

کوکب صاحب کی شخصیت ان کے مذہبی عقائد، صوفیانہ طرزِ فکر سماجی زندگی کے تجربات اور حبّ الوطنی کے جذبات سے مل جل کر بنی ہے۔ ان کے کلام اور خاص کر رُباعیات میں ان کی فکر و نظر کے یہ سب پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں اور ان کے فن کو ان کے کردار کا آئینہ بناتے ہیں۔ مثلاً خالقِ کائنات کے بارے میں کوکب صاحب فرماتے ہیں ؎

ہر ذرّہ ہے گو نور سے اس کے معمور
نظارہ تو ہے تابِ نظر تک محدود
کوکب ہے مگر دیدۂ بینا مجبور
جلوہ ہے مگر پردہ بہ پردہ مستور

تصوف کے رنگ میں وہ حق کے ہر متلاشی کو وہ یوں دعوتِ نظارہ دیتے ہیں ؎

حاصل تجھے گر چشمِ بصیرت ہو جائے
اک آن حلِ عقدۂ کثرت ہو جائے
ہر شکل نظر آئے گی تجھ کو اپنی
دل تیرا جو آئینۂ وحدت ہو جائے

تخلیقِ کائنات کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہے لازم و ملزوم یہ ہستی و عدم
قائم ہے ازل سے یہ نظامِ عالم
یہ ارض و سما، شمس و قمر، بحر و بر
ہے مرکزِ کائنات ذاتِ آدم

رشتۂ خالق و مخلوق کے متعلق فرماتے ہیں ؎

جو شے ہے وہ فانی ہے تماشا کیا ہے
یارب تری قدرت کا کرشمہ کیا ہے
جب تیرے سوا کچھ نہ رہے گا باقی
پھر خالق و مخلوق کا رشتہ کیا ہے

فلسفۂ روح کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کب فلسفۂ روح کی گتھی سلجھی
عاجز ہی رہا فہم و شعورِ بشری
انسان پہ یہ رازِ مشیت نہ کھلا
کہنا ہی پڑا روح کو امرِ ربی

کہتے ہیں جسے روح وہ جوہر ہے لطیف
اس آئینے کو گرد سے کرنا نہ کثیف
تجھ سے تری فطرت کا تقاضا ہے یہی
ہر فعل ترا پاک ہو، کردار شریف

دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

جاری ہے عجب سلسلۂ نقش بر آب
مٹ مٹ کے ابھرتے ہیں جو ہستی کے حباب
کیا موت و حیات کی حقیقت کوکب!
یہ عالمِ آب و گِل ہے اک خواب و سراب

آدم کی جو نسلیں ہوئیں پیوندِ زمیں
تاریخ میں آج ان کا نہیں نام کہیں
دستورِ مشیت ہے وہی "کُن فیکون"
جس میں کوئی گنجائشِ ترمیم نہیں

ہر آن نئی چال پہ چل جاتی ہے
پستی میں بلندی کو بدل جاتی ہے
یہ وقت کی آہستہ خرامی کوکب
لمحات میں صدیوں کو نگل جاتی ہے

خالق کائنات نے اپنی دیگر مخلوق کے مقابلے میں انسان کو جو عظمتیں بخشی ہیں ان کی طرف انسان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کوکب صاحب فرماتے ہیں ؎

قدرت کے اس انعام کی قیمت سمجھو
انمول ہے یہ زیست کی دولت سمجھو
مسجودِ ملک، اشرفِ مخلوق ہو تم
انسان ہو، انسان کی عظمت سمجھو

اس کے باوجود انسان اپنے خالق سے منہ موڑ کر دوسروں کے در کی جبہ سائی کرتا ہے۔ یہی بات کوکب صاحب یوں کہتے ہیں ؎

ہے قبضۂ قدرت میں یہ سب ہست و بود
اک سانس پہ منحصر ہے آدم کا وجود
توہین ہے یہ عظمتِ انسانی کی
ہاتھوں سے تراشتا ہے اپنے معبود

معرفتِ الٰہی کے لیے حق و باطل کی تمیز اور ضمیر کی بیداری ضروری ہے۔ جب بھی انسان سیدھی راہ سے بھٹکتا ہے اس کا ضمیر اسے ٹوکتا ضرور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان ضمیر کی آواز پر کان نہ دھرے۔ اس کے متعلق دو رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

سمجھا نہ اگر تو حق و باطل کیا ہے
فہم و خرد و علم کا حاصل کیا ہے
بیدار اگر ہو نہ سکا تیرا ضمیر
تعبیر ترے خواب کی غافل کیا ہے

آلودۂ عصیاں ہے جو آدم کا خمیر   انسان کی فطرت ہے خطا و تقصیر
لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہنگامِ گناہ   اندر سے اک آواز تو دیتا ہے ضمیر

کردار انسانی کے روز افزوں زوال سے بے چین ہو کر کوکب

صاحب [illegible] اُٹھتے ہیں [illegible] کہتے ہیں کہ ؎

خوں ریزی و خونخواری و قتلِ انساں
کرتی ہے گوارہ کہیں عقلِ انساں
عبرت کا مرقع ہے یہ منظر کوکب
شیطاں نظر آتا ہے بہ شکلِ انساں

اور کبھی فرماتے ہیں ؎

تعمیر کی تخریب ہوئی ہے ہم سے
سچائی کی تکذیب ہوئی ہے ہم سے
اسلاف کے اخلاق کا جو ورثہ تھی
برباد وہ تہذیب ہوئی ہے ہم سے

وہ آوارہ بشر انسان کو یہ کہہ کر جھنجھوڑتے ہیں ؎

جو فطرتاً آلودۂ شر ہوتا ہے
مردودِ خلائق وہ بشر ہوتا ہے
ظالم کے لیے دیر ہے اندھیر نہیں
مظلوم کی آہوں میں اثر ہوتا ہے

حسنِ عمل کو انسانی کردار کی کسوٹی بتاتے ہوئے وہ راہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو یوں دعوتِ عمل دیتے ہیں ؎

ہے ساری یہ کائنات جاگیر تری
محدود نہیں قوتِ تسخیر تری
کردار تو ہے حسنِ عمل پر موقوف
تقدیر ہے وابستۂ تدبیر تری

بے کار کہیں سعیِ عمل جاتی ہے
تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے
ہاتھوں میں شناور کے ہو جس کی پتوار
طوفان سے کشتی وہ نکل جاتی ہے

کوکب صاحب چاہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ایسا انقلاب آئے کہ سیاسی مصالح کی بنا پر نہیں بلکہ محض انسانیت کے ناطے آدمی آدمی کا احترام کرے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

آلودۂ مصلحت محبت نہ رہے
انسان کو انسان سے نفرت نہ رہے
لانا ہے تو انقلاب ایسا لاؤ!
جب نام فریب کا سیاست نہ رہے

تغزل میں ڈوبی ہوئی دو رُباعیاں دیکھیے ؎

ممنونِ کرم رہتی ہیں آہیں کتنی
اشعار میں ڈھلتی ہیں کراہیں کتنی
ہر زخم ہرا ہو کے دُعا دیتا ہے
معصوم ہیں قاتل کی نگاہیں کتنی

وہ اشک جو پلکوں پہ جھلک اُٹھتے ہیں
دامن پہ گہر بن کے ڈھلک اُٹھتے ہیں
جذبات پہ رہتا نہیں قابو کوکب
پیمانے جب آنکھوں کے چھلک اُٹھتے ہیں

وطن کی عظمت اور حبُ الوطنی کی جب بات چھڑی تو کوکب صاحب نے جھوم جھوم کے فرمایا ؎

گل زار و گل و سرو و سمن ہے بھارت
تہذیبوں کا رنگین چمن ہے بھارت
یک جہتیِ قومی پہ ہے فخر اپنی ہمیں
ہندی ہیں، ہمارا یہ وطن ہے بھارت

یہ بلبل و گل، رُوح و بدن کا رشتہ
ماں باپ کا، بھائی بہن کا رشتہ
برحق ہیں زمانے میں یہ رشتے لیکن
ہر رشتے سے اعلیٰ ہے وطن کا رشتہ

طوفان میں ڈوب کر اُبھرنا سیکھو
جینا ہے اگر تم کو تو مرنا سیکھو
جب دیش پہ سنکٹ ہو تو تن من دھن سب
قربان وطن پہ اپنے کرنا سیکھو

افسانہ

شاہد مسیح الزماں

مصنوعی پیروں کی چبھن

اسے آج اپنے کو پاگل سمجھنے میں سکون مل رہا ہے، مگر وہ جانتا ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔

شروع شروع میں عجیب سا لگتا تھا، پھر دھیرے دھیرے وہ عادی ہوتا گیا۔ بات بھی اب بہت پرانی ہو گئی ہے۔ پھر لگتا ہے ابھی کل کی بات ہے کتنی پرسکون رات تھی، دن تو بہت سی الجھنوں کو جنم دیتا ہی ہے رات ـــــ ان الجھنوں کو اپنے اندر سمیٹ کر کچھ دیر کو چھپا لیتی ہے۔ اس رات بھی کچھ ایسا ہی ہوا، دن کی الجھنوں کو رات سمیٹ رہی تھی۔ لوگ اپنے پیشوں سے تھکے بستروں پر اپنی الجھنوں کے حل ڈھونڈتے ہوئے سو گئے۔ کسی کو ہوش ہی نہ رہا۔ چاروں طرف لوگ جاگتے سوتے بے خبر رہے اور وہ مر گیا۔ یہ راز سب سے پہلے اس نوعمر ڈاکٹر پر کھلا تھا اور وہ صرف گردن ہلا کر رہ گیا۔ جیسے اسے یقین نہ ہو۔ شاید اس نے ابھی تک کسی کو مرتے نہ دیکھا تھا۔ پھر بھی وہ نوعمر ڈاکٹر سمجھ تو گیا ہی تھا، پر پتہ نہیں کیوں چپ رہ گیا اور یہ راز، راز ہی رہا۔ اس رات کئی موتیں ہوئیں۔ کئی بہت اہم ہستیاں دائمی سکون پا گئیں۔ ایسا مکمل سکون جو اس کے تصور سے دور تھا۔ قلم میں کاغذ میں، عمارتوں میں، کرسیوں پر سکون ڈھونڈھتی رہیں، وہ اہم ہستیاں یہ جان ہی نہ پائیں کہ سانس لیتے ہوئے اس دنیا سے فرار ممکن نہیں۔ کرسیاں قلم کاغذ، عمارتیں یہ سب الجھن کے دوسرے نام ہیں، وقت کے کھلونے

ان اہم ہستیوں کے سوگ میں کسی نے اس کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ سب لاشیں دفن کر دی گئیں۔ اور وہ کھڑا سب کا منھ دیکھتا رہ گیا اس کی لاش کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ شاید کسی کو اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ وہ بھی اس رات مر چکا ہے۔ اور وہ بے بس سا سر جھکائے، اپنا بے جان جسم، بے جان حوصلے، بے جان تمنائیں لیے جینے لگا، ایک جھوٹی، غیر فطری زندگی وہ بغیر ہستی کا وجود لیے ایک بے تکی بے معنی زندگی میں ڈھکیل دیا گیا۔ پتہ نہیں حالات کی مار تھی یا خود اس کی کوتاہی، مگر وہ اپنی تعلیم پوری نہ کر سکا۔ تعلیم بھلا کسی کی پوری ہو پائی ہے۔ تعلیم تو ادھوری رہتی ہے کسی کی بھی مگر پھر بھی یہ ادھوری کم تعلیم کا احساس اس کی زندگی، اس کی فطرت اس کی نفسیات پر حاوی ہوتا چلا گیا۔ اور اس احساس کو چھپانے کے لئے اسے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

چند لوگوں کا مختصر سا اجتماع تھا۔ ایک نشست، جس میں افسانہ نگار، سائنس داں، شاعر، ادیب، دو اچھے عہدے کے سرکاری افسر اور کچھ اور لوگ ان کے بیچ وہ اپنے کو کچھ زیادہ ادھورا پا رہا تھا۔ اسے لگا کہ سب لوگ اسی کو دیکھ رہے ہیں۔ دو ایک نگاہوں میں اسے تمسخر کا شبہ ہوا، ایک آنکھ میں تو اسے یقین تھا کہ حقارت کی جھلک تھی۔ لوگ قصے سنا رہے تھے، اپنے خاندانی اوصاف گنوا رہے تھے۔ کسی کا سلسلہ رانا پرتاپ سے ملتا تھا، کسی کے اجداد پانی پت کی لڑائی کے اہم ترین کردار تھے۔ کسی کا تعلق اس مشہور خاندان سے تھا جس کی تین پشتیں مغلیہ حکومت کی صلاح کار رہیں۔ اور وہ اپنے کو اور چھوٹا محسوس کرنے لگا۔ ان قدآور لوگوں کے بیچ وہ بونا سا کھلا جا رہا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ اپنے لئے کوئی وصف اضافی نہ ڈھونڈھ سکا۔ چاروں طرف لوگوں کے قد اونچے ہوتے جا رہے تھے، اس نے محسوس کیا کہ عنقریب وہ روند دیا جائے گا۔ اس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا، مگر لوگ اس

سے بالا بے نیازی ہو چلے ہے ۔ اور یہ بے نیازی اسے بہت گراں گذری ۔۔ بہت تکلیف دہ ۔ وہ حقارت آمیز نگاہیں وہ تمسخر بھری نظریں اسے گوارہ تھیں ۔ مگر یہ بے نیازی ۔ اس کا دماغ پھٹنے لگا ۔ ایک بہت بڑا پیر اس کے سینے پر آکر پڑا ' اس نے حسرت سے اوپر دیکھا ' بہت اونچے پر ا سے سگریٹ کا دھواں نظر آیا ' وہ کچلا جا رہا تھا اس دھوئیں کے نیچے اور دھوئیں کو احساس بھی نہ تھا اپنے گرد و پیش کی یہ بے نیازی اسے ڈسے ڈال رہی تھی ۔ کوئی جان بوجھ کر عمداً تاک کر اسے کچلتا تو شاید جسمانی تکلیف کے ساتھ یہ روحانی اذیت نہ ہوتی جسمانی تکلیف تو محسوس ہی نہ ہوتی ۔ دھوئیں کا بوجھ ہی کیا ۔ مگر اس کے وجود سے یہ بے نیازی نا قابل برداشت ہوتی جا رہی تھی ۔ جب ماں نے اس کے بکھرے بالوں میں اپنا ہاتھ محبت سے پھیرا تو وہ چونک پڑا ۔ نظر اٹھائی تو دو میلی میلی آنکھیں ' بھوئیں ' دھوپ ، گرد سے بے رونق آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں ۔ ممتا بھری بے نور آنکھیں ' جیسے اسے دیکھنے ہی کو کھلی ہوں ' ورنہ ان کے لیے کائنات بے معنی ہو چکی تھی ' کہیں کچھ دیکھنے کو نہ بچا تھا ۔۔ اور اسے ان بے جان آنکھوں میں پانی پت کی کشمکش ' رانا پرتاپ کے حوصلے اور حکومت مغلیہ کے اتار چڑھاؤ ایک ہی جگہ پر نظر آئے ۔

نیند میں بھی اس کے چہرے پر سکون نہ پا کر وہ بے چین ہو گئی ۔۔ یوں بھی چین کا احساس تو مدتوں پہلے ختم ہو چکا تھا ۔ آج تک اسی کی خاطر تو وہ اپنی ممتا دوسروں پر نچھاور کر کے اس کی پرورش کرتی رہی ۔ حالانکہ اس کی حیثیت خادمہ ہی کی تھی مگر اس کی محبت ' خلوص اور بزرگی کے اثر سے ہمیشہ اسے نانی ' پھوپھی ' بڑی خالہ ہی کا درجہ ملا ۔ اور شفقت اس کی عادت بن گئی ۔

اس نے اپنے ادھورے پن کے احساس کو چھپانے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا ۔ اور اپنے کو ایک پوشیدہ سلطنت کا شہزادہ مشہور کر دیا ۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ لوگوں پر اپنی اصلیت ظاہر ہونے دیتا ۔ شاید حقیقت کا سامنا کرنے کی قوت نہیں تھی ۔ اپنے کو اونچا کرنے کے لئے اس نے اپنے پیروں میں لکڑی کے مصنوعی پیر لگا لیے اور انھیں ڈھانکنے کی کوشش میں شب و روز گذرنے لگے ۔ اسے ہر لمحہ یہی اندیشہ رہتا کہ دوسروں کے دیئے کپڑوں میں چھپے کوئی اس کے نقلی پیر دیکھ نہ لے اور اس کے اصلی قد کا اندازہ لگا لے ۔

پریوں کی باتیں ! شہزادہ تھا نا ۔۔ تو کیوں نہ پرستان کا شہزادہ بن جائے ۔ اور ہر پری کو اپنا دیوانہ بنا لے ۔ چھوٹی پری ' بڑی پری ' کم سن پری ' جوان پری ۔ اور ہر پری کے دل میں ایک ہی جذبہ ' ایک ہی خواہش ۔

لیکن ہر رات ' ایک لمبی مسافت طے کر کے اپنی سلطنت سے اتر کر ' اپنے بستر پر پہنچتا تو یہ لکڑی کے مصنوعی پیر بہت چبھتے ۔ وہ چیخ پڑتا مگر اس اندیشے سے آواز حلق کے باہر آتے ڈرتی کہ کسی پر اس چیخ کا راز ظاہر نہ ہو جائے اور یہ چیخ اس کے وجود کے اندر گھٹ کر اس کے دل و دماغ کو منتشر کر دیتی ۔ مگر لاکھ کوشش کے باوجود وہ خود کو لمبا نہ محسوس کر سکا ۔

دن میں تو وہ ریاست کے ' پریوں کے دلفریب قصے سنا سنا کر دوسروں کے ساتھ خود بھی فریب کھاتا رہتا ۔ مگر رات کو ان مصنوعی پیروں کی چبھن ۔ اسے اپنی بے وقعت حقیقت سے ہم کنار کر کے اس کے ذہن کی پراگندگی بڑھا دیتی ۔ اور وہ خود کو پاگل سمجھنے لگا ۔

پھر جب اس نے غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اکیلا نہیں ہے اس کے چاروں طرف بے شمار لوگ ایسے نظر آئے جنھوں نے یا تو اپنی موت کو پوشیدہ رکھا ' یا حالات نے انھیں کفن اتارنے پر مجبور کر دیا ۔ ایسے جسم جن کی روح موت کی وجہ سے جدا ہو چکی ہے ۔ جذبات سے عاری احساسات سے عاری ' مروتوں سے نا آشنا ' رواداری سے بہت دور کیونکہ یہ تو روح کی باتیں ہیں ' جسم کو تو بس اپنا ننگا پن ڈھانکنے سے مطلب اور وہ سوچ رہا ہے کہ اس بے روح کے جسم کو آرام کیسے ملے گا ۔ کیونکہ واپس تو روح کو جانا ہے جو جا چکی ۔ اب کوئی اسے دفن کرنے تو آئے گا نہیں ' اچھا ہو گا کہ وہ خود ہی اپنی قبر کھود کر اس میں لیٹ رہے ۔

یہ بات بہت پہلے اس کے ذہن میں آئی تھی اور اس نے کدال سنبھال لی تھی مگر پھر کدال کسی کسی پتھر سے ٹکراتی اور کبھی پانی کبھی تیل کبھی ہیرے جواہرات نظر آتے اور وہ رک کر کبھی پانی ' کبھی تیل کبھی ہیرے جواہرات اکٹھا کرنے لگتا اور قبر پھر ادھوری رہ جاتی ۔

لیکن وہ ہمت نہیں ہارا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ ہر کدال کے ساتھ قبر کشادہ ہو رہی ہے ۔ ہر مٹھی ہیرے نکال کر وہ اور جگہ بنا رہا ہے اور ایک لمحہ آئے گا جب سارے پتھر سمٹ چکے ہوں گے اور پھر بس

(باقی ص ۴۳ پر)

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب "اوراقِ گل" (شعری مجموعہ)

شاعر: چندر پرکاش جوہر بجنوری ۔ قیمت : بیس روپے

ملنے کا پتہ : ۶۔ دیپا بلڈنگ، لیڈر روڈ ۔ الہ آباد ۳

اوراقِ گل میں جوہر صاحب کی ۴۰، ۴۵ سالہ حیاتِ شاعری کے ہر عہد کی غزلیں شامل ہیں ۔ مجموعہ کی ابتدا جذباتِ عقیدت سے بھرپور ایک نعتِ پاک سے اور اختتام "بیادِ فراق" کے عنوان سے ایک پُر اثر نظم پر ہوا ہے۔

جوہر صاحب کے کلام کی جو خصوصیت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے وہ ان کے اندازِ بیان اور لب و لہجہ کی یکسانیت ہے۔ ان کے بیشتر اشعار بیجا تکلف، غیر ضروری رمز و اشاریت اور تصنع کی بازیگری سے قطعًا بے نیاز ہیں۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار نہایت سادگی مگر پُرکاری کے ساتھ بڑے مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں اضطراب یا اُلجھاؤ نام کو نہیں ہے۔ ان کی شاعری سکون بخش اور کیف پرور ہے۔

بنیادی طور پر جوہر صاحب کے شعری ذوق کی تربیت کلاسیکل روایات کے سایہ میں ہوئی ہے۔ لیکن ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات نے ان کی آواز میں نیا پن پیدا کر دیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے سوچ کر اور محسوس کر کے کہا ہے۔ احساس کی شدت، تجربہ کی صداقت اور اندازِ بیان کی لطافت نے ان کے کلام میں دلکشی پیدا کر دی ہے۔

درج ذیل اشعار جوہر صاحب کے شعری مزاج اور مرتبہ کے تعیین میں معاون ہوں گے ۔

ظلمات میں ابھرے گی اک تازہ کرن جوہر
احساس کے سانچے میں اشعار کو ڈھلنے دو

باوقار لہجے میں پُر اثر کہا جائے
دل کا حال جو کچھ بھی ہو مختصر کہا جائے

یاد آتے ہی تری آئے خیالوں کے ہجوم
ایک پیکر سے تراشے گئے پیکر کتنے!

یوں دل کی وادیوں سے گزرتی ہے اس کی یاد
جیسے اُترتی دھوپ کا منظر دکھائی دے

بڑھ گئی اتنی تمازت آگہی کی دھوپ میں
زندگی خود جل رہی ہے زندگی کی دھوپ میں

میں تیرگی سے گزرتا ہوں روشنی کی طرح
مجھے شعور ہے جینے کا آدمی کی طرح

کیوں نہ ہم بدل ڈالیں کہنہ اصطلاحوں کو
کیوں نہ آج قاتل کو چارہ گر کہا جائے

مجموعی طور پر "اوراقِ گل" ایک قابلِ مطالعہ مجموعہ کلام ہے جس کی خاطر خواہ پذیرائی کی جانی چاہیے۔

——— (ڈاکٹر) تسخیر فہمی

نام کتاب، "شفق زار" (شعری مجموعہ)

شاعر: اوم کرشن راحت ۔ قیمت: ۱۵ روپے

اوم کرشن راحت شعرا کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کی ذہنی تربیت میں ان کے گھر کے ادبی ماحول کا بڑا دخل رہا ہے۔ ابتدائے کلام میں "من آنم کہ من دانم" کے تحت وہ خود فرماتے ہیں:

> "جناب اختر شیرانی کی، میرے والد جناب مہاراج کرشن سے دوستی نے مجھے شاعر ضرور بنا دیا، ابھی تیرہ ہی سال کا تھا کہ شعر کہنا شروع کر دیا ــ جناب اختر شیرانی کا رسالہ "رومان" گھر میں آتا تھا، اور نظمیں "او دیس سے آنے والے بتا"۔ "اے عشق

کہیں بے چل گنگناتے گنگناتے آنکھیں نم ہو جاتی
تھیں، حالانکہ نہ میں نے غربت ہی دیکھی تھی اور
نہ ہی عشق سے کوئی سروکار تھا۔"

مندرجہ بالا سطور جناب راحت کے اس ادبی اور تہذیبی پس منظر کی عکاسی کر رہی ہیں، جس کی آغوش میں ان کا ادبی شعور ارتقا پذیر ہوا۔

راحت نے تقسیم سے پہلے کا ماحول بھی دیکھا اور تقسیم کے مضر اثرات نے بھی ان کو متاثر کیا۔ معاشرے کی بدلتی ہوئی قدریں بھی ان کے ذہن پر اثر انداز ہوئیں۔

"شفق زار" میں غزلیں بھی ہیں، رباعیاں بھی اور نظمیں بھی لیکن راحت بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، حالانکہ ان کی رباعیوں میں بھی ایک خاص نہج اور ایک خاص کرب نمایاں ہے۔

تو دیدۂ غم لے کے کہاں آیا ہے
انسان کا غم لے کے کہاں آیا ہے
اس رزم گہہِ تیغ و سناں میں راحت
تو لوح و قلم لے کے کہاں آیا ہے

راحت کی غزلوں میں جمالیاتی حسن کے ساتھ ہی ساتھ فکر و شعور کی بصیرت انگیز کیفیات کا امتزاج بھی ہے، ان کی غزلیں فن کی پاسداری کے ساتھ جدید رجحانات سے ہم آہنگ ہو کر اور زیادہ دلکش ہو جاتی ہیں۔

گھر میں ہر سمت اب آئینے ہی آئینے ہیں
میری شوریدہ سری کو ملے دیوار کہاں

آدمیت کا کچھ انداز نظر تو آئے
ہم تو منھ دیکھ کے رہ جاتے ہیں انسانوں کا

ٹوٹے پھوٹے قصرِ دل کی شان اسی سے باقی ہے
پیار کی اک محراب جو راحت رکی رہی دروازے پر

کھوج میں اس کی پا لیا خود کو   جستجو میری رائیگاں نہ گئی

بہت ہیں دید کے قابل یہاں قدیم آثار
مجھے بھی دیکھنے آؤ کہ ڈھ گیا ہوں میں

مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ "شفق زار" ایک کامیاب اور سلجھے ہوئے شاعر کا ایک ایسا خوبصورت شعری مجموعہ ہے جس میں عصری حسیت، تغزل، اسلوب کی دل کشی اور جذبات کی پاکیزگی بدرجہ اتم موجود ہے۔

———— ساحر لکھنوی

نام کتاب: عزیز لکھنوی ۔ حیات اور کارنامے (تحقیقی مقالہ)
مصنف: ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ۔ قیمت: ۷۵ روپے
ملنے کے پتے: (۱) ۱۸۱/۱۷ فراش خانہ، وزیر گنج لکھنؤ
(۲) نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ (۳) نصرت پبلشرز، امین آباد لکھنؤ
(۴) دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

شاعر، عالم اور نثر نگار مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کا نام لکھنوی شاعری کے اس دور کی ضمانت ہے جب لکھنؤ زباں دانوں اور سخن فہموں سے چھلک رہا تھا اس عہد میں شعر و ادب سے واجبی واقفیت رکھنے والوں کے لیے شاعری کے میدان میں قدم رکھنا آسان نہ تھا۔ آتش و ناسخ اور انیس و دبیر کے شعری فتوحات نے لکھنؤ کے ذوق اور مزاج کو اتنا پختہ اور بلند کر دیا تھا کہ یہاں کی فضا میں سطحی اور عامیانہ شاعری کا بار پانا مشکل ہو گیا تھا۔ اب شاعرانہ لغزشوں کی سرِ عام گرفت ہونے لگی تھی اور فنی اغلاط و اسقام نے ادبی معرکہ آرائیوں کے باب کھول دیئے تھے۔ جب کوئی شاعر منزلِ شعر میں کسی مقام پر ٹھوکر کھاتا تو اسے منھ کی کھانی پڑتی۔ اس ماحول نے میدانِ شعر میں اترنے والوں کو محتاط رہنے کا سلیقہ سکھا دیا تھا چنانچہ شعر کہنے کا جوکھم وہی اٹھاتا جو رموزِ فن اور نکاتِ شعر سے پوری طرح واقف ہوتا۔

عزیز لکھنوی نے چونکہ اپنے عہد کے چند عالموں اور عظیم المرتبت شاعروں اور ماہر و کامل عروض دانوں کے سامنے زانوئے تلمذ

نہ کیا تھا اس لیے انھیں اس راہ پر گامزن ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مختلف علوم و فنون سے واقف ہونے کی بنا پر عزیز نے معاصرین کی صف میں نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کر لیا اور دنیائے شاعری میں ان کا نام ادب اور احترام سے لیا جانے لگا۔

ایسی بلند پایہ اور گوناگوں شخصیت کے مختلف الجہات ادبی کارناموں کا احاطہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ رُدَولی کے معروف علمی خانوادے کے فرد ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی نے اس موضوع پر سب سے پہلے قلم اٹھایا اور عزیز لکھنوی کے فن کو محیط پانچ ابواب پر مشتمل اپنے تحقیقی مقالے میں ان تمام پہلوؤں کا بخوبی جائزہ لیا جو ابھی تک پردۂ خفا میں تھے۔ اس مقالے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ مصنف کی یکساں قدرت کی حامل دو صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ مقالے کے نصف اوّل میں مقالہ نگار کا تحقیقی مزاج کارفرما ہے جو عزیز لکھنوی کی حیات اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو پوری طرح اجاگر کرتا ہے اور نصف آخر میں انھوں نے اپنے مخصوص تنقیدی شعور سے کام لے کر عزیز کی شاعری، نثر نگاری اور نظریۂ شعر و سخن سے تفصیلی بحث کے بعد اہم اور معنی خیز نتائج اخذ کیے ہیں۔

کسی بھی موضوع پر تحقیقی مقالہ تصنیف کرتے وقت ایک محقق کا ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ضروری ہے جو اسے اعتبار اور استناد کا درجہ عطا کرتی ہیں۔ حقائق سازی کا کام تو بہت سے محقق کر لیتے ہیں، لیکن حقائق یابی کی منزل تک بہت کم محقق پہنچ پاتے ہیں۔ تحقیق کا اصل مقصد حقائق یابی ہے حقائق سازی نہیں حقائق ساز محقق کا نام تاریخ تحقیق سے بہت جلد قلمزد کر دیا جاتا ہے، لیکن حقائق یاب محقق اس تاریخ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی نے یہ تحقیقی مقالہ لکھ کر حقائق یاب محققین کے زمرے میں شمار ہونے کا قدرے جواز پیدا کر لیا ہے۔

مقالے پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کر لینے کے باوصف مقالہ نگار نے اس موضوع کا باب بند کر دینے کا اعلان نہیں کیا ہے۔ حقیقتاً کامیاب محقق وہی ہے جو صاحبانِ قلم کو بیدار کرنے کے لیے اپنے موضوع سے متعلق نئی بحثوں کا آغاز کرے۔

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی نے اپنے عمیق مطالعہ —— اور دقیق نظریہ کی روشنی میں یہ مقالہ لکھ کر عزیز لکھنوی سے متعلق نئے مباحث کے دروازے کھولے ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

مقالہ کا سرورق خوشنما اور کتابت و طباعت اطمینان بخش ہے۔

—— انیس اشفاق

●

صفحہ ۱۱ کا بقیہ:

جگر سے وابستہ
کچھ یادیں

میں نے اجازت طلب کی کہ زنانخانے سے چائے آگئی۔ جگر صاحب نے فوراً چٹکی لیتے ہوئے فرمایا:

"کیوں جناب طعام آمد و دہقانیاں برخاستند" —— ایک دروازے سے چائے کی کشتی داخل ہو رہی اور دوسرے دروازے سے آپ جانے کو تیار ہیں —— اسے آپ کا تکلف سمجھوں یا ناپختگی! اسی لیے تو آپ کو اب تک اسٹوڈنٹ سمجھتا ہوں —— خیر تشریف رکھیے اور ناشتہ کرنے کے بعد ہی جائیے"۔

جگر صاحب کی اس پر خلوص تنقید سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ اب تو کوئی تکلفاً بھی چائے کو پوچھے تو میں انکار نہیں کرتا!

جگر صاحب کی آخری علالت میں مجھے بھی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن ہمارے ایک دوست شمس الہدیٰ قیسی الفاروقی نے انتہائی قابلِ تحسین خدمت انجام دی۔

قیسی صاحب اس وقت گونڈہ میں تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے، مگر کچہری تحصیل کے کاموں کو بھی نظر انداز کر کے جگر صاحب کی تیمار داری میں بیشتر اوقات مصروف رہتے۔

جگر صاحب کی عیادت میں آنے والوں کے لیے قیسی اکثر دیوار بن جاتے تھے اور لوگوں کو مایوس واپس جانا پڑتا۔ اتنی بندشں کے باوجود اگر کسی کے آنے کی آہٹ بھی جگر صاحب کو مل جاتی تو وہ اشارے سے اُسے اندر بلا نے کو کہتے۔ بات نہیں کر سکتے تھے مگر آنکھوں آنکھوں میں اظہار تشکر کی جھلک مل جاتی تھی۔ اور پھر وہ تسبیح اسمِ اعظم اور توبہ و استغفار میں ڈوب جاتے۔ زار و قطار روتے تھے اور آنے والوں سے اپنے حق میں مغفرت کی دُعا طلب کرتے تھے۔

ایک لمبی علالت کے بعد جگر صاحب اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ لیکن اپنی ہمہ گیر، عظیم، مخلص اور باوقار شخصیت کے کچھ ایسے نقش چھوڑ گئے جو موصوف سے وابستگی رکھنے والے ہر چھوٹے بڑے آدمی کے دل و دماغ میں زندہ و پائندہ ہے۔

* *

شاہ کوکب القادری .... صہ ۴۲ کا بقیہ

زبان کے بارے میں بھی کوکب صاحب ایک صاف ذہن کے مالک ہیں، وہ اُردو کو کسی مذہبی گروہ یا فرقے کی زبان نہیں سمجھتے بلکہ اسے ہندستان کی مشترکہ تہذیب اور ثقافت کا اٹوٹ انگ مانتے ہیں اور قومی یک جہتی کی علامت کے طور پر اس کی بقا کے خواہاں ہیں، وہ کہتے ہیں ؎

آغوش میں بھارت کے پلی ہے اُردو
پروان چڑھی، پھُولی پھَلی ہے اُردو
انسان کو آداب سِکھا دیتی ہے
تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے اُردو

یک جہتیِ قومی کا نشاں ہے اُردو
تہذیب کا رنگین بیاں ہے اُردو
اربابِ سیاست اسے کیا سمجھیں گے
دنیائے محبّت کی زباں ہے اُردو

جو صاحب قلم رُباعی کی فنّی قیود کے ساتھ الوہیت، وطنیت اخلاقیات وسماجیات کے مختلف مضامین کو اثر انگیز عنوان سے اور اتنی جگر سوزی اور دیدہ دری کے ساتھ پیش کر سکے اس کو یقیناً یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

سینے میں نہاں دولتِ غم رکھتا ہوں
سوزِ جگر و دیدۂ نم رکھتا ہوں
اشعار مرے گنجِ گراں مایہ ہیں
کوکب ہوں، گہر بار قلم رکھتا ہوں۔

کوکب صاحب کی ان ہی عظمتوں کے پیشِ نظر جناب شوق راٹھوری نے بجا طور پر نہ صرف اپنے دل کی بات بلکہ سارے ادب نوازوں کے جذبات کی ترجمانی یہ کہہ کر کردی ہے ؎

شاہ کوکب کی ذاتِ عالی سے
بزم اُردو کی زیب و زینت ہے
یا الٰہی دے ان کو عمر دراز
ان کی ہستی بہت غنیمت ہے

مصنوعی پیروں کی چبھن ——— صہ ۴۳ کا بقیہ

ایک ہلکی سی ضرب کافی ہوگی۔ زمین آغوش پھیلا دے گی۔ دھویں، گرد، دھوپ سے بے رونق، میلی میلی آنکھیں، ممتا بھری بے نور آنکھیں اس کی منتظر ہوں گی۔ اور تب اسے ان مصنوعی پیروں کی چبھن سے نجات مل جائے گی۔

اسے آج اپنے کو پاگل سمجھنے میں سکون مل رہا ہے مگر وہ جانتا ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ وہ بس نہیں ہے۔

4 DEC 1987

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۲ | نمبر ۴

جولائی ۱۹۸۷ء

ایڈیٹر: — امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: — شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر: — ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: — ۴۷۱۰۸

پبلشر: اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

نئی بات

ہندستان کے متعدد پردیش اس وقت خشک سالی اور سیلاب کی زد میں ہیں۔ آسام بنگال اور بہار کے لوگوں پر دریاؤں کی طغیانی نے قہر ڈھا رکھا ہے اور وہ سیلاب سے پناہ مانگ رہے ہیں۔ جبکہ اتر پردیش، ہریانہ، راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات، مہاراشٹر اور کرناٹک جیسی متعدد ریاستوں کے عوام کی آنکھیں پانی کے لیے آسمان کو تکتے تکتے تھک گئی ہیں۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ ایک ہی ملک میں ایک جگہ لوگ ایک ایک بوند پانی کے لیے ترس رہے ہیں تو دوسری جگہوں پر سیلاب نے تباہ کاری مچا رکھی ہے۔

ملک کی وسیع و عریض ریاست اتر پردیش کے ۵۵ اضلاع اس وقت غیر معمولی خشک سالی کا شکار ہیں۔ ہماری ریاست میں بارش نہ ہونے کے سبب خریف کی فصل تقریباً برباد ہو چکی ہے اور چند روز کے اندر اگر حسبِ ضرورت بارش نہ ہوئی تو ربیع کی فصل کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

قدرتی آفات کا مقابلہ کرنا اگرچہ کوئی آسان کام نہیں ہے، تاہم ریاستی حکومت نے اپنے محدود وسائل سے ریاست کے عوام کو قحط کی اس آفت ناگہانی سے نجات دلانے کے لیے متعدد مثبت اقدامات کیے ہیں جن کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

ریاستی حکومت نے خشک سالی کی موجودہ سنگین صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مرکزی حکومت سے تین سو کروڑ روپئے کی مالی امداد طلب کی ہے۔ چنانچہ ریاست میں خشک سالی سے تباہ و برباد ہونے والی فصلوں کے نقصانات کا اندازہ لگانے کے لیے ماہرین پر مشتمل دو مرکزی ٹیمیں ابتک ریاست کا دورہ کر چکی ہیں جن کی سفارشات پر ریاست کو عنقریب حسب خواہ مالی امداد دستیاب ہو جائے گی۔

وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ نے خشک سالی کا عزم مصمم کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے ریاست کے تمام ضلع حکام کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ ضرورت کے مطابق پیسہ خرچ کریں اور کسی کو بھی کسی قسم کی کوئی دشواری نہ ہونے پائے۔ خشک سالی کی صورت حال کا جائزہ لینے اور زیر عمل محکمہ جاتی پروگراموں کی نگرانی کے لیے کابینہ کی ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے صدر مقام پر راحت کمشنر کے زیر نگرانی ایک کنٹرول روم بھی قائم کیا گیا ہے۔

کسانوں کو راحت پہنچانے کے لیے لگان اور زرعی واجبات کی وصولی اکتوبر، ۱۹۸۷ء تک ملتوی کر دی گئی ہے۔

تالابوں اور چشموں کو بھرنے، نہروں اور ٹیوب ویلوں کو پوری صلاحیت سے چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ دیہی اور شہری علاقوں میں اتر پردیش جل نگم جنگی پیمانے پر پینے کا پانی فراہم کرنے کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ خشک سالی سے پیدا ہونے والی وبائی بیماریوں کی روک تھام اور دواؤں کی تقسیم کے لیے ۵۰ لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی جا چکی ہے۔ دیہی علاقوں میں پمپ نہروں کے لیے کم سے کم ۲۰ گھنٹے بجلی اور ٹیوب ویلوں کے لیے ۱۶ گھنٹے برابر بجلی فراہم کی جا رہی ہے۔

اس طرح خشک سالی سے نبرد آزما ہونے کے لیے ابتک راحت رسانی کے جو ٹھوس اقدامات کیے گئے ہیں، انھیں ملحوظ رکھتے ہوئے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عوام کے سرگرم تعاون سے اس ناگہانی مصیبت سے نجات حاصل کرنے میں ہم انشاءاللہ کامیاب ہو جائیں گے۔

ایڈیٹر

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی، وارانسی

غزل

رم جھم کی آنچ پوشاک میں

معلوم نہیں کیوں اب کے برس نفرت کی ہوا برسات میں ہے
کل تک جو ہمارے ساتھ میں تھا وہ آج ہماری گھات میں ہے

آنسو بھی اندھیری رات میں ہیں جگنو بھی اندھیری رات میں ہے
اب تم جسے چاہو اپنالو، دونوں کی چمک برسات میں ہے

ڈوبا ہوا عالم کا عالم رم جھم کے مدھر نغمات میں ہے
وہ حسن جو پونم میں بھی نہیں، بارش کی اندھیری رات میں ہے

پھر جائے نہ پانی باتوں پر، اقرارِ وفا برسات میں ہے
کل ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تھا، اب لاج تمہارے ہات میں ہے

پایا ہے بہ فیضِ عشق وہ غم، سن لو گے جو تم رودادِ الم
اُڑ جائے گا پنچھی بن کے ابھی، وہ رنگِ حنا جو ہات میں ہے

سنتا ہوں تمہارے قدموں سے آباد ہوئے ہیں ویرانے
اس گھر کی خبر بھی لے لینا خالی جو بھری برسات میں ہے

ہم بھور میں پنگھٹ پنگھٹ پر دیکھ آئے حسینوں کے جمگھٹ
وہ حسن کسی صورت میں نہیں، جو حسن تمہاری ذات میں ہے

طوفان بپا ہو جائے گا جب بھی مجھے چھیڑا جائے گا
طوفان کسی دریا میں کہاں، طوفاں تو مرے جذبات میں ہے

اس دور کا ظالم انساں تو خود ختم کرے گا اپنے کو
اس کے لیے ہم کیا فکر کریں جو آپ ہی اپنی گھات میں ہے

سمجھو نہ اسے تم میرا جنوں مانو تو نذیر اک بات کہوں!
اب عشق کی تسکیں کا ساماں شہروں میں نہیں دیہات میں ہے

○

محمد اسحاق صدیقی
موتی تالاب، لکھنؤ

کہانی: پھلوں کے ناموں کی

پھول اور پھل قدرت کی دو نعمتیں ہیں۔ نہ پھولوں کے دیکھنے سے جی بھرتا ہے اور نہ پھلوں کے کھانے سے۔ پھولوں کے حسن اور پھلوں کی لذت کی تعریف کرتے وقت ہمیں ان بے شمار انسانوں کا ممنون ہونا چاہیے جن کی محنت سے قدرت کے یہ حسین تحفے ہم تک پہنچے۔

ہمارے ملک میں بہت سے پھل پرانے زمانے میں دوسرے ملکوں سے لائے گئے تھے۔ لوگوں نے شوقیہ ان کے بیج بوئے اور ان بیجوں سے اگنے والے درختوں کو یہاں کی آب و ہوا ایسی راس آئی کہ ان غیر ملکی پھلوں کے باغ لگانا عام بات ہو گئی اور اب یہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ ہم جو پھل کھاتے ہیں ان میں بہت سے پھل اصل کے اعتبار سے بدیسی ہیں۔

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ پھلوں کے ناموں کی وجہ تسمیہ کیا ہے اور وہ کن ملکوں سے آئے ہیں؟ میں نے بعض ملکی اور بعض غیر ملکی پھلوں کے ناموں اور ان کے وطن کے بارے میں تحقیق کی ہے اور اس سلسلے میں جو منتشر معلومات یکجا کر سکا ان کا خلاصہ نیچے پیش کرتا ہوں۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ پھلوں کے ناموں کی وجہ تسمیہ کی تلاش میں بعض جگہ مجھے قیاس آرائی سے کام لینا پڑا ہے جس کا ماننا نہ ماننا ناظرین کے اختیار میں ہے۔

سنگھاڑا





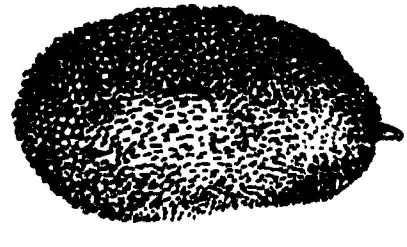
تالابوں میں اگنے والے اس تکونے پھل کے کانٹے سینگ سے مشابہ ہوتے ہیں اور باہر کا حصہ ہڈی (ہاڑ) کی طرح سخت ہوتا ہے لہذا اس کا نام سینگ ہاڑا رکھا گیا جو الفِ ندائیہ کے اضافہ سے سینگھاڑا یا سنگھاڑا ہو گیا۔ سنگھاڑے کی خصوصیت اس کے کانٹے ہیں۔ بچوں کی ایک پہیلی سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

اگل کھونٹا بگل کھونٹا گائے مرکھی دودھ میٹھا

سنگھاڑے کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے سامنے کی طرف سے دیکھنے پر گائے کا چہرہ نظر آتا ہے۔ اس کا گودا سفید اور ذائقہ میٹھا ہوتا ہے۔

کٹھل

اسم با مسمیٰ ہے۔ اس کی بیرونی سطح خاردار ہوتی ہے لہٰذا



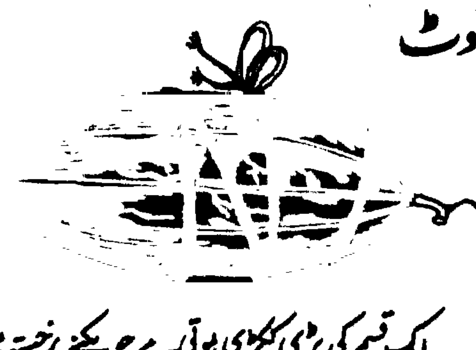
یہ نام پڑا۔ بچوں کی مشہور پہیلی ہے،

ایک پٹاری کیلوں سے جڑی
کھول کے دیکھو تو میووں سے بھری

کیلوں سے مراد یہاں کانٹے ہیں اور میووں سے مراد "کوئے" یا میٹھے گودے میں چھپے ہوئے بیج ہیں۔ کٹھل لفظ مرکب ہے کٹ کانٹے کا مخفف ہے۔ ہل (جسے عوام ہر بھی کہتے ہیں کیونکہ لَ رَ سے بدل جاتا ہے) کی اصلیت نامعلوم ہے۔ شاید یہ کلمۂ نسبت ہے جو بڑھل (بڑہل) اور گڈھل (پھول) کے آخر میں بھی پایا جاتا ہے۔

کچے کٹھل کی ترکاری بنائی جاتی ہے، پکنے پر پھل میٹھا ہو جاتا ہے۔ اس کے بیجوں کے باہری گودے کا ذائقہ کیلے جیسا لیکن ہیک دار ہوتا ہے۔ بعض لوگ انھیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ بیجوں کی بھی ترکاری بنائی جاتی ہے۔

پھوٹ



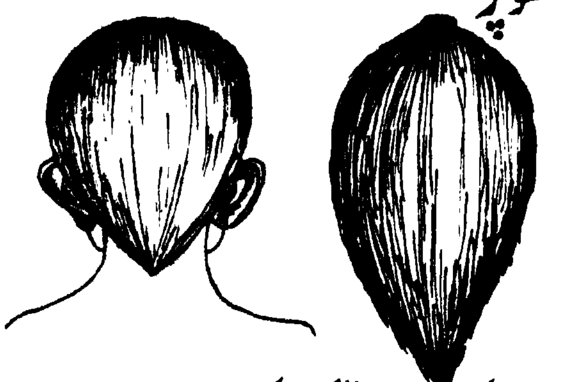
ایک قسم کی بڑی ککڑی ہوتی ہے جو پکنے پر خستہ ہونے کی وجہ سے جابجا پھٹ جاتی ہے لہٰذا اس کا نام ہی پھوٹ پڑ گیا۔ اس کا ذائقہ پھیکے خربوزے جیسا ہوتا ہے۔ پکی ہوئی پھوٹ کے ٹکڑوں کو گرنے سے بچانے کے لیے بیچنے والے اسے پتاور سے باندھ دیتے ہیں۔ پکنے پر پھل کے پھٹنے کا مقصد افزائش

...سے بیج پھیلانا ہے۔
"پھوٹ" کے معنی "نااتفاقی" اور "اختلاف" بھی ہیں جیسا کہ اس پہیلی سے ظاہر ہے،

کھیت میں اُپجے سب کوئی کھائے
گھر میں اُپجے گھر بہہ جائے

مطلب یہ ہے کہ جب پھوٹ کھیت میں پیدا ہوتی ہے تو سب لوگ کھاتے ہیں لیکن اگر گھر میں پھوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو گھر تباہ ہو جاتا ہے۔

کھوپرا



کھوپرا سوکھی ہوئی گری کو کہتے ہیں۔ اس کا انگریزی نام کوپرا (copra) دراصل پرتگیزی زبان کا لفظ ہے پرتگیزی میں یہ لفظ ملیالم سے پہنچا۔ غالباً ہندی میں یہ لفظ ملیالم سے آیا۔ ہندی لفظ کھوپرا (جسے عوام کھوپڑا بھی کہتے ہیں) ذو معنی ہے ناریل کی گری اور کاسۂ سر (کھوپڑی یا کھوپڑا) ناریل کی گری (گری گولا مسلّم) اور خود ناریل دونوں انسان کے سر سے مشابہ ہوتے ہیں، جیسے سر پر بال ہوتے ہیں ویسے ہی اس پھل کے سخت چھلکے کے گرد لمبے لمبے ریشے یا جٹائیں ہوتی ہیں۔ ان کا مقصد بلندی سے گرنے پر پھل کو پھٹنے سے بچانا ہے۔

پرانے زمانے میں کالی دیوی کو انسانی سروں کی بھینٹ دی جاتی تھی، پھر انسانی سر کی جگہ ناریل نے لے لی اور اب بعض مقامات پر دیوِیوں کو (مثلاً ویشنو دیوی کے مندر میں) ناریل ہی چڑھائے جاتے ہیں گویا ناریل انسانی سر کا بدل ہے۔

منقّیٰ (مُنَقّٰی)

اگر آپ نے کبھی حکیمی علاج کیا ہے تو بعض نسخوں میں لکھا دیکھا ہوگا "مویز منقّیٰ" مویز فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "خشک کیے ہوئے بڑے انگور" منقّیٰ عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں: "صاف کیا ہوا، بیج نکالا ہوا" عوام نے اسم (مویز) کو نظر انداز کردیا کیونکہ مشکل لفظ ہے اور اسم صفت (منقّیٰ) کو اپنا لیا۔ یہ لفظ اتنا پسند آیا کہ لڑکیوں کا نام بھی منقّیٰ رکھا جانے لگا۔

سپستاں



ایک صاحب جن کا شین قاف بہت درست تھا' ایک عطار کی دکان پر پہنچے اور خالص عربی لہجے میں دریافت کیا:

"کیا آپ کے یہاں لعوقِ سپستاں ہے؟" (عین کو حلق سے نکال کر)

عطار نے جواب دیا، "ہے تو ضرور مگر اتنا گاڑھا نہیں ہے"۔

یہ لعوق خاکی رنگ کی میٹھی چٹنی ہوتی ہے جس میں بڑا لس ہوتا ہے۔ یہ نزلے اور پرانی کھانسی کی خاص دوا ہے جو سپستاں سے تیار کی جاتی ہے۔ لیکن سپستاں کیا ہوتا ہے؟ جس پھل کو ہم لسوڑا یا لسوڑا کہتے ہیں اسے فارسی زبان میں سپستاں کہتے ہیں۔ سپستاں دو لفظوں سے مل کر بنا ہے، سگ (کتا یا کتیا) اور پستاں۔ لسوڑے کے چھوٹے چھوٹے گول پھل کتیا کے پستانوں سے مشابہ ہوتے ہیں اس لیے ان کا نام سگ پستاں رکھا گیا جو مختصر ہو کر سپستان ہو گیا۔ اسے لسوڑا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا پھل لس دار ہوتا ہے۔

لسوڑے کی دو ... ہوتی ہیں ایک ... کا چھوٹا۔ بڑے پھل والے لسوڑے کو راسے لسوڑا کہتے ہیں۔ کچے لسوڑے کا اچار بنایا جاتا ہے۔ اس کے سوکھے پھل جوشاندے میں ڈالے جاتے ہیں اور کچلے ہوئے پتے، نمک اور آٹے کے چوکر کو پانی میں اُبال کر پینے سے سارا بلغم نکل جاتا ہے۔

گوندنی



گوندنی کے پھل لسوڑے کے پھلوں سے مشابہ ہوتے ہیں لیکن لسوڑے کے مقابلہ میں گوندنی چھوٹی، زیادہ میٹھی اور لذیذ ہوتی ہے۔ اس کا رس گوند جیسا چپچپا ہوتا ہے لہٰذا ان پھلوں کا نام ہی گوندنی رکھ دیا گیا جو درخت کا بھی نام ہے۔

گوندنی میں پھل بہت آتے ہیں۔ ان کا رنگ سُرخی مائل زرد ہوتا ہے۔ اسی لیے جب کوئی عورت سر سے پاؤں تک سونے کے زیور پہنے ہوتی تو پرانی عورتیں کہتیں "وہ گوندنی کی طرح زیوروں سے لدی ہوئی تھی"۔

لیچی



ہمارے ملک میں بعض نہایت لذیذ اور خوش نما پھل چین سے آئے۔ ان پھلوں میں لیچی، لوکاٹ، خوبانی اور شہتوت قابلِ ذکر ہیں۔

لیچی چینی زبان کا لفظ ہے جو انگریزی میں بھی مستعمل ہے لیکن ہجے مختلف ہیں:

Lichee - Litchi - Leechee - Lychee

اس کا علمی نام (Litchi Chinensis) ہے جس کا لاحقہ اس کے وطن چین کا مظہر ہے۔ ہندستان میں اس کا رواج اٹھارھویں صدی کے آغاز میں ہوا۔ پہلے بنگال میں اور پھر ملک کے دوسرے حصوں میں اس کے درخت لگائے گئے۔

لیچی کے درخت باغوں میں آرائش کے لیے بھی لگائے جاتے ہیں۔ پھلوں کے بڑے بڑے گچھے لگتے ہیں۔ پکنے پر پھل سُرخ ہوتا ہے اور اس کے اوپری چھلکے پر کچھ سخت دندانے ابھرے ہوتے ہیں۔ ہندستان میں مظفر پور کی لیچی مشہور ہے۔

(علم باغبانی مصنفہ وصی اللہ خاں۔ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد، ۱۹۳۴ء ص ۳۱۹)

لوکاٹ

اس خوش نما پھل کا وطن چین ہے۔ یہ چین سے جاپان پہنچا اور جاپان سے ہندستان آیا۔ اس کا چینی نام لوہ کواٹ (Loh Kwat) ہے جو انگریزی میں جاکر (LOQUAT) ہوگیا۔ بول چال میں اسے لکھوٹ (लकवट) بھی کہتے ہیں

خُوبانی



خوبانی کو انگریزی میں ایپری کاٹ (Apricot) کہتے ہیں۔ اس کا وطن بھی چین ہے لیکن نام فارسی ہے۔

خوبانی کے پھل کی شکل چہرہ سے مشابہ، پکنے پر رنگ نارنجی اور سُرخ، چھلکا مخملی، گودا نرم اور گٹھلی بڑی ہوتی ہے۔

میری ہم۔ س ان سے نام خوبانی ی ا ں خوباں ہے جس معنی ہیں "معشوق" اس پھل کے خوش نما رنگ اور مخملی جلد سے نام رکھنے والے کا خیال اپنے معشوق کے چمپئی رنگ اور سُرخ گالوں کی طرف منتقل ہوا اور اس نے یہ نام رکھ دیا۔

خود لفظ خوباں مفرد نہیں مرکب ہے (خوب + آں) خوب کے معنی ہیں "اچھا" اور آں کے معنی "شان و ادا" کے ہیں۔

شہتوت



مشہور میوہ ہے۔ نام فارسی ہے۔ یہ دو لفظوں سے مل کر بنا ہے: شاہ + توت۔ شاہ کے معنی ہیں بادشاہ اور تُوت اصلی نام ہے۔ انگریزی میں اسے ملبری (Mulberry) کہتے ہیں۔

شہتوت کی دو قسمیں ہیں، سیاہ اور سفید۔ سفید شہتوت کا وطن چین ہے اور کالے شہتوت کا ایران۔ (دراصل سفید کا رنگ سبزی مائل سفید اور سیاہ کا اُودا ہوتا ہے) کالے شہتوت کا شربت (شربتِ توتِ سیاہ) کھانسی میں مفید ہے۔ کشمیر اور میسور میں سفید شہتوت کے درخت ریشم کے کیڑے پالنے کے لیے لگائے جاتے ہیں کیونکہ ان کے چکنے پتے ریشم کے کیڑوں کی مخصوص غذا ہیں۔ کالے شہتوت کے پتے کھردرے ہوتے ہیں، ریشم کے کیڑے انھیں کھانا پسند نہیں کرتے۔

رَس بھَری

ڈاکٹر عبدالحق کی "اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" میں

(Raspberry) کے معنی دیے ہیں، (پودا یا پھل)۔ رس بھری، توت فرنگی۔ یہی معنی بعض دوسری لغتوں میں بھی ملتے ہیں۔ بظاہر ہندی نام انگریزی (راز بری) کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ لیکن دراصل دونوں مختلف پھل ہیں جیسا کہ نیچے دی ہوئی تصویروں سے ظاہر ہے:



ان پھلوں کے علمی نام ہیں:

راز بری (Raspberry) - Rubus idaeus

کیپ گوز بری (Cape gooseberry) - Physalis peruviana



راز بری کو توت فرنگی کہنا مناسب ہے کیونکہ اس کا وطن یورپ ہے۔ رس بھری کو انگریزی میں کیپ گوز بری کہتے ہیں یہ پھل غالباً پیرو (جنوبی امریکا) سے آیا۔ انگریزی میں اسے (Chinese Lantern) بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کا گول پھل ایک ایسے کاغذی خول میں چھپا ہوتا ہے جیسے کوئی پہلودار چینی قندیل۔ پہلے اس پودے کو باغوں میں آرائش کے لیے لگایا جاتا تھا پھر اس کے پھل کھائے جانے لگے۔ رس بھری کا مربہ بھی بنایا جاتا ہے۔

لیموں

لیموں کا اصلی وطن جنوبی مشرقی ایشیا ہے۔ بعض کے نزدیک ہندستان، خاص کر مشرقی ہمالیہ کا علاقہ۔ چنانچہ آج بھی آسام میں لیموں کی مختلف جنگلی قسمیں پائی جاتی ہیں۔

ایرانی جغرافیہ نویس اصطخری (۹۵۰ء) نے پنجاب میں لیموں کا ہونا بیان کیا ہے۔ عرب جغرافیہ نویس ادریسی (۱۱۵۴ء) نے بھی اس کی تائید کی ہے لیکن نام لیموا بیان کیا ہے۔

ہندستان کے مختلف حصوں میں اس پھل کے مختلف نام ہیں:

लिम्बू लेम्बू लीमू लेमू

निम्बू नेम्बू नीमू नेमू

اسے فارسی میں لیمو اور عربی میں لیموں کہتے ہیں۔ انگریزی نام لیمن (LEMON) لیموں (LIMUN) کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اس کا چینی نام لی منگ (LI-MUNG) بھی ہندستانی سے ماخوذ ہے۔

نارنگی

رنگی کو نارنگی کہیں چلے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

کبیر کے اس مشہور دوہے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نارنگی کو نارنگی یعنی "بے رنگ" کہنا صداقت کو جھٹلانا ہے کیونکہ وہ رنگین ہوتی ہے لیکن شاید اس لفظ کے شروع میں جو کلمہ "نا" آیا ہے وہ نفی کے معنی میں نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام عربی لفظ نار (آگ) اور فارسی رنگ سے لے کر بنایا گیا ہے کیونکہ پکنے پر اس پھل کا رنگ آگ جیسا ہوتا ہے۔

سنسکرت میں نارنگی کو نارنگ (नारंग) یا نارنگاہ (नारंगाः) کہتے ہیں۔ یہی نام (نارنگ) فارسی زبان میں

۔ں پایا جاتا ہے جو عربی ۔ں جا کر نارنج ہو گیا۔ کیونکہ عربی میں
'گ' نہیں ہے اور اسے 'ج' سے بدل دیتے ہیں۔

یورپ میں اس پھل کا رواج عربوں کے ذریعہ ہوا چنانچہ اسپین کی زبان میں اسے نارنج ہی کہتے ہیں۔ انگریزی نام آرنج (ORANGE) فرانسیسی سے ماخوذ ہے۔ نارنج کا 'نا' حذف کرنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ فرانسیسی زبان میں اور (OR) کے معنی ہیں "سونا" اور اس پھل کا رنگ سنہرا ہوتا ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ انگریزی نام آرنج سنترے اور نارنگی دونوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ نارنگی چھوٹی ہوتی ہے اور سنترا بڑا۔ نارنگی میں سنترے کے مقابلہ میں کھٹاس زیادہ ہوتی ہے۔ سنترے کا صحیح نام (MANDARIN ORANGE) ہے۔ انگریزی نام مینڈارن کے معنی ہیں: "چینی زبان، چینی افسر" انگریزی میں یہ لفظ پرتگالی سے آیا اور پرتگالی میں میلے (MALAY) یعنی ملایا کی زبان سے' جس میں اس کا روپ مینڈارم (MANDARIN) ہے۔ میلے زبان کا یہ لفظ سنسکرت کے منتری سے ماخوذ ہے۔ سنترے کے پورے انگریزی نام (مینڈارن اورینج) سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستان میں یہ پھل چین سے آیا۔

سنترا



اسے سنگترا بھی کہتے ہیں۔ اس خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھل کا وطن غالباً ہند چین کا جنوبی حصہ (کوچین چین، موجودہ

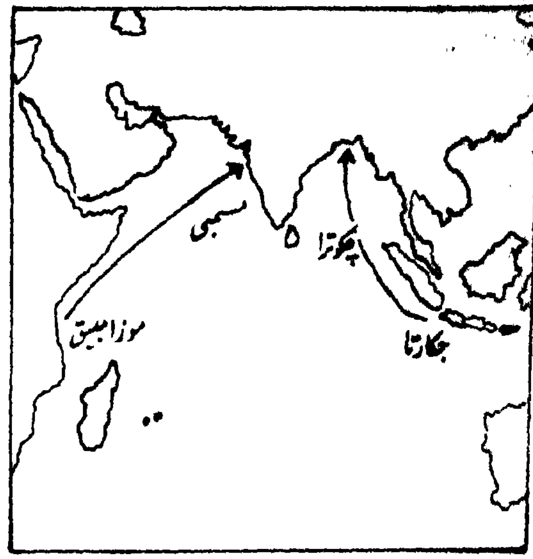
کمبوڈیا) ہے۔ ہمارے ملک میں آسام، ناگالینڈ، میزورام، آسام اور منی پور کے جنگلوں میں سنترے کے جنگلی پیڑ پائے جاتے تھے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ پیڑ مقامی نسل کے تھے یا ہند چین سے لائے گئے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے شمالی مغربی برما کے شان (SHAN) لوگوں نے آسام اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں حملے شروع کیے اور تیرھویں صدی عیسوی تک دریائے برہم پتر کی وادی کے کافی حصے پر قابض ہو گئے۔ بعد میں ان میں سے بہت سے لوگ یہیں بس گئے اور کاشت کاری کرنے لگے۔ غالباً ہندستان میں سنترے کے پیڑ انھیں لوگوں نے لگانا شروع کیے۔ سنترے کے نام کا ابتدائی حصہ غالباً اسی شان قوم کی طرف اشارہ کرتا ہے (ش کا 'س' سے بدل جانا ممکن ہے)

آسام میں سنترے کو سُم تھرا (SUM THIRA) کہتے ہیں ہیم کوش (آسامی ورناکولر ڈکشنری) کے مطابق یہ لفظ مرکب ہے۔ سُم، "سونا" کا بگڑا ہوا روپ ہے (سُم ہندی میں جنس ہے) اور تھرا "تارا" کا۔ سنترے کے پکے ہوئے پھل ہرے ہرے پتوں میں دور سے سنہرے تاروں کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، لہذا ان کا نام آسامی زبان میں سُم تھرا رکھا گیا۔ گویا اس پھل کا ہندستانی نام سنترا مخفف ہے سونا تارا کا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس پھل کا ہندستانی نام سنترا پرتگال کے قصبے سنترا (SINTRA/CINTRA) سے ماخوذ ہے۔ جو کم از کم چودھویں صدی عیسوی سے عمدہ قسم کے سنتروں کے لیے مشہور ہے۔ ہو سکتا ہے ہندستان میں اس پھل کا رواج پرتگیز لوگوں کے ذریعہ ہوا ہو۔

دہلی کے بادشاہ محمد شاہ رنگیلے (زمانۂ حکومت ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء) نے خوشنما رنگ کی وجہ سے سنترے یا سنگترے کا نام بدل کر رنگترا رکھا جو مقبول نہ ہوا۔

چکوترا



یہ پھل کنولے کی ایک بڑی قسم ہے۔ بنگال کا چکوترا مشہور ہے۔ اس کی ایک بہت بڑی قسم کا پھل ماہتابی کے نام سے مشہور ہے۔
(فن باغبانی ص ۲۹۳)

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز جس ملک سے آتی ہے اسی کے نام پر مشہور ہو جاتی ہے: جیسے مصر کے نام پر مصری، مرتبان (برما کے شہر) کے نام پر مرتبان (چینی مٹی کا برتن) اور سورت (شہر) کے نام پر سورتی (تمباکو)۔ چکوترا، مسمبی اور مالٹا بھی ایسے ہی پھل ہیں جن کے نام مقامات کے نام پر ہیں۔

چکوترا ہندستان میں جاوا سے آیا۔ اس کا نام جاوا کے شہر جکارتا (JAKARTA) کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ جکارتا انڈونیشیا کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر کا پرانا نام "بتاویا" (BATAVIA) تھا، اسی لیے بنگال میں چکوترا کو "بتابی لیبو" (BATABI - LEBU) کہا جاتا ہے۔ اس کا نام "مہتابی" غالباً مسلمانوں کی جدت طرازی ہے۔ یہ "تابی" میں "ماہ" (چاند) کے اضافے سے بنایا گیا ہے اور مہا کا بدل ہے۔ چکوترا کافی بڑا ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے "مہابنو" بھی کہتے ہیں۔

مُسَمّبِی

عوام اسے موسمی بھی کہتے ہیں لیکن اس کا موسم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسمبی کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ انگریزی میں بھی اسے مُسمبی یا موسمبی (MUSAMBI / MOSAMBI) کہا جاتا ہے۔ یہ موزمبیق MOZAMBIQUE کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ہمارے ملک میں یہ پھل موزمبیق سے آیا، اور اسی کے نام سے مشہور ہوا۔ موزمبیق کا ملک افریقہ کے جنوبی مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ اس کا پرانا نام "پرتگیز ایسٹ افریقہ" تھا۔

مالٹا



مالٹا (MALTA) بحیرۂ روم میں سسلی کے جنوب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ یہاں سے موجودہ صدی کے شروع میں ہمارے ملک میں سنترے کی ایک اعلا قسم آئی جو اس جزیرے کے نام پر مالٹا کہلاتی ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مسمبی اور مالٹے کا چھلکا موٹا اور گودے سے چپکا ہوتا ہے اور اسے چاقو سے اتارنا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے سنترے اور نارنگی کا چھلکا ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے اور اسے آسانی سے چھیلا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں پھانکیں ہوتی ہیں۔

کِھرنی، کھیرا

کھرنی مشہور میوہ ہے جو پکی ہوئی نمکولی (نیم کے پھل) سے مشابہ ہوتا ہے۔ کھیرا ککڑی کی قسم کا پھل ہے۔ ان دونوں کے ناموں کی اصلیت جاننے کے لیے ہمیں ان سے رشتہ



رکھنے والے دوسرے دو الفاظ یعنی کھیر اور کھیری پر بھی غور کرنا ہوگا۔

فارسی میں شیر کے معنی ہیں "دودھ" سنسکرت میں یہ کشیر (क्षीर) ہے۔ عوام اسے چھیر کہتے ہیں۔ اسی سے لفظ کھیر بنا ہے جو دودھ میں چاول اور شکر ڈال کر پکائی جاتی ہے کھیری مویشیوں کے تھنوں سے اوپر کا وہ گوشت ہے جس میں دودھ بنتا اور رہتا ہے۔

کھیرے کے اوپری حصّے کو کاٹ کر جب نیچے والے حصے پر رکھ کر رگڑتے ہیں تو دودھ کا ایسا سفید پھین نکلتا ہے لہٰذا اس کا نام ہی کھیرا رکھ دیا گیا۔

یہی کھرنی سو اسے دبایئے تو دودھ نکلتا ہے اور کھایئے تو باچھوں میں دودھ بھر جاتا ہے، لہٰذا اس میوے کا نام کھیرنی پڑ گیا جو مخفف ہو کر کھرنی اور پھر کھِنّی ہو گیا۔ بعض جگہ اسے کھیری بھی کہتے ہیں۔

آم، آملہ، اِملی، اَمرا



ان چار پھلوں کے نام آپس میں گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔

آم مخفف ہے سنسکرت آمر (आम्र) کا۔ آمر سے ہی لفظ اَمرا نکلا ہے۔ اس کا پھل آم کی طرح کھٹا ہوتا ہے اور اچار بنانے کے کام آتا ہے۔ عوام اسے انباری بھی کہتے ہیں۔

اس کا مقابلہ فارسی انبہ سے کیجیے، جس کے معنی ہیں "آم"

آمر سے دو اور لفظ نکلتے ہیں یعنی آملہ یا آنولہ (ر، ل سے بدل جاتا ہے) جس کی تانیث املی ہے۔ آملے کی پتیاں املی کی پتیوں سے مشابہ ہوتی ہیں لیکن املی کھٹی ہوتی ہے اور آملہ کھٹا

املی کو انگریزی میں (TAMARIND) کہتے ہیں، جو عربی "تمر ہندی" (ہندستان کی کھجور) کا بگڑا ہوا روپ ہے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ والوں کو املی کا علم عربوں کے ذریعہ ہوا۔

□□

اپنے قارئین سے

نیا دور کی اشاعت میں تاخیر کے لیے ہم بار بار اپنے مخلص قارئین سے معذرت کر چکے ہیں۔ ہم نیا دور کو ماہ بہ ماہ آپ کی خدمت میں پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس سلسلہ میں آپکو انتظار کی جو زحمت اٹھانی پڑی ہے اس کے لیے ہم انتہائی معذرت خواہ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمیشہ کی طرح آپ کا بھرپور تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔

——— (ادارہ)

بشیر بدر
۱۸۵- ابولین، میرٹھ

دو غزلیں

اب تیرے میرے بیچ ذرا فاصلہ بھی ہو
ہم لوگ جب ملیں تو کوئی دوسرا بھی ہو

تو جانتا نہیں مری چاہت عجیب ہے
مجھ کو منا رہا ہے کبھی خود خفا بھی ہو

تو بے وفا نہیں ہے مگر بے وفائی کر
اس کی نظر میں رہنے کا کچھ سلسلہ بھی ہو

چپ چاپ اس کو بیٹھ کے دیکھوں تمام رات
جاگا ہوا بھی ہو کوئی سویا ہوا بھی ہو

پت جھڑ کے ٹوٹتے ہوئے پتوں کے ساتھ ساتھ
موسم کبھی تو بدلے گا یہ آسرا بھی ہو

اس کے لیے تو میں نے یہاں تک دعائیں کیں
میری طرح سے کوئی اسے چاہتا بھی ہو

○

لہروں میں ڈوبتے رہے دریا نہیں ملا
اس سے بچھڑ کے پھر کوئی ویسا نہیں ملا

کچھ لوگ تھوڑی دیر تو اچھے لگے مگر
ہم جس کے ہو سکیں کوئی ایسا نہیں ملا

وہ بھی بہت اکیلا ہے شاید مری طرح
اس کو بھی کوئی چاہنے والا نہیں ملا

ساحل پہ کتنے لوگ مرے ساتھ ساتھ تھے
طوفاں کی زد میں آیا تو تنکا نہیں ملا

دو چار دن تو کتنے سکوں سے گذر گئے
سب خیریت رہی کوئی اپنا نہیں ملا

○○○

جعفر عسکری

اردو کے خود نوشت سوانح نگاروں میں جوش کا مرتبہ

اردو میں خود نوشت سوانح نگاری کے فن کو قبولِ عام کی سند بیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔ آج تک اردو میں جس قدر بھی خود نوشت سوانح عمریاں عالمِ وجود میں آئی ہیں، اول تو یہ کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ وہ فن کی میزان پر پوری نہیں اترتیں نیز تنقیدی نقطۂ نظر سے، معدودے چند کو چھوڑ کر، اکثر ناقص قرار دیئے جانے کی مستحق ہیں۔ کیوں کہ خود نوشت سوانح نگاری کا فن جن فنی خصوصیات، دماغی عرق ریزی اور گہری فکری بصیرت سے عبارت ہے، اردو کی بیشتر خود نوشت سوانح عمریاں ان عناصر سے محروم ہیں۔

اردو کی سب سے پہلی خود نوشت سوانح حیات مولانا جعفر تھانیسری کی سوانحی تصنیف تواریخِ عجیب ہے جس میں فن کے نقطۂ نظر سے بے شمار کمزوریاں ہیں لیکن اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں تحریر کردہ ظہیر دہلوی کی خود نوشت سوانح عمری داستانِ غدر ہے جس میں غدر کے واقعات بیان کرنے میں خود مصنف کی سیرت و شخصیت کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو گئے ہیں۔ مذکورہ سوانحی تصنیف کا سنِ اشاعت ۱۹۱۰ء ہے۔ ۱۸۸۸ء میں عبدالغفور خاں نساخ نے آپ بیتی کے نام سے اپنی سوانح عمری کی تصنیف کی جس میں ذاتی حالات و واقعات کسی ترتیب و ربط کے ساتھ تو قلم بند نہیں کئے گئے ہیں پھر بھی اس کا اسلوب بڑا دلکش ہے اور مذکورہ سوانحی تصنیف کی بہت سی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ بیسویں صدی میں اردو کے مشہور انشا پرداز اور ادیب خواجہ حسن نظامی کی خود نوشت سوانح حیات آپ بیتی (سنِ اشاعت ۱۹۲۹ء) منظرِ عام پر آئی۔ مذکورہ سوانحی تصنیف زیادہ ضخیم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس میں شعر و ادب، سفر و حضر، تصوف، ذاتی حالات نیز علمی، ادبی اور تاریخی حالات کو بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خود نوشت سوانح عمری تذکرہ (سنِ اشاعت ۱۹۱۹ء) بھی قابلِ لحاظ خود نوشت سوانح عمری ہے، اس کے باوجود کہ اس میں بہت سے فنی نقائص موجود ہیں اور یہ سلسلہ وار اور مربوط طریقے پر نہیں لکھی گئی ہے۔ ظفر حسن ایبک نے اپنی سوانح آپ بیتی (سنِ اشاعت تقریباً ۱۹۴۹ء) کے عنوان سے تحریر کی۔ مذکورہ تصنیف کئی اعتبار سے اردو کے خود نوشت سوانح نگاری کے ادب میں ایک بلند مقام رکھتی ہے کہ اس میں ذاتی حالات کے علاوہ قومی، بین الاقوامی سیاسی حالات، مسلمانانِ عالم کے ذہنی رجحان وغیرہ کو نہایت مہارت اور فنکارانہ طریقے پر پیش کیا گیا ہے۔ اردو کے سوانحی ادب میں سر رضا علی کی خود نوشت سوانح حیات "اعمال نامہ" (سنِ اشاعت ۱۹۴۳ء) اپنی باقاعدگیوں اور دلچسپیوں کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سر رضا علی کا ادبی ذوق صاف ستھرا تھا۔ سیاسی، تاریخی، قومی، تہذیبی حالات، اردو ادب اور بین الاقوامی ادب سے گہری واقفیت نے اعمال نامہ کو ایک منفرد اور دلچسپ سوانحی تصنیف کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ اسی زمانے کی ایک اور اہم خود نوشت سوانح حیات حکیم احمد شجاع کی خوں بہا (سنِ اشاعت ۱۹۴۲ء) ہے۔ محبت، حسن، اخلاص، انکساری اور سادگی نے مذکورہ خود نوشت سوانح حیات کو خاصہ اہم بنا دیا ہے۔ مذکورہ بالا خود نوشت سوانح عمریوں کے علاوہ چند دیگر قابلِ ذکر خود نوشت سوانح عمریوں میں نواب چھتاری کی یادِ ایام (۱۹۴۹ء)

مولانا حسین احمد مدنی کی نقشِ حیات (۱۹۵۴ء)، سردار دیوان سنگھ مفتون کی ناقابلِ فراموش، ہوش بلگرامی کی مشاہدات (۱۹۵۵ء)، شاد عظیم آبادی کی شاد کی کہانی شاد کی زبانی (۱۹۵۶ء)، عبدالمجید سالک کی سرگذشت (۱۹۵۵ء)، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی یادوں کی دنیا (۱۹۶۷ء)، سورش کاشمیری کی بالترتیب پسِ دیوارِ زنداں، نغمۂ عشرت، موت سے واپسی اور نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ہیں۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد جوش کی معروف خود نوشت سوانح عمری یادوں کی برات پر گفتگو زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ جوش اپنی سوانحی تصنیف میں مذکورہ کتاب کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں نے اپنے حالاتِ زندگی قلمبند کرنے کے سلسلے میں کامل چھ برس تک مسلسل اور گاہ گاہ غیر مسلسل عرق ریزی کی ہے۔ ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ تیار کیا، اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پھر ڈیڑھ پونے دو سال صرف کرکے، تو سو صفحات کا تیسرا مسودہ تحریر کیا، اور تین ہزار میں اس کی کتابت بھی مکمل کرائی، مگر جب اس پر غائر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ اس مسودے کو بھی میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے جو صبح کو بیدار ہوکر، رات کے خواب کو، اس خوف سے، جلدی جلدی اٹھا بیٹھا لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے۔

اور خدا خدا کرکے، اب یہ چوتھا مسودہ شائع کیا جا رہا ہے اور میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ میں اس چوتھے مسودے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں اب مجھ میں دم باقی نہیں ہے کہ دو برس مزید عرق ریزی کرکے پانچواں مسودہ لکھوں اور اسے بھی قلم زد کردوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا ہوں کہ اب میرے چل چلاؤ کا وقت سر پر آپہونچا ہے ...."[1]

مذکورہ بالا سطور سے ہم بہ آسانی اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں کہ یادوں کی برات کی شانِ نزول سرسری نہیں ہے بلکہ مسلسل چھ برس کی کدوکاوش اور عرق ریزی کے بعد تین مسودات کو ناقص قرار دیے جانے کے بعد چوتھے مسودے کی تکمیل و تصنیف کو جوش نے لائقِ اشاعت قرار دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ چوتھے مسودے سے بھی چنداں مطمئن نہ تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جوش کی سوانحی تصنیف یادوں کی برات چھ برسوں کی مسلسل دماغی ورزش اور تخلیقی جدوجہد کا ثمرہ ہے اس لیے وہ تمام ناقدین و مبصرین جو مذکورہ خود نوشت سوانح حیات کو محض لفظی شعبدہ گری اور جھوٹ کا پلندا قرار دیتے ہیں، وہ خود دروغ گو ہیں۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اپنی سوانحی تصنیف میں جوش نے اپنے اندر سے باہر کی سمت سفر کیا ہے اور خارجی دنیا نیز اپنے اندر کی دنیا کے تمام رطب و یابس کو اپنے مخصوص انفرادی طرزِ بیان میں پیش کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مذکورہ خود نوشت سوانح عمری میں جوش نے بہت سے حقائق کو بھی افسانوی رنگ و آہنگ عطا کر دیا ہے، ساتھ ہی، اس کے برعکس، بہت سے افسانوں کو حقائق کے پیکر میں ڈھالنے کی سعیٔ نامشکور کی ہے۔

یادوں کی برات کی انفرادیت مسلم ہے۔ اردو کی کوئی دوسری خود نوشت سوانح حیات مثال میں نہیں پیش کی جا سکتی جس کی اشاعت برسوں نزاع کا موضوع رہی ہو۔ شاید اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مذکورہ خود نوشت سوانح حیات میں جوش نے جس بے خوفی اور بے باکی سے تلخ حقائق کو بے نقاب کیا ہے نیز مروجہ کہنہ روایات سے بغاوت کی ہے اور ساتھ ہی جس تندی سے مصنوعی تہذیبی و معاشرتی اقدار پر کاری ضرب لگائی ہے ـــــ تنگ نظر اور قدامت پسند طبقہ نیز رجعت پسند عناصر اسے برداشت نہیں کر سکے۔ یادوں کی برات کے نزاع کا سبب بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر یوں رقم طراز ہیں:

"اشاعت کے فوراً بعد یادوں کی برات متنازع فیہ بن گئی تو اس کی ایک وجہ تو خود جوش کی نزاعی شخصیت تھی مگر اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ کتاب میں جوش نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے مخصوص گھن گرج والے اسلوب میں پُرجوش غیر منافقانہ انداز میں گفتگو کی تھی ...."[2]

مذکورہ مضمون میں آگے چل کر ڈاکٹر سلیم اختر نے جوش کی "نزاعی شخصیت" کی مزید وضاحت ان لفظوں میں کی ہے:

---

[1] ماخوذ از چند ابتدائی باتیں مطبوعہ یادوں کی برات از جوش۔ ص۔ ۱

[2] ماخوذ از جوش کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ افکار ۱۹۸۲ء ص۔ ۴۵۸

"جوش کی شخصیت کا بہت بڑا حسن صاف گوئی ہے۔ ایسی صاف گوئی جو بعض اوقات تو مداقتوں کو بھی کیموفلاج کرتی نظر آتی ہے (بالکل اسی طرح جیسے بہت تیز روشنی چکاچوند پیدا کرکے آنکھوں کے لیے اندھیرے کا باعث بن جاتی ہے)" سلہ

اردو کے دوسرے خود نوشت سوانح نگاروں کے مقابلے میں جوش اپنی سوانحی تصنیف یادوں کی برات میں انتہائی صاف گو، بے باک اور حقیقت پسند قلم کار کی حیثیت سے نمایاں ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ یادوں کی برات پر تنقید کرنے والے ناقدین کا ایک مخصوص گروہ مذکورہ کتاب کے انھیں حصّوں کو عام طور سے ہدفِ ملامت بناتا ہے جن میں جوش ایک انتہائی بے تکلفی و بے باکی کے ساتھ زندگی کے تاریک گوشوں اور تہذیب کے گلتے ہوئے ناسور کو کامیابی سے بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں۔

جوش کی ایک اور خصوصیت جو انھیں دوسرے خود نوشت سوانح نگاروں سے منفرد و ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تجربات، مشاہدات و محسوسات کو جس مردانہ و توانا لب و لہجے میں بیان کیا ہے نیز جس کثرت سے مختلف النوع اور گوناگوں مسائلِ ذات و حیات کو پیش کیا ہے اس کی مثال اردو کے کسی دوسرے خود نوشت سوانح نگار کے یہاں نظر نہیں آتی ہے۔ بحیثیت خود نوشت سوانح نگار انھیں یہ خصوصیت بھی عظمت و تقدم عطا کرتی ہے کہ اپنی سوانحی تصنیف میں وہ خود نوشت سوانح نگار کے علاوہ ایک ادیب، ایک انشا پرداز، ایک مفکر، ایک شاعر، ایک صحافی، ایک باغی، ایک عیاش، ایک رندِ اوباش، ایک یار باش، ایک عاشق، ایک ملحد، ایک دین دار، ایک انسان دوست، ایک ماہرِ لغویات، ایک نبّاضِ فن، ایک ماہرِ زبان، مصلح، ایک وفاشعار شوہر، مشفق باپ، ایک امن پسند شہری، ایک اشتراکی، ایک جاگیردار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک انسان کی شکل میں نمودار ہوئے ہیں۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو کے کسی دوسرے خود نوشت سوانح نگار کی شخصیت اتنی تہہ دار، متنوع اور متضاد نہیں ہے جیسی کہ جوش کی ہے۔ پھر یہ بھی جوش ہی کی شخصیت ہے جو اتنے خانوں میں تقسیم ہونے کے باوجود منتشر ہوتی نظر نہیں آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر وحید اختر:

"جوش صاحب نے اپنے تجربات کے سلسلے میں لفاظی اور تصنع سے کام نہیں لیا۔ نثر رواں بھی ہے اور جاندار بھی، خصوصاً اس کے وہ حصے جو شخصیات کے متعلق ہیں اردو شخصیت نگاری میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک فحش لطائف، عریاں نگاری، جنسی تجربات اور لذت کوشی کی ترجمانی کا سوال ہے شاید جوش سے زیادہ اردو میں کوئی دوسرا اس کا حق ادا بھی نہ کر سکتا تھا۔ کیوں کہ نہ تو دوسروں کے تجربات اتنے متنوع ہوں گے نہ زبان ان معاملات کے بیان کرنے میں یاوری کر سکتی ہے جیسی جوش کی شخصیت اور زبان نے کی ہے۔ جوش کو اہلِ اردو سے مردانگی کی کمی کی شکایت ہے اسی لیے وہ بہت سی باتوں کو ناگفتنی چھوڑ گئے ہیں جس کا انھیں قلق ہے مگر جتنا کچھ ان کے قلم سے گفتنی بنا ہے وہی شاید ہماری تہذیب کی ریاکاری اور نقاب در نقاب طرزِ بیان کے لیے مشکل سے ہی قابلِ قبول ہوگا۔" سلہ

اس مختصر مضمون میں یادوں کی برات کے طرز و اسلوب اور تکنیک وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں ہے، یہاں صرف یہ باور کرانا مقصود ہے کہ جوش نے اپنی سوانحی تصنیف میں جتنے اسالیبِ بیان سے کام لیا ہے نیز طرزِ نگارش کے جتنے نمونے چھوڑے ہیں، اردو کے کسی اور خود نوشت سوانح نگار کی سوانحی تصنیف میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ جوش نے جو زبان استعمال کی ہے، وہ عام طور سے رواں ہے، لیکن بعض مقامات پر عبارت آرائی اور مقفیٰ و مسجع عبارت کی زیادتی نے بے کیفی بھی پیدا کر دی ہے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:

"جناب جوش ملیح آبادی مترادف الفاظ جمع کرنے کو شاید انشا پردازی کا کمال سمجھتے ہیں مگر ان کا یہ اندازِ نگارش پڑھنے والے میں اکتاہٹ اور بدمزگی پیدا کر دیتا ہے"

مولانا عبدالماجد دریابادی کے علاوہ بعض دیگر ناقدین نے بھی جوش کی زبان نیز طرزِ بیان کے متعلق اسی قسم کی آرا کا اظہار کیا ہے جو کسی حد تک صداقت پر مبنی ہیں۔ لیکن زبان و طرزِ بیان کی یہ لغزشیں ایسی نہیں ہیں کہ انھیں پر ساری تنقیدی قوت صرف کر دی جائے اور یادوں کی برات کی بے شمار خوبیوں سے چشم پوشی کر لی جائے۔ جوش لائقِ ملامت و قابلِ گردن زدنی اس وقت ہوتے جب انھوں نے اپنی سوانحی تصنیف میں

شروع سے آخر تک صرف قافیہ پیمائی کی جاتی اور محض الفاظ کی صنعت گری پر تمام قوت صرف کر دی جاتی۔ اس کے برعکس یادوں کی برات میں ندرتِ زبان و بیان کے ایسے عمدہ نمونے کثرت سے ہیں جن میں صرف حلاوت و سلاست ہی نہیں بلکہ گہری معنویت ملتی ہے۔ یادوں کی برات کے سب سے کمزور حصے وہ ہیں جن میں جوش مبالغے کی حدوں سے تجاوز کر گئے ہیں اور واقعات پر غلو کے ساتھ ساتھ مصنوعی اندازِ بیان غالب آ گیا ہے خاص طور سے اپنے اٹھارہ معاشقوں کی داستان بیان کرتے ہوئے ان کے اندازِ بیان میں مبالغہ، تصنع اور دروغ گوئی کے عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

یادوں کی برات صرف محض نگاری، داستان سرائی، دروغ گوئی اور محض گپ بازی سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس میں لاتعداد علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور قومی مسائل پر سنجیدگی اور استدلال کے ساتھ سحر انگیز طریقے پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ یادوں کی برات میں مبالغہ آرائی بھی ہے، گپ بازی اور دروغ گوئی بھی۔ لیکن جوش کے ناقدین کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے کہ بنیادی طور پر جوش ایک تصور پرست اور رومان پسند فنکار تھے۔ وہ حقائق کو بھی ایک رومانی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ یادوں کی برات میں جوش نے اکثر واقعات کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور بہت کچھ فقط زیبِ داستان کے لیے اس میں شامل کر لیا ہے پھر ایک پہلو یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تاثیر پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے بعض غیر اہم سے غیر اہم واقعات تک کو، جن کی صداقت مشکوک ہے، اہم، حقیقی اور غیر معمولی طور پر دلچسپ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں ڈاکٹر سلیم اختر کے مضمون سے یہ اقتباس پیش کر دیا جائے جس میں انھوں نے جوش اور ان کی سوانحی تصنیف یادوں کی برات کا نفسیاتی تجزیہ بڑی کامیابی سے کیا ہے:

"یادوں کی برات کے ضمن میں ایک بات پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ اس میں صداقت کتنے فی صد ہے؟ صداقت کے اخلاقی اور معاشرتی مفہوم سے قطع نظر جب ہم نفسیات کی روشنی میں قول کا مطالعہ کریں تو سچ اور جھوٹ کی حدیں لاشعوری محرکات کی طلسم کاری کا تو یہ عالم ہے کہ کسی خاص موقع پر کسی لفظ کا بھول جانا یا زبان یا قلم سے حرفِ غلط کا نکل جانا تہ در تہ نفسی کیفیات سے مملو نظر آتا ہے تو خود نوشت سوانح عمری کے بیان میں سچ اور جھوٹ کو ہوا بند ڈبوں میں نہیں تلاش کیا جا سکتا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جوش کے کذب کی جستجو کے برعکس یہ دیکھنا زیادہ بہتر ہوگا کہ انھوں نے کس حد تک ایمانداری سے کام لیا ہے۔ میں نے جب اس معیار پر یادوں کی برات کو پرکھا تو جوش کو خاصہ بے جھجک پایا۔ اس حد تک کہ وہ "تر خواب" کا بھی تذکرہ کر دیتے ہیں۔

"مشاعرے سے داد کے رطل ہائے گراں پی کر جھومتا جھامتا گھر آیا تو خوشی کے مارے دیر تک نیند نہیں آئی۔ اور سو گیا تو خواب میں یہ دیکھتا رہا کہ پریاں بھینچ بھینچ کر مجھے گلے لگا رہی ہیں۔ غسل مجھ پر واجب ہو گیا" (ص۔ ۱۴۰)

یہ ایمانداری کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جوش نے ہر ممکن طریقے سے اپنا قد اونچا رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی یہ کوشش فطری معلوم ہوتی ہے تو کبھی بے چوں محسوس ہوتی ہے۔ گویا جوش نے اونچی ایڑی کے جوتے پہن رکھے ہوں"[1]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یادوں کی برات اندھیرے اور اجالے اور خیر و شر کی ایک دلچسپ اور عبرت انگیز دستاویز ہے۔ جوش کی خود نوشت سوانح عمری یادوں کی برات کو، اگر نہایت اختصار سے لکھا جائے تو، مندرجہ ذیل اسباب و خصوصیات کی بنا پر اردو کی دیگر خود نوشت سوانح عمریوں پر فوقیت و تقدم حاصل ہے:

جوش بالکل نجی و ذاتی معاملات تک کو بے چون و چرا بیان کر دیتے ہیں مثلاً معاشقوں کا احوال، صنفِ نازک سے غیر معمولی دلچسپی کا

---

[1] جوش کا نفسیاتی مطالعہ۔ ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ افکار (جوش نمبر) ۱۹۸۳ء ص۔ ۴۵۶

ذکر، جنسی بے راہ روی کے متعدد واقعات وغیرہ۔

جوش نے انواع و اقسام کے حالات و واقعات جس کثرت سے اپنی سوانحی تصنیف میں قلم بند کئے ہیں، اس کی مثال کسی دوسری اردو کی خود نوشت سوانح عمری میں نہیں ملتی۔

یادوں کی برات برسوں نزاع کا موضوع بنی رہی اور اردو کی کسی دوسری خود نوشت سوانح حیات پر اردو دنیا نے اس قدر واویلا نہیں کیا۔

یادوں کی برات کا کینوس (CANVAS) جتنا وسیع ہے، ویسا کسی اور خود نوشت سوانح عمری کا نہیں ہے، اردو خود نوشت سوانح نگاری کے حدود میں۔

جوش اردو کے واحد خود نوشت سوانح نگار ہیں جنھوں نے سماج کے ہر طبقے کے افراد کی عکاسی کی ہے نیز ہر طبقے کے ذوق کا سامان اس میں یکجا کر دیا ہے۔

جوش نے یادوں کی برات میں اپنے ذاتی حالات کے دوش بدوش سات دہائیوں پر مشتمل زندگی کے گوناگوں مسائل و مصائب نیز واقعات، حادثات، مشاہدات، تجربات و محسوسات کو جس فنکارانہ حسن کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے، اردو خود نوشت سوانح نگاری کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

شخصیات پر تحریر کردہ جوش کے خاکوں نے یادوں کی برات میں خصوصی کشش پیدا کر دی ہے اور ایک لحاظ سے جوش کی روداد حیات کو وسعت و دائمیت عطا کر دی ہے۔

مذکورہ بالا محض چند امتیازی خصوصیات ہی کو پیش نظر رکھا جائے تو بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت خود نوشت سوانح نگار جوش کا جو مرتبہ اردو خود نوشت سوانح نگاروں میں ہے وہ کسی دوسرے سوانح نگار کا نہیں ہے۔

احمد وصی

ایک نظم

کیفؔ احمد صدیقی کی یاد میں

تم سے ملنا، تم سے بچھڑنا
تم سے بحثیں کرنا، لڑنا
تم کو سننا، تم کو پڑھنا
بھلا بھلا سا لگتا تھا
بچپن کا ہر گذرا لمحہ
رُکا رُکا سا لگتا تھا
اپنا شہر، محلہ، کوچہ
دُھلا دُھلا سا لگتا تھا

آبائی وطن جب میں جاؤں گا
مجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا
کب آئے ہو کب جاؤ گے
اب وہ موسم بیت چکا ہے
تم سے کوئی نہیں پوچھے گا
کہاں گئے ہو کب آؤ گے

ایم کوٹھیاوی راہی

ایڈیٹر "اشتراک۔ دہلی"
قاضی پور خورد۔ گورکھ پور

دو غزلیں

اک سمن پوش تھا اور وہ بھی تمہارے جیسا
کوئی موسم نہیں آئے گا ہمارے جیسا

ڈوب جانے کے لیے اُترا تھا آکاش سے چاند
جھیل میں تیر رہا ہے جو شکارے جیسا

اُنگلیاں کاٹنے والی تھیں کنیزیں ابھی
کوئی زنداں سے نہیں نکلا تمہارے جیسا

ایک بہتا ہوا دریا تھا تمہارا شاعر
آج لگتا ہے جو مٹّی کے کنارے جیسا

رہ گیا رات مری چشمِ غزل میں ڈھل کر
ہائے وہ قطرۂ معصوم شرارے جیسا

تب مری آنکھ کی ٹھنڈک تھا وہ شعلہ راہی
اب دہکتا ہے جو سینے میں شرارے جیسا

کوئی بدن، کوئی چہرہ نہ اب نظر آئے
شب ایسی آئے کہ نہ جس کی کوئی سحر آئے

کسی غبار، کسی دھند نے مٹا ڈالا
یہ جان لینا جو اب کے نہ لوٹ کر آئے

ہمارے جسم کو اے دوست مُدّتیں گذریں
پر اطمینان کے لمحات مختصر آئے

کوئی درخت نہیں، ریت ریت ساحل پر
نہ جانے کیسے یہاں ناؤ سے اُتر آئے

یہ میری رُوح نے دیکھا کہ رو پڑیں آنکھیں
مرے بغیر مرے گھر جو ہم سفر آئے

لہو بہا تو چلو اب کے بار یہ تو ہوا
تمہارے عارض و لب اور بھی نکھر آئے

نیاز سلطان پوری
بھتی جرولی سلطان پور

کلیم الدین احمد بحیثیت نقاد

اُردو تنقید کی دُنیا میں کلیم الدین احمد کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ ان کا شمار اردو کے انتہا پسند نقادوں میں کیا جاتا ہے۔ "اُردو شاعری پر ایک نظر"۔ "سخنہائے گفتنی" "اُردو تنقید پر ایک نظر"۔ "اردو میں فن داستان گوئی"۔ "عملی تنقید" اور "قدیم مغربی تنقید" موصوف کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔

اردو تنقید کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ اس نے تقریظات اور تذکروں کے بطن سے جنم لیا ہے۔ حالی کے مقدمے کو اُردو تنقید کا اولین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے، جو نئے تناظر کی روشنی میں تنقید نگاری کی پہلی اور شعوری کوشش ہے اسے اُردو تنقید کا آمد نامہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

برطانوی سامراج کے زیر اثر مشرقی ادبیات میں کئی گراں قدر اضافے ہوئے انھیں میں سے ایک خوش گوار اضافہ تنقید نگاری بھی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے کہ اردو ادب میں تنقید بالکل ناپید تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کے تذکروں، تقریظات اور مشاہیر کے خطوط میں تنقید کے اولین نمونے وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

جن لوگوں نے مغرب کے ادبی تنقیدی رجحان و میلانات کی روشنی میں اُردو ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ان میں کلیم الدین احمد کا نام سر فہرست ہے۔ ان کی تنقید نگاری کا وصف غیر جانبداری اور صاف گوئی ہے۔ وہ کسی بھی ادبی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر اپنے مافی الضمیر کو واضح الفاظ میں ادا کر دیتے ہیں۔ انھیں اپنی آواز کی تائید کے لیے نہ تو قارئین کا وسیع حلقہ چاہیئے اور نہ ہی ہمنواؤں کی صف شکن فوج۔ نہ تو وہ کسی سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ مصلحت پسندی کا شکار۔ یہی وہ وصف ہے جو انھیں تمام معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔

مغرب زدگی

مغرب زدگی کلیم الدین احمد کی سب سے بڑی کمزوری رہی ہے۔ مغربی ادب کے زیر اثر انھیں اُردو سمیت تمام مشرقی زبانوں کا ادب بے مقصد اور غیر وقیع نظر آتا ہے۔ وہ مغربی ادبیات اور تنقید سے حد درجہ متاثر ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں ایک طرح کا انتہا پسندانہ رُجحان پیدا ہو گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر میں مشرقی ادب کی کوئی چیز اہم نہیں ہے۔ وہ اُردو ادب کو مغربی ادب کے تنقیدی اصولوں پر پرکھتے ہیں جس سے ان کے تنقیدی فیصلوں میں غلطی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ان کے نزدیک میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مومنؔ ایسے اعلیٰ درجے کے شاعر نہ ہو سکے کہ وہ انگریزی ادبیات سے ناآشنا تھے، چنانچہ وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

> "میرؔ، سوداؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ کی غزلوں سے یہ حقیقت صاف عیاں ہے کہ

اُن میں اعلیٰ پائے کے شاعر ہونے کی صلاحیت موجود تھی۔ اگر یہ کسی مغربی ادب سے واقف ہوتے، نظم کے مفہوم سے آشنا ہوتے تو آج اُردو شاعری دنیائے ادب میں اس قدر پست اور مبتذل نہ نظر آتی۔" ؎۱

کلیم الدین احمد مشرق کی ہر چیز کو مغرب کی نظر سے دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو کے ادبی شاہکاروں تک سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ اقبال کی بعض نظمیں جو اُردو میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں اور جو مشرقی ادبیات کا سرمایۂ افتخار ہیں، ان کی جارحانہ تنقید کا بری طرح شکار ہوئی ہیں۔ اقبال پر دراز زنی کرتے ہوئے، "اُردو شاعری پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں،

"اقبال نظمیں لکھتے ہیں لیکن وہ پیغمبری کو شاعری سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھتے ہیں۔ انھیں کچھ کام کرنا ہے، ضروری پیغام دینا ہے اس لیے وہ صرف پیغام پر دھیان دیتے ہیں۔ شاعرانہ محاسن اور تکنیک پر دھیان نہیں دیتے، وہ پیغام میں ایسا محو ہو جاتے ہیں کہ اور کسی چیز کی کھوج نہیں کر پاتے ہیں۔ وہ پورب پچھم چکوروں کی دُنیا میں تو سانس لیتے ہیں لیکن شاعری کے نیلگوں اور بیکراں آسمان تک ان کی رسائی نہیں۔" ؎۲

وہ حالی کو اردو تنقید کا بانی اور اُردو کا بہترین نقاد تسلیم کرتے ہیں لیکن انگریزی زبان و ادب سے عدم واقفیت کی بنا پر حالی کا دماغ اوسط درجہ کا "خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ و شخصیت اوسط" گردانتے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اُردو شاعری کا بیشتر سرمایہ دریا برد کرنے کے لائق ہے مگر سرے سے اُردو شاعری میں اعلیٰ نمونوں کی موجودگی سے انکار نہ صرف [illegible] اور غلط بیانی کی علامت بھی ہے۔ حالی نے جب غزل کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس کے غیر صحت مند عناصر پر انگشت نمائی کی تو غزل کے شیدائیوں نے حالی کا قافیہ تنگ کر دیا حالانکہ حالی کا بنیادی مقصد غزل کی تنقیص کے بجائے اس کی اصلاح تھا۔ کلیم الدین احمد کی صدا جس وقت ایوانِ غزل میں گونجی تو نہ صرف پاسبانِ غزل متزلزل ہوئے بلکہ اُردو تنقید نگار تک بری طرح جھنجھوڑ اُٹھے، جس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اُردو کے سہل نگار نقادوں کو غور و فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

انتہا پسندی

کلیم الدین احمد کی شخصیت جہاں انتہا پسندی کے لیے موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے، وہیں وہ روایت شکنی میں اپنی آپ مثال ہیں۔ جب انھوں نے غزل کے متعلق نیم وحشی صنفِ سخن کا فتویٰ صادر کیا تو ان کے خلاف ایک طوفانِ عظیم برپا ہو گیا۔ ان کی مخالفت میں کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ اردو کے سہل نگار نقادوں نے ان کے خلاف زہر افشانی بھی کی، متحدہ محاذ بھی قائم کیا۔ موصوف کی مخالفت بعض ادیبوں کی شہرت کا وسیلہ بنی۔ مگر کلیم الدین احمد اس حوصلہ شکن اور صبر آزما دور میں ٹس سے مس نہ ہوئے، وہ اپنی جگہ قائم و دائم رہے۔ دراصل انھوں نے لفظ نیم وحشی کا استعمال عمرانیات (Sociology) کی اصطلاح میں کیا تھا جس کا نعم البدل ہندی لفظ अर्द्धसभ्य ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ غزل کو اُردو کی آبرو گردانتے والا طبقہ سوچے سمجھے بغیر ان کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ جب کہ حقیقت حال یہ ہے کہ غزل کو اردو شاعری کی آبرو گردا ننا جتنا مضحکہ خیز ہے اتنا نیم وحشی صنفِ سخن قرار دینا نہیں۔ اُردو غزل کے قدیم سرمایہ میں جو تہذیب ہمیں ملتی ہے کیا اسے شرافت کا اعلیٰ نمونہ قرار د

جا سکتا ہے۔ سستی شہرت کے لیے جا و بیجا جوڑ توڑ کرنا اور بات ہے اور کسی سائنٹیفک تجزیے کے بغیر کوئی نظریہ وضع کرنا اور بات ہے۔

تقریباً یہی برتاؤ کلیم الدین احمد کے ساتھ ہوا۔ غزل پرستوں نے ان کی جا و بے جا مخالفت کر کے انھیں دنیائے تنقید کا بے تاج بادشاہ بنا دیا۔ غیر جانبداری اچھی اور سنجیدہ تنقید کی بنیادی شرط ہے۔ کیونکہ تنقید نہ تو تحسین ہے اور نہ ہی تنقیص بلکہ تنقید نام ہے افہام و تفہیم کا۔

انفرادیت

کلیم الدین احمد شاعر و ادیب کی انفرادیت پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند مصنفین پر تبصرہ کرتے ہوئے "اردو تنقید پر ایک نظر" میں لکھا ہے:۔

"سماجی حالات سے ادب پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ آرٹ کا وجود فن کار کی کاوشوں سے ہوتا ہے۔ سماج کی کاوشوں سے نہیں ہوتا یہ ایسی روشن حقیقت ہے جس سے کوئی سمجھدار آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ مارکسی نقاد اس روشن حقیقت پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں وہ ادب و فن کی تخلیق میں فن کاروں کی انفرادیت کو کم سے کم اہمیت دیتے ہیں۔" ۳۳

کلیم الدین احمد کے نزدیک اچھے شاعر کے لیے فطری ودیعت، نیک نیت تکنک اور ناقدانہ سوجھ بوجھ لازمی ہے۔ وہ فن کی اہمیت پر زور دیتے ہیں چنانچہ قدیم مغربی تنقید میں افلاطون کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعری القا نہیں، الہام نہیں، جنون نہیں، شاعری پر کسی دیوی کا سایہ نہیں ہوتا۔ وہ مخبر غیب یا پیغمبر کی طرح صرف خدا کی زبان نہیں"
یہاں آرٹ یعنی فن کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے

صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ فطرت۔ فطرت کے بجائے القا کہیے، جنون کہیے، دیوی کا سایہ کہیے۔ فطرت بغیر آرٹ کے کوئی اچھا کارنامہ پیش نہیں کر سکتی اور پھر آرٹ کے حدود کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ بغیر فطرت کے آرٹ کوئی شاہکار پیش نہیں کر سکتا یعنی جب تک شعری صلاحیت ودیعت نہ کی گئی ہو، کوئی شاعر محض فن کے زور سے شاہکار پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن بات یہیں تک نہیں رہتی، کامیاب شاعری کے لیے اور بھی چیزیں ضروری ہیں، فن سے عشق ہونا، مشق کی عادت ہو، ایک خوش بخت موقع یا دوسرے لفظوں میں کہیے کہ لمحۂ وجدان بھی ہو۔ جب تک یہ ساری چیزیں یکجا نہ ہوں، کامیابی ممکن نہیں۔ فطری ودیعت، نیک نیت (خلوص) مشقت، طریق کار (تکنیک) ہوش مندی (ناقدانہ سوجھ بوجھ) یہ ساری چیزیں اچھے شاعروں کے لیے لازمی ہیں۔" ۳۴

وحدتِ عمل

کلیم الدین احمد نہ صرف ڈرامہ بلکہ نظم، افسانہ اور ناول کے لیے بھی وحدت عمل یا ایک خاص قسم کی ترتیب کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"یہ بات یونانی ٹریجڈیز پر منطبق ہو تو ہو بہت ساری ٹریجڈیز پر منطبق نہیں ہوتی۔ رہیں وحدتیں تو وحدت عمل کی اہمیت ظاہر ہے۔ اس نے اس حقیقت کو پالیا کہ عمل کے اجزا اس طرح باہم مربوط ہوں کہ اگر ان میں ایک کی بھی ترتیب بدل دی جائے یا اسے خارج کر دیا جائے تو پورا عمل

تباہ ہوجائے یا بالکل بدل جائے لیکن یہ تسلسل یہ ربط نظروں کے لیے بھی ضروری ہے، افسانوں کے لیے بھی اور ناولوں کے لیے بھی۔" [۵۵]

تصورِ ادب

حکمائے ادب نے جو ادب کے نظریات پیش کیے ہیں ان میں دو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایک طبقہ کا کہنا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ LITERATURE IS THE MIRROR OF SOCIETY۔ اور دوسرے کا کہنا ہے کہ ادب تنقیدِ حیات ہے:۔ LITERATURE IS THE CRITICISM OF SOCIETY کلیم الدین احمد ان دونوں نظریات سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ ادب کو سماج اور سماجی تعلقات کی مسلسل تلاش، جذبات و احساسات کی پُرکیف لطافت تحت الشعور اور لاشعور کے تاریک گوشوں کو اجاگر کرنے کا نام دیتے ہیں۔ وہ ادب کا تصور ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"ادب نہ تو نقل ہے نہ تنقید، اور نہ EXPRESSION۔ یہ تلاش ہے، مسلسل تلاش ہے سماج اور سماجی تعلقات کی، جذبات و احساسات کی پرکیف تحت الشعور اور لاشعور کے تاریک، پُراسرار اور بھول بھلیاں جیسے نہاں خانوں کی اور دشتِ امکاں اور بساطِ لامکاں کی۔" [۵۶]

اُردو زبان اور فنِ داستان گوئی میں کلیم الدین احمد نے اپنے ادبی تصورات کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے

"ادب زندگی کی عکاسی کا دوسرا نام نہیں — آرٹسٹ نقال نہیں، وہ زندگی کی نقل نہیں اتارتا۔ اس کی حساس طبیعت، باریک بیں آنکھیں جب اپنے گردو پیش دیکھتی ہیں تو اسے ایک قسم کی بے اطمینانی ہوتی ہے۔ ہر طرف اسے بے ترتیبی، بدنظمی، ناموزونیت، بدصورتی، تنگی، فشار، عدم تکمیل کی مثالیں نظر آتی ہیں اور وہ ان نقائص کو رفع کرنا چاہتا ہے۔ وہ بے ترتیبی، بدنظمی، ناموزونیت کے بدلے بہتر ترتیب، بہتر نظم، تناسب و موزونیت کے نمونے پیش کرتا ہے۔ وہ بدصورتی، عدم تکمیل سے متعفن ہوکر ایک حسین اور مکمل دنیا کی تکمیل کرتا ہے۔ وہ تنگی اور فشار کو وسعت اور آزادی سے بدل دیتا ہے۔" [۵۷]

کلیم الدین احمد تا حیات ادب کی مقصدیت پر زور دیتے رہے ہیں، وہ ادب کی قوتوں سے بخوبی واقف ہیں اسی لیے انھوں نے ہمیشہ ادبی قوتوں کا استعمال اچھے مصرف میں لینے کی تلقین کی۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مختصر افسانوں پر بھی ابھی تک کوئی کتاب اچھی نہیں لکھی گئی ہے، ایک ایسی کتاب کی فوری ضرورت ہے جو اردو افسانوں کا انصاف کے ساتھ لیکن سخت جائزہ لے۔ ان افسانوں کی ناموزوں اور مہمل زیادتی نے طوفانِ نوح کی صورت اختیار کرلی ہے۔ سلامتی کی صورت ایک تو یہ ہے کہ ہم کوئی کشتیِ نوح بنا کر اس میں پناہ گزیں ہوجائیں، اور اس سیلاب کو گزر جانے دیں۔ دوسری زیادہ اچھی بات تو یہ ہے کہ اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کریں اور اسے روک کر اس کی طاقت سے کچھ اچھا مصرف لیا جائے۔ یہ افسانے نہایت مضر ہیں، پڑھنے والوں کا مذاق ہمیشہ کے لیے خراب ہوجاتا ہے ان کا دل کسی مفید اور قیمتی ادبی کارنامے میں نہیں لگتا۔ وہ ان مہمل افسانوں کو حاصلِ ادب سمجھنے لگتے ہیں، اسلیے ایسی تنقید کی فوری ضرورت ہے جو ان مہمل افسانوں کی "مہملیت" کو روشن کرے اور جو پڑھنے والوں کے بگڑے ہوئے مذاق کو سدھا لے۔" [۵۸]

کلیم الدین احمد نے اپنی نگارشات میں اُردو نقادوں کے ساتھ ساتھ مغربی نقادوں کی تنقید پر بھی کاری ضرب لگائی ہے، ان کی کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ارسطو پر تنقید کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:۔

"اس سے ارسطو کی اصل کمزوری واضح ہوجاتی ہے اور وہ کمزوری ایسی بنیادی ہے کہ اس کی وجہ سے صحیح معنی میں نقاد نہیں کہا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے نوٹ تجزیاتی ہیں لیکن اس میں اور تجزیاتی تنقید میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ وہ ایک ناظر ہے ایک مفکر ہے جو درجہ بندی کرکے خیالات کو آراستہ کرتا ہے اسے مختلف نامیاتی رشتوں سے کوئی واسطہ نہیں البتہ جہاں تک ان کا تعلق پلاٹ سے ہو۔ لیکن ارسطو کو یہ بات ہمیشہ خیال میں رکھنا چاہئے تھی کہ جس چیز کا وہ تجزیہ کررہا ہے وہ شعری ڈراما ہے اور شعریت کو ڈرامہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اگر ہمیں قوت حاصل ہے تو ہمیں شعری ڈرامہ پر قلم اٹھانا چاہئے ورنہ نہیں......... جس نقاد کو شعری زبان کی اس کاوش سے دلچسپی نہیں جو پیکر اور علامت تراشی کے گہرے اور با اثر استعمال سے دنیائے معنی پیدا کردیتی ہے اسے نقاد کیسے کہا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو میں تجزیاتی تنقید نہیں ملتی"۔ [9]

کلیم الدین احمد کی تنقید سے اختلاف ممکن ہے مگر اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُردو کا کوئی بھی باشعور اور انصاف پسند ناقد کلیم الدین احمد کی صلاحیت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُردو تنقید سے متعلق کوئی بھی تصنیف موصوف کے حوالے کے بغیر نامکمل اور تشنہ متصور ہوگی۔!

حواشی:

۱۔ اُردو شاعری پر ایک نظر۔ از کلیم الدین احمد
۲۔ " " " " "
۳۔ اردو تنقید پر ایک نظر۔ از کلیم الدین احمد
۴۔ قدیم مغربی تنقید۔ از کلیم الدین احمد
۵۔ قدیم ادبی تنقید۔ از ڈاکٹر وہاب اشرفی
۶۔ " " " "
۷۔ اُردو زبان اور فن داستان گوئی۔ از کلیم الدین احمد
۸۔ " " " " "
۹۔ قدیم مغربی تنقید۔ از کلیم الدین احمد

غزل

جاوید الزام
قاضی پور خورد
گورکھپور

تو مرے دل کا ارمان ہے زندگی
چند لمحوں کی مہمان ہے زندگی

موت کا کوئی دروازہ ہوتا نہیں
میں نے مانا نگہبان ہے زندگی

تیرے چلتے زمانے میں رُسوا ہوئے
یہ بھی اک تیرا احسان ہے زندگی

بن کے آنسو وہ آنکھوں سے گر جائیگا
دیکھ دل میں جو ارمان ہے زندگی

اور کیا آج میں تجھ کو الزام دوں
پاس آ تجھ پہ قربان ہے زندگی

اسد مرزاپوری
مالوی نگر، مرزاپور

ستاروں کی برات

نغمہ پیرائے سحر ہوگی تمنائے حیات
کٹتے جاتے ہیں یہ مڑ مڑ کے گزرتے لمحات
پستیاں مائل پرواز ہوئی جاتی ہیں
عزمِ تازہ سے لرزتا ہے فسونِ آفات
دستِ امروز کو دیتی ہے نئی اک مشعل
تا ملے تیرہ نصیبی کو شبِ غم سے نجات
پیرہن کرنوں کا لاؤ کہ اسے پہنائیں
خواب سے جاگ رہی ہے مری سوئی ہوئی رات
زندہ رہنا ہے تو بننا ہے جفاکش سب کو
ورنہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے جذبات
چہرہ لیلائے تمنا کا نکھارو یارو
زلفِ ہستی کے خم و پیچ سنوارو یارو
ہر بشر خوش ہے کہ عالم میں بہار آئی ہے
زیرِ داماں لیے نیرنگیِ بستانِ چمن
دشت وحشت کے بگولے نہ ادھر آئیں گے
گرد آلود نہ ہوگا کبھی رخسارِ وطن
وقت کے ہاتھوں نے دریاؤں کا رخ موڑ دیا
خاکِ پامال سے ابھرے گل ریحان و سمن
اہلِ گلشن کو نہیں خوفِ خزاں کا احساس
وہی کلیوں کا دہن ہے وہی پھولوں کا بدن
اب تو مزدور کے ہاتھوں میں ہے زرتار کلاہ
ختم کر کے گئے سب سلسلۂ دار و رسن
بیکراں جلوے ہیں دامن میں لیے ہیں نکات
اتری آکاش سے دھرتی پہ ستاروں کی برات

ظہیر غازی پوری
بی، ایس، آر، ٹی، کارپوریشن
ہزاری باغ (بہار)

پیغامِ عمل

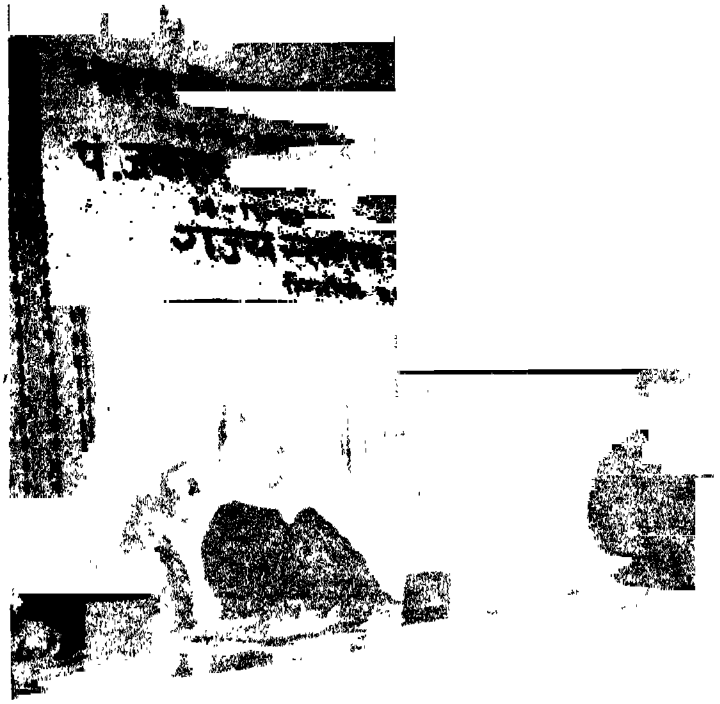
اے ہم عصرو! وقت کی آواز کو سمجھو
مغلوبِ سیاست کے ہر انداز کو سمجھو
کیوں آگ بھڑک اٹھتی ہے اس راز کو سمجھو
زنجیرِ جنوں توڑ دو، تاریخ بدل دو
پھن کاڑھے ہوئے سانپوں کے سر آج کچل دو

نہرو کا وطن ہے تو یہ گاندھی کی زمیں ہے
کچھ شک نہیں اس میں کہ یہ جنت سے حسیں ہے
اقبال کے ہر خواب کی تعبیر یہیں ہے
اٹھو اسے فردوس کی مانند بنا دو
ہر گوشے کو قندیلِ محبت سے سجا دو

عیسائی بھی، ہندو بھی، مسلماں بھی یہاں ہیں
انجیل کے، گیتا کے ثناخواں بھی یہاں ہیں
دیکھو تو سہی امن کے خواہاں بھی یہاں ہیں
اب فرقہ پرستی کو مٹانا ہے ضروری
بھارت کو تباہی سے بچانا ہے ضروری

تہذیب یہاں ایک ہے انسان یہاں ایک
ہے نام جدا، پھر بھی ہے بھگوان یہاں ایک
رگ وید یہاں ایک ہے قرآن یہاں ایک
تفریق کی لعنت سے زمانے کو بچا لو
اور ربط و محبت کے نئے پھول کھلا دو

گورنر اتر پردیش جناب عارف ۲۵ جولائی ۸۶ کو تلک ہال [illegible] میں آزادی ہند کی چالیس سالگرہ اور پنڈت جواہر لال نہرو صدی تقریبات سے متعلق ریاستی کمیٹی کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے تصویر میں وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ اور وزیر برائے اطلاعات شریمتی دیپا کول بھی نظر آرہی ہیں۔



وزیر اعلا اتر پردیش شری ویر بہادر سنگھ دہلی کے پالم ہوائی اڈے پر عازمینِ حج کو الوداع کہتے ہوئے۔





راعلاشری ویر بہادر سنگھ اور مرکزی وزیر مملکت برائے کپڑا شری رام نواس مردھا
جون ۱۹۸۷ء کو کیتھڈرل ہال لکھنؤ میں نیشنل ہینڈلوم کارپوریشن کی جانب سے منعقدہ
ئش دیکھتے ہوئے ۔



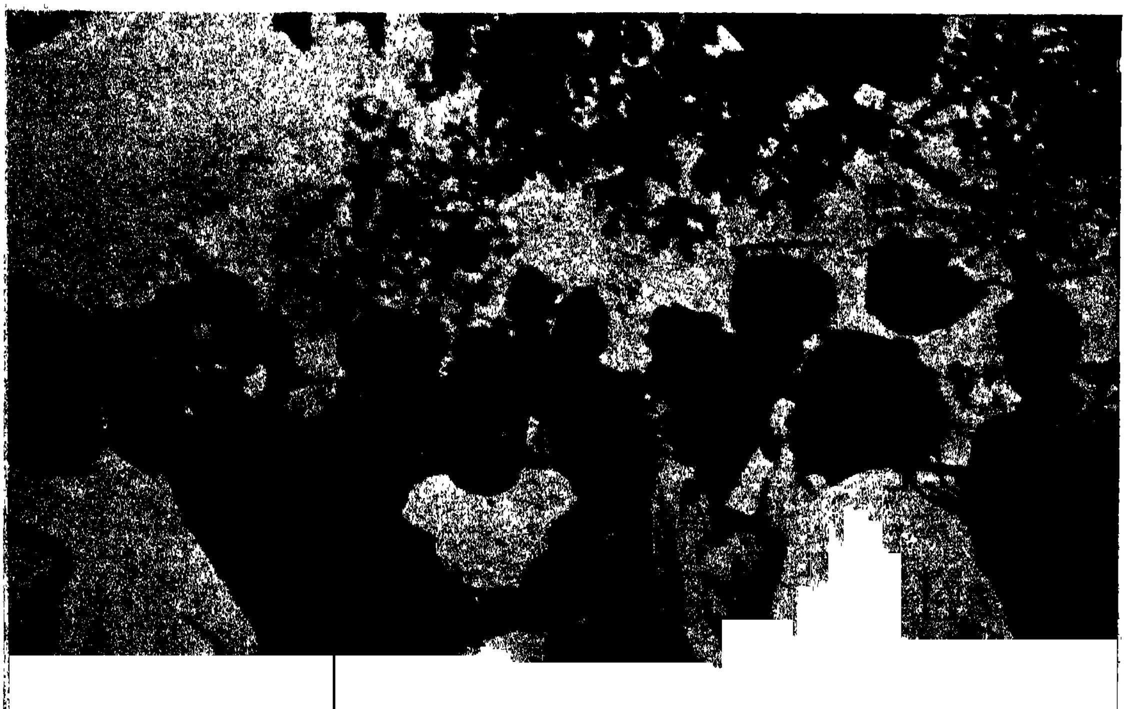
وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ عالمی یوم ماحولیات کے موقع پر
میں شجرکاری کرتے ہوئے ۔



وزیر ریاست
برائے اطلاعات
شریمتی دیپا کول
لٹریسی ہاؤس لکھنؤ
کی جانب سے شائع کردہ
ریدے کے ماحولیات نمبر
کی رسم اجرا
انجام دیتے ہوئے
←



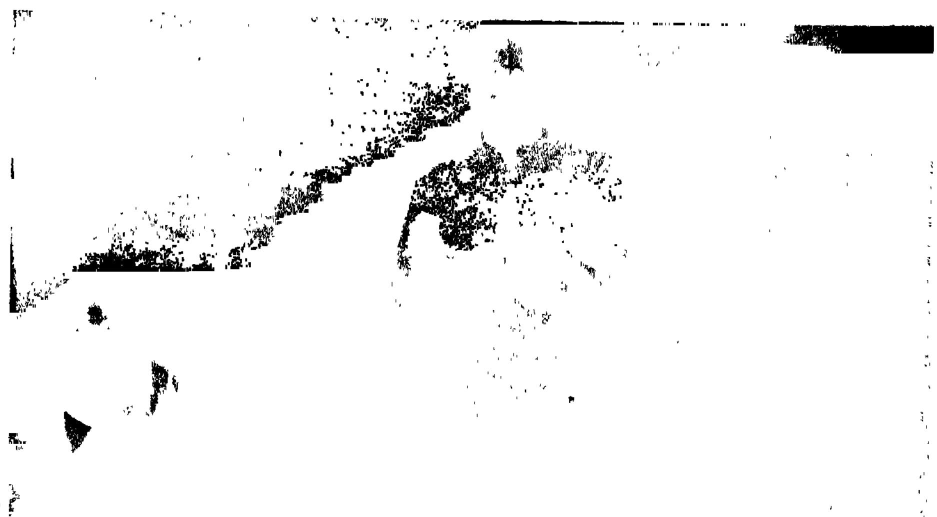
وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ ۵ر جولائی کو ضلع گورکھپور کے رام گڑھ تال پراجکٹ کا سنگ بنیاد ر
کی تقریب کے موقع پر منعقدہ جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے۔



وزیر اعلا اتر پردیش، شری ویر بہادر سنگھ ۱۳ر جون ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ زندہ عجائب گھر کے معائنہ کے دوران مختلف مقامات سے آئے ہوئے افراد سے گفتگو کر رہے ہیں۔



وزیر اعلیٰ شری ویر بہادر سنگھ
۸ر جون ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں
اتر پردیش سنگیت ناٹک اکیڈمی
کی جانب سے منعقدہ تقریب
میں فن کاروں کو انعامات
تقسیم کرتے ہوئے



وزیر تعلیم شری
سبط رضی ۱۶ر جون کو
سوچنا کیندر لکھنؤ میں
ماحولیات کے موضوع
پر ہندی شعری مجموعے
"امرتا" کی رسم اجرا
انجام دیتے ہوئے





وزیر ریاست برائے
اطلاعات سشریمتی
دیپا کول ۵ر جون کو
آئی۔ ٹی۔ آر۔ سی لکھنؤ
میں عالمی یوم ماحولیات
کے موقع پر منعقدہ
نمائش
دیکھتے ہوئے۔

ناوک حمزہ پوری
ڈاکخانہ:- شیر گھاٹی - ۸۲۴۲۱۱
ضلع گیا (بہار)

عروج زیدی

شخصیت اور فن

سنہ ۱۹۸۶ء کے اواخر میں حضرت عروج زیدی مرحوم (آہ! انھیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) نے اپنا تازہ شعری مجموعہ متاعِ فکر اس ہیچمدان کے پاس بھجوایا اور خواہش کی کہ اس پر یہ خاکسار اپنی رائے بھی ظاہر کرے۔ عروج صاحب ایک عرصے سے بیمار چل رہے تھے اور صاحب فراش تھے۔ بڑھتی ہوئی عمر اور امراض کے حملوں نے انھیں گویا "پیری و صد عیب" کی تصویر بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ عجیب اتفاق کہ مذکورہ شعری مجموعہ جس وقت میرے پاس آیا اُس وقت میں بھی بیمار تھا۔ مگر عروج صاحب سے تعلقات قلبی نے چین نہ لینے دیا اور اسی عالم میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے چاہا کہ جستہ جستہ کتاب کا مطالعہ کر کے تعمیل حکم کے لیے کچھ لکھ دوں۔ اس ارادے سے کتاب ہاتھ میں اٹھائی تو گویا کسی غیبی اشارے سے صفحہ ۱۲۵ کھل گیا اور اس شعر پر نظر جم گئی ؎

رفتہ رفتہ آرہا ہوں ایسی منزل کے قریب
دھوپ جائے گی نہ میرے پاس سایہ جائے گا

دل کی دھڑکن تہ و بالا ہو گئی، آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑی کا مرقع بن گئیں اور میں نے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ گھر والوں میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے سمجھا تکلیف بڑھ گئی ہے۔ بیماری نے خطرناک موڑ لے لیا ہے۔ "کیا ہوا؟" — "تکلیف بڑھ گئی ہے؟" "ڈاکٹر کو بلوا لوں؟" میں ان سوالات کا کیا جواب دیتا۔ ہچکیوں کے درمیان اہلیہ کو عروج صاحب کا شعر دکھایا۔ انھوں نے کتاب ہاتھ سے جھپٹ لی اور الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔ اللہ نہ کرے۔ یہ سب کیا سوچنے لگتے ہیں۔"

انسان بنیادی طور پر بڑا خود غرض ہوتا ہے۔ یوں میں یہ دعوا نہیں کروں گا کہ میں حضرت عروج کے لیے رو رہا تھا۔ خود اپنی بیماری نے اپنا انجام سامنے کر دیا ہو گا اور شعر کی بھرپور تاثیر نیز واقعیت کے سبب ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں عروج صاحب کے حالات سے واقف تھا۔ وہ ازراہ ذرہ نوازی اپنے امراض کی کیفیت سے مسلسل مجھے مطلع فرماتے رہتے تھے۔ یوں ہم دونوں کے حالات نے دل پر دو طرفہ حملہ کیا اور میں رو پڑا۔ دوسرے دن اپنی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے میں نے رائے زنی کے سلسلے میں عروج صاحب سے معذرت کر لی۔ بات آئی گئی ہو گئی اور پھر یوں ہوا عروج صاحب کی بیماری نے زور پکڑا۔ بات مقامی معالجین کے قابو سے باہر ہو گئی تو انھیں بغرض علاج دہلی لے جایا گیا۔ دہلی سے بھی ان کے خلف اکبر عزیزم عرفان زیدی صاحب سلمہٗ ان کے حالات سے مجھے مسلسل مطلع کرتے رہے۔ دہلی میں بھی جب حالات ایسے ہو گئے کہ لگا کہ مشیت کو کچھ اور ہی منظور ہے تو انھیں ۱۵ جنوری سنہ ۱۹۸۷ء میں رام پور واپس لایا گیا اور آخر کار تمام دوڑ دھوپ اور بہترین علاج و معالجہ کے باوجود فروری کے اولین ہفتے میں یہ منحوس خبر سننے کو ملی کہ اردو کا یہ قادر الکلام اور کامل الفن شاعر بتاریخ ۴ر فروری ۱۹۸۷ء رات دس بج کر پچیس منٹ پر ہمیں داغ مفارقت

دے گیا۔ انا للہ الخ ۔ اور ہم حضرت فانی کے شعر میں تھوڑی سی ترمیم کر کے رونے کو رہ گئے ؎

اٹھ گئے دنیائے فانی سے عروج
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

آہ! وہ عروج زیدی ہم سے جدا ہو گیا جس نے تقریباً ساٹھ برس گیسوئے شعر و ادب کی مشاطگی میں اس طرح گزارے کہ نہ کبھی کسی صلے کی تمنا کی نہ ستائش کی پروا۔ اپنے افکار گوہر بار میں مشرقی تہذیب کی قوس قزح کھلانے والا عروج ہم سے بچھڑ گیا۔

تجریدیت و لایعنیت کے اس دور پر آشوب میں "زبان کے حسن، برمحل محاورات کے حسن، تیور کے حسن، پیرایۂ اظہار کے حسن، ترسیل و ابلاغ کے حسن کا علم بردار عروج زیدی اب ہم میں نہ رہا۔

وہ عروج جو مبتذل، تہذیب سوز، مخرب اخلاق، غیر فطری رجحانات اور پست فکر شاعری سے دامن کش رہ کر ہمیشہ تعمیری صحت مند اور پاکیزہ ادب پیش کرتا رہا ہم سے چھن گیا۔

جو کبھی آتش نفس، شعلہ نوا تھا وہ عروج
اب مآل آثار ہو کر پیکر تصویر ہے

اب از سر نو حضرت عروج کی "متاع فکر" کی ورق گردانی کرتا ہوں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غافل نہیں تھے ورنہ انھوں نے تو اپنی گرتی ہوئی صحت، اضمحلال قویٰ، بڑھتی ہوئی عمر اور یورش عوارض کے پیش نظر جا بجا گویا پیشین گوئی کر دی تھی۔ حضرت عروج مومن تھے اور مومن موت کی آرزو کبھی نہیں کرتا لیکن موت کے استقبال سے خائف بھی نہیں رہتا۔ کل من علیہا فان نیز کل نفس ذائقۃ الموت کے مصداق وہ جسد فانی کے انجام سے ناواقف نہیں رہتا۔ عروج مرحوم کے اس قبیل کے متعدد اشعار اس وقت ایک عجیب کیفیت کے حامل ہو گئے ہیں۔ عروج تو رخصت ہوئے اب ان کے مطالعے سے اپنا انجام آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور ایمان تازہ ہوتا ہے۔ چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

مستقبلِ حیات کو خطرہ ہے لے عروج — ہر گام پر ہیں ایسے اشارات ان دنوں
عروج وا ہے یہی زوالِ عمر کے بعد — کبھی یہاں سے چلا اور کبھی وہاں پہنچا

ہائے ڈھلتی عمر کا یہ مرحلہ — اختلاف جسم و جاں ہے آج کل
یہ حالتِ اعصاب عروج آپ سمجھئے — جیسے کسی گرتی ہوئی دیوار کا عالم

کہہ گیا ہے کس پتے کی بات دانائے راز
زندگی کو خواب کہیے موت کو تعبیر خواب

تا بجے جاگے گا کوئی بزم ہست و بود میں
زیست کے رنگیں ورق پر نقش ہے تحریر خواب

افسوس یہ روشن ضمیر، پاکیزہ کردار، نیک نفس اور مخلص انسان نیز شعر و ادب کا بے لوث خادم اب وہاں چلا گیا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔

سید السادات، رفیع الدرجات سید فیاض علی عروج زیدی ایک ذی شان و پاک نہاد سید گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد سید نوشہ علی ایک شریف النفس و پاکیزہ کردار بزرگ تھے۔ علم و عمل ہر دو لحاظ سے یہ خانوادہ معروف و ممتاز رہا ہے۔ سید فیاض علی عروج زیدی نے اسی جلیل القدر زندہ ضمیر گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کی تعلیمی سندوں میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۱۴ء درج ہے لیکن خود حضرت عروج نے اس کی متواتر تردید کی ہے اور اپنی اصل تاریخ پیدائش ۲۵ ستمبر ۱۹۱۲ء بتائی ہے[1]

حضرت عروج شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے جہاں ان کا خاندان ضرورتاً عارضی طور پر قیام پذیر تھا۔ آبائی وطن آپ کا بدایوں ہے۔ بدایوں کی اپنی ایک شاندار تاریخ ہے۔ یہ وہی بدایوں ہے جس کے بارے میں حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے ؎

بجائی سرمہ در دیدہ کشم خاک بداؤں را

یہ وہی بدایوں ہے جسے حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے مولد و منشا ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ وہی بدایوں ہے جہاں بقول مولانا ماہر القادری مرحوم "شعر و ادب بنتے کا تے ملتے ہیں"

---

[1] زندہ مکتوب کا قلیہ ماخوذ از شمع فروزاں ص ۱۳

وطن سے ہجرت انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ عروج صاحب کو آلِ رسولؐ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس سنت کی پیروی نہ کرتے اس لیے بعض حالات سے مجبور ہو کر بدایوں کی سکونت ترک کر کے انھوں نے رام پور کو مستقر بنایا اور تا دمِ مرگ مستقلاً قیام کر کے اسے وطنِ ثانی کی حیثیت دے دی۔ حالاں کہ اصل وطن کی محبت اُن کے دل میں اکثر چٹکیاں لیتی رہتی تھی ؎

جیسے چمن سے نکہت جیسے صدف سے موتی
ویسے جدا ہوا ہوں میں جنت وطن سے

تاہم مجھے کہنے دیجیے کہ وطنِ ثانی کی حیثیت سے رام پور کا انتخاب کر کے انھوں نے اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا۔ رام پور ایک مدت مدید تک علم و ادب کا نہ صرف یہ کہ گہوارہ رہا ہے بلکہ شعراء و ادباء کی سرپرستی کا بھی اسے فخر حاصل ہے اور یوں رام پور بجا طور پر "دارالسرور" کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے۔

حضرت عروج کی ابتدائی تعلیم مشرقی انداز و نہج پر ہوئی۔ علوم متداولہ اردو، فارسی اور عربی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ نیز اپنی کاوش سے انھوں نے انگریزی میں بھی خاصی دستگاہ بہم پہنچائی اور ہندی سے بھی شناسائی حاصل کی۔ یوں بیک وقت پانچ زبانوں پر انھیں ماہرانہ دسترس حاصل تھی۔

شعر و شاعری کے سلسلے میں تلمذ کے تعلق سے خود حضرت عروج نے اپنی فطری خاکساری و انکسار کی وجہ سے مَنْ عَلَّمَنِی حَرْفًا فَهُوَ مَوْلَائِی کہا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اکتسابِ فیض کے لیے انھیں جہاں سے جو کچھ مل گیا اسے موتی سمجھ کر چن لینے میں انھوں نے کسی دریغ سے کام نہ لیا۔ درج ذیل رباعی اس معاملے میں صورتِ حال کی تصویر کشی کرتی ہے ؎

عزّالی سے کوئی ہوا یوں سائل   حضرت نے کیے علوم کیوں کر حاصل
بولے کہ کبھی میں نے دمِ استفسار   پردہ نہ حیا کا رخ پہ رکھا حائل

تاہم مجھے کہنے دیجیے کہ حضرت عروج ایک ہی وہبی شاعر تھے۔ فطرت نے طبعِ موزوں اور ذوقِ صالح کی دولت لازوال آپ کو عطا کی تھی یوں وہ کسی رسمی شاگردی کے محتاج نہ تھے۔ تاہم عروج نے جو زمانہ پایا اس میں شاگردی و استادی کی رسم ایک طرح سے لازمی تصور کی جاتی تھی اور اس طرح عروج نے بھی اکتسابِ فن کی تکمیل کے لیے اپنے زمانے کے استاذ الاساتذہ حضرت احسن مارہروی کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ حضرت احسن کا شمار حضرت داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا تھا اور داغ کی زباندانی کسی پر مخفی نہیں ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اور جن حضرات نے کلامِ عروج کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ اس امر میں راقم الحروف سے اتفاق کریں گے کہ زبان کی صحت، شستگی بیان کی صفائی و پاکیزگی کے معاملے میں سلسلۂ داغ کی روایت کی حضرت عروج نے نہ صرف یہ کہ پابندی کی ہے بلکہ اسے آگے بڑھا کر نئی منزلوں سے آشنائی بخشی ہے ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

حضرت عروج نے اپنے شعری و ادبی سفر کا آغاز ۱۹۲۹ء میں کیا اور تا دمِ آخر کارزارِ ادب میں مجاہدانہ ڈٹے رہے۔ یوں کچھ کم ساٹھ برس کی طویل مدت تک انھوں نے دامنِ ادب کو جواہرِ فکر و فن سے مالا مال کیا ہے۔ عروج ایک فعال نیز پُر گو شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قابلِ قدر اور بڑا ذخیرۂ نظم و نثر انھوں نے اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔ غیر مطبوعہ ذخیرۂ کلام سے قطع نظر ان کی وہ تصنیفات جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں ان کی تفصیلات یہ ہیں:

(۱) عروج کے سَو شعر: نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ حضرت عروج کے ایک سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ عروج صاحب نے مولانا ماہر القادری کی تحریک پر ۱۹۴۱ء میں مرتب کیا تھا اور اس کی طباعت ۱۹۴۲ء میں روبہ عمل آئی۔ یہ انتخاب کلام نہ صرف یہ کہ اس عہد کے نامور اساتذہ اور ناقدینِ فن کی نگاہ میں پسندیدہ ٹھہرا بلکہ اس نے عروج کی شاعرانہ عظمت کا سکہ بھی جما دیا۔ چنانچہ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق لسان القوم مولانا صفی لکھنوی کی رائے ہدیۂ ناظرین ہے:

• کلام میں سادگی و پرکاری، ہر شعر معیاری، سلیم المذاقی کا آئینہ، واردات قلبی کا خزینہ، اکثر از دل خیزد بردل ریزد، ادب اردو کو ایسے ہی دل گداختہ شعرا کی ضرورت

(۲) دس برس کے بعد ۱۹۶۱ء میں "جھلکیاں" کے نام سے عروج صاحب کا دوسرا مجموعہ کلام شائع ہوا اور مشاہیر سے خراج تحسین حاصل کی۔ بقول ابوالفصاحت پنڈت لبھورام جوش ملسیانی یہ مجموعہ بھی "الفاظ کے دروبست کی حیرت انگیز خوبی" اور "وجدانی کیفیت" کا حامل ہے۔

(۳) ۱۹۶۷ء میں عروج صاحب کا تیسرا مجموعۂ کلام "دل لخت لخت" کے عنوان سے منظر عام پر آیا جس کے تعلق سے پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین مرحوم نے یہ رائے ظاہر کی تھی۔ "آپ کے تخیل میں تازگی و لطافت، اور کلام میں زبان و بیان۔ فکر و فن اور جذبات کی توانائی کا عروج نظر آتا ہے۔"

(۴) حضرت عروج کے ۱۰۱ قطعات کا شاندار مجموعہ ۱۹۷۶ء میں بنام "شمع فروزاں" شائع ہوا جو بقول پروفیسر سید احتشام حسین: "زوال پذیر قدروں کے درمیان بکھری ہوئی سچائی تلاش کرنے والوں کے لیے ایک فکر انگیز کارنامہ اور چونکا دینے والا اضافہ ہے۔"

(۵) صرف دو سال کے بعد ۱۹۷۸ء میں عروج کی غزلوں کا انتخاب بنام "سفینۂ غزل" شائع ہوا جو پروفیسر رشید حسن خاں کے گراں قدر مقدمہ سے بھی آراستہ ہے۔ جس میں بقول ڈاکٹر احمد سجاد روایت و جدت کے حسین امتزاج نے عروج کی شاعری کو ایک نیا مگر شگفتہ اور سنجیدہ موڑ دے دیا ہے۔"

(۶) "متاع فکر" کے نام سے ۱۹۸۵ء میں عروج کی غزلوں کا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ یہ اُن کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری مجموعہ ہے اور بغیر کسی "صاحب نظر" کی تقریظ و تعارف کے شائع ہوا ہے۔ حق یہ ہے کہ عروج کو بہت قبل یہ مقام حاصل ہو چکا تھا جب ان کا نام و کلام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ ہر فنکار اپنے پارۂ فن کا سب سے اچھا شارح خود ہوتا ہے۔ یوں اس مجموعے کے تعلق سے خود عروج کی رائے ملاحظہ فرمائیے:۔

"میں اپنی نگارشات قلم کو بڑی حد تک تجدید روایت قرار دیتا ہوں۔ چونکہ مبتذل، تہذیب سوز، مخرب اخلاق غیر فطری رجحانات، اور پستیٔ فکر والی شاعری کے زہریلے اثرات مجھ پر آئینہ ہیں۔ اس لیے میں پاکیزہ معیار ذوق کے نمونے پیش کرنے کے حق میں ہوں[1]۔"

(۷) مذکورہ بالا شعری تصانیف کے علاوہ عروج کے تنقیدی مقالات کا صرف ایک مجموعہ بنام "زندہ کتبے" ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ یہ بقول عروج اُن کے بچھے معاصرین شاد عارفی، جگر مرادآبادی، نوح ناروی، راز یزدانی، شفیق جون پوری اور ماہر القادری کے خاکوں پر مشتمل ہے لیکن حق یہ ہے کہ مذکورہ بالا مشاہیر کی شخصیت و فن کا کوئی گوشہ موصوف نے تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور تنقید کلام کے سلسلے میں بھی اپنی بصارت و بصیرت نیز ژرف نگاہی کا وہ ثبوت دیا ہے کہ باید و شاید یہ مجموعہ اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اس سے عروج کی باکمال نثر نگاری بھی آئینہ ہو گئی ہے۔

ان مطبوعہ تصانیف کے علاوہ مرحوم کے کئی شعری مجموعے اور منتشر مضامین (مطبوعہ و غیر مطبوعہ) شیرازہ بندی نیز طباعت و اشاعت کے لیے عرفان زیدی صاحب کی طرف آس لگائے ہیں۔

جسمانی طور پر عروج اب ہماری نظروں سے اوجھل ہیں لیکن جو علمی و ادبی اثاثہ انھوں نے اپنی یادگار چھوڑا ہے اس کی بدولت انھیں ابدیت حاصل ہے اور ان کا نام اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اردو زبان زندہ ہے۔ مرحوم نے کیا بصیرت افروز شعر کہا ہے ؎

قلم کو جس نے زندگی دی ہو — موت اس شخص کو نہیں آتی

دنیائے شعر و ادب میں باکمالوں کی کمی نہیں۔ ایسے باہنر فنکار جن کا کلام زبان کی سلاستگی، بیان کی پاکیزگی کا آئینہ ہو لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج کے اس دور پر آشوب میں صحت مند ادب کے علم بردار ایسے شعراء جن کا کلام "بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی" کے مصداق ہو کم ہی نظر آئیں گے۔ عروج زیدی مرحوم کا شمار ایسے ہی خوش نصیب باکمال استاد شاعروں میں ہو گا جنھیں فکر کی صحت لہجے کی انفرادیت، اسلوب کی شگفتگی پیرایۂ اظہار کی ندرت نیز صالح روایات کی تجدیدیت کے سبب حلقۂ ارباب فکر و نظر میں قبول عام کا درجہ حاصل تھا۔

---

۱ متاع فکر ص۸

عروج صاحب نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنی استادانہ فنکاری کا لوہا منوایا ہے لیکن بلحاظ کیفیت وکمیت حق یہ ہے کہ عروج غزل کے شاعر ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں "اس حقیقت کا اعتراف بے محل نہ ہوگا کہ میں نے اپنے فن کا مرکز بالخصوص غزل کو بنایا ہے"۔

یہ عروج کے عقائد کی پاکیزگی اور فکری طہارت ہی کا کرشمہ ہے کہ انھوں نے اپنے تقریباً تمام مجموعۂ کلام کا آغاز حمد ونعت سے کیا ہے آج کے دور میں معاشرے گم کردہ راہی کا بڑا اور سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ آج کا انسان اس قدر مادہ پرست ہو گیا ہے کہ کسی ماورائے فہم "علیٰ کل شیٔ قدیر" ہستی پر اس کا ایمان ہی نہیں رہا۔ بفضلِ خدا عروج راسخ العقیدہ مومن ہیں اور اس کا برملا اظہار واقرار بھی کرتے ہیں ؎

کون جانے گا کسے حاجت روا کہتا ہوں میں
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے برملا کہتا ہوں میں
کیا مرا ادراک ، کیا میرے تصور کی بساط
ماورائے فہم ہے جس کو خدا کہتا ہوں میں

نہ صرف یہ کہ دوسری اصناف سخن میں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری میں بھی اس نوعیت کے اشعار در آئے ہیں جن سے اُن کے عقیدے کی طہارت ہویدا ہے ؎

کیوں نا خدا کو قادرِ طوفاں سمجھ لیا
یہ کیا کرے گا ناؤ اگر ڈولنے لگے

گناہگار ہوں لیکن میں نا امید نہیں
یقینِ رحمتِ پروردگار شاہد ہے

عروج اس محسن انسانیتؐ کو بھی خراج عقیدت ادا کرنا نہیں بھولتے جس کی بدولت ذاتِ خداوندی سے ان کا رشتہ استوار ہوا ہے۔ دیکھیے کتنی والہانہ عقیدت کے مظہر یہ اشعار ہیں ؎

خدا کا عشق بھی ہے اور عشق شاہِ والا بھی
مئے دو آتشہ ہے میرے دل کے آبگینے میں
چلا ہوں پڑھ کے بسم اللہ مجریہا مرسٰہا تلاطم کو بھی رکھ سکتا ہوں میں اپنے سفینے میں

عروج سیدزادے ہیں۔ حسینؓ ابن علیؓ سے نسبی نسبت و قرابت رکھتے ہیں حق و باطل کے معرکۂ خوں ریز میں حسینؓ نے جو استقامت دکھائی ایثار و قربانی کی جو مثال قائم کی وہ رہتی دنیا تک اہل بصیرت کے لیے نشان راہ کا کام کرے گی۔ حضرت حسینؓ عروج صاحب کا آئیڈیل بھی ہیں اور ان کی ذات سے ان کے دل کو والہانہ عقیدت بھی ہے ؎

دو جہاں کے سارے سجدے بھی نہیں اس کا جواب
زیرِ خنجر تھا جو سجدہ کربلا کی خاک پر

تشنگی تیغوں کے سائے دھوپ غربت اے عروج
آپ نے سجدہ کہاں دیکھا ہے سجدہ دیکھیے

عروج انسان کی عظمت سے واقف ہیں ؎

دیکھیے اک پتلۂ خاکی کا منصب دیکھیے
نائب یزداں پھر اس پر سربراہ کائنات

میں سمٹ کر پیکرِ خاکی بنا ہوں اے عروج
اور اگر پھیلوں تو میری انتہا کوئی نہیں

عروج اپنی شاندار تاریخ ماضی کا ادراک بھی رکھتے ہیں ؎

ان کی تقدیر میں ہے آج سرابوں کا سفر
ہائے وہ لوگ جو تھے پیاس بجھانے والے

جوئے شیراب بھی مچلتی ہے چٹانوں میں مگر
غالباً سو گئے سب تیشہ اٹھانے والے

وہ عصرِ حاضر کے زوال پر دل گرفتہ بھی ہیں اور اس پستی کے اسباب بھی ان کی نظر میں ہیں ؎

جادہ پیمائی حدیث کربلا بن جائے گی
رہزنوں کی بھیڑ ہے منزل نما کوئی نہیں

خود شناسی سے تو محروم ہیں یکسر محروم
کیا ہوا لوگ اگر ماہ و قمر سے گذرے

ارتقائے عصر حاضر خواب بے تعبیر ہے
اک قطرے میں مگر دریا نما کوئی نہیں

ہمیں نے چھوڑ دی ہے بس انسان کی پابندی
جو ہم چاہیں تو دردِ عشرتِ رفتہ پلٹ آئے

قومی اور بین الاقوامی سطح پر پھیلے ہوئے انتشار، فرقہ واریت، علاقہ پرستی، رنگی و نسلی عصبیت کا مشاہدہ بھی عروج نے کیا ہے ؎

آتشِ نفرت سے دنیا اب ہے ایسے موڑ پر
دیدہ ور کو یہ جہنم کے سوا کچھ بھی نہیں

ہم نشینی کا یہ رخ بھی کتنا درس آموز ہے
خار و گل یکجا ہیں لیکن کیف قربت ناشناس

چمن پرستو یہ کیسی چمن پرستی ہے
کہ صرف گل ہی قبول نظر ہیں خار نہیں

جو ناگوار نہ گذرے تو ایک بات کہوں
وفا پسند سہی تم وفا شعار نہیں

کہاں گئے وہ نشیمن جو شاخ شاخ پہ تھے
یہ اک سوال ہے تحقیق باغباں کے لیے

چمن میں اہل چمن ہم سے کیوں گریزاں ہیں
اگر بہار نہیں ہیں تو ہم خزاں بھی نہیں

عروج صرف تشخیص مرض نہیں کرتے۔ علاج بھی تجویز فرماتے ہیں ؎

وفا شعار بنو اے غرض کے دیوانو!
غرض غرض ہے غرض دوستی نہیں ہوتی

بے حقیقت تھا ہر اک قطرہ عروج
ربط باہم سے سمندر بن گیا

یہ کائنات تو فردوس گم شدہ ہوتی
مگر مذاقِ محبت جہاں میں عام نہیں

سامان نشاطِ دل تصویر وطن ہوگی
جس روز رواداری دنیا کا چلن ہوگی

یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئیے کہ عروج نے سراپا مقصدی شاعری کی ہے حالانکہ ایک قطعہ میں انھوں نے اپنا نظریہ شاعری یوں واضح کیا ہے ؎

زلف و رخسار کے ثنا خوانو! اس تعارف سے مدعا کیا ہے؟
درس آموز جب کلام نہیں شعر گوئی سے فائدہ کیا ہے؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عروج "مکتب داغ" کے تربیت یافتہ ہیں اور داغ خالص غزل کے شاعر تھے۔ عروج اپنی افتاد مزاج کے لحاظ سے داغ اسکول سے میل نہیں کھاتے۔ داغ کے کلام میں جو جسمانی لذت پرستی کے نمونے جابجا آپ کو ملیں گے۔ کلام عروج میں ان کا شائبہ تک نہیں۔ البتہ اسکولِ داغ سے زبان و بیان کی شستگی، صحت و صفائی کا جوہر انھوں نے لیا ہے انھوں نے اپنی زندگی میں ہر نوعیت کا ہنگامہ جھیلا ہے۔ زیست کے ہر سرد وگرم کا بہ نفس نفیس تجربہ حاصل کیا ہے اور ان تجربات کو ایسے پیرایۂ اظہار میں ادا کیا ہے کہ زبان کی صحت اور بیان کی پاکیزگی کا حق بھی ادا ہو گیا ہے۔ انھوں نے کرب ذات کا دائرہ وسیع تر کر دیا ہے۔ جہاں ان کا اپنا غم بھی کائنات کا غم ہو گیا ہے ؎

اپنی ویرانی کا ماتم کیا کروں، کس سے کروں؟
جب مری حدِ نظر تک سیکڑوں بے گھر ہیں لوگ

ہج ذیل اشعار میں عروج کا رنگ تغزل ملاحظہ فرمائیے۔ ان میں زبان و
ین کا حسن بھی ہے روزمرہ اور محاورے کی خوبی بھی ہے۔ تعبیراتی جدت
ازی بھی ہے، پرکشش انداز بیان بھی ہے۔ احساس کی خلش بھی ہے،
شاعر کا متنوع عکس بھی ہے اور سب سے بڑھ کر عروج کے لہجے کی اپنی انفرادی
ہستہ روی جو تیر نیم کش بن کر دلوں میں اتر بھی جاتی ہے اور اٹک بھی
تی ہے یوں کہ تا دیر اس کی خلش محسوس ہوتی ہے ؎

گونجتی رہتی ہے کانوں میں تری آواز پا
اور دیکھا جائے تو اپنے سوا کوئی نہیں

تمہاری طرزِ تبسم اڑا نہیں سکتی
کلی، کلی ہے ہوا سے چٹک گئی ہوگی

اتفاقاً سامنا ہوا اُن کا پھر ہمیں کیا ہوا نہیں معلوم

اپنی وفا کا ان سے صلہ چاہتے ہیں لوگ
کیا چاہتے ہیں لوگ؟ یہ کیا چاہتے ہیں لوگ؟

آپ ہی کہیے اسے کیا نام دینا چاہیے
وہ جو کانٹا سا کھٹکتا ہے رگِ جاں کے قریب

دل سے اُمڈے ہوئے آنسو ہیں مری پلکوں پر
اس ابھرتی ہوئی سازش کا دبانا مشکل

براہِ راست ہوں میں ان سے ہم کلام عروج
وہ مقتدی ہوں کہ جس کا کوئی امام نہیں

تمھیں کیا حقیقت تو شادیاں مبارک ہو ورنہ دنیا جانتی ہے آگ جو ساون میں لگی

کاش اس بت کو بھی ہم وقت تمنا دیکھیں
برف کی سل سے نکلتا ہوا شعلہ دیکھیں

یہ تصور ہی غلط ہے دمِ آہو ٹھہرے
میرے آنگن میں تری زلف کی خوشبو ٹھہرے

ان کو دیکھا تو قدم یوں رک گئے
جیسے دامن ہو کہیں الجھا ہوا

میری نظر میں صرف مرا آشیاں نہیں
ٹھہرا ہوا ہوں برق کی رفتار دیکھ کر

جو آتی ہے تو یادِ عشرتِ رفتہ ضرور آئے
مگر پرچھائیوں کا ہم کبھی پیچھا نہیں کرتے

اسلوب نگارش کے بارے میں یہ طے شدہ امر ہے کہ ثقافت کا کما حقہٗ ادراک، عصری حسیت، متعلقہ صنفِ سخن اور قارئین اس کے تشکیلی عناصر ہیں۔ قارئین کے تعلق سے عرض کروں گا کہ اکثر احباب کا نظریہ ہے کہ ترسیلی سہولت کے لیے ادب کو زیادہ سے زیادہ عوامی زبان سے قریب تر کیا جائے۔ اس بارے میں حضرت عروج کا اپنا اور مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ بہت ارفع و اعلیٰ نظریہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں؛

"شعر و ادب عوامی سطح تک آجانے کے بعد موت کے آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ عوام کو حقیقی سطح تک لانا اس تعلیم یافتہ اور ہوش مند طبقہ کا کام ہے جس کا نغمۂ زندگی سازِ شکستہ کے تاروں کو بھی متحرک کر دیتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ طبقہ خود عوام کے غلط مذاق کے سامنے جھک جائے یا اس سے متاثر ہو جائے"

لہ زندہ کتبے ص۱۳

غزلیں

سیّد حیات وارثی

دھوپ میں میں تھا، تو اس کے سر پہ بھی سایہ نہ تھا
میں نے ہی تنہا فریبِ دوستی کھایا نہ تھا

ہجر کی اس کیفیت کو میں بھلا کیا نام دوں
مدّتوں سویا نہ تھا اور خواب بھی ٹوٹا نہ تھا

تھی تغافل میں بھی پنہاں اک لطیف اپنائیت
بارہا میں نے بھی اس کو دیکھ کر دیکھا نہ تھا

بھیڑ سے دُنیا کی میں، جب تک الگ چلتا رہا
شکست رفتاری نہ تھی، میں اس قدر تنہا نہ تھا

کیوں نظر آتے ہیں آخر اہلِ ساحل بدحواس
ڈوبنے والے سے جب ان کا کوئی رشتہ نہ تھا

اس کے دروازے پہ کیوں ہے مانگنے والوں کی بھیڑ
جس کے دامن میں بہ ظاہر کوئی سرمایہ نہ تھا

عالمِ حیرت میں ہے، فکر و نظر کا آئینہ
سامنے تھا اس کا جلوہ اور وہ بے پردہ نہ تھا

یادؔ دہلوی

مستقل اندھیرا ہے مستقل ہے تنہائی
ہم کو مطمئن کرنے زندگی کہاں لائی!

جب کسی سفینے سے موج کوئی ٹکرائی
زندگی کے ماتھے کی ہر شکن اُبھر آئی

ہے مری نگاہوں میں ذرّہ ذرّہ آئینہ
آپ ہی تماشہ ہوں، آپ ہی تماشائی

موت کو حسیں کہہ کر آج ہم نے یہ جانا
اس طرح بھی ہوتی ہے زندگی کی رُسوائی

آج ان کے چہرے سے میرا غم نمایاں ہے
عمر بھر کی بے تابی آج مجھ کو راس آئی

برق آ کے لہرائی جب کسی نشیمن پر
میرا دل لرز اُٹھا میری آنکھ بھر آئی

جانے کتنی اُمیدیں یادؔ رقص کرتی ہیں
پھر بھی کم نہیں ہوتی اپنے دل کی تنہائی

افسانہ

ا.م. راجندر
چیف ایڈیٹر "سی انڈیا"
۶۸ چتروہار نئی دہلی ۹۲

بد "منظر"

صفیہ خانم یہاں کی ریسرچ لیبارٹری میں جونیر ریسرچ آفیسر تھیں اور ان کے شوہر سلیم رضا مقامی ڈگری کالج میں انگریزی کے لکچرار تھے۔ صفیہ خانم سائنس کے کمالات کا ذکر کرتیں تو سلیم رضا ادب کی خوبیاں گنوانا شروع کر دیتے اور اس کی بڑائی کرتے۔ یہ خوشگوار گھریلو بحث بے لوث قہقہوں کے درمیان اس موضوع پر کہ ادب کو سائنس پر فوقیت حاصل ہے یا سائنس کو ادب پر، کافی دیر تک چلتی رہتی دل میں صفیہ اور سلیم دونوں جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے مقاصد اور اس کے ارتقا کے لیے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہم تھے۔ اور پھر کسی کسی سطح پر ادب اور سائنس کے سنگم اور اشتراک سے بھی عمدہ نتیجے برآمد ہوتے ہیں جس کا بیّن ثبوت اس گھر کی خوشگوار فضا اور سلیم اور صفیہ کی ہنسی خوشی سے بھرپور زندگی تھی!

صفیہ خانم کوئی پینتیس سال کی ہوں گی۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، درمیانہ قد، دبلا پتلا جسم اور گول حسین چہرہ۔ ان سے کوئی بھی بات کرتا تو فوراً مسکرا کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتیں اور یہ مسکراہٹ گفتگو کے درمیان مسلسل قائم رہتی تھی۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانیں بڑی روانی سے بولتی تھیں مگر عموماً اردو میں ہی بات کرتیں۔ زبان بڑی شستہ اور لب و لہجہ بڑا شائستہ تھا۔ شادی ہوئے بارہ سال ہو گئے تھے اور وہ بہت ہی پیارے بچوں جاوید اور ناہید کی ماں تھیں۔ ہر لحاظ سے چاق و چوبند اور چست تھیں اور ملازمت اور گھر کے کام میں انصاف کرتی تھیں۔ میاں نے کئی دفعہ تجویز کی تھی کہ گھر میں کوئی خادم یا آیا رکھ لی جائے کیونکہ بچے اس وقت تو کافی چھوٹے تھے مگر صفیہ نہیں مانی تھیں کیونکہ وہ اصولاً گھر میں آیا اور ملازم رکھنے کے خلاف تھیں اور گھر میں سلیم کی والدہ تو تھیں ہی۔ پھر بچے بھی اب اتنے چھوٹے تو نہیں تھے لیکن صفیہ نے کبھی اپنی ساس پر بھی کام کاج کا بوجھ نہیں ڈالا۔ خود علی الصبح اٹھتیں، جھاڑو بہارو اور صفائی کرتیں اور چائے بنا کر سب کو پلا دیتیں اسی وقت بچوں کے لیے ناشتہ بھی تیار کر لیتیں۔ دفتر جانے سے پہلے سبزی ترکاری بھی تیار کر دیتیں۔ ساس روٹی سینک لیتیں اور کبھی کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ سلیم خود بچوں کے لیے سینڈوچ اور ٹوسٹ وغیرہ تیار کر لیتے اور کئی مرتبہ تو چائے وغیرہ بنا کر بھی سب کو پلا دیتے۔ شام کا کھانا بھی عام طور پر صفیہ ہی بنا لیتیں اگرچہ ان کی ساس ان کی پوری مدد کرتی تھیں۔

اپنے ریسرچ کے کام میں صفیہ بہت ہی دلچسپی لیتی تھیں اور گھر پر بھی رات کو مطالعہ کرتیں۔ ان میں اتنی ہمت اور کوشش کا جذبہ تھا کہ اپنے مضمون میں ڈاکٹریٹ کرنے کی بھی سوچ رہی تھیں۔ سلیم اور میں اچھے دوست تھے اور ہم کالج میں پڑھاتے تھے اور میرا ان کے یہاں آنا جانا تھا۔ ایک روز مجھے سلیم رضا کے ہمراہ صفیہ خانم کی لیبارٹری جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں بھی ان کے اپنے کام میں انتہائی شوق، محنت اور انہماک کو دیکھ کر میں بڑا متاثر ہوا۔ وہ اپنے کام میں شہد کی مکھی کی طرح جٹی ہوئی تھیں اور ادھر ادھر اپنی تجربہ گاہ میں کوئی بھی چیز اٹھانے یا رکھنے جاتیں تو ایسی برق رفتاری سے قدم اٹھاتیں جیسے ایک غیر معمولی جوش اور عزم ہی پیدا کر سکتا ہے اور پھر مجال ہے کہ پیشانی پر ذرا سی بھی شکن پڑ جائے۔ وہی

شائستگی، خوش خلقی اور خندہ پیشانی۔ جس سے ملتیں یا بات کرتیں تو مسکراہٹ کی قندیل ہونٹوں پر پہلے روشن ہو جاتی۔

ایک روز میں سلیم رضا کے گھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ سلیم نے ادب کی بات چھیڑ دی۔ صفیہ خانم فوراً بولیں۔

"آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم سائنسدانوں کو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں۔ میری مثال لے لیجئے، چھٹپن میں یعنی جب میں دسویں جماعت میں تھی تو میں نے ایک افسانہ لکھا تھا اور وہ ہمارے اسکول میگزین میں بھی چھپا تھا۔"

ہم سب ہنس پڑے اور سائنس اور ادب کی بات یہیں ختم ہو گئی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"آپ تو ایک تعلیم یافتہ اور بیدار مغز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ دیکھیے آپ ایم۔ ایس۔ سی تک پڑھ گئیں اور آپ کے گھر والوں نے آپ کو ملازمت کرنے کی اجازت دے دی۔ ادب اور سائنس کی اہمیت کو آپ نہیں سمجھیں گی تو اور کون سمجھے گا۔

صفیہ خانم مسکرا دیں اور پھر سنجیدہ ہو کر بولیں۔

"بھیا میں جھوٹ نہیں بولونگی۔ خاندان میں تو بہت ہی دقیانوسیت تھی اور لڑکیوں کی اعلےٰ تعلیم پر بھی بندشیں تھیں۔ شکر ہے کہ اب یہ ختم ہو رہی ہیں۔ میں نے میٹرک ہی پاس کیا تھا کہ پھوپھی، چچی اور دوسری بزرگ عورتوں نے فوراً میرے ہاتھ پیلے کرنے کی صلاح دیدی۔ صرف بیچارے ابّا تھے جنھیں میرے کالج میں داخلہ لینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں ان کے سر ہو گئی کہ میں تو آگے پڑھوں گی۔ گھر میں دوسرے بزرگوں کی مخالفت کے باوجود ابا نے میری خواہش اور مستقبل کے پیش نظر مجھے کالج میں داخل کرا دیا اور میں نے سائنس لے لی۔ بی۔ ایس۔ سی کر لی تو پھر سب شادی کے لیے کہنے لگے۔ چونکہ میری بی۔ ایس۔ سی میں فرسٹ ڈویژن آئی تھی، ابا نے مجھے آگے پڑھنے سے نہیں روکا۔"

"اس کے لیے تو ہم بھی آپ کے ابا جان کے شکر گزار ہیں" سلیم ہنستے ہوئے بولے" ورنہ اس وقت آپ کی شادی کسی اور سے ہو جاتی۔"
اس کے بعد خاموشی سی ہو گئی تو میں بولا۔

"مگر جب آپ نے ملازمت کی تو بھی تو مخالفت ہوئی ہوگی۔"

"کچھ نہ پوچھئے بھیا۔ اصل مخالفت تو تبھی ہوئی۔ امی اور ابا جان کو رشتے داروں سے کیا کیا نہ سننا پڑا مگر وہ سب کو یہی جواب دیتے کہ اس معاملے میں مسلمان ہونے کا کوئی تعلق نہیں ہے اسلام تعلیم نسواں کا حامی ہے اور ہمارے مذہب میں عورتوں کی ملازمت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں اور خواتین اور مردوں کو مل کر اپنے ملک اور سماج کی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ چنانچہ مجھے ملازمت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اپنے خاندان میں اس وقت میں پہلی لڑکی تھی جس نے ملازمت کی۔ اب تو خیر وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ہی بدل گیا ہے۔"

"اگر سلیم بھائی اجازت دیں تو ایک سوال اور پوچھ لوں۔" میں نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سلیم رضا مسکرا کر بولے۔" جیسے پچھلے سوالات تو آپ نے میری اجازت سے ہی پوچھے تھے! آپ کی بھابی ہیں جو چاہیں پوچھئے۔"

"کیا شادی کے معاملے میں بھی آپ آزاد خیال تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"بھیا آپ کو یہ سن کر شاید مایوسی ہوگی" صفیہ خانم بولیں "میری ان سے ملاقات کالج یا ملازمت کے دوران نہیں ہوئی۔ میں نے انھیں شادی سے پہلے دیکھا بھی نہیں تھا کیونکہ یہ ہمارے رشتہ دار نہیں تھے۔ یہ ان دنوں لکھنؤ میں تھے اور یہ شادی ہم دونوں کے والدین نے ہی خط و کتابت اور بات چیت سے طے کی تھی۔ البتہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو رشتے داروں کی موجودگی میں چند منٹ کے لیے سرسری طور پر دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ میں محبت کی شادی کے خلاف نہیں ہوں بلکہ بہت حد تک اس کی حامی ہوں لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانے اور ملازمت کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہم اپنی روایتوں اور اخلاقی اور سماجی اقدار کو کھو دیں۔"

اور چند منٹ بعد ہی میز پر پلیٹیں اور پیالے لگ گئے۔ صفیہ ہر کام کو خود ہی کر رہی تھیں، پیالیوں کا دھونا، خشک کرنا

اور چائے وغیرہ لگاتا۔ جاوید اور ناہید بھی اپنی ماں کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ہم سب چائے کی میز پر بیٹھ گئے۔ بچے بہت ہی تمیزدار تھے اور خاموشی سے سر جھکائے میز پر بیٹھ گئے تھے۔ میز پر بھی صفیہ کے سلیقے اور ہنرمندی کا اظہار میز پر سجی رکھی تقریباً ہر شے سے ہو رہا تھا۔ سلیقہ بلاشبہ اس گھر کے کونے کونے سے عیاں تھا۔

کچھ عرصہ بعد میں نے یہاں کے کالج کو چھوڑ دیا اور ناگپور چلا گیا جہاں مجھے یونیورسٹی میں ریڈر کی جگہ مل گئی تھی۔ ناگپور آنے کے کوئی تین سال بعد، ایک روز اخبار میں ان طلبا کی فہرست میں جو لکھنؤ یونیورسٹی سے سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے حقدار قرار دیے گئے تھے، صفیہ خانم کا نام پڑھا۔ دل نے گواہی دی کہ یہ مسز سلیم رضا ہی ہوں گی۔ ناگپور آنے کے بعد ابھی تک صفیہ یا سلیم سے ملنے کا کوئی موقعہ میسر نہیں آیا تھا۔ میں نے اسی وقت صفیہ خانم کو ان کی لیبارٹری میں ایک ٹرنک کال بک کی۔ صفیہ تو کسی میٹنگ میں گئی ہوئی تھیں مگر جس نے فون پر بات کی اس نے تصدیق کر دی کہ ڈاکٹریٹ انھیں ہی ملی ہے۔ میں نے اسی وقت دونوں کو گھر کے پتے پر مبارک باد کا ایک تار بھیج دیا اور شام کو ہم سب گھر میں صفیہ خانم کی بات کرتے رہے۔

یوں تو لاکھوں کروڑوں ہندستانی گھروں میں نیکی، ایثار اور قربانی کی پیکر خواتین کی ممتا اور محبت کے چراغ روشن ہیں اور ان کی بدولت گھر مسرت کا گہوارہ ہے مگر صفیہ خانم نئے بدلتے ہوئے ہندستان کے چہرے کی بڑی نمائندہ تصویر تھیں۔ انھوں نے زندگی اور عمل دونوں کا راز پالیا تھا اور گھر، دفتر اور علم کے شعبوں کو انھوں نے اپنے صحیح نظریے، محنت اور صداقت اور مسکراہٹ کی مسلسل آبیاری سے سرسبز چمن زاروں میں بدل دیا تھا۔ صفیہ خانم جیسی عورتیں بلاشبہ ہندستان کے درخشاں مستقبل کی ضامن ہیں۔

عروج زیدی

صفحہ ۱۳ کا بقیہ

یوں حضرت عروج کی طرز نگارش کا جائزہ لیتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اپنے اس لائحہ عمل کی پیروی انھوں نے خوب خوب کی ہے اور اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ گرچہ عروج صوت وصدا کے ایک ہجوم میں گھرے ہوئے تھے لیکن پھر بھی ان کی اپنی آواز دور سے پہچانی جانے لگی ؎

میرے گرد و پیش تھا صوت و صدا کا اک ہجوم
اس فضا میں بھی مری آواز پہچانی گئی

اور یہ صورت بن بلائے نہ آ گئی اس کے لیے انھیں بڑا ریاض، بڑی مشقت کرنا پڑی ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور معنی کی جامہ زیبی کا ہنر حاصل کرنا پڑا ہے ؎

عرض مطلب کو بھی درکار ہے جامہ زیبی
ہمیں لفظوں کے تعاقب میں نکلنا ہوگا

اور پھر مشق و مزاولت نے عروج کو وہ مقام عطا کیا کہ ان کا ہنر خود زبان بن گیا ؎

حسنِ کلام تشنۂ تکمیل ہے عروج   جب تک نہ اپنے منھ سے ہنر بولنے لگے

اس تجربہ کے واسطے اک عمر چاہیے   الفاظ ساتھ چھوڑ دیں دل بولنے لگے

عروج اعجاز اسلوب بیاں کی انتہا یہ ہے
کہانی کہنے والا خود کہانی بن کے رہ جائے

اور آخر میں عرض ہے کہ شعر و ادب کے اس بے لوث خادم نے فکر و فن کے جو چراغ جلائے ہیں انھیں زمانے کی سرپھری ہوا بھی کبھی بجھا نہ سکے گی ؎

میں وہ چراغ ہوں جس کو بڑا بھروسہ ہے
بجھا سکے گی نہ یہ سرپھری ہوا مجھ کو

غزلیں

کمال جائسی

کرنیل گنج
کان پور

سونی پلکوں پہ جو راتوں کو سجائے ہونگے
خواب اس کے نہیں ہونگے وہ پرائے ہونگے

ساتھ پتھراؤ کا موسم بھی وہ لائے ہونگے
شہر کے موڑ پہ دیوانے جو آئے ہونگے

اُس ستم گر سے وفاؤں کی ہو اُمید انھیں
نقش ان لوگوں نے پانی پہ بنائے ہونگے

لمحے بے رنگ ملے ہوں گے سرِ شہرِ وفا!
وقت نے آئینے چہروں کو دکھائے ہونگے

زندگی پیار کے زخموں سے سجی ہوگی مگر
اہلِ دل شوق سے سینوں میں چھپائے ہونگے

تتلیاں شوق کی آوارہ ہوئی ہوں گی کمالؔ!
جب بہاروں نے نئے گیت سُنائے ہونگے

تبسم شاہجہانپوری

محلہ جلال نگر کالونی
شاہجہانپور

تیری یادوں نے مجھے بخشے اُجالے کتنے
راہِ ہستی میں وگرنہ تھے اندھیرے کتنے

فرض، احساس، تمنّائیں، محبّت، یادیں
میں اٹھائے ہوئے پھرتا ہوں جنازے کتنے

ہم ہی مجرم ہیں کہ تکمیل کا پیکر نہ بنے
زندگی کرتی رہی ہم سے تقاضے کتنے

یاد جب مجھ کو ترا عہدِ وفا آتا ہے
طنز کرتے ہیں یہ رنگین لفافے کتنے

ہم برستے ہوئے دو ابر کے ٹکڑے تھے مگر
اہلِ دُنیا نے بنائے ہیں فسانے کتنے

تم تبسمؔ در و دیوار سے دُکھ سکھ کہہ لو
حالِ دل رہ گئے اب پُوچھنے والے کتنے

منظر بھوپالی

نزد تلّیا تھانہ، سلطانیہ روڈ
بھوپال

یہاں خوابوں کی ارزانی بہت ہے
اس آبادی میں ویرانی بہت ہے

مُبارک تم کو خوشیوں کے خزانے
مجھے تو غم کی سلطانی بہت ہے

سروں پر خواب اوڑھے جا رہے ہیں
یہاں سُورج کی تابانی بہت ہے

ہوس دریا کی ہوگی اہلِ زر کو!
ہمیں دو گھونٹ ہی پانی بہت ہے

قصیدے پڑھنے والوں میں نہیں ہوں
مجھے تو چاک دامانی بہت ہے

پرندے زخم کھا کر اُڑ رہے ہیں
ہواؤں کو پشیمانی بہت ہے

میں سچّے لفظ ہی لکھتا ہوں منظرؔ
مری باتوں میں نادانی بہت ہے

اشفاق احمد
چاند پورہ۔ بہرائچ

اردو میں طنز و مزاح کی روایت اور ”اودھ پنچ“

اردو میں مزاح نگاری کی ابتدا اردو کی ابتدا کے ساتھ ہی ہوئی۔ زبان کے آغاز ہی سے ہمیں مزاح کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ لیکن اس دور کے طنز و مزاح نگاروں میں کوئی ایسی شخصیت نہیں ملتی جسے بطور سند پیش کیا جا سکے۔ لیکن بعد میں سوداؔ کے دور میں میر ضاحک، فدوی، مکین اور بقاؔ وغیرہ چند شعراء موجود تھے۔ لیکن ان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ اس کے بعد انشاؔ و مصحفیؔ کی معاصرانہ چشمکیں ہیں جو صرف ہجو و تنقیص تک محدود تھیں اس کے بعد ایک اہم نام غالبؔ کا آتا ہے جو شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اپنا سکہ جمائے ہوئے تھے۔ غالبؔ کے مکاتیب طنز و مزاح کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کے ایک خط کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

”دھوپ بڑی تیز ہے، روزے رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا کھا لیا۔ اور یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور صاحب فرماتے کہ روزہ نہیں رکھتا۔“ [1]

یہ حقیقی اور فطری مزاح ہے جو غالبؔ کے یہاں نظر آتا ہے۔ لیکن باقاعدہ طور پر مزاح نگاری کی ابتدا اودھ پنچ کے اجرا سے ہوتی ہے۔ اودھ پنچ کا پہلا پرچہ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو منظر عام پر آیا اور تھوڑے ہی وقت میں مقبول خاص و عام ہو گیا جس نے بہت جلد اپنے گرد مزاح نگاروں کا ایک جم غفیر بھی اکٹھا کر لیا جنھوں نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ سجاد حسین اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس کے معاونین میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برقؔ، تربھون ناتھ ہجرؔ، اکبر الہ آبادی، منشی احمد علی کسمنڈوی، احمد علی شوقؔ اور نواب سید محمد آزاد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اودھ پنچ اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردعمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے زندگی سے شگفتگی اور آسائش چھین لی تھی۔

سجاد حسین ایک سچے محب وطن تھے۔ انھوں نے مزاحیہ انداز میں سامراجیت اور نام نہاد ترقی پسندی پر کھل کر تنقید کی۔ انھوں نے سیاسی لوگوں پر پھبتیاں کسنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

اودھ پنچ کی قدر و منزلت اس کے لائق ایڈیٹر سجاد حسین کی مرہون منت تھی۔ زندہ دلی ان کا امتیازی وصف تھا۔ تکلیف کے زمانے میں بھی کسی نے ان کے چہرے پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی نہ دیکھی یہی خصوصیت ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو خطوط مختلف رؤسا کے نام لکھے ہیں وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ چکبستؔ لکھتے ہیں۔

”اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ رہتے

جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی اور دور دور تک مشہور ہو جاتی تھی۔ ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔ جو مظلوم ان تیروں کا شکار ہوتا ہے وہ روتا ہے اور دیکھنے والے اس کی بے کسی پر ہنستے ہیں۔ [۱۵]

اودھ پنچ میں ایک کالم لوکل علیہ الرحمہ کے نام سے لکھا جاتا تھا جس میں زمانے کی تبدیلیوں کا ذکر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں انکم ٹیکس بل سے لوگ ڈرے ہوئے تھے۔ اودھ پنچ نے انکم ٹیکس کی مخالفت میں کئی مضامین لکھے۔ ۲۹ مئی ۱۸۷۷ء کے شمارے میں ٹیکس کی منظوم مخالفت ملاحظہ فرمائیے۔

کہتے ہیں جسے ٹیکس وہ ہے قہر الٰہی
دیکھیں ہم کب ہوتی ہے اس سے رہائی
روٹی ہی نہیں صبح تا شام میسّر
اس حال میں ہو ٹیکس کی کس طرح ہمائی
الٹی یہ بنالیتا ہے عالم کی حجامت
ہے ٹیکس بھی شاید کوئی اللہ کا نائی
کانٹا سا کھٹکتا ہے یہ آنکھوں میں ہماری
نشتر سا چبھا دل میں ہے جانوں پہ بن آئی
کونسل سے چلا ٹیکس، ادھر چرخ سے ہیضہ
دونوں نے پہنچتے ہی عجب دھوم مچائی
بربادی کے آثار، خرابی کے علامات
اس ٹیکس میں ہر شخص کو دیتے ہیں دکھائی

اودھ پنچ نے جہاں انگریزی سرکار پر چوٹیں کی ہیں وہیں ہندستان کی مختلف ریاستوں کی غفلت شعاری پر بھی بےباک تبصرے کئے ہیں اور سماج کی برائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔

اودھ پنچ ایک قوم پرست کانگریسی اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر کانگریسی مکتب خیال سے منسلک تھے۔ اپنی پالیسی کے اعتبار سے یہ سرکار کا آزاد مشیر اور رعایا کا خادم تھا۔ اس اخبار کے ساتھ یہ دلچسپ خصوصیت وابستہ تھی کہ سیاسی معاملات میں ترقی پسند اور سماجی تہذیبی اور ادبی معاملات میں قدامت پسند تھا۔ اسی وجہ سے سیکولرزم کی حمایت اور سرسید کی مخالفت میں اودھ پنچ پیش پیش رہا اور ہمیشہ ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار رہا۔ اودھ پنچ نے انگریزوں کے خلاف قومی شعور بیدار کرنے کے سلسلے میں بڑا کام کیا اور انگریزوں کی منافقانہ سازشوں کے خلاف ہمیشہ لڑتا رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں اودھ پنچ کے شباب کی دوپہر ڈھلنا شروع ہو گئی اور اس کی حالت روز بروز خراب ہونے لگی۔ مگر سجاد حسین کو یہ گوارا نہ تھا کہ اودھ پنچ کو بند ہوتا ہوا دیکھیں۔ منشی بالمکند گپتا صاحب کو ایک خط میں جو بعد میں "زمانہ" میں شائع ہوا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مکرمی تسلیم

خط پہونچا۔ اودھ پنچ مردہ ہاتھوں سے اس لیے نکلتا ہے کہ کوئی اٹھانے والا نہیں ہے۔ دو ایک سطروں کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں نہ منھ سے بول سکتا ہوں۔ کچھ تو کرہت کرکے نکال دیتے ہیں۔ دس سال سے فالج میں گرفتار لب گور ہوں۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہیں تو کیا انتظام ہو سکے۔ اخبار صرف اس لیے نکالتا ہوں کہ جیتے جی مر نہیں سکتا۔ ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں...... مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔

اودھ پنچ زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو ہاں گذشتہ زمانے میں کچھ تھا۔"

غرض اودھ پنچ کی اشاعت کو وہ اپنی زندگی سمجھے تھے اور اس کے بند ہونے کو موت تصور کرتے تھے لیکن لگاتار گھاٹے کے سبب اودھ پنچ کا جاری رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ نازک زمانہ تھا جب محمد سجاد حسین کو مالی مشکلات کا سامنا تھا چنانچہ ۱۹۱۲ء میں یہ پرچہ ان کی زندگی میں ہی بند ہو گیا۔

اردو صحافت میں اودھ پنچ کی اہمیت تین اسباب کی بنا پر ہے۔ پہلی تو یہ کہ اودھ پنچ نہ صرف اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا بلکہ اس نے پہلی بار اردو میں مغربی طنز و مزاح کے حربوں کو استعمال کیا۔
(باقی ص۴۵ پر)

وقار طاہری
۸۔ ۹۹/۲۲۳، نالہ روڈ
چمن گنج، کان پور

غزل

سب نظر آندھیوں پہ رکھے تھے
ہم نگہ شہ پروں پہ رکھے تھے

بے وسائل مجھے پہونچنا تھا
راستے پربتوں پہ رکھے تھے

دیکھ کر مجھ کو تھرتھرانے لگے
جو دیے طاقچوں پہ رکھے تھے

باغ میں گشت کر رہی تھی ہوا
بلبلے پانیوں پہ رکھے تھے

اشک رکھے تھے اس کی پلکوں پر
یاد یئے سرحدوں پہ رکھے تھے

ایک ہلچل اک ارتعاش لیے
لفظ کچھ کاغذوں پہ رکھے تھے

دھوپ کے زرد رنگ پھول وقار
کوہ میں پتھروں پہ رکھے تھے

کسم یاراش
۵۲۔ اشوک گارڈن۔ رائے سین روڈ
بھوپال ـــــ ۴۶۲۰۲۳

غزل

جب تری یادوں سے یارانے ہوئے
شہر میں آباد ویرانے ہوئے
اوڑھ کر بیٹھے تھے ہم سنجیدگی
لے کے تیرا نام دیوانے ہوئے
لوگ اپنی بات کیوں کرنے لگے
شمع سے جب دور پروانے ہوئے
پیاس اب شاید کہیں بہہ جائے گی
ڈبڈباتے نین پیمانے ہوئے
آدمی بھی اپنے آپے میں نہیں
درد بھی جینے کے من مانے ہوئے
راستے میں جب اندھیرا بڑھ گیا
جسم کے سائے بھی بیگانے ہوئے
کس سے رشتوں کے سراپے مانگئے
لوگ تو خود سے ہی انجانے ہوئے
عمر بھر بھٹکی جہاں بے چارگی
راستے وہ بھی تھے پہچانے ہوئے
دھڑکنوں کے نام لکھ کر زندگی!
ہم خود اپنے گھر میں انجانے ہوئے
درد شاید کھو چکا اپنا بھرم
آجکل ویران میخانے ہوئے

زاہد عثمانی
گھوسیا، ضلع وارانسی

غزل

جنگل تھا سرخ جھیل تھی یادوں کی شام تھی
تاروں کی یہ کتاب تمہارے ہی نام تھی

لمحوں کے ساتھ ساتھ صدی بھی اُڑا گئی
پروائی ابکے سال بہت تیز گام تھی

خوشبو کا ایک جسم تھا چندن کا پیڑ تھا
وہ بولتی سی آنکھ دلوں کا سلام تھی

برگد تلے گلاب کا پودا نہ اُگ سکا
صدیوں سے جس سے فصلِ چمن ہمکلام تھی

تقدیر تو قوموں کے لیے لکھی گئی تھی
اک شخص کی قسمت تو محض ٹوٹا جام تھی

تاریخ لکھ رہی تھی قصیدہ ہمارے نام
تلوار اپنے ہاتھ میں جب بے نیام تھی

جام و سبُو پہ پیاس بھی اک لکھ گئی غزل
اس میکدے کی شام تو زاہد کے نام تھی

افسانہ

اظہار صہبائی
بازید خیل، شاہجہانپور

دھوپ کا سفر

پوایاں روڈ کے دونوں طرف بہت سی گندی اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں مُردہ بندریا کے بچّے کی مانند فٹ پاتھ کے سینے سے چپکی ہوئی ہیں۔ میلے چیتھڑوں اور ٹاٹ کے بدرنگ ٹکڑوں نے ان جھونپڑیوں کی تعمیر میں پوری وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔ جھگیوں کے سامنے ہی بنجاروں نے اپنی بھٹیاں اور دھونکنیاں لگا رکھی ہیں۔ خانہ بدوش ان کی مدد سے لوہے کا مختلف سامان بنانے کا کام کرتے ہیں۔ سارا دن آگ اگلتی ان بھٹیوں میں لوہا گلایا جاتا ہے۔ دہکتے سرخ لوہے پر گھنوں اور ہتھوڑوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔

"کھاٹ ــــ کھاٹ ــــ کھٹاک ــــ کھٹاک ــــ کھٹ"

یہاں تک کہ ان مسلسل گھنوں کی زوردار آوازوں سے تنگ آکر سورج دیوتا بھی جھنجھلا کر آکاش میں اپنا منھ چھپا لیتے ہیں۔ مٹی میں ننگ دھڑنگ کھیلتے، ناک سُڑکتے گندے بچے سوسو دیتا کر یوں خود سے رُوٹھا پاکر اپنے کھیل اُدھورے چھوڑتے ہوئے پتھریلے فٹ پاتھ کو اپنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔ گھنوں کی آوازیں ہر روز کافی دور تک فٹ پاتھ سے گزرنے والوں کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ آپ پولیس لائن کے سُرخ گیٹ پر ہی کھڑے ہو کر صاف طور پر ان آوازوں کو سُن سکتے ہیں۔ کبھی کبھی مرد عورت ایک ساتھ مل کر ایک ہی لوہے پر چوٹ مارتے ہیں ــــ باری باری ــــ ان کے ہاتھ رُکتے ہی نہیں ــ کسی نہ کسی بھٹی پر دن میں ہر وقت ٹھونکا پیٹی کا کام ہوتا ہی رہتا ہے۔

رات گئے تک اس گندی بستی میں بھنگ، چرس، گانجے اور مدک کا دَور چلتا رہتا ہے۔ کوئی فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھا ہوا ہاتھوں میں چلم سنبھالے کھانستے کھانستے بے دم ہو جاتا ہے، تو کوئی دارو کے نشے میں دُھت لڑکھڑاتا اول فول بکتا دکھائی پڑتا ہے۔ کسی جھونپڑی سے لاٹھی ڈنڈے اور گالیوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں اور پھر کافی رات گئے یہ ساری چہل پہل شب کے سناٹوں میں سمٹ آتی ہے۔ اور پوری بستی یوں خاموشی کے آغوش میں دم توڑ دیتی ہے گویا کسی سانپ نے اسے نگل لیا ہو۔ چوماس کی پہلی پھوار کے ساتھ ان خانہ بدوش مردوں، عورتوں کا قافلہ کسی دوسری جگہ کوچ کر جاتا ہے۔

موسموں کی مانند ان کے آنے جانے کا سلسلہ بھی ہمیشہ یوں ہی بنا رہتا ہے۔ ہر سال ان میں سے کچھ پُرانے چہروں کی کمی ہوتی ہے اور نئے چہروں کا اضافہ اس کمی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ ایک طویل عرصے سے یہی ہوتا آرہا ہے۔ غریب بنجاروں کی زندگی ان چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں تک ہی محدود ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان کو سر چھپانے کے لیے ایک ٹکڑا آسمان اور رہنے بسنے کے لیے صرف دو گز زمین ہی کی ضرورت ہے۔

یہ معمولی جھگیاں کچن، باتھ روم اور ورک شاپ سے لے کر

بجھنے تک کا کام دیتی ہیں۔ شام کے وقت بھینسوں اور دھوئیں کا
م پوری طرح بند ہو جاتا ہے۔ کوئی خانہ بدوش لڑکی فٹ پاتھ
بیٹھی سبزی چھیلتی نظر آتی ہے اور کوئی سِل بٹے پر نون مرچ
رگڑتی ہوتی ہے تو کہیں باسی مچھلی کے سفنے ادھیڑے جا رہے
وتے ہیں۔ ہر جھگی میں پیشاب کی بساند لیے زنجیر سے بندھی بکریوں
ر ایک آدھ مریل اور خارش زدہ کتے یا چار چھ مرغیوں کا پلا ہونا
بھی ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کبھی کوئی جانور سڑک سے
زرتے کسی ٹرک یا موٹر کے پہیے کے نیچے آکر مرحوم ہو جاتا ہے
خانہ بدوش سارا فٹ پاتھ سر پر اٹھا لیتے ہیں۔

ابھی پچھلے ہفتہ ہی کی بات ہے، تیسری جھونپڑی کے بنجارے کی ایک مرغی ایک ٹرک کے پہیے سے کچل کر مر گئی تھی تو انھوں نے ٹرک روک کر اس کے ڈرائیور ...... کی کافی مرمت کر دی تھی۔ پہلے تو بھاری بھرکم جسامت کے ڈرائیور نے خانہ بدوشوں پر اپنی آستینیں چڑھانے کی کوشش کی تھی، لیکن پھر خانہ بدوشوں کی تعداد دیکھ کر انھوں نے چپ چاپ ٹرک لے کر وہاں سے بھاگ جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

پوایاں روڈ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ سڑک آئے دن اسی قسم کے حادثات دیکھنے کی عادی بن چکی ہے۔ پوایاں روڈ کی ساری رونق انھیں بنجاروں کے ہی دم سے ہے ورنہ یہاں چند سرکاری دفاتر، ایک دو کرانے کی دکانیں اور پولیس لائن کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے؟ اکثر دن کے فالتو اوقات میں محنت کش خانہ بدوش عورتیں کرانے کے دکان داروں رمضانی اور کھڑک سنگھ سے ہنسی ٹھٹول کر کے اپنا دل بہلا لیا کرتی ہیں۔ ان کے سودے سلف کا لین دین بھی انھیں دکانداروں سے چلتا ہے۔ وہ نون تیل اور دھنیا مرچ انھیں دکانوں سے ہی خریدتی ہیں اور وقت پڑنے پر نقد ادھار سے بھی کام چلا لیا جاتا ہے۔ ادھار کے کارن رمضانی اور کھڑک سنگھ کو کبھی بار خسارہ بھی اٹھانا پڑا، کیونکہ کئی خانہ بدوش کمینے ان کا ادھار چکائے بغیر ہی راتوں رات وہاں سے اپنا بوریا بستر موڑ کر کسی دوسری جگہ چلتے بنے۔

پوایاں روڈ پر خانہ بدوشوں کی ان جھگیوں کا سلسلہ کافی دور تک چلا گیا ہے۔ کوڑے کے بدبودار ڈھیروں کے کنارے بنی ان جھونپڑیوں میں سب سے آخری جھونپڑی بندی کی ہے۔ گھن چلانے والے بنجاروں کی اس بھیڑ میں لوگوں کو بندی کا چہرہ کافی متاثر کرتا ہے۔ راہ گیر اسے دیکھتے ہی اپنے دل میں ایک عجیب سی چُبھن محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایک ایسی چبھن جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ بندی ہے بھی تو قیامت کی حسین۔ گھٹنوں تک سُرخ اونچا چُنٹیں پڑا گھیر دار لہنگا، اس کے کنارے پر ٹکی ہوئی چمکدار سنہرے چوڑے گوٹے کی جھالر، تنگ، اونچا اور بازو کھلا رنگین چھینٹ کا جمپر اور چولی۔ چندری کی کناریوں میں چمکتے سفید موتی اور گوری کلائیوں میں کھنکتی سرخ چوڑیاں۔ یہی کوئی بیس بائیس کے قریب ہوگا اس کا سن ـــ اکثر شام کو جب وہ چاقو، چھری اور درانتی لے کر فروخت کی غرض سے بہادر گنج کے ناکے پر بیٹھتی ہے تو اپنے چاروں طرف مجمع اکٹھا کر لیتی ہے۔ لوگ سامان خریدنے کے ساتھ اس کی باتوں میں بھی دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ بلا کی اکھڑ ہے یہ عورت بھی۔ صرف دوٹوک بات کرتی ہے۔ زیادہ مول بھاؤ اسے پسند نہیں ـــ کبھی کبھی تو اس کے قریب کھڑے ہوئے پھلوں کے ٹھیلے والے اس پر ایک آدھ فقرہ بھی چُست کر دیتے ہیں، اور بندی صرف مسکرا کر رہ جاتی ہے وہ ان پھبتیوں کی عادی بن چکی ہے۔

لیمو، ہری مرچ اور ہرا دھنیا بیچنے والا گھسیٹے تو صرف اس کی مسکراہٹ دیکھنے کے لیے ہی اپنا تھوا اس کے سامنے والی جگہ پر لے کر بیٹھتا ہے۔ ایک آدھ دوکان داروں نے بات کچھ آگے بھی بڑھانی چاہی لیکن بندی کی جلی کٹی سُن کر ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اپنی جھگی پر گھن چلانے کا کام زیادہ تر بندی ہی کرتی ہے اس کا شوہر لکھیا صرف بھٹی دھونکنے اور سنسی سے لوہا گھمانے کا کام سنبھالتا ہے۔ لکھیا کا کہنا ہے کہ لوہا گھمانے کے لیے اکثر

کی جرأت ہے۔" ایسا کرتے وقت وہ اپنی چوکڑیادار رنگین لنگی کو کمر کے پھینٹے میں سختی سے اڑس لیتا ہے۔

دفتر جانے کی غرض سے جب میں اِدھر سے گزرتا ہوں تو ہر روز میری ملاقات بندی سے ہو جایا کرتی ہے۔ یوں ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں کیونکہ ہماری نگاہیں ایک دوسرے کو خوب پہچانتی ہیں۔ بندی اچھی طرح جانتی ہے کہ اِدھر سے گزر کر دفتر جانا میرا روز کا معمول ہے۔ اس کے جھونپڑے کے قریب آتے ہی مجھے اپنی رفتار کچھ سُست ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ میں اس بات کا سبب جاننے سے قاصر ہوں۔ ہر روز یہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ہم دونوں کی نگاہیں اچانک ہی ایک دوسرے سے اُلجھ کر رہ جاتی ہیں۔ پھر بندی اپنے کام میں محو ہو جاتی ہے اور میں اپنے ذہن سے اس کا خیال جھٹکتا تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔

دوسرے خانہ بدوش مردوں کی طرح لکھیا کو بھی دارو کا چسکا لگا ہوا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بندی اس سے کھنچی کھنچی سی رہتی ہے۔ ہر رات جب وہ دارو کے نشے میں دُھت گنگناتا لڑکھڑاتے قدموں سے جھگی میں داخل ہوتا ہے تو وہ اسے جلی کٹی سُنانے لگتی ہے۔ لکھیا کو نشے میں دیکھ کر اس کا پارہ اچانک ہی ساتویں آسمان پر پہونچ جاتا ہے اور جھگڑا ہونے لگتا ہے کبھی کبھی تو یہ لڑائی اچانک ہی مار پیٹ اور گتھم گتھا کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔ جھگڑے کو یوں بڑھتے دیکھ کر دوسرے جھونپڑے کے لوگ نکل آتے ہیں اور بندی کو لکھیا کی مضبوط گرفت سے آزاد کرا دیتے ہیں۔ بنجارنیں بندی کے چوٹیلے اور سوجے ہوئے جسم پر ہلدی تھوپنے اور گرم کپڑے کی سنکائی کا کارِ ثواب انجام دینے لگتی ہیں۔ کچھ دیر بعد کوئی بنجارن بندی کو اس کی جھگی میں چھوڑ آتی ہے۔ پھر لکھیا اور بندی ایک دوسرے کی طرف سے کروٹ لیے خاموشی سے جھگی میں پڑے رہتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں سارا جھونپڑا ان دونوں کے خراٹوں سے گونج اٹھتا ہے۔

فٹ پاتھ پر جھاڑو لگانے والے منگو جمعدار کی جھاڑو کی آواز ان دونوں کو صبح ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ دونوں اپنے کپڑوں کی دھول جھاڑتے زمین سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ لکھیا اُٹھتے ہی سنہری کرنوں کی بارش کرتے سورج دیوتا کو دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا ہے۔ پھر میونسپلٹی کے نلکے پر آکر طبیعت سے کُلّا کرتا ہے۔ بندی سامنے کے ہوٹل سے لایا ہوا چائے کا کلھڑ اور رات کی باسی روٹی چپ چاپ اسے پکڑا دیتی ہے۔ بھوجن سے شکم سیر ہو کر دونوں خاموشی سے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں وہی گھنوں کی آوازیں اور ہتھوڑوں کی کھٹ کھٹ ——— یہی ان کا معمول ہے۔

بندی کو لکھیا کا دارو پینا تو ناگوار گزرتا ہی ہے مگر اس وقت وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہو جاتی ہے جب لکھیا شراب کے نشے میں بھٹی پر کسی سے اُلجھ پڑتا ہے اور مار پیٹ کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ کئی بار اسے اسی کارن اشفاق نگر کی پولیس چوکی کا بھی منھ دیکھنا پڑا ہے اور وہ اپنی بے بسی پر جھنجھلا کر رہ گئی ہے اس نے پولیس اسٹیشن سے لکھیا کو اپنے ساتھ لاتے ہوئے خوب پھٹکار سُنائی ہے اور صاف کہہ دیا ہے کہ مجھے پولیس کے لفڑے میں پڑنا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود لکھیا اپنی دارو پینے کی عادت سے باز نہیں آیا۔

بندی بہادر گنج سے جو کچھ کما کر لاتی ہے، لکھیا سارے کا سارا دارو میں ڈبو دیتا ہے۔ جب کبھی وہ اسے پیسے دینے سے انکار کرتی ہے تو لکھیا تھپڑوں اور گھونسوں سے اس کی پٹائی کرنے لگتا ہے۔

بندی کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑے ہیں۔ لنگا بھی پھٹنے لگا ہے اور کرتی بھی کئی جگہ سے مسک چلی ہے۔ لکھیا کا دارو کا خرچ جھیلنے کے بعد بندی کے پاس اتنا بچتا ہی کہاں ہے جو وہ اپنے کپڑوں کی طرف کچھ توجہ دے سکے۔ اس نے رمضانی کی دوکان سے سوئی دھاگا لے کر کئی مرتبہ اپنی کرتی اور لہنگے پر پیوند لگائے ہیں، لیکن بے جان کپڑے کے یہ پیوند کسی مفلس کی خواہش کی مانند جلد ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ اور پھر وہ نئے سرے

سے نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھی ان پیوندوں سے اپنا سر کھپانے لگتی ہے۔ پھٹے کپڑوں سے جھانکتے اپنے جسم کے عریاں نقوش کو وہ لوگوں کی چبھتی نگاہوں سے چھپانے کی کافی کوشش کرتی ہے لیکن بے سود۔ ! ادھر تو کئی مرتبہ لکھیا نے بھی اس بات کو تاڑ لیا ہے کہ راہ گیروں کی نگاہیں گھن پلاتی بندری کے جسم میں پہلے کی بہ نسبت اب کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے وہ خوب جان چکا ہے۔ سائیکل پر سوار آرڈی نینس فیکٹری جانے والے راہ گیروں کی بھیڑ جو ہر روز اپنی ڈیوٹی کی جلدی میں تیزی سے چپ چاپ وہاں سے نکل جایا کرتی تھی، اب ایک آدھ آدمی سرگوشیوں میں بندری پر کوئی فقرہ چست کر دیتا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، سامنے اقبال سنگھ کی آرا مشین کا مستری بھیکو اپنے ہیلپر رام چرن سے کہہ رہا تھا:

"یار ! کھدا کسم یہ بندیا سسوری ایک دم اتّی کٹیلی ہوئی رئی ہے کہ اُو کو دیکھ نہ جانے کا ہے میرو ہر دے پھڑکن لاگت ہے۔ !"

بھیکو کی بات سُن کر لکھیا خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اس کی دھونکنی کے چلتے ہوئے تیز ہتھے میں معاً بریک سے لگ جاتے ہیں۔ لیکن پھر کچھ سوچتے ہوئے اس زہر بجھے جملے کو برداشت کر لیتا ہے۔ اسے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ برداشت کی یہ قوت اس میں کہاں سے پیدا ہو گئی ہے۔ ؟ اب تک تو وہ چیخ چیخ کر ضرور کوئی لفڑا کھڑا کر دیتا۔ وہ اس جملے کی چبھن کو اپنے دل ہی میں محسوس کرتا رہتا ہے۔ ادھر کئی دن سے اس نے اس غم میں دارو کو بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ بندری اس کی اداسی اور ترک مے نوشی کا سبب جاننے سے قاصر ہے، اچانک اداسی اور اتنی تبدیلی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

لکھیا سارا دن مغموم اور اداس اپنی ٹھونکا پیٹی اور بھٹی کا کام کرتا رہتا ہے، بندری ہر شام بہادر گنج سے واپسی پر اُسے دارو لے پیسے پکڑا دیتی ہے لیکن پھر بھی وہ ۔ ی کارس ۔ ۔ ۔ کرتا۔ کئی روز سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔ حالانکہ شراب استعمال نہ کرنے کی وجہ سے لکھیا کو اپنا سارا جسم دکھتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ کئی بار تو بھٹی پر سنسی سے پکڑا ہوا لوہا بھی اس کی ڈھیلی پکڑ کے کارن اچھل کر دور جا گرا ہے اور اس کا سر چوٹ کھانے سے بال بال بچا ہے۔ اگر وہ ذرا بھی چوک جاتا تو سرخ لوہے سے اس کی آنکھ یا سر کا کام تمام ہو گیا ہوتا۔ بندری اس کی اس حرکت پر روئی میں لگی آگ کی طرح بھڑک اٹھتی ہے اور اس سے صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ "مجھے کھترے کا کام پسند نائیں جب تیرو ہاتھ پیر ناکو کابل نائیں تو کا ہے بھٹی پر بیٹھ جات ہے ؟"

آج شام جب بندری بہادر گنج سے لوٹ کر جھگّی میں داخل ہوئی تو لکھیا دونوں گھٹنوں میں سر دیئے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم، دھرتی پر نگاہیں گاڑے میٹھا ہوا تھا۔ بندری کے قدموں کی آہٹ اسے چونکا دیتی ہے۔ پھر وہ جیسے ہی دارو کے پیسے اس کی طرف بڑھاتی ہے، لکھیا کے چہرے پر اچانک اداسی کی پرچھائیاں کانپ اٹھتی ہیں۔ وہ اخبار میں لپٹی اپنے قریب پڑی سرخ پالیتھین کی تہیں کھولتے ہوئے اس کی طرف اچھال دیتا ہے۔ اس کے چہرے پر اب بھی افسردگی چھائی ہے۔

"لے اسے دروجی کے تیر سلاون کے لیے دیئی آ۔ پورو پانچ میٹر ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتا ہے۔ "ہم کا دارو پین کے لیے تورے پیسن کی جرورت نائیں، تو ایک دم مور کھ ہے۔ اپنی کچھو پھکر نائیں کرت ہے۔ تیرو یہ جوبن ایک دن ہمری ناک کٹائے دیہیں۔ آکھر ہم بنجارن کی بھی کچھو عجت آبرو ہے۔ ؟"

لکھیا کی بات سن کر بندری مبہوت نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے، اور پھر اچانک ہی اس کے خوبصورت رخساروں پر شفق کی سرخی نمایاں ہو جاتی ہے اور وہ لجا کر اپنا سر لکھیا کے کاندھے پر رکھ دیتی ہے۔

سال ۸۸-۱۹۸۷ء کے

ریاستی بجٹ کی اہم خصوصیات

- سال ۸۸ - ۱۹۸۷ کے سالانہ منصوبہ کا حجم ۶۵ر ۲۶۲۹ کروڑ روپئے متعین کیا گیا ہے جو گذشتہ سال سے ۳ ر ۲۲ فیصد زیادہ اور دیگر سبھی ریاستوں کے منصوبوں میں سب سے زیادہ ہے۔
- سال ۸۸ - ۱۹۸۷ میں بھی پہاڑی علاقوں کی ترقی کے لیے ہماچل پردیش کے مساوی یعنی ۲۳۵ کروڑ روپئے کی رقم مختص کی گئی ہے۔
- نئے ۲۰۔ نکاتی پروگرام کے تحت سال ۸۸ - ۱۹۸۷ میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام سے ۶۶ ر ۷ لاکھ خاندان مستفید ہوں گے۔ قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین روزگار گارنٹی اسکیم کے تحت بالترتیب ۴۸۰ لاکھ اور ۸۴ ر ۳۴۴ لاکھ انسانی یوم کے بقدر روزگار مہیا کیا جائے گا۔ اسی طرح چھوٹی صنعت کے ۲۰ ہزار واحدے قائم ہوں گے۔ مجموعی طور سے ۱۷۰۰ مواضعات کو پینے کا پانی مہیا کیا جائے گا۔ دیہی علاقہ کے ۵۰۰۰ خاندانوں کو رہائشی قطعات الاٹ کیے جائیں گے۔
- مجموعی طور سے ۷ ر ۱ لاکھ افراد گندی بستی سدھار اسکیم سے مستفید ہوں گے۔
- اقوام درج فہرست کے مجموعی طور سے ۵۶ر۲ لاکھ خاندانوں کو اسپشل کمپوننٹ پلان کے تحت مستفید کرنے کا نشانہ بھی ہے
- سال ۸۸ - ۱۹۸۷ء میں اناج کی پیداوار کا ۲۴۵ر۵ لاکھ ٹن کا نشانہ ہے۔ اس کے علاوہ ۱۵ لاکھ میٹرک ٹن تلہن اور ۵۰ر۳۱ لاکھ ٹن دلہن کی پیداوار کا نشانہ بھی ہے۔
- اوسر سدھار پروگرام کے تحت ۲۳۰۰۰ ہیکٹئرز زمین کے سدھار کا نشانہ ہے۔
- عوامی نظام تقسیم کے تحت امداد باہمی والی دکانوں سے تقریباً ۶۰۰ کروڑ روپیے کی اشیائے صرف مہیا کی جائیں گی۔
- ایسے سبھی بے سہارا افراد کی نشان دہی کی جائے گی جنھیں کسی بھی ذریعہ سے امداد حاصل نہیں ہوتی ہے انھیں امداد دینے کے لیے پانچ کروڑ روپیے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ سال ۸۸-۱۹۸۷ء میں مزید ۱۱۶۰۰۰ ہیکٹیر رقبہ میں آبپاشی صلاحیت پیدا کی جائے گی۔
- بجلی کی ۵۲۰ میگاواٹ کی مزید تنصیبی صلاحیت پیدا کرنے کی تجویز ہے اور ۹۱۶ر۱۷ ملین یونٹ بجلی پیدا کرنے کا نشانہ ہے۔
- مجموعی طور سے ۴۰۸۰ مواضعات اور ۳۹۱۴ ہریجن بستیوں کی بجلی کاری کی جائے گی اور ۲۰۵۰۰ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپ سیٹوں کو بجلی مہیا کرنے کا نشانہ ہے۔

سال ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۱۰۰ ... مابسیاں
قائم کرنے کی تجویز ہے۔

- اقوام متحدہ کی مدد سے سہارنپور میں ۱۳۵ لاکھ روپیے کی لاگت سے ایک وُڈ کاروِنگ کمپلکس کو ترقی دی جائے گی۔
- سال ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۲۱۰۸ کیلو میٹر نئی سڑکیں اور ۱۳۹ نئے پل تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔
- ۲۲۴ پرائمری اور ۱۸ سینیر بیسک اسکول کھولے جائیں گے۔ اس سال نو مزید نوودے اسکول کھولے جائیں گے۔ مجموعی طور سے ۱۰٫۴۳ لاکھ بالغان کو حرف شناس بنایا جائے گا۔
- ۸۸-۱۹۸۷ء میں ... ۱ نئے ذیلی صحت مرکز، ۲۲۵ ابتدائی صحت مرکز، ۲۴ اجتماعی صحت مرکز اور انٹنسیو کارڈیک کیئر یونٹ، دو ڈائلسس یونٹ، دانتوں کے چار کلینک اور ۲۵ غیر سرکاری ایلوپیتھک اسپتال قائم کیے جائیں گے۔
- ریاست کے مختلف زمروں کے سرکاری و دیگر ملازمین کو فوری راحت بہم پہنچانے کی غرض سے یکم نومبر ۱۹۸۶ء سے منظور شدہ ۱۵ فیصد عبوری راحت کے علاوہ ان کی بنیادی تنخواہ کے دس فیصد کے بقدر کم سے کم ۶۰ روپیے اور زیادہ سے زیادہ ۲۲۵ روپیے ماہانہ عبوری راحت جون، ۱۹۸۷ سے دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔
- سبکدوش ملازمین کے لیے پنشن کا تعین یکم جنوری ۱۹۸۶ کے بعد سبکدوش ہونے والے ملازمین کی مجموعی تنخواہ کے ۵۰ فیصد پر کیا جائے گا۔
- پنشنروں اور خاندانی پنشنروں کو نظر ثانی شدہ پنشن پر یکم جنوری، ۱۹۸۶ اور یکم جولائی، ۱۹۸۷ سے مرکزی ملازمین کے مساوی مہنگائی بھتہ بھی واجب الادا ہوگا

... ۰ ۵ ہزار سے بڑھا کر
ایک لاکھ روپیے کر دی جائے گی۔

- مال کے نظم ونسق کو عوامی نوعیت کا حامل بنانے اور ترقیاتی پروگراموں کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے تین نئے ضلعوں کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ اضلاع ہری دوار، سدھارتھ نگر (نوگڑھ۔ بستی) اور مئو (اعظم گڑھ) ہوں گے۔
- اس سال ۲۶٫۱۰ کروڑ روپیے کی لاگت سے ۲۵ کیلو میٹر لمبے سرحدی باندھ اور ۴۰ کیلو میٹر کے بقدر پانی کی نکاسی کے کاموں کی تکمیل کے ذریعہ مزید ... ۳۲ ہیکٹر رقبہ کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا جائےگا۔

"اودھ پنچ" صفحہ ۲۸ کا بقیہ

دوسری یہ کہ سیاسی اور مجلسی مسائل پر بھرپور طنز کا آغاز اودھ پنچ سے ہی ہوا۔ اودھ پنچ سے قبل محض نکتہ چینی یا ایک حد تک تنقید ضرور موجود تھی لیکن ظرافت کے بیشتر عناصر کا افسوسناک حد تک فقدان تھا یہ کمی اودھ پنچ نے پوری کی۔

تیسری یہ کہ اودھ پنچ وہ پہلا اردو اخبار تھا۔ جس نے کسی خاص واقعہ کے متعلق اپنی رائے دینے یا کسی مضحک پہلو کو نمایاں کرکے پیش کرنے کے لیے کارٹون کا بھی استعمال کیا۔

البتہ معیار صحافت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس اخبار نے معاصرین کی پگڑیاں اچھالنے، انھیں ذلیل کرنے اور بعض اوقات دلائل کے بجائے محض ابتذال اور پھکڑپن سے کام لینے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ قابل اعتراض روش تھی لیکن اس وقت کا مزاج ہی اس طرح کا تھا اس لیے اس سلسلے میں اودھ پنچ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

بہرحال اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں اودھ پنچ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کے قدرداں اسے آسانی سے فراموش نہیں کرسکتے

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

نام کتاب "کشیدِ جاں" (شعری مجموعہ)
شاعر: عمر انصاری   قیمت: اکیاون روپے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ فردوسِ ادب، ۲۱ امین آباد پارک لکھنؤ

۱۹۳۰ء سے ۱۹۸۷ء تک اپنے ستاون سالہ ادبی سفر میں عمر انصاری حیرت انگیز طور پر اس طرح وقت اور زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے ہیں، کہ اُردو شاعری کے ہر نئے موڑ پر جہاں کہیں بھی وہ ہمیں ملے ہیں، تازہ دم ہی ملے ہیں اور کبھی کبھی تو بے اختیار ان کی یہ بات بھی باور کر لینے کو دل چاہا ہے کہ ؎

زمانہ کیا چلے شانہ ملا کر میرے شانے سے!
کہ میرا ہر قدم آگے ہی پڑتا ہے زمانے سے

اپنی شاعری سے انھوں نے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ لکھا ہے اور خوب خوب لکھا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں اور تمام اصنافِ سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اب تک ان کے آٹھ مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے ہر ایک کم از کم ۲۰۸ صفحات سے لے کر ۴۵۶ صفحات تک پر مشتمل ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ کلام "کشیدِ جاں" ان کی تازہ ترین غزلوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۶ء تک چار سال کے عرصہ میں لکھی گئی ہیں۔

"اُجلی قبا کے انسان" اور "حرفِ حق" لکھنے والے معتبر ترین شاعر عمر انصاری کی تازہ پیش کش اور توانا آواز ہمیں اس لیے مرغوب نہیں ہے کہ ان کا ہنر ہمارے قبیلے سے نسبت رکھتا ہے بلکہ اس لیے کہ اپنی "کشیدِ جاں" میں وہ ایک عہد آفریں شخصیت بن کر ہمارے سامنے اُبھرے ہیں اور انھوں نے جس ہنرمندی کے ساتھ زندگی کو ہنر اور ہنر کو زندگی بنایا ہے۔ وہ ہمارے گزرنے والے آج کے لیے بھی اور آنے والے 'کل' کے لیے بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۳۸ء میں اپنے پہلے مجموعہ کلام "جرسِ کارواں" کی اشاعت سے ۱۹۸۷ء میں اپنے موجودہ مجموعہ کلام "کشیدِ جاں" کی اشاعت تک عمر انصاری اپنی شکست و ریخت میں اپنی تعمیر و تلاش میں اپنی گہری اثر پذیری اور طاقتور اثر اندازی میں، اپنے انتشار و اتحاد میں، اپنی قدیم روایت سے وابستگی اور جدید زمانے کی آگاہی میں ایک زندہ احساس اور بے تاب فکر کی اور اپنے زمانے کے عمل اور ردِّ عمل کی ایک بیّن علامت بن گئے ہیں۔

"کشیدِ جاں" کی اشاعت عصری ادب میں نہ صرف ایک خوش گوار ہوا کے جھونکے کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ کاروانِ غزل کے لیے ایک نئے سنگِ میل کی بشارت کا درجہ رکھتی ہے۔

اچھے کاغذ، اچھی کتابت، صاف ستھری طباعت، خوبصورت تزئین کاری اور گٹ اَپ کے ساتھ کتاب اپنی صوری و معنوی دونوں خوبیوں کے اعتبار سے خوب بلکہ نہایت خوب ہے۔

دامنِ دل اور دامنِ نظر کھینچنے والے بے شمار اشعار میں سے جو "کشیدِ جاں" کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں، چند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

عالم یہی، جب نیند میں غفلت کی پڑا تھا
پہلے جو اُٹھا سب سے، مرا دستِ دُعا تھا

پلٹ کے جا نہ سکا پھر اسی طرح میں بھی
زبانِ خلق سے نکلا ہوا سخن جیسے

جہاں میں ہو کوئی منصف تو دے ہمیں بھی سزا
کہ اپنے دل پہ بہت ہم بھی جبر کرتے ہیں

بچہ بھی اک وہیں تھا بڑی دیر سے کھڑا
جس جا سجے ہوئے تھے کھلونے دکان میں

چھڑ جائے ذرا جنگ اگر تیغ و قلم میں
تلوار ہی رک جائے، قلم پھر نہیں رکتے

اسی امید پہ کشتی کا سفر جاری ہے
ہو کہیں بھی مرے خوابوں کا جزیرہ ہے ضرور

اس کی یادوں کا تو یارو ہے جدا ہر انداز
دے کے آواز کبھی آئیں نہ جائیں کہہ کے

ڈاکٹر انوار الحسن

نام کتاب "پریم چند کا فنی و فکری مطالعہ"
مصنف : سید محمد عصیم ، قیمت : تیس روپے
ملنے کا پتہ : ۱۸۲۳- ترکمان گیٹ ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

پریم چند کی حقیقت نگاری اور مثالیت پسندی میں کتنے ہی عیب کیوں نہ نکالے جائیں، اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ وہ اردو فکشن کا ایک اہم نام ہیں۔ ان کے ماننے والوں اور ان سے بے اندازہ عقیدت رکھنے والوں کی تعداد کچھ کم نہیں، اسی طرح کچھ لوگ ان کے مخالف بھی ضرور ہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ عقیدت اور مخالفت سے ہٹ کر غیر جانبدارانہ انداز میں ان کا فنی محاکمہ کیا جائے۔

جناب محمد عصیم کی پریم چند سے دل چسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ایم، اے کے ایک خصوصی پرچے کے لیے پریم چند کو اپنا موضوع بنایا اور اب ان پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ پریم چند سے متعلق ان کے بعض مضامین کا مجموعہ "پریم چند کا فنی و فکری مطالعہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں پریم چند کی ناولوں اور افسانوں سے متعلق ان کے آٹھ مضامین شامل ہیں، جن میں انھوں نے معروضی انداز اختیار کرتے ہوئے پریم چند کے فن کو طالب علمانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ قابلِ تعریف بات ہے کہ ان کا انداز تحقیقی ہے اور یہ مضامین ریسرچ اسکالروں کے انداز سے خاصے ہٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

عصیم صاحب نے "عرضداشت" میں بہت ہی صفائی سے لکھ دیا ہے :-

> " میری مقدور بھر کوشش یہی رہی ہے کہ
> پریم چند کو جتنا اور جیسا کچھ میں نے محسوس کیا ہے،
> ان تاثرات کو پیش کر سکوں۔ چونکہ یہ محض تاثرات ہیں
> اس لیے نہ تو میں نے کوئی دعوا کیا ہے اور نہ ردِ دعوا۔"

اس صاف گوئی کے بعد عصیم صاحب نے پریم چند کے فن کو ہمدردانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے تین مضامین خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ "پریم چند اور ہری جنوں کے مسائل" میں انھوں نے پریم چند کی انسان دوستی کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے افسانوں اور ناولوں کے حوالے سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ پریم چند نے اپنے ہی دور میں ہری جنوں کے مسائل کو شدت سے محسوس کر لیا تھا اور ان کا ہمدردانہ حل تلاش کرنا چاہا تھا۔ "پریم چند کے یہاں تشدد اور عدم تشدد کی کش مکش" مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ویسے تو پریم چند مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے اصول کے زبردست حامی ہیں اور اپنے ناولوں اور افسانوں میں جگہ جگہ کھل کر ان نظریات کی تائید کرتے نظر آتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ان کے یہاں بعض جگہ تشدد اور باغیانہ سرگرمیوں کا کھل کر اظہار ہوا ہے۔
"کیا پریم چند فرقہ پرست تھے؟" عصیم صاحب کا تیسرا مضمون ہے جس میں انھوں نے پریم چند پر لگائے گئے ان الزامات کی سختی سے تردید کی ہے کہ پریم چند فرقہ پرست تھے یا ان کے یہاں اس قسم کے رجحانات کا اظہار ہوا ہے۔ اس کے بجائے مختلف مثالوں اور دلیلوں سے عصیم صاحب نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ

پریم چند نے زندگی بھر فرقہ وارانہ رجحانات کی کھل کر مخالفت کی۔ وہ اس دور کی مقبول ترین شدھی تحریک کے بھی مخالف تھے۔ اس لیے بقول عصیم صاحب، انھیں فرقہ پرست قرار دینا سخت ناانصافی کی بات ہے۔

ان کے دوسرے مضامین پریم چند کے مختلف کرداروں کے تجزیوں پر مبنی ہیں اور پریم چند شناسی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ دو مضامین میں عصیم صاحب نے "زادِ راہ" کے مختلف افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ مضامین یقیناً طالب علموں کے لیے معلوماتی نوعیت کے حامل ہیں۔

——— شہنشاہ مرزا

نام کتاب: "حرف و نوا" (شعری مجموعہ)

شاعر: جنید حزیں لاری — قیمت: بیس روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵

دو سو صفحات کی ضخامت رکھنے والے زیرِ تبصرہ مجموعے میں ابتدائی بیس صفحات انتساب، تعارف، عرضِ واقعی (مصنف) اور فہرست (ہر غزل کا پہلا مصرع اور نظموں کے عنوانات) پر صرف ہوئے ہیں۔ بقیہ صفحات میں دو حمد و مناجات، ایک نعت، ۵۰ غزلیں، سات ردایتی پابند اور چار آزاد نظمیں اور آٹھ قطعات شامل ہیں۔ بیشتر غزلوں کے اختتام پر شاعر کا ایک ایک منتخب شعر درج ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر محمود الٰہی، ڈاکٹر حنیف نقوی اور حرمت الاکرام جیسے صاحب الرائے اور بالغ نظر اصحابِ قلم کی مختصر لیکن معتبر اور مستند آرا کی روشنی میں جنید حزیں لاری کے فکری خد و خال دیکھنے، ان کے شعری رویوں کو سمجھنے، پرکھنے اور تخلیقی سفر کی سمتوں کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے میں حزیں کی شاعری پر کوئی رائے دینے کے بجائے دنیائے ادب کے ذی وقار اور صاحب نظر ادیبوں کی تحریروں سے مختصر اقتباسات پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ کیجیے:

"اس افراط و تفریط کے دور میں جنید حزیں لاری کا مجموعۂ کلام روایت اور جدت کے ایک خوبصورت امتزاج کی نوید جاں فزا بن کر آیا۔ میں اسے اردو شاعری کے لیے نیک فال سمجھتا ہوں۔"

(پروفیسر جگن ناتھ آزاد)

"چونکہ ستائش اور حسنِ طلب ان کی قوتِ تخلیق کے محرکات و مقاصد میں نہیں ہیں اس لیے وہ سچائی کو کسی تکلف اور تصنع کے بغیر سامنے لے آتے ہیں۔ سچائی کے اظہار کا یہی اسلوب ان کی شاعری کی جان ہے۔"

(پروفیسر محمود الٰہی)

ان گراں قدر رایوں کی صداقت کے ثبوت میں چند اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جن میں تکلف و تصنع سے گریز، جذباتی صداقت، عصری آگہی اور اظہار ذات جیسے جدید موضوعات کو کچھ اس فنکارانہ خوش سلیقگی کے ساتھ برتا گیا ہے کہ انھیں روایت اور جدت کے حسین امتزاج کی لازوال مثالوں کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

باقی بچا تھا جو بھی اثاثہ وہ لٹ گیا
آیا تھا درد بانٹنے کل ایک دردمند

ہر ایک ذرۂ صحرا میں ہے وجود مرا
بکھر چکا ہوں میں جاؤ سمیٹ لاؤ مجھے
آشوبِ آگہی کی حکایت لکھو حزیں
گہرے سمندروں کی طرح خامشی لیے

قدروں کی شکست و ریخت میں ہم افراد کوئی اپنا نہ سکے
اس دور میں لازم ہیں دونوں ہشیاری بھی عیاری بھی

——— ڈاکٹر محبوب راہی

*

نیا دور

جلد ۴۲ نمبر ۵

اگست ۱۹۸۷ء

اِیڈِیٹر : ——— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر : ——— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر : ——— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر : ——— ۴۷۱۰۸

پبلشر
پبلشر اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ : یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
سالانہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

اس سال ہم اپنی آزادی کی چالیسویں سال گرہ منا رہے ہیں۔ آج سے چالیس سال قبل یعنی ۱۵ ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر ایک نرالے انداز میں آزادی حاصل کی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں آزاد ملکوں میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جو خون خرابے کے بغیر آزادی کی منزل سے ہم کنار ہوا ہو۔ یہ فخر ہندستان ہی کو حاصل ہے کہ اس نے برطانیہ جیسی طاقت ور سلطنت سے خونریزی کے بغیر گاندھی جی کی قیادت میں اہنسا کے ذریعہ آزادی حاصل کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ آزادی ہم کو بغیر جدوجہد کے اور بغیر قربانیاں دیئے ایسے ہی حاصل ہو گئی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ملک کے جانباز محبانِ وطن لگاتار سّو سال سے دار و رسن کی منزلوں سے گزر رہے تھے ان منزلوں سے گزرنے کے بعد ہی ہم کو آزادی کی یہ نعمت نصیب ہوئی ہے اتنی جانفشانیوں اور قربانیوں کے بعد حاصل کی ہوئی آزادی کو برقرار رکھنا اور اسے مستحکم بنانا ہر محب وطن کا اوّلین فریضہ ہے۔ اگر اس وقت ہم نے اس میں کوتاہی کی اور ملک دشمن اور شرپسند طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ نہیں کیا تو ہم اپنی آزادی اور جمہوریت کو درپیش خطرات سے نہ بچا سکیں گے اور جس کے لیے ہماری آنے والی نسلیں ہم کو کبھی معاف نہ کریں گی۔ جب ملک آزاد ہوا تو قائدین وطن کو سب سے پہلے فرقہ وارانہ تشدد سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ پھر پسماندہ اور غریب عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے موثر اقدامات کیے گئے۔ اسی کے ساتھ ہی ملک کی تعمیر نو کا کام شروع ہوا۔ معمارانِ وطن نے ایک عظیم ملک کے شایانِ شان عظیم المقصد فیصلے کیے۔ خاتمۂ زمینداری، اصلاحات آراضی اور اجتماعی ترقی وغیرہ سے متعلق اقدامات ترجیحی بنیاد پر کیے گئے جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ پنج سالہ منصوبوں اور مختلف کثیر مقصدی پروجیکٹوں کی عمل آوری سے رفتہ رفتہ ملک مستحکم و مضبوط ہوتا گیا۔ آج جب ہم آزادی کے بعد گزشتہ چالیس برسوں کی ترقیاتی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ کیونکہ زیر نظر مدّت کے دوران ملک کے ساتھ ہی ساتھ ریاست اتر پردیش نے بھی ہمہ گیر ترقی کی ہے اور بیشتر زمروں میں ہماری ریاست خود کفیل ہو گئی ہے۔ ریاستی حکومت پوری مستعدی کے ساتھ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہے۔

آیئے! آزادی کی چالیسویں سال گرہ کے موقع پر یہ عہد کریں کہ اکابرین قوم کے خواب کو تعبیر آشنا کرنے کے لیے ہم سب حکومت کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے اور ایک نئے بھارت ورش کی تعمیر میں بھرپور حصہ لے کر جمہوریت دشمن عناصر کے منصوبوں کو کبھی کامیاب نہ ہونے دیں گے۔

ایڈیٹر

سری نیواس لاہوٹی
اُردو ہال، حمایت نگر
حیدرآباد

مسز سروجنی نائیڈو
ایک دِلنواز شخصیت

آج میں اپنی ماں کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اور جب اس ماں کو یاد کرتا ہوں تو خیالات کی دنیا بدل جاتی ہے۔ ایک گزری ہوئی شام، محبت کی محفل، اس بزم کی شمع فروزاں! جس کا نور نظروں سے دور ہے مگر میرے دل کے خون میں اس نور کے ذرات ابھی تک چمک رہے ہیں اور میری دنیا کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ سروجنی نائیڈو صرف جے سوریہ اور پدمجا کی ماں ہی نہیں تھیں بلکہ ہر اُس سپاہی کی ماں تھیں جو میری طرح سے آزادی کے محاذ پر صبر آزما جنگ لڑنے کے لیے سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ جب سامنے ہوتیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک آبشار بہہ رہا ہے۔ اور میں ان کی لازوال مسکراہٹوں سے اپنی فکر و نظر کے لیے سرمایہ حیات جمع کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی دلنوازصحبتوں میں کبھی کبھی شعر و شاعری کی لذتیں بھی حاصل ہو جاتی تھیں۔ یہ زمانہ میری کم عمری کا تھا۔ پھر بھی وہ ہر منزل پر ایسا مشورہ دیا کرتی تھیں کہ میں اُجڑے دیار میں اپنے چمن کو سنوار لوں۔

بہرحال اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ آج ہمارے قائدین کا ـــــ چاہے وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں ـــــ وہ جوشِ عمل کہاں گیا؟ وہ سرفروشی کیا ہوئی؟ فکر و نظر کی وہ وسعتیں اب کہاں ہیں؟ ـــــ آج جو میں قائدینِ ملت کو جلسوں کی ترتیب میں اور جلسوں کے پلیٹ فارم کی نشستوں میں اگلی صف تلاش کرتے دیکھتا ہوں تو اپنے دل سے کہتا ہوں کہ کہاں گئے وہ انسان جو نشستوں کی تلاش نہیں کرتے تھے بلکہ نشستیں ان کو تلاش کرتی تھیں۔

سروجنی نائیڈو اپنے زمانے کی بہت بڑی لیڈر اور اپنی قوم کی محبوب اور اپنے رفقاء کا بہت بڑا سہارا تھیں۔ اس حقیقت کو تو وہی چند ہم نفس بتا سکیں گے جنھوں نے خلوت اور جلوت میں سروجنی کی روحِ انسانیت کو دیکھا تھا۔ یہ مضمون تو محض نذرانۂ عقیدت ہے۔ وہ خراج جو میں ادا کرنا چاہتا ہوں، اگر عمر بھر لکھتا رہوں تو بھی ادا نہیں کر سکتا۔ میرے اس مضمون کا موضوع نہ تو سروجنی کی حیات ہے نہ شاعری۔ سروجنی کی حیات لکھنے کے لیے ایک ایسے مورخ کی ضرورت ہے جو تنگ نظری کے تمام تعصبات سے پاک ہو۔! رہا ان کی شاعری کا معاملہ تو یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی زبان کی سلاست، نفاست اور نزاکت کا نقش دل پر ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ جب کبھی اپنی زبان دانی انگڑائیاں اور جمائیاں لینے لگتی ہے تو انھیں کی کتابوں کی ہوا میرے قلب و نظر کو تازہ دم کر دیتی ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، یہ تو ماں کی خدمت میں نذرانہ اور صرف نذرانہ ہے اگر اس نذرانہ عقیدت سے محترمہ کی شخصیت و سیرت پر کچھ بھی روشنی پڑ سکے تو میں سمجھوں گا کہ میں

اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

سروجنی نائیڈو کا وجود ہماری تہذیب و تمدن کا ایک بیش بہا سرمایہ تھا جو حیدرآباد نے ہندوستان کو اور ہندوستان نے دوسرے متمدن ممالک کو دیا۔ ہم حیدرآبادیوں کے لیے یہ فخر کچھ کم نہیں ہے کہ ۱۳ر فروری ۱۸۷۹ء میں حیدرآباد کے طبقۂ نسواں میں ایک ایسی بین الاقوامی شخصیت پیدا ہوئی جس نے نہ صرف اپنی شاعری کے سحر طراز نغموں بلکہ ملک و ملت کے لیے اپنی جاں بازیوں اور قربانیوں سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک لازوال شہرت حاصل کرلی۔ ہندوستان کے اس دور کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو اس کے اوراق پر قدرت کا یہ معجزہ طلائی حرفوں میں قلم بند ہوگا کہ ایک غلام اور پسماندہ ملک اور اس کا زیادہ پسماندہ طبقۂ نسواں نے اپنی فطرت کے معدن سے ایک ایسا ہیرا پیدا کیا اور اپنی قدیم تہذیب کے سمندر سے ایک ایسا موتی برآمد کیا جس نے جنسی اقتدار کے غرور کو جھٹلا دیا اور بتا دیا کہ ہندوستان کی عورت باوجود ایک اندھے سماج کی سخت گیری کے زندگی کے ہر شعبے میں کس ہمہ گیر قابلیت کے ساتھ نمایاں ہو سکتی ہے ـــــ شاعری، ادب، سیاست اور سب سے زیادہ اپنے شخصی کردار کے دلنواز نقوش میں سروجنی دیوی کی بین الاقوامی شخصیت، ہندوستانی طبقۂ نسواں کے لیے عالمگیر پیام تھی اس لیے کہ وہ ایک ایسے طبقے کی نمائندہ خاتون تھیں جو آج صدیوں کی گہری نیند کے بعد بیدار ہو رہا ہے۔ اس طبقے کی بیداری کے لیے سروجنی نے مسیحا کا کام کیا۔ میرے خیال میں جب خود ایسے طبقے کی کوئی شخصیت ہمہ تن ایک پیام بن جاتی ہے تو وہی اس کی عظمت کا صحیح پیمانہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ملتیں اور قومیں انسانوں کی برادری میں آبرو پاتی ہیں۔ لیکن اس آبرو کو حاصل کرنے کے لیے سروجنی دیوی نے اپنی زندگی کے ستر سال مسلسل جدوجہد میں گزارے اور جب ۲ر مارچ ۱۹۴۹ء کو ان کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا تو برنارڈشا جیسے مفکر کو بھی یہ کہنا پڑا کہ،

"ہندوستانی دوستوں میں ٹیگور کی موت کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہے جو مجھے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔"

انیسویں صدی عیسوی کے آخری بیس سال کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد عوام کی بیداری کا ابتدائی زمانہ تھا اور اسی زمانہ میں ہندوستان کی بعض نامور ہستیوں نے جنم لیا ان میں سے ایک سروجنی چٹوپادھیائے بھی تھیں۔ نوجوان سروجنی نے زندگی کا پہلا نظارہ شعر و ادب کے فطری آئینے میں کیا۔ اس وقت انھوں نے دنیا کو جس نظر سے دیکھا وہ ــــــ

"پھولوں کی خوشبو اور قوس و قزح کی رنگینی سے معمور
تھی اور وہ اپنے گیتوں کی شبنم میں ایک چمکتے ہوئے
تارے کی طرح اپنی ٹھنڈی شعاعیں بکھیر رہی تھیں
مگر ان ٹھنڈی شعاعوں میں ایک بے قرار روح کی
بے قراری بھی شامل تھی۔ جب انھوں نے زندگی
کا ایک گیت گایا تو باوجودیکہ اس گیت کی زبان
انگریزی تھی اس کی سراپا ایشیائی روح نے اپنے
چہرے کو بے نقاب کر دیا۔"

انھوں نے کہا: ــــــ

تو لذت اور شہوت کے گھونٹ پیے گا اور
محبت تجھے آگ کی طرح جلائے گی
اور درد تجھے شعلہ کی طرح پاک کر دے گا، تاکہ
تیری کھوٹ تیری خواہشوں سے جدا ہو جائے
اس طرح پاک کی ہوئی روح
اپنی اندھی دعاؤں سے نجات پانا چاہے گی
خوشیوں کے جوش سے درگزر کر کے پھر تو سیکھے گا
مرے دل کے سکوں کا سادہ راز !!

سروجنی کی شعریت نے "ہمیں خوابوں اور تصورات کا ایک تسلسل عطا کیا تھا اور ان کی فصاحت و بلاغت نے ہماری قومی زندگی کی روح ایک ایسے پیغام سے بیدار کیا جو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ان کے شاعرانہ افکار و تصورات نے ہمیں سب کچھ دے دیا جو وہ دے سکتی تھیں۔"

پچاس سال قبل سروجنی "اپنے خوابوں کا گیت" میں کس طرح اپنے جذبات کی ترجمانی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

درختوں کے اس سحر طراز جھنڈ کی روشنی میں
جب میں اکیلی کھڑی تھی
تو میں نے محسوس کیا کہ
محبّت کی رات کے ستارے میری نرم و نازک
جوانی کے گرد
جمع ہو کر چمک رہے ہیں
اور اس وقت میں نے حق کی روح کا نغمہ سُنا!!

یہ حق کی روح کا نغمہ میدان جنگ کا نعرہ بن گیا اور فولاد کی سی سختی ان کی رُوح میں سما گئی۔ ۱۹۰۰ء کی سروجنی نے جب اپنی روح ۱۹۱۰ء کی سروجنی نائیڈو کے حوالے کردی تو اس وقت سروجنی کیا دیکھتی ہے کہ:

"ان پھولوں کی پتیوں پر جن کی ڈالیاں خود ان کے گیتوں کی ہلکی ہوا میں جھولا کرتی تھیں وہ انسانیت کی مجروح زندگی کے خون سے لبریز ہے تو وہ بلبلا اٹھیں اور اس کے بعد سے ان کے اندر ایک ایسا آتش کدہ روشن ہوا جس نے اپنا ناطہ زندگی کی عریاں حقیقتوں سے جوڑ لیا۔ سروجنی کی زندگی میں یہ ایک ایسا موڑ تھا کہ ان کی شاعرانہ فکر آسمان سے اتر کر اپنے وطن کی اس خاک پر قدم رکھنے کے لیے مجبور ہوئی جو اہلِ وطن کی آبرو کے خون سے آلودہ تھی۔"

سروجنی نے اپنی روح کو ملک کے حوالے کر دینے کے بعد کسی بھی وقت اس سے پہلو تہی نہیں برتی بلکہ ہر امتحان کی آگ میں تپ کر ایسا جوہر خالص بن گئیں کہ اہل وطن نے ۱۹۲۵ء میں ان کے سر پر کانگریس کی صدارت کا تاج رکھا — یہ دور وہ تھا جب ملک کے ہر وطن پرست کی شام اس کی صبح سے ناآشنا تھی۔ جیل خانے ان کے لیے کارواں سرائے بن گئے تھے۔ اس زمانے کے نوجوان قومی سپاہیوں کی نظر میں سروجنی کو اکّا (بڑی بہن) اور تلّی (ماں) کا مقام حاصل تھا اور یہ مقام مسز نائیڈو کو صرف اس لیے حاصل ہو سکا کہ ان کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور کشش تھی اور جو کوئی بھی ان کے حلقۂ اثر میں آجاتا اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اس سے کترا کر چلا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرقہ وارانہ منافرت کے بھڑکتے شعلوں میں وطن پرستی کا چہرہ بُری طرح جھُلسا جارہا تھا اس وقت بھی سروجنی نائیڈو اپنے خیال اور عمل کی دنیا میں اس چٹان پر قدم جمائے رہیں جہاں وہ پہلے دن سے اپنی غیر مشروط وطن پرستی کا جھنڈا گاڑے کھڑی تھیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فرقہ وارانہ فتنہ انگیزی کے اس طوفانی زمانے میں بھی وہ کبھی متزلزل نہیں ہوئیں حالانکہ اس فرقہ وارانہ سیلاب میں بہت سے لیڈروں کی قیادت کے جہاز تنکوں کی طرح سے تعصب کی موجوں کے حوالے ہو گئے جب ہماری قومی تحریک ملک کی تقسیم سے ہم کنار ہوئی تو سروجنی کی آواز مدھم پڑ گئی کیونکہ ملک کے اتحاد کا تصور پارہ پارہ ہو گیا تھا، اور سرمایہ داری جنگ آزادی کے سپاہیوں کو سمیٹ کر فرقہ پرستی کے قلعوں میں محصور ہو گئی تھی۔

اس دور میں مسز نائیڈو ہندستان کی بڑی سیاسی تنظیم کانگریس پر کوئی اثر تو نہیں ڈال سکی لیکن وہ اپنے قریب ہمیشہ ایک چھوٹی سی بزم سجائے رہیں جس میں ہندو اور مسلمانوں کی تفریق کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ ایک بڑی دردناک حقیقت ہے کہ ہمارے قومی رہنما جیسے جیسے ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے ان کی خانگی مجلسیں بھی اسی مناسبت سے تنگ اور محدود ہوتی گئیں، لیکن سروجنی نائیڈو کے یہاں — گورنر ہونے کے باوجود — ان کی زندگی کے آخری لمحہ تک بھی ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور دوسرے لوگوں کا بلا امتیاز مذہب جمگھٹا لگا رہتا تھا اور یہ سب کچھ مسز نائیڈو کی زندگی کی آخری سانسوں تک صرف اس لیے باقی رہ سکا کہ وہ جو کچھ محسوس کرتی تھیں بلا خوف تردید اس کا اظہار کر دیا کرتی تھیں۔ اس کا ثبوت ہمیں اس واقعہ سے ملتا ہے کہ

جب ریاست حیدرآباد میں مجلس اتحاد المسلمین اور رضاکار سیاست کا ندر تھا اور دہشت پسندی کی خبریں ملک میں چاروں طرف پھیلنے لگیں تو مسز نائیڈو نے کہا کہ "افسوس! ملی جلی تہذیب کا سنگم حیدرآباد خودکشی کر رہا ہے" اور جب یہاں پولیس ایکشن کے بعد ہندستانی فوجیں داخل ہوئیں اور رضاکاروں اور نظام کی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو انھوں نے جن الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا اس کے لیے موجودہ دور میں بڑی جرأت اور فراخدلی کی ضرورت ہے۔ وہ کہتی ہیں:

"آج میں مسرت اور غم کے ملے جلے جذبات سے دوچار ہوں۔ مجھے دکھ ہے کہ میرے وطن کو ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کی خوشی ہے کہ حیدرآباد بہت بڑی تباہی سے بچ گیا۔"

ان الفاظ میں کتنا درد وکرب اور اپنے وطن کے لیے کتنی محبت پوشیدہ ہے اس کا احساس وہی کر سکتا ہے جس کے سینے میں سروجنی کا دل دھڑکتا ہو اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں بڑی بڑی ہستیاں اس خاتونِ مشرق کی معترف ہو جایا کرتی تھیں۔

یہاں پر میں ایک ایسے واقعے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مرحومہ کی متاثر کن زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ غالباً یا داخل ۱۹۴۵ء کی بات ہے جب کہ یہ بچہ و تنہا کانگریس کی جانب سے بولنے کی مجاز تھیں اس لیے کہ تمام بڑے کانگریسی قائدین نظر بند تھے اور انگریز سامراجیوں نے اپنے مفادات کی چھان بین کرنے اور ہندستان کے حالات سے واقف ہو کر سامراجی نقطۂ نظر سے ایک کتاب لکھنے کے لیے ایک انگریز مصنف کو ہندستان بھجوایا تھا۔ جب یہ مصنف ہندستان کے سفر سے واپس ہو کر اپنے وطن پہنچا تو اس کے ایک دوست نے دریافت کیا کہ ہندستان میں کیا کیا دیکھا اور کن کن لوگوں سے ملاقاتیں کیں تو اس مصنف نے ایک لمبی چوڑی فہرست اپنے دوست کے سامنے پیش کر دی۔ لیکن وہ کہنا بھول گیا کہ وہ سروجنی نائیڈو سے بھی ملا تھا۔ اس مصنف کے دوست نے اس کا جواب سننے کے بعد کہا کہ اگر تم نے ہندستان میں صرف یہی دیکھا اور انہی لوگوں سے ملے ہو تو پھر تم نے ہندستان نہیں دیکھا۔!

وہ تعجب سے پوچھنے لگا کہ کیوں؟

اس مصنف کے دوست نے کہا کہ "اگر تم نے مسز سروجنی نائیڈو سے ملاقات نہیں کی ہے تو گویا تمہارا یہ سفر نامکمل رہا۔"

انگریز مصنف نے فوراً جواب دیا کہ میں تو ان سے دوبار ملا ہوں۔ اور اپنی ملاقات کا حال بیان کرنے لگا۔

وہ کہتا ہے کہ:

"جب میں پہلی بار سروجنی نائیڈو سے ملا تھا تو ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں کسی بہت بڑے انقلابی سیاست داں سے گفتگو کر رہا ہوں۔ لیکن جب میں دوبارہ ان سے ملا تو بالکل اس کے برعکس اثرات مجھ پر مرتب ہوئے اور میں یہ محسوس کرنے لگا کہ میں عہدِ ماضی کے کسی بڑے یونانی فلاسفر سے باتیں کر رہا ہوں اور اس وقت مجھے سروجنی کی شخصیت نے اتنا متاثر کیا کہ میں اس ملاقات کو مدت العمر نہیں بھول سکتا۔"

اس واقعہ کو دہرانے کی ضرورت محض اس لیے پیش آئی کہ یہ ایک ایسے شخص کے خیالات ہیں جس کو سامراجیوں نے ہندستان اس غرض سے بھجوایا تھا کہ وہ مس رانجھون کی زبان میں مسی میو کی طرح سے ہندستان کا حال لکھے۔ اس شخص نے باضابطہ طور پر ہندستان سے متعلق کوئی کتاب تو نہیں لکھی لیکن ایک زمانے تک اپنے تاثرات کو ــــ جو سامراجی مکتب خیال سے بہت ہی مختلف تھے ــــ لندن کے مختلف اخباروں میں پیش کرتا رہا۔ اپنے آخری مضمون میں وہ ایک جگہ اپنے ملک والوں سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھتا ہے:

"میں ہندوستان اس لیے بھیجا گیا تھا کہ ہمارے

ملک کے بعض جمہوری نقارچیوں کا ہمنوا بن کر ان کی طرح سے ہندیوں کے جذبۂ آزادی کو کچلنے کے لیے اپنی توانائیوں کو صرف کروں مگر جب میں نے اپنی آنکھوں سے ہندوستان کی غربت و افلاس اور سیاسی زبوں حالی کو دیکھا اور مسز سروجنی نائیڈو جیسے باعزت لیڈروں کی زبانی وہاں کے حالات معلوم کیے تو میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اب میں اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف انگلستان کے حکمراں طبقے کے اس طرز عمل کی تائید نہیں کر سکتا جو انھوں نے ہندوستان سے متعلق رکھا ہے۔"

اس واقعہ کے پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی، قوموں کی حقیقی تعمیر ایسے ہی افراد کے ہاتھوں ہوا کرتی ہے جیسی کہ مسز نائیڈو کی شخصیت تھی۔ ان لوگوں پر جنھوں نے محترمہ کی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا اور اسے سمجھنے کی کوشش کی تھی ان پر یہ بات اچھی طرح سے واضح تھی کہ محترمہ کی خانگی اور سیاسی زندگی میں کوئی تضاد اور فرق نہیں تھا۔ وہ سیاسی پلیٹ فارم پر بھی وہی بات کہتی تھیں جو خانگی ملاقاتوں میں ایک ملنے والے سے کہا کرتی تھیں ـــــ خانگی اور سیاسی زندگی میں تضادات اس وقت پیدا ہوا کرتے ہیں جب کہ سیاست ایک پیشہ، ایک تفریح اور دفع الوقتی ہو۔ لیکن جہاں سیاست زندگی کا ایک اہم ترین عنصر بن کر کسی فرد کی زندگی میں سرایت کر گیا ہو ناممکن ہے کہ وہ اختلافی شکل اختیار کرے، اور یہی وہ بات تھی جو سروجنی نائیڈو کی شخصیت میں پائی جاتی تھی۔

آج مسز سروجنی نائیڈو ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن اپنی مصروف اور باعمل زندگی میں قربانی، ایثار اور قومی اتحاد کی جس شمع کو روشن کر گئی ہیں اس کی روشنی کے سہارے ہندوستانی عوام کا قافلہ اپنی متعین کی ہوئی منزل کی طرف رواں دواں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

**

فاخر جلال پوری
جلال پور، فیض آباد

صبحِ آزادی

وہ بھارت کے اُفق پر مسکرائی صبحِ آزادی!
حیاتِ تازہ کا پیغام لائی صبحِ آزادی

نشاط افروز سامانِ بہارِ جاوداں بن کر!
چمن کے ذرّے ذرّے پر ہے چھائی صبحِ آزادی

جہاں پر گونجتے تھے سامراجی ساز کے نغمے
نسیمِ قسمت وہاں اب گنگنائی صبحِ آزادی

جہاں پر اک ہجومِ تیرگی شامِ زنداں تھا
وہاں اب شمع بن کر جگمگائی صبحِ آزادی

کہیں جمنوتری کے آبشاروں کی فضاؤں میں
کہیں گنگا کے دھاروں میں نہائی صبحِ آزادی

کہیں ہے جلوہ فرمائی ہمالہ کی بلندی پر
کہیں کھیتوں میں جا کر لہلہائی صبحِ آزادی

کہیں گلشن کے پھولوں کو مذاقِ رنگ و بو بخشا
کہیں صحرا کے ذرّوں میں سمائی صبحِ آزادی

طلائی پیرہن پہنا گئی ایوانِ شاہی کو؛
فقیروں کی کٹی میں کھنچ کے آئی صبحِ آزادی

جنھیں نیند آ گئی ہے وادیٔ شامِ اسیری میں
انھیں بیدار کرنے کو اب آئی صبحِ آزادی

رہِ شامِ وطن میں اپنی منزل ڈھونڈنے والو!
تمھارا خیر مقدم کرنے آئی صبحِ آزادی

چمن کی ہر روش شہرِ ختن کا ایک افسانہ
کہ بزمِ سادہ میں اک رنگ لائی صبحِ آزادی

مبارک اُن محبانِ وطن کے حوصلے فاخرؔ
جنھیں اے شامِ زنداں یاد آئی صبحِ آزادی

حنیف نقوی
ریڈر شعبۂ اُردو بنارس ہندو یونیورسٹی
وارانسی ۔ ۲۲۱۰۰۵

مرزا دبیر شعرائے اُردو کے تذکروں میں

اُردو میں تذکرہ نگاری کی روایت میر تقی میرؔ کے تذکرے "نکات الشعراء" سے شروع ہوتی ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس کے بعد سے ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں اُردو کی پہلی ادبی تاریخ "آبِ حیات" کی اشاعت تک کے خاصے طویل زمانے کو بجا طور پر تذکرہ نگاری کا دور کہا جا سکتا ہے۔ سوا سو سال سے زائد کی اس درمیانی مدت میں ہندستان کے مختلف حصوں میں شعرائے اُردو کے جو تذکرے لکھے گئے انھوں نے اُردو میں ادبی تاریخ نویسی، سیرت نگاری اور نقدِ شعر کے آغاز اور فروغ کی راہیں ہموار کیں اور ایسے بے شمار شاعروں کو بے نام و نشان ہونے سے بچا لیا جو بہ صورتِ دیگر قعرِ گمنامی میں کھو گئے ہوتے۔ اور اس کے نتیجے میں تاریخِ ادب کی بہت سی کڑیاں منتشر ہو گئی ہوتیں۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تذکرے مختلف معروف و غیر معروف شاعروں کے بارے میں جو گراں قدر معلومات فراہم کرتے ہیں اور ادبی روایات و اقدار کے نقطۂ نظر سے حال کا رشتہ ماضی کے ساتھ استوار کرنے میں ان کا جو کردار رہا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ان سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ تذکروں کی اہمیت و افادیت کے اس اعتراف کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ تذکرہ نگاروں نے عام طور پر غزل گوئی کو اصل شاعری تصور کرتے ہوئے صرف غزل گو شعراء کے تعارف سے سروکار رکھا ہے اور دوسری اصنافِ سخن کو ذیلی و ضمنی حیثیت دے کر ان کے نمائندہ فن کاروں کو نظر انداز کر دینے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ان تذکروں میں قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ جیسی معروف اور اہم اصنافِ ادب میں ناموری حاصل کرنے والے شعراء میں سے صرف وہی شاعر جگہ پا سکے ہیں جو غزل گوئی کے میدان میں بھی اپنی طباعی کے جوہر دکھانے میں معاصر شعراء سے پیچھے نہیں رہے ہیں یا جنھوں نے مقدار و معیار سے قطعِ نظر اس صنف میں بھی کلام کے کچھ نمونے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ، انیسؔ کے بعد اُردو کے دوسرے بڑے مرثیہ گو شاعر ہیں جن کے کلام کا مطالعہ مختلف فکری، فنی اور لسانی زاویوں سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اس اعتبار سے اُردو کی ادبی تاریخ میں ایک مستقل اور ناگزیر موضوعِ بحث کی حیثیت رکھتا ہے۔ دبیرؔ ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے[1] لیکن کم سنی ہی میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ دہلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہیں رواجِ زمانہ کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہیں تقریباً بارہ سال کی عمر میں انھوں نے شاعری کی ابتدا کی اور میر مظفر حسین ضمیرؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، یہیں انھوں نے مختلف ادبی معرکے سر کر کے اساتذہ اور معاصرین سے اپنی پختہ گوئی اور قادر الکلامی کا لوہا منوایا

یہیں سے ان کی شہرت ہندستان کے گوشے گوشے میں پھیلی اور بالآخر ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۹ مارچ ۱۸۷۵ء کو جبکہ سنہ عیسوی کے مطابق ان کی عمر کا بہترواں سال چل رہا تھا، اسی خاک کی آغوش میں سو کر انھوں نے اپنی داستانِ حیات کا آخری باب مکمل کیا۔

مرزا رجب علی بیگ سرور کی مشہور تصنیف "فسانۂ عجائب" کا پہلا ایڈیشن ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں مطبع حسینی میں چھپ کر شائع ہوا، لیکن اس کا نقش اول ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں تیار ہوچکا تھا۔ اس کتاب میں بیانِ لکھنؤ کے تحت سرور نے جن مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے، ان میں دلگیر، ضمیر، خلیق اور فصیح وغیرہ کے ساتھ دبیر کا نام بھی شامل ہے۔ قرائن کے مطابق یہ اندراج ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) یا اس کے معاً بعد کے تین چار برسوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر حقیقت اس سے مختلف نہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) کے آس پاس دبیر مرثیہ گو کی حیثیت سے لکھنؤ کے نام برآوردہ شعرا میں شمار ہونے لگے تھے۔ "فسانۂ عجائب" کے دیباچے ہی میں سرور نے مرزا محمد رضا برق کے یہاں ہر مہینے شب ماہ میں صحبتِ مشاعرہ کے انعقاد کا ذکر کیا ہے۔ مرزا کلب حسین خاں نادر اور سید افضل حسین ثابت کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ دبیر بھی اس محفل میں شرکت کرتے تھے۔[۲] شہرت و ناموری اور مشاعروں میں شرکت کے متعلق ان باوثوق اطلاعات کے باوجود ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء کے بعد لکھے جانے والے شعرائے اردو کے زیادہ تر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ اس کا سبب بظاہر اس کے علاوہ کچھ اور نہیں معلوم ہوتا کہ دبیر بنیادی طور پر مرثیے کے شاعر تھے جب کہ تذکرہ نگاروں کی محفل میں باریابی کے لیے غزل گوئی شرطِ اوّل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگرچہ شروع میں انھوں نے غزلیں بھی کہی تھیں جن کے چند اشعار اس زمانے کے بعض معتبر ماخذ میں محفوظ بھی رہ گئے ہیں تاہم عام تذکرہ نگاروں کا ان کی غزل گوئی سے بے خبر رہنا اور اس لیے اپنے یہاں ان کا ذکر نہ کرنا کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں جسے غیر ذمہ داری یا بے اعتنائی کا نام دیا جا سکے۔ غلط یا صحیح، تذکرہ نگاروں نے اپنے لیے بعض حدیں مقرر کر رکھی تھیں۔ ان حدوں کے اندر رہتے ہوئے انھوں نے ادب کی جو خدمت انجام دی ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

"خوش معرکۂ زیبا" مؤلفہ سعادت خاں ناصر وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں دبیر کا ذکر آیا ہے۔ "خوش معرکۂ زیبا" تاریخی نام ہے جس سے اس تذکرے کا سالِ آغاز ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ انجام ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں ہوا۔ سال ہجری کتاب کے آخر میں درج مختلف شعرا کے قطعات تاریخ سے اور سال عیسوی اشک کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "تذکرۂ مشرکات" سے معلوم ہوتا ہے۔[۳] اس تذکرے کو ہندستان میں ڈاکٹر شمیم انہونوی نسیم بکڈپو لکھنؤ سے جولائی ۱۹۷۱ء میں اور پاکستان میں جناب مشفق خواجہ مجلس ترقی ادب لاہور سے اپریل ۱۹۷۰ء (جلد اوّل) و مارچ ۱۹۷۲ء (جلد دوم) میں شائع کر چکے ہیں۔

تذکرے عام طور پر حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیے گئے ہیں۔ ناصر نے اس کے برخلاف استادی و شاگردی کے رشتے کو ترتیب کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یعنی پہلے کسی مشہور استاد اور اس کے بعد اس کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ ابتدا مرزا محمد رفیع سودا کے ذکر سے ہوئی ہے جن تک خود مولف کا سلسلۂ شاگردی منتہی ہوتا ہے۔ چونکہ تمام شعرا کا سلسلۂ تلمذ معلوم ہونا ممکن نہیں تھا اس لیے تذکرے کو تین حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ حصۂ اوّل میں ان شاعروں کا ذکر ہے جن کی استادی و شاگردی معلوم ہے۔ دوسرا حصہ ان شاعروں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے جن کی استادی و شاگردی کے متعلق معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ تیسرا حصہ شاعرات سے متعلق ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے مرتب کردہ نسخے کے مقدمے میں مختلف قلمی نسخوں میں

شعراء کی کمی بیشی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی مجموعی تعداد آٹھ سو چوبیس متعین کی ہے [۳] موصوف کا بیان ہے کہ "شعرائے لکھنؤ کے سلسلے میں " خوش معرکۂ زیبا " سے بہتر کوئی مآخذ نہیں "
ناصر نے اپنے ہم عصروں اور ان شعراء کے بارے میں جو اس سے کچھ عرصہ قبل گزر چکے تھے، ایسی معلومات پیش کی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں [۴] " علاوہ بریں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول " معاصرین میں چونکہ بہتوں سے ان کی ملاقات اور دوستانہ مراسم تھے، اس لیے ناصر کے بیانات ان کے سلسلے میں عینی شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں " [۵]

دبیر کا ذکر اس تذکرے میں ان کے استاد میر مظفر حسین ضمیر کے فوراً بعد آیا ہے۔ ناصر نے تذکرہ نگاری کی روایت کے مطابق تخلص اور نام کے اندراج کے بعد دبیر کی جودتِ طبع اور مضمون آفرینی کی تعریف کرتے ہوئے انھیں مرثیہ گوئی میں تمام شعراء سے سبقت لے جانے اور زمین سلام کو فکرِ بلند سے آسمان تک پہنچانے پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے اور ان کے استاد میر ضمیر کے درمیان بے لطفی کی روداد اس طرح بیان کی ہے:

" استاد اور اس میں جو بے لطفی ہے، ایک بزرگ کی زبانی مختصراً اسے بیان کرتا ہوں۔ میاں دبیر اوائل میں ایک مرثیہ اصلاح کے واسطے میر ضمیر کی خدمت میں لائے۔ کہیں کہیں اصلاح دی اور بہت پسند کیا، بلکہ فرمایا کہ یہ مرثیہ ہمیں دو کہ راجہ میوہ رام کے یہاں ہم پڑھیں۔ اس نے کہا کہ بہتر میں بھیج دوں گا۔ دبیر نے اس مرثیہ کی دو نقلیں لیں، ایک بھیج دی اور ایک اپنے پاس رکھی۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ دبیر صاحب نے اس سے کہا کہ اس مرثیے کو راجہ میوہ رام کی مجلس میں نہ پڑھنا۔ قصہ کوتاہ جب مجلس کا دن آیا، میر صاحب مع دبیر تشریف فرما ہوئے۔ مجلس کے گداز کرنے کو دبیر سے کہا: منبر پر جاؤ اور کچھ پڑھو۔ اس ناحق شناس نے سامعین کو ہمہ تن اشک دیکھ کر وہی مرثیہ پڑھا۔ رقت اور تعریف ایسی ہوئی کہ میر ضمیر کے پڑھنے کی گنجائش نہ رہی اور خاتمہ اسی پر ہوا۔"

(جلد اوّل۔ ص ۵۲۴)

تذکرے کے ایک اور قلمی نسخے مخزونہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے مطابق دبیر کے منبر سے اترآنے کے بعد:———

" میر ضمیر نے راجہ کے کہنے سے دو چار بند کسی مرثیے کے پڑھے اور نہایت بے مزا منبر سے اترے۔ بڑھنا میوہ رام کی مجلس میں اور ملاقات دبیر کو برابر ترک کیا۔"

(جلد اوّل حاشیہ ص ۵۲۴)

دبیر اور ضمیر کے درمیان تعلقات کی ناخوش گواری سے متعلق اس واقعے کے بیان کو مشفق خواجہ نے " خوش معرکۂ زیبا" کی اولیات میں شمار کیا ہے [۶] ناصر کو اس اولیت کا فخر حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دبیر کا ذکر کرنے والے سب سے پہلے تذکرہ نگار ہیں۔ جہاں تک اصل واقعے کا تعلق ہے، اسکی صحت میں شبہ کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ جزئیات کے فرق سے قطع نظر افضل حسین ثابت (شاگرد دبیر) کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے [۷]

انتخاب کلام کے تحت ناصر نے سب سے پہلے ایک غزل کا یہ شعر اس صراحت کے ساتھ کہ " اکثر دوستوں سے اس کے نام پر سنا ہے"۔ نقل کیا ہے ؎

مے سے توبہ کی ستم گر نے غضب تو دیکھو
جب کہ تیار مری خاک سے پیمانہ ہوا

دبیر سے قبل ضمیر کے کلام کے تحت بھی اسی زمین میں ایک مطلع نقل کیا جا چکا ہے۔ (ص ۵۲۲)

ممکن ہے اُستاد اور شاگرد دونوں نے ایک ہی طرح میں
غزلیں کہی ہوں۔ ضمیر کا مطلع یہ ہے ؎

تب میسّر مجھے اک بوسۂ جانانہ ہوا
جب کہ میں خاک ہوا، خاک سے پیمانہ ہوا

دبیر کے کلام میں غزل کے مندرجہ بالا شعر کے بعد ایک سلام کے دس اشعار اور ایک رُباعی نقل کر کے ناصر نے ناظرین سے یہ معذرت کی ہے کہ ـــــ

" اور غزل مرزا صاحب کی ہر چند تلاش کی، بجز ایک شعر سابق کے دستیاب نہ ہوئی۔ بہ مجبوری سلام و رُباعی تحریر ہوئے۔"

اس کے بعد ایک رُباعی اور منقول ہے جس کے مصرع اوّل ـــــ "بے فائدہ ہر بند پہ بتلانا ہے" کے حوالے سے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ـــ " اس رُباعی میں طعن ہے میر انیس صاحب پر، کہ وہ اپنے پڑھنے (کے وقت) مرثیے پر ہر بند میں بتلاتے جاتے ہیں۔"
(جلد اوّل ص ۵۲۶)

سید محسن علی محسن لکھنوی ناصر کے بعد دوسرے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے تذکرے "سراپا سخن" میں دو جگہ دبیر کا تذکرہ کیا ہے۔ "سراپا سخن" خود مؤلف کے بیان کے مطابق دس سال کی محنت کے بعد ۱۲۶۹ھ کے آغاز (۱۸۵۲ء) میں مُرتب ہوا۔ اس کے آٹھ برس بعد ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ سے پہلی بار اس کی اشاعت ہوئی۔ بعدازاں ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء اور ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں اسی مطبع سے اس کے دو ایڈیشن اور شائع ہوئے اس کے علاوہ ۱۹۶۷ء میں ہندستان میں ڈاکٹر سید سلیمان حسین اور ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں ڈاکٹر اقتدا حسن اس کی تلخیص بھی شائع کر چکے ہیں۔ تذکرے کے سبب تالیف کے متعلق مؤلف کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں وہ بسلسلہ تجارت کان پور میں مقیم تھے ایک مرتبہ شیخ الٰہی بخش عشقی سے ملاقات کے دوران بر سبیل تذکرہ ناسخ کا یہ مصرعہ سامنے آیا ع

جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں

اور خیال ہوا کہ اگر اسی انداز سے سارے اعضائے جسمانی پر ناسخ کی غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان سراپا کے نام سے مرتب کر دیا جائے، لیکن ناسخ کی عمر نے وفا نہ کی۔ بعدازاں محسن نے مختلف شعرا کا کلام جمع کر کے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ اس تذکرے میں مختلف اعضائے جسمانی کے زیرِ عنوان علاحدہ علاحدہ ایسی غزلیں اور اشعار یکجا کیے گئے ہیں جن میں ان اعضا کے نام بطور ردیف یا جزوِ ردیف نظم ہوئے ہیں اور ہر شاعر کا کلام نقل کرنے سے پہلے اختصار کے ساتھ اس کا تعارف سپردِ قلم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس طرح کسی شاعر کا کلام جتنے عنوانات کے تحت نقل ہوا ہے اتنی ہی بار اس کے حالات بھی نقل کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر محسن نے اس تذکرے میں کل سات سو اکتیس (۷۳۱) شاعروں کے کلام کے نمونے پیش کیے ہیں۔ دبیر کا ذکر "آنکھیں" اور "ہاتھ" کے عنوانات کے تحت دو جگہ آیا ہے اور ان دونوں مواقع پر ان کی ایک ایک رُباعی نقل کی گئی ہے۔ پہلی بار ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ـــــ

" مرثیہ گوئی میں طاق، صف آرائی اور مضمون خیزی میں شہرۂ آفاق، مرزا سلامت علی دبیر ولد مرزا غلام حسین، متعلقان مرزا آغا جان کاغذ فروش باشندہ لکھنؤ، ارشدِ تلامذۂ میر مظفر حسین ضمیر مرثیہ گو۔"
(طبع ثانی، ص ۱۰۸)

دوسری جگہ مزید اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف اس قدر لکھا گیا ہے: ـــــ

" مرزا سلامت علی دبیر مرثیہ گو ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش، باشندہ لکھنؤ، شاگرد میر مظفر حسین ضمیر۔"
(طبع ثانی۔ ص ۲۱۵)

دبیر اور مرزا آغا جان کے تعلق کی نوعیت پوری طرح واضح

نہیں۔ دبیر کے والد مرزا غلام حسین کے جاری کردہ ایک استشہاد مورخہ ۱۱ رجب ۱۲۱۵ھ (۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی سوتیلی ماں کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کی وجہ سے بچپن کے کچھ دن دہلی کے ایک رئیس مرزا فتح علی خاں کے یہاں گزارے تھے۔ رئیس موصوف مرزا غلام حسین کے والد کے ساتھ "صیغۂ اخوت" اور "روابطِ قدیم" رکھتے تھے۔ جب حالات کی ناسازگاری کے باعث وہ مبتلائے عسرت ہوئے تو دہلی سے ترکِ سکونت کرکے لکھنؤ چلے آئے۔ مرزا غلام حسین بھی انہی کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے۔ استشہاد کی تحریر کے وقت مرزا فتح علی خاں کے صاحبزادے فضل علی خاں عرف آغاجان مرزا غلام حسین کے مکان پر سکونت پذیر تھے[۵۹] ان حالات کے پس منظر میں محسن کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دبیر اور ان کے خاندان کو کم حیثیت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے ان بیانات میں انھوں نے پہلی بار مرزا آغاجان کو اور دوسری مرتبہ دبیر کے والد مرزا غلام حسین کو کاغذ فروش قرار دے کر اس معاملے کو مزید الجھا دیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے دبیر کے ذکر میں محسن کے اسی اختلافِ بیان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مصنف موصوف کو شوق ہے کہ ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ نکتۂ طنز کا نکال لیتے ہیں، اسلئے خاندان کے بیان میں نہ یقین ہے نہ شک۔"[۶۰]

شعرائے اردو کا تیسرا تذکرہ جس میں دبیر کا ذکر ملتا ہے عبدالغفور نساخ کا "سخن شعراء" ہے۔ نساخ بنگال کے رہنے والے تھے اور شروع میں قہور تخلص کرتے تھے۔ لکھنؤ کے معاصر شعراء سے چشمک کے بعد انھوں نے ناسخ کے مقابلے میں نساخ تخلص اختیار کیا۔ نثر و نظم میں متعدد تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ "سخن شعراء" ان کے تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۸۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ دیباچے کے مطابق "بارہ برس کی محنت میں یہ تذکرہ تیار ہوا" تھا۔ اس اعتبار سے اس کی ابتدا ۱۲۶۹ھ مطابق ۵۳-۱۸۵۲ء میں ہوئی ہوگی۔ اس کا پہلا اڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۲۹۱ھ مطابق ۷۵-۱۸۷۴ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ تذکرے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) کے بعد بھی متعدد اضافے کیے گئے ہیں۔ شعراء کی مجموعی تعداد دو ہزار چار سو پچاسی (۲۴۸۵) ہے۔ مؤلف نے بقول خود "اشعارِ آبدار میں اطناب و اعجاز اور احوالِ شعراء میں اختصار و ایجاز" سے کام لیا ہے۔ دبیر کے متعلق ان کا بیان ہے کہ:

"دبیر تخلص، مرزا سلامت علی ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش لکھنوی، شاگرد مظفر حسین ضمیر۔ مرثیہ اچھا کہتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ عیوب شاعری سے پاک ہو۔ راقم نے ان کو عظیم آباد میں دیکھا ہے۔"
(ص ۱۵۸)

اس مختصر تعارف کے بعد ایک غزل کے دو شعر نقل کیے گئے ہیں ؎

رواں کرتا تھا خنجر گاہ گاہے روک لیتا تھا!
عجب ناز و ادا سے اس نے کاٹا میری گردن کو
دلا ان تنگ چشموں سے نہ چشمِ مہر تو رکھیو!
کسی کے حال پر روتے نہ دیکھا چشمِ سوزن کو

نساخ نے دبیر کے والد مرزا غلام حسین کو کاغذ فروش لکھا ہے۔ یہ بیان بظاہر تذکرۂ "سراپا سخن" پر جو ان کے مآخذ میں شامل ہے، مبنی معلوم ہوتا ہے۔ دبیر کی شاعری کے بارے میں مؤلف کا یہ قول بھی کہ ـــ "مرثیہ اچھا کہتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ عیوب شاعری سے پاک ہو" ـــ کلام کے منصفانہ تجزیے سے زیادہ شعرائے لکھنؤ کے خلاف ان کی پرخاش کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ انھوں نے میر انیس کے بارے میں بھی کم و بیش انہی الفاظ میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

"سوائے مرثیہ کے اور کسی صنفِ سخن میں مطلق دخل نہیں رکھتے۔ بلکہ مرثیہ بھی ان کا ایسا نہیں

کہ عیوبِ شاعری سے پاک ہو۔" (ص ۵۶)

انیس اور دبیر دونوں کے بارے میں ناسخ نے یہاں مجملاً جو رائے ظاہر کی ہے، اس کی تفصیل کے لیے ان کی تصنیف "انتخابِ نقص" کی طرف رُجوع کیا جا سکتا ہے۔ ۳۲ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ جس میں اُردو کے ان دونوں بڑے مرثیہ گویوں کے کلام کی غلطیاں نکالی گئی ہیں، ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں مطبع نظامی کان پور سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

مرزا کلب حسین خاں نادر، ناسخ کے نامور تلامذہ اور دبیر کے ممتاز معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے نثر اور نظم میں مختلف موضوعات پر متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے مخمسات کا ایک مجموعہ "دیوانِ غریب" بھی شامل ہے، جو اپنے نام کے اعداد کے مطابق ۱۲۸۳ھ (۶۷-۱۸۶۶ء) میں مُرتب ہوا تھا، اور ۱۲۸۴ھ (۶۸-۱۸۶۷ء) میں مطبع "دل کشا" فتح گڑھ میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں نادر کے چند طبع زاد مخمسات کے علاوہ پانچ سو اکیس [۵۲۱] شاعروں کی غزلوں پر ان کی تضمینیں شامل ہیں۔ دیوان میں ہر خمسے کے شروع میں اختصار کے ساتھ اس شاعر کا حال بھی لکھ دیا گیا ہے جس کی غزل پر مصرعے لگائے گئے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے مختلف شاعروں سے متعلق ان تعارفی کلمات کو ہر شاعر کے پانچ پانچ اشعار کے ساتھ یکجا کر کے ۱۹۵۷ء میں "تذکرۂ نادر" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس طرح نادر کی اس تصنیف کو اصلاً تذکرہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک مستقل تذکرے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور یہ تذکرہ اس اعتبار سے اہم بھی ہے کہ اس میں ایسے بہت سے شعراء کے مختصر حالات اور کلام کے نمونے موجود ہیں، جن کا ذکر کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ علاوہ بریں اس کی بدولت ایسے متعدد شعراء کی غزلیں بھی محفوظ رہ گئی ہیں جو غزل گو کی حیثیت سے معروف نہیں۔ مرزا دبیر بھی شاعروں کے اسی دوسرے زمرے میں شامل ہیں۔ نادر نے دبیر کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ صرف چند فقروں پر مشتمل ہے:

"مرزا سلامت علی، سخن سنجِ گرامی، مرثیہ گوئے نامی، متوطن لکھنؤ۔" (ص ۶۶)

البتہ تضمین کے لیے ان کی جس غزل کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کے بارے میں ان کی اطلاع اہم ہے کہ "یہ وہ غزل ہے جو مرزا صاحب نے مشاعرۂ فتح الدولہ میں بہ عہد مرزا غازی الدین حیدر شاہ اودھ کے پڑھی تھی" ___ یہ وہی غزل ہے جس کے دو شعر "سخن شعراء" کے حوالے سے اوپر کی سطور میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ نادر کی اس تحریر سے یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل غازی الدین حیدر کی زندگی میں یعنی ۲۷ ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء سے قبل کہی جا چکی تھی۔ وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دبیر نے اس زمانے تک غزل گوئی اور مشاعروں میں شرکت ترک نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ اس بیان سے مرزا فتح الدولہ برق کے یہاں مشاعروں کے انعقاد کا زمانہ متعین کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

نواب یار محمد خاں شوکت بھوپال کے شاہی خاندان کے ایک فرد اور مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان کی تصانیف میں ایک مختصر تذکرہ "فرح بخش" بھی شامل ہے، جو مطبع نظامی کان پور میں ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸ مارچ ۱۸۷۲ء کو چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ یہ تذکرہ شوکت نے ۱۵ شعبان ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۸۷۰ء کو اپنے زمانے کے "بعض شعرائے نازک خیال" کے اشعار اپنی بیاض سے منتخب کر کے صرف ایک شب میں مرتب کیا تھا۔ انھوں نے اسے چار گلشنوں میں تقسیم کیا ہے۔ گلشنِ اول سے گلشنِ سوم تک بھوپال سے تعلق رکھنے والے ان شاعروں کا ذکر ہے جو (۱) تذکرے کی ترتیب کے وقت بقیدِ حیات تھے اور بھوپال میں مقیم تھے (۲) جو ماضیِ قریب میں وفات پا چکے تھے۔ اور (۳) جنھوں نے بھوپال سے ترک سکونت کر کے کسی اور جگہ بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ان شاعروں کی مجموعی تعداد اکیس [۲۱] ہے۔ گلشنِ چہارم میں مؤلف کے الفاظ میں "تذکرہ ان ادبائے نامدار کا ہے جن کی وجہ سے ہندوستان نقشۂ گلشنِ

بے خار ہے"۔ ان ادبائے نامدار کی کل تعداد صرف پانچ ہے جن میں مرزا غالب، ان کے ایک معروف شاگرد اور نواب صدیق حسن خاں کے بڑے بھائی سید احمد حسن عرشی اور مرزا دبیر کے ساتھ دو غیر معروف و گمنام شاعر والا صاحب اور سید شریف حسین بھی شامل ہیں۔ اس گلشن کی ابتدا غالب سے اور اختتام دبیر پر ہوا ہے۔ دبیر کے بارے میں مؤلف لکھتے ہیں:

"شاعر بے نظیر، قدسی ضمیر، مرزا دبیر سلمہ اللہ القدیر۔ جناب ممدوح کا کلام تمام ہندوستان میں مثل نیر اعظم مشہور ہے۔ میں دو بند مرثیے کے لکھتا ہوں اور اس رسالے کو ختم کرتا ہوں۔ لاَعِطْرَ بَعْدَ العُرُوْس اہلِ عرب میں ضرب المثل ہے، اور بہترین حلویات بقول حضرت امیر عسل ہے"۔

(ص ۷۶)

اس بیان کے آخر میں مرثیے کے یہ دو بند نقل کیے گئے ہیں:

رو دار ہے خورشید پر ابرو نہیں رکھتا
ابرو مہِ نو رکھتا ہے، یہ رُو نہیں رکھتا
قد رکھتا ہے شمشاد، یہ گیسو نہیں رکھتا
سنبل کے ہیں گیسو، قدِ دلجو نہیں رکھتا
گر آنکھ ہے نرگس کے، یہ بینائی نہیں ہے
غنچے کا دہن ہے پہ یہ گویائی نہیں ہے

زہرہ دفِ شادی کو بجاتی ہوئی آئی
شب آئینۂ ماہ دکھاتی ہوئی آئی
نُقلِ اخترِ تاباں کے لٹاتی ہوئی آئی
اور قاضیِ گردوں کو جگاتی ہوئی آئی
نوشاہ کے خلعت کی جو طلعت نظر آئی
سہرا لیے کشتی میں شعاعِ قمر آئی

اس تذکرے میں ایک ادیب نامدار کی حیثیت سے دبیر کی شمولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان کی مرثیہ گوئی مذہبی حلقوں سے نکل کر ادبی حلقوں میں بھی اپنا لوہا منوا چکی تھی اور لکھنؤ سے باہر بھی ایک ایسا حلقہ موجود تھا جس میں وہ انیس سے زیادہ معروف و مقبول تھے۔

"فرح بخش" کے بعد اگلا تذکرہ جس میں ہمیں دبیر کا ذکر ملتا ہے "ارمغانِ گوکل پرشاد" ہے۔ اس کے مولف گوکل پرشاد رسا قصبہ کھجوا ضلع فتح پور کے رہنے والے تھے۔ ان کا یہ تذکرہ منشی بہاری لال کے مطبع 'مطلع نور' واقع کان پور میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ مختلف قطعات تاریخ کی رُو سے اس کا سالِ ترتیب ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۷ء اور سالِ طباعت ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء قرار پاتا ہے۔ 'ارمغانِ گوکل پرشاد' سے ۱۸۷۵ء برآمد ہوتا ہے۔ اس لیے بربنائے قیاس یہ کہا جا سکتا کہ اس کا آغاز ۱۸۷۵ء میں اور اتمام ۱۸۷۷ء میں ہوا ہوگا۔ تذکرہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ شاعروں کے تعارف کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد گیارہ سو دو ہے۔ دوسرے حصہ میں "سراپا سخن" کی طرح محبوب کے سراپا، آرائش و زیبائش زیورات و ملبوسات، حرکات و سکنات اور رفتار و گفتار کی مناسبت سے علٰحدہ علٰحدہ عنوانات کے تحت ان شاعروں کے منتخب اشعار تخلص اور حصۂ اول میں تعارف کے سلسلہ نمبر کے التزام کے ساتھ یکجا کیے گئے ہیں۔ حصۂ اوّل کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے ۱۹۷۵ء میں دوبارہ شائع کردیا ہے اور یہی اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں دبیر کے متعلق مختصراً یہ معلومات فراہم کی گئی ہے:

"مرزا سلامت علی ولد مرزا غلام حسین، مرثیہ گویانِ نامی شہر لکھنؤ سے ہیں۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہیں۔ آپ کے مرثیے چند جلدوں میں مطبع منشی نول کشور میں چھاپے گئے ہیں"۔

اس بیان میں مطبع نول کشور سے چند جلدوں میں مرثیوں کی اشاعت سے متعلق اطلاع کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں۔

ڈاکٹر محمود زماں آزردہ کی تحریر کے مطابق مطبع نول کشور سے دبیر کے مرثیوں کی صرف دو جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ پہلی جلد

دبیر کے انتقال کے صرف نو ماہ بعد دسمبر ۱۸۷۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ میں اور دوسری جلد اس کے تین چار مہینے بعد اپریل ۱۸۷۶ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس کے بعد بھی یہ دونوں جلدیں مرثیوں کی کمی بیشی کے ساتھ اسی مطبع سے کئی بار شائع ہو چکی ہیں [۱۱] لیکن اب تقریباً نایاب ہیں۔

"ارمغانِ گوکل پرشاد" کا دوسرا حصہ ہماری دسترس میں نہیں اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں دبیر کے کتنے اشعار نقل کیے گئے ہیں اور وہ کس صنف یا اصناف سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ اس تذکرے کے مآخذ میں "خوش معرکۂ زیبا"، "سراپا سخن" اور "سخن شعرا" بھی شامل ہیں، اس لیے قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ گوکل پرشاد نے مراثی دبیر کے علاوہ ان تذکروں سے بھی اشعار منتخب کیے ہوں گے۔

"بزمِ سخن" مولفہ نواب علی حسن خاں سلیم، ہماری معلومات کے مطابق شعرائے اردو کا ساتواں تذکرہ ہے جس میں دبیر کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ تذکرہ دبیر کی وفات کے پانچ برس بعد ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں مرتب ہوا اور اس کے اگلے سال یعنی ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں مطبع مفیدِ عام آگرہ میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ اس کی تالیف کے وقت مولف کی عمر صرف چودہ سال تھی اسی لیے لالہ سری رام، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور بعض دوسرے اہلِ علم کا خیال ہے کہ شعرائے فارسی و اردو کے جو تذکرے نواب علی حسن خاں کے نام سے شائع ہوئے ہیں وہ اصلاً ان کی تصنیف نہیں [۱۲] شعرائے فارسی کا تذکرہ "بزمِ سخن" سے بھی دو برس پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ یعنی اس کی تالیف کے وقت مولف کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ مولانا محمد عباس رفعت شیروانی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ "بزمِ سخن" دراصل منشی محمد صابر حسین صبا سہوانی کی تالیف ہے [۱۳]۔ اس تذکرے میں کل چار سو چونتیس شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ دبیر کے متعلق صاحبِ تذکرہ کا بیان درج ذیل ہے:

"مرزا سلامت علی خلف مرزا غلام حسین لکھنوی با ضمیر پیوند تلمذ داشت۔ مرثیہ خوش ترمی گفت بیتے بیش از گفتارش دست نہ داد۔"

(ص ۔ ۴۸)

اس حد درجہ مختصر تعارف میں رسمی معلومات کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاہم تذکرہ نگار نے یہ لکھ کر کہ "مرثیہ خوش ترمی گفت" بالواسطہ طور پر اپنی اس رائے کا اظہار کر دیا ہے کہ دبیر کی غزل ان کے مرثیے کی بہ نسبت کمتر درجہ کی چیز ہے۔ اگلے جملے میں ایک شعر سے زیادہ کلام دستیاب نہ ہونے سے دراصل اشعار غزل کا فراہم نہ ہونا مراد ہے۔ یہ ایک شعر جو نمونۂ کلام کے طور پر اس تذکرے میں نقل کیا گیا ہے، عبدالغفور نساخ کے تذکرے میں نقل شدہ دو اشعار میں سے پہلا شعر ہے اور اس غزل سے تعلق رکھتا ہے جو کلب حسین خاں نادر کے بقول فتح الدولہ برق کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔

شعرائے فارسی کے تذکرے فی الوقت ہمارے دائرہ گفتگو میں شامل نہیں، تاہم یہاں ضمنی طور پر "بزمِ سخن" کے مولف نواب علی حسن خاں ہی کے نام سے شائع شدہ فارسی تذکرے "صبحِ گلشن" کا حوالہ بے محل نہ ہوگا۔ یہ تذکرہ جیسا کہ اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، "بزمِ سخن" سے دو برس پہلے جمادی الاولیٰ ۱۲۹۵ھ مطابق مئی ۱۸۷۸ء میں مرتب و مکمل ہو کر اسی سال مطبع شاہجہانی بھوپال سے شائع ہوا ہے۔ اس تذکرے میں نسبتاً تفصیل کے ساتھ دبیر کے بارے میں یہ معلومات فراہم کی گئی ہے:

"نامش سلامت علی، دراصل ہندو نژاد بود بہ طیب خاطر بہ شرفِ اسلام مشرف شد و مذہب شیعہ اختیار نمود۔ طبعش از اصناف شعر بس کہ مائل بہ مرثیہ گوئی بہ زبان اردو افتاد، در مراثی خود دادِ شاعری علی وجہ الکمال داد۔ غیر میر ببر علی انیس درین فن نظیر خود نہ داشت و احیاناً در زبان فارسی بہ مدحتِ ائمہ آہنگ بری داشت۔ ہمت

بند کاشی را در سلک تضمین کشیدہ و بست و نہم
ماہ محرم سنہ یک ہزار و دوصد و نود و دو از
کش مکشِ ایں دار المحن آرمیدہ"۔

(ص۔ ۱۶۳)

دبیر کا اصلاً ہندو ہونا اور بعد میں مشرف بہ اسلام ہوکر مذہب شیعہ اختیار کرنا یکسر خلاف واقعہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولف کو اس معاملہ میں دبیر اور دلگیر کے درمیان التباس ہوا ہے اور انھوں نے دلگیر کے قبول اسلام کا واقعہ دبیر سے منسوب کردیا ہے۔ اس غلط بیانی سے قطع نظر "صبح گلشن" کے مؤلف کو مرزا صاحب کی تاریخ وفات کے اندراج کے نقطہ نظر سے اُردو اور فارسی کے تمام تذکرہ نگاروں میں شرف اولیت حاصل ہے۔ ہمارے علم کے مطابق اس سے قدیم تر کوئی ایسا تذکرہ موجود نہیں جس میں دبیر کی تاریخ رحلت درج ہو۔ انتخاب کلام کے تحت صاحب تذکرہ نے صرف "ہفت بند کاشی" کی متذکرہ بالا تضمین کے چار بند نقل کیے ہیں۔ یہ تضمین بہ شکلِ مخمس ۱۸۲ (ایک سو بیاسی) بندوں پر مشتمل ہے اور رجب ۱۲۸۰ھ (دسمبر ۱۸۶۳ء و جنوری ۱۸۶۴ء) میں "شمس المشرقین" کے نام سے مطبع اودھ گزٹ لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔[۱۴]
اس کے علاوہ "دفتر ماتم" کی انیسویں جلد میں بھی شامل ہے۔

دبیر کے حالات کے بیان میں صاحب "صبح گلشن" سے جس قسم کی غلطی ہوئی ہے اسی نوعیت کا ایک سہو تذکرہ "یادگار ضیغم" میں بھی نظر آتا ہے۔ محمد عبداللہ خاں ضیغم لکھنوی نزیل حیدرآباد کی تالیف ہے اور ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں مطبع گلزار دکن حیدرآباد میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ مؤلف نے بقولِ خود ؏

حدیث زندہ گویم، مردہ در گور

کے مصداق اس تذکرے میں صرف ان شاعروں کا حال اور کلام درج کیا ہے جو ۱۳۰۲ھ (۸۵-۱۸۸۴ء) میں بقید حیات تھے البتہ اگر کسی مرحوم شاعر کا ذکر اس کے کسی شاگرد کے بیان میں آگیا ہے تو مجملاً اس کا حال بھی لکھ دیا گیا ہے۔ دبیر "یادگار ضیغم" کی تالیف سے دس سال پہلے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں وفات پاچکے تھے اس لیے ان کا نام اس تذکرے کی فہرست شعراء میں شامل نہیں لیکن ضمناً ان کے سلسلے کے آٹھ شاعروں کے حالات میں ان کا ذکر موجود ہے۔ ان میں سے صغیر بلگرامی (ص ۲۲۱) میر مہدی حسن عقیل (ص ۲۵۶) مرزا محمد طاہر رفیع ابن مرزا محمد جعفر اوج (ص ۲۹۸) اور مرزا غلام حسین جوش مدراسی شاگرد زکی (ص ۲۹۹) کے حالات میں انھیں صرف مرزا دبیر، مرزا دبیر مرحوم یا مرزا دبیر مرحوم لکھنوی لکھا گیا ہے۔ جب کہ بہادر حسین وحید لکھنوی کے ترجمے میں اُن کا ذکر ان کے پورے نام "مرزا سلامت علی دبیر مرحوم لکھنوی" کے ساتھ آیا ہے (ص ۲۶۳)۔ ان پانچ مقامات کے برخلاف سید بندہ رضا آرزو بلگرامی شاگرد زکی (ص ۲۹) کے حال میں ان کا نام "مرزا ببر علی بیگ دبیر مرحوم" محمد رضا خاں رضا (ص ۱۶۱) کے ترجمے میں "مرزا ببر علی بیگ مرحوم دبیر لکھنوی" اور محمد شکر اللہ خاں رشید لکھنوی (ص ۱۶۲) کے تعارف کے تحت "مرزا ببر علی دبیر مرحوم لکھنوی" بتایا گیا ہے۔ یہ غلطی بہ ظاہر میر انیس کے نام کے ساتھ التباس کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

ضیغم نے متذکرۂ بالا شعراء کے تراجم میں خود مرزا دبیر یا ان کے کسی شاگرد سے ان کے استفادے کے بیان میں کہیں کہیں دبیر کی مرثیہ گوئی کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً آرزو کے حال میں انھیں "اس فن خاص میں اکمل" قرار دیا گیا ہے (ص ۲۹)۔ محمد رضا خاں رضا کے حال میں لکھا ہے کہ:

"مرزا صاحب مرحوم مرثیہ گوئی میں یگانۂ آفاق تھے"۔
(ص ۱۶۱)

بہادر حسین وحید کے حالات میں مرثیہ و سلام میں مرزا صاحب سے مشورۂ سخن کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک استادِ نامی اس فن میں گزرے ہیں"۔

(ص۔ ۲۶۲)

محمد طاہر رفیع کے حالات کے تحت ان کے والد مرزا محمد جعفر اوج کے اپنے پدر بزرگوار مرزا دبیر کے کسب فیض کا ذکر کرتے ہوئے انھیں "مرثیہ گوئی میں مسلم الثبوت" گردانا ہے (ص ۲۹۸) رشید لکھنوی کے حال میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کے بارے میں یہ معلومات فراہم کی گئی ہے :-

" مرزا ببر علی دبیر مرحوم لکھنوی .... مرثیہ گوئی میں طاق شہرۂ آفاق تھے........ مرزا صاحب مرحوم کے علم و فضل اور باکمال ہونے کا اک جہاں معترف ہے، کچھ حاجت بیان نہیں۔ چھ سات برس ہوئے کہ اس جہان سے رحلت کی۔" (ص ۱۶۲)

جیسا کہ اس تذکرے کے تعارف کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ دبیر اس کی تالیف سے پورے دس سال پہلے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں فوت ہوئے تھے، اس لیے ان کی وفات کو چھ سات برس پہلے کا واقعہ قرار دینا درست نہیں۔ تین جگہ نام کے غلط اندراج کے بعد یہ دوسری غلطی ہے جو دبیر کے حالات کے سلسلے میں "یادگار ضیغم" کے مؤلف سے سرزد ہوئی ہے۔

"خمخانۂ جاوید" وہ آخری تذکرہ ہے جس کی طرف رجوع کے ساتھ دبیر سے متعلق تذکروں کی حد تک براہ راست یا معاصرانہ معلومات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ شعرائے اردو کا یہ سب سے ضخیم مگر ناتمام تذکرہ لالہ سری رام دہلوی کی تصنیف ہے۔ انھوں نے اس کا آغاز ۱۸۹۲ء میں کیا تھا۔ سترہ سال کے بعد ۱۹۰۸ء میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی جب کہ پانچویں اور آخری جلد جو ردیف عین کے تحت حرف ثانی "ز" پر ختم ہوتی ہے، مؤلف کے انتقال (۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء) کے بعد منظر عام پر آئی۔ دبیر کا ذکر اس کی تیسری جلد میں آیا ہے۔ سرورق کے اندراج کے مطابق یہ جلد ۱۹۱۷ء میں دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ لیکن مختلف تقریظوں اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۹۱۳ء کے اواخر یا ۱۹۱۴ء کے اوائل میں ہو چکی تھی اور اصل متن ۱۹۱۵ء میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا۔ دبیر کے لیے اس تذکرہ میں کل تیرہ صفحات وقف کیے گئے ہیں۔ ان میں سے سات صفحات سوانح کے لیے اور باقی چھ صفحے انتخاب کے لیے مخصوص ہیں۔ دو ہزار چھ سو سے زائد شعرا کے حالات پر مشتمل اس تذکرے میں جن لوگوں کا حال اس قدر تفصیل سے لکھا گیا ہے، ان کی تعداد بہت محدود ہے۔ تعارف کے آغاز میں سب سے پہلے جلی حروف میں "امام کعبۂ بلاغت ناظم عطارد تحریر، مرزا سلامت علی دبیر مرحوم" کا عنوان قائم کیا گیا ہے بعد ازاں "خم خانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی" کے ذیلی عنوان کے تحت مرزا صاحب کے خاندانی و ذاتی حالات تحریر کیے گئے ہیں لیکن سات صفحات کے اس خاصے مفصل بیان میں کوئی ایسی بات نہیں جو منشی افضل حسین ثابت لکھنوی کی تصنیف "حیات دبیر" میں موجود نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "خم خانۂ جاوید" کے لیے دبیر کے حالات بھی املاً ثابت لکھنوی ہی نے لکھے ہیں۔ لالہ سری رام نے ان کی تحریر کے آخر میں جن چند جملوں کا اضافہ کیا ہے، وہ یہ ہیں :-

" آپ کے صاحبزادے حضرت اوج بڑے باکمال مرثیہ گو ہیں۔ ان کی خدمت میں راقم کو بمقام لکھنؤ دوبارہ نیاز حاصل ہوا تھا۔ ہنگام ملاقات حضرت نے بہ کمال توجہ جناب دبیر کے حالات بھی سنائے تھے۔"

(ص ۱۵۸)

اس کے بعد فاضل مؤلف نے ثابت لکھنوی کی اعانت کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں لکھا ہے :-

" مندرجہ بالا حالات کے لیے راقم منشی افضل حسین ثابت کا مشکور ہے جنھوں نے ایک پورا رسالہ موسوم "خم خانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی" مرزا دبیر کے حالات میں بھیج کر "خم خانۂ جاوید" سے اپنی دل چسپی کا ثبوت دیا۔"

(ایضاً ص ۱۵۸)

اس بیان سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ دبیر کے اس تعارف کے آغاز میں جو ذیلی عنوان (خم خانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی)

[illegible] گیا ہے، وہ بھی دراصل ثابت ہی کا تجویز کردہ ہے۔ اس انکشاف کے بعد مشترک بیانات کے سلسلے میں "حیاتِ دبیر" مجد بار حسین اور "سبع مثانی" کے دیباچے کے ساتھ "خم خانۂ جاوید" کا حوالہ تو ضرور دیا جا سکتا ہے لیکن کسی معمولی جزوی اختلاف کی صورت میں یہ کہنا کہ مؤلف "خم خانۂ جاوید" نے ثابت کے بیان پر یہ اضافہ کیا ہے، یا کسی روایت کے متعلق یہ بیان کہ افضل حسین ثابت اور لالہ سری رام دونوں اس کے ناقل ہیں، قطعاً درست نہیں۔

"خم خانۂ جاوید" میں مختلف اصناف سے دبیر کے کلام کے جو نمونے پیش کیے گئے ہیں، ان میں مختلف مرثیوں کے سولہ[16] مکمل بند اور رشحات متفرق اشعار، انیس[19] رباعیاں، پندرہ[15] اشعار پر مشتمل دو غزلیں اور تین سلاموں کے چودہ[14] منتخب شعر شامل ہیں ان میں سے ایک غزل کی پیشانی پر "غزل کمیاب مرزا دبیر منقول از مجموعۂ مرسلہ" کے اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ثابت کے لکھے ہوئے اس رسالہ کے ساتھ دبیر کا کلام بھی منسلک تھا۔ لیکن پیش کردہ کلام میں خود لالہ سری رام کے پسندیدہ اشعار بھی شامل ہیں، اس لیے متن اور انتساب دونوں ہی کے نقطۂ نظر سے اس کی صحت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ فی الوقت اس سلسلے میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس انتخاب میں کم از کم دو ایسی رباعیاں ضرور شامل ہیں جو دبیر کی نہیں، انیس کی تصنیف ہیں۔ یہ دونوں رباعیاں درج ذیل ہیں ؎

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پر گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں، بُو تیری ہے

دل کو مرے شغل غم گساری کا ہے
غفلت میں (بھی) طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرّہ!
ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

اسی طرح مرثیے کے ایک منتخبہ بند کے پہلے دو شعر صفحہ ۱۶۱ کی سطر ۱۷، ۱۸ پر نقل ہوئے ہیں اور ٹیپ کی بیت چھ سطروں کے فرق سے صفحہ ۱۶۲ سطر ۴ پر لکھی گئی ہے۔ درمیان کی ان چھ سطروں پر بغیر کسی فصل کے تین رباعیاں منقول ہیں۔

ایک اہم اختلاف جو اس تذکرے اور دوسرے معتبر مآخذ کے درمیان پایا جاتا ہے اور بہ طور خاص قابل ذکر ہے۔ وہ دبیر کی تاریخ وفات سے تعلق رکھتا ہے۔ "خم خانۂ جاوید" کے مطابق انھوں نے ۳ محرم ۱۲۹۲ھ کو انتقال کیا، جب کہ ثابت لکھنوی نے اپنی تمام تحریروں میں مرزا صاحب کی تاریخ رحلت ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ لکھی ہے[16] ڈاکٹر اکبر حیدری[17]، ڈاکٹر محمد زماں آزردہ[18] اور جناب کاظم علی خاں[19] نے اپنے تحقیقی مقالات اور مضامین میں اسی تاریخ (۳۰ محرم) سے اتفاق کیا ہے۔ ان شواہد کی بنیاد پر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ "۳ محرم" اصلاً ۳۰ محرم کی تصحیف ہے اور اس کے لیے بظاہر ثابت لکھنوی یا لالہ سری رام کے بجائے کاتب تذکرہ ذمہ دار معلوم ہوتا ہے۔

ثابت لکھنوی کو متذکرہ بالا تاریخ وفات کی صحت پر اس حد تک اصرار ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد کے بیان کی تردید کو ضروری خیال کرتے ہوئے نہایت باوثوق انداز میں لکھا ہے کہ:

"مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب نے ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو انتقال فرمایا، مگر صحیح یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ کو رحلت کی۔"[19]

جناب کاظم علی خاں نے بھی اپنے ایک مضمون میں نہایت مدلل بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مرزا دبیر کی صحیح تاریخ وفات سہ شنبہ، ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۹ مارچ ۱۸۷۵ء ہے[21]۔ دبیر سے متعلق تلاش و تحقیق کے معاملے میں سند کی حیثیت رکھنے والے متذکرہ بالا اصحاب کے اس متفق علیہ فیصلے کے باوجود اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ صحیح نہیں۔ ثابت لکھنوی نے اس سلسلے میں اپنی تمام تحریروں میں منیر شکوہ آبادی (شاگرد دبیر) کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "یگانہ سلخ و سہ شنبہ مرغ ایزدی" اور عبدالعلی آسی مدراسی کی کہی ہوئی

تاریخ کے ایک مصرعے "سلخ محرم آمدہ روز رحلتِ او" سے استدلال کیا ہے۔ ان دو تاریخوں کے علاوہ سید حسن لطافت لکھنوی کے قطعۂ تاریخ کے پہلے مصرعے "روز سہ شنبہ تھا اور سلخ محرم، وقتِ صبح" اور مرزا محمد جعفر اوج (فرزند دبیر) کی ایک رباعی کے مصرعِ ثانی "تھا سلخ کو غرۂ محرم اپنا" سے بھی ماہ محرم کے آخری دن رحلت کی تائید ہوتی ہے [۲۱] لیکن یہ فیصلہ کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی کہ اس دن حتمی طور پر مہینے کی تیسویں تاریخ تھی، انتیسویں نہیں، اس کے برخلاف "اودھ اخبار" کے ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء مطابق یکم صفر ۱۲۹۲ھ کے شمارے میں "جناب مرزا دبیر صاحب کی وفات" کے زیرِ عنوان نہایت واضح لفظوں میں یہ اندراج موجود ہے کہ "منگل کی اخیر شب کو یعنی ۲۹ محرم کو یہ حادثہ واقع ہوا" [۲۲]۔ اسی اخبار کے اگلے شمارے مورخہ ۱۴ مارچ ۱۸۷۵ء میں مختصر سوانح عمری حضرت دبیر مغفور" کے تحت یہ بیان کیا گیا ہے کہ "۲۹ محرم کو عاشق حسین نے اس دار فانی سے کوچ فرمایا اور رونق افزائے دار البقا ہوئے" [۲۳] مزید برآں منشی فدا علی فارغ کے ایک قطعۂ تاریخ سے بھی جو "اودھ اخبار" ہی کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا، یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی وفات محرم کی ۲۹ تاریخ کو ہوئی تھی۔ اس قطعہ کے دو ابتدائی اشعار درج ذیل ہیں ؎

انتیسویں کو ماہ محرم کی چرخ نے
کیا لکھنؤ میں فتنۂ ماتم بپا کیا
یعنی کہ نقشِ ہستیٔ مرزا دبیر کو
حرفِ غلط کی طرح سے اس نے مٹا دیا [۲۴]

مؤلف "صبح گلشن" اور مولانا محمد حسین آزاد کے بیانات گزشتہ سطور میں نقل کیے جا چکے ہیں، ان سے بھی ۲۹ محرم ہی کی توثیق ہوتی ہے۔ ۳۰ محرم کی تائید میں قدیم ترین بیان ثابت لکھنوی کا ہے لیکن یہ مرزا صاحب کی وفات کے ۳۷، ۳۸ سال بعد پہلی بار ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں قلم بند کیا گیا ہے [۲۵] اس لیے معاصر شہادتوں بالخصوص "اودھ اخبار" کے اندراجات کے مقابلے میں کسی طرح قابلِ ترجیح نہیں۔ بحث کا ماحصل یہ ہے کہ مرزا دبیر کی تاریخ وفات سہ شنبہ ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۹ مارچ ۱۸۷۵ء ہے۔ تقویم کی رو سے اگر ان تاریخوں کی مطابقت میں دو دن کا فرق واقع ہوتا ہے تو یہ چنداں اہم نہیں، معاصر شہادتوں کی بنیاد پر اس تخمینی حساب کو بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

"آبِ حیات" کی اشاعت کے بعد بھی اگرچہ تذکرہ نگاری کا سلسلہ جاری رہا اور "خم خانۂ جاوید" جیسے اہم تذکرے کے علاوہ کئی اور تذکرے بھی لکھے گئے ہیں لیکن مرزا دبیر کے حالات و کلام کے مطالعہ میں ان سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ بعد کے ان تذکرہ نگاروں میں سے جن لوگوں نے دبیر کا ذکر کیا ہے انھوں نے بالعموم وہی باتیں دہرائی ہیں جو ان کے پیش رو تذکرہ نگار اپنے تذکروں میں لکھ چکے ہیں یا جن کی مکمل تفصیلات ثابت لکھنوی کی تصانیف میں موجود ہیں، اس لیے اس گفتگو کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

(شیعہ کالج لکھنؤ کے دبیر سیمینار میں پڑھا گیا)

حواشی

۱ "حیاتِ دبیر" مصنفہ سید افضل حسین ثابت لکھنوی۔ مطبوعہ اسٹیم پریس لاہور (۱۹۱۳ء) جلد اول، صفحات ۱ و ۲۰۔ "سبع مثانی" مرتبہ سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ (۱۹۳۰ء) دیباچہ ص ۹

۲ "تذکرۂ نادر" مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی (۱۹۵۷ء) ص ۶۶۔ و "سبع مثانی" دیباچہ ص ۲۳

۳ عیسوی تاریخ "تذکرہ شعرا" محسن لکھنوی نے اپنے تذکرے "سراپا سخن" (طبع ثانی ۱۸۷۵ء ص ۳۲۴) میں درج کی ہے۔

۴ "خوش معرکۂ زیبا" مرتبہ مشفق خواجہ، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۷۰ء) جلد اول مقدمہ مرتب ص ۸۴

۵ ایضاً "خوش معرکۂ زیبا" جلد اول، مقدمہ مرتب ص ۸۱

۶ "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور (نومبر ۱۹۷۲ء) ص ۳۳۷

۷ "خوش معرکۂ زیبا" جلد اول، مقدمہ مرتب ص ۶۸

۸ "حیاتِ دبیر" جلد اول، ص ۳۲ تا ۳۵ و "سبع مثانی (دیباچہ)
صفحات ۱۹ و ۲۰

۹ تفصیل کے لیے دیکھیے "حیاتِ دبیر" جلد اول صفحات ۷ تا ۹

۱۰ "آبِ حیات" مطبوعہ نول کشور پریس، لاہور (۱۹۰۷ء) حاشیہ ص ۴۱۵۔ مولانا آزاد نے محسن کے بیانِ ثانی کے حوالے سے دبیر کے والد کا نام مرزا آغا جان لکھ دیا ہے (ان کے والد مرزا آغا جان کاغذ فروش تھے) جو یکسر خلاف واقعہ ہے اور بہ ظاہر کسی غلط فہمی یا سہو کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

۱۱ "مرزا سلامت علی دبیر" مطبوعہ سری نگر، طبع اول ۱۹۸۱ء ص ۳۶۷

۱۲ "خم خانۂ جاوید" جلد چہارم ص ۲۴۱ و "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" ص ۹۰۳

۱۳ "بیاضِ رفعت" (قلمی، مملوکہ جناب کالی داس گپتا رضا) بحوالہ ماہنامہ "شاعر" بمبئی جلد ۵۲۔ شمارہ ۵، ۶ بابت ۱۹۸۱ء ص ۴۳

۱۴ اس اطلاع کے لیے راقم السطور مکرمی ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کا ممنون ہے

۱۵ "حیاتِ دبیر" جلد اول، صفحات ۱، ۴۶، ۱۲۹ و "سبع مثانی" (دیباچہ) صفحات ۹، ۱۴

۱۶ "تحقیقی نوادر" شائع کردہ اردو پبلشرز لکھنؤ، مطبوعہ ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۳۶۔

۱۷ "مرزا سلامت علی دبیر" ص ۱۵۰

۱۸ "تلاشِ دبیر" مطبوعہ لکھنؤ (دسمبر ۱۹۷۹ء) صفحات ۲۰ و ۷۷

۱۹ "حیاتِ دبیر" ص ۲۶

۲۰ "تلاشِ دبیر" صفحات ۱۹ تا ۲۱

۲۱ لطافت کے اس قطعے اور اوج کی رباعی کے لیے ملاحظہ ہو "تحقیقی نوادر" از ڈاکٹر اکبر حیدری صفحات ۳۴۰ و ۳۴۱

۲۲ بحوالہ "تحقیقی نوادر" ص ۳۳۷، "مرزا سلامت علی دبیر" ص ۱۵۲ و "سہو و سراغ" از کالی داس گپتا رضا، مطبوعہ بمبئی (جنوری ۱۹۸۰ء) صفحہ ۱۶۳

۲۳ بحوالہ "مرزا سلامت علی دبیر" صفحہ ۱۵۱، "تحقیقی نوادر" صفحہ ۳۳۹ و "سہو و سراغ" صفحات ۱۶۳-۱۶۴

۲۴ بحوالہ "تحقیقی نوادر" صفحہ ۳۴۲

۲۵ ثابت لکھنوی نے یہ تاریخ سب سے پہلے "حیاتِ دبیر" میں درج کی ہے۔ یہ کتاب دیباچے کی ابتدائی تاریخِ تحریر کے مطابق ۹؍ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ (۱۹؍ دسمبر ۱۹۱۲ء) سے کچھ پہلے مکمل ہوئی تھی۔ ●●

نفیس علی شفق دیوبندی

غزل

ادھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا
انھیں ہر بہانے مگر دیکھ لینا

جفاؤں پہ اک روز ہوں گے وہ نادم
وفاؤں کا میری اثر دیکھ لینا

ہر آہٹ پہ یہ مشغلہ تھا سحر تک
کبھی در کبھی رہ گزر دیکھ لینا

نہ بچے کوئی تو مجھ کو الزام دینا
تم اندازِ برقِ نظر دیکھ لینا

تمنائے پرواز کرنے سے پہلے
ذرا قوتِ بال و پر دیکھ لینا

شفق بات کرنے سے پہلے ہے لازم
عیارِ دماغِ بشر دیکھ لینا

ڈاکٹر اختر بستوی
لیکچرر گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور

رُخِ جہاں پہ جو دیکھی ہے بے بسی میں نے
صلیبِ غم پہ چڑھا دی ہے ہر خوشی میں نے

کسی چراغ کی گویا میں سطحِ زیریں ہوں
کہ نور بانٹ کے پائی ہے تیرگی میں نے

یہ بازگشت نہ ہو زندگی کے صحرا کی!
صدا جو دل سے ابھرتی ہوئی سُنی میں نے

بنا کے تاج محل مقبرہ پہ اُلفت کے
شکستِ خواب سے تکمیلِ خواب کی میں نے

پلٹ نہ آؤں کہیں علم کے جزیرے سے
وہاں یہ سوچ کے کشتی ہی پھونک دی میں نے

ہزار سمت سے پھوٹا جنوں کی صورت میں
دبا کے دیکھ لیا جوشِ آگہی میں نے

نشیب جن کے مقدر میں تھا انھیں اختر
بلندیوں سے پکارا کبھی کبھی میں نے

نور کی موجیں ہیں یوں احساس کے ظلمات میں
جیسے جمنا میں دیے تیریں اندھیری رات میں

ڈس کے بے سُدھ ہو گئیں دل کو ہوس کی ناگنیں
زہرِ بے لطفی کا باقی رہ گیا جذبات میں

سرزمینِ حُسن سے بھی سنگ کا تحفہ ملا!
چاند سے بھی چند پتھر آئے ہیں سوغات میں

صبح جو شہروں میں پژمُردہ سی آتی ہے نظر
تازگی اُس کی ذرا دیکھے کوئی دیہات میں

کیوں اکیلے پن کا ہو اہلِ تصوّر کو گلہ
انجمن خوابوں کی ہے تنہائی کے لمحات میں

مجھ کو جس دشمن کی تھی باہر کی دُنیا میں تلاش
پا لیا میں نے اسے آخر خود اپنی ذات میں

اب تو اے اختر یہی گفتار کی معراج ہے
سیکڑوں معنی چھپے ہوں ایک مہمل بات میں

نکہت ابرار
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عظیم مجاہدِ آزادی:
راجہ مہیندر پرتاپ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جہاں تعلیمی اور ثقافتی میدان میں ملک کی شان دار خدمت انجام دی ہے وہیں اس نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ایسے عظیم مجاہد پیدا کیے ہیں جن کے نام ہندستان کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے۔ انھیں مجاہدوں میں ایک قابلِ قدر نام راجہ مہیندر پرتاپ کا بھی ہے جو بذات خود ایک ادارہ تھے، ایک واقعہ سے زیادہ ایک تاریخ تھے۔ ان کی زندگی جدوجہد اور قربانی کی ایک زندہ کہانی ہے۔ وہ پہلے ہندستانی تھے جنھوں نے سب سے پہلے اپنی جاگیر کو ٹھکرایا اور انگریز سرکار کے خلاف ایک باغی کا روپ لے کر ملک کو آزاد کرانے کے لیے نکل پڑے۔

راجہ مہیندر پرتاپ ۱۸۸۶ء کو مرسان (علی گڑھ) میں پیدا ہوئے اور تین سال کی عمر میں ہاتھرس کے راجہ ہرنام سنگھ نے ان کو گود لے لیا اور آٹھ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۹۴ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل کرایا گیا، جہاں ان کی تمام تر تعلیم اسی ادارے میں رہ کر ہوئی۔ جناب اشرف علی اور میر ولایت حسین جیسے استادوں کا ان کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ یہاں رہ کر انھوں نے مسلم تہذیب اور اسلام کی خوبیوں کو سمجھا اور مسلمانوں سے اچھے تعلقات قائم رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک میں ان کا شان دار استقبال کیا گیا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے سرسید تحریک کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کی پوری زندگی پر سرسید تحریک کی گہری چھاپ تھی۔ ایک مرتبہ بورڈنگ ہاؤس میں جب ان کے بڑے بھائی ان سے ملنے آئے تو وہ انگریز پولیس افسر سے ملاقات کرانے کے لیے راجہ صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے مگر راجہ جی نے اپنے بھائی کی طرح اس انگریز پولیس افسر کی تعظیم میں سر نہیں جھکایا بلکہ ہاتھ بڑھا کر اس کے ساتھ مساوی سلوک کیا۔

ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈر ماریسن سے بھی ان کے نظریاتی اختلافات تھے کیونکہ مسٹر ماریسن طلبا کے سیاسی تحریک میں حصہ لینے کے سخت خلاف تھے۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر ماریسن حکومت برطانیہ کے مفاد کو زیادہ ترجیح دیتے تھے اور اس سلسلے میں بہت ہی حساس اور جذباتی واقع ہوئے تھے جبکہ راجہ مہیندر پرتاپ غیر ملکی تسلط کے سخت خلاف تھے۔

راجہ مہیندر پرتاپ نے اپنی ہی طرح کے سوچنے والوں کے ساتھ مل کر آزادی کی ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی مجاہد آزادی کے لیے مشعل راہ بن گئی۔ وہ آزادی کے دیوانے تھے۔ اس دیوانگی میں انھوں نے اپنی عیش و آرام کی زندگی کو ترک کر دیا اور آزادی کی ایسی مشعل جلائی، جس کی مثال جنگِ آزادی کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔

سرسید کی طرح انھوں نے بھی ۲۴ مئی ۱۹۰۹ء کو متھرا کے قریب بندرابن میں ایک اسکول قائم کیا جو آزاد قومی تعلیمی ادارے کے روپ میں بہت مقبول ہوا۔ اس اسکول میں صنعتی اور تکنیکی تعلیم کی مفت سہولت تھی۔

اسکول کے قیام کے لیے انھوں نے ۲۵ ہزار روپیہ کے عطیے کے ساتھ ہی اپنی ریاست کے پانچ مواضعات کی آمدنی سے ایک ٹرسٹ بنایا اور اس اسکول کا نام "پریم ودیالیہ" رکھا۔ اس اسکول کی تعریف کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے ایک جگہ کہا ہے کہ،

" ۱۹۱۵ء سے راجہ مہیندر پرتاپ کے لیے میرے دل میں بہت قدر پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے بھی پہلے جب میں افریقہ میں مقیم تھا تو مجھے راجہ مہیندر پرتاپ کی عظمت کے بارے میں پتہ چلا۔ جب میں بندرابن آیا اور میں نے جب اس عظیم ادارے کو دیکھا تو ان کے لیے میرے دل میں اور بھی زیادہ قدر بڑھ گئی۔ ان کی قربانی اور قومیت دونوں ہی ناقابل فراموش ہیں۔"

۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں منعقد جب کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے خسر نے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ " اگر اس اجلاس میں شرکت کی تو جند کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے"۔ لیکن انھوں نے کانگریس کے اجلاس میں شرکت کو زیادہ عزیز سمجھا۔ یاد رہے کہ ان کی شادی طالب علمی کے زمانے میں ہی جند (پنجاب) کے مہاراجہ رنبیر سنگھ کی چھوٹی بہن سے ہوئی تھی۔ جند کے مہاراجہ دوسرے راجاؤں کی طرح انگریزوں کے وفادار تھے۔

راجہ مہیندر پرتاپ کو جب یقین ہو گیا کہ آزادی کی جدوجہد صرف ہندستان میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر کی جانی چاہیے تو انھوں نے ۱۹۱۴ء میں سات سمندر پار تحریک آزادی کو حقیقی روپ دینے کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کا آغاز کیا۔ اپنی زندگی کے ۳۲ سال انھوں نے ملک سے باہر گزارے اور اس غیر ملکی سفر کی لمبی مدت میں وہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آزادیٔ ہند کا پیغام لے کر گھومتے رہے اور اس طرح پانچ مرتبہ پوری دنیا کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران انھوں نے قیصر جرمنی، افغانستان کے شاہ امان اللہ خاں، روسی انقلاب کے عظیم لیڈر لینن، چین کے چیانگ کائی شیک، ترکستان کے سلطان رشید، تبت کے چیف لاما فاگ فالہ وغیرہ سے ملاقات کی۔

اس غیر ملکی سفر کے دوران انھوں نے پہلی جنگ عظیم اور روسی انقلاب کا بھی بہت گہرائی سے مطالعہ کیا۔ جرمن حکومت نے ان کا استقبال ہندستان کے ایک انقلابی لیڈر کے روپ میں کیا تھا۔ شہنشاہ قیصر سے ملاقات کے بعد راجہ جی کو برلن کے سفیر کی حیثیت سے افغانستان بھیجا گیا اور مولوی برکت اللہ بھوپالی جو جرمن یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے، وہ بھی ان کے ساتھ افغانستان گئے۔

افغانستان میں راجہ مہیندر پرتاپ نے اپنی یوم سال گرہ کے موقع پر یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو جلاوطنی کی زندگی میں آزاد ہندستان کی حکومت کا اعلان کر دیا اور اس کے وہ خود صدر جمہوریہ مقرر ہوئے۔ مولوی برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم اور مولانا عبیداللہ سندھی کو وزیر داخلہ بنایا گیا۔ اس آزاد ہندستان کی حکومت کے قیام کے بعد انھوں نے افغانستان کے شہنشاہ سے ایک معاہدہ بھی کیا۔

انھوں نے ۱۹۱۸ء میں ترکستان کے قاسم بیگ اور مولوی برکت اللہ بھوپالی کے ہمراہ روس میں لینن سے ملاقات کی اور ہندستان کی مکمل آزادی کے لیے تعاون کی درخواست کی۔ لینن سے ملاقات کے بعد وہ افغانستان لوٹ آئے اور انھوں نے افغانستان کے شہنشاہ پر روس کی حکومت کو تسلیم کیے جانے کا دباؤ ڈالا کیونکہ افغانستان کے حکمرانوں پر ان کا بہت گہرا اثر تھا۔ افغانستان دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے روس کو سب سے پہلے تسلیم کیا۔ آج روس اور ہندستان کے درمیان جو تعلقات ہیں وہ راجہ مہیندر پرتاپ کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہیں جسے بعد میں پنڈت جواہر لال نہرو، مسز اندرا گاندھی، اور اب جناب راجیو گاندھی مزید مستحکم بنا رہے ہیں۔

راجہ مہیندر پرتاپ اور مولوی برکت اللہ امریکہ بھی گئے جہاں انھوں نے غدر پارٹی کے لیڈران سے ملاقات کی اور اس پارٹی کے جلسوں کو خطاب بھی کیا۔ امریکہ میں قیام کے دوران مولوی برکت اللہ بھوپالی نے "اسلام کا اسلحہ" نام کا ایک اخبار

[illegible] میں ہی ان کا انتقال ہوگیا اور وہیں مدفون بھی ہوئے۔

راجہ جی نے وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے نامور افراد کو خطوط لکھے، اخبار نکالے اور کتابیں لکھیں۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں "ورلڈ فیڈریشن" نام کا ایک اخبار نکالا جس کا مبہم خاکہ تہران (ایران) میں بنایا اور اس منصوبہ کو تحریری شکل ماسکو (روس) میں دی گئی اور یہ اخبار امریکہ، چین اور جاپان سے ایک ساتھ شائع ہوا، بعد میں ۱۹۴۶ء میں اس اخبار کو ہندستان سے دوبارہ جاری کیا گیا۔

انھوں نے مختلف موضوعات پر تین درجن سے زائد کتابیں لکھی ہیں، اس کے علاوہ چار اخبارات کی ادارت بھی کی جن میں دو انگریزی کے اور دو ہندی کے تھے۔

وہ اکبر بادشاہ کے "دینِ الٰہی" کی طرح ایک نیا مذہب بھی چلانا چاہتے تھے اور اس مذہب کا نام انھوں نے "دینِ محبت" رکھا۔ دینِ محبت کا بنیادی مقصد تمام مذاہب کے درمیان میل ملاپ اور مساوات کو اجاگر کرنا تھا۔ وہ فرسودہ رسم و رواج کے خلاف تھے اور ہریجنوں کو مساوی درجہ دینے کے قائل تھے۔ کرشن جی کی جنم بھومی بندرابن کے مندر میں جب وہ داخل ہو رہے تھے تو مندر کے پجاری نے پوچھا کہ تم کون ہو، جس پر انھوں نے اپنے کو ہریجن بتایا۔ ہریجن بتانے پر ان کو روک دیا گیا، کیونکہ اس مندر میں ہریجنوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر کچھ دیر بعد ہی پجاری کو حقیقت کا علم ہوا اور ان سے مندر میں جانے کی درخواست کی۔ تب انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ "میں ایسے بھگوان کے درشن کرنا نہیں چاہتا جہاں انسان، انسان کے درمیان تفریق ہو!"۔

راجہ مہندر پرتاپ نے قومی یکجہتی کے ساتھ ہی عالمی برادری کا ایک نیا فلسفہ پیش کیا۔ وہ پوری دُنیا کو ایک ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے تاکہ جنگ کے خطرات سے تمام ملکوں کو بچایا جا سکے۔ ہندستان کو وہ ایک آریائی صوبہ بنانا چاہتے تھے۔

بتیس سال کی جلاوطنی کے بعد جب وہ ۹ راگست ۱۹۴۶ء کو اپنے مادرِ وطن واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ملک تشدد اور فرقہ واریت کی آگ میں بُری طرح جھلس رہا تھا۔ انھوں نے ملک کی یہ حالت دیکھ کر عوام کو امن و محبت سے رہنے کا مشورہ دیا۔

راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی مادرِ درس گاہ کو ہمیشہ عزیز رکھا وہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور بزرگ ترین اولڈ بوائے ہونے کی وجہ سے ان جلسوں کی صدارت بھی فرماتے تھے۔ پروفیسر علی محمد خسرو صاحب کے دورِ وائس چانسلری میں یونیورسٹی کی صد سالہ تقریبات کا اہتمام کیا گیا تو اس میں راجہ مہندر پرتاپ آخری بار شریک ہوئے اور انھوں نے آخر دم تک مسلم یونیورسٹی سے اپنے دیرینہ تعلق کو برقرار رکھا۔

غزل

اَختر عُمَر

لفظ آغاز انتہا تو نہیں
یہ تبسّم بھی حادثہ تو نہیں

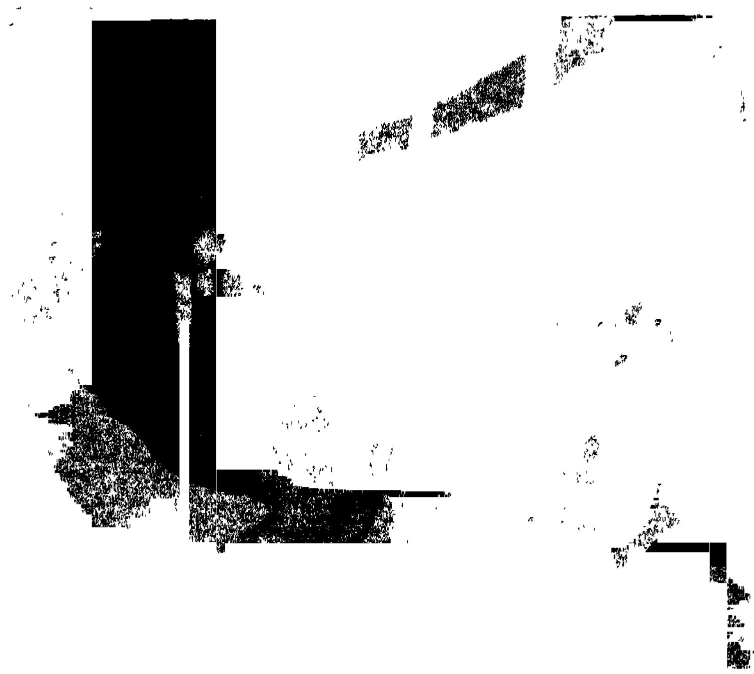
وہ فقط حرف دیکھ لیتا ہے
لکھنا پڑھنا وہ جانتا تو نہیں

لوگ ایک سمت کیوں پھسلتے ہیں
کائی پر شہر یہ بسا تو نہیں

دُھوپ نے بخش دی سیاہ بختی
کائی کا رنگ اب ہرا تو نہیں



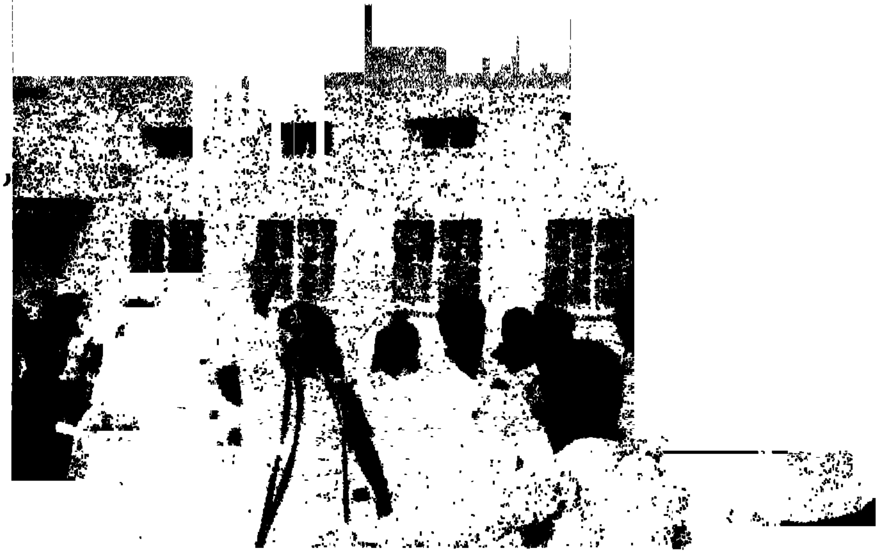
وزیر اعظم شری راجیو گاندھی یکم اگست کو کملا نہرو اسپتال الہ آباد میں آنجہانی کملا نہرو کے ۸۸ ویں یوم پیدائش
کے موقع پر، دیپ جلاکر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔



وزیر اعظم
شری راجیو گاندھی
کی
الہ آباد آمد
پر
عوام اُن کا
پرتپاک
خیر مقدم
کرتے ہوئے

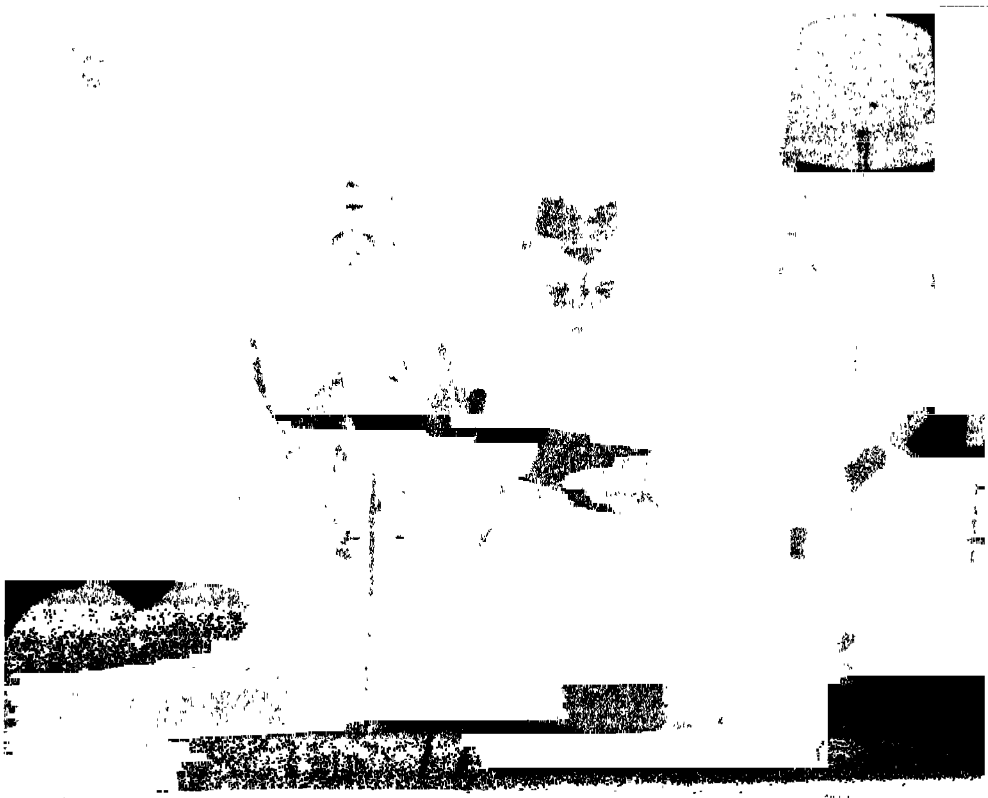


گورنر اتر پردیش جناب محمد عثمان عا
وفد سے محوِ گفتگو ہیں ۔ وفد شرکر
جنید صدیقی پر مشتمل تھا۔ تصویر میں



وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کے کملا نہرو اسپتال پہنچنے کا ایک منظر

نر اتر پردیش جناب محمد عثمان عارف الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس ڈی این جھا کو
چیف جسٹس کے عہدے کا حلف دلاتے ہوئے ۔ تصویر میں وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ بھی نظر آ رہے ہیں ۔





…ی اتر پردیش جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے ایک
…سل الرحمن شمسی، ایم. کوٹھیاوی راہی اور شری
…یڈیٹر "نیا دور" بھی نظر آرہے ہیں۔



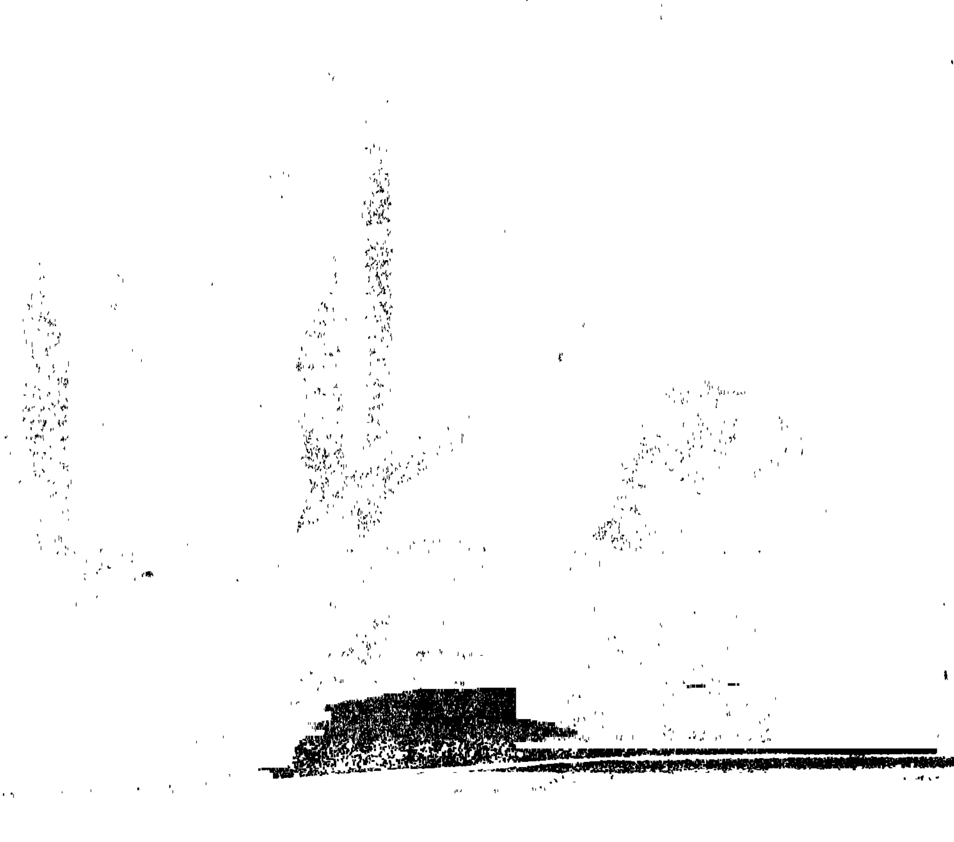
وزیر اعلا اتر پردیش شری ویر بہادر سنگھ عیدالاضحی کے موقع پر گورنر جناب محمد عثمان
مبارکباد دیتے ہوئے۔



گورنر اتر پردیش
جناب محمد عثمان عارف
۱۶ اگست کو
پولیس لائن لکھنؤ میں
جنم اشٹمی کے موقع پر
منعقدہ تقریب کا
افتتاح کرتے ہوئے
تصویر میں وزیر داخلہ
شری گوپی ناتھ دکشت
بھی نظر آرہے ہیں



شری ویر بہادر سنگھ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ
عامہ اتر پردیش کی جانب
سے شائع کردہ کتاب
"آزادی کی چار دہائیاں"
کی رسم اجرا انجام
دیتے ہوئے
تصویر میں وزیر ریاست
برائے اطلاعات
شریمتی دیپا کول
بھی نظر آرہی ہیں۔



وزیر ریاست برائے
اطلاعات شریمتی
دیپا کول، لکھنؤ میں
ق میموریل ٹرسٹ
کی جانب سے
ق کے ۹۰ ویں یوم
ائش کے موقع پر
منعقدہ جلسہ میں
میں خراج عقیدت
پیش کرتے ہوئے

قاضی غلام صابر قدیری سندیلوی

شمعِ آزادی

ہوئی ہے روشن نگاہِ آدم نئے چراغوں کی روشنی میں
ملا ہے پیغام سعیٔ پیہم نئے چراغوں کی روشنی میں

نئی امنگیں ہوئی ہیں پیدا مسافرانِ رہِ عمل میں
ہوا ہے بیدار عزمِ محکم نئے چراغوں کی روشنی میں

نظر میں ہے اُن کا روئے تاباں ہر اک خد و خال ہے نمایاں
ہے محوِ دیدار چشمِ پُرنم نئے چراغوں کی روشنی میں

خوشی کے آنسو مچل رہے ہیں چراغ پلکوں پہ جل رہے ہیں
پہونچ گئے قصرِ یار پہ ہم نئے چراغوں کی روشنی میں

نہ شورِ ماتم نہ آہِ پیہم نہ آنکھ پُرنم نہ گریۂ غم
سکوں فضا ہے نظامِ عالم نئے چراغوں کی روشنی میں

جنوں کا ناسور بھر گیا ہے، خرد کا چہرہ نکھر گیا ہے
ملا ہے زخمِ جگر کو مرہم نئے چراغوں کی روشنی میں

بشر جو نفرت میں مبتلا تھا عداوت و بغض میں پھنسا تھا
ہوا ہے انسانیت کا محرم نئے چراغوں کی روشنی میں

کلی محبّت کی کھل گئی ہے، ستم کی بنیاد ہل گئی ہے
بدل گئی ہے سرشتِ آدم نئے چراغوں کی روشنی میں

صنم نے اُلفت کا راگ چھیڑا حرم مسرّت سے جھوم اٹھا
گلے ملے گبر و شیخ باہم نئے چراغوں کی روشنی میں

اٹھو کہ دُنیا رواں دواں ہے بڑھو کہ نزدیک کارواں ہے
اٹھائیں ہم تم بھی فیض ہمدم نئے چراغوں کی روشنی میں

کرو مرتّب اک ایسی محفل کہ صدرِ محفل ہو صاحبِ دل
بناؤ دستورِ امنِ عالم نئے چراغوں کی روشنی میں

سحابِ رحمت نچوڑ لائیں، کہو تو تارے بھی توڑ لائیں
ملا ہے صابرؔ ہمیں یہ دم خم نئے چراغوں کی روشنی میں

نسیم اختر صدیقی

نئی صبح

فضا جھوم اٹھی، ہوا گنگنائی
نویدِ بہاراں چمن میں جو آئی
اُفق تا اُفق، روشنی مسکرائی
نئی صبح آئی، نئی صبح آئی

بنے از سرِ نو ترقی کے زینے
نکل آئے طوفاں کی زد سے سفینے
کھنکنے لگے شبنمی، آبگینے
نئی صبح آئی، نئی صبح آئی

لکھے شاعروں نے جو قومی ترانے
مسرّت کے گھر گھر بجے شادیانے
کہیں کھیت مہکے، کہیں کارخانے
نئی صبح آئی، نئی صبح آئی

اٹھو نقشِ تخریب کاری مٹا دو
خوشی بانٹ لو، آہ و زاری مٹا دو
زمانے سے بے اعتباری مٹا دو
نئی صبح آئی، نئی صبح آئی

مسائل کی زنجیر بھاری نہیں ہے
غلامی کا دستور جاری نہیں ہے
وہ پہلی سی بے روزگاری نہیں ہے
نئی صبح آئی، نئی صبح آئی

گرفتارِ غم آج آزاد ہوں گے
بہر حال سرگرمِ ایجاد ہوں گے
جو اُجڑے ہیں گھر پھر سے آباد ہوں گے
نئی صبح آئی، نئی صبح آئی

●●

جعفر ملیح آبادی

اورنگ زیب اور شیواجی

قومی یکجہتی کے آئینے میں

انگریز مورخین نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نفاق پیدا کرنے کے لیے ہندستان کے جن حکمرانوں کے کردار کو مسخ کرکے پیش کیا ہے ان میں اورنگ زیب اور شیواجی کا نام سر فہرست ہے۔ ہندوؤں میں اورنگ زیب، ہندو کش، ظالم اور بت شکن مشہور ہے، تو مسلمانوں میں شیواجی، مسلمانوں کا پکا دشمن اور اسلام سے نفرت کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اگر معتبر تاریخوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں ہی حکمراں غیر متعصب، رواداری اور خیر سگالی کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان دونوں کے درمیان جو لڑائیاں اور خوں ریزیاں ہوئیں وہ محض بربنائے اقتدار و ملک گیری تھیں کسی مذہبی جذبے کے تحت نہیں۔ دونوں ہی بلا امتیاز مذہب اپنی اپنی رعایا کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ذیل میں ان دونوں حکمرانوں سے متعلق چند تاریخی حقائق پیش کیے جارہے ہیں، جن سے کسی حد تک ان دونوں کی اصلی تصویر سامنے آجائے گی۔

اورنگ زیب کے عہد میں یورپین سیاح کپتان ہملٹن ہندستان آیا تھا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے، لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور پر برتی جاتی ہے وہ اپنے برت رکھتے ہیں، تیوہاروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیساکہ اگلے زمانے میں منایا کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی۔"

—— (ہند عہد اورنگ زیب میں)

ہندوؤں کے علاوہ دوسرے مذہبی فرقوں کے ساتھ بھی اورنگ زیب کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ ایک مرتبہ دو پارسی عہدے داروں کے بارے میں کسی نے اورنگ زیب کو عرضی دی کہ چونکہ یہ دونوں آتش پرست ہیں لہٰذا ان کو برخاست کردیا جائے اور ان کی جگہ مسلمانوں کو دی جائے۔ اورنگ زیب کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی، اس نے درخواست گذار کی استدعا کو نامنظور کرتے ہوئے لکھا:۔

"مذہب کے معاملے کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے .... بادشاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت و قابلیت کے اصول پر ملیں گی نہ کہ مذہب و ملت پر۔"

(عالمگیر۔ مؤلفہ عزیز حسن بقائی)

اورنگ زیب کی ہندو دشمنی ثابت کرنے کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کردیا، مگر تاریخ کے اوراق نیز اورنگ زیب کے فرامین اس

الزام کی تردید کرتے ہیں۔ عزیز حسن بقائی رقمطراز ہیں،

"اورنگ زیب کے عہد میں ایک صدی سے لیکر ہفت ہزاری (جو سب سے بڑا منصب تھا) عہدوں پر فائز ہونے والے ہندو اُمرا کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ ہفت ہزاری ہندو اُمرا میں سے ساہو پسر مہاراجہ سیتا تھا اور پنج ہزاری اُمرا میں شیواجی کا داماد راجندرجی اور مالوی بھونسلہ بھی تھا اورنگ زیب کے سپہ سالاروں میں سے راجہ جے سنگھ پنج ہزاری منصب داروں میں سے تھا۔ راجہ جسونت سنگھ کابل کا گورنر تھا۔ ہفت ہزاری منصب پر اکبر کے یہاں صرف ایک ہندو تھا، مگر عالمگیر کے یہاں تین ہندو امرا نظر آتے ہیں۔"

(عالمگیر ص۳۱)

شیواجی کے داماد کو پنج ہزاری کے منصب پر فائز کر دینا اورنگ زیب کی فراخدلی اور رواداری کی روشن دلیل ہے۔ مندرجہ بالا چند ہندو اُمرا کے علاوہ تاریخ میں ایسے بے شمار ہندوؤں کا ذکر ملتا ہے جو اورنگ زیب کے دربار میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ مثلاً کنور رام سنگھ، راجہ بشن سنگھ، راجہ جے سنگھ، راجہ رائے سنگھ راجہ مان سنگھ، راجہ اندر سنگھ، راؤ بھاؤ سنگھ، راجہ رام سنگھ راجہ انوپ سنگھ وغیرہ وغیرہ۔

اعلیٰ منصب اور عہدے دینے کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب نے نہ جانے کتنے ہندوؤں کو جاگیریں بھی عطا کیں۔ مثلاً گردھر ولد جگ جیون اور پنڈت بلبھدر کو جاگیریں دی گئیں۔ مشہور عالم سر سی۔ پی۔ رائے کی تحقیق کے مطابق:

"اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیے گئے۔"

(روشن مستقبل ص۲۴)

اورنگ زیب نے اپنے مندرجہ ذیل فرمان کے ذریعے جو بقول عزیز حسن بقائی رئیس پڈرونہ ضلع گورکھپور کے پاس ہے، نانکار ناتھو نام کے ایک ہندو کو بطور انعام ایک بڑی جاگیر دی تھی۔

"اس وقت فرمان والا شان صرف صدور لایا کہ مبلغ پانچ ہزار پانچ سو روپیے آمدنی موضع کھیسہ وغیرہ ۳۳ موضع معمولہ پرگنہ سدھورہ سرکار جون پور متعلقہ صوبہ الہ آباد بطور انعام نانکار ناتھو زمیندار پرگنہ کہ مالگذار ہے اور رعیت گیری کا شیوہ اپنا شعار بنا کر عمال اور جاگیرداروں کے چبوترے میں حاضر ہوتا ہے آمدنی مواضع مذکور کی مع متعلقین صرف کرے۔"

(عالمگیر ص۴۲)

اورنگ زیب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے بے شمار مندروں کو منہدم کرا دیا۔ اس جھوٹ کا پول مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو عالموں اور محققین نے بھی کھولا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ مندر منہدم کرنے کے بجائے ان کی دیکھ بھال کے لیے جاگیریں عطا کرتا رہتا تھا۔ پنڈت سندر لال "بھارت میں انگریزی راج" نامی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں، آج تک متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کیے جانے کے تذکرے ہیں۔"

اور ڈاکٹر بشمبر ناتھ پانڈے کا کہنا ہے کہ مہاکالی مندر اجین، بالاجی مندر چترکوٹ، جین مندر گرنار اور دلواڑہ مندر آبو، گرودوارہ رام رائے کو بھی اورنگ زیب نے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ ڈاکٹر پانڈے کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان مندروں کو جاگیریں عطا کرتے ہوئے اورنگ زیب نے یہ ہدایت کی تھی کہ "ٹھاکر جی سے وہ اس بات کی دعا مانگیں کہ اس کے خاندان میں تا قیامت حکومت بنی رہے۔"

(ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات ص۴۶)

بعض مورخین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ اورنگ زیب

کے طرزِ عمل سے ہندو اس سے برہم ہو گئے تھے جس کے باعث مغلیہ سلطنت کو زوال ہوا، مگر اس بات کی پرزور تردید ڈاکٹر تارا چند نے کی ہے، وہ لکھتے ہیں:ـــــ

"بعض لوگوں کے نزدیک اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اس کی ناکامی کا سبب بنی۔ یہ خیال غلط ہے ہندوؤں کی بغاوتیں ناکام رہیں اور ان کا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہ تھا، اورنگ زیب نے ان بغاوتوں کو ہندوؤں ہی کی مدد سے فرو کیا......

اس میں شک نہیں کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ مغلیہ سلطنت کے لیے ایک بارِ عظیم ثابت ہوئی لیکن ان کی بغاوت نہ ملکی تھی نہ مذہبی، فقط ایک قبیلے کی بغاوت تھی۔ راجپوت، بندیلے اور شیواجی کے اپنے رشتہ دار اورنگ زیب کی خاطر شیواجی اور اس کے جانشینوں کے خلاف لڑے۔"

ـــــ (رود کوثر مولفہ شیخ محمد اکرم ص۴۶۷)

تاریخوں میں شیواجی کے باب میں اورنگ زیب کا یہ قابلِ قدر واقعہ بھی درج ملتا ہے کہ اس نے شیواجی کے ۷ سالہ یتیم پوتے ساہو، کی پرورش اپنی نگرانی میں کرائی تھی۔ اس بچے کا خیمہ شاہی خیمے کے ساتھ نصب کیا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی تعلیم ہندو مذہب کے مطابق دلوائی تھی، دو پنڈتوں کو مامور کیا تھا جو اسے ہندو شاستر پڑھایا کرتے تھے۔

ساہو جوان ہونے کے بعد جب اپنی آبائی سلطنت کا والی ہوا تو اورنگ زیب کی شفقتوں اور احسانات کو اس نے ہمیشہ یاد رکھا اورنگ زیب کی وفات پر، اس کے جنازے کے ساتھ خلد آباد تک گیا اور مٹی دیتے وقت اس قدر رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ اس کے علاوہ جب بھی اسے فرصت ملتی اورنگ زیب کی قبر پر حاضری دینے جایا کرتا۔

شرپسند مورخین نے اورنگ زیب کے حریف شیواجی کے متعلق بھی لغو بیانی سے بہت کام لیا ہے۔ اس کی شخصیت کو داغدار کرنے کے لیے اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے ہیں اسے مسلمانوں کا دشمن اور اسلام سے نفرت کرنے والا بتایا گیا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو دوست رکھتا تھا۔ اس کی نگاہ میں اسلام کی بڑی عزت تھی۔ اس نے اپنی فوج کو سخت تاکید کر دی تھی کہ کسی مسجد کو نقصان نہ پہونچایا جائے۔ اگر کہیں قرآن شریف کا کوئی نسخہ ہاتھ لگے تو اسے بہت احترام کے ساتھ میرے پاس لایا جائے۔ اس کے دادا مالوجی جو احمد نگر کے بادشاہ کی فوج میں کمانڈر تھے، مسلمان صوفیوں اور فقیروں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ "رود کوثر" کے ص۴۶۷ پر لکھا ہے:

"مرہٹہ تاریخ کے ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیواجی کا دادا مسلمان پیروں کا بڑا معتقد تھا اور حضرت شاہ شریف کا مرید تھا۔ اپنے مرشد کے نام پر اس نے اپنے بیٹوں کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے۔"

خود شیواجی بابا یاقوت سہروردی کا بہت بڑا مرید تھا جنھیں اس نے ۳،۶۵۳ ایکڑ زمین عطا کی اور ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔ جب شیواجی کسی مہم پر جانے لگتا تو بابا یاقوت کی قدم بوسی کے لیے ضرور جاتا اور ان کی دعائیں لے کر مہم پر روانہ ہوتا تھا۔

شیواجی نے اپنی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر مسلمانوں کو فائز کیا تھا، اس کا نجی منشی مُلا حیدر تھا جس کے پاس شیواجی کی ساری خفیہ دستاویزیں رہتی تھیں۔ جب شیواجی کو اورنگ زیب نے آگرے میں نظر بند کر دیا تو شیواجی کے ایک مسلمان ساتھی ہی نے اسے وہاں سے نکل جانے میں مدد دی۔

مسلمانوں کے ساتھ شیواجی کے حسنِ سلوک کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے لکھتے ہیں:

"کچھ مراٹھا مورخوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شیواجی کا مقصد ہندو پد بادشاہی قائم کرنے کا تھا، لیکن 'پونا محضر'، جس میں شیواجی کے دربار کی کارروائیاں درج ہیں اس میں ۱۶۵۷ء

میں شیواجی کے افسروں اور ججوں کی تقرری کا بھی ذکر ہے۔ شیواجی کی نئی سرکار نے جن قاضیوں کو مقرر کیا ان میں قاضی اور نائب قاضیوں کے نام ہیں۔ جب مُسلم رعایا کے مقدمے پیش ہوتے تو شیواجی مسلم قاضیوں کے مشورے سے فیصلہ دیتا شیواجی کے مشہور جرنیل دولت خاں اور دریا خاں تھے۔"

آگے ان دونوں جنرلوں کے ضمن میں ڈاکٹر پانڈے ایک دلچسپ واقعہ بھی لکھتے ہیں جسے درج ذیل کیا جارہا ہے:۔

"جس وقت وہ لوگ (دولت خاں اور دریا خاں) پدم درگ کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے اس وقت سدی کی فوج نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شیواجی نے اپنے صوبیدار جیواجی وِنائیک کو انھیں رسد اور روپے بھیجنے کی ہدایت کی جسے اس نے وقت پر نہیں بھیجا۔ اس پر شیواجی نے اسے برخاستگی اور قید کا حکم دیتے ہوئے لکھا کہ تم سمجھتے ہو کہ تم برہمن ہو اس لیے میں تمھیں تمھاری اس دغابازی کے لیے معاف کردوں گا۔ تم برہمن ہوتے ہوئے بھی دغاباز نکلے اور تم نے سدی سے رشوت لے لی۔ لیکن میرے مسلمان کمانڈر کتنے وفادار نکلے کہ اپنی جان پر کھیل کر ایک مسلمان سلطان کے خلاف انھوں نے میرے لیے بہادرانہ لڑائی لڑی۔"

(ہندوستان میں قومی یک جہتی کی روایات صفحہ ۳۹)

جب شیواجی اپنے مسلمان ساتھی کی مدد سے نظر بندی سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا تو دکن کی ریاست گول کنڈہ کے بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ نے اس کی ہر طرح مدد کی۔ تانا شاہ کی مدد ہی سے شیواجی از سرِ نو مغل فوج سے نبرد آزما ہو سکا۔

شیواجی قرآن شریف اور مسجدوں کے ساتھ ساتھ مسلم عورتوں کی بھی بے حد عزت کرتا تھا۔ اس سلسلے کے بے شمار واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں، ان میں سے ایک واقعہ یہاں پیش کیا جارہا ہے:

ایک مرتبہ کسی جنگ میں بہلول خاں کی بیگم کو شیواجی کے کمانڈر نے قید کرلیا اور جب قرآن شریف کے ساتھ بیگم کو شیواجی کے روبرو پیش کیا گیا تو پہلے اس نے قرآن شریف کو بہت ادب کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور ایک امام مسجد کے سپرد کردیا۔ پھر اس نے نیام سے تلوار نکالی اور بیگم کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا۔

"شیوا تلجا دیوی کی پوجا کرتا ہے، تلجا شمشیر کف ہے، مجھے تو بھوانی اچھی نہیں لگتی، آپ یہ تلوار اپنے ہاتھ میں لے لیں اور جس وقت آپ شیوا کی نیت میں فتور پائیں فوراً یہ تلوار اس کے سینے میں اتار دیں' بھوانی ماں! تمھارا شیوا ہر طرح سے گنہگار ہے اُسے معاف کردو ماں۔"

بیگم، جو اب تک بہت خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھی، شیواجی کے اس برتاؤ سے اس کے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بیگم کے شوہر بہلول خاں کو جب شیواجی کی اس اعلیٰ ظرفی کا علم ہوا تو ایک دن وہ شیواجی سے ملنے کے لیے آیا اور کہا کہ "ہم نے سنا تھا کہ آپ شیطان ہیں مگر آپ تو فرشتہ ثابت ہوئے۔ اب میں ہمیشہ آپ کے زیرِ سایہ ہی رہوں گا۔"

محمد ولی الحق انصاری

روشنی دل کو نہیں ملتی نمِ غم کے بغیر
پھول گلشن میں نکھرتے نہیں شبنم کے بغیر

ایک سجدہ بھی جو ہو جائے بہت کافی ہے
خواہشِ خلدِ بریں، خوفِ جہنم کے بغیر

کوئی عیسیٰ نہیں ہو سکتا جہاں میں پیدا
فیضِ رُوح القدس و عصمتِ مریم کے بغیر

اے شہیدانِ رہِ دوست مُبارک ہووے
زندگی تم کو ملی معجزۂ دم کے بغیر

رونقِ دہر ہے منّت کشِ جُرمِ آدم
کچھ بھی ہوتا نہ یہاں لغزشِ آدم کے بغیر

چارہ سازانِ منافق سے یہ کہہ دے کوئی
زخم بھر سکتے ہیں دریوزۂ مرہم کے بغیر

موت قابو میں نہ ہو جس کے، کہاں کا وہ حکیم
حیف سقراط پہ جو مر نہ سکا سم کے بغیر

انکساری ہے ضروری پئے حُسنِ کردار
پُرکشش ہوتی نہیں زلف کبھی خم کے بغیر

اس کی رحمت کا ولی ہم کو ہے سایہ درکار
وقت کا اپنے سلیماں جو تھا خاتم کے بغیر

ملہ دیو جانس کلبی کی طرف اشارہ ہے

واقف رائے بریلوی

غزلیں

ہر اندھیرے سے کرن بن کے گزر جاتی ہے
کیا تمنّا ہے جو انجام سے ڈر جاتی ہے

دل جہاں پر ہے وہاں ہوش میں جانا مشکل
میں جہاں پر ہوں وہاں سب کی نظر جاتی ہے

مجھ کو پہچان گئی اس کے بدن کی خوشبو
میرے نزدیک صبا آ کے ٹھہر جاتی ہے

کوئی عالم ہو، مرا نشّہ اُترتا ہی نہیں
اک نظر ہے جو مرے جام کو بھر جاتی ہے

اتنی سادہ ہے کہ ملتی ہی نہیں اُس کی نظر
اتنی ہُشیار کہ ہر دل میں اُتر جاتی ہے

زُلفِ ہستی کو بہت بار سنوارا، لیکن
اس کی فطرت ہے بکھرنا یہ بکھر جاتی ہے

ایک دن بھی کہیں کاٹے نہیں کٹتا واقف
میکدہ ہے کہ جہاں رات گزر جاتی ہے

□□

علی باقر زیدی

اُردو شاعری اور جنگِ آزادی

اگر ہندستان کی جنگِ آزادی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اُردو زبان ہر منزل پر آزادی کی نقیب نظر آئے گی۔ جنگِ آزادی کی عام تاریخوں سے واقعات کے تسلسل کا تو پتہ ضرور چل جائے گا، لیکن اگر ۱۸۵۷ء کی تباہی کا منظر، جلیان والا باغ میں بہتے ہوئے خون کا دریا اور تختۂ دار پر جھولتی ہوئی لاشوں کا انقلاب آفریں منظر دیکھنا ہو ــــ یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے قیدیوں کی زنجیروں کی جھنکار، بیڑیوں کی فریاد، اور آزادی کے سورماؤں کے بڑھتے ہوئے قدموں کی دھمک سننا ہو تو اردو شاعری کا سہارا لینا پڑے گا۔ بقول علی جواد زیدی: ــ

"...... اُردو ہندستان کے سیاسی شعور کی تشکیل و تکمیل میں ایک اہم کردار ہمیشہ ادا کرتی رہی ہے..... بالخصوص اٹھارھویں صدی سے ہماری قومی تاریخ کے عہد بہ عہد ارتقا کے مرقعے نظمِ اردو کے آئینے میں نظر آنے لگتے ہیں۔"

(اُردو میں قومی شاعری کے سو سال ص۳۵)

غلامی کے دور کی خونچکاں داستان میں اردو ادب نے ہماری قومی تاریخ کا وہ بیش قیمت سرمایہ پیش کیا ہے جس پر آنے والی نسلیں فخر کرتی رہیں گی۔ ۱۸۵۷ء میں جب پہلی بار سامراج کی بجلی نے غریبوں کے جھونپڑوں سے لے کر شاہی محلات تک کو اپنی زد میں لے لیا تو غالب جیسا غزل گو شاعر بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ؎

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی فوج دلّی شہر کے چپّے چپّے پر ظلم و ستم کا پہاڑ توڑ رہی تھی، سرِ عام پھانسیاں دی جا رہی تھیں اور خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان حالات کا اظہار داغ دہلوی نے اس طرح کیا ؎

مقامِ امن جو ڈھونڈھا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

اُردو کے ممتاز شاعر اور ناقد خواجہ الطاف حسین حالی نے اس موقع پر "دہلی مرحوم" کے عنوان سے ایک نظم لکھی، جس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر، جو اُردو کے ممتاز شاعر بھی تھے، انگریزوں نے جو ظلم و ستم ڈھائے اُسکی دردناک کہانی انھوں نے اس طرح بیان کی ہے ؎

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

بہادر شاہ ظفر سے متعلق ایک مشہور واقعہ ہے کہ جب انھیں قید کر کے رنگون کے قید خانے میں رکھا گیا تھا اس وقت ان کی نگرانی کے لیے جو انگریز افسر مقرر کیا گیا تھا، اس کو اُردو شاعری سے بھی شغف تھا ایک دن اس نے دیکھا کہ بہادر شاہ ظفر خانۂ قید میں کچھ طبع آزمائی کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر اس نے دیوار زنداں پر یہ شعر لکھ دیا۔

ہندیوں میں دم نہیں ہے خیر مانگیں جان کی
چل چکی جو کچھ ظفر چلنی تھی ہندستان کی

جنگ آزادی جس طرح آگے بڑھتی رہی تباہیوں، بربادیوں اور قربانیوں کی داستان بیان کرتے ہوئے اُردو شعراء کا قافلہ بھی آگے بڑھتا رہا۔ ان میں کچھ شعراء نے تو عملی طور پر جنگِ آزادی میں حصہ بھی لیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور دیگر شعراء نے حب الوطنی اور آزادی کے جذبے سے سرشار ہو کر اشعار لکھے۔ وہ شعراء جو عملی طور پر تحریک آزادی میں شریک تھے ان میں رام پرشاد بسمل، مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اختر شیرانی، اسحٰق پھپھوندوی، درگا سہائے سرور جہان آبادی، گوپی ناتھ امن، محمد علی جوہر، انور صابری، جمیل مظہری، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، علی جواد زیدی، خواجہ عبدالحمید شیدا، ظفر علی خاں، غلام عباس نیرنگ، شورش کاشمیری عارف ہنسوی، قاضی عدیل عباسی، مولانا سید باقر دہلوی، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، فراق گورکھپوری، منشی گوری شنکر اختر، سیوک رام ناصر، سکھدیو پرشاد بسمل، سردار نو بہار سنگھ صابر، پنڈت دتیہ پرشاد فدا، لالہ پرشاد اختر، پنڈت اندرجیت شرما، کشن چند زیبا، صابر موہانی، کنور پرتاپ سنگھ آزاد اور ٹیکا رام سخن وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

بھگت سنگھ کے ایک ساتھی رام پرشاد بسمل تھے جو اُردو کے شاعر تھے اور جن کو انگریزوں نے پھانسی دے دی تھی، ان کی زبان سے نکلا ہوا یہ شعر آج بھی ہر وطن پرست کے ذہن میں گونج رہا ہے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ان شعراء کے علاوہ اردو کے بہت سے ایسے شاعر بھی تھے جنھوں نے عملی طور پر تو جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا لیکن آزادی کی تحریک کو اپنی شاعری سے جلا بخشی۔ ان شعراء کا شمار ہم مجاہدین آزادی کی صف میں تو نہیں کر سکتے لیکن ایک قومی شاعر کی حیثیت سے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مثلاً برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم روش صدیقی، احسان دانش، حفیظ جالندھری، آنند نرائن ملا، ساغر نظامی، غلام ربانی تاباں، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، عمر انصاری، سلام مچھلی شہری، مہاراج بہادر برق، کنھیا لال ثاقب، کیفی اعظمی، خلیل الرحمان اعظمی اور معین احسن جذبی وغیرہ۔

جنگ آزادی کے دوران ایک ایسا بھی وقت آیا جب اردو کے شاعروں کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا لیکن وہ اس سے ہراساں نہیں ہوئے اور انھوں نے قومی شاعری کا سلسلہ نہ صرف جاری رکھا بلکہ جیل میں بھی باقاعدہ مشاعرے منعقد کرنے لگے۔ اس طرح کے مشاعروں کا ذکر سبط حسن نے "مشاعرۂ زنداں" میں اس طرح کیا ہے:

"شاید ادب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے اور بے مثال ہے کہ جیل کی چہار دیواریوں کے اندر اسیران بلا کا کوئی باقاعدہ عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا ہو....... ۲۰ جنوری ۱۹۲۲ء کو آگرہ ضلع جیل میں مشاعرہ ہوا۔ اس وقت تقریباً تین سو سیاسی قیدی اس جیل میں موجود ہیں..... میر مشاعرہ مولانا عارف ہنسوی کو منتخب کیا گیا۔"

آگرہ ضلع جیل میں تین طرحی مشاعرے منعقد ہوئے۔ پہلا مشاعرہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۲ء کو منعقد ہوا، مصرع طرح تھا۔

ہے یہ وہ درد جو شرمندۂ احساں نہ ہوا

دوسرا مشاعرہ ۲۴ فروری ۱۹۲۲ء کو ہوا جس میں مصرع طرح تھا

ہوئے وہ مہرباں کچھ اور بھی نامہرباں ہو کر

اور ع

باطن میں ہیں آزاد بظاہر ہیں نظر بند

تیسرا مشاعرہ ۲ر مارچ ۱۹۲۲ء کو منعقد ہوا جس میں مصرع طرح تھا ؎

"نعمتیں ہیں شکستہ پائی کی"

اور ؎ "اب ہم کو انتظار ہے روزِ حساب کا"

اور آخری مشاعرہ ۴ر مئی ۱۹۲۲ء کو ہوا جس میں مصرعہ طرح تھا

؎ "حالِ دل کہتے ہیں اپنا پھر اسی قاتل سے ہم"

اور "تمام عمر قیامت کا انتظار رہا"

ان مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظمیں اور غزلیں زیادہ تر حب الوطنی اور قومی جوش عمل کے جذبات سے مالا مال ہوتی تھیں اور شرکت کرنے والوں میں مولانا عارف ہنسوی، مولانا نذیر احمد جمندی، مولانا عبدالمجید شیدا، فراق گورکھپوری، مولانا فاخر الہ آبادی، پنڈت کرشن کانت مالوی، سید صغیر حسین اسیر الہ آبادی، جناب مہا بیر تیاگی، حافظ محمد عثمان (علی گڑھ)، رتن لال زمرد، حفیظ الرحمٰن حفیظ فرخ آبادی، رام نریش ترپاٹھی (الہ آباد)، محمد مصطفےٰ پھپھوندوی، پنڈت دیا شنکر گنجور، کنور بہاری لال ماتھر، اندر جی ورما، رام پرشاد طالب، لکشمی دت مسافر، عبدالحمید الہ آبادی، اظہار ہروی، شاہ حفیظ عالم جنیدی، عزیز احمد زبیری مارہروی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(قومی آزادی سے متعلق نظموں کو سب سے پہلے ۱۹۲۹ء میں سبط حسن نے ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا تھا، جنھیں انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا تھا، اس مجموعے کا نام تھا "آزادی کی نظمیں")

جنگ آزادی کے دوران جو اہم واقعات رونما ہوئے اردو شاعروں نے ان پر بھی نظمیں لکھیں۔ اس طرح کی نظموں کا سرمایہ بھی بہت کافی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا حسرت موہانی اور دوسرے شعرا کو جب قید کیا گیا تو مولانا نے "چکی کی مشقت" کا ذکر غزل تک میں کر دیا۔ مجاہدینِ آزادی کی عام گرفتاریاں ہونے لگیں تو "فریادِ قوم" کے عنوان سے برج نرائن چکبست نے نظم لکھی۔ کلکتہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر لارڈ کرزن نے اپنی تقریر میں ہندستانیوں کی تحقیر کی تو اس کے جواب میں چکبست نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا "کرزن سے جھپٹ"۔ ہوم رول تحریک جب شروع ہوئی تو اسی عنوان کے تحت ظریف لکھنوی نے نظم لکھی، جلیان والا باغ میں جب مجاہدینِ آزادی پر مشین گن چلائی گئی تو اس حادثے کو تلوک چند محروم نے اپنی نظم "شکوۂ صیاد" اور ظفر علی خاں نے اپنی نظم "مارشل لا" میں بیان کیا۔ انگلستان سے جب سائمن کمیشن آیا اور گاندھی جی نے جب اس کی مخالفت کا نعرہ دیا تو لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ انگریزی حکومت نے عوام پر لاٹھی چارج کیا اور پنڈت جواہر لال نہرو لکھنؤ میں جلوس کی قیادت کرتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے۔ اس واقعہ کو نوشابہ خاتون نے اپنی نظم "پولیس لاٹھی چارج" اور ظفر علی خاں نے اپنی نظم سائمن کا "مقاطعہ" میں بیان کیا۔ اس وقت کے مشہور مجاہد آزادی قاضی جلیل عباسی کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے اس جیل میں قید کیا گیا جس میں علی جواد زیدی پہلے سے قید تھے۔ ان کی رہائی پر اس واقعہ کو علی جواد زیدی نے اپنی نظم "سیاسی قیدی کی رہائی" میں بیان کیا۔ مجاہد آزادی مہادیو دیسائی کی جیل میں جب موت ہوگئی اور دوسرے مجاہدین آزادی کو جب پھانسیاں دی گئیں تو ان واقعات کو علی جواد زیدی نے اپنی نظم "قیدی کی لاش" میں بیان کیا۔

جنگِ آزادی کے دوران مسلم لیگ کے لیڈر محمد علی جناح نے جب "دو قومی نظریہ" پیش کیا اور پاکستان کا مطالبہ کیا تو مطالبۂ پاکستان کے خلاف اُردو کے شعرا نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور شمیم کرہانی نے اپنی نظم "پاکستان چاہنے والوں سے" میں ایسے لوگوں کی سخت مذمت کی جو پاکستان کے ہمنوا تھے۔

جنگ آزادی میں اردو شاعروں کا یہ قافلہ منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا اور ان میں سے جو لوگ بھی اس دنیا سے رخصت ہو جاتے تھے وہ یکے بعد دیگرے آنے والی نسل کے ہاتھ میں

پرچم آزادی سونپتے جاتے تھے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد کے شعراء نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا۔ مثال کے طور پر شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے شکست زنداں کے خواب کی تفسیر اس طرح بیان کی ؎

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

جوش ملیح آبادی نے صرف تفسیر ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بڑی جرأت کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کو یہ کہہ کر مخاطب کیا ؎

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

اپنے ظلم بے نہایت کا فسانہ یاد ہے
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے

میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے

اس نظم میں آگے چل کر جوش ملیح آبادی جرأت اور یقینِ محکم کے ساتھ انگریزوں کو ظلم کے انجام سے اس طرح آگاہ کرتے ہیں ؎

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

جوش کے ہم عصر شاعر فراق گورکھپوری جنھوں نے قید و بند کی مصیبتیں بھی برداشت کی تھیں ان کے دل میں بھی آزادی کی تڑپ تھی جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ؎

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراقؔ
ہمارے سانس سے روشن ہے نامِ آزادی

علی سردار جعفری جو اس وقت نوجوان انقلابی شاعر اور خود مجاہد آزادی تھے، انھوں نے جنگِ آزادی میں شامل ہونے کے لیے کسانوں اور مزدوروں کو اس طرح آواز دی ؎

اُٹھو ہند کے باغبانو! اٹھو
اُٹھو انقلابی جوانو! اُٹھو
کسانو اٹھو! کامگارو! اُٹھو
نئی زندگی کے شرارو! اُٹھو
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

اُردو کے ایک عظیم شاعر فیض احمد فیضؔ نے آزادی کے مجاہدوں کے سرفروشی کے جذبے کو اپنی ایک نظم میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

جواں لہو کے پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بُلاتے رہے
بڑی عزیز تھی لیکن مرے وطن کی لگن

اُردو کے شاعروں کا یہ قافلہ مجاہدینِ آزادی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا، یہاں تک کہ جب پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح آزادی کا سورج طلوع ہوا تو اس وقت بھی سب سے پہلے اُردو ہی کے شاعر جوش ملیح آبادی نے آزادی کا استقبال کیا ؎

اٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا زنجیرِ شب ٹوٹی!
وہ دیکھو پَو پھٹی، غنچے کھلے، پہلی کرن پھوٹی

جاوید لکھنوی

اے میرے پیارے وطن

اے میرے پیارے وطن ہندوستاں
اے بہاروں کے محافظ گلستاں
ناز ہے مجھ کو تری تہذیب پر
جس سے عالم میں ترا اونچا ہے سر
یہ زمیں ہے بھیم و ارجن کی زمیں
دہر میں جن کا کوئی ثانی نہیں
جن کے تیروں سے لرزتی تھی فضا
جن پہ افشا جنگ کا ہر راز تھا
یہ ہے رشیوں کی ریاضت کا جہاں
ہر طرف ہیں علم و حکمت کے نشاں
یہ زمیں ہے کرشن سے اوتار کی
خوبرو رادھا کے سچے پیار کی
آج بھی دنیا کو گیتا کے ورق
دے رہے ہیں آدمیت کا سبق
یہ اسی چشمے کا فیضِ عام ہے
جس کی طغیانی کا بھارت نام ہے
ویاس نے ویدوں کو لکھا ہے یہیں
آگہی کا نور پھیلا ہے یہیں
ہاں یہی ہے فلسفے کی درس گاہ
آج تک ہے روشنی جس کی گواہ
ذرّے ذرّے میں ادب کی باس ہے
یہ دیارِ فکرِ کالی داس ہے
تھا یہیں بدلا دماغِ بالمیک
ہے یہیں روشن چراغِ بالمیک
رام اور سیتا کا یہ پیارا چمن
جس کی ضامن ہے بہارِ لکشمن
اس چمن میں آ نہیں سکتی خزاں
اس کا رکھوالا ہے ہر پیر و جواں
اس زمیں پہ علمِ گوتم کو ملا
جس نے دنیا میں اُجالا کر دیا
یہ ہے جلوہ گاہِ کردارِ اشوک
اس کو کہتے ہیں چمن زارِ اشوک
یاد ہے سب کو مزاجِ اکبری
دل سے ہر مذہب کی جس نے قدر کی
ہے ابھی جھانسی کے قلعے کی فصیل
لکشمی بائی کی ہمت کی دلیل
ہاں گرو نانک کا مسکن ہے یہی
دے گیا سب کو پیامِ راستی
یہ ہے گاندھی کے اصولوں کا دیار
امن کے خوش رنگ پھولوں کا دیار
کتنا دلکش ہے اہنسا کا سبق
ہے یہی قرآں کا گیتا کا سبق
یہ جواہر کا ہے میدانِ عمل
تھا مکمل جس کو عرفانِ عمل
جس کی حکمت آج بھی مقبول ہے
اندرا گاندھی اسی کا پھول ہے
اس زمیں میں اندرا کا خون ہے
ہاں یہیں اک روشنی مدفون ہے
خون سے وہ لکھ گئی اک داستاں
یاد رکھے گا جسے یہ آسماں
اے مرے پیارے وطن ہندوستاں
اے بہاروں کے محافظ گلستاں

●●

ڈاکٹر مصطفےٰ فطرت

غزل

چہروں کی ہر شکن سے نمایاں ہے دوستو
اس دور میں ہر ایک پریشاں ہے دوستو

بڑھتے رہے یونہی جو ملائے ہوئے قدم
مستقبلِ حیات درخشاں ہے دوستو

حق مانگنے چلے تو ہو لیکن رہے خیال
کاندھوں پہ بارِ فرضِ گلستاں ہے دوستو

اک حرفِ آرزو کا نکلنا ستم ہوا
خودداریِ ضمیر پشیماں ہے دوستو

پھر سکتی ہے نگاہِ محبت بھی ایک دن
دشمن سے بھی خلوص کا امکاں ہے دوستو

غفلت شعاریوں نے سمجھنے ہی کب دیا
کیوں تار تار اپنا گریباں ہے دوستو

اہلِ وفا کے نقشِ قدم سے روش روش
تا وسعتِ نگاہ چراغاں ہے دوستو

فطرت کو صرف اپنے نشیمن کا دکھ نہیں
فطرت کے دل میں دردِ گلستاں ہے دوستو

■

افسانہ

عابد سہیل

درد کی دہلیز

"کشن بھیّا!" کی مانوس سی آواز کانوں میں پڑی تو میں نے ایک دم اسکوٹر میں بریک لگایا۔ اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی جانی پہچانی صورت نظر نہ آئی۔ میں دوبارہ اسکوٹر اسٹارٹ کرنے جا ہی رہا تھا کہ پھر وہی مانوس سی آواز کانوں میں گھل گئی۔

"کشن بھیّا!"

اب میں نے پھر چاروں طرف دیکھا تو سامنے دکان کے پاس اوشا کھڑی تھی، بالکل تین چار سال پہلے کی طرح کہنیوں تک ہاتھ جوڑے ہوئے لیکن اپنے پُرانے اور مخصوص انداز میں 'کشن بھیّا' کہنے اور اس طرح ہاتھ جوڑ کر "نمستے" کرنے کے علاوہ اوشا بالکل بدل چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور جسم آدھا بھی نہیں رہ گیا تھا۔ چہرہ پر ہمیشہ کھیلنے والی مسکراہٹ اور شوخی جانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ چند سال قبل اور آج کی اوشا میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل جذبات سے بھر گیا تھا، لیکن انھیں الفاظ نہیں مل پا رہے تھے۔

اوشا سے میری ملاقات کچھ عجیب طرح سے ہوئی تھی۔ سدرشن کے ساتھ اسے ایک آدھ بار دیکھا تو تھا لیکن بات چیت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ پھر ایک دن سدرشن مجھ سے ملنے آئی تو اُوشا بھی اس کے ساتھ تھی۔ سدرشن نے مجھے بتایا کہ میں آنے لگی تو یہ بولی کہ میں بھی چلوں گی۔ ذرا دیکھوں تو آپ کے کشن صاحب کیسے ہیں۔!

میں نے بیٹھنے کے لیے کہا اور کرسی کھینچی تو اسے کچھ اس طرح سامنے کھڑے دیکھا کہ ہاتھ تقریباً کہنیوں تک جُڑے ہوئے تھے، آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ مجھے وہ ایک دلکش اور پسندیدہ شخصیت کی مالک نظر آئی۔

"کشن بھیّا! کچھ اور نہ سمجھ لیجیے گا۔ میں نے اس دن پہلی بار ہی آپ کو دیکھ کر سدرشن دیدی سے کہہ دیا تھا کہ تم چاہے کچھ بناؤ یا نہ بناؤ، میں تو بھیّا ہی بناؤں گی۔"

یہ بات اس نے ایسے بھولے پن سے کہی تھی کہ میں فوراً ہی اس کو اپنی بہن محسوس کرنے لگا تھا۔ اب سدرشن تو خاموش تھی اور وہ میڈیکل کالج کے کاٹیج وارڈ میں میری چارپائی پر بیٹھی بڑی بے تکلفی سے مٹک مٹک کر باتیں کر رہی تھی۔ ان دنوں میری ایک عزیزہ بیمار تھیں اور مجھے ان کی تیمارداری کے سلسلے میں کاٹیج وارڈ میں رہنا پڑتا تھا۔ میں اپنی کتابیں بھی وہیں اُٹھا لے گیا تھا اور وقت ملتا تو وہیں سے یونیورسٹی چلا جاتا تھا۔

اُوشا سے میرا تعارف کچھ اس طرح ہوا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے سدرشن نے مجھے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ رویندر سے اس کی محبّت، اس محبّت کے پیچ و خم، کامیابی اور ناکامی کے امکانات، سب کچھ مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ اوشا سے برابر ملاقات ہوتی رہتی۔ اکثر سدرشن کے ساتھ وہ بھی آ جاتی تھی۔ پھر ایک دن سدرشن نے مجھے بتایا کہ اوشا کہہ رہی تھی کہ میں

تمھارے ساتھ اس طرح لگی رہتی ہوں، یہ کہیں کشن بھیا کو بُرا تو نہیں لگتا۔
ہم لوگ اس بات پر خوب ہنسے تھے۔

ویسے وہ عجیب سی لڑکی تھی۔ ہم لوگوں کے ساتھ رہتی تو چھا جانے کی کوشش کبھی نہ کرتی۔ میں کوئی بات آہستہ سے سدرشن سے کہتا اور وہ سُن بھی لیتی تو ایسی بن جاتی جیسے اس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔ خود اس نے مجھے روبندر کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا۔ کبھی زبان پر اس کا نام تک نہ لائی تھی، لیکن مجھے سُدرشن سے سارے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے کبھی کبھی وہ بجھی بجھی سی نظر آتی۔ لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے مستقل خوشیوں اور مسرتوں کے درمیان چند لمحوں کی خاموشی یا اداسی چھا جائے۔ پھر وہ بلا سبب ہی ہنسنے لگتی تو میں کہتا:

"تجھے کیا ہو گیا ہے اُوشا؟"

"مجھے۔؟" اوشا اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر کہتی "میری بات کہہ رہے ہیں کشن بھیا! بھلا مجھے کیا ہونے لگا۔ میں تو پگلی ہوں پگلی، ہر وقت ہنسا کرتی ہوں۔ آپ بھی کہتے ہوں گے کہ بہن ملی سو وہ بھی پاگل۔ ارے بہن بنانا تھا تو کسی ڈھنگ کی لڑکی کو بنایا ہوتا۔"

"ہوں نہ پگلی۔؟"

"پوری! تھوڑی نہ بہت۔" میں اس کے سر پر چپت مارتا تو وہ کہتی۔

"کشن بھیا! پتاجی بھی مجھے پاگل ہی کہتے ہیں، اور میں نے آپ کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ بھی اسی طرح چپت لگاتے ہیں بالکل آپ ہی کی طرح۔ دسہرے کی چھٹیوں میں گھر جاؤں گی تو ان سے خوب چپت کھاؤں گی، بڑا مزہ آئے گا۔"

اوشا نے چٹخارہ کچھ ایسے ہی لیا جیسے املی یا کوئی کھٹ مٹھی چیز کھاتے وقت اکثر لوگ لیتے ہیں۔ پتاجی سے پاگل کہلانے اور چانٹا کھانے میں اوشا کو شاید کچھ اسی قسم کا مزہ آتا تھا۔

اوشا باتیں کچھ اسی طرح کی کیا کرتی تھی۔ اس کی باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہنستے وقت اس کے گالوں میں گڑھے اب بھی پڑتے تھے، آنکھوں میں شرارت اب بھی ناچتی تھی، پھر بھی وہ پہلے والی بات نہ تھی، اس کے راستوں کے چراغ کیسے بجھتے جا رہے تھے اس کا مجھے سدرشن کے ذریعہ علم ہو گیا تھا۔

سدرشن نے مجھے بتایا کہ اس کے والدین اس کی شادی کی بات چیت چلا رہے ہیں، وہ بڑے پیسے والے لوگ ہیں، دلی اور سہارن پور میں کپڑے کی کئی کئی دکانیں ہیں، مکانات ہیں اور بہت سی دوسری جائیداد، اور اوشا کے پتاجی سوچتے ہیں کہ اس کی شادی کسی کھاتے پیتے گھرانے میں ہو گئی تو اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کی شادیاں بھی آسانی سے ہو جائیں گی۔ وہ خود کو بیچ کر بھی کسی نہ کسی طرح یہ شادی کرنا ہی چاہتے تھے۔

روبندر دہلی کے کسی دفتر میں کلرک تھا، کوئی چار سو روپے مل جاتے تھے۔ ویسے اس پر کوئی خاص ذمہ داری نہ تھی۔ صرف بوڑھی ماں تھی، لیکن ان دنوں اتنی کم تنخواہ میں نئی نویلی دُلہن بیاہ کر لانے اور اسے دہلی میں رکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پھر ایک دن سدرشن آئی۔ میں نے پوچھا کہ اوشا کیوں نہیں آئی تو اس نے بتایا کہ روبندر آیا ہوا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر شاید اس طرح اوشا کی کچھ مدد کر سکوں، روبندر سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔

سدرشن نے جو اس سے قبل کئی بار اوشا سے مل چکی تھی، اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ مجھے تو وہ پچیس چھبیس برس کا سنجیدہ اور پرخلوص نوجوان نظر آیا۔ رنگ گندمی تھا جسے مصائب کے نقوش نے ذرا سیاہی مائل کر دیا تھا۔ کپڑے ایسے سادے پہنتا تھا، جیسے عام طور پر لوگ روزانہ پہنتے ہیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ روبندر نے سادہ طبیعت پائی ہے۔ اس کا رویہ میری جانب بس ایسا تھا جیسا اوشا کے بڑے بھائی کی جانب ہونا چاہیے۔

بعد میں مجھے سدرشن نے بتایا کہ اوشا کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی تھی کہ میں نے بھی روبندر کو پسند کر لیا تھا۔

چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں کہ ایک دن سدرشن گھبرائی گھبرائی میرے پاس آئی۔ اس نے بتایا کہ اُوشا کی ماتاجی کا خط آیا ہے۔ سب کچھ طے ہو چکا ہے، تاریخ تک رکھی جا چکی ہے اور

ابھی چھٹیوں میں اس کی شادی بھی ہو جائے گی، اوشا کو ساتھ لے جانے کے لیے اس کے پتاجی بھی آرہے ہیں۔

میں نے سدرشن کو بھیج کر فوراً اوشا کو ہوسٹل سے بلوایا۔

اُوشا نے اپنی عجیب حالت بنا رکھی تھی۔ آنکھیں رو رو کے سُوجالی تھیں۔ شاید جب سے خط آیا تھا اس نے بالوں میں تیل ڈالا تھا نہ کنگھی کی تھی، بس سدرشن کے کہنے سے نہ جانے کیسے کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھایا، سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ میرے سینے میں سر دے کے پھوٹ پڑی۔

"پاگل مت بنو اوشا!" میں نے کہا۔ "میں رویندر کو تار دے کر بلائے لیتا ہوں اور اسے تیرے پتاجی سے ملا کر سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے، سب کچھ بدل سکتا ہے۔"

"اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔" اوشا نے آنسو پونچھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا، پیار سے بھی، غصّے سے بھی سدرشن بھی میرا ساتھ دیتی رہی لیکن اوشا کسی طرح صاف صاف انکار کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ بس روتی رہی اور یہی کہتی رہی کہ "ماتاجی سر پٹک پٹک کر جان دے دیں گی، پتاجی کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

چھٹیوں کے بعد سدرشن نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ اوشا واپس آگئی ہے، لیکن جس خاموشی اور ٹھنڈے طریقے سے اس نے مجھے یہ اطلاع دی تھی اسے دیکھتے ہوئے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ پھر میں نے ایک شام اسے اپنے شوہر کے ساتھ حضرت گنج میں دیکھا۔ وہی پہلے والی شوخی، مسکراہٹ شرارت اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔

یہ وہی اوشا تھی جس نے کچھ دن قبل رویندر کے لیے رو رو کر اپنی آنکھیں سُوجالی تھیں۔ میرے اعتماد کو ٹھیس لگی۔ مجھے ایسے لگا جیسے اوشا نے خود مجھ کو دھوکا دیا ہو۔ کتنے بدل جاتے ہیں یہ انسان ــ! میں دل مسوس کر رہ گیا۔

اس کے بعد کچھ ایسا ہوا کہ میرا یونیورسٹی جانا ختم ہو گیا، اور اوشا سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے امتحان دیا یا نہیں۔

شاید سال ڈیڑھ سال بعد رویندر سے ایک دن سرِراہ ملاقات ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اس نے میرا نام لے کر بالکل پاس سے گزرتے ہوئے مجھے روکا نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ پاتا۔ اُوشا نے اپنے رویہ سے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے سارے متعلقین کی یاد بھی میرے ذہن سے بھلا دی تھی۔ رویندر اب ذرا موٹا ہو گیا تھا، اس کا رنگ بھی نکھر آیا تھا، کپڑے بھی پہلے کے مقابلہ میں اچھے پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ اب وہ یہیں کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہے، تنخواہ بھی اچھی ہے اور اس نے شادی بھی کر لی ہے۔ میں نے اس کو شادی پر مبارکباد دی، تو اس نے کہا۔

"آپ کی بہن صاحبہ کہاں ہیں؟"

اس نے یہ بات نہایت نرمی سے کہی تھی لیکن زہر میں بجھا جو نشتر اس نرمی میں لپٹا تھا وہ میرے سینے کے اندر گھپ گیا۔ میں اس کی جلن اور کڑواہٹ سے تڑپ اُٹھا۔ کچھ بول نہ پایا تو میں نے گردن جھکا لی۔

"کیا لڑکی تھی ــ!" اس نے شاید ایک اور وار کرنے کا فیصلہ کیا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ اس نے مجھے آخری خط میں کیا لکھا تھا۔ میں تو وہ خط ہر وقت اپنے پرس میں رکھتا ہوں کہ کہیں مہارانی جی مل جائیں تو اسے واپس کر کے کہوں۔ ذرا میری بیوی کی صورت اپنی صورت سے ملا تو لیجیے۔"

اب پرس اس کے ہاتھ میں تھا، اس نے ایک چھوٹا سا پرزہ نکالا اور اس کی تہیں کھول کر میری طرف بڑھا دیا۔

تحریر اوشا ہی کی تھی، خط پڑھ کر مجھے ایسا لگا، جیسے میرے پیروں کے نیچے زمین نہ ہو اور میں پاتال کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا ہوں ــــ اس میں جو کچھ لکھا تھا وہ کچھ اس طرح تھا:

"روبیندر صاحب!
زندگی کی خوشیاں چار سو رُوپلی کی نوکری کرکے حاصل نہیں ہوجاتیں، اب جب واقعی فیصلہ کا وقت آگیا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ خواب اور حقیقت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ جیون تو صرف ایک ہی بار ملتا ہے اور وہ بھی تباہ کردیا جائے۔ یہ کوئی عقلمندی کی بات نہ ہوگی، سو رکھتا ہی ہوگی۔ میں ایسا داؤں کیوں لگاؤں جس میں ہار ہی ہار ہے۔
یہ جو میرے گال ہیں اور ہونٹ، جن کو آپ نے نہ جانے کتنی بار گلاب کی پنکھڑی کہا ہے، یہ چار سو روپوں کی دھوپ میں کتنے دن اپنی چمک دمک قائم رکھ سکیں گے۔ میں نے جس زندگی کا خواب دیکھا تھا اس کے لیے تو آپ کی تنخواہ مہینے کے چار ہفتوں میں سے ایک ہفتہ بھی نہ چل پائے گی۔ میرا خیال چھوڑیے اور اپنی حالت دیکھتے ہوئے کسی ایسی لڑکی سے شادی کر لیجئے، جسے اگر آپ تپتی دھوپ میں بھی چھوڑ جائیں تو اس کے گالوں کی رنگت پر کوئی اثر نہ پڑے۔"

میں نے اسی طرح گردن جھکائے ہوئے خط روبیندر کو واپس کر دیا۔ اس کے اصرار پر میں نے کسی روز اس کے گھر آنے کا وعدہ بھی کر لیا، اس سے پتہ بھی لے لیا لیکن اس کے یہاں جانے کی ہمت نہ کر سکا۔

اور اب اُوشا میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، ڈھلے ہوئے جسم اور بے ترتیب بالوں نے میرے دل سے سارا غصہ نکال کر پھینک دیا تھا۔ اور پیار کی وہی پرانی چنگاری پھر سے سلگ اٹھی تھی۔ میں بمشکل کہہ سکا۔

"کیسی ہو اُوشا؟"

میرے سوال کا جواب نہ دے کر اوشا نے مجھے ان صاحبہ سے متعارف کرایا جو اس کے ساتھ تھیں۔

"یہ ہیں میری نند سبھدرا دیدی۔"

یہ اس بات کی تنبیہ تھی کہ کشن بھیا! اس وقت میں اکیلی نہیں ہوں، میری نند بھی میرے ساتھ ہیں۔ آپ کے دل میں پیار کا جو ساگر اُمڈ پڑا ہے اسے میں دیکھ رہی ہوں لیکن اسے اس وقت دل کے کسی کونے میں دبائے رکھیے۔ دیکھیے اگر اس سمندر کا ایک قطرہ بھی آپ کی آنکھوں میں آگیا تو میں ——— اب جو کچھ بھی رہ گئی ہوں ——— اس میں ڈوب جاؤں گی۔ میری سسرال والے مجھے اس میں زندہ ہی ڈبو دیں گے۔

سبھدرا نے ہاتھ جوڑ کر بالکل رسمی طریقہ سے نمستے کیا اور میں نے بھی اسی طرح جواب دیا۔ پھر اوشا بولی۔

"اچھی ہوں۔ کل ہی آئی تھی، آج رکوں گی، کل شام دلّی چلی جاؤں گی۔ چلیے آپ سے ملاقات ہوگئی۔ اور ہاں کشن بھیا آپ نے شادی کر لی؟"

"ہوں! ——" میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پھیلا کر جواب دیا۔

"اور مجھے پوچھا بھی نہیں ——!"

یہ جملہ پہلے والی اوشا نے کہا تھا ——— چار سال اُدھر یونیورسٹی میں پڑھنے والی شوخ اور چنچل اوشا نے۔ میں نے اس پرانی اُوشا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں ایک تصویر نظر آئی۔ یہ تصویر روبیندر کی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک غم جھلکتا ہوا دکھائی دیا ——— یہ غم روبیندر کا تھا۔

میرے سینے میں غم کا طوفان موجیں مار رہا تھا۔ میں نے سوچا پوچھوں۔ "اُوشا! تو اب بھی اتنی اچھی، اتنی معصوم اور اتنی بھولی ہے۔ پھر تجھے اس وقت کیا ہوگیا تھا۔ جب تونے روبیندر کو خط لکھا تھا۔ ایک بار کہہ دے اُوشا! کشن بھیا وہ میری بھول تھی، کیا آپ میری غلطی معاف نہیں کریں گے؟"

(باقی ص۴۳ پر)

عبداللہ کمال
۱۷ ظہور شاہ جی بلڈنگ
لیمنگٹن روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۰۹

غزل

چشمِ حسرت دیدہ، حرفِ خط کشیدہ ہوں
میں کہ تیرے شہر میں دامن دریدہ ہوں

اپنے خوں کا ذائقہ سرشار رکھتا ہے
اپنے ہی سر پر میں تیغِ خوں چشیدہ ہوں!

دشمنوں کے درمیاں بھی زندہ ہوں، لیکن
خوف اپنا ہے کہ بہ ہمہ خود گزیدہ ہوں

برگ و بار اندر ہی اب پروان چڑھتے ہیں
میں شجر صحرا زدہ، طوفان دیدہ ہوں

جھیل لوں گا اب میں ہر موسم کی سفاکی
فرض کر لوں گا کہ دست و پا بریدہ ہوں

دیکھیے کھلتے ہیں کب عیب و ہنر میرے
یعنی اب تک غیر مطبوعہ جریدہ ہوں

خواب پلکوں پہ ابھی تک رقص کرتے ہیں
شہر، میں تجھ سے ابھی تک خوش عقیدہ ہوں

ڈاکٹر یوسف گوہر شاہجہانپوری
مظہر انٹیسری اسکول ۔ ایمن زئی
جلال نگر ۔ شاہجہانپور

غزل

ہر سمت آگ کا ہے سمندر میں کیا لکھوں
ہر ذرّے میں ہے خوئے ستم گر میں کیا لکھوں

کانٹے ملے ہیں مجھ کو گلوں کی تلاش میں
برگشتگیٔ حالِ مقدّر میں کیا لکھوں

رشتے حصارِ خود نگری میں سمٹ گئے
اب کوئی ماں، بہن نہ برادر میں کیا لکھوں

جن کے گھروں میں دورہ ظلمت ہے اُن سے پُوچھ
بربادیوں کا لوگوں کی منظر میں کیا لکھوں

کل تک جو غمگسار تھے میرے رفیق تھے
آج ان کے ہاتھ میں بھی ہے خنجر میں کیا لکھوں

افسانہ

فاطمہ حسن

کفارہ!

میں، سارا حوصلہ چھوڑ بیٹھی. صبر و شکر کے ساتھ پوری عمر ایسی ہی خاموشی سے گذار دینے کا سارا عزم متزلزل ہوگیا۔ میں کیا کروں؟ کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔ زندگی میں کوئی آسرا کوئی سہارا تو لینا ہوتا ہے نا ــــ مجھے بھی بڑا سہارا دیا تھا اس پتھر والی پگڈنڈی نے۔ جب جب میرا دم گھٹتا، اندر کمرے میں گھٹن ہی گھٹن ہو جاتی میں گھبرا کے کمرے کی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیتی. ٹھنڈی ہوا کا ہلکا سا جھونکا میرے اندر کی اس گھٹن سے بے نیاز گذر جاتا۔ حسب معمول میری نگاہیں پچھواڑے کھلنے والی کھڑکی کے سامنے ہی دس بارہ فٹ لمبے اور دو فٹ چوڑائی لیے پتھروں کے پکّے فرش کی اس پتھر کی پگڈنڈی پر ٹھہر جاتیں. ایک لائن میں تین اور پھر دو پتھر جڑے برابر اٹھارہ قطاریں جمی پڑی تھیں. اس کے چاروں طرف سوکھی، اُجاڑ زمین تھی اور پھر دور پر کوٹھی کے کمپاؤنڈ کی اونچی تین طرفہ دیواریں۔ ہرے بھرے پیڑ پودے، تناور درخت، پھل پھول کیا کچھ موجود نہیں ہے یہاں، مگر پتھروں کو جوڑ کر بنے اس لمبے سے ٹکڑے کے سرے پر نہ تو کوئی پھولوں بھری کیاری تھی، نہ کوئی سرسبز پودا، اور نہ ہی کسی دیوار سے اور نہ ہی عمارت کے کسی حصّے سے اس کے سرے جا کر ملتے تھے.

میں سوچتی جب اسے کسی سے کہیں جوڑنا ہی نہیں تھا تو پھر بنایا ہی کیوں گیا. کیا میری طرح بے مقصد وجود اس کا بھی ہے؟ پچھلے سات مہینے سے میں گھبرا گھبرا کر یہاں اس کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑی سوچتی رہتی ہوں۔ کیسی مطابقت ہے ہم دونوں میں۔ بس یونہی پڑے ہیں، نہ کوئی سجانے سنوارنے والا نہ کوئی اپنا بنانے والا۔ لیکن پیدا کرنے والا اپنی مصلحت آپ سمجھتا ہے۔

مجھے پیدا کر کے میری اماں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں باپ، نانا امی کی گود میں مجھے ڈال کر ایسے کنارہ کش ہوئے جیسے اپنے سارے فرائض میرے سلسلے میں پورے کر چکے ہوں۔ سنا تھا وہ ہیں، اور اپنے بال بچوں میں خوش ہیں۔ میں نے کبھی انھیں دیکھا ہوتا، تو ان کا کچھ حال بھی جان لیتی۔ اللہ جانے وہ باپ کیسے ہوتے ہیں جو ماں کے مرنے کے بعد اپنی اولاد سینے سے لگا کے عمر یونہی گذار دیتے ہیں۔ کیا معلوم اس ایک اتنی بڑی دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔

بیچاری نانا امی تو اپنی حیات کے دن پہلے ہی کافی گذار چکی تھیں، میرے ساتھ جینے کے لیے ان کے پاس تھوڑا ہی عرصہ تھا وہ پورا ہوگیا اور میں ماموں جان اور ممانی جان کے ہاتھوں سونپ دی گئی۔ یہی دُنیا کا دستور ہے اپنوں کو اپنے ہی سمیٹ لیتے ہیں مگر میں تو نانا امی کے بعد ڈیڑھ سال رہ کر بھی ماموں جان اور ممانی جان کو ہی اچھی طرح نہ جان پائی تھی، پوری دُنیا کی خبر کیسے لیتی۔

میرے ماموں اور ممانی بھی دو بچّوں کے والدین تھے. گلریز بھیّا مجھ سے بڑے اور ماہ رُخ مجھ سے چھوٹی۔ میں دونوں کے بیچ کی۔ اور شاید دونوں کی زندگی کی راہوں میں مستقبل قریب میں روڑا بلکہ میرا اٹک جانا ممکنات میں سے تھا جسے ان کے گھر میں میرے قدم

رکھتے ہی مُمانی نے محسوس کیا مگر کسی خطرے کے لاحق ہونے کا اعلان تو کیا نہیں، پھر میں کیا بھتی اگر اس اندھیری رات میں سوتے سوتے میری آنکھ نہ کھل گئی ہوتی اور سرسر کرتے مُمانی جان کے الفاظ میرے کانوں میں نہ پڑ گئے ہوتے :

"تم سمجھتے کیوں نہیں ــــ ایک طرف گلریز میاں دن رات اس کے پیچھے پیچھے ہیں اور دوسری طرف مجھے فکر ہے مہ رُخ کی۔ یہ کمبخت مہ جبین ایسی خوبصورت ہے کہ اچھی بھلی مہ رُخ کی صورت اس کے سامنے دب کر رہ گئی ہے۔ آئے گئے سبھی تو مہ جبین کی صُورت کی تعریفیں کیا کرتے ہیں۔"

"ہوں۔ یہ تو ہے۔" ماموں کہہ رہے تھے۔

"پھر۔ پھر تم کچھ کرو۔ کہیں ڈھونڈھ کر مہ جبین کو کر کرا دو۔" مُمانی نے بیچارگی سے کہا تھا۔

"ہاں۔ اب دیکھوں گا۔"

ماموں کی نیند سے بھری آواز سُنائی پڑی۔ میرا سارا بدن پسینے سے تر ہو گیا۔ "اللہ! اللہ تو کیا؟ ــــ تو کیا اسی لیے مجھے گلریز بھائی کے آس پاس دیکھتے ہی مُمانی جان کو کوئی نہ کوئی کام یاد آجاتا ہے۔" مجھے گلریز بھائی کی بار بار کہی ہوئی بات یاد آگئی۔

"ممی! تھوڑی دیر کو کچھ کام روک بھی دیا کیجیے ــــ آپ کو کام یاد آیا اور مہ جبین کو پکار دیا۔ ممی پلیز! اسے اٹھا دیا تو میرا گیم چوپٹ ہو جائے گا۔ دیکھیے نا ہم تین ہیں چوتھا ہاتھ ڈمی ہے۔" تاش کے پتے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ممانی جان کو دکھاتے ہوئے گلریز بھائی کہتے اور میں آدھی اٹھتی اور پھر بیٹھ جاتی اب مجھے سمجھتے دیر نہیں لگی کہ ایسا بڑا خطرہ دور کرنے کی ترکیب میں ماموں جان اور مُمانی جان جلدی ہی کریں گے۔

شاہد حسین سے چٹ پٹ میرا نکاح پڑھوا کر مُمانی جان نے میرے ہاتھوں میں ننا امّی کے چھوڑے ہوئے دونوں بکسوں کی کنجیاں تھما دیں۔ شاہد کے ساتھ رخصت ہوتے ہوئے بھی میرے کان منتظر تھے مگر گلریز بھائی کی آواز نہ آنی تھی اور نہ آئی ــــ

"ممی پلیز اسے اُٹھا دیا تو میرا گیم چوپٹ ہو جائے گا۔"

خبر نہیں گلریز بھائی کے گیم کا کیا بنا۔ میں تو اٹھ کر شاہد کے ساتھ اپنی سسرال کی اس کوٹھی میں آگئی، جہاں پہلی ہی رات کو شاہد نے منٹوں میں اپنا گیم کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی آواز میں مجھے سمجھا دیا۔

"مہ جبین! میں اصُولوں کا آدمی ہوں۔ تمھارے ماموں اور مُمانی تو واقف ہیں، یقیناً تمھیں بھی انھوں نے آگاہ کر دیا ہوگا۔ اگر نہیں جانتیں ہیں تو میری امی جان بیچاری جنھوں نے اپنے دل کا ارمان پورا کرنے کو یہ شادی ــــ ہاں تم سے میری شادی کی ہے اور انھیں معلوم بھی نہیں ہونا چاہیے۔ وہ میری پسند کی پہلی شادی ہے اب تو کئی برس ہو گئے۔ دو بچے بھی ہیں۔ ناہید میری بیوی ہیں وہ اکلوتی ہیں نا، بڑا بزنس ہے سب وہیں کلکتے میں ہیں ــــ کیا کرتا امی جان کی مرضی نہیں تھی ــــ اور وہ بیچاری تو یونہی غموں سے ٹوٹی پلنگ پر پڑی اپاہج ہیں، سالوں سے بس زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں، انھیں صدمہ ہوتا ــــ کیا کرتا۔ ہمیں تو آج بھی ایک دوسرے سے پہلے جیسی محبت ہے۔ اسی لیے امی جان سے پوشیدہ میں نے تمھارے سرپرستوں کو آگاہ کر دیا تھا۔ ویسے بھی امّی جان کی علالت، ان کی تنہائی اور معذوری کی وجہ سے مجھے اس گھر میں تمھاری ضرورت تھی۔" ــــ

نہ جانے شاہد کب تک میرے کمرے میں ٹہلتے اور بولتے رہے۔ میرے کان تو کیا سارا وجود ہی سُن ہو گیا تھا۔ میں اپنی جگہ جمی بیٹھی تھی۔ نہ معلوم کب شاہد کمرے سے نکل کر جا چکے تھے، اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میرے اندر گھٹن بڑھتی گئی۔ اس کمرے میں گھٹن ہی گھٹن تھی۔ میں مسہری سے نیچے زمین پر اتر کر کھڑی ہو گئی اور اپنے سامنے والی کھڑکی کے بند پٹ کھول دیے۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا میرے اندر کی گھٹن سے بے نیاز گزر گیا ــــ میرے کانوں میں اذان کی آواز آئی۔ مجھے یاد آیا کل رات جب میں یہاں آئی تھی تو میرے آنچل پر شاہد نے نماز پڑھی تھی یا ان سے رسماً پڑھوائی گئی تھی ــــ یہ آنچل تو اس وقت بھی ویسا ہی کورا ہے۔ وضو کر کے میں نے فجر کی نماز ادا کی۔

شکوہ گلہ کس سے کرتی۔ ماموں، ممانی نے پھر کبھی خبر ہی نہیں لی۔ میں خود بھی ان سے میلوں دور آکر الگ ہوکر سمٹی ہی رہ گئی۔ شاہد اس رات کے بعد کبھی پھر میرے کمرے میں نہیں آئے۔ میرا پلنگ ان کی امّی کے کمرے میں بچھا دیا گیا۔ وہ الگ میرے کمرے کے بغل والے کمرے میں سوتے۔ امّی جان کی دوائیں، نسخے اور ڈاکٹروں کے فون نمبر وغیرہ کے ساتھ تیمارداری کی چھوٹی بڑی باتیں سمجھا کر تیسری صبح شاہد کلکتہ چلے گئے۔ مہینے پندرھویں ایک دو گھنٹے کو وہ آتے، دوسرے تیسرے دن امّی جان سے فون پر بات کرتے، مجھے ان کی تکلیفوں کے لیے ہدایتیں دیتے کہ اب کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں۔ گھر کا سارا کام اچھن بُوا اور کریم اللہ سنبھالتے اور سارا انتظام میرے ہاتھوں میں دھیرے دھیرے آتا گیا۔ امی جان ہنسی خوشی بڑی بڑی مجھے دُعائیں دیتی جاتیں — لیکن نہ جانے مجھے کیا ہوتا اچانک میرا دم گھٹنے لگتا، دن ہو یا رات میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر اسی پتھروں کی بنی پگڈنڈی کو دیکھنے لگتی۔ خود بخود اپنی کیفیت سے اس کا موازنہ کرتی گھنٹوں گزار دیتی۔ مجھے اس کو دیکھ کر لگتا کچھ تو ہے اس دُنیا میں میرے جیسا — جس کا اور چھور کسی سے نہیں جُڑا ہوا ہو۔

امی جان مجھے دُلہن کہتیں، عزیز رشتہ دار شاہد کی دُلہن، گھر کے نوکر چاکر بیگم صاحب اور خود شاہد مجھے امی جان کی بہو بیگم کہتے — اور میں سوچتی ٹھیک ہی تو ہے رشتوں کی پہچان کے لیے کچھ نام دیئے جاتے ہیں، جن کا کوئی رشتہ ہی نہ بنا ہو وہ قریبی رشتہ کی مدد سے ہی تو پہچان بتا پائیں گے۔

دن گزرتے گئے۔ امی جان کی زبان مجھے دُعائیں دیتے دیتے خشک پڑنے لگی تھی مگر دلہن کی طرح پوتے پوتیاں دستیاب نہیں ہوا کرتے جو امی جان کی زبان سے نکلنے والے اس دوسرے ارمان کو بھی ہاتھ کے ہاتھ پُورا کر دیتے۔ ان کی دُعائیں سُن کر میرے دل سے دھواں سا اُٹھتا۔ میرا دم گھٹتا اور میں اسی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔ سامنے کی زمین پر جُڑے پتھروں کو ایک ایک کر کے شمار کرتی۔ نجانے کیسے اپنائیت سی ہوگئی تھی مجھے ان پتھروں سے۔ ان پر نظر گاڑ کر تقابل کرنے سے کیسی تسکین مل جاتی مجھے۔ اس پتھر کی پگڈنڈی سے سہارا آسرا لیتے لیتے نجانے کیسا تال میل قائم ہوگیا تھا اس بے زبانی کی زبان میں۔

امی جان گزر گئیں، شاہد ان کے آخری دنوں میں برابر یہاں مقیم رہے۔ مگر پھر جو گئے تو تین مہینے کا غوطہ مار کر آج آئے تو ہمراہ اپنے بچوں اور بیوی کو بھی لے آئے۔ نہ معلوم ان کے دونوں بچوں اور بیوی پر نظر پڑتے ہی مجھے ایک خوف سا کیوں محسوس ہوا مگر پھر میں گھر کے کام اور کھانے کے انتظام میں لگ گئی۔ اس وقت سے اب تک بس یہی سوچتی رہی کہ یہاں سب کو لانے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی شاہد میرے بغل والے کمرے میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سونے چلے گئے۔ رات خاصی اندھیری تھی۔ میں بڑی دیر سے چپ چاپ اپنی مسہری پر نیند آجانے کے انتظار میں پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ ہوا کی سی سرسراتی آوازیں شاہد کے کمرے سے نکل کر میرے کانوں میں پڑیں۔

"ہائے۔ بیچاری مہ جبین۔ اتنی خوبصورت ایسی اچھی لڑکی ناقدرا شوہر ہے اس کا!"

"ہوں۔" شاہد کا جواب تھا۔

"بہت دن ہو گئے نا اس کی شادی کو"؟

"ہوں!"

"تم اس کے شوہر سے کچھ کہتے کیوں نہیں — ایسے کیونکر کاٹ پائے گی غریب اپنی زندگی۔"

"ہوں!"

"اوہو — شاہد کچھ تو خیال کرو بیچاری کا۔ تمہاری غریب رشتہ دار ہے۔ ذرا سوچو تمہارے علاوہ اور کون ہے اس کا۔ وہ بیچاری معصوم لڑکی کب تک اپنے شوہر کے نام پر بیٹھی رہے گی۔؟"

"ہوں!"

"کچھ کہو بھی شاہد ــــ کیا کرنا ہے ــــ بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

"ہوں۔"

"ارے ــــ اچھا کچھ نہ کہو ــــ شاہد تم اس کی دوسری شادی کرادو۔"

"ہوں۔"

"ہاں شاہد۔ یہ تو بڑا ظلم ہے اس بے چاری پر ــــ اس کے شوہر سے طلاق لے کر کرادو نا اس کی دوسری شادی۔"

"ہوں۔"

"ہاں سنو شاہد! وہ طلاق نہیں دیتا تو تم کچھ کرو شاہد پلیز شاہد۔ اب تو اس بیچاری کو تمھاری امی جان کا سہارا بھی نہیں رہا۔ بیچاری لڑکی ہے ابھی تو ساری عمر پڑی ہے اس کی ــــ شاہد سنو ــــ تم بہت کچھ کر سکتے ہو ــــ میں بھی ڈھونڈوں گی اس کے لیے ایک اچھا سا شوہر۔"

جواب میں شاہد کے خرّاٹے سُنائی پڑنے لگے۔

"اوہو۔ جنونست شاہد۔ تم مجھے ذرا بتاؤ یہ مہ جبین کیوں سورج مکھی کے پھول کی طرح اپنے شوہر کو آفتاب سمجھے تکتی رہ کر دن گزار رہی ہے۔ آخر وہ ایک زندہ اور سمجھدار لڑکی ہے۔ خود اپنے مستقبل کے لیے سوچ سکتی ہے۔ بتاؤ شاہد تم نے کبھی اس سے بات کی۔ مہ جبین نے کچھ کہا کبھی ــــ اُف فوہ! تم پھر سو گئے ــــ سوؤ نہیں شاہد۔ ارے تم تو واقعی سو گئے۔"

ناہید کے لہجہ میں بڑی بیچارگی اور مایوسی تھی۔ کمرے میں شاہد کے خراٹے گونج رہے تھے۔ کوٹھی کی تاریکی میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ مگر میرے اندر کا سکوت درہم برہم ہو گیا، اور میں بے چینی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑکی کے پٹ کھول دیئے ہمیشہ کی طرح آج بھی ٹھنڈی ہوا کا ہلکا سا جھونکا میرے اندر کی کیفیت سے بے نیاز گزر گیا۔ حسبِ معمول میں نے اس پتھر کی پگڈنڈی پر نگاہیں جمانی چاہیں تاکہ اسے دیکھ کر اپنا سارا حوصلہ، ضبط اور صبر برقرار رکھنے کا پہلے جیسا عزم قائم رکھ سکوں۔ مگر کھڑکی کے باہر چہار سو گہرا اندھیرا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گم پتھر کی وہ پگڈنڈی بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس خیال سے میں لرز گئی۔ میرے اندر کی ساری ہمت جواب دے گئی۔ میں بے دم، بے سہارا اور کمزور سی بستر پر آ گری۔ خالی دل و دماغ لیے نجانے کب تک پڑی رہی۔ اچانک میری نگاہوں کے سامنے ناہید کا چہرہ آ گیا اور پھر اس کے منھ سے ذرا دیر پہلے کا نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے خالی ذہن کی دیواریں پھاند پھاند کر مجھ سے سوال کرنے لگا۔ میں سوچنے لگی کیا کروں۔

یقیناً شاہد نے میرے بارے میں ناہید کو کچھ نہیں بتایا تھا اور اس وقت اس کے پوچھنے پر تو سونے کا بہانہ بنا کر شاہد صاف ٹال گئے لیکن آنے والی صبح میں تو اس گھر کا ہر در و دیوار ناہید کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔ پھر ــــ؟ پھر کیا ہوگا۔؟ پھر کیا ناہید کے دل میں میرے لیے ایسا درد، اتنی ہمدردی اور ایسی بھرپور محبّت باقی رہ پائے گی۔؟ میں سوچ میں پڑ گئی اور پھر انہی سوچوں میں میرے اندر سے ایک آواز سی اُبھری۔

"بزدل! ڈرپوک۔ ہاں ایک بودی بے وقوف لڑکی ذرا سی ہمت کرو بس کہیں کچھ نہیں ہوگا ــــ یہ درد تمھارا اپنا درد ہے پہچان لو اسے۔ یہ وہ درد تو نہیں ہے جسے لا دوا سمجھ کر تا حیات پتھر دل بن کر بیٹھنے کا عزم، حوصلہ اور آسرا چاہتی رہ جاؤ۔"

اور تب مجھے ایک احساسِ تقویت ہوا۔ اپنی ساری ہمّت سمیٹ کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ شاہد سے الگ ہو کر مجھے اپنی منزل آپ بنانے کی جستجو کرنی ہے اور پھر میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لیا کہ کل صبح ناہید سے ساری باتیں میں خود کہہ دوں گی۔ اس یقینی فیصلے کے بعد اب مجھے ایک گہرے سکون کا احساس ہوا۔ پچھلے سات مہینوں سے بے چین کر دینے والا وہ سارا درد اور اس کی گھٹن یکلخت ختم ہو گئی۔ اب کمرے میں کھلی صاف ہوا ہے اور مجھے بڑی زوروں کی نیند آ رہی ہے سو جانے کے لیے میں نے آنکھیں بند کر کے اطمینان سے کروٹ بدلی ہے۔

اس گھر میں یہ میری پہلی پرسکون رات تھی۔

لیکن گئی رات کے کسی پہر بجلی کی روشنی سے میں جاگ اٹھی۔ ہونٹوں پر انگلی رکھے مجھے خاموش رہنے کا اشارا کرتے ہوئے اپنے سامنے شاہد کو کھڑے دیکھ کر قبل اس کے کہ حیرت اور گھبراہٹ سے میں چیخ پڑتی، شاہد نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور مجھے لیے ہوئے کوٹھی کے دوسرے کنارے پر آ گئے۔ نہ جانے شاہد کب سے اور کب تک بولتے گئے — میرے حواس لوٹے تو کانوں میں شاہد کے بیچارگی سے کہے ہوئے چند جملے پڑ گئے۔

"تم تو کچھ بولو گی ہی نہیں — اچھن بوا اور کریم اللہ بخوبی واقف ہیں، مزید انھیں سمجھا بھی دیا ہے۔ یقین کرو مہ جبین! میں ناہید کو کبھی روک نہیں سکا، جو وہ سوچتی ہیں کر گزرتی ہیں۔ امی کی آڑ اٹھ گئی تو ایک دم سسرال آ گئیں اور اب آ کر تمھارے معاملے میں انھیں دلچسپی پیدا ہو گئی تو بس سمجھو اب وہ تمھیں ادھیڑنے میں لگ گئیں۔ کارروائی تو پچھلی بار ہی آ کر کر گیا تھا لیکن اب کل ہی صبح وکیل سے سارے کاغذات تیار کرا دوں گا۔ بس شام تک طلاق نامہ، مہر کی رقم اور کچھ اور — میں سخت نادم ہوں — کیسی مجبوری تھی، بہرکیف اب تو شرمسار ہوں اور تمھارا گنہگار بھی۔ اپنے گناہ کا کفارہ تو مجھے دینا ہی ہے اسلیے سوچتا ہوں بطور کفارہ کچھ اور بھی —" آگے کے الفاظ اپنے منہ میں لیے شاہد مجھے وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

نہ معلوم کب اور نجانے کیسے میں واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

"اُف فوہ! دوپہر ہو گئی اور تم مہ جبین اب تک سوئی پڑی ہو — اٹھو بھی اب مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں — ارے تمھیں تو تیز بخار ہے۔!" یہ ناہید کی آواز تھی۔

"تم تو بیمار ہو گئیں — خیر میں نے شاہد کو بھیجا تو صبح سویرے ہی ہے۔ شام تک آ جائیں گے — میں ابھی ڈاکٹر بلواتی ہوں"۔

مجھے کوئی جواب نہ سوجھا — ناہید کمرے کے باہر چلی گئیں۔ میری آنکھوں سے نیند اڑ گئی — دن کے یہ چند گھنٹے آخر کسی طرح مجھ پر سے گزر چکے تو ناہید کی آواز میرے کانوں میں گونج گئی۔

"او ہو شاہد تم یقیناً عظیم ہو — اس معصوم لڑکی کی زندگی ایک جابر کے چنگل سے چھڑا لائے — تمھارے اس زبردست کارنامے سے مہ جبین بہت خوش ہو گی تم دیکھنا شاہد — ہاں اب ہم اسے اپنے ساتھ کلکتے لے جائیں گے وہاں ممی کی کئی ایک سہیلیاں ان دنوں خوبصورت بہو کی تلاش میں ہیں۔ میں نے مہ جبین کے بارے میں ممی کو آج ہی خط میں لکھ دیا ہے"۔

بطور کفارہ میرے ہاتھوں میں ایک کثیر رقم کا چیک اور طلاق نامہ تھما کر شاہد اپنے بچوں اور بیوی کو لیکر شہر گھومنے چلے گئے ہیں۔ اور میں کفارے میں ملے کاغذ کے ٹکڑوں کو ہاتھ میں لیے اپنے بستر پر بیٹھی ہوں — رات بہت گہری ہوتی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ میں بھی گہری سوچوں میں ڈوبتی جا رہی ہوں مگر اپنی زندگی کا سرا اب بھی میرے اپنے ہاتھوں میں آتا نہیں معلوم دیتا ہے۔

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

رسالہ کا نام: "رُوحِ ادب" (سہ ماہی)

ایڈیٹر: محمد نظام الدین

قیمت: سالانہ ۱۶ روپیے فی شمارہ: پانچ روپیے

ملنے کا پتہ۔ ویسٹ بنگال اُردو اکاڈمی، ۱۷۔ سندری موہن ایونیو۔ کلکتہ

زیرِ نظر شمارہ ۸، اپریل تا ستمبر ۱۹۸۶ء ہے۔ اُردو قارئین کو صحت مند نثری اور شعری ادب ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ بنگلہ ادب کے مشاہیر ادبا اور ان کی تخلیقات سے بھی روشناس کراتا ہے، اور قومی یک جہتی کو مستحکم بنانے کے سلسلے میں یہ رسالہ خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے

زیرِ نظر شمارہ میں ویسے تو ۱۶۰ صفحات میں ۴۳ صفحے شعری ادب اور نظموں، ۶۶ صفحے نثری ادب، ۳ صفحے بنگلہ ادب، ۷ صفحے غزلوں، ۲۵ صفحے افسانے اور ۷ صفحے ڈرامہ کے علاوہ تبصرہ کتب، آئینۂ خیال اور خبرنامے کے شامل ہیں۔ تنوعِ مضامین کے اعتبار سے ہر مضمون دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے لیکن صفحہ ۷ پر پروفیسر عنوان چشتی کا مقالہ "مومن کی پیکر تراشی: غزل کے حوالے سے" غور طلب ہے۔

بنگلہ کے مشہور افسانہ نگار منوج مترا کا افسانہ، جس کے اُردو مترجم قیصر شمیم ہیں "الٰہی کا پیٹر" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، ترقی پسند رجحانات کو اجاگر کرنے کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے امید ہے کہ سنسکرت اور ہندی زبانوں کے شہرۂ آفاق ادب کے تراجم کو بھی رسالہ کے آئندہ شماروں میں جگہ دی جائے گی۔

رسالہ کا کاغذ، کتابت، طباعت اور سرورق اچھا ہے۔

——— دیا شنکر

نام کتاب: "کربِ شب"

مصنف: واحد علی خاں واحد القادری قیمت: تیس روپئے

ملنے کا پتہ: محشر اکیڈمی۔ رزڑ۔ رام پور، یوپی۔

غزل نے دلی اور لکھنؤ کے سفر کے دوران تازہ دم ہونے کے لیے روہیلوں کی بستی رام پور میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا اور اس طرح دبستانِ رامپور کی بنیاد پڑی، جس کا تعلق امیر مینائی اور غالب سے بھی رہا۔ اسی دبستان کے کہنہ مشق اور استاد شاعر ہیں۔ حضرت واحد القادری جن کی پہچان ان کے شعری مجموعہ "کربِ شب" کے لہجہ سے ہوتی ہے ؎

زندہ بھی ہوں، ماحول پہ چھایا بھی ہوا ہوں
اندر سے اصولوں کی طرح ٹوٹ چکا ہوں

شاعر موصوف محشر عنایتی کے شاگرد اور کئی درجن شعراء کے استاد ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں طویل و بے کراں شب کے کرب کو من و عن سمیٹ کر کہتے ہیں ؎

اس شخص میں تو ساری لچک تیغ کی سی تھی
ہم شاخِ گل سمجھتے ہوئے بار ہا ملے

انھوں نے زمان و مکان کی وسعتیں سمیٹتے ہوئے غزل میں کرب و انتشار کو تیکھی آواز میں سموتے ہوئے منزلِ حیات تک پہنچنے کی کوشش کی ہے ان کی شاعری یکسر داخلی ہے جس میں سوز و گداز بدرجۂ اتم موجود ہے

کیسا حسین تھا آدمی انساں تھا جن دنوں
کتنے مہیب آج اس انساں کے سائے ہیں

———

ہمارے شہر میں ایسے بھی لوگ بستے ہیں
کہ روز ملتے ہیں اور اجنبی سے لگتے ہیں

———

ترا تکلم، ترا تبسم، ترا ترنم، تری خموشی
وہ چٹکے غنچے، وہ برق چمکی، وہ پھول بکھرے، وہ کھو گئے ہم

———

ڈالی ہے ہم نے پھر نئی تعمیر کی طرح
اپنی انا کو توڑ کے زنجیر کی طرح

اک خوش گوار کرب سا تنہائیوں میں ہے
جینے کا لطف آج بھی پُروائیوں میں ہے

پڑے گا فرق ضرور آئینوں کی قیمت میں
کسی نظر کے اگر زاویے بدل جائیں

واحد القادری ہر صنفِ سخن پر قادر ہیں۔ ان کو زندگی کی طویل و بے کراں شب کے کرب کو اشعار میں سمیٹنے کا فن اچھی طرح آتا ہے کتاب کی ظاہری صورت اور کتابت و طباعت بھی خوش نما ہے۔

——— ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

نام کتاب: "جدید ہندی ادب کے معمار"
مصنف: خواجہ وجیہ الدین قیمت: بیس روپیے
ملنے کے پتے: دانش محل امین آباد، مکتبۂ دین و ادب امین آباد،
گیانالیہ ۱۳۶ راجہ بازار لکھنؤ، نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ
امین آباد لکھنؤ۔ پنجابی پستک بھنڈار نئی دہلی

"جدید ہندی ادب کے معمار" خواجہ وجیہ الدین کی مرتب کردہ کتاب اُردو میں ہندی ادب کو روشناس کرانے کی ایک اچھی کوشش ہے ترجمہ سادہ اور سلیس ہے۔

خواجہ وجیہ الدین نے بھارتیندو بابو ہریش چندر سے آگے اور دوسرے مختلف اہلِ قلم کا تعارف مع ان کی تخلیقات کے سادہ زبان میں کرایا ہے۔ انھوں نے ہندی کے اہلِ قلم کو اپنی حد تک ان کی زبان اور شیلی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسی لطف اور چاشنی کے ساتھ اُردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہر زبان کے ادیبوں اور اس کے جاننے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہد اور ہم عصر دوسری زبانوں کے تخلیقی ارتقا سے روشناس ہوں تاکہ انھیں یہ معلوم ہو کہ اپنے ملک کی دوسری رائج زبانوں میں تخلیقی عمل کی نوعیت کیا ہے۔

ہر چند کہ ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے لیکن دوسری زبانوں کی بہ نسبت اردو اور ہندی کے درمیان اتنی مشکلات نہیں ہیں۔ اُردو میں ہندی ادب کو منتقل کرنے کا کام بہت سے اُردو داں حضرات کر رہے ہیں ان میں ڈاکٹر صادق کا نام کافی نمایاں ہے۔ ان کے علاوہ خواجہ وجیہ الدین بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

——— وقار ناصری

نام کتاب: "قطرہ قطرہ سمندر"
شاعرہ: فاطمہ وصیہ جائسی
قیمت: بیس روپیے
ملنے کا پتہ: ۳۷۔ ساتویں گلی۔ نشاط گنج لکھنؤ

فاطمہ وصیہ جائسی نے جس علمی ماحول میں آنکھ کھولی اس کا پس منظر عربی و فارسی تھا۔ اس لیے وصیہ جائسی کو الفاظ پر پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ جدیدیت کے دھارے میں نہیں بہی ہیں۔ ہمارے شعری ادب کا سرمایہ نئی جہتوں اور نئے امکانات سے آشنا ہوا ہے۔ لیکن اگر ماضی کی صالح روایات سے حال کا رشتہ یک لخت ختم ہو جائے گا تو ہمارا ادب ہوا میں معلق نظر آئے گا۔ پرانی علامتوں میں نئی معنویت کا اظہار، فاطمہ وصیہ جائسی کے فن کی پہچان ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تخلیقی عمل کے پیکر کو مستعار نہیں لیا ہے ؎

غم پرائے نہیں اپنے ہیں وصیہ سچ ہے
ہم نے جو بات لکھی دل کی زبانی لکھی

ہم جی رہے ہیں اب بھی اُسی اعتماد سے
آئے گی صبحِ نو یہ ہمارا یقیں تو ہے

ایک فن کار کی سچی پہچان اس کی شاعری کا محور ہے، اور اس کے داخلی شواہد ان کے اشعار میں موجود ہیں ؎

برسیں گھٹائیں اور نہ معلوم ہو سکا
ہے کتنا جذب ریت کے اندر یہ دیکھیے

زمانے والے سمجھتے ہیں جن کو بے وقعت
خلوص صرف انھیں بے گھروں میں باقی ہے

ان کی منظومات میں ہندستانیت کی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ امن اور قومی یک جہتی کا پیغام بھی ملتا ہے۔

—— (ڈاکٹر) ظہیر علی صدیقی

نام کتاب: "شہرِ قلم" (شعری مجموعہ)
شاعر: شوکت مجید قیمت: ۲۵ روپیے
ملنے کے پتے: اُردو فرنٹ ڈی ۴۲/۲۸ جگجیون پورہ (مدن پورہ) وارانسی۔ خورشید اکرم ڈی ۲۸/۴۹ پانڈے حویلی وارانسی۔ محمد داؤد سُنار پُورہ وارانسی۔ عبدالرحمن بنارسی، ۱۵۔ ایلگزینڈر لین اسٹرانس روڈ مدراس ۱۲

شوکت مجید صاحب کا تعلق بنارس کے ایک علم دوست اور تجارت پیشہ گھرانے سے ہے۔ شاعری انھیں ورثے میں ملی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے، جو ۱۱۹ غزلوں اور ۷ متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ 'روشناسی' میں کسی توسل کے قائل نہیں ہیں۔ 'احوالِ واقعی' کے عنوان سے 'پیش لفظ' میں وہ رقمطراز ہیں:

"میں کسی کی تقریظ یا تعارف کے ذریعہ روشناس کرائے جانے کا قائل نہیں ہوں۔ میں کیا ہوں، کیسا ہوں اس بحث سے ہٹ کر جیسا بھی ہوں خود کو اپنے لفظوں میں ویسا ہی پیش کر دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں"!

اس کے باوجود مزید کسی کی تقریظ موجود ہے۔ اس تضاد سے قطع نظر جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے اس میں سادگی، روانی اور پُرکاری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک فعّال، ترقی پسند اور متحرک شاعر ہونے کے باوجود شوکت صاحب نے کلاسیکی اور جدید شاعرانہ طرز میں توازن قائم رکھا ہے۔ ان کے یہاں عصری حسیت کا بیباکانہ اور برجستہ اظہار پایا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے مندرجۂ ذیل اشعار سے ہوتا ہے:-

آدمیت کو پرکھنے کی نہ کوشش کر سکے
آدمی کی شکل ہی کو آدمی کہتے رہے

شجر کے سائے بھی اب ناگ بن کے ڈستے ہیں
کہاں قیام مسافر کرے کہاں نہ کرے

گھر کی ویرانی سے گھبرا کے چلا آیا ہوں
اب کوئی پھول لٹائے کوئی پتھر پھینکے

تیرے ربطِ خاص کی دین ہے، یہ کمالِ عشق میرا نہیں
میرے دل نے اس کو سمجھ لیا جو تیری نظر نے کہا نہیں

ابر کی اوٹ سے مہتاب لجائے جیسے
تم اسی حسن سے شرماؤ تو میں گیت لکھوں

بحیثیت مجموعی 'شہرِ قلم' ایک اچھی کاوش ہے۔ کتابت و طباعت ٹھیک ہے لیکن کاغذ پر مزید توجہ کی ضرورت تھی۔

—— سیّد اباد جعفری

دَرد کی دہلیز

... صفحہ ۳۹ کا بقیہ

لیکن اوشا کی آنکھوں میں کوئی شرمندگی نہ تھی، ندامت کا عکس تک بھی نہ تھا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں،

"کشن بھیّا! اپنی زندگی میں زہر گھول کر کسی کی طرف امرت کا گلاس بڑھا دینا، اسے جینے کا سہارا دینا، بھلا کوئی ایسی بات ہے جس پر شرمندہ ہوا جائے۔!!"

**

نیا دور

جلد ۴۲ | نمبر ۶

ستمبر ۱۹۸۷ء

ایڈیٹر : ــــ امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر : ــــ شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر : ــــ ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر : ــــ ۴۷۱۰۸

پبلشر اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ : یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
زرِ سالانہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اقلیتی فرقوں کے لوگوں میں تحفظ اور اعتماد کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے پندرہ نکاتی پروگرام وضع کیا تھا۔ حکومتِ اتر پردیش نے وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ کی قیادت میں اس پروگرام پر عمل درآمد کی راہ میں بہت سے موثر اقدامات کیے ہیں، جن کے تحت ریاست کے ایسے ضلعوں میں، جہاں فرقہ وارانہ فسادات کا خدشہ رہتا ہے، افسروں اور ملازمین کی تقرری میں بڑی احتیاط برتی جاتی ہے نیز ضلع مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ اور دیگر اسامیوں پر ایسے لوگ تعینات کیے جاتے ہیں جن کی صلاحیت غیر جانبداری اور انصاف پسندی کے متعلق کسی طرح کا کوئی شبہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ اہم انتظامی عہدوں پر صرف ایسے افسران کو تعینات کیا جاتا ہے جو پوری طرح سیکولر ہوں اور جن کا پچھلا ریکارڈ بہت اچھا رہا ہو۔ یہ کوشش بھی کی جاتی ہے کہ ضلع اور پولیس نظم و نسق میں اقلیتی فرقوں کو مناسب نمائندگی ملے۔ ضلع مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں سے واضح طور پر بارہا یہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ضلع میں امن و قانون برقرار رکھنے کے سلسلے میں ذاتی طور سے ذمہ دار ہوں گے۔ پولیس میں اقلیتی فرقے کے لوگوں کی بھرتی کے لیے مناسب بندوبست کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً اس کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے کہ آیا اقلیتی فرقے کے لوگوں کو مناسب تعداد میں پولیس میں لیا جا رہا ہے کہ نہیں؟ اقلیتوں میں احساسِ تحفظ پیدا کرنے کی غرض سے پی، اے، سی کی پانچ خصوصی بٹالینوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ اس فورس کے لیے خصوصی تربیت کا بندوبست بھی کیا گیا ہے جس کے تحت اقلیتوں کی مذہبی قدروں کا احترام کرنے اور اقلیتی فرقے کے لوگوں سے رواداری کا برتاؤ کرنے کی ضرورت پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ زمرہ چار کی اسامیوں اور پبلک سروس کمیشن کے دائرہ عمل سے باہر کی زمرہ تین کی اسامیوں کے لیے مقرر کردہ سلیکشن کمیٹیوں میں اقلیتی فرقے کے ایک فرد کو لازمی طور سے شامل کرنے کے اصول پر سختی سے عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اقلیتی فرقے کے لوگوں کو زراعت، تجارت اور کاروبار وغیرہ کے لیے مالی و تکنیکی امداد دینے کے واسطے اتر پردیش میں ایک اقلیتی مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن بھی سرگرم کار ہے۔ اس کارپوریشن کی مدد سے اب تک ۷۹۹، افراد مستفید ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مارچ ۱۹۸۷ء تک ۳۲۰ واحدوں کو ساٹھ لاکھ روپیہ مارجن منی قرض اسکیم کے تحت منظور کیا جا چکا ہے۔

تعلیم کے میدان پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ متعدد پرائمری اور ثانوی اسکولوں کے علاوہ یونیورسٹیوں میں بھی اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہے۔ ریاست میں ۲۱۴۲ اُردو میڈیم اسکول قائم ہیں جن میں تقریباً ۲،۷۳ لاکھ طلبا مختلف درجوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اُردو تعلیم کی توسیع کی غرض سے پانچ ہزار اُردو ٹیچروں کی نئی تشکیل کردہ اسامیوں کے مقابلے میں ۳۶۵۰ اسامیوں پر تقرری ہو چکی ہے۔ ریاست میں اقلیتوں کے مفاد کے تحفظ اور ان کے مختلف مسائل کو حل کرنے کی غرض سے ایک اقلیتی کمیشن بھی سرگرم عمل ہے۔

آہ! خواجہ احمد عباس

مشہور و ممتاز ناول نگار، افسانہ نویس، صحافی اور ادیب خواجہ احمد عباس کا انتقال بلاشبہ ہماری ثقافتی اور علمی زندگی کا ایک نقصان عظیم ہے جس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔

عباس صاحب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، صحافت اور ادب کے ساتھ ساتھ وہ فلم سازی کے میدان میں بھی سرگرم اور فعال رہے اور انھوں نے ڈھرے سے ہٹ کر متعدد فلمیں بنائیں اور اس سلسلے میں سماجی مقاصد اور افادیت کو انھوں نے ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ انھوں نے اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی لکھا، اپنے ناولوں کے ترجمے انھوں نے خود انگریزی میں بھی کیے۔ چند سطروں میں ان کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی گرانقدر خدمات پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی، چنانچہ ان کی یاد میں نیا دور بہت جلد ایک خصوصی نمبر شائع کرے گا۔

سری نیواس لاہوٹی
اردو ہال، حمایت نگر
حیدرآباد

قاضی عبدالغفار

قاضی عبدالغفار ایک ایسی عہد ساز شخصیت کا نام ہے جنھوں نے اردو صحافت اور ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ کوئی ادبی مورخ اس نام کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ قاضی صاحب مراد آباد کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے —— وہ گھرانا بھی ایسا کہ ان کے دادا حامد علی صاحب کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں سُولی پر لٹکا دیا گیا تھا اور دو دن کی جستجو کے بعد ان کی لاش جہاں ملی وہیں اسے دفنا دیا گیا اور وہ بھی رات کے اندھیرے میں۔

قاضی صاحب اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں کہ مراد آباد میں ان کے پڑوس میں ایک لالہ جی رہا کرتے تھے وہ رات میں پُرسہ دینے کے لیے جب پہنچے تو قاضی صاحب کی دادی نے اُن سے کہا کہ ابھی تک تو لاش نہیں ملی ہے۔ اس پر لالہ جی اور ان کی دادی ایک لالٹین ہاتھ میں لے کر اس جگہ پہنچے جہاں سولی پر لٹکایا جا رہا تھا۔ وہاں تلاش بسیار کے بعد نعش دستیاب ہوئی اور مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ اسے وہیں دفنا دیا جائے۔ قاضی صاحب کے والد نے ان کے دادا کی سنت سے انحراف کیا اور وہ خان بہادر ابرار احمد کے نام سے مشہور ہوئے۔ جن کی پہنچ انگریز حکام تک تھی اسی لیے جب قاضی صاحب نے بی۔اے کا امتحان دیے بغیر علی گڑھ کو خیرباد کہا تو اس وقت ایم۔اے۔او کالج میں ان کے ساتھیوں کو جن میں عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خاں شروانی، عبدالرحمٰن صدیقی اور شعیب قریشی کے علاوہ سعیدالرحمٰن قدوائی کو بڑا تعجب ہوا مگر ان کے والد نے گورنر سے کہہ کر ان کو آبپاشی کے محکمے میں ملازم رکھوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ گورنر سے کوئی ہندستانی ملنے جاتا تو اسے اپنے جوتے اتار کر ننگے پیر جانا پڑتا تھا اور یہی صورت قاضی صاحب کے ساتھ پیش آئی۔ حالانکہ یہ "فل سُوٹ" زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اس واقعہ سے ان کو بڑا صدمہ ہوا لیکن بادل ناخواستہ انھیں سرکاری نوکری قبول کرنی پڑی۔ زندگی میں یہ صرف دو بار سرکاری ملازمت سے منسلک رہے۔ ایک مرتبہ نوجوانی میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۶ء میں سر مرزا اسماعیل کے اصرار دایما پر نظام حیدرآباد کی ریاست کے ناظم اطلاعات کی حیثیت سے۔ لیکن جب سر مرزا اسماعیل کو وزارت عظمیٰ چھوڑنی پڑی تو قاضی صاحب بھی نظامت اطلاعات سے مستعفی ہو گئے۔ مگر ابتدائی ملازمت کے چھوڑنے کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے اور وہ اس طرح ہے کہ وہ یو۔پی کے اس علاقہ پر تعینات کیے گئے تھے جس کی سرحد نیپال سے ملتی ہے ایک دفعہ یہ دورے پر گئے اور اپنا سامان ڈاک بنگلے میں رکھ کر دفتر کے معائنہ کو گئے اور جب واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا سامان ڈاک بنگلے کے صحن میں پڑا ہوا ہے اور ایک انگریز مادرزاد ننگا ان کے کمرے میں براجمان ہے۔ اس پر قاضی صاحب کو بڑا طیش آیا اور انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس انگریز افسر کی چھڑی سے اتنی پٹائی کی کہ وہ آگے بھاگ رہا تھا اور قاضی صاحب چھڑی لیے اس کے پیچھے تھے۔ جب وہ ادھ موا ہو کر بھاگ نہیں

سکا تو ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا، تب قاضی صاحب نے اسے چھوڑ دیا اور واپس ڈاک بنگلہ آ کر اپنی ملازمت سے استعفا دے دیا اور مرادآباد چلے آئے۔

قاضی صاحب کی پہلی شادی ۱۹۱۰ء میں سر محمد یعقوب کی بہن سے ہوئی جو ان کے خالہ زاد بھائی بھی تھے۔ اس شادی میں مولانا شوکت علی نے بھی شرکت کی تھی اور سلامی کی جس رقم کا انبار دولھا کے سامنے پڑا ہوا تھا اس پوری رقم کو مولانا نے علی گڑھ یونی ورسٹی کے فنڈ میں جمع کرا دیا۔ گویا یہ ان کے رفاہی کام کا پہلا زینہ تھا۔

قاضی صاحب کی اخبار نویسی کی ابتدا (۱۶) سال کی عمر میں ہوئی، جب یہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ مرادآباد سے ابن علی صاحب کی ادارت میں اخبار "نیر عالم" نکلتا تھا جس میں ان کا تحریر کردہ ایک خبر نامہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے تو یہ متعدد اخباروں میں لکھتے رہے۔ اصل اخبار نویسی کی ابتدا ۱۹۱۳ء میں ہوئی تھی جب مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے "ہمدرد" نکالا۔ "ہمدرد" کے معیار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے ادیب "ہمدرد" میں چھپنا اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتے تھے۔ پریم چند کا ایک افسانہ ۱۹۱۳ء میں "ہمدرد" میں شائع ہوا تھا جس کا انھیں معاوضہ بھی ملا تھا۔ "ہمدرد" میں ان کے شرکار کار میں مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ مولانا شرر اور جالب دہلوی قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں مولانا محمد علی کو نظر بند کر دیا گیا تو قاضی صاحب نے مولانا محمد علی کے اشارے پر کلکتہ سے "جمہور" نکالا جو بقول قاضی صاحب کے "جمہور" میرا سب سے کامیاب اخبار تھا جس کی تعداد اشاعت ۱۳ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔" یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا آزاد بھی نظر بند کر دیے گئے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں قاضی صاحب کو بھی چھ ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا اور اس کے بعد انھیں کلکتہ سے چلے جانے کا حکم ملا، اور وہ مرادآباد چلے آئے۔ مگر پھر انھیں نظر بند کر کے نینی تال بھجوا دیا گیا۔ جس پر قاضی صاحب نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ

"میں اپنے دادا کی سنّت پر عمل کر رہا ہوں۔"

۱۹۱۸ء میں انھوں نے "الصباح" نکالا، لیکن چھ مہینے بعد اسے بند کر دینا پڑا۔

۱۹۲۱ء میں قاضی صاحب خلافت وفد کے معتمد کی حیثیت سے لندن کے لیے روانہ ہوئے جہاں سے ۱۹۲۲ء میں واپس ہوئے اس وفد میں سر آغا خاں کے علاوہ سیٹھ چھوٹانی (خلافت تحریک کے صدر) ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مشیر حسین قدوائی اور سید حسن امام تھے۔ قاضی صاحب نے اس وفد کی روئیداد "نقش فرنگ" کے نام سے حکیم اجمل خاں کی ایما پر تحریر کی، جو ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب اس کے بارے میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

> "نقش فرنگ، میری پہلی تصنیف تھی، اس سے پہلے جو کچھ لکھا تھا وہ یا تو اخباری مضامین تھے یا چند ادبی مضامین، جو کبھی کبھار ادبی رسالوں میں چھپ جایا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میری زندگی کے ہنگاموں میں تصنیف و تالیف کے مشاغل کی تمام راہیں بند تھیں۔"

۱۹۲۱ء کے بعد قاضی صاحب کئی بار یورپ اور مشرق وسطیٰ کے دوروں پر گئے اور دو سال تک پیرس میں تجارت بھی کی۔ لیکن ۱۹۲۶ء میں یورپ سے واپس چلے آئے اور حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد طبیہ کالج کے معتمد کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک مرادآباد میونسپلٹی کے چیرمین رہے۔ اسی زمانے میں قاضی صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استحکام میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں جامعہ پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جامعہ کے اساتذہ کو آٹھ مہینے سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ حکیم اجمل خاں اس کی وجہ سے بڑے متفکر تھے۔ ایک دن انھوں نے قاضی صاحب کو بلا کر ایک ہیرے کی انگوٹھی دی اور کہا کہ اسے بمبئی لے جاؤ اور وہاں فروخت کر کے جو رقم ہاتھ آئے اس سے

اساتذہ کی تنخواہیں تقسیم کردو، اس کے ساتھ یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ اس انگوٹھی کو دہلی میں فروخت نہ کرنا۔ اس زمانے میں اس انگوٹھی کی قیمت بیس ہزار روپے آئی اور اس رقم سے جامعہ کے اساتذہ کی تنخواہیں ادا کی گئیں اور جو رقم بچ رہی اسے جامعہ کے مدِ محفوظ میں جمع کر دیا گیا۔

"نقشِ فرنگ" کے بعد ان کی دوسری تصنیف "لیلیٰ کے خطوط" ہے جو ۱۹۲۷ء میں (۲۷) دن میں لکھی گئی۔ اس کتاب کا شمار ادبِ لطیف کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ پہلے یہ خطوط قسط وار "نیرنگ خیال" میں شائع ہوتے رہے، لیکن ۱۹۳۲ء میں یہ کتابی شکل میں معہ تمہید و اضافہ کے شائع ہوئے۔ طوائف کا موضوع اُردو ادب میں نیا نہیں ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے ان خطوط میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ اردو ادب کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے "مجنوں کی ڈائری" لکھی جو قاضی صاحب کی انشاپردازی کا ایک دل کش نمونہ ہے۔ قاضی صاحب کی ایک اور تالیف "اس نے کہا" ہے جو خلیل جبران کی کتاب کا چربہ ہے۔ اس میں پیغمبر کے فلسفیانہ افکار و اقوال کو بڑے ادیبانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "تین پیسے کی چھوکری" ایک مختصر انشائیہ ہے جس کی زبان دُھلی دُھلی ہوئی ہے۔

قاضی صاحب کی سب سے معرکۃ الآرا تصنیف "آثارِ جمال الدین افغانی" ہے۔ چونکہ جمال الدین افغانی دو سال تک حیدرآباد میں محب حسن کے پاس قیام پذیر تھے جو اس زمانے میں اصلاحی تحریک اور خاص طور پر طبقۂ نسواں میں اصلاح کے بڑے موئید تھے۔ قاضی صاحب کی یہ کتاب برسوں کی تحقیق اور کاوش کا ثمرہ ہے۔ اس کتاب کا مواد انھوں نے لندن اور پیرس کے کتب خانوں سے جمع کیا تھا۔ اس کتاب کو انجمن ترقی اردو ہند نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا، جو اب ناپید ہے۔ اس کتاب کا مواد جمع کرنے کے لیے قاضی صاحب کو بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور جہاں سے مواد ملا اُسے جمع کیا، اس لیے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

> "چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے جمع کر کے مٹھائی تیار کرنا اور تحقیق کرنا دونوں مماثل ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے "حیاتِ اجمل" لکھی جو حکیم اجمل خاں کی مستند سوانح عمری ہے۔ اسی طرح سے انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک کتاب "آثارِ ابوالکلام آزاد" تحریر فرمائی جو اُردو میں سیرت نگاری کا شاہکار مانی جاتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئیں۔

۱۹۳۴ء کے اوائل میں انھوں نے حیدرآباد سے "پیام" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جو حیدرآباد کے شاہی ماحول میں صورِ اسرافیل پھونکنے کے مماثل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پولیس کا ایک انسپکٹر بھی اخبار کے ایڈیٹر کی خبر لے لیا کرتا تھا۔ قاضی صاحب کے ساتھ بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا، لیکن انھوں نے اس وقت کے کوتوال بلدہ کو لکھ کر بھجوا دیا کہ

> "میرے اخبار کے خلاف آپ کو جو شکایت ہے اس کو عدالت میں پیش کر دیجیے، میں وہاں اپنی جواب دہی کر لوں گا۔ پولیس کے محکمے میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا میرے پیشے کی توہین ہے۔"

اس کے بعد پولیس والوں کی ہمّت نہیں ہوئی کہ "پیام" تو کجا دوسرے اخبار والوں پر بھی ہاتھ ڈالتے۔ یہ تھا حیدرآباد کا پہلا معرکہ جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ان کی ٹکر بھانت بھانت کے نوکر شاہی عناصر سے ہوئی لیکن وہ ہر ایک کی پول کھولتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی آخری ٹکر کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم سے ہوئی جو اپنی یورپین ڈگری کے زور پر کتب خانہ میں من مانی چلانا چاہتے تھے۔ قاضی صاحب نے اس کے خلاف "علم کی رسد بندی۔ کتب خانہ آصفیہ" کے عنوان سے جو چودہ اداریے سپردِ قلم کیے وہ حیدرآباد کی صحافتی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔

اسی طرح سے ماچریڈی پلی میں پولیس کے وحشیانہ مظالم کو جس طرح طشت از بام کیا اور اس کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کیا اس کے گواہوں میں راقم الحروف بھی شامل ہے جو اس وقت "پیام" کا اسٹاف ممبر تھا۔ قاضی صاحب کی صحافتی زندگی کا یہ پہلو صرف ادارتی کالموں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس کی دلچسپیاں گوناگوں اور نوع بہ نوع تھیں۔ ان کا "سرِ راہ" کا کالم آج بھی بہت سے ذہنوں میں تازہ ہے۔ اس کالم میں زبان کی چاشنی اور تحریر کے ایک خاص مزاحیہ اندازِ بیان کے ساتھ کچھ معلوماتی باتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ انھوں نے اس کالم میں انگلستان سے مسٹر ایمری کی قیادت میں جو پارلیمانی وفد ہندستان آیا تھا اس کا قاضی صاحب نے جو خاکہ اڑایا ہے وہ بس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ "پیام" میں شائع ہونے والے پرچے "نقد و نظر" تبصرے، ع غ کا کالم "ہر روز کچھ سوچیئے" یہ ایسے فیچر تھے جس کو آج بھی پڑھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں۔ بہرحال پیام کا ہر کالم بے مثال ہوا کرتا تھا۔

قاضی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نوجوان نسل کو تیار کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین، بزمِ محب، کامریڈ ایسوسی ایشن، انجمن صحیفہ نگاراں وغیرہ کی تنظیموں کو سنوارنے میں نمایاں حصہ لیا۔ حیدرآباد میں ہر ترقی پسند تحریک کو قاضی صاحب کی سرپرستی حاصل ہوا کرتی تھی۔ علم کی دولت اور سماجی شعور کی پختگی سے حیدرآباد کے عوام کو ہم آہنگ کرنے میں قاضی صاحب نے وہ فرض انجام دیا ہے کہ مستقبل کا مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں انھوں نے سیاسی اور سماجی تنگ نظری کے خلاف آواز بلند کرنے میں جو اپنا فرض انجام دیا تھا وہ آج تاریخ کا ایک باب بن چکا ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو ان کی روشن خیالی کی گواہی دیتی ہیں اور یہی ان کی مقبولیت کا راز تھا۔

قاضی صاحب بڑے وجیہ اور خوش خوراک و خوش پوشاک انسان تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، اونچا قد، چوڑی پیشانی، خشخشی داڑھی گداز جسم، چہرے پر متانت اور آواز میں خود اعتمادی۔ یہ ایسی خوبیاں تھیں کہ ہر ملنے والا ان کا گردیدہ ہو جایا کرتا تھا۔ وہ نئے لکھنے والوں کی ضرورت سے زیادہ ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔ مجھے برسوں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے اور میں اس بات کی گواہی دے سکتا ہوں کہ اپنے (۱۶) سالہ قیام حیدرآباد میں انھوں نے ایک ایسی روشن خیال نسل کو پروان چڑھایا کہ ان کا کوئی بھی سیرت نگار ان خوبیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ قلم کے دھنی تھے اور لکھنا پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے لکھنے کے انداز پر یوں رقمطراز ہیں کہ:

"میری لکھائی کا ڈھنگ ایسا ہے کہ جب لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو لکھے چلے جاتا ہوں اور اس کے لیے صبح شام کی کوئی قید نہیں۔"

قاضی صاحب نے ادب کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔ جن لوگوں نے ان کے ڈرامے پڑھے ان کو اس بات کا قائل ہو جانا پڑا کہ وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار تھے۔ ان کا شعر کہنا وقت گزاری کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا، اور وہ جس کاغذ پر شعر لکھتے تھے اسے خود ہی ضائع کر دیا کرتے تھے لیکن میں نے ان کی بہت سی چیزیں محفوظ کر لی ہیں جنھیں کسی اور وقت کے لیے چھوڑے دیتا ہوں۔ نمونے کے لیے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

پروانہ اپنی منزلِ آخر پہ آ گیا
باقی ہے ایک شمعِ عزادارِ آرزو

اس نامراد دل کی جسارت کو کیا کروں
ہے بدنصیب اب بھی طلب گارِ آرزو

کہانی دل کی آخر ایک شب یوں ختم ہو جائے
کہ جیسے طفلِ ناداں روتے روتے تھک کے سو جائے

(باقی ص ۳۱ پر)

غزلیں

بدنام نظر

۶۷ - لارلوڈ . بائم پل . گیا - ۸۲۳۰۰۱

رینگتے رہتے ہیں کچھ سانپ کھنڈر کے نزدیک
دیکھ سن کر ذرا آنا مرے گھر کے نزدیک

داغ تو داغ ہے دامن پہ رہے یا دل پر
آپ رکھیں نہ اسے شمس و قمر کے نزدیک

آرزوؤں کے سبھی شیش محل چور ہوئے
رات کے خواب کو لے آیا سحر کے نزدیک

ڈستی رہتی ہے کوئی آہ مجھے کمرے میں!
کوئی خاموش کھڑا رہتا ہے در کے نزدیک

درد ہی درد ہے احساس کے ہر کوچے میں
لاش ہی لاش ہے ہر سمت نظر کے نزدیک

بات برسوں کی ہے اک گیت سنا تھا میں نے
آج تک گونج رہا ہے مرے سر کے نزدیک

ذہن کے در پہ یہ دستک سی ہے کیسی بدنام
کون ہے رات کے اس پچھلے پہر کے نزدیک

فاروق شفق

ج - ۱۸۵، دھان کھیتی
گارڈن ریچ - کلکتہ ۲۴...۷

روشنی کی چمک آنسوؤں میں نہیں
کوئی بجلی کہیں بادلوں میں نہیں

اب دریچوں میں چہرے نہیں پھول سے
پہلی سی بات وہ موسموں میں نہیں

کھڑکیاں جن کی آہٹ پہ کھل جاتی ہیں
دوستو! میں تو ان صاحبوں میں نہیں

ہوٹلوں، بار، کلبوں میں شاید ملے
زندگی جس کو کہیے گھروں میں نہیں

کچھ بھی ہو کوئی مڑ کے نہیں دیکھتا
اب کوئی زندگی حادثوں میں نہیں

چاندنی اب اترنے کو ہے صحن میں
روشنی کی ضرورت گھروں میں نہیں

وفا ملک پوری
پورنیاسٹی - بہار

دبستانِ بہار کا ایک گمنام شاعر

جذب گوپالپوری

عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ "بہار کی زمین بڑی سنگلاخ ہے" دراصل یہ بہار کے مکتب شعر و ادب کے خلاف ایک سستا اور سطحی "پروگینڈا" ہے جو کسی گوشہ سے دھیمے لہجوں میں چلا بعد میں خود اہل بہار نے بغیر سوچے سمجھے ہم آواز ہو کر اس کو وزنی بنا دیا۔

اردو زبان و ادب کی آبیاری اور شعر و سخن کی بزم آرائی میں خطہ بہار کا حصہ ملک کے کسی "اردو خطہ" سے کم نہیں۔ البتہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہار کے شعراء و ادباء کی پذیرائی میں خود اہل بہار نے بڑی "بخالت" سے کام لیا ہے جس سے یہاں کے فنکاروں کی حوصلہ افزائی نہ ہو سکی اور وہ شکستہ دل ہو کر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو سنوارنے کی جدوجہد نہ کر سکے۔ مگر جنھوں نے ایسے حوصلہ شکن اور دل شکستہ ماحول میں اپنی جدوجہد جاری رکھی اور پرورش لوح و قلم کرتے رہے وہ آسمان اردو کے آفتاب و مہتاب بن کر چمکے اور پوری اردو دنیا میں اپنے فکر و فن کا اجالا چھوڑ گئے۔ شاد و آزاد سے لے کر جمیل و پرویز تک فکر و فن میں ارتقا پذیری کا جو عمل مسلسل نظر آتا ہے، یہ اردو کی ادبی تاریخ میں "دبستان بہار" کو ایک سنگ میل کی حیثیت سے نمایاں کرتا ہے۔ دبستان بہار کے ذہین و باشعور اہل قلم آج بھی فکر و فن اور زبان و ادب کی خدمت، نام و نمود اور حوصلہ و ستائش سے بے پروا ہو کر انجام دے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سکون و سکوت اور خلوص و توجہ سے علمی و ادبی کام کرنے والے، اعلان و اشتہار کے ان طریقوں کو بروئے کار نہیں لاتے جو اس عہد میں گویا سکۂ رائج الوقت ہے۔

دبستان بہار کے پُرخلوص خدمت گزاروں میں جناب سید علی عباس جذب گوپال پوری مرحوم بھی ہیں جو سکوت سخن شناساں بہار سے حد درجہ کبیدہ خاطر رہے۔ ان کو اس کا شدت سے احساس تھا کہ اہل بہار اپنے باکمالوں کی قدر نہیں کرتے۔ احساس کی اس شدت نے ان کو بہت زیادہ منفعل کر رکھا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی فطری ذہانت اور شاعرانہ صلاحیت کے باوجود شاعری میں وہ جدو جہد اور خلوص و فکر نہ پیدا کر سکے جو ذہنی گہرائی اور فکری رعنائی کا مظہر ہو سکتی۔

مرحوم نے عربی مدارس میں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی مگر ان کے شاعرانہ مزاج نے ان کو مولویانہ رواج کا پابند نہ ہونے دیا۔ وہ عالمانہ منہاج پر نہیں چل سکے یہی وجہ ہے کہ اپنے بعض ہم عصر اور ہم وطن عالموں کی طرح اپنے دین کے ساتھ اپنی دنیا نہ سنوار سکے اور اپنے ضلع کے مشہور حسین گنج ہائی اسکول میں اردو فارسی کی تعلیم دینے لگے۔ پھر پتہ نہیں کیا سبب ہوا وہاں سے اپنے ہی ضلع کے دوسرے اسکول میں چلے گئے مگر ان کی نزاکت مزاج ملازمت کے بارگراں کو نہ سنبھال سکی اور غالباً ۱۹۵۲ء

میں موصوف نے بہ حسرت و یاس اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور قید و بند ملازمت سے آزاد ہو گئے اور اپنی عمر ریگزار حرماں میں بسر کرنے لگے۔

مرحوم ایک باکمال اور ماہر فن شاعر ہونے کے باوجود گوشہ گمنامی سے باہر نہ نکل سکے۔ ان کو اپنی گمنامی کا بھی شدید احساس تھا۔ ایک غزل کے مقطع میں اپنی اس کیفیت کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے ؂

اے جذبؔ بایں ندرت و پرواز تخیل
تو شاعر گمنام ہے معلوم نہیں کیوں

جناب جذبؔ گوپالپوری نے شاعری کا حصہ بہت سے مشہور شاعروں کی طرح ورثہ میں نہیں پایا تھا اور نہ یہ سعادت بزور بازو حاصل کی تھی۔ کسب و کوشش سے ایک شاعر "استاد تو ہو سکتا ہے مگر شاعر نہیں ہو سکتا" تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" جذبؔ صاحب کی شاعری ایک "عطیہ فطرت" ہے جب تک ان کا یہ جذبہ فطری ساتھ دیتا رہا وہ نظم و غزل کے ذریعہ پرورش لوح و قلم کرتے رہے۔ انھوں نے بہت اچھی غزلیں بھی اپنی تخلیقات کی یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں مگر یہ زیادہ تر بلکہ شاید تمام تر غزلیں طرحی اور غیر طرحی مشاعروں کے لیے کہی گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ارباب مشاعرہ نے ان سے غزلیں "کہلوائی" ہیں۔ اور نظمیں انھوں نے کہی ہیں۔ بس اس "کہلوانے" اور "کہنے" میں جو فرق ہے وہی فرق ان کی غزلوں اور نظموں میں نمایا ہے۔ خصوصاً ان کی ابتدائی غزلیں زبان و مزاج لب و لہجہ اور جذب و کیف کے اعتبار سے اردو کی رسمی عشقیہ شاعری سے زیادہ قریب ہیں۔ بایں ہمہ ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی بلا تجسس مل جاتے ہیں جو "آورد" کے بار گراں سے محفوظ ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے: ؂

بہار آئی بھی گلشن میں اور گذر بھی گئی
مگر شکستگی بال و پر کو کیا کہیئے

عبادتوں پہ بھی رد و قبول کا دھڑکا
اب اور شامتِ نوع بشر کو کیا کہئے
سخن کا کون ہے اے جذبؔ قدر داں لیکن
جنون عرض متاع ہنر کو کیا کہیئے

سمجھتی ہے اگر دنیا ہمیں شوریدہ سر سمجھے
مگر ہر رہگذر کو ہم اسی کی رہگذر سمجھے
تجلی نے دیے ہیں اسقدر دھوکے نگاہوں کو
کہ ہم صبح شب غم کو بھی آشوب نظر سمجھے
غم جانکاہ سے بھی شمع ہستی جب نہ بجھ پائی
ہم اپنی عمر دو روزہ کو بھی عمر خضر سمجھے

کون جانے لب ساحل بھی سلامت پہنچے
موج طوفاں سے سفینہ نکل آیا تو سہی
زندگی ہے کہ کوئی خواب میں پائی ہوئی چیز
تو نے بخشا تو سہی میں نے بھی پایا تو سہی
تجھ سے نزدیکی کی تعبیر ہے دوری تجھ سے
کھو گیا میں تو ہوا کیا تجھے پایا تو سہی

حجاب ناز کو اب شوق امتحاں نہ رہا
خدا کا شکر یہ پردہ بھی درمیاں نہ رہا
وصال تیغ و گلو امتحاں تھا سخت مگر
ترے تبسم پنہاں سے امتحاں نہ رہا

یہ چند اشعار صرف چار غزلوں کے ہیں جو سامنے آگئے ہیں۔ انھیں اشعار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ جذبؔ کی غزلیہ شاعری زیادہ تر حسن و عشق، برق و شرر اور شعلہ و شبنم کی شاعری ہے مگر ایسے اشعار بھی کچھ کم نہیں جنھیں زندگی کے حقائق کی آئینہ داری اور عارفانہ تصورات

کا رنگ نمایاں ہے۔

بلاشبہ نظم و غزل میں کچھ بنیادی فرق ہے، غزل کہہ لینا بظاہر بہت آسان ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر چاہے اس کا فطری لگاؤ اس صنف سخن سے نہ ہو مگر الفاظ کی شعبدہ گری، پینترے بازی اور سستے قسم کی صنعت طرازی کو ہی غزل گوئی کا محور سمجھتا ہے اور معاملہ بندی، مبالغہ آرائی اور سوقیانہ مضامین کو موزوں کر کے اپنے جذبہ سخنوری کی تسکین کر لیتا ہے۔

لسان القوم مولانا صفی لکھنوی نے غزل کے لیے ایک ہی مناسب و موزوں فقرہ کہہ دیا ہے کہ "غزل کا مزاج دھان پان ہے" ــــ اس لیے غزل کہنے سے پہلے اس کے مزاج کو سمجھنا اور پھر سمجھ کر برتنے کی صلاحیت پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ جذبؔ صاحب جو بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے مگر ان کے شعور کی پختگی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے جہاں نظموں کو شوکت الفاظ سے مالا مال کر کے رفعت فکر کا جلال بخشا ہے وہیں غزل کے مزاج داں ہونے کی حیثیت سے اسے نزاکت خیال اور حلاوت الفاظ سے حسین و متین بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزلوں میں سے چند غزلوں کے چند اشعار اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ دوسری غزلوں کو بھی قارئین اگر بامعان نظر پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے تو یقین ہے راقم الحروف کے خیال کی تصدیق ہو جائے گی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے جذبؔ مرحوم کو جولانیٔ طبع کا اصل میدان نظم ہے جہاں انھوں نے اپنے محسوسات و مشاہدات کو اپنے فکر و شعور کی بلندی و ہمہ گیری کے سانچے میں ڈھال کر اشعار کے پیکر میں پیش کیا ہے یہاں اتنا اور عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ وہ مقام جہاں سب سے بڑھ کر مرحوم کے اشہب قلم نے اپنے تگ و تاز اور مسابقت کا مظاہرہ کیا ہے وہ صنف قصیدہ ہے۔ راقم الحروف نے جو قصائد ان کی زبانی سُنے ہیں وہ اس اہم صنف سخن پر ان کی مہارت تامہ کی دلیل ہیں۔

نظموں میں کچھ رومانی نظمیں بھی ہیں جو غالباً ماضی کی رومانی یادوں سے تعلق رکھتی ہیں ان نظموں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر رنگ و بو کے نیستاں میں کھو گیا ہے اور اسی جنگل میں رہنا چاہتا ہے۔ "برق مجسم" "سرمست شباب" اور "دو آنکھیں" جیسی رومانی نظمیں کہنے والا شاعر ــــ "مادر ہند کو سلام" "زلزلہ بہار" "امن کے لیے جنگ" اور "میرا نوکر" جیسی نظمیں بھی لکھ سکتا ہے۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا مگر آخر الذکر نمائندہ نظموں کے مطالعہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ یہ حرف و حکایت کا شاعر رنگ و بو کے خواب سے بیدار ہو چکا ہے اور لمحاتی تاثرات اور رومانی کیفیات کے تمام اثرات اس کے ذہن سے مٹ چکے ہیں اور اب بس اس کے سامنے سڑکوں پر، پگڈنڈیوں پر، محلوں میں، جھونپڑیوں میں خوش بخت اور کم نصیب انسان ہیں ــــ غم نصیبوں، تلخ کاموں اور دلفگاروں کے چہرے ہیں ان کی الجھنیں ہیں، مایوسیاں ہیں، چیخیں ہیں، گھٹتی ہوئی امنگیں ہیں اور دم توڑتے ہوئے حوصلے ہیں اور اسی کے مقابلہ میں شہزادوں، شہریاروں اور ناز پروردوں کا طبقہ بھی ہے جو اگرچہ بہت محدود ہے مگر شاعر کی عقابی فکر کی گرفت نے اسکو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے ــــ خدا کی یہ اشرف مخلوق جس کو انسان بنا کر خالق بھی اپنے کو بے ساختہ "احسن الخالقین" کہہ اٹھا کس طرح دو طبقوں میں بٹ گئی ہے یا بانٹ دی گئی ہے اس کی بالکل سچی اور صحیح تصویر کشی جذبؔ مرحوم نے اپنی نظم "مادر ہند کو سلام" میں کی ہے۔ یہ نظم ہندستان کے یوم آزادی ۱۵ اگست کے موقع پر ۱۹۶۰ء میں کہی گئی ہے (اور پڑھی بھی گئی ہوگی) مگر یہ ہندستان کے ہر دور کے حکمرانوں کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے، ایسی جذباتی نظمیں عام طور پر "نعرہ بازی" کی علامت بن جاتی ہیں مگر جذبؔ صاحب کی رفعت فکر نے ایسے خالص جذباتی خیالات کو بھی شعری جمالیاتی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا ہے۔

اس نظم کے چند شعر نقل کرنا بے محل نہ ہوگا

آسمانوں کے شکنجوں میں زمینوں کا سلام
حلقۂ گرداب کے اندر سفینوں کا سلام
کشورِ آزاد کے اندر غلاموں کا سلام
صبحِ نورانی میں حسرت خیز شاموں کا سلام
شب کی تاریکی میں روشن دل کے داغوں کا سلام
روزِ عالم تاب میں جلتے چراغوں کا سلام
سانس لینے والے مردوں، زندہ لاشوں کا سلام
اس تماشہ گاہِ ہستی میں تماشوں کا سلام

اب تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجیے

راگنی کا ساز نغموں کا گیتوں کا سلام
یعنی اپنے لاڈلوں کا اور چہیتوں کا سلام
خوشنما پھولوں کا باغوں کا بہاروں کا سلام
نازپرور نازنینوں کا نگاروں کا سلام
سکہ سازی، سکہ بازی کے ترانوں کا سلام
گنگناتے، جھومتے، گاتے خزانوں کا سلام
سیم کاروں، زرگروں، دولت پناہوں کا سلام
کج نہادوں، کج دماغوں، کج کلاہوں کا سلام
یومِ جمہوری میں جشنِ بادشاہی کا سلام
اور اک شاعر کی افسردہ نگاہی کا سلام

نظرِ قاصر میں جناب جذبؔ کی صرف یہ ایک نظم ہی ان کو ایک بڑا نظم نگار شاعر منوانے کے لیے کافی ہے۔ اسی انداز کی ایک نظم "میرا نوکر" بھی ہے جس میں سماج کے اونچے طبقہ کی بے حسی، کجروی اور ناانصافی کی داستان کے ساتھ ایک غریب پسر، خستہ حال اور خردسال نوکر کے گھٹے اور پسے ہوئے جذبات اور کچلے ہوئے ارمانوں کا بیان ایسے دردمندانہ لب و لہجہ میں کیا گیا ہے جسے سن کر ناممکن ہے کہ کوئی حساس دل اور بیدار ذہن منفعل اور متاثر نہ ہو۔ ان نظموں کے علاوہ اور بھی نظمیں تفصیلی (یا کم از کم اجمالی) اظہار خیال کی مستحق ہیں مگر طولِ کلام کا خوف مانع ہے اس لیے صرف ایک فکر بلند کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نظم ہے "ارمغانِ عقیدت" جو غالبؔ کی بارگاہ میں ہے۔ یہ نظم غالبؔ کی شان میں ان کے شایانِ شان ایک قصیدہ ہے اور اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ پوری نظم غالبؔ کے طرزِ فکر پیرایۂ سخن اور اسلوب نگارش کے انداز پر پیش کی گئی ہے۔ شاعر کی پختہ کاری اس میں اپنے عروج پر ہے۔ بلاشبہ جذبؔ صاحب کی یہ نظم جو غالبؔ جیسے "محرمِ گنجینۂ اسرار" شاعر کے فکر و فن سے متعلق ہے، مرصع نظموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ جذبؔ صاحب نے نہیں بلکہ غالباً غالبؔ نے "در مدح خود" کہی ہے۔

مذکورہ بالا نظم کے علاوہ اور کسی نظموں نیز غزلوں کے مطالعہ سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر برق و باراں جذبؔ مرحوم براہ راست غالبؔ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ غالبؔ کے بعد اقبال کا رنگ بھی ان کے کلام میں کہیں کہیں جھلکتا ہے۔ مضمون کے طویل ہونے کا خیال مانع ہے اس لیے مذکورہ بالا نظموں کا اقتباس ضروری ہونے کے باوجود نہ دے سکا۔

گوپالپوری صاحب کے متعلق مجھے کوئی علم اس کا نہیں ہے کہ مرحوم کا کسی دور میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" سے بھی کوئی تعلق تھا یا نہیں مگر میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ مرحوم جیسے گوشہ نشین اور "پراگندہ روزی پراگندہ دل" انسان کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ کسی گروپ بندی کے چکر میں پڑتے۔ بہرنوع مرحوم ترقی پسند گروپ سے وابستہ رہے ہوں یا نہیں لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کی نظمیں اس عہد کے کسی بھی ترقی پسند شاعر کی نظموں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

جذبؔ صاحب مرحوم نہ میرے ہم عمر تھے اور نہ ہم عصر بلکہ وہ مجھ سے اوپر کی ایک سیڑھی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ "زلزلۂ بہار" ان کی نظم ۱۹۳۴ء کے زبردست زلزلہ کے بعد لکھی گئی ہے جبکہ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا تھا اور لکھنؤ کے مدرسہ ناظمیہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ پھر بھی میں مرحوم کے نام سے

بہر حال واقف تھا مگر مجھ سے ملاقات اس وقت ہوئی جب میں پٹنہ میں قیام پذیر تھا۔ یہ "صبح نو" کے عروج کا زمانہ تھا اس ملاقات سے پہلے مرحوم کا ذکر علامہ جمیل مظہری مرحوم مجھ سے تعریفی اور تحسینی انداز میں کر چکے تھے۔ خود علامہ مرحوم جذب صاحب کی بڑی قدر کرتے تھے۔ بہر حال موصوف سے ملاقات کے وقت ہی ان کی خوش خلقی انکساری اور جذبہ احترام نے مجھے بطور خاص متاثر کیا تھا۔ پھر جب تک مرحوم زندہ رہے برابر پٹنہ میں کبھی سیوان میں کبھی مشاعروں میں کبھی بھائی رضا نقوی صاحب کے یہاں اور اکثر جناب زوار حسین صاحب مرحوم سابق وزیر حکومت بہار کے دولت کدہ پر ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ جب بھی ملے انتہائی خلوص اور کسر نفسی کے ساتھ اور ہمیشہ میرے ادبی خدمات کے مداح و معترف رہے۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور آخر عمر میں بڑی الجھنوں اور پریشانیوں میں گرفتار رہے۔ علامہ جمیل مظہری مرحوم نے ان کے حالات کی بڑی سچی ترجمانی فرمائی ہے ؎

عمر کی بسر تو نے رہگزار حرماں میں
تھا نہ کوئی نخلستاں تیری زندگی میں جذب
تیرا جذبہ ہمت مستقل ہے اک تاریخ
کہ ادب کی خدمت کی تو نے مفلسی میں جذب
فن کی روح ہے مردہ اہل ذوق افسردہ
کون لے جگہ تیری بزم شاعری میں جذب

یہ اور بھی افسوس اور حسرت و حیرت کی بات ہے کہ ان کے انتقال کے بعد بھی تعزیت "مرگ وفا" کی وہ رسم بھی ادا نہ ہو سکی جس کے مرحوم مستحق تھے غالب نے شاید انھیں کے لیے کہا تھا ؎

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

اردو اخبارات نے بھی ان کے انتقال کی خبر کی اشاعت میں بھی بخل سے کام لیا جیسا کہ "صبح نو" نے ان کے انتقال کے بعد تعزیتی شذرہ میں لکھا تھا" دراصل اس جدو جہد اور دور دارو گیر میں ایسے بے یار و مددگار اور بے نوا دبے ریا افراد کے لیے میدان مسابقت میں آنا اور گوئے سبقت لے جانا بے حد دشوار مرحلہ ہے یہی وجہ ہے کہ جذب گوپالپوری اپنی صلاحیتوں سمیت اپنے کنج سے باہر نہ نکل سکے اور آخری دور حیات میں آلام و اسقام کے مصائب و شدائد جھیل کر سفر آخرت اختیار کیا"۔ (صبح نو اکتوبر ۱۹۷۱ء)۔

ان حالات میں مرحوم کے مجموعہ کلام کو مرتب کر کے اس کی اشاعت کی جدو جہد ہمارے عزیز سید حسن عباس صاحب ایم اے کا ایک ادبی کارنامہ ہے اور یہ چکنے پات ان کے ہونہار بروا ہونے کا ثبوت ہیں۔ ہمیں یقین کرنا چاہیئے کہ آئندہ بھی وہ اپنی ادبی خدمات کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ خدا ان کو ہمیشہ توفیق اور موقع عنایت کرے۔ اسی کے ساتھ یہ افسوس ناک حادثہ ہے کہ مرحوم کا مجموعہ کلام ابتک شائع نہ ہو سکا۔ بہار کی اردو اکاڈمی اگر مرحوم کے مجموعہ کلام کی اشاعت اپنے ذمے کر اس کو منظر عام پر لے آئے تو یہ بھی زبان اردو کی ایک اہم خدمت ہوگی۔

+

ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ نیا دور آپ کی خدمت میں وقت پر پہنچا سکیں۔ اس سلسلے میں آپ کو جو زحمت ہو رہی ہے ادارہ اس کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہے۔

—— ادارہ

غزل

محمد احمد رمز

پتہ: فوٹو آرٹ اسٹوڈیو، پریڈ، کان پور

ایک اک پل اسے ڈر ہے میرا
میری چاہت بھی ہنر ہے میرا

میری آنکھوں میں چمک ہے اُس کی
اس کے سینے میں شرر ہے میرا

کچھ سُجھائی نہیں دیتا مجھ کو
ایک آہٹ پہ سفر ہے میرا

دشتِ تعبیرِ تمنّا ہوں میں
خوابِ دیوار نہ در ہے میرا

یہ بھی تقسیمِ زیاں ہونی تھی
پھل تمھارے ہیں شجر ہے میرا

لڑکھڑاتی ہے صدا کیوں میری
کوئی شاید پسِ در ہے میرا

رمز یہ بھی ہے گراں لوگوں پر
میری مٹھی میں گہر ہے میرا

عنبر بہرائچی

آفیسرس کالونی، اناؤ

آنکھیں کھلتے ہی سنّاٹے سرگوشی کر جاتے ہیں
سبز سحر کے سائے سائے زرد بگولے بیٹھے ہیں

اک حجرے کی وسعت ہی کیا؟ کھلی فضا کے دیوانو!
صدیاں بیتیں پھر بھی اس میں چاند ستارے رہتے ہیں

جھلسا دینے والی گرمی، ریت کے ٹیلے، تُند ہوا
دن بھر باطل پر یلغاریں، رات ہوئی تو سجدے ہیں

ان زرخیز زمینوں پر ہی کیوں امرت برسائیں گے
یہ بادل تو ہر خطّے میں پھول اگانے نکلے ہیں

بوسیدہ کپڑوں میں ہر شب، اشک فشاں رہتا ہے کوئی
کچھ نورانی پیکر اس کی پابوسی کر جاتے ہیں

اس وادی میں کل ہر کونپل، برچھی بن کر کوندی تھی،
خدشہ یہ تھا بس پل بھر میں اولے گرنے والے ہیں

سونے چاندی کی دیواریں راہ بھلا کیا روکیں گی!
عنبر یہ خاکی پیکر تو قدروں کے رکھوالے ہیں

کاظم علی خاں

کیفؔ لکھنوی احوال اور ادبی آثار

(۱)

ڈاکٹر شیب راہی اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالے میں کیفؔ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"شیخ فضل احمد نام تھا، کیفؔ تخلص تھا تفصیلی حالات معلوم نہیں، نمونۂ کلام میں صرف ایک شعر ملا ہے"۔

یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ کیفؔ لکھنوی کا صحیفۂ حیات وہ بند کتاب ہے، جس کے متعدد ابواب کو کھولنے سے اُردو تحقیق ابھی تک قاصر رہی ہے ساحر لکھنوی کا یہ شعر اسی صورتِ حال کا ترجمان ہے ؎

اُن میں ہی کہیں ہوگا اب ذکر ہمارا بھی
جو بند کتابیں ہیں دُنیا ترے ہاتھوں میں

مختلف مصادر کی ورق گردانی کے نتیجے میں کیفؔ کے جو ناکافی حالات دستیاب ہوسکے ہیں وہ یہاں پیش کیے جاتے ہیں[1]

فضل احمد کیفؔ لکھنوی ایک شیخ خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ سراپا سخن، سخنِ شعراء، بزمِ سخن اور طورِ کلیم جیسے قدیم مآخذ کیفؔ کے والد کا نام شیخ اکبر علی کشمیری بتلاتے ہیں۔ اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ کیفؔ کے اسلاف کا وطن کشمیر تھا۔ خاندانِ کیفؔ کشمیر سے کب اور کن حالات میں لکھنؤ منتقل ہوا، اس کے بارے میں دستیاب مصادر خاموش ہیں۔ کیفؔ کے والد شیخ اکبر علی کس کے فرزند تھے؟ وہ کس پیشے سے متعلق تھے؟ اقتصادی اعتبار سے ان کا شمار مالدار طبقے سے تھا یا وہ نادار تھے؟ ان کا زمانۂ ولادت و وفات کیا تھا؟ دستیاب مصادر ان سوالوں کے جواب دینے سے قاصر ہیں، لیکن اس صورتِ حال سے یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ اکبر علی نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا نمایاں کارنامہ انجام نہیں دیا تھا جو ان کی شہرت کا باعث بنتا اور وہ اپنے زمانے کی سماجی زندگی میں کسی ممتاز مقام کے مالک نہ رہے ہوں گے۔

کیفؔ کی ننھیال کے متعلق ہماری معلومات صفر ہیں اور ہمیں ان کی والدہ کا نام تک نہیں معلوم۔

قدیم مصادر صراحت کے ساتھ کیفؔ کا سنہ ولادت نہیں بتاتے لیکن دیوانِ کیفؔ کے تقریظ نگار منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی نے ربیع الآخر ۱۲۹۲ھ میں وفات کے وقت کیفؔ کی عمر ۶۳ سال قرار دی[2] ہے۔ گویا تسلیم کے بموجب کیفؔ کا زمانۂ ولادت ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء کے آس پاس نکلتا ہے، جسے مولانا حسرت موہانی نے بھی مانا ہے۔ لیکن صاحب "طبقاتِ شعرائے ہند" مولوی کریم الدین ۱۸۴۷ء میں کیفؔ کی عمر قریب ۲۵ برس بتاتے ہیں گویا کریم الدین کے نزدیک کیفؔ ۱۸۲۳ء (۱۲۳۹ھ) کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے۔ کریم الدین اور تسلیم کے بیانات میں جو اختلاف نظر آتا ہے اس کے دور ہونے کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ وفات کے وقت کیفؔ کی عمر شاید ۵۳ برس رہی ہو جسے تسلیم سہواً ۶۳ سال لکھ گئے ہوں اگر ہمارا یہ معروضہ قابلِ قبول ہو تو کریم الدین اور تسلیم کے بیانات کا اختلاف دُور ہوسکتا ہے۔ کیفؔ کا زمانۂ ولادت ۱۸۲۳ء (۱۲۳۹ھ) اس لیے بھی قرینِ قیاس ہے کہ ۱۲۷۱ھ میں تمام ہونے والے تذکرے "گلستانِ سخن"

میں کیفؔ کو "جوانِ نیک نہاد" بتایا گیا ہے۔ سنہ ولادت ۱۲۳۹ھ ماننے پر ۱۲۷۱ھ میں کیفؔ کی عمر ۳۲ سال ہوتی ہے جسے جوانی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے لیکن سال ولادت ۱۲۲۹ھ ماننے پر کیفؔ کی عمر ۱۲۷۱ھ میں ۴۲ سال نکلتی ہے اور ۴۲ برس کے ادھیڑ آدمی کو جوانِ نیک نہاد نہیں کہا جاتا۔

خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی ناقل ہیں کہ لکھنؤ میں کیفؔ محلہ سبزی منڈی میں رہتے تھے جو چوک کے پاس واقع ہے۔ عشرتؔ لکھنوی کے بموجب کیفؔ نے عمر بھر شادی بیاہ کے بندھن سے آزاد رہ کر تجرد کی زندگی گزاری تھی۔ عشرتؔ لکھنوی (متولد دوشنبہ ۲۹ جون ۱۸۶۸ء مطابق ۷ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ) کیفؔ کے ہمعصروں میں شامل تھے (دیکھیے "آبِ بقا" ص ۱۷۵ نیز ص ۱۸۷)

کیفؔ لکھنوی پر مولانا حسرتؔ موہانی اور ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کے مقالے اس امر پر روشنی نہیں ڈالتے کہ کیفؔ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا تھا۔ تذکرۂ "خوش معرکۂ زیبا" (تالیف ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) میں کیفؔ کا ذکر خاصی تعریف و توصیف کے ساتھ ہوا ہے اور نمونۂ کلام میں اشعار کی تعداد بھی قابلِ لحاظ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء تک کیفؔ شعر و سخن کے میدان میں نومشقی کی منزل سے کافی آگے نکل چکے تھے۔ "خوش معرکۂ زیبا" کے زمانۂ تکمیل ۱۲۶۲ھ تک اگر کیفؔ کی مشقِ شاعری کی مدت تقریباً دس سال ہو چکی ہو تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔ اگر ہمارا یہ اندازہ قابلِ قبول ہو تو کیفؔ (متولد ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) نے کم و بیش ۱۴ سال کے سن سے تقریباً ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں مشقِ شاعری کا آغاز کیا ہوگا "فکرِ بلیغ" (ص ۲۷۳) میں شادؔ عظیم آبادی نے میر مونسؔ کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیفؔ لڑکپن ہی سے مشقِ سخن میں مصروف ہو چکے تھے اسی لیے ہم نے آغازِ مشقِ سخن کے وقت کیفؔ کی عمر تقریباً ۱۴ سال قیاس کی ہے۔ تذکرۂ "سراپا سخن" (تالیف اوائل ۱۲۶۹ھ) کیفؔ کو صاحبِ دیوان شاعر قرار دیتا ہے گویا "سراپا سخن" کے زمانۂ تکمیل اوائل ۱۲۶۹ھ (اواخر ۱۸۵۲ء) تک کیفؔ کا دیوان اپنی ابتدائی شکل میں مرتب ہو چکا ہوگا۔ کیفؔ کی مشقِ شاعری کے آغاز کے متعلق اگر ہمارا تخمینہ قابلِ قبول ہو تو انھوں نے ۱۲۵۳ھ سے شاعری شروع کر کے کم و بیش سولہ سال کی مدت میں اوائل ۱۲۶۹ھ تک اپنا دیوان ابتدائی شکل میں مرتب کر لیا ہوگا جس میں ان کی وفات تک اضافے ہوتے رہے ہوں گے۔

کیفؔ کے تلمذ کے باب میں معاصرین کی شہادتیں انھیں میر وزیر علی صباؔ لکھنوی اور خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی دونوں ہی کا شاگرد بتاتی ہیں۔ آغا جو شرفؔ خود آتشؔ کے شاگرد تھے۔ شرفؔ نے مثنوی افسانۂ لکھنؤ (قلمی نسخہ ص ۱۹۵) میں کیفؔ کو شاگردِ آتشؔ لکھا ہے۔ منشی امیر اللہ تسلیمؔ نے بھی کیفؔ کو آتشؔ کا شاگرد مانا ہے۔ خواجہ حسام الدین حسامؔ (تلمیذِ کیفؔ) اور اشرفؔ علی اشرفؔ کے بعض قطعاتِ تاریخ (مشمولہ "آئینۂ ناظرین") بھی کیفؔ کو آتشؔ کا شاگرد قرار دیتے ہیں لیکن نصف درجن سے زائد کیفؔ کے معاصر تذکرہ نگاروں نے انھیں بہ تکرار میر وزیر علی صباؔ (تلمیذ آتشؔ) کا شاگرد تحریر کیا ہے۔ ان میں یہ سات تذکرے شامل ہیں:۔

(۱) خوش معرکۂ زیبا، (۲) طبقاتِ شعرائے ہند، (۳) سراپا سخن، (۴) گلستانِ سخن، (۵) سخنِ شعرا، (۶) بزمِ سخن، (۷) طورِ کلیم۔ ان میں سے "خوش معرکۂ زیبا" کی تکمیل آتشؔ (متوفی ۱۵ محرم ۱۲۶۲ھ مطابق چہار شنبہ ۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء) کی زندگی ہی کے دوران ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں ہو چکی تھی۔ "خوش معرکۂ زیبا" بھی کیفؔ کو صباؔ کا شاگرد بتاتا ہے، جیسا کہ اس کی درج ذیل عبارت سے ظاہر ہے:۔

" اوروں کو اس پر تاسف و حیف شیخ فضل احمد تخلص
کیفؔ، کلام اس کا نہایت بامزا، شاگرد میر وزیر علی صبا
یہ اشعار اس سے یادگار"

(خوش معرکۂ زیبا طبع لکھنؤ ص ۴۲۹)

"خوش معرکۂ زیبا" کی اس معاصر شہادت کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کیفؔ آتشؔ کی زندگی ہی میں صباؔ کے شاگرد ہو چکے تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ کیفؔ، صباؔ و آتشؔ میں سے پہلے کس کے شاگرد ہوئے تھے۔ اس سوال کا جواب میر مونسؔ اور شادؔ عظیم آبادی جیسے معاصرینِ کیفؔ کی بیان کردہ ایک روایت کی بنیاد پر یہ ملتا ہے کہ کیفؔ پہلے صباؔ کے شاگرد ہوئے تھے مگر بعد کو انھوں نے خود آتشؔ کی خواہش پر آتشؔ ہی سے اصلاح لینا شروع کر دی تھی۔ (فکرِ بلیغ ص ۲۷۳)

کیفؔ کی مزاجی کیفیت کے متعلق ان کے معاصرین آغا جو شرفؔ،

امیر اللہ تسلیم، شاد عظیم آبادی اور میر یونس کے بیانات دل چسپی سے خالی نہیں۔ مثنوی افسانہ لکھنؤ (قلمی نسخہ ص ۱۹۵) میں شرق کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؂

جو ہیں فضل احمد خجستہ خصال
تخلص تو ہے کیفؔ اب سنیے حال
توکّل ہے، قانع ہیں، ابرار ہیں
یہ مردِ خدا نیک کردار ہیں
یہ شاگردِ آتشؔ کے ہیں انتخاب
مضامیں نئے، بندشیں لاجواب
یہ خوش فکر ہیں، اور ہیں نکتہ داں
عروضی ہیں، ان کو ہے علمِ بیاں

'آئینۂ ناظرین' کی تقریظ میں امیر اللہ تسلیم کا بیان ہے:—

"فضل احمد کیفؔ شاگردِ آتشؔ مغفور کا عجب دم تھا ہمیشہ ان کی خوش گوئی اور معاملہ بندی کا مُقر ایک عالم تھا جب تک اس خاکدانِ کدورت نشان میں زندہ سلامت رہے، تنہائی دوست، دشمنِ کثرت رہے۔ آزادگی کہ خاصۂ اہلِ کمال ہے دل کو نہایت مرغوب تھی، اس عالم اسباب میں سوائے بے تعلقی کے کوئی چیز نہ محبوب تھی نہ مطلوب تھی۔ بدولت بے نیازی اور استغنا کے اربابِ دول سے نہ ملتے، کبھی بے جا ضرورت اپنے گوشۂ خلوت سے نہ ہلتے۔ اکثر خاموش رہتے کونین فراموش رہتے۔ صورت سے پایا جاتا تھا کہ دل میں اشغال معنوی کا بھی مزا تھا...."

یہ تقریظ امیر اللہ تسلیم کی کمیاب اردو نثر کا ایسا نمونہ ہے جس سے تسلیم پر لکھنے والے اہلِ قلم بے خبر رہے ہیں۔ تقریظ میں تسلیم نے کیفؔ کی مزاجی کیفیت اور شخصیت کے جن نمایاں پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے اُن کی تشکیل میں کیفؔ کے حالاتِ زندگی کہاں تک برسرِ عمل رہے ہیں اور اُن کی سیرت کے ان پہلوؤں کا اظہار ان کے اشعار میں کس حد تک ہوا ہے؟ کیفؔ کی حیات و شاعری کے باب میں ان سوالات کا جائزہ لینا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ تنہائی پسندی کیفؔ کی سیرت کا وہ نمایاں پہلو ہے جو ان کے حالاتِ زندگی سے ہم آہنگ محسوس ہوتا ہے۔ عمر بھر شادی نہ کرکے اکیلے رہنا ان کی سیرت کے اسی پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ کیفؔ کی نشو و نما ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو شہرت و امارت سے محروم تھا اور جس کے حصے میں صرف گوشۂ گمنامی آیا تھا۔ کیفؔ کے گوشۂ تنہائی میں ان کے خاندان کے گوشۂ گمنامی کی کارفرمائی کس حد تک رہی ہے اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہم نشینوں، دوستوں اور رفیقوں کی کثرت جس ثروت و شہرت کی رہینِ منّت ہوا کرتی ہے اس سے کیفؔ ایک معمولی خاندان کی فرد ہونے کے باعث شاید محروم رہے ہوں گے۔ بھیڑ بھاڑ سے دور رہ کر گوشۂ تنہائی میں زندگی بسر کرنے کی عادت کو کیفؔ کے حالاتِ زندگی کا فطری نتیجہ کہا جائے گا۔

دنیوی امور سے بے تعلقی کیفؔ کی تنہائی پسندی کے میلان کی دین معلوم ہوتی ہے۔ کیفؔ کی سیرت میں ترکِ دنیا کے رجحان کو ان کے تصوّف سے شغف کا کلی نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تنہائی پسندی اور ترکِ دنیا یا تصوّف کی جانب میلان کیفؔ کی سیرت کے وہ پہلو ہیں جن کا اظہار ان کے اشعار میں بہ تکرار ہوا ہے مثلاً ؂

کچھ اور ہم کو غیب کی ہرگز خبر نہیں
اتنا تو جانتے ہیں کہ دنیا ہے چار روز (آئینۂ ناظرین ص ۹)

کھلتی نہیں ہے آنکھ کبھی صبحِ حشر تک
بہتر ہے قبر سے بھی کوئی خوابگاہ کیا ——— (ص ۱۷)

نہ کس طرح ہو کنجِ تربت پسند
سدا تخلیے کی ہے صحبت پسند ——— (ص ۴۳)

ان بتوں کو مظہرِ ذاتِ خدا کہتا ہوں میں
جو نہ کہنا تھا، وہی اب برملا کہتا ہوں میں ——— (ص ۱۳۵)

ترکِ دنیا کے میلان کے مظاہر میں دنیوی دولت و شہرت سے بیزاری کا رجحان بھی آتا ہے جس کے نقوش کیفؔ کی سیرت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں بھی جلوہ گر نظر آتے ہیں کیوں کہ شاعری میں کائنات کے ساتھ ساتھ ذات کے اظہار کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔

کیفؔ کے یہ اشعار ان کی شخصیت اور کردار کے آئینہ دار ہیں ؎

آواز چلی آتی ہے رونے کی وہاں سے
جن محلوں میں آگے کبھی ہوتا تھا سدا رقص (ص ۹۵)

کھدوا رکھ اپنی قبر تو بدلے خطاب کے
دنیائے بے ثبات میں نام و نشاں نہ ڈھونڈ (ص ۶۷)

دربار آج گو ہے ترا زور و شور پر
آئے گا کل کوئی نہ پسِ مرگ گور پر (ص ۹۲)

تسلیم نے یہ بھی بتایا ہے کہ کیفؔ بیش تر خاموش رہا کرتے تھے۔ شاد عظیم آبادی نے کیفؔ سے اپنی ملاقات اور بات چیت کے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے :-

" بیشتر دیکھا گیا ہے کہ زبانی تقریر و روزمرّہ میں تو بڑے فائق اور بڑے فصیح ہیں، مگر شعر ان کے بھدے اور فصاحت سے گرے ہوتے ہیں، اس کے برخلاف یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شیخ فضل احمد کیفؔ شاگرد آتش سے اگر باتیں کی جائیں تو سخت تعجب ہوتا ہے کہ یہی بزرگ ہیں جن کے اشعار روزمرّہ اور نمک فصاحت سے بھرے ہوتے ہیں۔" (فکر بلیغ ص ۲۳۶)

کیفؔ کی خاموشی کا سبب بظاہر ان کا وہ غیر دل چسپ طرزِ گفتگو رہا ہوگا جس کی طرف شاد عظیم آبادی نے اشارہ کیا ہے۔ میر مونس کا بیان ہے کہ کیفؔ گفت گو میں تتلاتے تھے۔ (فکر بلیغ ص ۲۷۳)۔ کیفؔ کی غیر دلچسپ گفتگو میں شاید ان کے توتلے پن کا بھی دخل رہا ہوگا۔ ان حالات میں اگر ایک توتلا شخص اپنی غیر دل چسپ گفتگو کو چھپانے کے لیے اگر خاموش رہنے کا عادی ہو جائے تو اس میں حیرت کی بات نہ ہوگی۔

میر مونس نے کیفؔ کی جسمانی وضع قطع کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ وہ جسمانی طور پر سوکھے، دُبلے اور کمزور آدمی تھے (فکر بلیغ ص ۲۷۳)۔ جسمانی طور پر کمزور، دُبلے اور سوکھے سہمے کیفؔ جیسے شخص کے درج ذیل اشعار میں عجب نہیں کہ ان کی کسی نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہوا ہو ؎

ان ضعیفوں سے کوئی پوچھے خدا کے واسطے
جس پہ تکیہ تھا جوانی میں وہ طاقت کیا ہوئی (ص ۲۰۳)

کندہ کیا ہے ہم نے یہ رستم کی گور پر
مغرور آدمی نہ ہو بازو کے زور پر (ص ۹۲)

کیفؔ فنِ شاعری میں اپنی اعلا استعداد کی بنیاد پر اپنے اُستاد میر صبا لکھنوی (متوفی ۲۷ رمضان ۱۲۷۱ھ مطابق چہار شنبہ ۱۳ جون ۱۸۵۵ء[۵۵]) کے جانشین تسلیم کر لیے گئے تھے۔ حسرت موہانی نے کیفؔ کو تلامذۂ صبا میں سرِ فہرست جگہ دی ہے[۵۶] اور صبا کے سگے داماد میر رضا حسین تنہا نے بھی کیفؔ کو صبا کا شاگرد رشید مانا ہے[۵۷]۔ کیفؔ کے نام اور نمونۂ کلام کا اُن کے عہد کے دوران لکھنؤ، دہلی، بھوپال اور بنگال میں لکھے جانے والے نصف درجن سے زائد تذکروں میں شامل ہونا بھی اس امر پر مُشعر ہے کہ وہ اپنے عہد میں ایک مستند اُستاد کی حیثیت سے ملک گیر مقبولیت کے مالک ہو گئے تھے۔ (کیفؔ کے احوال اور ادبی آثار جن تذکروں میں آئے ہیں ان میں "خوش معرکۂ زیبا" "سراپا سخن" لکھنؤ میں لکھے گئے تھے۔ "طبقات شعرائے ہند" "گلستانِ سخن" دہلی میں تحریر ہوئے تھے۔ "بزمِ سخن" "طورِ کلیم" بھوپال میں معرضِ وجود میں آئے تھے اور عبد الغفور نسّاخ کا تذکرہ سخن شعرا بنگال میں تیار ہوا تھا)۔ مولانا حسرت موہانی کیفؔ کے متعلق رقم طراز ہیں :

" منشی امیر احمد مینائی مرحوم نے "امیر اللغات" میں سند کے طور پر ان (کیفؔ) کے اشعار بکثرت نقل کیے ہیں جن سے ان کا مسلم الثبوت استاد ہونا قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے۔" ۵۸

کیفؔ لکھنوی نے اپنی اسی مقبولیت کی بدولت اپنے ارد گرد متعدد شاگردوں کا ایک حلقہ تیار کر لیا تھا۔ تلامذۂ کیفؔ کی فہرست میں ہمیں سردست درج ذیل شاگردوں کے نام دستیاب ہوئے ہیں :

(۱) نواب شاہ میرزا خاں آزاد (گلدستۂ شعرائے لکھنؤ جلد ۱ شمارہ ۲۸ مورخہ ۲۴ فروری ۱۸۶۱ء ص ۲)۔ (۲) آغا حسن آغا (بحوالہ ادبی مقالے ص ۱۶۱)۔ (۳) مولوی افہام اللہ افہام (آئینۂ ناظرین ص ۲۳۳)۔ (۴) نواب شاہ مرزا تجلی (گلدستۂ شعرائے لکھنؤ شمارہ ۱۵ بابت ۱۵ جولائی ۱۸۶۰ء ص ۳)۔ (۵) خواجہ حسام الدین حسام (آئینۂ ناظرین ص ۲۳۳)۔ (۶) منشی عبد البصیر حضور بلگرامی (ادبی مقالے ص ۱۶۸)۔ (۷) خواجہ محمد ذاکر رعد (گلدستۂ شعرائے لکھنؤ شمارہ ۱۳ بابت ۱۷ جون ۱۸۶۰ء

صہ) ۔ (۸) مرزا محمد حسین شمیم (ادبی مقالے ص۱۸۱) ۔ (۹) جوزف جوانس صاحب (ادبی مقالے ص۲۷) ۔ (۱۰) میر علی حسین صبر (گلدستہ شعرا لکھنؤ شمارہ ص۴) ۔ (۱۱) قمر الدین خاں قمر مولانی (ادبی مقالے ص۱۹۱) ۔ (۱۲) میر ہدایت اللہ خاں ہدا (بحوالہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ اپریل ۱۹۰۸ء ص۶ حاشیہ ص۳) ۔

ابھی تلامذۂ کیف کی اس نامکمل فہرست میں اضافے کی گنجائش موجود ہے۔

کیف اپنے سفرِ حیات کی آخری منزل کے دوران اپنے مکان واقع سبزی منڈی چوک لکھنؤ سے منتقل ہو کر اپنے شاگرد مولوی انعام اللہ انعام کے والد مولوی انعام اللہ نجم (ڈپٹی کلکٹر غازی پور) کی اقامت گاہ واقع فرنگی محل لکھنؤ آ گئے تھے۔ فرنگی محل لکھنؤ میں ڈیڑھ برس قیام رہا، اور آخرکار کیف نے شبِ جمعہ ۱۴ ربیع الآخر ۱۲۹۲ھ (مطابق بستم مئی ۱۸۷۵ء) کو گیارہ بجے شب میں وفات پائی۔ تقریظِ آئینۂ ناظرین" میں تسلیم لکھنوی کا بیان ہے کہ کیف کی تدفین باغ مولوی انوار (نزد رکاب گنج) لکھنؤ میں عمل میں آئی تھی لیکن "آبِ بقا" (ص۱۷۵) میں عشرت لکھنوی نے غلطی سے کیف کا مدفن عیش باغ لکھنؤ لکھا ہے۔ میں نے باغ مولوی انوار لکھنؤ میں کیف کے مزار کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس صورتِ حال پر کیف کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

مٹ جائے گا ہماری طرح سے مزار بھی
باز آئے چند روز کے نام و نشاں سے ہم

(آئینۂ ناظرین ص۱۱۲)

کیف کے ادبی آثار

کیف کا دیوان بہ عنوان "آئینۂ ناظرین" مطبع مصطفائی لکھنؤ سے ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ "آئینۂ ناظرین" میں منشی امیر اللہ تسلیم کی تقریظ اور وفاتِ کیف کے متعلق متعدد قطعاتِ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کیف کی وفات (۱۴ ربیع الآخر ۱۲۹۲ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۸۷۵ء) کے بعد شائع ہوا تھا۔ آئینۂ ناظرین کے لیے کلام کیف کی جمع آوری اور ترتیب کا کام ان کے کرم فرما، دوست اور استاد بھائی مولوی محمد انعام اللہ نجم گوپاموی (شاگرد میر وزیر علی صبا) نے کیف کی حیات ہی میں سر انجام دیا تھا اور اس کی طباعت کے مصارف کی کفالت بھی نجم نے کی تھی۔ "آئینۂ ناظرین" طبع ۱۲۹۲ھ کی کتابت شاید منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی نے فرمائی تھی، جیسا کہ آئینۂ ناظرین (ص۲۲۴) میں شامل منشی امیر اللہ تسلیم کے خاتمۃ الطبع کی درج ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے :-

"مولوی صاحب موصوف الصدر (مولوی انعام اللہ نجم) نے انھیں (کیف) کی حیات میں کمال جد و جہد سے کلامِ پریشاں جا بجا سے فراہم کیا بجائے خود ایک دیوان ترتیب دیا۔ سبحان اللہ عجب دیوان ہے کہ جس کو دیکھ کر روحِ نظیری قربان ہے۔ بلاغتِ معانی سے دمساز، فصاحت پر الفاظ کو ناز۔ مصرع چست، بندش درست۔ تراکیب پسندیدہ، محاورے سنجیدہ۔ کہیں درشتیِ کلام نہیں، الفاظِ غیر مستحسن کا نام نہیں۔ واقعی دیوان نہیں مرقع تصاویرِ معانی ہے، ہر ورق گویا کارنامہ بہزاد ہے ارژنگ مانی ہے۔ مولوی صاحب ممدوح نے کمالِ قدر دانی کو کام فرمایا، دیوان کو مطبع مصطفائی میں چھپوایا۔ مصارف طبع کی کفالت کی، سوائے جد و جہد بلیغ کے بڑی ہمت کی۔ کارگزارانِ مطبع کی عرق ریزی کا کیا کہنا واقعی دیوان مذکور بہت صحیح اور نہایت خوب چھپا۔ بیاضِ حسن بیاضِ گردنِ سلمیٰ سے ہم آغوش ہے، سوادِ سیاہی زلفِ لیلیٰ سے دوش بدوش ہے۔ ہر نقطہ نقطۂ مردمکِ چشمِ جادو نگاہ ہے، ہر دائرہ حلقۂ دائرۂ ماہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے قدر دانِ اہلِ ہنر کو خوش حال فارغ البال رکھے، تا قیام قیامت تک باجاہ و اقبال رکھے۔ آمین یا رب العالمین۔ تاریخیں طبع کی حوالۂ قلم ہوئیں، آخر میں زیب رقم ہوئیں۔"

لراقمہ

لراقمہ کے بعد امیر اللہ تسلیم کا اردو قطعۂ تاریخ ہے جس سے دیوان کا سنہ طباعت ۱۲۹۲ھ ملتا ہے۔

"آئینۂ ناظرین" ص۲۲۴ کے بغلی حاشیہ میں مولوی محمد انعام اللہ کی جانب سے یہ اعلان بھی چھپا ہے :-

" اطلاع۔ اس دیوان کا حقِ تالیف مؤلف نے صاحبِ مطبع مصطفائی کو ہبہ کیا۔ اس واسطے کوئی اور صاحبِ مطبع اس کے چھاپنے کے مجاز نہیں۔ فقط العبد مولوی محمد انعام اللہ ڈپٹی کلکٹر غازی پور"

"آئینۂ ناظرین" ۲۲×۱۶ سنتی میٹر ناپ کے ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، مسطر ۱۵ سطری ہے اور اس میں بہ لحاظِ حروفِ تہجی کیف کی ۱۹۸ غزلیں شامل ہیں جو صـ۲۲۰ پر ختم ہوتی ہیں۔ آخر کے چار صفحات میں منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کی تقریظ و خاتمہ نیز وفاتِ کیف و دیوانِ کیف کی طباعت کی مختلف شاعروں کی کہی ہوئی تاریخیں ہیں۔ غزلیات پر ان کے نمبر اور تعدادِ اشعار کے اندراج کا بھی التزام ہے دیوان میں کس ردیف میں کتنی غزلیں ہیں اس کا اندازہ درجِ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکے گا:

(۱) درجِ ذیل ردیفوں میں صرف ایک ایک غزل ملتی ہے: پ، ٹ، خ، ڈ، ذ، ڑ، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، ق، ک۔

(۲) دو دو غزلوں والی ردیفوں کی تفصیل یہ ہے: ث، چ، ح، ژ، س، غ، ف، گ، ل، ہ۔

(۳) تین تین غزلوں والی ردیفیں یہ ہیں: ج، م

(۴) چار غزلیں صرف ایک ردیف میں ہیں: د

(۵) پانچ غزلیں : ت

(۶) چھ غزلیں : ب

(۷) نو غزلیں : ر

(۸) چالیس غزلیں : الف

(۹) اٹھاون غزلیں : ے

(دیوان کا جو نسخہ میرے پیشِ نظر ہے اس میں بعض صفحات کی کمی کے باعث ردیف 'ن' نیز 'و' کی غزلوں کی تعداد کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔ دونوں ردیفوں میں مجموعی طور پر ۲۶ غزلیں ہیں)۔

"آئینۂ ناظرین" میں کیف کی غزلوں کی مجموعی تعداد ۱۹۸ ہے۔ اس کے مقابلے میں کیف کے استاد میر صبا کے دیوان "غنچۂ آرزو" مطبع محمدی لکھنؤ طبعِ اوّل مطبوعہ ۲۵ رجب ۱۲۷۰ھ (مطابق ۲۳ اپریل ۱۸۵۴ء) میں غزلیاتِ صبا کی مجموعی تعداد ۲۲۷ ہے۔ "آئینۂ ناظرین" میں کیف کی غزلیں ہی شامل ہیں اور یہ کیف کے دوسرے اصنافِ سخن کے نمونوں سے خالی ہے۔ مولانا حسرت موہانی انتخابِ سخن جلد ہفتم صـ۱۶۱ تا ۱۶۸ میں دیوانِ کیف کا انتخاب بھی شائع کرا چکے ہیں۔

کیف کا غیر متداول کلام

مجھے کیف کا کچھ ایسا کلام بھی ملا ہے جو آئینۂ ناظرین میں موجود نہیں کیف کا یہ غیر متداول کلام سطورِ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ؎

(۱) جُرم کرتے ہیں جان بوجھ کے لوگ
کیا ہی عہدِ شباب ہوتا ہے

"آئینۂ ناظرین" کی متعلقہ غزل نمبر ۱۹۰ پر کیف کا یہ شعر اضافہ ہے۔ یہ شعر "خوش معرکۂ زیبا" طبع لکھنؤ صـ۴۴۹ سے منقول ہے۔

(۲) الٰہی جلد نکل جائے ہجرِ یار میں رُوح
رکھے نہ دیر تلک مجھ کو احتضار میں رُوح

(۳) پس از فنا بھی کسی کی ہے جستجو باقی
بھٹکتی پھرتی ہے ہر ایک رہ گزار میں رُوح

(۴) الٰہی اب کہیں وعدہ مرا برابر ہو
نکال لے ملک الموت ہجرِ یار میں رُوح

(۵) نہ ہوگا ساتھ جو گلگشت میں وہ گُل اندام
اُڑے گی نکہتِ گُل کی طرح بہار میں رُوح

(۶) جو ذبح کر لے ہے کر، آ کے جلد اے صیّاد
ابھی تلک تو ہے باقی ترے شکار میں رُوح

(۷) مراد پر نہ کبھی نخلِ آرزو آیا
ہوئی نہ شاد کبھی باغِ روزگار میں رُوح

(۸) دوئی کو چھوڑ ذرا اور توئی کو یکساں جان (کذا!)
وہی ہے تو میں اے کیف جو ہے یار میں رُوح

اشعار نمبر (۲) تا (۸) سے "آئینۂ ناظرین" کی متعلقہ غزل ۱۲۱ خالی ہے کیف کے یہ ساتوں غیر متداول اشعار "سراپا سخن" صـ۲۱۳ سے ماخوذ ہیں۔

(۹) قطعۂ تاریخ : ـہ

نہ کیوں کر خوب ہو دیوانِ تسلیم — بہت مشتاق ہیں از حد ہیں خوش گو
کہی یہ کیفؔ نے تاریخ اسکی — کلامِ شاعرِ بے مثل دیکھو

۱۲۸۹ھ

منشی امیر اللہ تسلیم کے دیوان "نظمِ ارجمند" کے لیے کیفؔ کا یہ قطعۂ تاریخ بھی دیوانِ کیفؔ میں موجود نہیں ہے۔

(۱۰) قطعۂ تاریخ : ـہ

اے زہے نظمِ لاجوابِ صباؔ — نہیں دیوان، یہ کرامت ہے
نئے مضمون ہیں نئی بندش — کیا فصاحت ہے کیا بلاغت ہے
سالکانِ رہِ مجازی کو — رہبرِ منزلِ حقیقت ہے
صاحبِ فہم کے لیے اے کیفؔ — پند ہے، وعظ ہے نصیحت ہے
عیسیِ طبع نے کہی تاریخ — کیا نیا نسخۂ محبت ہے

(۱۲۷۲ھ) "غنچۂ آرزو" طبع ۱۸۷۰ء ص ۱۹۷

(۱۱) قطعۂ تاریخ : ـہ

اے بہارِ ریاضِ فکرِ صباؔ — بلبلِ گلشنِ سخندانی
کشورِ نظم در قلمروِ اوست — تاج بخشِ شہے و خاقانی
از سوادِ خطِ منورِ او — دیدۂ انوری است نورانی
خامہ اش از طراوتِ مضمون — دُر فشاں ہمچو ابرِ نیسانی
بحر یے کہ اوست صدر نشیں — بے وقار اند شوکت و شانی
از صفائے معانی و بندش — آئینہ در لباسِ حیرانی
کیفؔ تاریخ طبع دیواں گفت — بے مثال و کلامِ لاثانی

۱۲۷۲ھ
(غنچۂ آرزو ص ۱۹۸)

(۱۲) قطعۂ تاریخ : ـہ

چوں دیوانِ صباؔ گردید مطبوع — برآمد آرزوئے مستمنداں
بلفظِ "بیت" گفتم تازہ تاریخ — رباید تا دلِ نازک پسنداں
دو حرفِ پیش را شش بار بنوشت — بکن حرفِ سوم را ہم سہ چنداں

۱۲۷۲ھ
(غنچۂ آرزو ص ۱۹۸/۱۹۹)

کیفؔ نے اس تاریخ میں لفظ "بیت" کے پہلے دو حروف یعنی ب، ے کے اعداد کو (جو ۱۲ ہوتے ہیں) چھ بار لکھنے کو کہا ہے جن کا جوڑ ۷۲ ہوا۔ پھر لفظ "بیت" کے تیسرے حرف 'ت' = ۴۰۰ کو تین سے ضرب دینے کی ہدایت کی ہے جس سے ۱۲۰۰ برآمد ہوتے ہیں۔ اس طرح ۷۲+۱۲۰۰ جمع کرنے پر مطلوبہ سال ۱۲۷۲ھ دستیاب ہو جاتا ہے۔

(۱۳) قطعۂ تاریخ : ـہ

صباؔ چوں از جہاں رختِ سفر بست — شد از بادِ اجل برباد خاکش
خداوندا بفیضِ رحمتِ تو! — نگردد در قیامت ہیچ باکش
چو از جیبِ کفن بیروں بیاید — بدوزی از کرم دامانِ چاکش
اگر یک قطرہ از ابرِ تو بارد — برآید بادہ اطہر ز تاکش
بلوحِ دہر تاریخِ وصالش — نوشت از خونِ دل کیفؔ جفاکش
خداوندا بیامرزے صباؔ را — ہوائے خلد سازے روحِ پاکش

۱۲۷۱ھ
(غنچۂ آرزو ص ۱۹۳-۱۹۴)

(۱۴) قطعۂ تاریخ : ـہ

چوں صباؔ از جفائے خارِ اجل — نقل کردہ ز گلشنِ ایجاد
بہر تاریخِ رحلتش اے کیفؔ — بود در جستجو دلِ ناشاد
آمد از آسماں چنیں آواز — بر زمیں تاجِ شاعری افتاد

(غنچۂ آرزو ص ۱۹۴)

مصرعۂ آخر سے مطلوبہ سنہ ۱۲۷۱ھ کے بجائے ۱۷۸۰ء برآمد ہوتے ہیں جیسا کہ درج ذیل تفصیل سے واضح ہوگا:

افتاد		شاعری		تاج		زمیں		بر
۱۷۸۰ = ۴۸۶	+	۵۸۱	+	۴۰۴	+	۱۰۷	+	۲۰۲

غزلیاتِ کیفؔ کا تنقیدی جائزہ

شیخ فضل احمد کیفؔ لکھنوی نے اپنے اُستاد صباؔ اور آتشؔ کی طرح اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو صنفِ غزل کے لیے وقف کر دیا تھا۔ صباؔ کے سرمایۂ سخن میں تو غزلیات کے دوش بدوش ایک صیدیہ مثنوی بھی مل جاتی ہے جسے راقم الحروف نے شیعہ کالج میگزین لکھنؤ صبا نمبر ۸۲-۱۹۸۱ء میں دوبارہ شائع کرا دیا ہے۔ آتشؔ کے ادبی اثاثے میں غزلیات کے ساتھ ایک واسوخت بھی ملا ہے جسے استادِ محترم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی "مقدمۂ کلامِ آتشؔ" طبع دسمبر ۱۹۵۹ء ص ۱۲۰ تا ۱۲۸ میں دوبارہ شائع کرا چکے ہیں۔ کیفؔ نے غزل سرائی کے سوا دوسرے اصنافِ سخن کی جانب

برائے نام ہی توجہ کی ہے۔ آتش و صبا کے بعد لکھنؤ میں اُردو غزل کی نشو و نما میں کیف جس نام و مقام کے مستحق تھے اس سے وہ ناقدین کی عدم توجہ کے باعث محروم رہے ہیں۔ زیرِ نظر مقالے کی تسوید (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۶ء) تک کیف (متوفّی ۲۰ مئی ۱۸۷۵ء) کو وفات پائے ایک سو گیارہ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور ۱۱۱ سال کی اس طویل مدّت میں میری اطلاع کے مطابق کیف لکھنوی پر محض درج ذیل دو مختصر مضامین شائع ہوئے ہیں:-

(۱) رسالہ اُردوئے معلّٰی علی گڑھ ماہ اپریل ۱۹۰۸ء ص ۱ تا ۱۰۔ مضمون از مولانا حسرت موہانی۔

(۲) مضمون از ڈاکٹر شاہ عبدالسلام (مشمولہ دبستانِ آتش طبع ۱۹۷۷ء ص ۲۰۴ تا ص ۲۱۰)

یہ صورتِ حال کلام کیف کی جانب ناقدین کی عام عدم توجہی پر دال ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں اسی حوصلہ شکن صورتِ حال کی تلافی کی سعی کی گئی ہے۔

شیخ فضل احمد کیف لکھنوی کی شاعری کا نسب نامہ صبا و آتش سے ہوتا ہوا مشہور شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفی تک منتہی ہوتا ہے۔ کیف صبا کے جانشین تھے۔ صبا آتش کے جانشین اور آتش مصحفی کے جانشین تھے۔ اس طرح کیف اپنے عہد میں ہمارے نزدیک مصحفی کے ادبی ورثے کے ڈائرکٹ ڈسنڈنٹ (DIRECT DESCENDANT) تھے۔ کلام کیف میں زبان کی صفائی و روانی، محاورہ بندی، اخلاقی مضامین، تصوف اور تغزل (جن کی تفصیل آگے اپنے مقام پر آئے گی) وہ بنیادی اوصاف ہیں جو انھیں شاید مصحفی، آتش اور صبا کے ادبی ورثے سے ملے ہوں۔ کیف نے اپنے کلام میں اپنے استاذ الاساتذہ مصحفی کے کلام کی تقلید کرنے سے بالعموم شعوری طور پر گریز کیا ہے۔ کیف نے مصحفی کی زمین میں اگر گام فرسائی بھی کی ہے تو وہ مصحفی کے مضمون سے دامن بچا بچا کر خاصی احتیاط سے چلے ہیں۔ مصحفی و کیف کی ہم زمین غزلوں کے درج ذیل اشعار ہمارے اس قول کی تائید کریں گے۔

مصحفی:

ہے دلیل دور (کذا؟) با آمد یہ صبح و شام کا
کس طرح میں معتقد ہوں گردشِ ایّام کا

آفریں دستِ جنوں کعبے میں کیں یہ شورشیں
تار بھی باقی نہ رکھا جامۂ احرام کا

کچھ نہ کہنے پائے ہم قاصد سے دل کی وقتِ نزع
لب تلک آنا مقدر ہی نہ تھا پیغام کا

زیست تک قصر و محل کی فکر میں حیراں رہے
ہم نے زیرِ خاک اک پایا محل آرام کا

مصحفی کیا صنعتِ صانع میں کیجے گفتگو
یاں نہیں کچھ تذکرہ آغاز اور انجام کا[۱۲]

کیف:

زندگانی نام رکھا ہے بس اتنے کام کا
شام کرنا صبح کا ہے صبح کرنا شام کا

رُوح حاجی، دل ہے کعبہ، اک صنم کے عشق میں
ہے لباسِ تن میں عالم جامۂ احرام کا

اُٹھتے ہیں قبروں سے مُردے، صُور پھنکتا ہے پڑا
اب نہیں اے بختِ خوابیدہ محل آرام کا

دانت ٹوٹے، بال غفلت میں ہوئے یکسر سفید
تو بھی اک نکتہ نہ سمجھے موت کے پیغام کا

پوچھ لینا کیف کو، ڈھونڈے جو تو اے محتسب
میکدے میں کوئی شخص آتا ہے روز اس نام کا

آئینہ ناظرین ص ۴۵-۴۶

تلاش کرنے پر مصحفی و کیف کی منقولۂ بالا غزلوں کی زمین میں مصحفی کے شاگرد اور کیف کے اُستاد آتش کا بھی ایک دو غزلہ ملا ہے جس کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

ایک جا مثلِ دُرِ غلطاں کہیں ٹھہرا نہ پاؤں
اخترِ اقبال ہوں میں گردشِ ایام کا

اے تپِ غم گور میں لے چل جوانی میں مجھے
دو پہر ہے موسمِ گرما میں وقت آرام کا

تختۂ میت فراقِ یار میں معراج ہے
وحی آنا جانتا ہوں موت کے پیغام کا

گیسوؤں نے کردیا وہ چند حسنِ روئے یار
نور ہوتا ہے زیادہ تر چراغِ شام کا

یاد جو آیا طوافِ کعبہ میں آتش وہ ماہ
حال بدتر تھا کتاں سے جامۂ احرام کا[۱]

مصحفی و آتش کی زمین میں بھی کیف نے مضامین کے سلسلے میں اپنی راہیں دونوں سے الگ نکالی ہیں۔ کلامِ کیف میں مضامینِ مصحفی کے نقوش تلاش کرنے کی ضرورت ہے لیکن آتش بہرحال کیف کے اُستاد تھے، لہٰذا کیف کے یہاں کہیں کہیں کلامِ آتش کی ہلکی جھلکیوں کا ملنا فطری امر ہے۔ آتش[۱۲] و کیف[۱۳] کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؂

آتش: — رفیع القدر ہر مصرع ہے اپنی بیتِ موزوں کا
نہ ایسا طاقِ کسریٰ تھا نہ قصر ایسا فریدوں کا

کیف: — حبابِ بحرِ ہستی تھے، ہوئے نابود ہستی سے
کہاں اب طاقِ کسریٰ ہے کہاں ایواں فریدوں کا

آتش: — محبت ہوتی ہے معشوق کو بھی عشقِ کامل سے
زمیں میں ساتھ قاروں کے گڑا ہے گنج قاروں کا

کیف: — کھلا یہ پستیِ ہمت سے دُزدانِ معانی کی
عجب کیا قفل توڑیں خاک ہو کر گنجِ قاروں کا

آتش: — بنایا ہے زبس حکمت سے اپنی دستِ قدرت نے
وہ رُخ جوشِ صفا سے رشک ہے قلبِ فلاطوں کا

کیف: — ہمیں خم میں چھپا دینا جو آئے محتسب ساقی
تجھے بتلائے دیتے ہیں یہ ہم نسخہ فلاطوں کا

آتش: — صفا کے واسطے مجنوں وہ بُت دانتوں میں ملتا ہے
خدا حافظ ہے آتش آبروئے دُرِّ مکنوں کا

کیف: — نگہ پڑتی ہے دندانِ صنم پر آج کل اپنی
بنا ہے رشتۂ نظارہ رشتہ دُرِّ مکنوں کا

آتش: — رعد کا شور ہو موروں کی صدا سے پیدا
جھومتا ابرِ بہاری ہو ہوا سے پیدا

کیف: — ہانگیں گرمی میں جو ہم رند دُعائے باراں
آب ہو ابر سے اور ابر ہوا سے پیدا!

آتش: — حسنِ بُت سے جو بنی جان پہ اپنی تو کھلا
حال ہوتا ہے یہی عشقِ خدا سے پیدا

کیف: — اس مُرقعے میں جو تصویر ہے لاثانی ہے
کیسے کیسے ہوئے بُت شانِ خدا سے پیدا

آتش: — پابرہنہ، سرِ عُریاں و تنِ گرد آلود
ہے کراماتِ گدا حالِ گدا سے پیدا

کیف: — صورتِ موج نہ ہو چیں بہ جبیں او منعم
کہیں طوفاں نہ ہو کشتیِ گدا سے پیدا

آتش: — خونِ جگر سے اپنے غمِ دل ہوں پالتا
رکھتی ہیں طفلِ اشک کو مژگاں کنار میں

کیف: — قُلزم ہے پیشِ طفلِ سرشک اِس شمار میں
لڑکا ہو جس طرح سے پدر کے کنار میں

آتش: — صحرائے تن کی سیر تو مجنوں ذرا کرے
محمل سوار ہے اسی گرد و غبار میں

کیف: — آغازِ خط میں خاک کریں دیدِ حسنِ یار
کیا چاندنی کا لطف ہے گرد و غبار میں

آتش: — ہمیشہ منہ کے اوپر مردنی سی چھائی رہتی ہے
نہیں زندوں میں ہم اس دن سے تم پر جب سے مرتے ہیں

کیف: — کہیں کیا ہجر میں جو دن کڑے ہم پر گزرتے ہیں!
عجب عالم میں رہتے ہیں نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

آتش: — تمہارے خط نورس کی طرح ہے جب کہ لہراتا
عجب رغبت سے آہوئے سبزۂ صحرا کو چرتے ہیں

کیف: — وہ آنکھیں پھیر کر اغیار کی جانب سے کہتے ہیں
یہ وہ آہو نہیں جو سبزۂ بیگانہ چرتے ہیں

آتش: — خیال آیا ہے شانے کا انھیں، آئینہ دیکھا ہے
بلا نازل ہوئی بکھرے ہوئے گیسو سنورتے ہیں

کیف: — بلا ہے عاشقوں کے حق میں معشوقوں کی آرائش
یہاں دل بکھرا جاتا ہے وہاں گیسو سنورتے ہیں

آتش و کیف کی ان ہم زمین غزلوں کے ہم قافیہ اشعار کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ کیف نے جہاں آتش کے قافیوں کو اپنایا بھی ہے وہاں مضمون میں نئے گوشے پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ تلاش کرنے پر ہمیں آتش و کیف کے بعض ایسے متفرق اشعار بھی ملے ہیں جن میں ہلکی سی مشابہت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

آتش :— آنکھیں ڈھاتی ہے وہ نرگسِ فتاں کیا کیا
داغ دیتی ہے مجھے گردشِ دوراں کیا کیا
——— (کلیاتِ آتش ص ۲۱)

کیف :— کوچۂ زلف سے آتی ہیں صدائیں کیا کیا
اس طلسمات میں ملتی ہیں بلائیں کیا کیا
——— (آئینۂ ناظرین ص ۱۴)

آتش :— سینے پر سنگِ ملامت جو گراں جاں روکے
گُرزِ رستم کو یقیں ہے کہ وہ انساں روکے
——— (کلیاتِ آتش ص ۱۷۶)

کیف :— گُرزِ رستم ہو تو شہزور سپر پر روکے
ضربتِ تیغِ اجل کو کوئی کیونکر روکے
——— (آئینۂ ناظرین ص ۱۶۳)

کیف یوں تو آتش و صبا دونوں ہی کے شاگرد رہ چکے ہیں مگر انھوں نے آتش کے مقابلے میں صبا سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ یہ بات کیف کے حالاتِ زندگی سے بھی واضح ہوتی ہے اور ان کا کلام بھی اس کا شاہد ہے۔ کیف دراصل صبا کے عام شاگرد ہونے کے بجائے بجا طور پر اُن کے جانشین رہے ہیں۔ کیف کے یہاں خم کدۂ آتش سے زیادہ صہبائے صبا کی کیفیت ملتی ہے۔ کیف اگر گہر آب دار تھے تو اس موتی کی نشو و نما کے لیے صبا صدف کی حیثیت رکھتے تھے۔ کیف کو گلشنِ صبا کا گُلِ خوش رنگ قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ کیف نے فنِ شاعری کے آداب صبا کی ادبی محفلوں سے سیکھے تھے اور کیف کی ادبی دُکان کے ساز و سامان کے ایک قابلِ لحاظ حصے کو صبا کے کارخانۂ شعر و سخن کی پیداوار قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ کیف کے یہاں دسیوں اشعار صبا کے اثرات کے آئینہ دار ہیں۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق کیف نے اپنے استاد میر صبا کی زمینوں میں تقریباً تین درجن غزلیں کہی ہیں[۱۹] کیف پر صبا کے اثرات کے مطالعے میں دونوں کی ہم زمین غزلوں کے ہم قافیہ یا معنوی اعتبار سے مماثلت رکھنے والے اشعار کا تقابلی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ؎

(۱) صبا :— فکرِ دنیائے دنی سے نہ یہ عالم ہوتا
پیش تر ہم نہ ہوئے ارض و سما سے پیدا
——— (غنچۂ آرزو ص ۳)

کیف :— یہ جہاں تنگ بہت ہے ترے دیوانوں پر
کاش ہوتے ہم الگ ارض و سما سے پیدا
——— (آئینۂ ناظرین ص [illegible])

(۲) صبا :— ملایا خاک میں گردوں نے کس کس نام آور کو
نشاں ملتا نہیں ہے قبرِ جمشید و فریدوں کا
——— (غنچۂ آرزو ص ۳)

کیف :— حبابِ بحرِ ہستی تھے ہوئے نابودِ ہستی سے
کہاں اب طاقِ کسریٰ ہے کہاں ایوان فریدوں کا
——— (ا۔ ن ص ۳۲)

(۳) صبا :— دل میں اک درد اٹھا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا
——— (غ۔ ا۔ ص ۴)

کیف :— دل میں گولاکھ تھے شکوے مگر ان کے آگے
ایسے کھوئے گئے، کچھ بھی نہ ہمیں یاد آیا
——— (الف۔ ن۔ ص ۲۱)

(۴) صبا :— عاشقوں سے نہ رہا کوئی زمانہ خالی
کبھی وامق، کبھی مجنوں، کبھی فرہاد آیا
——— (غ۔ الف ص ۳)

کیف :— بیستوں پر جو کبھی جاؤں میں وہ عاشق ہوں
نقشِ شیریں سے صدا آئے کہ فرہاد آیا
——— (الف۔ ن ص ۲۱)

(۵) صبا :— مژۂ یار کے نشتر نے کیا سودائی

خونِ فاسد کی طرح جوشش میں فصّاد آیا
(غ۔ الف ص۴)

کیف :۔ میری وحشت سے نہ ان کو کہیں سودا ہو جائے
پوچھتے پھرتے ہیں اک ایک سے "فصّاد آیا؟"
———— (الف۔ ن ص۲۱)

(۶) صبا :۔ دمِ آغازِ جنوں، طوقِ گلوگیر ہوا !
غل مچانے بھی نہ پائے تھے کہ حدّاد آیا
———— (غ۔ الف ص۴)

کیف :۔ میری وحشت نے مرے گھر کو بنایا بازار
کبھی فصّاد سدھارا کبھی حدّاد آیا
———— (الف۔ ن ص۲۱)

(۷) صبا :۔ اے مغبچو تمھارا بایاں قدم میں لوں گا ! علہ
زاہد کا گر عمامہ رہنِ شراب ہوگا
———— (غ۔ الف ص۶)

کیف :۔ کیا جانیے نجس ہیں یا پاک ہاتھ تیرے
اے محتسب نہ چھونا ساغر خراب ہوگا
———— (الف۔ ن ص۱۸)

(۸) صبا :۔ اے زاہدِ ریائی دیکھی نماز تیری
نیت اگر یہی ہے تو کیا ثواب ہوگا
———— (غ۔ الف ص۵)

کیف :۔ جو آئے میکدے میں اس کو ثواب ہوگا
کعبے چلا ہے زاہد کیا خراب ہوگا
———— (الف۔ ن ص۱۸)

(۹) صبا :۔ کسی کے وعدے کا رہ رہ کے دھیان آتا ہے
اٹک اٹک کے نکلتی ہے انتظار میں رُوح
———— (غ۔ الف ص۵)

کیف :۔ یقین ہے جو ذرا سا کسی کے آنے کا
نکل نکل کے پھر آتی ہے انتظار میں رُوح
———— (الف۔ ن ص۱۹)

(۱۰) صبا :۔ لبوں تک آہ نہیں فرطِ ضعف سے آتی
بُتو خدا سے ڈرو میں کہاں، کہاں فرہاد
———— (غ۔ الف ص۵۳)

کیف :۔ بُرا ہو عشق کا، جس نے عذاب میں ڈالا
وگرنہ ہجر کہاں، میں کہاں، کہاں فرہاد
———— (الف۔ نون ص۴۲)

(۱۱) صبا :۔ تری موجِ تبسّم پر خضر کا دم نکلتا ہے
پھرا جاتا ہے پانی آبرو ئے آبِ حیواں پر
———— (غ۔ الف ص۵۶)

کیف :۔ مزا پڑ جائے مرنے کا جسے لب ہائے جاناں پر
نہ تھوکے وہ کبھی مثلِ سکندر آبِ حیواں پر
———— (الف۔ ن ص۸۰)

(۱۲) صبا :۔ کعبے میں ہیں کبھی تو کبھی سومنات میں
خود رفتگی سے بند نہیں اک مقام پر
———— (غ۔ الف ص۵۹)

کیف :۔ موقوف دیر پر ہے نہ بیت الحرام پر
ڈھونڈا ہے اے صنم تجھے کس کس مقام پر
———— (الف۔ ن ص۸۱)

(۱۳) صبا :۔ قربان اپنی چشمِ حقیقت کے اے صبا
ہے ایک سی نگاہ سلیمان و مور پر
———— (غ۔ الف ص۶۲)

کیف :۔ نعمت سے تیری سیر قوی و ضعیف ہیں
یکساں تری نظر ہے سلیمان و مور پر
———— (الف۔ ن ص۸۳)

(۱۴) صبا :۔ بادہ نوشی پر رہا دار و مدار اب کی برس
طاق پر رکھے ہیں سب کاروبار اب کی برس
———— (غ۔ الف ص۶۷)

کیف : بادہ خواری یا وصالِ یار یا سیرِ بہار
اس سوا ہم کو نہیں کچھ کاروبار اب کی برس
———— (الف۔ ن ص۹۲)



نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نینی تال میں آنجہانی شری گووند ولبھ پنت کی یاد میں منعقدہ نمائش د
ہوئے ۔ ان کے ہمراہ مرکزی وزیر شری کے۔سی پنت اور شری نرائن دت تیواری بھی نظر آرہے ہیں۔

یہ انیکسی بھون (لکھنؤ) میں ۷، ستمبر ۱۹۸۷ء کو خشک سالی سے نپٹنے کے سلسلے میں ایک اعلا سطحی جلسہ منعقد ہوا۔ یہ تصویر
قع کی ہے جس میں مرکزی وزیر توانائی شری وسنت ساٹھے اور وزیر اعلا اتر پردیش شری ویر بہادر سنگھ بھی نظر آرہے ہیں۔





نئی حکومت کے دو سال مکمل ہونے پر ۲۵ ستمبر ۱۹۸۷ء کو سہکاریتا بھون (لکھنؤ) میں یو پی اردو جرنلسٹ ایسوسی
صدر شری شکیل الرحمن شمسی ایک خصوصی تقریب میں وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ کو سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے

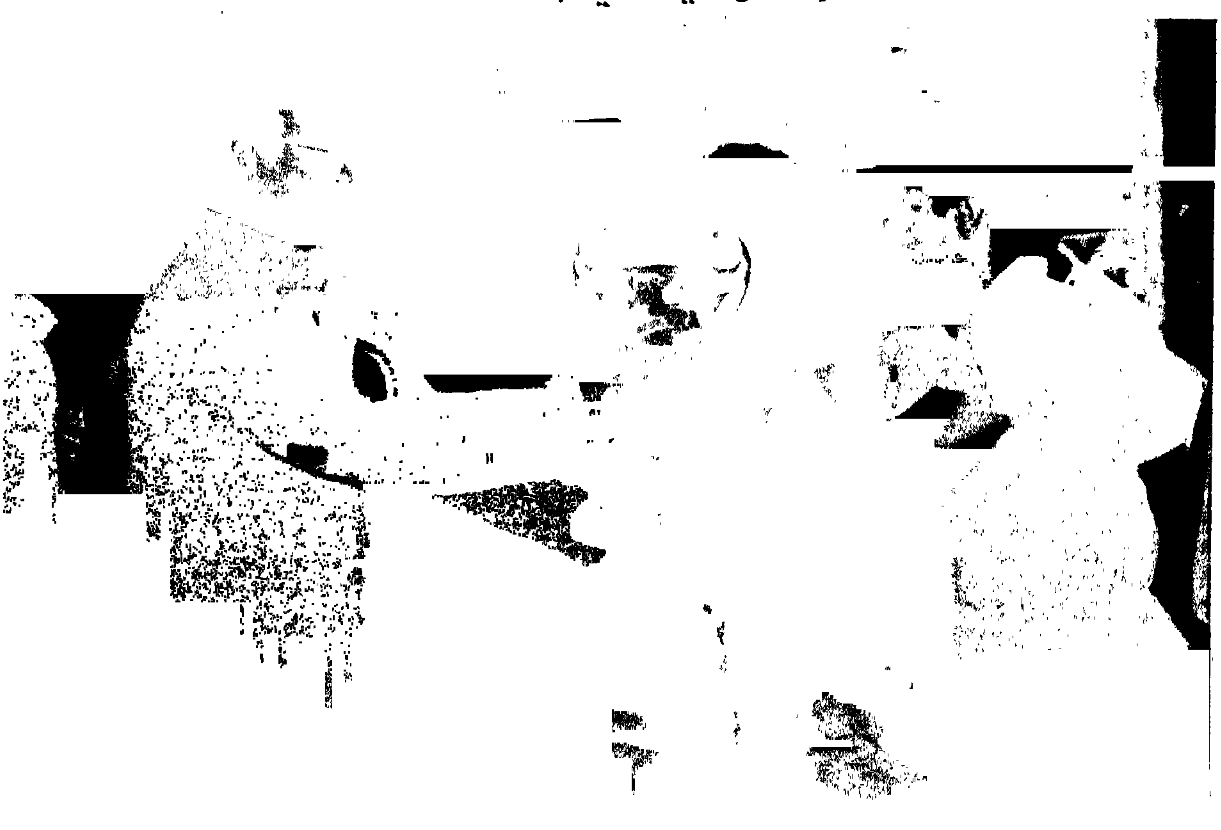
مشہور و ممتاز ادیب شری ادبیندر ناتھ اشک ۱۸ ستمبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ کو
اپنی تصنیفات پیش کرتے ہوئے۔





وزیر پارلیمانی امور ڈاکٹر عمار رضوی ۲۵ اگست ۱۹۸۷ء کو دارالشفا (لکھنؤ) میں اتر پردیش مومن کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے

وزیر تعلیم نثری سبط رضی ۲۳ اگست ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں منعقدہ ٹینس بال کرکیٹ ٹورنامنٹ کی فاتح ٹیم کے کپٹن کو انعامی شیلڈ دیتے ہوئے۔



ایک یادگار تصویر

(۵۳ - ۱۹۵۲ء)



کرسیوں پر (بائیں سے) سیّد ظہیر الدین علوی ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
ظہیر احمد صدیقی اور رشید احمد صدیقی وغیرہ

(۱۵) صبا:— ٹوٹی جاتی ہیں گلوں کے بار سے سب ڈالیاں
پھٹ پڑی ہے باغ میں کیسی بہار اب کی برس
—— (رغ. الف صـ۶۸)

کیف:— جائے حرمت یار سے کیا اختیار اب کی برس
آئی ہے توبہ شکن فصلِ بہار اب کی برس
—— (الف. ن صـ۹۱)

(۱۶) صبا:— محفل میں جو پروانہ تو جنگل میں بگولا!
ہر حال میں خوش رہتے ہیں کرتے ہیں سدا رقص
—— (رغ. الف صـ۶۹)

کیف:— آواز چلی آتی ہے رونے کی وہاں سے
جن محلوں میں آ گئے کبھی ہوتا تھا سدا رقص
—— (الف. ن صـ۹۵)

(۱۷) صبا:— ہم وہ عاشق ہیں کہ طفلی میں نہ نیند آتی تھی
دایہ جب تک نہ بیاں کرتی تھی افسانۂ عشق
—— (رغ. الف صـ۷۴)

کیف:— جب تلک سورۂ یوسف نہ پڑھا تھا ہم نے
بہ خدا جھوٹ سمجھتے تھے ہم افسانۂ عشق
—— (الف. ن صـ۱۰۵)

(۱۸) صبا:— نکلیں کہیں احاطۂ وہم وگماں سے ہم
باز آئے اس زمین سے اس آسماں سے ہم
—— (رغ. الف صـ۸۲)

کیف:— مُردوں پہ بھی نہ ہوں گے یہ صدمے فشار کے
ہیں تنگ جس قدر ستمِ آسماں سے ہم
—— (الف. ن صـ۱۱۲)

(۱۹) صبا:— اللہ رے شوق منزلِ مقصود کا ہمیں
نالوں میں بڑھ گئے جرسِ کارواں سے ہم
—— (رغ الف صـ۸۲)

کیف: اے خضر شوقِ منزلِ مقصود دیکھنا
کوسوں ہی آگے راہ میں ہیں کارواں سے ہم
—— (الف ن صـ۱۱۲)

(۲۰) صبا:— کون سنتا ہے تری جوشش جنوں میں ناصح
خضر بھی آئیں تو ہم راہ بتا دیتے ہیں
—— (رغ الف صـ۹۴)

کیف:— جوش میں آتے ہیں جس وقت ترے دیوانے
دھجیاں دامنِ صحرا کی اڑا دیتے ہیں
—— (الف. ن صـ۱۲۳)

(۲۱) صبا:— دُور کر لِلّٰہ یہ غفلت کا پردہ دُور کر
کچھ تجھے اپنی خبر اے بے خبر ملتی نہیں
—— (رغ. الف صـ۹۹)

کیف:— یاد رکھ اے نامہ بر اتنا پتا دیتا ہوں میں
وہ وہاں پر ہیں جہاں کی کچھ خبر نہیں ملتی
—— (الف. ن صـ۱۲۳)

(۲۲) صبا:— روز دو چار کے رونے کی صدا آتی ہے
رنگ لاتا نہیں یہ چرخِ ستم گر کس دن
—— (رغ. الف صـ۱۰۳)

کیف:— روز ڈھے جاتے ہیں لاکھوں ہی محل دُنیا میں
خاک اڑاتا نہیں یہ چرخِ ستم گر کس دن
—— (الف. ن صـ۱۲۵)

(۲۳) صبا:— کس قدر طالبِ دیدار ہیں اللہ اللہ
دیکھیے ہوتا ہے ہنگامۂ محشر کس دن
—— (رغ الف صـ۱۰۴)

کیف:— شوقِ دیدار بھی ہے، دہشتِ اعمال بھی ہے
ہو چکے دیکھیے ہنگامۂ محشر کس دن
—— (الف ن صـ۱۲۸)

(۲۴) صبا:— جفا و جور کا شکوہ نہیں کیا جاتا
نہیں نہیں ہمیں کچھ آپ سے ملال نہیں
—— (رغ. الف صـ۱۰۵)

کیف: نہیں سہی جو ہمارا تمہیں خیال نہیں
تمہارے بندے ہیں ہم ہم کو کچھ ملال نہیں
—— (الف. ن صـ۱۲۸)

(۲۵) صبا: خدا کا قہر بتوں کا عذاب رہتا ہے
اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے
(غ۔ الف ص ۱۵۳)

کیف: تری گلی کو کہوں کس طرح بہشت اے حور
یہاں تو جان پہ ہر دم عذاب رہتا ہے
(الف۔ ن ص ۱۹۸)

(۲۶) صبا: ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں ہیں ایک مشتِ خاک کے
(غ۔ الف ص ۱۵۸)

کیف: حوصلے اللہ رے مشتِ خاک کے
ظلم اٹھائے آدمی افلاک کے
(الف۔ ن ص ۲۱۳)

(۲۷) صبا: خاکساروں سے نہ کر پہلو تہی
ایک دن جانا ہے نیچے خاک کے
(غ۔ الف ص ۱۵۹)

کیف: خاکساری کیوں نہ ہو اپنا طریق
ایک دن جانا ہے نیچے خاک کے
(الف۔ ن ص ۲۱۲)

(۲۸) صبا: نشاں سدا نہیں رہتا ہے، نام رہتا ہے
وہ کام کر کہ زمانے میں واہ واہ رہے
(غ۔ الف ص ۱۹۳)

کیف: یہ آرزو ہے الٰہی کہ میں رہوں نہ رہوں
مرا کلام رہے اور واہ واہ رہے
(الف۔ ن ص ۲۰۹)

(۲۹) صبا: صباحِ حشر سراپا قصور وار اٹھے
ہر اک گناہ کے اعضائے تن گواہ رہے
(غ۔ الف ص ۱۹۲)

کیف: چھپا نہ دیدۂ خوں بار سے ہمارا حال
گناہِ عشق کے ہر وقت دو گواہ رہے (الف ن ص ۲۰۹)

(۳۰) صبا: اثرِ آتشِ سودا سے دوا جلتی ہے
تیرے بیمار کی صورت سے شفا جلتی ہے
(غ۔ الف ص ۱۹۲)

کیف: جانِ عیسیٰ کی مرے غم میں سدا جلتی ہے
اس قدر گرم نفس ہوں کہ دوا جلتی ہے
(الف۔ ن ص ۲۰۷)

(۳۱) صبا: کیا کیا ان آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے اے صبا
کیا کیا دکھاتی ہے ابھی تقدیر دیکھیے
(غ۔ الف ص ۱۶۷)

کیف: اے کیف عشقِ یار میں، جب تک کھلی ہے آنکھ
جو کچھ دکھائے گردشِ تقدیر دیکھیے
(الف۔ ن ص ۲۰۶)

(۳۲) صبا: عشقِ اللہ ہوا، راہ بتوں سے نہ رہی
یہ طریق اور ہے وہ سنگِ نشاں دور رہے
(غ۔ الف ص ۱۶۷)

کیف: چھوڑ کر دیر و حرم منزلِ مقصد پہنچے
راستہ قطع ہوا سنگِ نشاں دور رہے
(الف۔ ن ص ۱۹۴)

(۳۳) صبا: مر گئے پر یہ گناہوں کی گراں باری ہے
بیٹھے جاتے ہیں جنازے کے اٹھانے والے
(غ۔ الف ص ۱۸۸)

کیف: کیا کہیں کٹتی ہے کیوں کر شبِ فرقت اپنی
بیٹھے رہتے ہیں جنازے کے اٹھانے والے
(الف۔ ن ص ۱۸۶)

(۳۴) صبا: دل لگانا عذاب ہوتا ہے
آدمی کیا خراب ہوتا ہے (غ۔ الف ص ۱۹۰)

کیف: عشق جب باریاب ہوتا ہے
خانۂ دل خراب ہوتا ہے (الف۔ ن ص ۲۱۱)

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام اس بات سے انکار فرماتے ہیں کہ کیف

صبا کے شاگرد تھے۔ (دبستان آتش ص ۲۰۶) مگر یہ درجنوں اشعار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ کیف صبا کے شاگرد بھی تھے اور ان کے کلام کو صبا کے اثرات سے کسی طرح خالی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

کلامِ کیف میں صبا کے اثرات کی موجودگی سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی صبا کی تقلید میں گزاری تھی۔ کیف کے سرمایۂ سخن میں بہت کچھ حصہ ایسا بھی ہے جسے خود اُن کی ذاتی کاوش اور صلاحیت کا نتیجہ قرار دیا جائے گا اور جس میں صبا کی تقلید کا دخل نہیں۔ کیف نے صبا سے استفادہ کرنے کے باوجود وادیٔ شعر و سخن میں اپنا جادہ خود بنایا تھا اور اس جادے پر وہ یقیناً اپنے استاد سے آگے بھی نکل جاتے تھے۔ کیف کے ادبی سفر کی یہی وہ منزل تھی جہاں شاگرد اور استاد کی راہیں الگ ہو جانے کے باعث استاد و شاگرد کے درمیان دوری پیدا ہو گئی تھی۔ ہمارے ان معروضات پر مبنی بر قیاس تنقیدی مفروضات کا لیبل اس لیے نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ ان کے سرے کیف کے صحیفۂ حیات کے ایک ایسے واقعے سے ملتے ہیں جسے ان کے بعض معاصرین نے عینی شاہد کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

سید علی محمد شاد عظیم آبادی (متولد نوزدہم محرم ۱۲۶۲ھ مطابق[18] ۱۸ جنوری ۱۸۴۶ء و متوفی ۴ رجب ۱۳۴۵ھ مطابق ۸ جنوری ۱۹۲۷ء) کیف کے نہ صرف معاصرین میں تھے بلکہ شاد دراصل کیف کے استاد میر صبا کے سگے سمدھی مرزا دبیر کے شاگرد بھی تھے۔ شاد نے کیف کے ایک دوسرے ہم عصر میر مونس (برادر میر انیس) کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا ہے:-

"(میر مونس) ایک اور نقل بیان کرتے تھے جس کی تحقیق مجھ کو بعد میں ہوئی۔ یہ واقعہ شیخ فضل احمد کیف تخلص کے ساتھ پیش آیا تھا۔ میر مونس کہتے تھے کہ میں بھی ایک مشاعرے میں شریک تھا آتش مرحوم (متوفی محرم ۱۲۶۳ھ) بیٹھے جھوم رہے تھے۔ اسی صف میں ایک کم عمر شوکھے، دبلے اور کم رو — (کم رو کوا؟ کم رو ر؟) — تتلے لڑکے نے اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا ؎

چمن میں آ کے یہ کس نے شگوفہ چھوڑا ہے
کہ آج تک گُل و بُلبل میں بول چال نہیں

آتش نے گردن اٹھا کر کہا کہ ہاں لڑکے پھر پڑھو۔ تین دفعہ پڑھوایا اور پھر کہا کہ میں اپنی غزل اس شعر کے آگے کیا پڑھوں گا۔ یہ لڑکا کس کو دکھاتا ہے۔ میر وزیر علی صبا نے کہا کہ حضور ہی کا خادم ہے۔ کہا کہ بھئی تمھارا شاگرد ہے تو اب اس کی غزل میں بناؤں گا۔ صبا نے جھک کر سلام کیا۔ اتفاقاً لکھنؤ سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین عزیز[19] مرحوم کے یہاں خود کیف مرحوم سے یہ سُن کر کہ خواجہ آتش مرحوم کے شاگرد ہیں اور آتش کے مشاعرے میں شریک ہوئے ہیں، میر مونس کی زبانی مذکورہ بالا نقل میں بیان کرنے لگا۔ عزیز نے کہا کہ جس کی نقل آپ بیان کر رہے ہیں خود شیخ فضل احمد کیف کی ہے۔ دوسری نقل یہ سنی کہ جب حسب الحکم آتش کے پاس جانے لگے اور شاعروں میں غزلیں بے حد رنگ دینے لگیں اور کبھی کبھی اپنے اُستاد صبا سے بھی بڑھنے لگے تو اصلاح لینا ترک کر دیا۔ سب سے ظاہر کیا کہ میں نے غزل گوئی ترک کر دی لیکن کوئی ایسی طرح نہ تھی جس میں انھوں نے غزل نہ کہی ہو۔ یہ اظہارِ ترک محض اپنے قدیم اُستاد صبا کے سبب سے تھا، ایسے لوگ اب نایاب ہیں۔"

(فکرِ بلیغ ص ۲۰۳ تا ص ۲۰۴)

معاصرین کے یہ بیانات کیف اور ان کے اُستاد صبا کے درمیان نہ صرف تعلقات کی کشیدگی کی نشان دہی کرتے ہیں بلکہ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُستاد و شاگرد کے باہمی تعلقات میں یہ کشیدگی دراصل شاعری میں شاگرد کے اُستاد پر سبقت لے جانے کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ کیف کا وہ شعر جس پر خواجہ آتش نے بھرے مشاعرہ تعریف کر کے اُن کی اصلاح کا کام اپنے ذمہ لینے کی خواہش

کا اظہار کیا تھا۔ آئینۂ ناظرین ص۱۲۹ میں مصرعۂ اوّل میں معمولی اختلاف کے ساتھ یوں ملتا ہے ؎

کسی نے باغ میں ایسا شگوفہ چھوڑا ہے
کہ آج تک گُل و بُلبل میں بول چال نہیں

مذکورہ بالا روایت بتاتی ہے کہ کیفؔ نے یہ غزل جس طرحی مشاعرے میں پیش کی تھی اس میں آتشؔ بھی شریک ہوئے تھے اور انھوں نے مشاعرے کے لیے طرحی غزل بھی کہی تھی۔ گویا یہ طرحی مشاعرہ آتشؔ کی وفات (۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ مطابق چہار شنبہ ۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء) سے قبل منعقد ہوا تھا۔ تلاش کرنے پر مجھے آتشؔ کے غیر متداول کلام میں مذکورہ طرحی مشاعرے کی غزل مل گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی مجھے اس زمین میں کیفؔ کے متعدد اور بھی لکھنوی معاصرین کی غزلیں ملی ہیں جن میں میر وزیر علی صباؔ، میر دوست علی خلیلؔ (شاگرد آتشؔ)، شیخ امداد علی بحرؔ (تلمیذ ناسخؔ) اور سید محمد خاں رندؔ (شاگرد آتشؔ) کے نام شامل ہیں۔ اس طرح میں بحرؔ کا دو غزلہ دستیاب ہوا ہے اور رندؔ نے اس طرح میں سہ غزلہ کہا ہے۔ رندؔ کا یہ سہ غزلہ ان کے اس دوسرے دیوان میں ہے جس میں دیوانِ اوّل کی تکمیل (اواخر رجب ۱۲۵۸ھ مطابق اگست ۱۸۴۲ء) کے بعد کا کلام ہے۔ گویا رندؔ کا محولہ بالا سہ غزلہ اگست ۱۸۴۲ء کے بعد مگر وفات آتشؔ (۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء) سے قبل کا کلام ہے۔ چنانچہ اس سہ غزلہ کی آخری غزل کے درج ذیل مقطعے میں رندؔ خود معترف ہیں ؎

غزل کہی ہے یہ اے رندؔ حکمِ آتشؔ سے
وگرنہ شعر کا مدّت سے کچھ خیال نہیں

رندؔ کی مذکورۂ بالا غزل پر یہ عنوان بھی درج ملتا ہے۔

"غزل مشاعرۂ سراج الدولہ فرمائش آتشؔ"

گویا کیفؔ، آتشؔ، صباؔ، بحرؔ، خلیلؔ اور رندؔ کی مذکورہ بالا تمام ہم زمین و ہم زمانہ غزلیں آتشؔ کی زندگی میں منعقد ہونے والے سراج الدولہ کے طرحی مشاعرے کے لیے کہی گئی ہوں گی اور عجب نہیں کہ سراج الدولہ کا یہ طرحی مشاعرہ شاید ۱۸۴۲ء میں (ماہ اگست کے بعد) منعقد ہوا ہو۔ اگر ہمارے یہ معروضات قابلِ قبول ہوں تو اواخر ۱۸۴۲ء کے آس پاس

منعقد ہونے والے سراج الدولہ کے اس طرحی مشاعرے کے وقت کیفؔ (متولد ۱۸۲۳ء) کی عمر تقریباً ۱۹ سال رہی ہوگی اور شاید اسی لیے میر مونسؔ نے عینی شاہد کی حیثیت سے اس مشاعرے میں شرکت کے وقت کیفؔ کو کم عمر لڑکا بتایا ہے۔ کیفؔ، آتشؔ، صباؔ، بحرؔ، خلیلؔ اور رندؔ کی ان ہم زمین و ہم زمانہ غزلوں کے مطلعے درج ذیل ہیں ؎

(۱) کیفؔ: نہیں سہی جو ہمارا تمھیں خیال نہیں
تمھارے بندے ہیں ہم، ہم کو کچھ ملال نہیں

(۲) آتشؔ: ادا و ناز نہیں جس میں، خوش جمال نہیں
ہوئی جو چاند سی صورت تو کچھ کمال نہیں

(۳) صباؔ: یہ محو ہیں کہ ذرا غم نہیں، ملال نہیں
ترا خیال ہے اپنا ہمیں خیال نہیں

(۴) بحرؔ: بہارِ حسنِ خدا داد کو زوال نہیں
سدا گلاب کے دو پھول ہیں وہ گال نہیں

(۵) خلیلؔ: جو دل میں داغِ غمِ یارِ خوش جمال نہیں
مثالِ خانۂ تقویم گھر ہے مال نہیں

(۶) رندؔ: حسین بگڑیں تو بگڑیں مجھے ملال نہیں
غضب بتوں کا ہے کچھ قہرِ ذوالجلال نہیں

ان اشعار میں سے آتشؔ کا مطلع ان کی اس غزل سے نقل کیا گیا ہے جو آتشؔ کی زندگی کے دوران ۱۴ جمادی الاول ۱۲۶۱ھ کو مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہونے والے کلیاتِ آتشؔ کے متداول پہلے اڈیشن میں موجود نہیں۔ اس کا سبب بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آتشؔ نے اپنی اس غزل کو ناپسندیدگی کے باعث کلیات سے خارج کیا ہوگا۔ مگر آتشؔ کی وفات (محرم ۱۲۶۳ھ) کے بعد جب ۱۱ جمادی الاول ۱۲۶۸ھ کے قریب کلیاتِ آتشؔ کا دوسرا اڈیشن سلطان المطابع سے شائع ہوا تو اس میں آتشؔ کے غیر متداول کلام کے ماتحت ستائیس ایسی غزلوں کا اضافہ کر دیا گیا جو کسی نہ کسی وجہ سے کلیاتِ آتشؔ طبع اوّل میں شامل نہ کی گئی تھیں، چنانچہ آتشؔ کا منقولہ بالا مطلع ان کے کلیات کے دوسرے اڈیشن میں شامل اسی غیر متداول کلام میں دستیاب ہوتا ہے۔ "کلیاتِ آتشؔ" کی ۱۲۶۸ھ کے بعد کی اشاعتیں کلیات کے

پہلے ایڈیشن پر مبنی ہونے کے باعث آتش کے مذکورہ غیر متداول کلام سے محروم ملتی ہیں۔ (کلیاتِ آتش کی مختلف اشاعتوں کی کیفیت تحقیقی مطالعے" از عطا کاکوی، پٹنہ طبع ستمبر ۱۹۶۵ء ص ۱۴۳ تا ص ۱۵۴ کے مندرجات پر مبنی ہے)۔

مذکورۂ بالا روایت کے تحقیقی محاکمے میں اب آخری گوشہ یہ رہتا ہے کہ یہ تمام غزلیں جس طرحی مشاعرے کے لیے معرضِ وجود میں آئی تھیں اس کے بانی "سراج الدولہ" کون تھے؟ اس مشاعرے کے بانی بظاہر نواب سراج الدولہ علی محمد خاں بہادر سردار جنگ جنون تھے جو آتش کے صاحبِ دیوان شاگرد اور نواب روشن الدولہ کے داماد تھے۔ نواب روشن الدولہ بہ عہد نصیر الدین حیدر حکومتِ اودھ میں عہدۂ وزارت پر فائز رہ چکے تھے۔ نواب سراج الدولہ جنون کے حالات میری زیرِ طبع کتاب "منتخباتِ گلدستہ شعرائے لکھنؤ ۶۱-۱۸۶۰ء" میں موجود ہیں۔

حواشی

لہ کیف کے احوال اور ادبی آثار کے سلسلے میں جو مصادر میرے پیشِ نظر رہے ہیں ان کی فہرست یہ ہے :-

(۱) "آئینۂ ناظرین" : شیخ فضل احمد کیف لکھنوی۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ طبع ۱۲۹۲ھ (یہ دیوان مجھے اپنے کرم فرما جناب ڈاکٹر نیر مسعود سے ملا جس کے لیے میں موصوف کا انتہائی ممنون و متشکر ہوں۔)

(۲) "ادبی مقالے" : کاظم علی خاں۔ نامی پریس لکھنؤ۔ طبع دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۱۹۲-۱۹۳

(۳) اربابِ سخن : حسرت موہانی۔ اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۲ء حصہ دوم ص ۲۱-۲۲

(۴) انتخابِ سخن (جلد ہفتم) : حسرت موہانی۔ اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۳ء ص ۱۹۱ تا ۱۹۸

(۵) اردوئے معلیٰ علی گڑھ (رسالہ) : مدیر حسرت موہانی۔ اپریل ۱۹۰۸ء ص ۱ تا ۱۰ (مقالہ حسرت موہانی)

(۶) افسانۂ لکھنؤ (مثنوی) : آغا حجو شرف لکھنوی (قلمی نسخہ مخزونہ کتب خانہ سبطین آباد ٹرسٹ مٹیا برج کلکتہ ص ۱۹۵ (مثنوی کا یہ اصل نسخہ شرف کی مہر سے مزین ہے اور اس کی کتابت کی تکمیل ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ کو ہوئی تھی۔ یہ نسخہ شرف نے مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ کو پیش کیا تھا۔ نسخے پر واجد علی شاہ کے کتب خانے کی مہر بھی ثبت ہے، جو اب ورق پھٹ جانے کے باعث جزوی طور پر نظر آتی ہے — کاظم علی خاں)

(۷) آبِ بقا : مولفہ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی۔ مرتبہ مرزا جعفر علی نشتر۔ نامی پریس لکھنؤ۔ طبع ستمبر ۱۹۲۸ء ص ۱۴۳ نیز ص ۱۷۵

(۸) بزمِ سخن : سید علی خاں سلیم۔ مطبع مفید عام آگرہ طبع ۱۹۲۸ء ص ۱۰۰

(۹) خوش معرکۂ زیبا : مولفہ سعادت خاں ناصر۔ مرتبہ مشفق خواجہ مجلس ترقی ادب لاہور (جلد دوم) طبع مارچ ۱۹۷۲ء ص ۸۵-۸۴

(۱۰) خوش معرکۂ زیبا : مولفہ سعادت خاں ناصر۔ مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ طبع جولائی ۱۹۷۱ء ص ۴۴۹-۴۵۰

(۱۱) دبستانِ آتش : ڈاکٹر شاہ عبدالسلام۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، طبع دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۲۰۴ تا ص ۲۱۰

(۱۲) خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی (حیات اور شاعری) : ڈاکٹر شعیب راہی۔ آزاد پریس پٹنہ طبع جون ۱۹۸۲ء ص ۲۹

(۱۳) سخن شعرا : عبدالغفور نساخ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۷۴ء ص ۴۰۰ تا ص ۴۰۱

(۱۴) سراپا سخن : محسن علی محسن۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص ۱۲۸ نیز ص ۳۱۴

(۱۵) طبقات شعرائے ہند : کریم الدین۔ یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۳ء ص ۴۲۸

(۱۶) طورِ کلیم : سید نور الحسن خاں کلیم۔ مطبع مفید عام آگرہ۔ طبع ۱۲۹۸ھ ص ۸۶

(۱۷) غنچۂ آرزو : میر وزیر علی صبا لکھنوی۔ مطبع ثمر ہند لکھنؤ طبع ۱۸۷۷ء ص ۱۹۴-۱۹۳

(۱۸) انتخابِ صبا : مرتبہ کاظم علی خاں۔ یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۲ء

صہ ۹ نیز صہ ۹۳

(۱۹) شیعہ کالج میگزین لکھنؤ (صبا نمبر) : مرتبہ کاظم علی خاں ۸۲-۱۹۸۱ء صہ ۱۹ نیز صہ ۳۴

(۲۰) فکرِ بلیغ ، مولفہ شاد عظیم آبادی ۔ مرتبہ نقی احمد ارشاد ۔ نسیم بکڈپو لکھنؤ طبع اگست ۱۹۷۳ء صہ ۲۳۶ نیز صہ ۲۴۳ تا ۲۴۷

(۲۱) گلدستۂ شعرائے لکھنؤ : ۹۱ ۔ ۱۸۹۰ء کی فائل کے متعدد شمارے جن میں تلامذۂ کیفؔ کا حال و کلام ملتا ہے ۔

(۲۲) گلدستۂ یوسفی (حصۂ اوّل) : مرتبہ خواجہ محمد یوسف یوسفؔ ۔ نامی پریس لکھنؤ طبع دسمبر ۱۸۹۳ء (اس میں کیفؔ کی متعدد غزلیات شامل ہیں ۔ کاظم علی خاں)

(۲۳) گلستانِ سخن : مرزا قادر بخش صابرؔ ۔ یوپی اُردو اکاڈمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۲ء صہ ۳۰۶

(۲۴) مہذب اللغات (جلد دہم) : مہذبؔ لکھنوی صہ ۲۵۰ تا صہ ۲۵۱ (اس میں کیفؔ کے حالات حسرتؔ موہانی کے مقالے مشمولہ اُردوئے معلّٰی علی گڑھ اپریل ۱۹۰۸ء (صہ ۱ تا ۱۰) سے بے حوالہ اخذ کیے گئے ہیں اور کیفؔ کی تاریخ وفات ۴ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ لکھی گئی ہے جو درست نہیں ہے ۔ کیفؔ کی تاریخِ وفات دراصل ۱۴ ربیع الآخر ۱۲۹۲ھ ہے جیسا کہ ہمارے زیرِ نظر مقالے سے واضح ہو جائے گا)

(۲۵) نظمِ ارجمند : شیخ امیر اللہ تسلیمؔ لکھنوی ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۷۲ء صہ ۳۶۵ (برائے قطعۂ تاریخ از کیفؔ لکھنوی)

۷ھ آئینۂ ناظرین : صہ ۲۲۱ (بہ حوالہ دبستانِ آتشؔ ۔ آئینۂ ناظرین کا جو نسخہ ہمارے پیشِ نظر ہے اس میں متعلقہ صفحہ غائب ہے) ۔

۳ھ سراپا سخن صہ ۳

۴ھ ادبی مقالے صہ ۱۴۳

۵ھ انتخابِ صباؔ صہ ۳

۶ھ دیکھیے : (۱) رسالۂ اُردوئے معلّٰی علی گڑھ مرتبہ حسرتؔ موہانی ۔ ماہ اکتوبر ۱۹۰۹ء صہ ۳ (۲) اربابِ سخن حصہ اوّل صہ ۶ نیز حصہ دوم صہ ۲۱ (مؤلفہ حسرتؔ موہانی)

۷ھ رسالہ اردوئے معلّٰی علی گڑھ اپریل ۱۹۰۸ء صہ ۱ (حاشیہ ۱)

۸ھ ایضاً

۹ھ کیفؔ کے شاگرد سید ہدایت اللہ خاں ہُدا لکھنوی انشارؔ کے خلف البطن بھائی مسیح اللہ خاں بہادر کے پوتے اور سید حبیب اللہ کے فرزند تھے ۔ ہُدا نے ۸۷ برس کی عمر میں ۲۰ شعبان ۱۳۲۹ھ کو وفات پائی تھی ۔ ہُدا کیفؔ کے صاحبِ دیوان شاگرد تھے ۔ دیوانِ ہُدا چھپ چکا ہے (بہ حوالہ :

(۱) رسالہ معاصر پٹنہ (حصۂ دوم) صہ ۳۳ تا صہ ۳۶ (مقالۂ قاضی عبدالودود)

(۲) انشاء اللہ خاں انشاؔ : عابد پشاوری ۔ یوپی اُردو اکاڈمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۵ء صہ ۲۶۹ نیز صہ ۲۸۶ (۳) انشاء اللہ خاں ۔ عہد اور فن ، از اسلم پرویز ۔ مکتبہ شاہراہ دہلی ۔ طبع جولائی ۱۹۶۱ء صہ ۸۶ (۴) دیوانِ ہُدا مطبع نظامی لکھنؤ طبع ۱۳۰۴ھ صہ ۲۳۸

۱۰ھ بہ حوالہ سخن شعراء صہ ۵۰۵

۱۱ھ نظمِ ارجمند صہ ۳۶۸

۱۲ھ انتخابِ کلامِ مصحفیؔ : مرتبہ سید سلیمان حسین لکھنؤ طبع ۱۹۸۲ء صہ ۱۳

۱۳ھ کلیاتِ آتشؔ (دیوانِ اوّل) مطبع منشی نول کشور کانپور طبع اپریل ۱۸۸۶ء صہ ۲۰ تا ۲۱

۱۴ھ آتشؔ کے اشعار کلیاتِ آتشؔ صہ ۴۸ تا صہ ۴۹ ، صہ ۱۱۲ تا صہ ۱۱۳ ، صہ ۱۲۲ نیز صہ ۲۲۵ تا صہ ۲۲۶ سے منقول ہیں ۔

۱۵ھ اشعارِ کیفؔ کے لیے دیکھیے آئینۂ ناظرین صہ ۲۲ تا صہ ۲۳ ، صہ ۴۲ صہ ۱۱۵ تا صہ ۱۱۶ نیز صہ ۱۲۹ تا صہ ۱۳۰ ۔

۱۶ھ کیفؔ و صباؔ کی ہم زمین غزلوں کی تعداد ۳۵ ہے اور ان کے نمبر درج ذیل ہیں :۔

کیفؔ (۱) ر ۳۶ (۲) ر ۲۷ (۳) ر ۱۶ (۴) ر ۱۲ (۵) ر ۱۱۳ (۶) ر ۲۹ (۷) ر ۵۷ (۸) ر ۹۱ (۹) ر ۶۶ (۱۰) ر ۴۷ (۱۱) ر ۵۳ (۱۲) ر ۴۲ (۱۳) ر ۸۱ (۱۴) ر ۸۲ (۱۵) ر ۸۵ (۱۶) ر ۹۲ (۱۷) ر ۱۰۱ (۱۸) ر ۱۰۲ (۱۹) ر ۱۱۱ (۲۰) ر ۱۱۹ (۲۱) ر ۱۱۰ (۲۲) ر ۱۱۵ (۲۳) ر ۱۱۶ (۲۴) ر ۱۳۱ (۲۵) ر ۱۴۵ (۲۶) ر ۱۴۲ (۲۷) ر ۱۶۳ (۲۸) ر ۱۹۲ (۲۹) ر ۱۶۹ (۳۰) ر ۱۸۸ (۳۱) ر ۱۸۶ (۳۲) ر ۱۸۵ (۳۳) ر ۱۶۲ (۳۴) ر ۱۶۷ (۳۵) ر ۱۹۰

صباؔ : (۱) ر ۱ (۲) ر ۲ (۳) ر ۳ (۴) ر ۵ (۵) ر ۱۰ [illegible]

(۹) ر ۹۵ (۱۰) ر ۴۳ (۱۱) ر ۴۲ (۱۲) ر ۴۴ (۱۳) ر ۴۹ [illegible]

(۱۷) ص۹۶ (۱۸) ص۹۸ (۱۹) ص۱۱۴ (۲۰) ص۱۱۶ (۲۱) ص۱۲۱ (۲۲) ص۱۲۵ (۲۳) ص۱۲۶
(۲۴) ص۱۳۵ (۲۵) ص۱۸۴ (۲۶) ص۱۸۷ (۲۷) ص۱۸۹ (۲۸) ص۱۹۱ (۲۹) ص۱۹۳
(۳۰) ص۱۹۴ (۳۱) ص۱۹۵ (۳۲) ص۱۹۸ (۳۳) ص۱۹۹ (۳۴) ص۲۲۰ (۳۵) ص۲۲۴
(آئینۂ ناظرین و غنچۂ آرزو میں یہ غزلیں مذکورہ نمبروں کے حوالے سے دیکھی جا سکتی ہیں۔)

۱۷ؔ "بایاں قدم لینا" محاورہ ہے۔ یہ ایسے محل پر بولا جاتا ہے جب کسی سے کوئی بڑا کام انجام پا جائے (دیکھیے مہذب اللغات جلد دوم ص۲۳۱)

۱۸ؔ بہ حوالہ "شاد کی کہانی شاد کی زبانی"، مرتبہ پروفیسر محمد مسلم۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، طبع ۱۹۶۱ء ص۱۲ نیز ص۲۷۵

۱۹ؔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی غالباً وہی شخص ہیں جنہوں نے دہلی میں غالب سے ملاقات کی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "نگار" رام پور مارچ ۱۹۶۳ء ص۱۴ (مقالہ اکبر علی خاں عرشی زادہ)

۲۰ؔ دیکھیے: (۱) آئینۂ ناظرین: کیف ص۱۲۸ (۲) ادبیات و شخصیات: مرزا جعفر حسین لکھنؤ طبع ۱۹۷۸ء ص۱۱۵ (۳) غنچۂ آرزو ص۱۰۴، (۴) گلزار خلیل: میر دوست علی خلیل مطبع نامی لکھنؤ طبع مارچ ۱۸۸۹ء ص۹۳ (۵) ریاض البحر: شیخ امداد علی بحر۔ مطبع مصطفائی طبع ۱۲۸۵ھ ص۱۳۷ (۶) دیوان رند، (دیوان دوم): رند لکھنوی۔ مطبع نول کشور کانپور طبع جولائی ۱۸۸۴ء ص۱۸۰ تا ص۱۸۲ ✽

قاضی عبدالغفار

صفحہ ۶ کا بقیہ

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سالانہ ڈنر میں قاضی صاحب نے جو نظم سنائی تھی اس کے دو شعر پیش خدمت ہیں ؎

اب کون علی گڑھ آتا ہے جو جاتا ہے وہ جاتا ہے
سب بھول گئے ہم یاد نہیں کب آتے تھے کب جاتے تھے

وہ دورِ بہاراں بیت گیا رودادِ جوانی ختم ہوئی
اگلوں کو زمانہ کیا دے گا اپنی تو کہانی ختم ہوئی

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ قاضی صاحب بہت سی چیزیں اپنے قلمی نام سے بھی شائع کراتے تھے۔ ان کا قلمی نام ق۔ ع۔ غ کے علاوہ "خاموش" بھی تھا۔ ان کی ایک نظم "نوائے خاموش" کے عنوان سے ۱۹۲۶ء کے "ادبستان" میں شائع ہوئی تھی جس پر مصنف کے نام کی جگہ "خاموش" شائع ہوا ہے۔ اسی طرح سے ان کی ایک نظم ۱۹۳۱ء کے "جامعہ" میں "ق۔ ع۔ غ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

قاضی صاحب زندگی کے آخری دور میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے معتمد کی حیثیت سے اردو کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے نائب امیر جامعہ کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو جس طرح سے بچایا تھا اسی طرح سے قاضی عبدالغفار نے انجمن کے معتمد کی حیثیت سے اردو تحریک کو جو قوت نمو عطا کی وہ اردو کی ایک ناقابل فراموش خدمت ہے۔

قاضی صاحب ایک منفرد ادیب تھے اور ایک بے مثل انسان۔ جہاں یہ دونوں باتیں اکٹھا ہو جاتی ہیں وہاں ادبی اور انسانی دونوں معیار بلند ہو جاتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ادیبوں میں شاید ہی کوئی ادیب ایسا ملے جس نے نوجوان لکھنے والوں اور ادبی تحریکوں کی ہمت افزائی کی ہو۔ ان کی دل سوزی اور بے پناہ محبت نے بہت سے نئے لکھنے والوں کو ادیب شاعر بنایا۔ ان کے ادبی کارناموں پر کئی لکھنے والوں کو نئے نئے راستے سجھائے۔ قاضی صاحب اس کارواں کے مسافروں میں سے تھے جس میں حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل تھے۔ وہ کارواں بکھر گیا اور اس کے اکا دکا مسافر اپنے عزم بلند اور مقصد عظیم کی راہ پر رواں دواں تھے۔ قاضی صاحب ان میں سے ایک تھے۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں ان کی موت اردو ادب کے ایک بلند پایہ اور حوصلہ مند قائد کی موت تھی۔ ان کو بچھڑے ہوئے تیس سال گزر چکے ہیں۔ لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ع

بجھ چکی شمع نور باقی ہے

دیاشنکر سکسینہ مجل موجی
[illegible]

حسن اور فنا

یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے!
یہ خوشبو یہ رنگ اور یہ دلفریبی!
عطا کی ہے قدرت نے وہ دیدہ زیبی
کہ ہر پنکھڑی دلکشی کی امیں ہے
یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے

یہ صبحِ بہاراں کا آغوشِ رنگیں
مناظر پہ احسان نگاہوں کی تسکیں
یہ محسوس ہوتا ہے جنت یہیں ہے
یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے

نسیمِ سحر گدگداتی ہے اس کو
صبا پاس آکر جگاتی ہے اس کو
یہ گلشن نگاہوں میں خلدِ بریں ہے
یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے

ہر اک پنکھڑی پر جھلکتی ہے شبنم
جدھر دیکھتا ہوں جھلکتی ہے شبنم
جو قطرہ ہے وہ موتیوں سے حسیں ہے
یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے

جوانی کا آتا ہے یوں ہی زمانہ
کبھی مسکرانا کبھی جھوم جانا
غرض جو ادا ہے بہار آفریں ہے
یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے

مجھے سب کے خالق سے یہ پوچھنا ہے
یہ کیوں دوسرا پھول مرجھا رہا ہے
جو برباد ہونے کے قابل نہیں ہے
یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے

تو خالق ہے سب کا مقدر جگا دے
ہر اک حسن، حسنِ دوامی بنا دے
گوارا یہ تنظیمِ گلشن نہیں ہے
یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے

غضب ہے کہ مٹ جائیں دلکش فضائیں
جو شاداب کلیاں ہوں وہ سوکھ جائیں
مرا دل بہت اس سے اندوہ گیں ہے
یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے

ندا آئی اے شاعرِ نیک طینت
نظامِ جہاں کی فنا سے ہے زینت
فنا ایک موجِ بہار آفریں ہے
مآل اس کا اس پھول سے بھی حسیں ہے

فنا سے حسیں ہے چمن زارِ عالم
یہ ہے عارضی حسن کا جزوِ اعظم
فنا ہی سے تنظیمِ دنیا حسیں ہے
صداقت میں اس قول کے شک نہیں ہے

میں دیوانۂ حسنِ فطرت ہوں پھر بھی
نہیں فلسفہ کوئی وجہِ تسلی
مگر بحرِ مصرع مرا دلنشیں ہے
یہ ہنستا ہوا پھول کتنا حسیں ہے

بسنت کمار بسنت

غزل

رہنا ہو جس سے دور دور اسکے قریب جائے کیوں
عشق ہے آگ ہی تو پھر آگ کے پاس آئے کیوں

رہگذرِ حیات میں خار کوئی بچھائے کیوں
زیست کو گل کدہ بنائے، دشت اسے بنائے کیوں

میں تو بتا ہی دوں گا اشک آنکھ میں میری آئے کیوں
آپ مگر بتایئے ایسے میں مسکرائے کیوں

پاک ہوس سے دل ہو گر، عشق گناہ تو نہیں
بات کوئی بتائے کیوں، راز کوئی چھپائے کیوں

سن کے جسے ہو سب کو دکھ جو چبھے دل میں تیر سی
جان کے ایسی کوئی بات آدمی لب پہ لائے کیوں

لغزشِ پا پہ میری کیوں طنز ہے واعظو بتاؤ
زاہدِ پارسا کے پاؤں دیر میں ڈگمگائے کیوں

شکوہ کسی سے کچھ نہیں غم ہے تو بس یہی بسنت
میرے اور ان کے درمیاں اہلِ زمانہ آئے کیوں

ظہیر غازی پوری
بی، ایس، آر ٹی کارپوریشن
ہزاری باغ - (بہار)

خاموش — غازی پور کے مجاز

اس حقیقت کا اعتراف بہرحال ہر طبقہ کے قارئین کرینگے کہ خاموش غازی پوری عوامی شاعر تھے اور انھوں نے مشاعروں کی وساطت سے جو مقبولیت، شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کی وہ مثالی ہے۔ خاموش نے ملک بھر میں مشاعرے پڑھے اور سامعہ نواز ترنم اور نغمہ طراز غزلیات اور قطعات سے سامعین کا دل جیت لیا۔ وہ وہ جب شعر پڑھتے تھے تو ایک مسحور کن کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور پھولوں کی نرم چوٹ سے پتھر کے پگھلنے کا احساس جاگ اٹھتا تھا۔ کہیں "آنسو کا قطرہ" "چاند پہ شبنم" کی اچھوتی تصویر بن کر ابھرتا تھا تو کہیں "جنونِ شوق" زنجیر کی جھنکار کی صورت اختیار کر کے دلوں کو بے اختیار کر دیتا تھا۔ میرے خیال میں یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ خاموش کی شاعری ایسی ہی شاعری ہے جو سنتے ہی دل تک اتر جاتی ہے اور ذہن پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ کارلائل نے شاعری کو "موسیقانہ تخیل" اور ایڈگر ایلن پو نے شاعری کو "حسن کی مترنم تخلیق" کا نام دیا ہے اور لیوتس جیسا ناقد بھی شاعری کو "جادو کی بیٹی" گردانتا ہے۔

جو لوگ شہر غازی پور سے تعلق خاطر رکھتے ہیں انھیں بخوبی علم ہے کہ خاموش واقعی غازی پور کے مجاز تھے۔ ہر کس و ناکس ان پر جان چھڑکتا تھا، وہ جس طرف جاتے ایک قافلہ ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان کے اشعار لوگ اپنی ذاتی بیاض میں نوٹ کر کے رکھتے تھے۔ جا بہ جا شالو کے طور پر پیش کرتے تھے اور آج بھی اہلِ ذوق حضرات کو ان کے سیکڑوں اشعار ازبر ہیں۔ بالکل مجاز ہی کی طرح اہلِ شہر نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سر آنکھوں پر جگہ دی اور قدر و منزلت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ یہ شرف بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ع

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

خاموش غازی پوری اسم بامسمیٰ تو خیر تھے ہی لیکن قدرت نے انھیں بڑا زرخیز ذہن عطا کیا تھا۔ یہ غالباً ۵۵-۱۹۵۴ء کی بات ہے جب میں غازی پور میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا تو انھوں نے اچانک ہائی اسکول کے امتحانات میں بیٹھنے کی خاطر پرائیویٹ امیدوار کے طور پر اجازت حاصل کر لی اور امتحانات میں شریک ہوئے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے کئی مضامین میں امتیازی نمبر حاصل کیے اور ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ کسی پرائیویٹ امیدوار کے لیے یہ کامیابی لائق تحسین ہی نہیں بلکہ حیرت انگیز اور قابلِ فخر بھی ہے۔ اس مثال سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ خاموش بلا کے ذہین تھے اور ان کا شعور بڑا پختہ کار تھا، اور غالباً یہی سبب تھا کہ دیارِ شعر میں قدم رکھتے ہی انھوں نے اپنے انفرادی لب و لہجہ سے عوام و خواص دونوں کو یکساں طور پر متاثر کیا چند ہی برسوں میں ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔

میں جانتا ہوں کہ ادب و شعر کا باشعور طبقہ اس بات کی وضاحت چاہے گا کہ جب خاموش اس درجہ ذہین اور طباع تھے، ان کے مشاہدات و تجربات میں گہرائی و گیرائی تھی تو انھوں نے محض "کثیر تعداد" کی فہم و بصیرت تک ہی اپنی شاعرانہ چابک دستی کو محدود کیوں رکھا۔ اس کا جواب صرف وہ لوگ دے سکتے ہیں جو خاموش سے بہت قریب

رہے ہیں

خاموش تاحیات ناساعد حالات سے نبرد آزما رہے۔ انتہائی ناسازگار ماحول میں زندگی کے شب و روز گزارنے پر مجبور ہوئے اور چاہتے ہوئے بھی ان شکنجوں کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے جن کے باعث ہمیشہ وہ پابستہ رہے۔ ممکن ہے بعض احباب کو ان کے دہلی جانے اور وہاں سے فوراً واپس آجانے کے واقعات کا علم ہو۔ یہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، میں نے محض اشارے کر دیئے ہیں یہ کام محققین کا ہے۔ اگر کسی میں توفیق ہوئی تو وہ سینکڑوں صفحات سیاہ کر لے گا۔ بقول اے.سی بریڈلے ـــــ

"شاعری اور زندگی کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے
اور اس تعلق کی طنابیں گویا زیر زمیں ہیں"

لہٰذا شاعری کو شاعر کے حالات کے تناظرات میں جانچنا اور پرکھنا چاہیئے۔

میرا یہ دعویٰ کہ خاموش بے حد ذہین تھے، ان کے لب و لہجہ میں تازگی تھی، ان کی فکر کے دریچہ پر عصری حسیت دستک دیتی تھی، ان کے اسلوب نے ارتقار کی بلند قامت دیوی کا لمس محسوس کیا تھا اور ان کا شعور، لاشعوری کیفیات کو بھی شعر کی خوش پیکری عطا کرنے کی صلاحیتیں رکھتا تھا، اس لیے غلط نہ ہو گا کہ ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں لفظوں کا فن کارانہ انتخاب، معنویت کی تہ داری و ساطت اور تشبیہ و استعارہ کا خوبصورت امتزاج موجود ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کر رہا ہوں ؎

ہر لمحۂ نشاط کی قیمت کہاں رہے
ہر لمحۂ نشاط اگر جاوداں رہے

سوال یہ نہیں تاریک ہے فضا اب تک
سوال یہ ہے کہ تاریک یہ فضا کیوں ہے

ہائے کیا اندھیر ہے دُنیائے دار و گیر میں
جس کا سورج ہے اسی کو روشنی ملتی نہیں

رات تاریک اگر ہے تو خطا رات کی ہے
کیا ستم ہے کہ چراغوں کو سزا دی جائے

غالب کی اک غزل کی طرح ہے یہ زندگی
ایسی غزل جو سب کو سُنائی نہ جا سکے

خاموش کی شاعری میں عام طور پر محسوس کی جانے والی تمام واردات قلبی کی بازگشت موجود ہے۔ حسن و عشق کی طلسمی فضا، ہجر و فراق کے کرب انگیز لمحوں کی خوں آشامی، ذات و کائنات کی ابہامی کیفیات، سیاسی بحران کی اندوہناکی، تہذیبی و معاشرتی قدروں کی زبوں حالی اور عہد رواں کے ٹوٹتے بکھرتے انسانی رشتوں کی اذیت ناکی، ایسے موضوعات ہیں جو ان کے قلم کی زد میں بار بار آتے ہیں۔ ان کی شاعری ایسی متوالی خوشبو کے مصداق ہے جو ہر دہلیز سے گزرتی ہے اور ہر ذکی الحس کو قلندرانہ مستی عطا کرتی ہے۔ ایسی شاعری کو بجا طور پر کلاسیکی ادبی اقدار کا ایسا آبشار کہہ سکتے ہیں جو نشیب و فراز کی پروا کیے بغیر ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ واضح رہے کہ ورڈزورتھ نے "شاعری کو شاعر کے چھلکتے ہوئے جذبات کے نام سے موسوم کیا ہے۔

خاموش نے عام بول چال کی صاف و سادہ زبان کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا، لہٰذا ان کے یہاں بے جا شکست و ریخت فنی انتشار، معنوی بُعد اور ناترسیلیت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے آئینۂ فکر میں ہر عکس صاف، شفاف اور بے خراش ہے اور یہی خاموش کی مخصوص شناخت ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں جو سادگی اور پُرکاری کے آئینہ دار ہیں ؎

آسماں سے میں کبھی گزرا تھا
چاند پر گردِ سفر باقی ہے

آئے گی دلہن بن کے نئی صبح بھی لیکن
پردے سے نکلنے میں ذرا دیر تو ہو گی

(باقی صـ۴۸ پر)

عارف جائسی

ڈاک خانہ و موضع قضیاشہ
ضلع رائے بریلی یو۔پی

غزل

یہ اضطراب ہے کیسا تجھے ہوا کیا ہے
اگر وہ پوچھ لے اے دل کہ مدّعا کیا ہے

ہر اک ستم ترے ہنس کھیل کر سہیں گے ہم
مگر بتا تو سہی ان کی انتہا کیا ہے

تمھاری چشمِ کرم ہی کا فیض ہے ورنہ
حیات و موت کے مابین فاصلہ کیا ہے

یہ عارفانہ تجاہل تو دیکھئے اُن کا
جو ہم کہیں گے تو جانیں گے مدعا کیا ہے

یہ دیکھ کر وہ مجھ سے خفا خفا سے ہیں
یہ سوچتا ہوں کہ میں نے انھیں کہا کیا ہے

اب اُس کی یاد بھی دل میں کبھی نہیں آتی
زمانہ اور ابھی ہم سے چاہتا کیا ہے

یہی تو اپنی متاعِ حیات ہے عارفؔ
سوائے زندہ دلی اور اب رہا کیا ہے

کشفی لکھنوی

غزل

ہم جو ہیں کشتۂ غم دیکھیے کیا کرتے ہیں
داستاں اپنی رقم دیکھیے کیا کرتے ہیں

تہ و بالا تو اکیلے بھی کیے ہیں عالم
چاہنے والے بہم دیکھیے کیا کرتے ہیں

جانتے وہ بھی ہیں دو لفظ عروج اور زوال
ان کے یہ جاہ و حشم دیکھیے کیا کرتے ہیں

وہ سزا دے نہ سکے ظلم کو مجبور تھے کچھ
بے گناہوں پہ کرم دیکھیے کیا کرتے ہیں

آپ تو کر نہ سکے کچھ بھی علاجِ غمِ دل
چھوڑیے دیکھئے ہم دیکھیے کیا کرتے ہیں

اب رُکیں گے نہ کبھی کشفیؔ خود سر کے قدم
عشق کی راہ کے خم دیکھیے کیا کرتے ہیں

نشتر واجدی

غزل

یوں گھر کے رہ گیا ہوں سوالوں کے درمیاں
جیسے کوئی غریب مشالوں کے درمیاں

تاریکیوں کا آج بھی شب خوں ہے کل بھی تھا
کیسے کہیں کہ اب ہیں اُجالوں کے درمیاں

اے پختگیٔ عشق ترا کیا خیال ہے
کیا حشر ہوگا خام خیالوں کے درمیاں

مفہوم اب خلوص و وفا کے بدل گئے
جا تو رہے ہو، چاہنے والوں کے درمیاں

منزل ہے دور کوئی شریکِ سفر نہیں
ذوقِ طلب ہے پاؤں کے چھالوں کے درمیاں

حالات کے حصار میں نشترؔ ہے آج کل!
نغمے سمٹ کے رہ گئے نالوں کے درمیاں

افسانہ

شکیل صمدانی
۸۔۸۔ سی۔ آر۔ ایم ہال
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

"رشتے لمحوں کے"

"میں زہر کھالوں گی۔"

"تم میرے تن کا، میری رُوح کا، میری زندگی کا ایک حصّہ بن چکے ہو۔"

"تم میری قسمت بن چکے ہو شکیل!—— تمہاری قسم میں زہر کھالوں گی۔"

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ وہ بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ سونے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئی تھیں۔ عقل کام نہیں کررہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اسے رعنا کا یہ جملہ بار بار یاد آرہا تھا کہ:

"اگر تم نے مجھ سے شادی نہیں کی تو میں زہر کھالوں گی۔"

شادی اور زہر، یہ دونوں لفظ اس کے حواس پر چھائے جارہے تھے۔ بے چینی جب حد سے بڑھ گئی تو وہ بستر سے اٹھ کر بالکونی میں آگیا۔ موسم خوش گوار تھا۔ زمین پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آرہے تھے۔ فضا میں سرور تھا۔ شکیل کے دماغ کو کچھ سکون ملا تو پچھلے واقعات دھیرے دھیرے یاد آنے لگے۔

یہ کوئی آٹھ ماہ پہلے کی بات تھی۔ وہ باجی سے ملنے ان کے کالج گیا ہوا تھا۔ باجی باہر لان میں اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھیں، دیکھتے ہی باغ باغ ہوگئیں۔ شکیل بیٹھ کر چائے پی ہی رہا تھا کہ اتنے میں باجی کی ایک دوست ان سے ملنے آگئیں۔ باجی نے تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ محترمہ کا نام رعنا ہے۔ شکیل ایک خوش مزاج اور دل پھینک قسم کا نوجوان تھا، گو کہ یہ دونوں باتیں ایک دائرے تک محدود تھیں۔ وہ گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے پوچھ بیٹھا:

"بائی دی وے آپ کیا کرتی ہیں۔؟"

"آوارہ گردی۔!" جواب ملا۔

"وہ تو میں بھی کرتا ہوں۔" شکیل نے برجستہ جواب دیا۔

"چلیے ایک ساتھی تو ملا۔" اس نے کہا۔

"آپ نے مجھے اپنا ساتھی بنالیا۔" شکیل اپنی عادت پر اُتر آیا۔

"جی ہاں۔"

"اگر میں انکار کردوں تو۔؟" شکیل نے کہا۔

"آپ انکار کرہی نہیں سکتے۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

شکیل اور رعنا اپنی خوش مزاجی کا مظاہرہ کرہی رہے تھے کہ باجی اٹھیں اور کالج کے گیٹ پر رکشہ لینے چلی گئیں۔ رکشہ آگیا تو باجی نے آواز دی:

"ارے رعنا! تم کیا بک بک کررہی ہو۔ شکیل کی تو بکواس کی عادت ہے۔ ہم لوگ تو پریشان رہتے ہی ہیں تم کیوں اپنا دماغ کھپا رہی ہو۔"

یہ سنتے ہی رعنا باجی کے رکشہ کی طرف بڑھ گئی اور ان کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

رعنا کا طرزِ گفتگو مسحور کن تھا، گو کہ وہ خوبصورتی کے عام تصوّر

کے مطابق نگار آتشیں رُخ تو نہ تھی، لیکن قبول صورت ضرور تھی اور جاذب نظر بھی۔

باجی شکیل کی سگی بہن نہ تھیں، منہ بولی بہن تھیں، لیکن ان کی باہمی محبت اور خلوص کو دیکھ کر حقیقی رشتہ کا گمان ہوتا تھا۔ شکیل کا ان کے یہاں آنا جانا اکثر لگا رہتا تھا۔

رعنا سے شکیل کی دوسری ملاقات شہر کے معظم جاہ مارکیٹ میں ہوئی تھی۔ وہ فلم دیکھنے جا رہا تھا، عجلت میں تھا کہ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ تبھی وہ ایک رکشہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ابھی وہ اگلا قدم بڑھانے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ایک نسوانی اور جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"دیکھ کر چلا کیجیے ورنہ ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔"

شکیل کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا باجی کی آواز کانوں میں آئی۔

"رعنا ٹھیک کہہ رہی ہے۔"

شکیل نے دیکھا کہ وہ لوگ کپڑے کی ایک دکان پر بیٹھی ہوئی کچھ خرید رہی ہیں، چونکہ اسے جلدی تھی اس لیے وہ معذرت کر کے چلا گیا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک وہ باجی کے یہاں نہیں پہنچ سکا موقع نکال کر ایک اتوار کو وہ باجی کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ رعنا صاحبہ بھی تشریف رکھتی ہیں۔ آج شکیل بہت خوش تھا لہٰذا رعنا کو لیکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا اور اپنی عادت کے مطابق رعنا کا انٹرویو لینے لگا۔ معلوم ہوا کہ وہ بی ایڈ کر رہی ہے اور ایک اسکول میں عارضی معلم بھی ہے۔ شکیل کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کے والد محترم اس دار فانی کو چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ چنانچہ اسے نوکری کرنی پڑ رہی ہے یہ سن کر اسے بہت افسوس ہوا، اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ رعنا کو بہت کم تنخواہ مل رہی ہے تو اس نے رعنا کا بایوڈاٹا (BAO DATA) طلب کیا، تاکہ وہ اس کی نوکری کے لیے کسی اچھی جگہ کوشش کر سکے۔

اس وقت شکیل خلاف فطرت سنجیدہ ہو گیا تھا کیونکہ رعنا کے والد کی موت کی خبر نے اسے افسردہ کر دیا تھا (اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہو جانے کا احساس کتنا اذیت ناک ہوتا ہے) آج اس کی آنکھوں سے رعنا کے لیے ہمدردی ٹپک رہی تھی۔ اس نے اسے پورا یقین دلایا کہ وہ اس کی پوری مدد کرےگا۔ دوسرے روز وہ خود اس کے اسکول گیا اور اس کا بایوڈاٹا لے آیا۔

ادھر رعنا جو کہ پہلی ہی ملاقات میں شکیل کو اپنا دل دے چکی تھی اس کی ہمدردی سے بھرپور باتوں کو کچھ اور ہی رنگ دیتی گئی اور اس کی چاہت میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ اس کے خوابوں کی دنیا شکیل سے آباد ہونے لگی۔ وہ عمر کی اس منزل میں تھی جب انسان کو ایک ساتھی کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ انسان زندگی کی حقیقتوں سے دور ایک خیالی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔ اسے شکیل کی ہر ایک ادا پسند تھی وہ اس کو بہت چاہتی تھی۔ اگر شکیل اس سے جان بھی مانگتا تو وہ شاید انکار نہ کرپاتی۔

شکیل ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی دھن میں گم تھا، اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ رعنا کو کہیں اچھی سی نوکری دلوا کر رہے گا۔ آخرکار اس کی کوششیں رنگ لائیں اور رعنا کو ایک اچھے سے اسکول میں ملازمت مل گئی۔

ایک شام رعنا کے بلانے پر شکیل کو اس کے گھر بھی جانا پڑا۔ ۷ بج رہے تھے، سورج غروب ہو چکا تھا اور ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا میں سرور کن خنکی تھی۔ دستک دینے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ کیونکہ رعنا دروازے پر اس کی منتظر تھی۔ گھر میں اندھیرا تھا۔ اس کے پوچھنے پر رعنا نے بتایا کہ آج گھر میں بجلی نہیں ہے اور گھر کے سبھی لوگ کسی شادی میں گئے ہیں۔ وہ پیٹ میں درد کا بہانہ کر کے رک گئی ہے۔

"میں دیکھتا ہوں کیا بات ہے"۔ شکیل نے کہا۔

"رہنے دیجیے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے"....

رعنا نے برجستہ لیکن دھیمی آواز میں کہا۔

"کیوں بھئی مجھے اندھیرا اچھا نہیں لگتا۔"

"اندھیرا تو مجھے بھی اچھا نہیں لگتا، مگر آج ....."

یہ کہتے ہوئے وہ اس کے اتنے قریب آ گئی کہ شکیل اس کے

دل کی دھڑکن سُن سکتا تھا۔ اچانک زوروں سے بجلی کڑکی اور رعنا شاید سہم کر شکیل کی باہوں میں سما جانے کی کوشش کرنے لگی۔ شکیل اپنے آپ کو اس سے الگ کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس نے رعنا کو بُری طرح اپنی باہوں میں جکڑ لیا اور اس کے لبوں پر اپنے لب ثبت کر دیے۔

دو جوان جسم، تنہا کمرہ، اندھیری رات اور تنہائی۔ یہ ساری چیزیں ان کے ہوش و حواس چھین لینے کے لیے کافی تھیں۔ اخلاقی، سماجی، قانونی اور مذہبی قدریں ٹوٹنے لگیں۔ ہوش پر جوش غالب آنے لگا، اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

دونوں کو جب ہوش آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ باہر بارش تھم چکی تھی۔ بادل جو کر آپس میں ٹکرا رہے تھے اب خاموش تھے۔ شاید ٹکرانے کی سکت نہیں رہ گئی تھی، گھٹا جو کر برسنے کے لیے بے قرار تھی، برس چکی تھی۔ شکیل دھیرے سے اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے باہر نکلنے لگا، تبھی اسے رعنا کی آواز سنائی دی۔

"شکیل .... تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے ...... اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو تمھاری قسم میں زہر کھا لوں گی۔"

شکیل نے مڑ کر دیکھا۔ رعنا دھیرے دھیرے اس کی طرف آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، لب تھرتھرا رہے تھے اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

شکیل کے ہونٹ مجبور اور کمزور آواز میں بڑبڑا رہے تھے۔

"رعنا میں کیا کروں .... میں اپنی اور تمھاری بھول کو آخر کیا نام دوں ...... شاید تم نہیں جانتیں کہ میری شادی بچپن ہی میں میری خالہ کی لڑکی سے طے ہو چکی ہے۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے ...... اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر میں اسے نہ اپنا سکا تو وہ خودکشی کر لے گی ....."

یہ کہتے ہوئے شکیل دروازے سے باہر نکل گیا اور رعنا اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

دیکھتی رہی۔!!

*

اشرف مالوی

ہم ایک ہیں!

ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلم ہیں نہ عیسائی ہیں
ہم نہ سکھ ہیں نہ ہیں بودھسٹ نہ ہم جینی ہیں
پارسی ہیں نہ یہودی ہیں نہ نصرانی ہیں
ابنِ آدم ہیں ہم آپس میں سبھی بھائی ہیں
قومی یک جہتی کی اس ملک میں پہچان ہیں ہم
جس پہ ہر دھرم کو ہے ناز وہ انسان ہیں ہم
کرشن کو امن و مساوات کا پیکر جانا
رام کو بھٹکی ہوئی قوم کا رہبر جانا
گورو نانک کو محبت کا سمندر جانا
ہم نے چشتی کو اخوت کا پیمبر جانا
ہم نے اس شخص کی باتوں سے محبت کی ہے
جس نے اللہ کے بندوں سے محبت کی ہے
کوئی خسرو کوئی رسکھان کوئی سنت کبیر
خان خاناں، کوئی سودا کوئی غالب کوئی میر
کوئی تلسی کوئی میرا کوئی جائس کا فقیر
کوئی ناسخ کوئی جرأت کوئی اقبال و نظیر
مادرِ ہند کی آنکھوں کے ستارے سب ہیں
فخر سے آج بھی کہتے ہیں ہمارے سب ہیں
کوئی ٹیپو کوئی رضیہ کوئی سلطان ظفر
چندر شیکھر ہے اسی دیش کی گاتھا میں امر
لہری اشفاق و بھگت سنگھ نے پھانسی چڑھ کر
ہم کو ایثار و محبت کی دکھائی ہے ڈگر
گاندھی و نہرو کا پیغام سنانے کے لیے
ہم اٹھیں فرقہ پرستی کو مٹانے کے لیے

غزلیں

ڈاکٹر فوق کریمی

کریمی بلڈنگ

انوپ شہر روڈ ۔ علی گڑھ

[میر تقی میر کی رُوح سے معذرت کے ساتھ]

سب کی نگاہیں پہچانے ہے سب کا اشارا جانے ہے
کون ہے اپنا کون پرایا وقت کا مارا جانے ہے

اپنی محبت راز تھی لیکن خوشبو بن کر پھیل گئی
ہم نے کسو سے بات نہ کی پر عالم سارا جانے ہے

کروٹ کروٹ انگارے تھے بستر پر اے شعلہ رو
رات بسر کی ہم نے کیسے صبح کا تارا جانے ہے

کون ہے قاتل کون ہے ظالم کون ہوا مقتول یہاں
لوگ حقیقت لاکھ چھپائیں عالم سارا جانے ہے

کتنے ہمارے نام کے سورج تیرے اُفق پر نکلے ہیں
پیرِ فلک دُنیا کو بتا تو حال ہمارا جانے ہے

ناز و ادا سے اپنی وہ لوٹے ہے دل رہ گیروں کا
نایاب اور انمول ہے کیا شے خوب دل آرا جانے ہے

چاہ میں تیری فوق کا تیرے تو نے سُنا کیا حال ہوا
کوئی غریبِ شہر کہے ہے کوئی بچارا جانے ہے

رئیس نعمانی

تجارہ ہاؤس، دودھ پور علی گڑھ

لبوں کے حرف بک گئے، قلم بدل دیے گئے
نہ جانے کیسے کیسے محترم بدل دیے گئے

دلوں پہ مہریں لگ گئیں، خیال مسخ ہو گئے
نظر کی روشنی بجھی، قدم بدل دیے گئے

وہ زندگی کے راستے تھیں جن میں کچھ صداقتیں
وہ کھا کے انقلاب کی قسم بدل دیے گئے

نہیں جہاں میں اب کوئی حساب مرگ و زیست کا
نقوشِ راہِ ہستی و عدم بدل دیے گئے

تمہارے عہد میں کسی پہ ظلم کب ہوا کہیں
یہ اور بات، معنیِ کرم بدل دیے گئے

ہمیں تو ایسی زندگی سے موت ہے عزیز تر
جب اہلِ ہوش یہ کہیں کہ ہم بدل دیے گئے

ہمیں زیاں پسند تھے، ہٹے نہ اپنی راہ سے
سبھی یہاں تو ورنہ بیش و کم بدل دیے گئے

سلجھ سکی نہ آج تک رئیس زلفِ زندگی
بس اس قدر ہوا کہ پیچ و خم بدل دیے گئے

ڈاکٹر حبیب احمد حامی

فتح گڑھ ۔ فرخ آباد

سعی و عمل بجا سہی، پھر بھی ہیں یہ مقدرات
حُسن کے واسطے ہے جیت عشق کے واسطے ہے مات

جیسے وہ زُلفِ خم بہ خم کوئی پیام دے گئی
محوِ شعورِ ذات ہے آج بھی کاوشِ نجات

مہر و وفا کی داستاں، پوری بھی ہو تو کس طرح
حُسن کو بدگمانیاں، عشق کو ہیں توہمات

دل کی فسُردگی سے ہے سارا جہاں اُداس اُداس
دل کی شگفتگی سے ہے رونقِ بزمِ کائنات

نکہتِ زُلف مل گئی، دل کی کلی بھی کھِل گئی
تیرے قریب تر ہوں میں وصل کی آ گئی ہے رات

حامی نصیب دیکھیے اپنے بھی غیر ہو گئے
دَورِ فلک نے کر دیئے کتنے بڑے تغیّرات

عفت بانو عباسی زیبا کاکوروی

احساسِ محرومی!

آج آیا ہے مجھے اپنی تباہی کا خیال
کوئی آہٹ کوئی آواز مرے پاس نہیں
کوئی افسانہ کوئی راز مرے پاس نہیں
کاہشِ غم کا کوئی ساز مرے پاس نہیں
زیست کا اب کوئی انداز مرے پاس نہیں
آج آیا ہے مجھے اپنی تباہی کا خیال

نہ طلب ہے نہ تڑپ ہے نہ تمنا نہ ہراس
نہ جنوں ہے نہ سکوں ہے نہ کوئی آس نہ پاس
نہ ملاطم سے گریزاں، نہ تبسم کے حواس
دل نے شرما کے کہا اب نہیں کچھ بھی مرے پاس
آج آیا ہے مجھے اپنی تباہی کا خیال!

بھیگی بھیگی شبِ مہتاب کو ڈھونڈھا میں نے
اپنے کھوئے ہوئے ہر خواب کو ڈھونڈھا میں نے
اپنے پہلو کی تب و تاب کو ڈھونڈھا میں نے
آج پھر دلِ بیتاب کو ڈھونڈھا میں نے
آج آیا ہے مجھے اپنی تباہی کا خیال!

کوئی آنسو بھی نہیں حاصلِ غم جس کو کہوں
کوئی شکوہ بھی نہیں رنج والم جس کو کہوں
کوئی وعدہ بھی نہیں جانِ ستم جس کو کہوں
آہِ سوزاں بھی نہیں تیرا کرم جس کو کہوں
آج آیا ہے مجھے اپنی تباہی کا خیال!

ہر طرف کیسی خموشی ہے ہر اک شے پہ جمود
اپنے دامن سے الجھتا ہے خود اپنا ہی وجود
کیسا عالم ہے یہاں؛ فکرِ رسا تک محدود
سایہ افگن بھی نہیں وعدۂ فردا کی نمود
آج آیا ہے مجھے اپنی تباہی کا خیال!

غمِ دوراں مرے لمحات کو واپس کر دے
ان تڑپتے ہوئے دن رات کو واپس کر دے
درد اور درد کے جذبات کو واپس کر دے
روشنی چھین لے ظلمات کو واپس کر دے
آج آیا ہے مجھے اپنی تباہی کا خیال!

دل کے زخموں نے بہت ہنس کے سنوارا مجھ کو
تپشِ غم نے دیا بڑھ کے سہارا مجھ کو
غمِ ہستی نے کیا کوئی اشارا مجھ کو
میرے ہر عزم و ارادہ نے پکارا مجھ کو
آج آیا ہے مجھے اپنی تباہی کا خیال!

عشق کو آہِ شرربار بدلنا ہوگا
حسن کو چشمِ طرحدار بدلنا ہوگا
نگہِ پرسشِ غم خوار بدلنا ہوگا
گردشِ وقت کو رفتار بدلنا ہوگا
آج آیا ہے مجھے اپنی تباہی کا خیال!

○○

ملیالم کہانی

تحریر: ایس کے پوٹیکاٹ
ترجمہ: م. ق. خان
حکیم عنایت کالونی۔ گیا (بہار)

پاگل کتا

ایس. کے. پوٹیکاٹ ملیالم زبان کا ایک مایہ ناز ادیب و شاعر تھا، ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ۱۹۸۰ء میں گیان پیٹھ کا انعام ملا تھا۔ ۶ر اگست ۱۹۸۲ء کو موت نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ انھوں نے سات ناول، شاعری کے دو مجموعے، کہانیوں کے تین مجموعے، ایک سفرنامہ تین جلدوں میں، دو مضامین کے مجموعے اور ایک ڈرامہ لکھے یہ کہانی انھوں نے بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں لکھی تھی۔ اس کہانی کو پڑھ کر اُردو کے شہرۂ آفاق ادیب منشی پریم چند کی کہانی "کفن" کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ (م. ق. خ)

سورج کافی چڑھ چکا تھا، لیکن کرن ابھی تک اپنی بوسیدہ چٹائی پر لیٹا ہوا تھا، وہ ایک گندی، میل سے کالی چادر اوڑھے کسی مینڈھک کی طرح پڑا تھا گو اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں آدھے گھنٹے تک اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد وہ دھیرے دھیرے اُٹھا، اپنی چادر جھاڑی اور کھانستے ہوئے آنگن میں نکل آیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔

کرن کی ماں تقریباً نوّے برس کی ضعیفہ تھی۔ جھونپڑی نما مکان کے باہر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی حالت کسی ایسے اُلّو کی تھی جسے تیز روشنی میں ڈال دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے میں سمٹی ہوئی تھی۔

کرن نے اپنے مکان کے سامنے دُور دُور تک پھیلے خالی کھیتوں کی طرف دیکھا۔ دھان کی فصل کٹ چکی تھی اور سارا اناج وہ کھا چکے تھے۔ گھر میں تین دنوں سے کچھ نہیں پکا تھا۔ اس کی بیوی دروازہ سے کراہ رہی تھی۔ کرن کے پاس ایک کھوٹی چوّنی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

کرن نے پھر ایک بار خالی کھیتوں کی جانب نگاہ ڈالی، ان کھیتوں کی ویرانی خود اس کے خیالوں میں سما گئی۔ اسے نہ تو کوئی کام تھا نہ کہیں جانا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھیتوں کی جانب جا نکلا، پانی کے ایک نالے پر جھکا اور اس نے چلو میں تھوڑا پانی لیا، اپنے چہرے کو نم کیا اور منھ میں پانی لے کر اس نے دو تین بار کلّی کی، دانت صاف کیے اور دھوتی کے کونے سے چہرہ خشک کیا۔ پھر ایک منڈیر سے گزرتا ہوا سڑک پر چلا آیا۔

سڑک کے کنارے ایک دکان پر غیر معمولی بھیڑ دیکھ کر وہ اس کی جانب چلا گیا۔ وہ بھیڑ سے الگ کھڑا علی اور رمن نائر کی گفتگو سننے لگا۔

"وہ لال رنگ کا کتا جو چیتن نائر کا کتا ہے، اچانک پاگل ہوگیا ہے، اس نے پانچ چھ آدمیوں اور ایک گائے کو کاٹ لیا ہے۔ آج صبح اسی کُتّے نے کیلو دھوبی کے بیٹے کو بھی کاٹ لیا۔ کیلو ادھیکاری بابو سے سرٹیفکیٹ لینے جا رہا ہے تاکہ بیٹے کو

اسپتال لے جا سکے۔"

"کس بات کا سرٹیفکیٹ۔؟"

"اگر کسی کو پاگل کتا کاٹ لے تو روزانہ اخراجات کے لیے پانچ یا چھ آنے ملتے ہیں اور اسپتال میں مفت علاج بھی ہوتا ہے۔"

کرن بھی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ چندن سبزی فروش کیلو کو مشورہ دے رہا تھا: "اس بچے کے ساتھ ادھیکاری بابو کے پاس چلے جاؤ۔ ابھی ان سے گھر ہی پر ملاقات ہو جائے گی۔"

کیلو نے اپنے بچے کو کندھے پر اٹھایا اور ادھیکاری کے مکان کی جانب چل پڑا۔ بھیڑ منتشر ہوگئی۔ کرن بھی وہاں سے چل دیا۔ وہ ایک چائے کی دکان پر پہونچا، فرش پر بیٹھ کر اس نے آواز دی،

"آدھا گلاس چائے۔"

دس منٹ کے بعد چائے کی دوکان کا مالک گلاس میں چائے لے کر آیا اور اس نے گلاس کرن کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "میں نے پہلے ہی اس میں کافی چائے اور چینی ڈال دی ہے اب اور نہیں مانگنا۔"

کرن کا یہ معمول تھا کہ وہ آدھا گلاس چائے مانگتا اور چائے ملنے کے بعد وہ کہتا:

"یہ بہت میٹھی ہے اس میں اور چائے کا پانی دو۔"

جب چائے کا پانی ڈال دیا جاتا تو وہ کہتا، "یہ تو بالکل میٹھی نہیں، اس میں تھوڑی سی چینی اور ڈال دو۔"

اس طرح وہ آدھے گلاس کو پورے گلاس میں بدلنے کا فن جانتا تھا۔ چائے والا کرن کی عیاری سمجھتا تھا۔ کرن مایوس ہوکر دھیرے دھیرے چائے پینے لگا۔ وہ ایک ایک قطرہ چائے کا مزہ لے رہا تھا اور ہر گھونٹ کے بعد وہ سر ہلاتا۔ چائے پینے کے بعد اس نے گلاس فرش پر رکھ دیا۔ اس کی نگاہیں پتھیری (ایک قسم کی نان جو چاول سے بنتی ہے اور کیرل کے مسلمانوں میں کافی مقبول ہے) کے ڈھیر پر پڑیں، جو ایک میز پر کیلے کے پتوں پر رکھی تھیں، وہ ایک آدھ پتھیری کھانا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ پھر بھی اس نے قسمت آزمانا چاہا۔ کرن نے نہایت نرمی سے کہا: "مجھے ایک چھوٹی سی پتھیری دے دو اس کی قیمت میں کل دے دوں گا۔"

"اگر تمہارے پاس قیمت چکانے کے لیے پیسے نہیں ہیں تو مت کھاؤ۔ چائے پیو اور گلاس جلدی خالی کرو۔"

کرن مسکراتا ہوا اٹھا۔ میز پر گلاس رکھتے ہوئے اس کے قریب چونی بھی رکھ دی۔

کچھ دیر تک وہ یونہی بلا مقصد سڑکوں پر آوارہ گھومتا رہا اس نے دور سے کیلو دھوبی کو واپس آتے دیکھا۔ اسے تجسس ہوا کہ کیلو کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ کھیت کی منڈیر پر کھڑا ہوکر اس کا انتظار کرنے لگا۔

"کیا تمھیں ادھیکاری بابو کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔؟" کرن نے کیلو دھوبی سے دریافت کیا۔

"ہاں بھائی مجھے سرٹیفکیٹ مل گیا۔ اب میں سیدھے اسپتال جا رہا ہوں۔"

"تمھیں کتنے پیسے ملیں گے۔؟"

"روزانہ چھ آنے۔ شاید ایکس انجکشن کی ضرورت ہو۔"

کیلو یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کرن کھیتوں کی جانب لوٹ گیا۔ لیکن اس کے ذہن میں ایک پاگل کتا اور ایک ایک آنے کے چھ سکے گھومتے رہے۔ اس دن وہ بہت رات گئے گھر لوٹا۔ آج بھی کسی کو کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ پانی بھات بھی نہیں۔

پَو پھوٹنے کے کچھ ہی پہلے اپنے بچے کے رونے کی آواز اور کرن کے شور سے اس کی بیوی کی نیند ٹوٹی ــــ کرن چلا رہا تھا ــــ پاگل کتا، پاگل کتا۔!"

ایک لمبی چھڑی ہاتھ میں لے کر کرن جھونپڑی کے چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ بیوی کو دیکھ کر وہ اس کے قریب آیا۔ اس کے دانتوں میں خون لگا ہوا تھا۔

بیوی نے تعجب سے دریافت کیا: "تمھارے دانتوں میں

یہ خون کیسا ہے ۔ ؟"

کرن نے کپڑے سے دانت صاف کیئے اور بیوی کو تنبیہہ کی ۔ "خبردار ! کسی سے کچھ کہنا نہیں ۔ !"

اس کی بیوی نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا تو اس کی ٹانگ کے اوپری حصے سے خون نکل رہا تھا ۔ وہ رو رہا تھا ۔ کرن کے شور سے پڑوسی بھی دوڑ پڑے ۔ کرن نے لوگوں کو بتایا کہ ایک پاگل کتّے نے اس کے بچے کو کاٹ لیا اور دکھن جانب کی جھاڑیوں میں چھپ گیا ہے ۔

اس نے روتے ہوئے کہا ۔" وہ ایک لال رنگ کا کتّا تھا اس کی دم اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان چپکی تھی ، اس کی زبان منھ سے باہر لٹک رہی تھی اور زبان سے جھاگ نکل رہا تھا ، وہ ضرور چیتن نائر کا پاگل کتا ہوگا ۔ مجھ سے کسی نے کہا تھا کہ اسی کتّے نے کپلو دھوبی کے بیٹے کو بھی کاٹ لیا تھا ۔"

"اس پاگل کتّے کو جان سے مار دینا چاہیئے ۔ یہ خطرناک ہوگیا ہے ۔" لوگوں نے رائے دی اور دریافت کیا "کس راستے سے وہ گیا ، کرن ؟ "

"میں نے تو صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی ۔ پلک جھپکتے وہ غائب ہوگیا ۔"

اس دن ادھیکاری اندر سے اٹھ کر جب باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ کرن اپنے بیٹے کو ہاتھوں پر لیے صحن میں ایک جانب کھڑا ہے ۔ کرن نے ادھیکاری کو دیکھ کر بچے کو چٹکی کاٹی ۔ بچّہ رونے لگا ۔ ادھیکاری نے دریافت کیا :

" بھائی کس لیے آئے ہو ۔ ؟ "

" سرکار ! بچے کو کتے نے کاٹ لیا ہے ۔" ! اور کرن زارو قطار رونے لگا ۔

" کیا تم نے کتّے کو مار ڈالا ہے ؟ کون کتّا تھا وہ ؟ "

" کتّا تو بھاگ گیا حضور ، وہی چیتن نائر کا لال کتّا ، جس نے کپلو دھوبی کے بیٹے کو بھی کاٹا تھا ۔"

" کیسے ناکارہ لوگ ہیں ، ایک کتّے کو بھی نہیں مار سکتے ؟ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں " ؟ ! ادھیکاری نے رکھائی سے پوچھا ۔

" سرٹیفکیٹ ۔" کرن نے جواب دیا ، اور سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد کرن سیدھے شہر کے اسپتال چلا گیا ۔ اسپتال میں کمپاؤنڈر نے ایک کُند سوئی بچّہ کی ناف کے نیچے پیٹ میں پیوست کر دی ۔ بچّہ کراہ اٹھا ۔

اس دن شام کو کرن خوش خوش گھر لوٹا ۔ اس کے سر پر ایک سیر چاول کی پوٹلی اور اس کے اوپر ہرے کیلوں کا ایک گچھا تھا ۔ ایک ہاتھ میں رسی سے بندھی گوا ماٹھی مچھلی لٹک رہی تھی ۔ اس کا بیٹا اس کی گود میں سو گیا تھا ۔ اس نے چھ آنوں میں سے ایک آنہ تاڑی کی دکان پر بھی خرچ کیا ۔

چار ہی انجکشن کے بعد بچّے کا جسم پھولنے لگا ۔ وہ اب نہ تو کھڑا ہو سکتا تھا نہ چین سے لیٹ ہی سکتا تھا ۔ پھر بھی کرن اسے ہر دن اسپتال لے جاتا ۔ جب بھی کوئی راستے میں ملتا کرن نہایت فخر سے بیان کرتا کہ اس کے بیٹے کو پاگل کتّے نے کاٹ لیا تھا پھر اس نے ادھیکاری سے سرٹیفکیٹ لیا اور اسپتال میں انجکشن دلوا رہا ہے ۔

سات انجکشن کے بعد بچّہ بالکل کمزور ہوگیا ۔ آخر کار ایک دن اس کی بیوی نے اس سے کہا کہ اب اور انجکشن نہ دلواؤ ۔ لیکن کرن نے اس کی ایک نہیں سُنی ۔ وہ روز اپنے بیٹے کو گود میں اٹھائے ٹھیک وقت پر اسپتال پہنچ جاتا ۔

اس طرح گیارہ انجکشن پورے ہوگئے ۔ اب اس بچّے کا جسم اس قدر پھول گیا تھا کہ اس کی شناخت بھی مشکل تھی ، اس کا رنگ بھی کالا پڑ گیا تھا ۔ ڈاکٹر نے مزید انجکشن دلوانے کی اجازت نہیں دی ۔ کرن کا منہ لٹک گیا ، وہ اپنے بیٹے کو لیکر گھر لوٹ آیا ۔

دوسرے دن کرن نے اپنے بیٹے کو چٹائی پر بیہوش پڑا پایا ۔ اس کے منہ سے سسکنے کی نحیف آواز نکل رہی تھی ۔

" میرے بیٹے ۔ میرے پیارے بیٹے " : کرن اپنے بیٹے کو پکارنے لگا ۔ لیکن بچّہ بے حس و حرکت پڑا تھا ۔ کرن نے گھبرا کر اپنی بیوی کو آواز دی اور خود پاگل کتّے کی طرح گھر سے باہر بھاگ نکلا ۔ **

غزلیں

تحریر انجم
معرفت "اشتراک" ویکلی
قاضی پور خورد۔ گورکھ پور

نذرِ رسن و دار ہو گئے
ہم تو بھی باوقار ہو گئے

ہم خزاں کی دھوپ میں جلے
سایۂ بہار ہو گئے

یہ غلط ہے موت آ گئی
صرفِ انتظار ہو گئے

رُخ ہوا کا دیکھنے لگے
تم بھی دُنیا دار ہو گئے

خیریت بھی پوچھتے نہیں
آپ شہریار ہو گئے

ناخدا کو موج لے گئی
ہم ندی کے پار ہو گئے

وقت کے جو بادشاہ تھے
وقت کے شکار ہو گئے

سید عبد الستار زیدی
گورنمنٹ کالج گیان پور
وارانسی

اپنا کردار زمانے میں مثالی رکھنا
دل تمناؤں کا گھر ہے اسے خالی رکھنا

تم ہو خوشبو تو ہواؤں کی ضرورت ہے تمہیں
اپنے شاگردوں میں غالب ہو تو حالی رکھنا

ظلم کے آگے ہے توہین جھکانا سر کو
غم اٹھا لینا مگر روح بلالی رکھنا

موسمِ گل کہاں محتاج ہے نگرانی کا
جنگلوں کو کہاں راس آتا ہے مالی رکھنا

آگ میں سونا نکھرتا ہے غموں میں انساں
زیدی جی حوصلہ ہر حال میں عالی رکھنا

قائد حسین کوثر
۹۶/۳۹۲ ہمایوں باغ کانپور

کبھی ٹھہرنا ہوا میں، کبھی بکھر جانا
دھواں دھواں سا یہ پیکر لیے کدھر جانا

کبھی تو لاکھ صداؤں کو ان سُنی کرنا
کبھی کوئی نہ بُلائے مگر ٹھہر جانا

نہ جانے کتنے نگر بند آنکھ سے گزرے
شکن شکن سا یہ بستر بھی اک سفر جانا

کبھی تو گھر کو سمجھنا کہ ایک جنگل ہے
کبھی اُداس سے جنگل کو اپنا گھر جانا

وہ معرکہ بھی عجب تھا کہ ایک دن کوثر
نہ اس نے تیغ کو دیکھا نہ میں نے سر جانا

اُتّر پردیش اقلیتی مالیاتی وترقّیاتی کارپوریشن

اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک مُفید ادارہ

۱۰۔ اے ودھان سبھا مارگ لکھنؤ پر واقع یہ ادارہ ایک جامع اسکیم کے ساتھ سرگرم کار ہے۔ آج ہم اس کے چند پروگراموں کا ذکر کر رہے ہیں:

آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے اقلیتوں کی ترقی کے پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت ڈھائی سال پہلے حکومت یو۔پی نے اس کارپوریشن کی تشکیل اس مقصد سے کی کہ یہ ادارہ اقلیتوں کے افراد جن میں سکھ، عیسائی، بودھ، پارسی اور مسلمان شامل ہیں، دوسرے سرکاری ترقیاتی اداروں اور ایجنسیوں کے مابین بہتر رابطہ قائم کرائے اور اقتصادی و ترقیاتی پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ شمولیت کرائے۔ کارپوریشن خود بھی ایسی اسکیمیں چلائے جو اقلیتوں کی مالی حالت بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوں چنانچہ مندرجہ ذیل اسکیمیں اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے اس کارپوریشن نے چلائی ہیں۔

مارجن منی قرض اسکیم

بنکوں سے کسی صنعت، تجارت یا کوئی اور پیشہ کے لیے قرض حاصل کرنے میں قرض خواہ کو اپنے پاس سے بیس فیصد لگانا پڑتا ہے جو اقلیتی فرقہ اپنی غریبی کی وجہ سے نہیں لگا پاتا ہے۔ مارجن منی قرض اسکیم اسی کو دور کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس ادارہ سے بنک کے ذریعہ مانگی جانے والی رقم کا ۵، فیصد جو تیس ہزار سے زیادہ نہ ہو ضلع کی تشکیل شدہ کمیٹی کی سفارش پر متعلقہ بنک میں جمع کر دیا جاتا ہے اور صرف ساڑھے سات فی صدی سالانہ سُود لیا جاتا ہے۔ اقلیتی طبقے کے وہ لوگ جو چھوٹے چھوٹے پروجیکٹ کے لیے پانچ ہزار سے دس ہزار تک قرض لیتے ہیں ان کو مارجن منی قرض تیس فی صد تک دیا جا سکتا ہے۔

اس اسکیم کے تحت ۸۷-۱۹۸۶ء میں چار سو انتیس (۴۲۹) صنعت کاروں کو ۷۹ لاکھ روپیہ کا مارجن منی قرض منظور کیا گیا ہے۔

معلومات کی تشہیر

اقلیتوں کو سرکار کی جانب سے بنائی ہوئی غریبی دور کرنے کی اسکیمیں اچھی طرح معلوم نہیں ہیں، اس لیے کارپوریشن مختلف مقامات پر معلوماتی سیمنار منعقد کراتا ہے۔ ان میں اقلیتوں کے دانشوروں، وکلا، اساتذہ اور ڈاکٹروں کو جو سماجی بہبود کا کام کر رہے ہیں اور کمزور اور پچھڑے طبقے کے لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں ان کو مدعو کر کے ضلع حکام، بنکوں کے نمائندوں اور دیگر افسران سے ان کے ذریعہ چلائی جانے والی اسکیموں کی تفصیل فراہم کراتے ہیں، معلوماتی کتابچے تقسیم کیے جاتے ہیں۔

اس اسکیم کے تحت اب تک ۳۳ معلوماتی کیمپ قائم کئے جا چکے ہیں۔

ان اسکیموں کے ساتھ ساتھ کریڈٹ کیمپ، تعلیم بالغان، بغیر سود وظیفہ قرض اسکیم، پولیس و فوج میں بھرتی کیے جانے سے پیشتر تربیتی کیمپ لوگوں کو باہری ملکوں میں ملازمت کے لیے بھیجنا، رکشا اسکیم

اور عورتوں کو مفید روزگار کے لیے ٹریننگ کا انتظام کرنا بھی اس کارپوریشن کے منصوبے میں شامل ہے۔

اب یہاں چند مندرجہ ذیل ایسی اسکیموں کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے جو مختلف تنظیمیں شروع کر کے اقلیتی طبقے کے لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ یہ ادارہ ان تنظیموں کی ہر ممکن مدد کرے گا جو اسکیموں کے لیے ضروری قرار دی گئی ہے۔ تنظیموں کو فلاح و بہبود کی اسکیم چلانے سے پہلے رجسٹریشن کرانا پڑتا ہے، آڈٹ کرانا پڑتا ہے، اسکیم بنانا پڑتا ہے۔ فارم بھرنے میں بہت کمیاں رہ جاتی ہیں جس سے اعتراض کے ساتھ واپس آجاتے ہیں۔ ان سب باتوں میں آپ کی پوری پوری مدد یہ ادارہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔ تین اسکیمیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مرکزی وزارت سماجی بہبود کی اسکیم

عورتوں کا ٹریننگ سنٹر چلانے کے لیے:

اس کا مقصد عورتوں کی مالی مشکلات حل کرنے کے لیے ان کو ٹریننگ دینا ہے۔ عورتوں کی عمر ۱۸ سال سے ۵۰ سال تک ہو۔ ۲۰ سے ۳۰ عورتیں ٹریننگ حاصل کریں، ان کو ٹریننگ کے بعد روزگار فراہم کیا جائے یا ان کے ذریعہ بنا ہوا مال فروخت کرنے میں ان کی مدد کی جائے۔

ایک سنٹر چلانے پر سرکاری تخمینے کے حساب سے مشین، اوزار دفتر کا خرچ، فرنیچر، وظیفہ، عمارت کا کرایہ، انسٹرکٹر، کلرک اور کچے مال وغیرہ پر کل ۸،۶۰۰ روپیہ خرچ ہوتا ہے جس میں تنظیم کو ۵۰ فی صد مدد سرکار سے مل سکتی ہے۔ یہ مدد ڈیسک آفیسر ڈبلیو۔ اے جی۔ او، ویمن ویلفیئر اینڈ ڈیولپمنٹ ڈویژن، گورنمنٹ آف انڈیا شاستری بھون، دہلی سے مل سکتی ہے۔

(۲) عورتوں کے لیے تعلیم بالغان

وزارت سماجی بہبود کی یہ بھی اسکیم ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں کچھ پڑھ لکھ سکیں، اپنے بچوں کو صحت مند رکھنے کا ڈھنگ جان لیں، روزمرہ کی جانکاری حاصل کر سکیں، کچھ دستکاری وغیرہ سیکھ کر اپنی آمدنی بڑھا سکیں۔ اس کے لیے بھی عورتوں کی عمر ۱۵ سال سے ۴۵ سال کے درمیان ہونا چاہئے۔ کسی بھی تنظیم کو عورتوں کی تعلیم کے لیے کم سے کم پندرہ جگہوں پر ۱۵ تعلیمی مرکز کھولنا پڑتے ہیں۔

عورتوں کی تعلیم بالغان کے لیے پندرہ سنٹر چلانے پر گورنمنٹ بجٹ کے مطابق ماسٹر کی تنخواہ، کاپی، سلیٹ، کتابیں، مٹی کا تیل، متفرق خرچ بکس، لالٹین وغیرہ کے لیے کل چھتیس ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ اور اس میں بھی پچاس فیصد مدد شاستری بھون، نئی دہلی سے تنظیموں کو مل سکتی ہے۔

(۳) نوجوان لڑکوں کے لیے ٹرائی سم اسکیم

یہ اسکیم منسٹری آف رورل ری کنسٹرکشن، گورنمنٹ آف انڈیا، کرشی بھون نئی دہلی کی ہے جو آج کل کے لڑکوں کو، جو صرف ملازمت کے خواہاں ہیں اور ملازمت نہ ملنے پر ادھر اُدھر پریشان گھومتے رہتے ہیں، روزگار فراہم کرنے میں بہت معاون ہے۔ اس اسکیم کے لیے رضا کار تنظیم کو ساری شرطیں جو پہلے لکھی جا چکی ہیں، پوری کرنا پڑیں گی۔

بیکار نوجوانوں کو گھڑی سازی، ریڈیو، ٹی وی مرمت، پمپ سٹوو کی مرمت، ٹریکٹر مرمت اور اُسانے کی مشینوں کی ٹریننگ دینا پڑے گی جس کے لیے تنظیم کو ایک ٹریننگ سنٹر چلانا پڑتا ہے۔

کسی ایک ٹریڈ کے لیے سنٹر چلانے پر گورنمنٹ کے بجٹ کے تحت پچاس ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے جس میں سے سرکار پچاس فیصد مدد دے دیتی ہے۔

ایسی اور بہت سی اسکیمیں ہیں جن سے تنظیم اپنے شہر، قصبوں، اور دیہاتوں میں اقلیتی طبقے کے لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

مزید جانکاری کے لیے آپ اقلیتی ادارہ میں ہر وقت ۱۰ بجے سے ۵ بجے تک آکر تفصیلات حاصل کر سکتے ہیں۔

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

نام کتاب مُشاہدۂ فطرت

مرتب: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں   قیمت: ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ: دانش محل، امین آباد۔ لکھنؤ

مشہور ماہر ارضیات پروفیسر کے۔ این۔ کول کی شخصیت میں سائنسی مزاج، مذہب کی رُوح، ادب اور گنگا جمنی تہذیب و ثقافت۔ اس طرح یک جا ہو گئے تھے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہے۔ وہ سائنس داں تھے چنانچہ دلیل کے بغیر نوالہ نہیں توڑتے تھے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ماورائے تجربہ بھی ایک دنیا کا وجود ممکن ہے جس کا ادراک حواس کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شخصیت میں ایک ادیب بھی چھپا ہوا تھا جس نے انھیں مشکل سائنسی مسائل جیسے "موتی کیسے بنا"، "حرکت"، "مونگ پھلی کی نشو و نما" وغیرہ پر افسانوی روپ میں اظہار خیال کے لیے اکسایا۔

جن لوگوں نے کول صاحب کو تقریر کرتے سنا ہے وہ اس کی گواہی دیں گے کہ انھیں مشکل سے مشکل مسئلے کو آسان سے آسان لفظوں میں بیان کرنے کی قدرت حاصل تھی۔ یہی سہولت بیان، شخصیت کا رکھ رکھاؤ، مزاج کی شگفتگی ان کی ادبی کاوشوں میں بھی نظر آتی ہے جس کا اظہار اس کتاب میں شامل ان کی نثری تخلیقات سے ہوتا ہے 'ایک موتی کی کہانی' اس سلسلہ کی ایک نایاب کہانی ہے جس میں انسان کے جستجو کے مادہ، سائنسی حقائق، خواب کیا ہے 'زندگی کیا ہے، زندگی کا مقصد کیا ہے' اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کو ایک نوجوان کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ کول صاحب نے اس افسانوی تخلیق میں دریاؤں، پہاڑوں، بادلوں اور سمندروں کو زبان دے دی ہے۔ وہ نوجوان اپنے سوالوں کے جواب کے لیے عالموں، رشیوں، مینوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتا ہے۔ تیرتھ استھانوں کے چکر لگاتا ہے لیکن اس کی تشفی نہیں ہوتی۔ آخر فطرت خود اس کی مدد کے لیے آگے بڑھتی ہے اور اپنے اور کائنات کے سارے راز ایک ایک کرکے اس کے سامنے آشکارا کر دیتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مرتب کے دو مضامین کے علاوہ کول صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مفتی محمد رضا انصاری، ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی، ڈاکٹر حفیظ احمد خاں اور جناب موہن لال دیشنوی کا ایک ایک مضمون شامل ہے۔ کول صاحب کی تخلیقات کا ترجمہ مرتب نے کیا ہے۔

کتاب کی ضخامت اور مواد کے اعتبار سے قیمت بہت کم ہے لیکن کیا خوب ہوتا اگر ڈاکٹر کول کی نفاست پسندی کا خیال کرتے ہوئے کتاب بھی اسی نفاست کے ساتھ پیش کی جاتی، چاہے ایسا کرنے میں قیمت میں اضافہ ہی کیوں نہ ہو جاتا۔

——————— عابد سُہیل

نام کتاب: عبداللہ بن مقفّع — فن اور شخصیت

مصنف: ڈاکٹر رفیق احمد خاں ندوی ۔ قیمت: بیس روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ

عبداللہ بن مقفع، عباسی عہد کا مشہور ادیب و انشا پرداز، مترجم اور حکیم ہے اور اپنی حکمت و دانش اور ممتاز علمی و ادبی اسلوب تحریر کے لیے عالمگیر شہرت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی کتاب "کلیلہ دمنہ" کے ترجمے دنیا کی متعدد علمی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں اور اسے ادبیاتِ عالم میں لافانی حیثیت حاصل ہو گئی ہے

لیکن اُردو میں ابن مقفع اور اس کی کتاب کا مفصل تعارف نہیں ہو سکا تھا۔ مقام مسرت ہے کہ لکھنؤ ٹیلی ویژن کے اردو نشریات کے نگراں ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب نے اس کتاب اور اس کے مصنف کو اپنی

تحقیق کا موضوع بنایا اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ ڈاکٹر رفیق صاحب نے بڑی جامعیت اختصار اور تحقیق کے ساتھ ابنِ مقفع پر قلم اٹھایا ہے اور اردو دنیا کو ابنِ مقفع اور اس کی کتاب کی اہمیت سے بخوبی واقف کرا دیا ہے

ڈاکٹر رفیق نے عربی کے ممتاز اسالیب بیان کے اجمالی تعارف کے ساتھ ابن مقفع کے اسلوب کی بنیادی خصوصیات و امتیازات پر اچھی روشنی ڈالی ہے اور کتاب و صاحبِ کتاب کو اچھی طرح متعارف کرانے کے لیے عربی، اُردو اور انگریزی مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

کتابت کی غلطیوں سے مصنفین اور کتابوں کے بعض نام غلط ہوگئے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں ان غلطیوں کی تصحیح کر دی جائے گی۔

——— شمس تبریز خاں

نام کتاب "معیارِ نظر"

مصنف: ارشد کاکوی۔ قیمت: تیس روپے

ملنے کا پتہ: گل مہر بک ہاؤس۔ پٹنہ ۴

"معیارِ نظر" سید شاہ رشید الرحمن ارشد کاکوی کے سولہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مرحوم ارشد کاکوی نے اپنی مختصر سی زندگی میں جو تنقیدی مضامین سپردِ قلم کیے تھے وہ بیسویں صدی کے نصف آخر کی پہلی دو دہائیوں میں ہند و پاک کے معیاری رسائل و جرائد مثلاً نگار، ساقی، شاعر، آج کل، مہر نیم روز، مشرب اور ندیم وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں منتشر اوراق کو یکجا کر کے ان کے بھائی جناب عظیم الرحمن نے مجموعے کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔

"معیارِ نظر" کے سارے مضامین تخلیق کار کی فکر رسا کی غمازی کرتے ہیں اور تنقید کے "ہر معیارِ نظر" پر پورے اترتے ہیں۔ پورے مجموعۂ مضامین میں چند عنوانات کے علاوہ جو غالب، شاد اور شیفتہ وغیرہ سے متعلق ہیں، تقریباً سبھی مضامین ایسے افراد کے علم و فن پر لکھے گئے ہیں جو مضمون کی اشاعت کے وقت بقیدِ حیات تھے۔ وہ نیاز فتحپوری ہوں یا اثر لکھنوی، بابائے اُردو ہوں یا جمیل مظہری، وحشت کلکتوی ہوں یا جگر مراد آبادی، جگن ناتھ آزاد ہوں یا شکیل بدایونی۔ ارشد کاکوی کی نظر سے ان کے معائب و محاسن پوشیدہ نہیں رہ سکے۔ انھوں نے ان تمام قلم کاروں کی تخلیقات کو غیر جانبداری کے ساتھ پرکھا اور ان پر بے لاگ تبصرے کیے۔ ان کے بعض مضامین پر دوسرے صاحب الرائے ادیبوں نے جوابی مضامین بھی لکھے لیکن جب ارشد کاکوی نے جواب الجواب لکھا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا۔ طرزِ بیان کی شگفتگی، تازگی اور ندرت ان کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ تنقیدی بحثوں میں وہ کہیں بھی "خلط مبحث" کا شکار نہیں ہوئے بلکہ ٹھوس اور وزنی دلائل کے ذریعہ ہر "عقدہ لاینحل" کو حل کرنے کی سعی کرتے رہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ارشد سے بڑے قد کے ناقدین نے بھی ان کی ادبی کد و کاش کو سراہا ہے اور بعض سن رسیدہ ادیبوں نے خود ان کے فن پر سیر حاصل مضامین لکھے ہیں جو "ارشد کاکوی نمبر" (سفینہ۔ پٹنہ بابتہ جنوری۔ اپریل ۱۹۸۳ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔

"معیارِ نظر" ہر اعتبار سے لائقِ تحسین ہے۔ علمی اور ادبی کتابوں کے ہر اچھے ذخیرے میں اس کی شمولیت ضروری ہے۔ کتابت اور طباعت غنیمت ہیں۔

——— (ڈاکٹر) سلمان عبّاسی

خاموش

صفحہ ۴۴ کا بقیہ

ایک نعمت ہے محبت بھی مگر
سب کو یہ دیوانگی ملتی نہیں

محبّت کی شکستہ آرزوؤں کا لہو دے کر
تمہارے تذکرے میں رنگ پیدا کر دیا میں نے

مجھے یقین ہے شاعری کو شاعری کی طرح پڑھنے والے قارئین، خاموش غازی پوری کے عکس تاب شعری اوصاف سے بہر طور متاثر ہوں گے اور انھیں وہ مقام عطا کریں گے جس کے وہ مستحق تھے۔ بقول پڈرک پوٹل :-

"کسی بھی عہد میں تہذیب و ثقافت غلط ہو سکتی ہے، تنقید غلط ہو سکتی ہے، لیکن شاعری مجموعی طور پر غلط نہیں ہو سکتی۔"

٭٭

نیا دور

جلد ۴۲	نمبر ۷

اکتوبر ۱۹۸۷ء

ایڈیٹر : —— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر : —— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر : —— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر : —— ۴۷۱۰۸

پبلشر

پبلشر اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش)

مطبوعہ : یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
سالانہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پبلک انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

عنوانات

بات

باباے قوم مہاتما گاندھی نے اس ملک میں مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی، اتحاد و اتفاق اور یک جہتی قائم رکھنے کی خاطر اپنی جان تک قربان کردی تھی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک، ہمارے معاشرے اور ہماری ریاست میں ایسے عناصر سرگرم ہیں جو ہم آہنگی، اتحاد و اتفاق اور یک جہتی کو ختم کر کے نفاق، منافرت، علاحدگی اور انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں یہ عناصر تشدد اور دہشت پسندی کے ذریعہ اس ملک کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں۔ یہ عناصر رجعت پسند طاقتوں کے ایجنٹ ہیں اور عوام نیز حکومت دونوں کو الجھائے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ غریبی اور بے روزگاری جیسے بنیادی مسائل حل نہ ہوسکیں اسی لیے نفاق، منافرت، فرقہ پرستی، علاقائیت اور علاحدگی کے جذبے کو فروغ دینے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ہمیں ایسی طاقتوں اور ان عناصر سے نہ صرف یہ کہ ہوشیار رہنا چاہیے بلکہ ان کی ناپاک اور گندی سازشوں کو ناکام بنا دینا چاہیے۔ اگر کسی فرقے یا طبقے کے ساتھ کسی سطح پر ناانصافی ہوئی ہے تو اس کے خلاف پرامن طریقے سے آواز اٹھانی چاہیے۔ تشدد اور دہشت پسندی سے نہ کوئی مسئلہ حل ہوا ہے نہ حل ہوسکتا ہے۔ گاندھی جی نے صدیوں کی غلامی کے خلاف جو جنگ لڑی اس میں بم اور بندوق استعمال نہیں کیے گئے تھے بلکہ یہ لڑائی انھوں نے عدم تشدد کے ذریعہ لڑی اور کامیابی بھی حاصل کی، جس کے نتیجہ میں ہمیں صدیوں کی غلامی سے نجات ملی۔ آج بھی ہم پرامن طریقے سے اور عدم تشدد کے ذریعہ ہر مسئلہ حل کرا سکتے ہیں۔ ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم پرامن طریقے سے اور عدم تشدد کے ذریعہ کامیابی نہ حاصل کرسکیں۔

آج کے حالات میں بھی گاندھی جی کے اصول اور نظریات ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

وفیات

گذشتہ دنوں ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے دو بہت ہی ممتاز اور اہم فن کار فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔

فکر تونسوی بہت ہی مشہور و مقبول طنز نگار تھے اور انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ روزنامہ "ملاپ" اور ماہنامہ "بیسویں صدی" (دہلی) میں تو وہ مستقل لکھتے تھے، اس کے علاوہ اُردو کے تمام اہم اور معتدد رسالوں میں ان کے طنزیہ خاکے اور انشائیے شائع ہوتے تھے جو بڑی دل چسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ اپنی تحریروں میں وہ دوسروں کے ساتھ خود کو بھی طنز کا نشانہ بناتے تھے، ان کا طنز اتنا کاری ہوتا تھا کہ وہ افراد جو اُن کا موضوع بنتے، تلملا اُٹھتے تھے۔

احمد جمال پاشا بھی مشہور طنز و مزاح نگار تھے اور بڑا پختہ ادبی و تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک وہ لکھنؤ میں روزنامہ "قومی آواز" سے وابستہ رہے اور لکھنؤ کے ادبی ماحول میں بہت سرگرم اور فعال رہے۔ لکھنؤ کی سنجیدہ ادبی نشستوں میں وہ بڑی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور ابھرتے ہوئے باصلاحیت ادیبوں اور قلم کاروں میں بڑی دل چسپی لیتے تھے۔ وہ بڑے پرمذاق بھی تھے۔ ان کی بذلہ سنجی اور لطیف طنز سے آراستہ ان کے جملے محفلوں کی جان ہوتے تھے، وہ تھے تو طنز و مزاح نگار مگر ان کی دلچسپی پورے ادب سے تھی۔

ان دونوں فن کاروں کا انتقال یقیناً ہماری زبان اور ادب کا نقصانِ عظیم ہے۔

●

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی۔ وارانسی

غزل

جس کی پرواز میں زر ہوتا ہے پر ہوتا ہے
اس کا اک روز میں ہفتوں کا سفر ہوتا ہے

ایک سے ایک زمانے میں شجر ہوتا ہے
ڈھیلے کھاتا ہے وہی جس میں ثمر ہوتا ہے

ایسے شہزادے کو کیوں روئیں نہ سارے شہری
شہر جس کا ہے وہی شہر بدر ہوتا ہے

سب کی آنکھوں میں کہاں مہر و وفا کے آنسو
ہر صدف میں کہیں انمول گہر ہوتا ہے

ساتھ دیتی نہیں تقدیر بغیر تدبیر
باعمل ہی کی دعاؤں میں اثر ہوتا ہے

دیکھنے والے فقط قلعۂ شاہی کو نہ دیکھ
قید خانے میں شہنشاہ کا گھر ہوتا ہے

فتح دل جیتنے والوں کی ہوا کرتی ہے
سر کے لینے سے کہیں معرکہ سر ہوتا ہے

پرورش ہوتی ہے بچوں کی طرح پودوں کی
جب کہیں سایہ فگن کوئی شجر ہوتا ہے

نقشِ پا خاک پہ کیا خاک ملیں گے ان کے
جن جوانوں کا خلاؤں میں سفر ہوتا ہے

نئے انسان سے ملیئے تو سمجھ کر ملیئے
اب درندہ بھی ہم شکلِ بشر ہوتا ہے

اب سفر کے لیے جب گھر سے نکلتا ہوں نذیر
میری گردن پہ نہیں ہاتھ پہ سر ہوتا ہے

غلام رضوی گردش
معرفت علی رضا صاحب
نعمانیہ، جعفرآباد کالونی
اعظم گڑھ



نذیر بنارسی

لال قلعہ کے مشاعرے میں نذیر صاحب نے صرف چار شعر پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ اب فراق صاحب کی باری تھی ـــــ نوٹنکی شروع ہوگئی، مائک کے سامنے بڑے ٹھسّے سے پہنچے، اور آنکھیں بند کرتے ہوئے شگوفہ چھوڑ دیا ـــــ

" نذیر صاحب سے میرا اس وقت سے تعلق ہے جب ان کا بچپن تھا" ـــــ ! بس مشاعرہ گاہ میں ہلچل مچ گئی۔ لیکن نذیر صاحب بھی پرانے کھلاڑی ٹھہرے، اسی عالم میں اُچک کر مائک پر پہنچ گئے ـــ

" حضرات! فراق صاحب صحیح فرما رہے ہیں۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب فراق صاحب کو "لینے" کے "دینے" پڑگئے تھے۔ !"

جوابی حملہ زبردست ثابت ہوا، جیسے کو تیسا۔ ! ادھر سامعین کرام تھے کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ فراق صاحب کے ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ بولتی بند ہوگئی! پھر انھوں نے لاکھ کوشش کی، سلسلے آزمودہ نسخے آزمائے، بھانت بھانت کے کرتب دکھائے لیکن رنگ نہیں جما سکے۔ ساری ملیت دھری رہ گئی۔

اب کیا رکھا تھا، کھسیانی بلی کھمبا نوچے! مشاعرہ ختم ہوتے ہی خوب چڑھائی اور بپھر گئے ـــــ

" آخر آپ سمجھتے کیا ہیں۔ ؟" انھوں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا جیسے کچا چبا جائیں گے۔

" ایشیا کا عظیم شاعر۔ !" الفاظ کھینچتے ہوئے نذیر صاحب جھٹ بول پڑے۔

'جان بچی لاکھوں پائے' کے مصداق نذیر صاحب خوب جانتے تھے کہ بس اب دفاعی ہتھیار یہی رہ گیا ہے۔

ایک ادبی نشست میں فراق صاحب نے شعر سنایا ؎

آج آنکھوں میں کاٹ لے شبِ ہجر
زندگانی پڑی ہے سو لینا !

" غلط ہے۔ !" نذیر صاحب نے اعتراض جڑ دیا۔ لیجئے ؏

جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

"کیسے ؟" فراق صاحب نے آسمانِ شاعری سے زمین پر آتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور دیدے نچاتے ہوئے انھیں گھور کر دیکھا۔

" تخاطب کی غلطی ہے حضور ... "آج آنکھوں میں کاٹ لے شبِ ہجر" ..... یعنی "تو" ـــ " زندگانی پڑی ہے سو لینا" .... یعنی "تم" !

" تو آپ اسے کیا کہیں گے۔ ؟" مچلتے ہوئے پوچھا، جیسے منہ چڑا رہے ہوں۔

" میں اسے شترگربۂ خفی کہوں گا۔ !" پھر جملہ جڑ دیا۔

" ہوں..... باریک بات ہے۔ !"

مان تو گئے لیکن اڑیل ٹھہرے، پھر چُل سُوجھی ——

"ایسی غلطی تو غالب سے بھی ہوئی ہوگی۔" ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

"بس یہی تو فرق ہے .... غالب مان لیتے..... آپ نہیں مانیں گے"! نذیر صاحب نے جھٹ اُن کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ — پھر بولتی بند!

ایک محفل میں اہلِ علم کے علاوہ نذیر اور فراق بھی موجود تھے۔ کسی چنٹ نے سوچا، بات تو جب ہے کہ ایک تیر سے دو نشانے لگائے جائیں۔ "Killing Two Birds with One Stone" والا معاملہ ہو، بس شعر چپکا دیا؎

میر بیمار ہوئے جس کے طفیل!
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

"کچھ سُنا؟" فراق نے ٹہوکا مارا۔

"جی ہاں! لوگ یہی کہتے ہیں، کہ آپ کا تو دن رات کا سابقہ رہتا ہے"۔ نذیر صاحب نے کہا۔

فراق صاحب موقع شناس تھے، خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔ گویا دونوں میں ملی بھگت بھی تھی۔

لال قلعے کے مشاعرے میں دراز قد شاعر ہلال رامپوری اپنا کلام سُنا کر ابھی ہٹے ہی تھے کہ جھٹ پستہ قد نذیر بنارسی کا نام پکار لیا گیا۔ اِدھر نذیر صاحب کا مائک پر تشریف لانا تھا کہ اُدھر قدِ رعنا میں تضاد باہمی دیکھ کر محفل قہقہہ زار بن گئی۔ نذیر صاحب بھی منجھے منجھائے، سیکڑوں برساتیں جھیلے ہوئے "Seasoned" قسم کے شاعر! فوراً ارشاد ہوا ——

"آپ حضرات کی ہنسی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک شعر عرض ہے:

ہمارے قد پہ نہ ہنسنا، ہمارا قد وہ ہے
کہ جس کی لال بہادر نے آبرو رکھ لی

شعر گویا "دھماکہ" ثابت ہوا۔ لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہوئے جا رہے تھے اور پھر مشاعرہ نذیر صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ جی ہاں! گیلس وردی کا "The Little Man" بھی اکثر وہ کام کر جاتا تھا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے!

نذیر صاحب کچھ بھنگ کر چلتے ہیں لیکن خدا کے واسطے آپ بھول سے بھی کچھ نہ پوچھیے گا ورنہ فوراً کوئی نہ کوئی ادبی جواز پیش کر دیں گے؎

سُنا ہے آئے تھے غالب بنارس
اگر وہ آم کے موسم میں آتے
اور اِس "لنگڑے" سے ہو جاتی ملاقات
تو پھر کاشی سے کلکتے نہ جاتے

زود گوئی نذیر صاحب پر ختم ہے۔ ہوا یوں کہ ایک دن ایک مقامی پنڈت دوست کی فرمائش پر موصوف نے بھانگ چڑھا لی۔ اب ذرا جرأتِ رندانہ دیکھیے اور تو اور، اپنے "تجربہ" کو شعر کے قالب میں بھی ڈھال دیا؎

برسوں کا سفر کر گئے طے ایک پل میں
پھرتے رہے تاروں کے حسیں جنگل میں
"ٹھنڈائی" میں کیا گھول دیا تھا پنڈت
ہم رات بھر اُڑتے رہے "نبھو منڈل" میں

یادش بخیر، مولانا خیر بہوروی اور نذیر صاحب کی موجودگی میں علامہ انور صابری نے کسی مشاعرے کے لیے مصرع طرح دیا؎

نہ بھیگا آپ کا دامن، ہماری آستیں بھیگی

نذیر صاحب نے وہیں بیٹھے بٹھائے جھٹ پٹ مطلع کہا؎

گھٹا چھائی، ہوا سنکی، فضا مہکی، زمیں بھیگی
کوئی پھر یاد آیا، اشک پونچھے، آستیں بھیگی!

مولانا خیر بہوروی سُنتے ہی پھڑک اُٹھے اور انور صابری سے کہا، "مولانا! اب مطلع نہ کہیے گا، ہو گیا!"

مغل سرائے کے مشاعرے میں مجاز، نذیر بنارسی، جلال ملیح آبادی، مسعود اختر جمال اور دیگر ممتاز شعرائے کرام موجود تھے۔ مجاز چین سے بیٹھنا

کیا جانیں، سر میں جو کھجلی ہوئی تو نذیر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

ع تو ہی مستانہ زندگانی کردی

پھر ستم یہ کہ ساتھ ساتھ فرمائش بھی ۔۔۔ اب اپنا تعارف کروائیے نذیر صاحب"!

نذیر صاحب کی طبیعت بھی ایسی رواں کہ بس عش عش کرتے رہ جائیے۔

فوراً ارشاد ہوا ع

زنگین بہت تھی پانی پانی کردی

مصرع سنتے ہی جلال صاحب پھڑک جاتے ہیں، جواب تک وہسکی کی بوتل شیروانی کی جیب میں چھپائے چپ سادھے بیٹھے تھے۔ پھر کیا تھا؛ سویا ہوا پٹھان بیدار ہوگیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک جھٹکے سے بوتل نکالی اور نذیر صاحب کے سامنے دھائیں سے رکھ دی ۔۔۔ "اب آپ اس کے حق دار ہیں۔!"

مغل سرائے کے ہی شاعرے میں مخدوم محی الدین کا بستر کہیں راہ میں گر گیا۔ اب موصوف ہیں کہ پیچھے مڑ مڑ کر بے چینی سے دیکھتے جاتے ہیں۔ نذیر صاحب سے جب یہ دل سوز منظر نہ دیکھا گیا تو جھٹ بول پڑے۔

"مخدوم صاحب! یہ آپ کے نظریے کے خلاف ہے ۔۔۔ آگے دیکھیے۔!"

نذیر صاحب کی شخصیت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ بلا کے حاضر جواب واقع ہوئے ہیں۔ روس سے ظ۔ انصاری واپس لوٹے یا لوٹائے گئے تو نذیر صاحب کے لیے تحفتہً ایک عدد ٹوپی اور ایک جوڑا جوتا لائے۔

"جوتا بڑا ہو رہا ہے۔!" ٹرائل لیتے ہوئے نذیر صاحب نے فرمایا۔

"تو چھوٹا کروا لیجیے، لیکن پہننا آپ ہی کو ہے۔!" ظ انصاری نے اصرار کیا۔

نذیر صاحب نے مشورہ دیا۔ "اچھا، کچھ نہیں تو آپ بھی کھدر نذر کر دیجیے"!

"یہ سب نہیں چلے گا۔!" ظ نے احتجاج کیا۔

"کیوں؟ جوتا چلے گا ..... یہ سب نہیں چلے گا۔!"

نذیر صاحب نے نہلے پر دہلا مارا۔ اور اب ظ انصاری ہیں کہ ایک چپ ہزار چپ۔!

رانچی میں اہلِ علم و ادب کا مجمع تھا۔ ایک ادب نواز کو چہل سوجھی جو نذیر صاحب کی زود گوئی سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے بیٹھے بٹھائے سوچا، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، آج اچھا موقع ہاتھ آیا ہے آزما کر دیکھ لیا جائے۔ بس مصرع دے دیا ع

راںڈ سانڈ سیڑھی سنیاسی

نذیر صاحب نشانہ لگانے میں طاق، جھٹ ارشاد ہوا۔ ع

سب سے بچیں تو جائیں کاشی

جوڑ کا توڑ۔ محفل زعفران زار بن گئی۔ حسنِ اتفاق سے ایک سردار جی بھی موجود تھے جو بے حد محظوظ ہوئے اور اُچھلتے ہوئے فرمائش کی۔

"نذیر جی، اور چاہیے۔!"

نذیر صاحب نے کہا۔ رُباعی پیشِ خدمت ہے ۔

گنگا نہ ملے مجھ کو نہانے کے لیے

بیڑا نہ ملے پان لگانے کے لیے

سیڑھی جو بنارس سے ہٹا دی جائے

رستا نہ ملے سُورگ میں جانے کے لیے

چاروں طرف سے قہقہے بلند ہونے لگے۔ سردار جی نے پھر اُچھلتے ہوئے داد دی ۔۔۔ "نذیر جی، اور چاہیے!"

نذیر صاحب نے کہا۔ قطعہ عرض کرتا ہوں ۔

معلوم نہیں ہے تجھے اے بھانڈ

سچائی لگا دیتی ہے ہر جھوٹ پہ ڈانڈ

مکھی کے لیے آئی ہے وہ دان میں یہ

باہر ہی کے سب راںڈ ہیں باہر ہی کے سانڈ

سردار جی نے اب جوش میں کھڑے ہو کر ہانک لگائی ۔۔۔

"نذیر جی، اور چاہیے۔!"

نذیر صاحب سے اب رہا نہیں گیا اور انھوں نے بڑی بے بسی سے جواب دیا۔ "اب آپ اُٹھ اُٹھ کے، اسی طرح اکھاڑتے رہیے گا

تو میں کب تک جا تا رہوں گا۔!"

بنارس میں ڈاکٹر ٹھاکر کے یہاں آنکھ کے آپریشن کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں فی الفور یہ کہا لکھو ؎

چلا ہوں لے کے اندھی آنکھ مولیٰ کے سہارے پر
سُنا ہے روشنی بٹتی ہے ٹھاکر کے دوارے پر

اسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں شعر پیش کر دیا۔ موصوف ادب نواز بھی تھے، جی کھول کر داد دی۔

"مجروحؔ کا ہر شعر مضبوط ہوتا ہے۔!" کسی موقع پر مسعود اختر جمالؔ نے کہا۔

"جی ہاں! اس کا ہر شعر لینٹن گراڈ ہوتا ہے۔!" نذیرؔ صاحب کا جواب حاضر تھا۔

غازی پور کے مشاعرے میں وامقؔ جونپوری، مجروحؔ سلطانپوری اور نذیرؔ بنارسی وغیرہ مدعو تھے۔ کسی صاحب کی جیب میں "شیمپین" کی بوتل تھی۔

"چلے گی۔؟" انھوں نے نذیرؔ صاحب سے دریافت کیا۔

"چلنے کے لیے آئی ہے کہ کھڑی رہنے کے لیے۔؟" نذیرؔ صاحب بڑی معصومیت سے پوچھ بیٹھے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کا مشاعرہ کامتا پرشاد چترویدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ چلتے وقت بیوی نے مشورہ دیا ــــ "جوتے نئے ہیں، جھولے میں ڈال لیجیے گا۔"

"اس میں کیا ہے۔؟" ڈائس پر پہنچتے ہی کامتا پرشاد نے پوچھا۔

"جوتے! میں نے باہر ہی اتار کر رکھ لیے ..... بڑے جوتے پڑتے ہیں ...... میں نے سوچا شاید نہ ملیں۔؟" نذیرؔ صاحب نے صفائی پیش کی۔

"ارے صاحب، وہاں تو اتنے پڑتے ہیں کہ دکھائی نہیں دیتے۔!"

کامتا نے اپنی چوپخ ماردی۔ نذیرؔ صاحب لاجواب ہو گئے۔ اور اب یوں سوچ رہے تھے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے سیر کا سوا سیر پیدا کیا ہے۔

مشاعروں میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ ہمیشہ نذیرؔ صاحب کو بزرگ بنا کر پیش کرتے تھے۔ ایک بار نذیرؔ صاحب کو تاؤ آ گیا، سوچا اگلا پچھلا حساب برابر کر دوں۔ بس مائک پر آتے ہی قطعہ پڑھا ؎

رنگین کہیں جو زندگانی ہوتی
پھر کاہے کو یہ سادہ بیانی ہوتی
سمجھا لو بزرگ ہو؟ مگر میں کیا سمجھوں
اے کاش تمھاری بھی جوانی ہوتی!

اب سحرؔ صاحب کے کاٹو تو خون نہیں، موصوف بغلیں جھانکنے لگے۔

ہند و پاک بٹوارے سے کچھ پہلے مجروحؔ سلطانپوری سے ملنے محبوب پروڈکشنز بمبئی پہنچے۔ دیکھا تو سامنے مسخرہ اداکار یعقوب بیٹھا ہے۔

"مجروحؔ کہاں ملیں گے؟" نذیرؔ صاحب نے دریافت کیا۔

"اسپتال میں!" یعقوب نے شوخی دکھائی۔

"کس نمبر میں۔؟" استفسار ہوا۔

"یہ تو نہیں بتا سکتا!" یعقوب نے معذرت کی۔

"کیوں صاحب؟ اسی لیے تو ڈاکٹر سے پوچھا ہے۔!" نذیرؔ صاحب نے اسے کانٹوں میں گھسیٹا۔ یعقوب نے سوچا، یہ تو میرا بھی باپ نکلا۔!

اللہ اللہ کر کے مجروحؔ سے ملاقات ہوئی۔ مصافحہ اور معانقہ ہوا، ادھر ادھر کی سننے سنانے کے بعد دکھڑا دیا گیا۔

"بھائی جان نے الگ کر دیا ہے، تلاشِ معاش میں نکلا ہوں۔ اپنے عزیز دوست شاہ زماں صاحب کے ساتھ اسی سلسلے میں احمد آباد جا رہا ہوں۔!"

"تلاشِ معاش" کا لفظ مجروحؔ کو کھٹکا، انھیں باہر روک کر اندر گئے اور کچھ دیر کانا پھوسی کرتے رہے۔ پھر باہر نکلتے ہی مژدہ سنایا۔

"آپ کو محبوب صاحب نے کل صبح ناشتے پر بلایا ہے۔!"

حسبِ ارشاد وقت کرے پر دھاوا بول دیا۔ دیکھا تو مجوب صاحب جائے نماز پر مصروفِ عبادت ہیں۔ کچھ دیر بعد مخاطب ہوئے۔

" نذیر صاحب! ایسا ہے کہ آپ بھی جانتے ہوں گے، اس "لاش" سے اُردو کی ٹوٹی پھوٹی خدمت ہوتی رہتی ہے۔ مجروح یہیں ہیں، خمار آنے والے ہیں...... اگر آپ بھی آجاتے تو......!"

بس بیچ ہی میں بات کاٹ دی اور چہک کر کہا۔۔۔ "ابھی کسبِ معاش کے لیے باعزت ذرائع میرے پاس موجود ہیں ..... ورنہ پھر اجداد کی آبرو کو بیچا جائے گا۔"

مجروح کو جب معلوم ہوا تو بہت چیں بر جبیں ہوئے۔ راجپوت آدمی ٹھہرے، بالکل چراغ پا۔۔۔ آپے سے باہر!

بات آئی گئی ہو گئی۔ انھیں دنوں سحر صاحب بمبئی سے اُردو کا ایک جریدہ نکالتے تھے۔ ایک دن مجروح نے کہا۔۔۔ "آپ کو اعزازیہ دیا ہے، کھالے پر، خواتین کا جلسہ ہوگا۔"

رات میں محفل جمی۔ صدر مجروح بنے۔ سحر نے اعلان کیا۔

"نصیب نصیب! آج آپ کے سامنے میں اپنے سے اچھا شاعر پیش کر رہا ہوں۔!" ادھر مجروح نے ٹھوکا مارا۔۔۔ "مومن کی زمین میں جو غزل ہے وہی سنائیے گا۔!" حُسنِ اتفاق سے مجاز کو بھی یہ بہت پسند تھی۔

لیجیے اب نذیر بنارسی غزل سرا ہیں اور سامعین پر وجد طاری ہے:

ہوئے مجھ سے جس گھڑی تم جُدا
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مری ہر نظر تھی اک التجا
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ تمھارا کہنا کہ جائیں گے
اگر آسکے تو پھر آئیں گے

اسے ایک زمانہ گزر گیا
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مرے گرم گرم سے اشک میں
مری سرد سرد سی آہ میں

مرا ٹوٹا ہوا سا آسرا
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مرے شانے پر بھی زلف تھی
جو ہے آج مجھ سے کھنچی کھنچی

مرے ہاتھ میں بھی ہاتھ تھا
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہاتھ میں جو شراب لی
وہیں تم نے چھین کے پھینک دی

مجھے یاد ہے مرے پارسا
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہیں تم کو جانا ہو اگر
نہ گئے بغیر نذیر کے

وہ زمانہ اپنے نذیر کا
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نذیر صاحب کی اس غزل نے کچھ ایسا سماں باندھ دیا کہ پھر سحر صاحب تو کیا، مجروح کی بھی دال نہ گل سکی۔!

زود گوئی کی بھی انتہا ہو گئی۔ دیکھیے، نیاز حیدر نے "شاہراہ" دہلی کے طنز و مزاح نمبر کے لیے "تاڑ دُظلہ" بھی لکھوالی جناب سے ؎

میرے اچھے تاڑ، میں تیری بلندی کے نثار
ہر شجر تیری رعایا، تو ہے سب کا تاجدار
تیرے پتے پر گماں مجھ کو پرِ جبریل کا
تیری لمبائی پہ دھوکا صورِ اسرافیل کا

کیا کیا انکشافات ہیں؟...... "مہاتما جی سے اگر "ہنسا" ہوئی ہے تو یہی کہ انھوں نے تاڑ کے پیڑ کٹوا دیئے...... مچھلی کا نام "جل تروئی" رکھا تھا، لگتا ہے مچھلی کھاتے رہے ہوں گے!"

خدا سلامت رکھے، تین بیٹے ہیں۔ ظہیر، صغیر اور ریاض۔۔۔ تین بہوئیں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں۔۔۔ سب کے سب لائق،

مطلع اور فرماں بردار، بقول انیس ؎

یارب رسولِ پاکؐ کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچّوں سے گودی بھری رہے

بیگم کا تو انتقال ہو چکا ہے لیکن بچّوں کو قدم قدم پر نذیر صاحب کی ضروریات کا احساس رہتا ہے۔ چار بجے صبح کوئی نہ کوئی چائے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہے۔

۲۵ نومبر ۱۹۰۹ء کو اس جہانِ آب و گل میں نزولِ اجلال ہوا۔ خاندانی پیشہ طبابت ہے۔ والد ماجد حکیم نور محمد اور دادا حکیم علی بخش کی مسیحائی کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ انھیں بزرگوں کی یادگار "مقبولِ عام دواخانہ" مدن پورہ بنارس میں تقریباً سو سال سے قائم ہے۔

نذیر صاحب کو زندگی نے اُٹھا کر کئی بار ایسا پٹخا کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ پہلی دفعہ اس وقت جب بڑے بھائی نے اچانک علاحدہ کر دیا انھوں نے اس پُر آشوب دَور میں سُوت کی کانٹے کا دھندا کیا۔ قانونی لپیٹ میں آئے، چھ مہینے مقدمہ چلا، باعزّت بَری ہوئے، لیکن بنیادی طور سے آدمی نیک ہیں اور ان کی نیکیاں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔

انقلاباتِ زمانہ سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا ؎

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

دَورِ حاضر کا کوئی ممتاز ادیب و شاعر ایسا نہ ہوگا جس کی میزبانی کا شرف نذیر صاحب کو نہ حاصل ہوا ہو۔ عیب اور عیب جوئی جو عموماً ہمارے شعرائے کرام کی طبیعت کا خاصّہ رہی ہے، نذیر صاحب کے پاس کبھی پھٹکی تک نہیں۔

مجھ سے سب پوچھ، مگر عیب کسی کے مت پوچھ
سب کے عیبوں کو چھپانا ہی ہُنر ہے میرا

اور انھیں کے الفاظ میں ؎

مرا من ہے شہرِ گوکل کی طرح سے صاف ستھرا
مری سانس ایسی جیسے کوئی بانسری بجائے
مری ایک آنکھ گنگا، مری ایک آنکھ جمنا
مرا دل خود ایک سنگم جسے پوجنا ہو آئے

نذیر صاحب کی زندگی میں ایک دور وہ بھی آیا جب وہ مشاعروں سے دل برداشتہ ہو گئے اور دس سال تک مشاعرہ چھوڑ دیا لیکن جلد پھر راہِ راست پر آ گئے ؎

اندھیرا بڑھ گیا تھا روشنی کی بھیک
ہم اپنا گھر نہ جلاتے تو اور کیا کرتے

نذیر صاحب کے نظریۂ شعر سے آپ متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کا قول ہے:
"زندگی سنوارئیے، شاعری خود بخود سنور جائے گی۔!"

اٹھتّر سال کی عمر میں بھی زندہ دلی اور خوش مذاقی کا وہی عالم ہے، ادبی لطیفوں کا تو ان کے سینے میں ایک خزینہ دفن ہے۔ فرمانے لگے، سودا نے حزیں کی خدمت میں مصرع لکھ کر بھیجا ؎

"در درویش را درباں نہ باید"

حزیں نے جواب دیا ؎

"بباید تا سگِ دنیا نہ آید"

نذیر صاحب موڈ میں آجائیں تو ایسے ایسے شعر سنائیں گے کہ آپ کی طبیعت پھڑک اُٹھے گی ؎

سیاہ گیسو کو شانوں پہ ڈال رکھا ہے!
بلا کا سانپ سپیرے نے پال رکھا ہے

یہ دن کے دوش پہ بکھری ہیں شام کی زلفیں
کہ اک مچھیرے کے کاندھے پہ جال رکھا ہے

نذیر صاحب کا ظاہر و باطن یکساں ہے، لگی لپٹی نہیں رکھتے، بالکل صاف آدمی ہیں، خود معترف ہیں:۔
"اگر مصرع آجائے اور یقین ہو کہ پانچ سو روپے ملیں گے تو رات بھر میں غزل ہو جائے۔!"

ارے صاحب! غزل تو رہی دُور کی بات، موصوف صرف ایک عدد شعر کہہ کر بھی پانچ سو روپے وصول کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ہوا یوں کہ ہیرو نگر، لدھیانہ کی "ہیرو ہونڈا" کمپنی نے ماہنامہ "شمع" نئی دہلی میں اشتہار دیا کہ شعرائے کرام قومی یک جہتی کے موضوع پر ایک ایک شعر بھیجیں، جس شاعر کا شعر سب سے اچھا قرار دیا جائے گا اسے مبلغ پانچ سو روپے انعام!۔ بھلا نذیر صاحب کے ہوتے ہوئے کس میں اتنی ہمت کہ ان سے اچھا شعر کہہ کر نکل جائے اور وہ بھی قومی یک جہتی پر! چنانچہ قرعۂ فال انھیں کے نام نکلا ؎

وہ پریم اور پیار بھرے رین امنگ میں
سنگر کروڑ لوگ ہوں آج ایک رنگ میں

قومی شاعری کی بدولت، اربابِ اختیار کی نظروں میں نذیر صاحب کی کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ ڈی، آئی، جی پولیس شری آر۔ سی۔ رکشت کا جب بنارس سے تبادلہ ہوا تو موصوف نے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے نذیر صاحب کی خدمت میں تحفۂ دبیز ادبی قالین اور جائے نماز بھجوائی۔ ایک رکشت صاحب ہی پر کیا منحصر ہے، ان کی مدح و ثنا میں تو ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین، شریمتی اندرا گاندھی، ڈاکٹر سمپورنانند، پنڈت کملاپتی ترپاٹھی، شری اکبر علی خاں، شری بی۔ ڈی جتی اور شری شری پرکاش بھی رطب اللسان ہیں ؎

نذیر آکر مرا ہر شعر پھولوں کی طرح سونگھو
مرے شعروں میں میرے دیش کی مٹی مہکتی ہے

نذیر صاحب کی شاعری کے موضوعات متنوع ہیں۔ دیکھئے، خمریات میں بھی ٹانگ اڑائے ہوئے ہیں ؎

وہ دیکھ، وہ آنے لگا سورج پہ زوال
کیا میری طرف دیکھ رہا ہے؟ چل ڈھال
ناوقت یہ کون آگیا؟ "میں ہوں تری موت!"
"تو ہے مری لونڈی! لے مرا جام سنبھال!

لیکن دورِ حاضر میں ان کی شناخت قومی شاعری سے ہوئی ہے۔ خود فرماتے ہیں ـــــ "جدھر جدھر سے دیس کی سوندھی مٹی کی خوشبو آئی ہے اُدھر اُدھر پہنچنے کی کوشش کی ہے" ـــــ!

جناب کے تیور کچھ یوں ہیں: ـــــ "میں انصاف کی بھیک مانگنے نہیں آیا ہوں، صاحبانِ نقد و نظر کو انصاف کے خون سے سبک دوش کرنے آیا ہوں!" ـــــ یہ اندازِ بیان دیکھ کر تو اچھے اچھے دھونس کھا جائیں گے!

نذیر صاحب کی نثر بھی نہایت شستہ اور رواں ہوتی ہے۔ "ادارۂ چراغ" بمبئی کی خصوصی پیش کش "مجروح سلطان پوری ـ شخصیت اور شاعری" میں ان کا تازہ ترین مضمون "یادوں کے نقوش" ملاحظہ ہو۔
مگر خدا کے واسطے، ان کی قومی شاعری کو ہوا میں نہ اڑا دیجیے۔

اس میں بھی وہ تمام شعری محاسن موجود ہیں جو اچھی شاعری کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی نظم "پیارا ہندوستان" کو ہی لیجیے ؎

حُسن کی تیکھی، عشق کی ڈھار سی
واہ رے اپنی صبحِ بنارس:
گھاٹ کے پتھر جیسے پارس!
میرا نواس استھان یہی ہے
پیارا ہندوستان یہی ہے

اور ؎

جال بچھا کے جال سنبھالے
کمسن سڑکیں مانگ نکالے
بال بکھیرے ندی نالے
میرا نواس استھان یہی ہے
پیارا ہندوستان یہی ہے

نذیر صاحب کے اشعار جذبۂ حبّ الوطنی سے سرشار ہیں ؎

خون ہندی ہے تو گنگا کی روانی بھی رہے
جیسی تلوار ہے تلوار کا پانی بھی رہے

اور ؎

اسی کی زندگی ہے اب، لہو میں جس کے جوش ہو
وہ سر کرے گا معرکہ جو آج سرفروش ہے

ایسا محسوس ہوتا ہے نذیر صاحب ہمیشہ "جنگ" کے منتظر رہتے ہیں جو ان کے سمندِ فکر کے لیے تازیانے کا کام کرتی ہے۔ ویسے بھی آپ کو یا مجھے کلامِ نذیر کے بارے میں اظہارِ خیال کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ بہتر یہی ہے کہ ان کی کہانی خود انھیں کی زبانی سن لیجیے ؎

میں بنارس کا نواسی کاشی نگری کا فقیر
ہند کا شاعر ہوں شیو کی راجدھانی کا سفیر
لے کے اپنی گود میں گنگا نے پالا ہے مجھے
نام ہے میرا نذیر اور میری نگری بے نظیر
مضطرب رہتا ہوں ہر تازہ خبر کے واسطے
کرتا رہتا ہوں دعا فتح و ظفر کے واسطے

نامیؔ انصاری
۱/۱۸ مھیپریڈ، کانپور

"گاندھی"

وہ رہنمائے قوم کہ گاندھی تھا جس کا نام
روشن ہے جس سے مہر و محبّت کی صبح و شام
پیغامِ اتحادِ وطن جس کا ہر کلام
ارزاں تھا ہر بشر کے لیے جس کا فیضِ عام

ہندوستاں میں ایسا وہ مینارِ نُور تھا
کیرل سے کاشمیر تک اس کا ظہُور تھا

اس نے بتا دیا کہ خُمارِ اَلم ہے کیا
اس نے بتا دیا کہ اہنسا میں دَم ہے کیا
جمہُوریت کا رنگ ہے کیسا، دَھرم ہے کیا
انصاف کیا ہے عدل کا پہلا قدم ہے کیا

معلوم تھا جو نسخۂ جامِ شفا اسے
کہتے تھے لوگ اہلِ جنوں کا خدا اسے

انسانیت کے نور کا جوہر تھی اس کی ذات
کچلے دبے عوام کی رہبر تھی اس کی ذات
عرفان و آگہی سے منوّر تھی اس کی ذات
خوش کام و دلنواز و معطّر تھی اس کی ذات

آنکھوں میں ایسا نور کہ ہیروں سے بڑھ کے تھا
وہ اک فقیر سارے امیروں سے بڑھ کے تھا

ذرّوں کو اس نے تاروں کا ہمسر بنا دیا
کمزور و ناتواں کو تونگر بنا دیا
اپنے لہو سے اس نے جو منظر بنا دیا
نقشِ حیات لوحِ جہاں پر بنا دیا

ہنسا سے دُشمنی تھی، خطا کار سے نہ تھی
نفرت گُناہ سے تھی، گنہگار سے نہ تھی

وہ اک فقیر جس کو زمانے سے کام تھا
سوئے ہوئے دلوں کو جگانے سے کام تھا
تفریقِ رنگ و نسل مِٹانے سے کام تھا
اُونچا ہریجنوں کو اُٹھانے سے کام تھا

یہ کام اس نے کر کے جہاں کو دکھا دیے
وہم و گماں کے سارے اندھیرے مٹا دیے

اس نے تلاشِ حق میں قدم رکھ دیے جہاں
وہ راہ جگمگانے لگی مثلِ کہکشاں
مٹتا نہیں ہے صفحۂ عالم سے وہ نشاں
جس کو بنا دیا ہو محبّت نے جاوداں

قدرت نے بیکسوں کا مسیحا لکھا اُسے
بابائے قوم جس نے کہا، سچ کہا اُسے

محمد عالم
[illegible]
[illegible]
[illegible]

نمائندہ اردو شاعرات کے کلام پر ایک نظر

زبان و ادب سے دل چسپی اور شعر و سخن سے تعلق صرف مردوں کا حصہ نہیں ہے۔ ایام جاہلیت سے لے کر طلوع اسلام اور مسلمانوں کے عروج سے لے کر زوال تک اور جدید جاہلیت کے اس دور میں بھی شعر و سخن سے طبقۂ نسواں کو دل چسپی رہی ہے جہاں وہ شعراء کے کلام کا موضوع بنی رہیں اور اہل قلم کے اعصاب کو متاثر کرتی رہیں۔ خود انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے علم و ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچایا ہے۔ جہاں تک افسانوی ادب کا تعلق ہے عہد جدید میں خواتین افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تخلیقات اتنی ہی دقیع ہیں جتنی مردوں کی ہیں بلکہ ان میں چند ایسی ہیں جو اس میدان میں بہت سے مرد ادیبوں سے آگے ہیں۔ ناول نگاری اور افسانہ نویسی سے ان کی حد سے بڑھی ہوئی دل چسپی اور اس میدان میں ان کی کامیاب کوششیں اس بات کی علامت ہیں کہ وہ فطرۃً تخیل پسند واقع ہوئی ہیں۔ تخیل کی دنیا میں اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعہ اپنی ناتمام آرزوؤں کو پورا ہوتا دیکھ کر وہ تسکین حاصل کرتی ہیں۔ افسانوی ادب سے دل چسپی کی ایک اہم وجہ ان کا بالطبع باتونی ہونا بھی ہے جبکہ شاعری کی بڑی خوبی ایجاز ہے۔ یوں تو ایجاز کلام کا حسن ہے لیکن شاعری کے لیے یہ ایک لازمی اولین شرط ہے۔ عورت خواہ دیہات کی ان پڑھ گنوار ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب علم و ادب کی کہکشاں۔ دونوں باتونی ہوتی ہیں۔ کم سخن ہونا عورت ذات نے سیکھا ہی نہیں۔ لیکن عہد جدید کی خواتین نے اس کلیہ میں استثنائی صورت پیدا کردی ہے۔ ہمارے عہد کی شاعرات نے اردو شاعری کو اپنے تخلیقی شہ پاروں سے مالا مال کیا ہے اور اسے ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ برہا کے گیت اور ایام جدائی کے گانے عورتیں ہر زمانے میں گنگناتی رہی ہیں، لیکن اپنے صحیح اور سچے جذبات کو علی الاعلان شعر و ادب میں ظاہر کرنا ہمارے عہد کی خواتین کا کارنامہ ہے۔

قدیم زمانے میں تعلیم یافتہ خواتین چوری چھپے دو چار غزلیں کہہ لیتی تھیں، لیکن چھپنے چھپانے کا انھیں اس قدر شوق نہ تھا۔ جنھیں یہ شوق ہوتا وہ فرضی اور قلمی ناموں سے شائع کراتی تھیں۔ ان کے اس رجحان کی کبھی ہمت افزائی نہیں کی گئی۔ بہت کم گھرانے اور خاندان ایسے تھے جہاں خواتین کے اس ذوق کی پذیرائی ہوئی۔ شعر و سخن سے دل چسپی لینے کی اعلانیہ ہمت تعلیم یافتہ طوائفیں ہی کر سکیں جن کے لیے سماج میں جس طرح گانا جائز تھا۔ لکھنا بھی جائز تھا۔ بہارستان ناز کی سیر کیجیے تو جہاں شرفاء کی بیگمات کا کلام گلاب کی طرح کھل رہا ہے وہیں فنون لطیفہ سے دل چسپی لینے والوں کی غزلیں بیلا اور چنبیلی کی طرح مہک رہی ہیں۔

عہد جدید نے جہاں صنف نازک کو ہر طرح کی آزادی بخشی ہے وہیں اپنے افکار و خیالات کے حسین رخ سے گھونگھٹ اٹھانے کی آزادی بھی

مل گئی ہے۔ بعض افکار و احساسات اتنے دلکش اور حسین ہوتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ان پر حجاب کا حکم لگا دیا جائے۔ ایسے حسین احساسات و جذبات جس کی ایک جھلک ہوش و حواس چھین لے ان سے صرفِ نظر ہی مناسب ہے۔

عہدِ جدید کی شاعرات کے کلام کا ایک حصہ ایسا ہی ہے کہ بس پہلی نظر معاف ہے۔

ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر، مسعودہ حیات، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، فاطمہ شفیق شعری، سارہ شگفتہ، بانو وفا داراب، رفیعہ شبنم عابدی، زرینہ ثانی، ممتاز مرزا اور جمیلہ بانو نے گزشتہ تین چار دہائیوں میں اردو شاعری میں جو دھوم مچائی ہے وہ بہت سے جدید شعراء کے لیے باعثِ رشک ہے۔ ہاں ان سے کچھ مختلف اندازِ بیان صائمہ خیری اور راقم ہی کا ہے۔ اول الذکر کی شاعری مشرقی قدروں کی امین ہے اور موخرالذکر کی شاعری کا بیشتر حصہ عشقِ الٰہی اور محبتِ رسول ﷺ کے لطیف جذبوں کا فنکارانہ اظہار ہے۔

پاکستانی شاعرات میں ادا جعفری سب سے سینیر ہیں، ابتک چار شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، (۱) سازِ سخن بہانہ ہے (۲) غزالاں تم تو واقف ہو (۳) شہرِ درد، اور (۴) میں ساز ڈھونڈتی رہی۔

ادا جعفری کے یہاں فن اپنی بلندی کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں رکھ رکھاو ہے، سلیقہ اور شائستگی ہے۔ لطیف سے لطیف تر جذبوں کا اظہار انھیں آتا ہے۔ موزونیتِ طبع کے ساتھ ساتھ برسوں کا ریاض ہے روایتی شاعری سے نہ مکمل انحراف ہے نہ کورانہ تقلید، علامتوں کے استعمال اور لفظوں کے انتخاب میں جمالیاتی حسن کارفرما ہے۔ ان کی شاعری محض اپنی شناخت کے لیے نہیں ہے۔ داخلی کرب اور احساسِ ذات کے ساتھ ساتھ عصری آگہی بھی ہے۔ غمِ جاناں اور غمِ زمانہ دونوں کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کا کامیاب تجربہ ہے۔ نظیر صدیقی کے اس خیال سے اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے کہ

"ادا اپنی شاعری میں زبان و بیان اور خیال ان تینوں کے اعتبار سے ایک خوشگوار جدیدیت کا ثبوت دے رہی ہیں"

لیکن مجھے اس سے قطعی اتفاق نہیں کہ "ابھی ان کی انفرادیت کے خد و خال بہت واضح نہیں ہیں" ــــ انفرادیت قائم کرنے کے لیے فن کے ساتھ نادوا سلوک نہ پہلے پسندیدہ تھا اور نہ اب ہے۔ فن کا احترام فن کار کو محترم بناتا ہے۔ ان کی نظمیں آزاد اور پابند دونوں متاثر کرتی ہیں۔ ان کی غزلیں ہلکے ساز پر ایک خوشگوار نغمہ بکھیرتی ہیں۔ ان کی نظم "مسجدِ اقصیٰ" بے حد متاثر کرتی ہے ؎

محترم ہے مجھے اس خاک کا ذرّہ ذرّہ
ہے یہاں سرورِ کونین ﷺ کے سجدے کے نشاں
اس ہوا میں مرے آقا کے نفس کی خوشبو
اس حرم میں میرے مولا کی سواری ٹھہری
اس کی عظمت کی قسم ارض و سما نے کھائی
تم نے کچھ قبلۂ اوّل کے نگہبان! سُنا؟
زندگی مرگِ عزیزاں کو سہ لیتی ہے
مرگِ ناموس مگر ہے وہ دہکتی بھٹی
جس میں جل جائے تو خاکسترِ دل بھی نہ ملے
اور تپ جائے تو کندن ہے وجودِ انساں
پھر یہ پگھلے ہوئے لمحات گراں تابہ گراں
آپ مینارۂ انوار میں ڈھل جاتے ہیں
عرش سے خاک نشینوں کو سلام آتے ہیں
خارزاروں کو کسی آبلہ پا کی ہے تلاش
آج پھر رحمتِ یزداں کا سزاوار آئے
وادیِ گُل سے ببولوں کا خریدار آئے
دلق پوش آئے، غلاموں کا جہاں دار آئے
پاپیادہ کوئی پھر قافلہ سالار آئے
ریگ زاروں میں کوئی تشنہ دہن آئے
ہوش والو! کوئی تلقینِ جنوں فرمائے

ـــــــــــ (غزالاں تم تو واقف ہو)

نظموں کی طرح ان کی غزلیں بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہیں۔ غزلوں میں پھولوں کی خوشبو اور کلی کی تازگی موجود ہے، ؎

"خود اپنی ذات سے ہیں، شناسائیاں تو ہیں
صحرا میں ہم سفر مری تنہائیاں تو ہیں
پتھر بھی برگِ گُل ہیں کہ اپنی گلی کے ہیں

آخر بقدرِ ظرف پذیرائیاں تو ہیں
گل پیرہن ہے آج بھی اندازِ نقشِ پا
یعنی دلوں کی حوصلہ افزائیاں تو ہیں
جھوٹی تسلیوں کو ترستا رہا ہے جی
کاغذ کے برگ و گل میں بھی رعنائیاں تو ہیں

دلوں کی عرضِ تمنا کو اور کیا کہنا	کبھی کرن، کبھی شبنم، کبھی دعا کہنا
ہزار دشت اس اک مختصر سی راہ میں ہیں	شمیم جاں کو نہ بھولے سے مرحبا کہنا
نہ جانے کتنے چراغوں کا خوں ہوا ہوگا
نہیں ہے سہل کسی دل کو بے وفا کہنا

مطلوب زندگی کو ابھی امتحاں نہیں ؛
اب تک متاعِ درد سے دل بدگماں نہیں
دیکھو تو ہر جبیں پہ ہے اک آشنا سی لَو
سوچو تو آس پاس کوئی رازداں نہیں
چہروں کا رنگ دیکھ، نگاہوں کی بات سن
وہ بے زباں نہیں جو ترے ہم زباں نہیں
ہر لمحہ اک صدی سا گزارا ہے کرب نے
دل کو ندامتِ نفسِ رائیگاں نہیں
دیوارِ شب وہی ہے، جہاں تھی سحر وہی
شیشے نہیں رہے ہیں کہ سنگِ گراں نہیں
گزرے ہزار قافلے جس راہ سے ادا
اس راستے میں ایک بھی سنگِ نشاں نہیں

ادا جعفری کی شاعری میں کہیں بھی نسوانیت کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ خالص نسوانی جذبات و احساسات کی ترجمانی فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر کی بدعت ہے۔ جذبوں کی ایسی بے حجابی نہ پہلے کبھی دیکھی گئی اور نہ آئندہ اس کی امید ہے۔ شاعری میں عشقیہ جذبات کا اظہار اگر صنفِ نازک کی طرف سے علی الاعلان ہونے لگے تو اسے خطرناک تہذیبی شکست و ریخت اور اخلاقی زوال و انتشار کی علامت اور معاشرے کی تباہی کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ فہمیدہ ریاض اپنے شعری مجموعے "پتھر کی زبان" کے دوسرے ایڈیشن (پہلا ہندستانی ایڈیشن) کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں :

"بہ ظاہر اداس رومانی نظمیں کسی بہت ضدی لڑکی کی لکھی ہوئی ہیں (جسے کئی برس بعد، زندگی کے کسی اور موڑ پر "بدن دریدہ" اور "دھوپ" کی نظمیں لکھنی تھیں) پتھر کی زبان کی بیشتر نظموں کی ابتدا مایوسی اور اداسی سے ہے، لیکن تقریباً تمام ہی نظموں میں ایک واضح موڑ پڑتا ہے، جہاں مایوسی کی جگہ ایک ایسی کیفیت لے لیتی ہے جسے اُمید، یقین، اثبات یا ایسے ہی کسی رجحان کا نام تو نہیں دیا جا سکتا لیکن وہ کیفیت ہار مان لینے کی بہرحال نہیں ہے۔"

——— (پتھر کی زبان)

اپنے کلام سے متعلق دوسری وضاحت وہ یہ کرتی ہیں :

"میری آج کی نظموں میں "سیاسی موضوعات" پر حیران ہونے والے اس اولین مجموعے میں "لبے سفر کی منزل" اور "زاد راہ" پڑھ کر جان سکتے ہیں کہ سیاسی اور سماجی موضوعات میری شاعری میں اچانک نہیں در آئے ہیں ان کی جڑیں میری اولین سوچ میں موجود تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہیں"۔

——— (پتھر کی زبان)

فہمیدہ ریاض کی سیاسی شاعری سے ہمیں فی الحال کوئی دلچسپی نہیں، شاعری اگر سیاسی نعروں کی خدمت انجام دینے لگے تو اسے لائقِ اعتنا سمجھنا فن کے ساتھ بے وفائی ہے۔ مقصدیت ایک قابلِ تحسین شے ہے لیکن سیاسی وفاداری اور وابستگی جو کسی خاص جماعت یا تحریک کا اندھا مقلد بنا دے، فن کار کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ فہمیدہ ریاض کی رومانی نظموں میں ایک کشش ہے۔ ہر چند کہ اس میں بصیرت کا عنصر نہیں لیکن پڑھتے وقت ایک مسرت اور لذت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دوشیزہ شاعری کی زبان میں اپنے محبوب کو پیار بھرا خط لکھ رہی ہے ؎

یہ مری سوچ کی ان جان، کنواری لڑکی!
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہے
اپنی مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں چھپی
سر جھکائے ہوئے کترا کے نکل جاتی ہے

(جھجک: پتھر کی زبان)

"پتھر کی زبان" سے فہمیدہ ریاض کی عشقیہ شاعری کی جو شناخت ہوئی تھی وہ "بدن دریدہ" اور "دھوپ" میں برقرار ہیں۔ ہاں پتھر کی زبان میں جو جذبوں کی صداقت تھی سیاست کے سائے نے اسے دھندلا کر دیا ہے۔

چھوٹی وصل و فراق سے میں — انجان ڈگر پر چل رہی ہوں!
کیوں کھوٹ ہے میری زندگی میں — میں اس کا جواب دے رہی ہوں
ہاں میرے خمیر میں کجی تھی — اب خوش ہوں کہ اب بھٹک رہی ہوں
اس گریۂ زار پر نہ جاؤ!
میں دل ہی دل میں ہنس رہی ہوں

سیاسی وفاداری نے ان کے کلام کو احتجاجی نعرہ بنا دیا لیکن وہ اپنی پہچان قائم رکھنے میں کامیاب رہیں۔ خمیر کی کجی برقرار رہی اور ٹیڑھی پسلی سیدھی نہ ہو سکی ؎

پتھر سے وصال مانگتی ہوں — میں آدمیوں سے کٹ گئی ہوں
شاید پاؤں سراغِ اُلفت — مٹھی میں خاک بھر رہی ہوں
وہ خواہش بوسہ بھی نہیں اب — حیرت سے ہونٹ کاٹتی ہوں

جو مجھ میں چھپا میرا گلا گھونٹ رہا ہے
یا وہ کوئی ابلیس ہے یا میرا خدا ہے
جب سر میں نہیں عشق تو چہرے پہ چمک ہے
یہ نخلِ خزاں آئی تو شاداب ہوا ہے

(بدن دریدہ)

فہمیدہ ریاض اپنی تشنہ لب نظموں کی وجہ سے مشہور ہیں تو کشور ناہید اپنی غزلوں کے چھلکتے پیمانے کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں، ہر چند کہ ان کی آزاد نظمیں فنی اعتبار سے قابلِ توجہ اور پرکشش ہیں لیکن ان کی غزلیں نظموں پر حاوی ہیں۔ "عشق سانس دل" کے نام سے ان کی کلیات شائع ہو چکی ہے۔

تشنگی، کرب، اور اُداسی کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ ان کی عشقیہ شاعری نئی نسل کو متاثر کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں تنوع ہے۔ موضوعات کے انتخاب میں ندرت ہے اور پیش کش میں ایک سلیقہ ہے ان کے نظریات سے مکمل اتفاق ممکن نہیں لیکن فن کارانہ صلاحیت کا اعتراف نہ کرنا بھی ظلم ہوگا۔ عہدِ جدید کی عورت صرف اپنے دل کے کھنڈر میں نہیں گھومتی بلکہ دُنیا کے ویرانے کی بھی سیر کرتی ہے۔ کشور ناہید کی نظم "خود احتسابی" کے آخری دو بند ملاحظہ کیجیے:۔

جب آخری بچہ، آخری لاش کے سوکھے پستان
کو چھوڑے گا
جب یتیم بچہ بھی اپنی ماں کا نام لے کر
فراں رواؤں کو کوسے گا
جب انسان، آخری قدم، آخری چاند
پر رکھے گا
میں اپنا سر تکیے سے اٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں

جب آخری بوسہ، زندگی رقم کرے گا
جب نسلیں اپنے خوف کو لذت سمجھ کر
برداشت کرنا سیکھ لیں گی
اور خلا بھی تصنع کی تصویر ہوگا
میں اپنا سر تکیے سے اٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

(خود احتسابی)

"خود کلامی" میں جو صدائے احتجاج ہے وہ عہدِ جدید کی عورت کی صحیح ترجمان ہے کچھ یہی لب و لہجہ "میں کون ہوں" میں ہے ؎

"پہلے تم نے میری شرم و حیا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
میری تمنا، میری وفا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
اب گودوں میں اور ذہنوں میں پھولوں کے کھلنے کا موسم ہے
پوشاکوں پر نیم برہنہ

عورت بیچی، جسے بیچی عورت میرا نام نہیں

(میں کون ہوں ۔ آخری بند)

کشور ناہید کے یہاں نسوانی جذبات و احساسات مخصوص لب و لہجہ میں موجود ہیں، ان کی غزلوں کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ ان میں دوشیزگی اور دلآویز نسائیت پنہاں ہے۔ سوز و گداز، والہانہ پن اور وارفتگی ہر ہر لفظ سے عیاں ہے۔ اشعار کے انتخاب میں یہی مشکل درپیش ہے کہ کسے یاد رکھوں اور کسے بھول جاؤں۔ ہر چند کہ غزلوں میں ایک ہی بات، ایک ہی موضوع تمام اشعار کا محور ہے لیکن نئے نئے انداز اور رنگوں کے مختلف شیڈ کے ساتھ کہ ہر بات نئی اور ہر نقش اچھوتا اور دل کش نظر آتا ہے۔

نہ کوئی ربط بجز خامشی و نفرت کے
ملیں گے اب تو یہی خلاصے محبت کے

دعا سے تزکیۂ نفس تک سفر ہے بہت
لباس بدلو گے کتنے بھی اب ضرورت کے

سنبھل ہی لیں گے، مسلسل تباہ ہوں تو سہی
عذابِ زیست میں رشکِ گناہ ہوں تو سہی

وہ شخص جس کی آنکھ ہے بے رنگ، بے طلب
پہلے پہل ملا تو بہت مہرباں لگا

صلیبِ درد، سخنِ دار، جستجو بھی ہو
نگہ اٹھے تو کوئی میرے روبرو بھی ہو
دلوں کا عقدہ کسی طور تو کھلے ہم پر
تعلقِ غمِ جاناں واقفِ عدو بھی ہو

غموں کی جلتی چتا تھیں جوانیاں اپنی — بزعم خویش تھیں تازہ کہانیاں اپنی
ہر ایک لفظ تھا منسوب جو کسی نے کہا — نہ کام آئیں کبھی بے زبانیاں اپنی

یہ میری ذات تو مجھ میں سما کے رہ نہ سکے — وہ دشت ہوں کہ سمندر چھپا کے رہ نہ سکے

کبھی نظر تو آ، تسکینِ اضطراب تو دے
مری کھلی ہوئی آنکھوں کو کوئی خواب تو دے
بچھڑ کے ملنے میں لذت سہی مگر ناہید
کبھی تو وصلِ مسلسل کا ہی عذاب تو دے

تشنگی اچھی نہیں رکھنا بہت — روزنِ گل سے اسے تکنا بہت
عمر بھر کی بندشیں خواب و خیال — دو قدم بھی ساتھ ہے چلنا بہت
برف کی مانند جینا عمر بھر — ریت کی صورت مگر تپنا بہت

سلگ رہی ہے ان آنکھوں میں دیکھنے کی لگن
ترے فراق کی شدت سے پھنک رہا ہے بدن
یہ شورِ بندِ سلاسل، یہ ذکرِ دار و رسن
بدل سکے نہ کبھی خوگرِ وفا کا چلن
حیا سے سرخ ہوا رنگ تو کھلے گل بھی
دکھا گئی تری صورت حجاب کی چلمن
سنی ہے ایک زمانے کے بعد سرگوشی
مہک اٹھی ہے تمنا، چمک اٹھی دھڑکن

کبھی تو آ مری آنکھوں کی روشنی بن کر — زمینِ خشک کو سیراب کر نمی بن کر
کبھی تو آ تپش جاں گسل ہی دینے کو — کبھی گزر راہی راہوں سے اجنبی بن کر

انھیں یہ ضد کہ ملاقات کا فسوں نہ رہے
وہ انتظار ہے آنکھ میں بھی خوں نہ رہے
سیہ رات کے سینے سے لگ کے بیٹھ رہو
تمھیں بھی حسرتِ دریوزۂ جنوں نہ رہے
پھر ایک بار جمالِ نگارِ شب بکھرے
وہ برہمی ہو کہ پھر حسرتِ سکوں نہ رہے

جس کی تصویر ہے آنکھوں میں حیا کی مانند

پاس آتا ہے مرے موجِ صبا کی مانند
سایہ بن جاتی ہے ہر یاد صدا دینے پر
سنتا ہے یہ دل شہرِ وفا کی مانند
کس طرح کہہ دوں کہ دیکھا ہی نہیں ہے اسکو
پاس ہے میرے کہ وہ نادیدہ خدا کی مانند

جس نے بھی حالِ غمِ دل پوچھا   ہم نے اس کو ہی مسیحا سمجھا

بگڑی بات بنانا مشکل، بگڑی بات بنائے کون ؟
کنجِ تمنا ویرانہ ہے، آکر پھول کھلائے کون
ساگر پار کی خبریں دیکھے ہمسایہ کا پتا نہیں
آج کا انساں عالم فاضل، اس کو اب سمجھائے کون
رات بھی کالی چادر اوڑھے آ پہنچی ہے زینے میں
مہندی لگائے بیٹھی سوچے لٹ ابھی سلجھائے کون

حسرت ہے تجھے سامنے بیٹھے کبھی دیکھوں
میں تجھ سے مخاطب ہوں، ترا حال بھی کبھی پوچھوں
تو اشک ہی بن کے مری آنکھوں میں سما جا
میں آئینہ دیکھوں تو ترا عکس بھی دیکھوں

کشور ناہید کے یہاں الفاظ کی میناکاری اور ترکیبوں کی تراش دل کش ہے۔ لہجے میں گھلاوٹ ہے، تفکر کے ساتھ ساتھ دل سوزی ہے اس لیے ان کی شاعری جنسیہ شاعری ہوتے ہوئے بھی سطحیت سے بلند ہے۔

فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی طرح پروین شاکر بھی اپنی عشقیہ شاعری کے لیے معروف ہیں۔ ان تینوں کے کلام کے مقابلے و موازنہ کی جرأت ہم نہیں کر سکتے، ایک دفتر چاہیے ان کے فسانے کے لیے۔ نئے آہنگ اور نئے روپ میں ان تینوں کی عشقیہ شاعری دراصل روایتی عشقیہ شاعری کی نئی کونپلیں ہیں۔ ان میں ایک تازگی اور اپنے زمانے سے ہم آہنگی موجود ہے۔ ڈاکٹر حامد رضا صدیقی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:

"پروین شاکر محدود عشقیہ شاعری پر قناعت کر بیٹھی ہیں"۔
(خدا بخش جرنل ص ۳۶)

ڈاکٹر بیدار ان کی توانا شاعری سے اچھی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ساقی فاروقی کا بھی ان کے بارے میں قریب قریب یہی خیال ہے کہ اگر یہ رومانیت سے اظہاریت کی طرف سفر جاری رکھ سکیں تو ان میں بہت آگے جانے کے بہت امکانات ہیں۔ اسی طرح کے حوصلہ افزا کلمات محمد علی صدیقی بھی فرماتے ہیں کہ:

"پروین شاکر کم عمری ہی میں رجحان ساز شاعری کا روپ دھارتی نظر آرہی ہیں"۔

احمد ندیم قاسمی بھی انھیں گلستان فن کی "ایک نئی کلی" سے تعبیر فرماتے ہیں اور انھیں پروین کی شاعری میں آواز کے زیر و بم میں روحِ عصر کی گونج صاف سنائی دیتی ہے ان کے خیال میں "اردو شاعری میں ہر لحاظ سے یہ ایک نئی آواز ہے۔ منفرد، جمیل اور مستقبل گیر آواز !" — ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ان کی شاعری کے لیے وہی بلیغ جملہ عنایت فرماتے ہیں جو حضرت عمرؓ نے امراء القیس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "وہ اندھے مضامین کو بینا بنا دیتا ہے" —

امجد اسلام امجد کو یہ شکایت ہے کہ "اردو ادب میں سچے نسائی محسوسات اور جذبوں کی شاعری کم ہے" لیکن انھیں پروین شاکر کی شاعری میں ایک ایسی لڑکی کی آواز سنائی دیتی ہے جو خوبصورت پھول چننا بھی جانتی ہے اور انھیں گلدان میں سجانا بھی" —

"خوشبو"۔ "صد برگ" اور "خود کلامی" تین شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور دھوم مچا چکے ہیں۔ "خوشبو" کے پیش لفظ میں پروین شاکر نے لکھا تھا:

"محبت جب تقاضائے جسم و جاں سے ماورا ہو جائے تو الہام بن جاتی ہے۔ حسن جب لطافت کی آخری حدوں کو چھو لے تو خوشبو بن جاتا ہے۔ خوشبو حسن کی تکمیل ہے"۔

پروین شاکر کی شاعری میں بھینی بھینی خوشبو ضرور ہے لیکن کہیں کہیں ایسی تلخی اور کڑواہٹ ہے کہ منہ کا مزا خراب ہو جاتا ہے۔ پرانی قدروں سے بغاوت اور نئی روشنی کے اندھیرے نے اردو کی ان تینوں شاعرات (فہمیدہ، کشور، پروین) کو ایک حد پر لاکر کھڑا کر دیا ہے، جہاں ان کی شاعری قدیم ایام جاہلیت کی شاعری

سے قریب تر پہنچ کر فن کی بلندی کو چھونا فطری ہے وہیں جدید جاہلیت کے باد سموم سے متاثر ہو کر ان کے احساسات کی کلیاں مرجھائی مرجھائی سی لگتی ہیں۔
شکوہ اور احتجاج جب عامیانہ خلش بن جائے تو اس میں کوئی نیاپن نہیں رہ جاتا۔ تاہم ان کی رومانی نظموں میں جو نسوانی جذبات ہیں وہ قابلِ قدر ہیں۔ "وصال"، "ہمنی مون" اور "سپردگی" اور اسی طرح کی بہت سی نظمیں ان کی نسائیت کا عکس ہیں۔

خمارِ لذت سے ایک پل کو
جو آنکھیں چونکیں،
تو ہم خوابیدہ سرخوشی میں
غرورِ تارا جگی نے سوچا
خدائے برتر کے قہر سے
آدم اور حوا
بہشت سے جب بھی نکلے ہوں گے
سپردگی کی اس حسیں انتہا پہ ہوں گے
اسی طرح
ہم بدن ہم خواب اور ہم تمنا

(وصال، صد برگ)

نظیر صدیقی کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ:-
"پروین شاکر کی شاعری لڑکی کی ترجمان ہے۔ کشور ناہید کی شاعری عورت کی اور فہمیدہ ریاض کی شاعری جدید عورت کی۔ ان تینوں میں جہاں تک شعری تکمیل (onfection) کا تعلق ہے، پروین شاکر اپنی ہم عصر شاعرات پر فوقیت لے گئی ہیں۔"

(جدید اردو غزل)

پروین شاکر کے یہاں سادگی کے ساتھ پرکاری ہے اور یہی ان کے کلام کی امتیازی خوبی ہے۔

کھلی آنکھوں میں سپنا جھانکتا ہے — وہ سویا ہے تو کچھ کچھ جاگتا ہے
تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں — مرا تن مور بن کر ناچتا ہے
میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ — مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

کسی کے دھیان میں ڈوبا ہوا دل
بہانے سے مجھے بھی ٹالتا ہے

چاند بھی میری کروٹوں کا گواہ — میرے بستر کی ہر شکن کی طرح
بارہا تیرا انتظار کیا — اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہوئی جیسے دلہن کی خوشبو
پیرہن میرا مگر اس کے بدن کی خوشبو
اس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے — موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سراغ ہے

قریۂ جاں میں کوئی پھول کھلانے آئے — وہ مرے دل پہ نیا زخم لگانے آئے

عکسِ خوشبو ہوں، بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی
اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

ہتھیلیوں کی دعا پھول لے کے آئی ہو
کبھی تو رنگ مرے ہاتھ کا حنائی ہو
کوئی تو ہو جو مرے تن کو روشنی بھیجے
کسی کا پیار ہوا میرے نام لائی ہو

وہ رت بھی آئی کہ میں پھول کی سہیلی ہوئی
مہک میں چمپا کلی، روپ میں چنبیلی ہوئی

وہ چاندبن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا!
میں اس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی ہوں

بعد مدت اُسے دیکھا، لوگو! وہ ذرا بھی نہیں بدلا، لوگو
خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی اس کے چہرے پہ لکھا تھا، لوگو
اس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں رات بھر وہ بھی نہ سویا، لوگو

ہمیں خبر ہے، ہوا کا مزاج رکھتے ہو!
مگر یہ کیا، کہ ذرا دیر کو رُکے بھی نہیں

اپنی رُسوائی، ترے نام کا چرچا دیکھوں
اک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں
ایک اک کر کے مجھے چھوڑ گئیں سب سکھیاں
آج میں خود کو تری یاد میں تنہا دیکھوں
تو مرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں
مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اس رُت میں مہکتا دیکھوں
پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنکھڑی پنکھڑی ان ہونٹوں کا سایہ دیکھوں

'آہستہ' کی ردیف میں لکھی ہوئی غزل کے یہ اشعار ؎

جانتی ہوں کہ بچھڑنا تری مجبوری ہے
پر مری جان! ملے مجھ کو سزا آہستہ
میری چاہت میں بھی اب سوچ کا رنگ آنے لگا
اور ترا پیار بھی شدت میں ہوا آہستہ
رات جب پھول کے رُخسار پہ دھیرے سے جھکی
چاند نے جھک کے کہا، اور ذرا آہستہ"

پروین کی تمام غزلوں میں شگفتگی، تازگی، سادگی اور ایک موسیقیت موجود ہے۔ پڑھنے والا محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن عشقیہ جذبات کا صنفِ لطیف کی طرف ایسا بے باکانہ اظہار ہمارے معاشرے پر کیا اثر اور بے حجابی اور مادہ پرستی کے عہد میں کس قسم کے رجحانات کو فروغ د اس کی طرف ہمارے اُردو کے ناقدوں کی نظر نہیں جا سکی ہے۔ انھ اس کی پروا بھی نہیں کہ موجودہ نسل کا ادبی سرمایہ آئندہ نسل کے لیے ہوگا یا ایک قسم کا بوجھ جنھیں اٹھاتے ہوئے ان کی کمر دوہری ہو جائے داغ دہلوی کی غزلیں زبان اور فن کی خوبیوں کی وجہ سے اپنی ایک اہمیت رکھتی ہیں لیکن اپنے مضامین کے اعتبار سے اکثر طوائفوں کے مجرے کے لیے کارآمد ثابت ہوئیں۔ اندیشہ ہے کہ ان شاعرات کی غزلیں اسی مصرف کی نہ بن جائیں۔ شعر و سخن اور علم و ادب پر کسی کی اجارہ دار نہ پہلے تھی نہ اب ہے لیکن اسے تہذیب و شائستگی کے ساتھ اپنانا فن کو قابلِ احترام بنانا فن کار کی بنیادی ذمّہ داری ہے۔

جس طرح فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر عصرِ حاضر کی پاک شاعرات کی نمائندگی کرتی ہیں اسی طرح ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور مسعودہ موجودہ ہندستانی شاعرات کی نمائندہ ہیں۔ جدید اُردو غزل کے دامن کو جن شاعرا نے گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا ہے ان میں یہ تینوں نام معتبر ہیں۔ یہ تینوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور وسیع مشاہدات اور خوش گوار تجربات کی حامل ہیں ساجدہ زیدی کا پہلا شعری مجموعہ "جوئے نغمہ" ۱۹۶۲ء میں شائع ہ دوسرا مجموعہ "آتشِ سیال" ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک کی شاعری پر مشت ہے۔ ساجدہ زیدی کے نظریات سے قطع نظر ان کی شاعری میں لطیف خیالات علامتوں کی دبیز چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان کی نظموں میں نس جذبات ہیں لیکن ان کا اظہار بے حجابانہ نہیں ہے۔ ان کی نظمیں زمانے وسیع تجربات سمیٹے ہوئے ہیں۔ چراغِ فکر کی لو اس قدر تیز ہے کہ اسے شع کی زبان یا آتشِ سیال کہنا زیب دیتا ہے۔

مرے اطرافِ تنہائی کی
یخ بستہ فضائیں سانس لیتی ہیں
مرے سینے میں وہ آتشِ سیال فروزاں ہے
جو ہر زندہ حقیقت کا مقدر
یہ وہ سیال آتش ہے
کہ جس کے بحر بے ساحل میں

سورج ڈوب جاتے ہیں
زمانے جذب ہو جاتے ہیں
اور لمحوں کی زنجیر مسلسل ٹوٹ جاتی ہے
میں اس آتش کی خالق ہوں
مرے احساس کی بھٹی
مرے جذبوں کے آتش داں
مرے افکار کے شعلوں نے
اس آتش کو ڈھالا ہے

(آتشِ سیال)

ذات اور داخلی کرب کا احساس جدید شاعری کی امتیازی خصوصیات اور اس لحاظ سے ساجدہ زیدی جدید شاعری کی کامیاب نمائندگی کرتی ہیں جیسے کے ساتھ ہی بیرونی دنیا سے ان کی آگہی تنقیدی شعور کے دوش بدوش رہی ہے۔ مختلف قسم کے نظریات و عقائد نے انھیں متاثر ہے۔ تجربوں اور مشاہدوں نے ان کے حساس دل و دماغ کو مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کی نظموں میں مضامین اور موضوعات کا تنوع اس پر گواہ ہے ؎

گھنی ہے شام، سورج ڈھل چکا ہے
آبلہ پائی کو نیند آنے لگی ہے
کتابیں، دوست، ساتھی
رشتے، ناتے، گفتگو، بحثیں
شناسا
بارِ علم و فن
متاعِ آگہی
زخمِ دل و جاں
کوئی دلکش نظر
اک عرصۂ ہستی کا حال
یہ سب سائے ہیں
سائے روشنی میں ساتھ رہتے ہیں
اندھیرے پھیل جاتے ہیں
تو سائے
ایک مبہم سے خلا میں ڈوب جاتے ہیں۔

(شام، آتشِ سیال)

زاہدہ زیدی کا پہلا شعری مجموعہ "زہرِ حیات" ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا، اور دوسرا شعری مجموعہ "دھرتی کا لمس" ۱۹۷۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ زبان، علم اور فن تینوں سے وسیع واقفیت کسی فن کار کو جس قدر باوزن بنا سکتی ہے اس نے زاہدہ زیدی کو اس قدر معتبر اور باوزن بنا دیا ہے۔ یہاں بھی بات کہنے کا سلیقہ ہے۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں، جیسی کیفیت ہے۔ دل کی دھڑکنیں یہاں بھی ہیں مگر اس کی صدائیں دھیمی ہیں۔ عورت یہاں بھی ہے لیکن پھن ریکھا کے اندر ہی ہے۔

نظموں کی طرح زاہدہ زیدی کی غزلیں بھی جدید شاعری کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ جدید شعراء کی بھیڑ میں زاہدہ زیدی اپنے مخصوص لب و لہجہ کی وجہ سے پہچان لی جاتی ہیں ؎

رازِ غم کور نگاہوں سے چھپایا ہوتا
سر پہ شاید کسی تنویر کا سایا ہوتا
ریگ زاروں میں جلاتے رہے نادیدہ چراغ
گھر کے آنگن میں دیا کوئی جلایا ہوتا

ڈبو کے خون میں آنچل بہار آئی ہے	صبا تو آئی مگر سوگوار آئی ہے
بہار وادیِ گُل میں پکار آئی ہے	کلی ہی چونکی نہ خوابیدہ نکہتیں جاگیں
کہاں کہاں سے نظر بے قرار آئی ہے	نہ موجِ رنگ پہ ٹھہری نہ آتشِ گُل پر

ہمارا عہدِ محبت بھی استوار نہیں	وہ وقفِ ناز نہیں، میں وفا شعار نہیں
فضا میں گونج نہیں راہ میں غبار نہیں	ابھی تو قافلہ کوئی یہاں سے گزرا تھا

عجیب سانحہ ہے مرگِ دل کہ محفل میں
کوئی اُداس نہیں، کوئی سوگوار نہیں

مسعودہ حیات کا شعری مجموعہ "بوئے سمن" ۱۹۸۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ مسعودہ حیات نے نظم نگاری کے بجائے اپنے لطیف جذبات کے اظہار کے لیے غزل کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اختر الایمان کی یہ رائے درست ہے کہ ان کے کلام

ادا ان کی شاعری کی بنیاد جمالیاتی قدریں اور بالیدہ جمالیاتی ذوق ہے"۔
سادگی، بے ساختگی، شائستگی اور متانت سے ان کے کلام ادا ان کے لہجہ
کی شناخت ہوتی ہے ۔

دل لے گیا نہ لغزشِ پا لے گئی مجھے
عقل میں صرف میری ادا لے گئی مجھے
وہ تو جفا کی راہ میں حد سے گزر گیا
اس کی گلی میں پھر بھی دعا لے گئی مجھے

وفا کا رنگ اور حسنِ بتاں میں
بڑی تاثیر ہے دل کی زباں میں
الگ سمجھیں تجھے ہم خود سے کیونکر
تری تو مہک ہے جسم و جاں میں
حیات اب دل کو پتھر ہی بنا لو
اگر جینا ہے اس بزمِ جہاں میں

دل و نگاہ میں اک روشنی سی لگتی ہے
تمھاری یاد سے وابستگی سی لگتی ہے
یہ کیا ستم ہے مہکتی ہوئی بہاروں میں
ہر ایک چہرے پہ پژمردگی سی لگتی ہے
ہم اپنے گھر میں بھی ہیں اب مسافروں کی طرح
ہر ایک چیز یہاں اجنبی سی لگتی ہے

اشک اور آہ کو گلشن کی فضا کہتے ہیں !
راس آئے گی یہی آب و ہوا کہتے ہیں
یوں بھی ہوتی ہے کبھی دستِ طلب کی زینت
خونِ دل ہے جسے ہم رنگِ حنا کہتے ہیں
بے سبب اس نے کیا ترکِ تعلق لیکن
سادگی دیکھئے، ہم اپنی خطا کہتے ہیں
وقت کے ساتھ روش چارہ گروں نے بدلی
زہر کا جام پلاتے ہیں دوا کہتے ہیں
اس کا کیا ذکر کہ دنیا اسے کیا کہتی ہے
ہم اسے پیکرِ اخلاص و وفا کہتے ہیں

ستودہ حیات بنیادی طور پر غزل گو ہیں لیکن ان کی نظم "مجھ سے ملنا ہے تو آدابِ محبت سیکھو" ایک مشرقی عورت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ جدید تعلیم آزادی اور معاشرتی انقلاب نے عورت کو اپنی شخصیت اور اپنی ذات کے اظہار کے مواقع فراہم کیے ہیں اور ان مواقع سے ہندو پاک دونوں جگہ کی مستورات نے فائدہ اٹھایا ہے، لیکن یہ حیرت انگیز امر ہے کہ ہندوستان کی شاعرات نے باوجود جدیدیت اور ترقی پسندانہ نظریات سے قدرے متاثر ہونے کے، حیاداری کا ثبوت فراہم کیا، اور اپنی بات چلمن کے پیچھے سے شرماکر، تہذیب و شائستگی کے ساتھ پیش کی ہے اور اپنے افکار و جذبات پر استعارے اور علامات کی ردا ڈالے رکھی ہے — یہ مشرق کا ورثہ ہے یہی وہ جمالیاتی اقدار ہیں جن کی قدر و قیمت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ پاکستان کی شاعرات اپنے احتجاجی انداز اور بے باکانہ اظہار کی وجہ سے صنفِ مخالف میں ہنگامہ آرائی کا سبب تو ضرور ہیں لیکن اپنے اس نئے رجحان کی وجہ سے موجودہ اور آئندہ نسل کے لیے ایک مسئلہ بن گئی ہیں۔ ہندستانی شاعرات کا یہ فطری نشو و نما ہے جبکہ پاکستانی مستورات فطرت سے بغاوت کرتی نظر آتی ہیں اس کی واحد وجہ پاکستانی معاشرہ کا وہ انتشار ہے جس سے وہ ماضی قریب میں دوچار رہا ہے۔

لیکن اب رفتہ رفتہ دونوں جگہ کی فضا بدل رہی ہے۔ ترقی پسند اور جدیدیت سے اکتائے ہوئے لوگ اب صحت مندانہ اقدار کی تلاش میں تعمیری ادب کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ پچھلے دو سال میں پاکستان میں تقریباً ڈیڑھ سو نعتیہ کلام کے مجموعوں کا شائع ہونا مشرق کی بازیافت کا اشارہ ہے۔

پاکستان میں صائمہ خیری کے مجموعۂ کلام "میری نظمیں میرے گیت" اور ہندوستان میں رخسانہ نکہت کرم ہانی کے مجموعہ کلام "نالہ نیم شبی" شاعری کے نئے رجحان کا پتہ دیتے ہیں۔ بقول ادا جعفری — "صائمہ خیری کی شاعری میں شدتِ احساس کی امنگ اور مشرقی تہذیب کی مانوس خوشبو رچی بسی ملتی ہے"۔

سلام اس پر
تمام نوعِ بشر کے حق میں جو اک دعا ہے
سلام اس پر
جو اک عطا ہے
خدائے برتر کی نعمتوں میں
ہر ایک نعمت سے جو سوا ہے
سلام اس پر جو مسکرا کے
بتا رہا ہے حیات کیا ہے

سلام یہ کائنات کیا ہے
کمال ہے جو وہ ذات کیا ہے
سلام اُس پر
جو قلب و جاں کی ہر اک اُلجھن مٹا رہا ہے
جو ظلمتوں کو شکست دے کر
نفس نفس میں سما رہا ہے
سلام اُس پر
جو نورِ حق ہے
سلام اس پر
جو سب کا پیارا ہے مصطفےٰ ہے

(میری نظمیں میرے گیت)

ہندستان میں رخسانہ نکہت اُمِّ ہانی نے اپنے " نالۂ نیم شبی "
سے بے حسی اور جمود کو توڑا ہے۔ صحت مند رجحان اور اعلیٰ اقدار کے ساتھ
شاعرات کی صف میں نئی نئی وارد ہوئی ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا
کہنا درست ہے کہ:

" نالۂ نیم شبی " رخسانہ نکہت لاری کا مجموعہ کلام ہے جو
حمد، نعت اور ملّی منظومات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کو
پڑھنے کے بعد جو پہلا تاثر قائم ہوتا ہے، یہ ہے کہ یہ شاعری
دل کی آواز ہے اور اس لیے سچی اور کھری شاعری ہے
تصنع اور بناوٹ سے پاک "۔

ن تبریز خاں کے لفظوں میں "ایک دردمند مسلم خاتون کا " نالۂ نیم شبی "
اندر بڑا سوز و ساز اور قوتِ تاثیر و تسخیر رکھتا ہے "۔

ڈاکٹر صبیحہ انور کے اس تبصرہ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ: " رخسانہ
ن کے یہاں عشقِ الٰہی معرفتِ ذات ہی نہیں بلکہ انسان اور زندگی کے
ان کا ایک ذریعہ بن کر اُبھرا ہے اور انسانیت کے دُکھ درد اور غم کو
بانٹنے کی ترغیب بن کر سامنے آیا ہے "۔

رخسانہ لاری اُمِّ ہانی کا مجموعہ کلام " نالۂ نیم شبی " ان کے روشن شاعرانہ
مستقبل کا نقیب ہے۔

وہ اک انساں بلندی پر کھڑا
ہم کو بلاتا ہے
وہ تم کو بھی بلاتا ہے
وہ سب کو ہی بلاتا ہے
اُتر کر پھر ہماری ہی زمیں پر پاس آتا ہے
جلتی دھوپ ہے
پتھر کی بارش
خون کا دریا
مگر وہ مسکراتا ہے
مگر وہ گنگناتا ہے
بہت ہی مدھر نغمہ
سحر آگیں سناتا ہے۔

———— (نالۂ نیم شبی)

اُمِّ ہانی کے سفرنامہ حج " تجلیاتِ حرمین " میں بھی حمد و نعت شامل ہے۔

چوموں کعبے کی دہلیز آنکھوں سے میں
اے خدا تیرے گھر کا بیاں کیا کروں
رفعتِ شان اس کی کہاں تک کروں
اس کو دیکھیں تو آنکھوں کو ٹھنڈک ملے
اس کو سوچیں تو ہے راحتِ قلب و جاں
عظمتوں کے نشاں اس کے دیوار و در
ہے جلال و جمال اس کے ہر سنگ میں
بخششیں رحمتیں ہر نظارے میں ہیں
لمحہ لمحہ نئی شان سے جلوہ گر
چشمۂ فیض ہر سُو ہے اسی کا رواں
برکتوں کا ہے منبع یہ کعبہ تیرا
نور کی پھوٹتی ہیں شعاعیں یہاں
انجم و مہر و مہ کی ضیا ماند ہے
اے خدا تجھ کو سجدہ کروں روز و شب
ذہن میں نور تیرے تخیل کا ہو
عجز سے گڑگڑاؤں میں روؤں کبھی

(جاری)

ن خاں شوق

۰ا۲۲۰، ۳۰-۱۱ ملے پلی

باد

وچن!

پنے کہا تھا

ں ملکوں محبت سرا ایسی ہو

ہری کو اس کی زندگی کا پھل ملے

ا کمتر نہ ہو اور برتری کے پھول مہکیں

غ آرزو کی لَو بڑھے

کا دیپک مہرِ عالم تاب بن کر جگمگائے

ی رقصاں ہو

ں کا منظر ہو

ے ہندوستاں کا یہ مقدر ہو

ں کا راج گھر گھر ہو

والو! بتاؤ

نے باپو کا وچن کتنا کیا پورا؟!

○○

بشیر فاروقی

دیوالی

عجب ادا سے گھروں کی چھتوں منڈیروں پر
حسین شام نے کچھ روشنی کے گیت لکھے
عظیم مٹی سے ترشی ہوئی پیالی میں
چمکتی لَو نے نئی زندگی کے گیت لکھے

دیے جلے تو فضا جگمگائی ہے کیا کیا
نصیب جاگ اٹھے سُرمئی اُجالوں کے
رُوپہلے چاند نے دُلہن بنا دیا شب کو
سجا کے سُرمئی آنچل میں پھول تاروں کے

بہارِ حُسن لیے آئی ہے یہ ساعتِ نُور
مچل رہا ہے اُجالا ہوا کی باہوں میں
رفاقتوں کی مہک ہے محبّتوں کی چمک
دلوں کی جلوہ گہہِ ناز میں، نگاہوں میں

گلاب کھِل سے گئے ریشمی اُجالوں کے
جِدھر اُٹھاؤ نظر جگمگا رہے ہیں چراغ
لبوں پہ موجِ تبسم، دلوں میں رقصِ بہار
مہک رہی ہے فضا مسکرا رہے ہیں چراغ

○○

دیا شنکر سکسینہ بحر موجی
چمن لال مارکیٹ. گھنٹہ گھر
شاہجہاں پور

اردو زبان اور شاعری

اردو زبان کی ابتدا کب ہوئی، کیسے وجود میں آئی اور کس طرح ترقی کی۔ ان سوالات کے جواب محققین کی تصانیف سے ملتے ہیں۔ کوئی اس کو دکن سے منسوب کرتا ہے کوئی دہلی سے۔

پروفیسر محی الدین قادری زور کی تصنیف "مخطوطاتِ دکن" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ دوسرے محققین اس کی ابتدا کا سلسلہ امیر خسرو دہلوی کی تصنیف "خالق باری" کو بتاتے ہیں۔ "خالق باری" ایک قسم کی منظوم لغت ہے جس میں فارسی الفاظ کا ترجمہ بزبانِ ہندی ہے۔ اسے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے تصنیف کیا گیا تھا۔ اس کے دو شعر بطور نمونہ یہ ہیں:۔

خالق باری سرجن ہار واحد ایک بدا کرتار
رسول پیمبر جان بشٹ
یار دوست بولی جا اِشٹ

امیر خسرو کے سنِ ولادت میں اختلاف ہے۔ کوئی ۱۲۵۳ء کوئی ۱۲۵۵ء بتاتا ہے۔ سالِ رحلت بالاتفاق ستمبر ۱۳۲۵ء ہے۔ بہرحال اس کی صحیح طور سے تحقیق کی جائے تو ہم کو مغل حکومت کی تاریخ سے مدد لینا پڑے گی اور تزکِ بابری سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے دورِ حکومت کا نقشہ سامنے رکھنا پڑے گا۔ محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ اور تیمور لنگ کی ہندستان پر یورش، بابر کی ہندستان پر فوج کشی، ان سب پر غور کرنا ہوگا۔ ان حملوں میں جو فوج ہندستان آئی، اس نے اپنی زبان میں گفتگو کی ہوگی اور ہندستانیوں نے اپنی زبان میں۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہ گفتگو ایک دوسرے کی سمجھ میں کیسے آئی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ان زبانوں کا کوئی مترجم افہام و تفہیم کا فرض ادا کرتا رہا ہوگا، اور جب یہ فوجی ہندستان کے باشندوں میں گھل مل گئے ہوں گے تو ایک ایسی زبان کی بنیاد پڑی ہوگی جس کو فریقین سمجھ سکیں۔ محمد بن قاسم زمانۂ حجاج میں حملہ آور ہوا تھا اس کی اور اس کی فوج کی زبان عربی تھی، بقیہ حملہ آوروں کی زبان ترکی فارسی تھی۔ ہندستان کی زبان سنسکرت آمیز ہندی تھی۔ ان تینوں زبانوں کے امتزاج سے جو زبان بولی گئی ہوگی، پہلے اس کا نام رکھنے میں دشواری پیش آئی ہوگی۔ کیونکہ یہ زبان لشکریوں کی زبان تھی اس لیے اس کا نام اردو پڑ گیا۔ اردو ترکی لفظ ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ یہی لشکری زبان ترقی کر کے ریختہ اور پھر اردوئے معلّٰی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اردو کے ساتھ معلّٰی کا لفظ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں پڑا۔ معلّٰی کے معنی ہیں عالی، عظیم اور بڑا۔

اردو زبان کا پہلا شاعر کون تھا، یا پہلا نثر نگار کون تھا، یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ کوئی خسرو کو اردو کا پہلا شاعر قرار دیتا ہے، کوئی ولی دکنی کو اسی طرح نثر نگاری میں مُلّا وجہی کو ___ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات سے پہلے جو زبان بولی جاتی تھی وہ اردو کی غیر ترقی یافتہ صورت تھی۔ ولی دکنی کے کلام میں اکثر شعر ایسے ملتے ہیں جو آج کی زبان معلوم ہوتے ہیں مثلاً:

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا



وزیر اعلا اتر پردیش
شری ویر بہادر سنگھ
۲؍اکتوبر ۱۹۸۷ء کو
گاندھی جینتی
کے موقع پر
جی۔ پی۔ او۔ پارک
لکھنؤ میں
مہاتما گاندھی کے
مجسّمے کی
گُل پوشی کے بعد
انھیں
خراجِ عقیدت
پیش کرتے ہوئے



وزیر اعلا شر
ویر بہادر سنگ
آنجہانی وزیر اعظ
شریمتی اندرا گاند
کے یوم شہادت
کے موقع پر
میں منعقدہ ایک
جلسے میں اندرا
کی تصویر کی گل
کرتے ہوئے



وزیراعلا شری ویر بہادر سنگھ لکھنؤ میں ۲۷ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو بہار کے سابق وزیراعلا آنجہانی شری کرشن سنہا کی صد سالہ یوم پیدائش تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے۔



سلیم شری
سبط رضی
زیرِ شتہ کو
فیض آباد کے
مع سیبرا میں
بر پرشاد دیہی
ی اسکول میں
ہانی شری
ے رام یادو
کے موقع پر
رہ جلسہ کو
سکرتے ہوئے

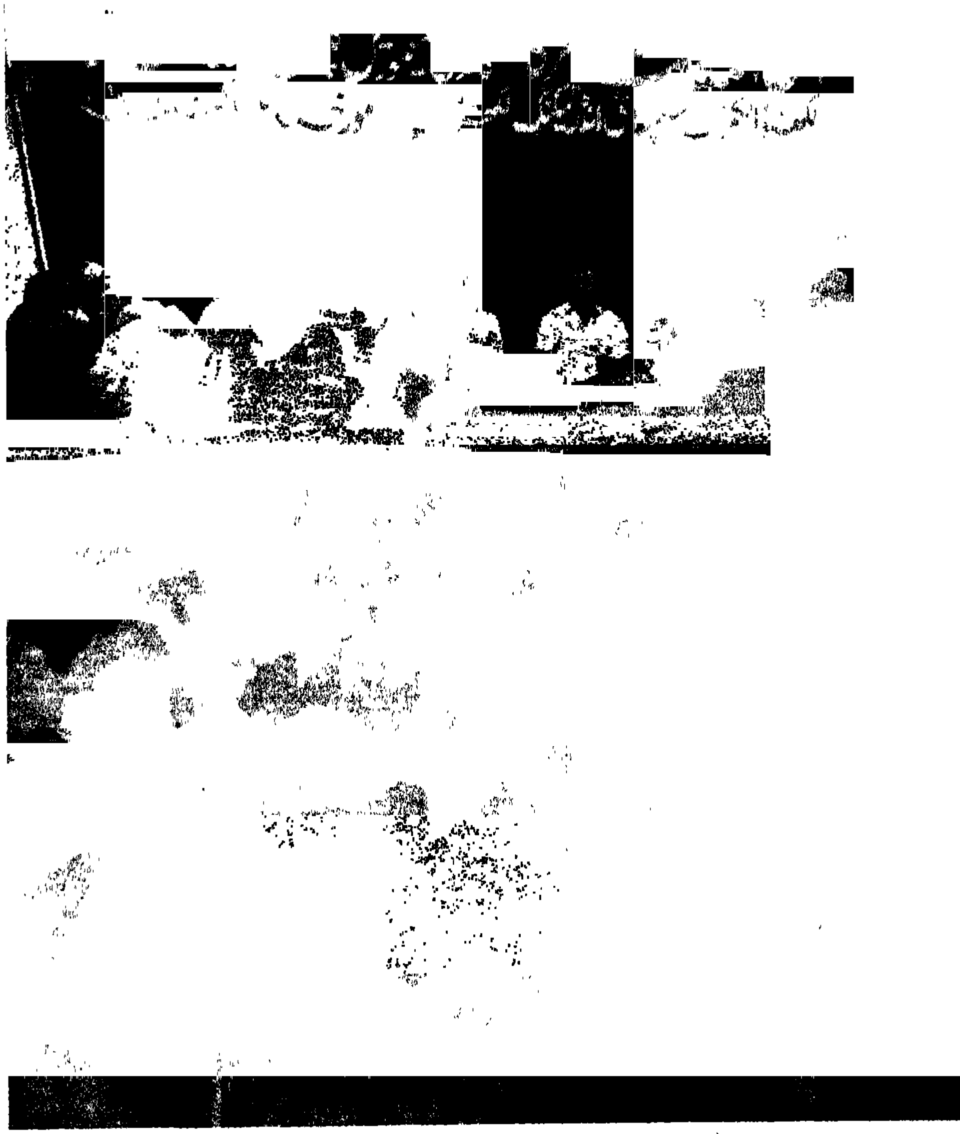


وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ ۱۴؍اکتوبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں صلاح کار ریاستی سماجی بہبود کے نو تشکیل شدہ ریاستی بورڈ کے پہلے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے۔



گذشتہ دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین گورکھپور کی جانب سے ہفتہ وار "اشتراک" کے دفتر میں قومی یک جہتی ہفتہ منایا گیا، یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں پورنیما مجبیں ایم، کوٹھیاوی راہی، نفیس غازی پوری، عارف عباسی اعظمی، اور نسیم ساماتی نظر آ رہے ہیں

گاندھی میموریل کلچرل سوسائٹی کی جانب سے لکھنؤ میں منعقدہ کل ہند مشاعرے کا ایک منظر





اردو تعلیمی بورڈ کی جانب سے سہارن پور میں منعقدہ یوم سرسید کے جلسہ میں پدم شری حکیم سیف الدین حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے ان کے دائیں جانب نظر آرہے ہیں عثمان الحق صدیقی ایڈیٹر انڈین میسیج، راؤ مختار علی خاں اور ڈاکٹر [illegible]

ہر زباں پر ہے مثلِ شانہ مدام
ذکر اُس زلف کی درازی کا

لے تو لی سرو قد کو دیکھوں گا
وقت آیا ہے سرفرازی کا

ان اشعار پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں کہے گئے ہیں۔ کبھو، کسو، آوے، آئے ہے، آئیاں، جائیاں، جائے ہے، تک وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ولی سے لے کر میر و غالب تک استعمال ہوتے آئے ہیں۔ میر نے آئیاں، جائیاں، کہا ہے ؎

یار وعدے کی راتیں آئیاں
عاشقوں نے صبح کر دکھلائیاں

غالب نے آئیاں، جائیاں، نہیں کہا ہے۔ آئے ہے، جائے ہے، کہا ہے۔ اُردو کی تعمیر و شکست و ریخت کا عمل میر کے زمانے سے شروع ہوا۔ میر اور ان کے معاصر سودا نیز دیگر شعرا نے زبان کو فصیح الفاظ سے آراستہ کیا۔ غالب، ذوق، مومن، آتش، ناسخ اور ان کے معاصرین نے اُردو زبان کو صاف، شستہ، شیریں اور اثر آفریں بنانے میں پورا پورا حصہ لیا یہ زبان فصاحت و بلاغت ہی نہیں تہذیب اور اخلاق بھی سکھاتی ہے۔ شیریں گفتاری کے ساتھ نشست و برخاست کے طریقے اور آداب محفل بھی بتاتی ہے۔

جس کام کا آغاز میر نے کیا تھا، جس تہذیب کی جانب قدم بڑھائے تھے وہ مشاعرے کی شکل میں رونما ہوئی۔ حالی، چکبست، اقبال، اصغر حسرت، فانی، جگر، نسیم و فراق تک پہنچ کر یہ قدم برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔

زبان اس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اس کے پرستار زندہ رہتے ہیں۔ ان پرستاروں کی کمی بیشی کا زبان پر اس وقت تک اثر نہیں پڑتا جب تک وہ دلوں سے نہ نکل جائے۔ اُردو زبان نے ہمیں کیا دیا اگر ہم انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو ہمارا سر اس کے بار احساں سے جھک جاتا ہے۔ وہ جب تغزل کی طرف مائل ہوئی تو میر نے کہا ؎

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

سودا نے کہا ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

گُل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی!

غالب نے فرمایا ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ذوق نے کہا ؎

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات؛
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مومن کی زبان پر آیا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کرلے
ہم تو کل خواب عدم میں شبِ ہجراں ہولیے

آتش نے تعلیم دی کہ ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

حسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

ناسخ نے کہا ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں　　ہائے اب کیا کروں کہاں جاؤں

زندگی زندہ دلی کا نام ہے　　مُردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

اصغر ترانہ سنج ہوئے ؎

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے
لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

فانی نے ارشاد کیا ؎

اُٹھ اے نگاہِ شوق اُٹھ متاعِ جاں لیے ہوئے
وہ دامنِ نگاہ میں ہیں بجلیاں لیے ہوئے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دَیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میّت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

غالب کے بعد جس نے آفاقی شاعری کی طرف رُخ کیا وہ علامہ اقبال کی ذات ہے۔ ان کی شاعری کے دو حصے ہیں۔ ایک جو انھوں نے اسلامی فلسفہ کے زیر اثر پیش کیا، دوسرا وہ حصہ جو دُنیا بھر کے لیے ہے۔ یہ عظیم مفکر، پاکیزہ خیال شاعر، ژرف بین و نکتہ شناس فلسفی عجیب دماغ لے کر آیا تھا، کہتا ہے ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اس کا فلسفۂ خودی ایسی تعلیم ہے جو انسان کو اپنی عظمت سے آشنا کرتی ہے اس کی خودی غرور و نخوت پر نہیں بلکہ ذاتِ الٰہی سے انتہائی محبت پر مبنی ہے جس کی وضاحت اس نے یوں کی ہے ؎

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں

یہی خودی جب قربِ خداوندی کے مقام پر پہونچتی ہے تو مرکزِ رحمت و انعام بن جاتی ہے۔ اس کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

پھر اک راز بتایا ہے ؎

تری دُعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری!
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

اُردو شاعری کے بعد تمام زبانوں کی شاعری کا مطالعہ کر جائیے، یہ تعلیم آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔ اقبال کے بعد جوش ملیح آبادی کی یاد آجاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جوش اختراعِ تراکیب و الفاظ کے بادشاہ ہیں، یہی ان کی عظمت کے لیے کیا کم ہے۔ جوش کے ساتھ فراق کا ذکر ناگزیر ہے۔ انھوں نے اُردو ادب میں اپنی خداداد صلاحیت کے صفِ اوّل

(باقی صہ ۳۹ پر)

غزلیں

ظفر گورکھپوری
۶/۴۳ رایت نیو میونسپل کالونی
دیونار ۔ بمبئی ۔ ۴۰۰۰۴۳

میں آگ تو دبا لوں، دلِ ناتواں ضرور
سلگے گی کوئی شے تو اُٹھے گا دھواں ضرور

کانٹوں کے ہونٹ اتنے ملائم نہ تھے کبھی
پیوست ہوں گے میرے لبوں کے نشاں ضرور

میں اپنی دھوپ سے بھی گیا اِس فریب میں
دیوار ہے تو چھاؤں بھی ہوگی وہاں ضرور

آیا نہ رات دل کے دھڑکنے کا اعتبار
ہاں اُن کی آہٹوں کا ہوا تھا گماں ضرور

پتھر کی چھت بھی توڑ کے سیلاب لے گیا
اب دیکھ کے ہنسے گا مجھے آسماں ضرور

میں بھی بھلا چکا ہوں، انھیں بھی نہیں خیال
کچھ طے ہوا تھا اُن کے مرے درمیاں ضرور

گہرے سمندروں کا سفر پُرخطر سہی
کھولوں گا ایک روز مگر بادباں ضرور

ایسا نہیں ہے دوست کہ بے گھر ہوں آج تک
کاغذ پہ اک بنایا تھا میں نے مکاں ضرور

تم لاکھ اس کے ناز اُٹھاؤ ظفر میاں
اِک دن دغا کرے گی یہ عمرِ رواں ضرور

شجاع خاور

شروع میں تو تھا مشہور ولولہ میرا
پھر اس کے بعد پتہ بھی نہیں چلا میرا

زبان کوئی بھی سمجھا نہ استعاروں کی
اسی لیے تو میاں اور دل جلا میرا

میں دوستوں کی عنایت کی بات کیا چھیڑوں
کہ دشمنوں سے ہوا کون سا بھلا میرا

سکوتِ دشت کو توڑے بغیر آتا ہے
مزاج خوب سمجھتا ہے زلزلہ میرا

گذر بسر کے لیے ہو گیا ہوں چُپ ورنہ
بیانِ درد ہے محبوب مشغلہ میرا

چند ایک خواب ہی باقی ہیں، باقی ٹوٹ چکے
اب ایسا کون سا مشکل ہے مرحلہ میرا

قلم نے خوب غزل گوئی کی شجاع مگر
غزل سرائی نہیں کر سکا گلا میرا

واقف رائے بریلوی
۳۳۰۰ اتری جہاں آباد
تاز تلہ، رائے بریلی

غزل

بیکل اُتساہی کی نذر

دے کے اپنی روشنی چمکا دیا
تو نے ذرّے کو کہاں پہنچا دیا

کچھ نہ تھا، چھوٹا سا میرا اک نام تھا
تو نے میرے نام کو پھیلا دیا

تو نے جذبوں کو عطا کی شاعری
تو نے ہی آواز کو نغمہ دیا

تیرا ہر وعدہ ہے سچّا اے خدا
تو نے بن مانگے ہمیں کیا کیا دیا

بھول بیٹھا تھا میں دردِ عشق کو
پھر سے بیکلؔ نے مجھے تڑپا دیا

میں زمانے سے بہت مایوس تھا
اس محبّت نے مجھے چونکا دیا

گاؤں میں واقفؔ کھلا تھا ایک پھول
جس نے پورے ملک کو مہکا دیا

رئیس رامپوری
بے نک روڈ، رامپور

غزل

میں مُسکرا رہا ہوں، حقیقت کچھ اور ہے
حالات ہیں کچھ اور، طبیعت کچھ اور ہے

اس دَور کی کتابِ سیاست کچھ اور ہے
مفہوم ہے کچھ اور، عبارت کچھ اور ہے

دُنیا تو حُسن والوں کو کہتی ہے بے وفا
میرا خیال آپ کی بابت کچھ اور ہے

نازک ہیں یوں تو پنکھڑیاں بھی گلاب کی
لیکن ترے لبوں کی نزاکت کچھ اور ہے

اب آپ ہی بتائیے منصف بھی کیا کرے
ہے واقعہ کچھ اور شہادت کچھ اور ہے

یاروں سے پیار بھی ہے مُبارک مگر رئیسؔ
جو دُشمنوں سے ہو وہ محبّت کچھ اور ہے

ڈاکٹر انوارالحسن
صدر شعبۂ علوم مشرقیہ
لکھنؤ یونیورسٹی

کچھ غالبؔ کے بارے میں

غالبؔ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں ؎

نے گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اور یہ اپنی شکست کی آواز ایسی مدھر، سُریلی، جذبات سے بھرپور، مؤثر، دل گداز، ہوش رُبا، دعوتِ فکر و نظر دینے والی اور چونکا دینے والی تھی کہ اسے درحقیقت نہ تو "گلِ نغمہ" کہا جا سکتا ہے نہ "پردۂ ساز" اردو ادب کی وہ بلند قامت شخصیت جو مرزا غالبؔ کے نام سے جانی پہچانی ہوئی ہے، مدتوں سے اُردو نظم و نثر پر ایک عہد آفریں شخصیت کی حیثیت سے چھائی ہوئی ہے۔

مرزا غالبؔ اپنے اُردو کلام کو "مجموعۂ بے رنگ" سمجھتے تھے۔ لیکن وہی ان کی شہرتِ دوام کا باعث بنا۔ اپنے بے تکلف احباب، اعزّا اور شاگردوں کے نام ان کے نجی خطوط اُردو نثر کا بہترین سرمایۂ ادب تصور کیے جاتے رہیں۔ لیکن انھیں خود اپنی فارسی دانی پر ناز تھا۔ وہ اہلِ زبان کے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ ؎

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

یعنی میرے رنگ برنگے نقوش دیکھنا ہے تو میری فارسی دیکھو اور اُردو کے مجموعہ کو نظر انداز کر دو جو ہے تو میرا ہی مجموعۂ کلام لیکن بے رنگ ہے۔

انھوں نے بیشک فارسی میں نقش ہائے رنگ رنگ پیش کیے لیکن اساتذۂ اہلِ زبان کے سامنے ان کا کوئی نقش دل کش، جاذبِ نظر اور پرکیف ہونے کے باوجود بقائے دوام کا ضامن نہ ہوسکا اور یہ کام کیا تو اسی بے رنگ مجموعۂ اُردو نے کیا۔ یہ بے رنگ مجموعہ شائع ہونے کے بعد سے آج تک اُردو زبان کی سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب کی حیثیت سے معروف و مقبول ہے۔ چھوٹے بڑے کتنے ہی اڈیشن جاذبِ نظر، دل کش، سادہ، مفید حواشی اور تعلیقات کے ساتھ کارآمد مقدمات اور تنقیدی اشاروں کے ساتھ دنیا کے کونے کونے میں شائع ہو چکے ہیں اور آج بھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔

دیوانِ غالبؔ کے جو مختلف ایڈیشن قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں ان میں نظامی پریس بدایوں، برلن ایڈیشن، نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ عرشی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نول کشور پریس لکھنؤ سے دیوانِ غالبؔ کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے لیکن اس میں بے احتیاطی کے باعث کچھ الحاقی کلام بھی شامل ہو گیا، جو ازروئے تحقیق غالبؔ کا کلام نہ تھا۔

غالبؔ خود نوشت سوانح حیات[۱] کے بموجب ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء مطابق ۸ر رجب ۱۲۱۲ھ بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء ان کی مسلّمہ تاریخ وفات ہے[۲]۔ اسداللہ خاں نام، مرزا نوشہ عرفیت اور اسدؔ و غالبؔ تخلص تھے۔ اکبرآباد (آگرہ) وطنِ اصلی اور مولد تھا اور دہلی کی سکونت کے سبب "دہلوی" کہلائے۔ نجم الدولہ، دبیر الملک بہادر، نظام جنگ خطابات[۳] تھے۔

باپ عبداللہ بیگ والیٔ الور کی فوجی ملازمت میں تھے اور غالب ابھی پانچ ہی سال کے تھے کہ کسی جنگ میں مارے گئے۔ ان کے چچا نصراللہ بیگ نے پرورش کی، اور غالب ابھی نو یا دس سال کے تھے کہ وہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ بچپن ہی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ان کی شادی ہوگئی تھی۔[5] اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنالیا تھا لیکن وہ بھی جوانی میں داغِ مفارقت دے گیا، جس کا بڑا ہی دردناک مرثیہ غالب نے کہا تھا۔ یہ مرثیہ دیوانِ غالب میں موجود ہے اور اردو مرثیہ کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

غالب تورانی النسل تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ راست گوئی، اختلاطِ عام سے متنفر، نرمی، عاجزی اور انکساری ان کے خصائل تھے۔ ان کا رنگ گورا، داڑھی گول، سر کے بال ترشے ہوئے، کشیدہ قامت، قوی الجثہ، آنکھیں ابھری ہوئی اور کان بڑے بڑے تھے۔[6]

انھیں فارسی زبان سے طبعی لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ملا عبدالصمد کی تعلیم سے بہت فیض حاصل کیا۔ انھیں فلسفہ، طب اور نجوم میں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی۔ پندرہ سے انیس سال کی عمر میں آگرہ کی سکونت ترک کرکے مستقل طور پر دہلی میں قیام پذیر ہوگئے اور کرایہ کے مختلف مکانوں میں رہے۔[7] کان پور، لکھنؤ، عظیم آباد، کاشی، بنارس، میرٹھ، رام پور اور کلکتہ کے سفر بعض ناگزیر حالات میں کیے اور عموماً دہلی ہی میں سکونت رہی۔

مرزا غالب کا من پسند پھل آم تھا، گوشت، بادام، انڈا، دہی اور شراب ان کی مرغوب غذائیں تھیں۔ ان کی آمدنی قلیل اور اخراجات اس لیے زیادہ تھے کہ ان کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا۔ مستقل آمدنی صرف وہ پنشن تھی جو چچا کی وراثت میں ملتی تھی۔ کچھ عرصہ بہادر شاہ ظفر کے یہاں سے بھی قلیل تنخواہ ملتی رہی، پھر دربار رامپور سے وظیفہ[8] مقرر ہوگیا۔ قمار بازی، شطرنج اور چوسر ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔ اسی قمار بازی کی بدولت انھیں تین ماہ کی سزا بھی بھگتنا پڑی[9] جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں ؎

شادم از بند کہ از بندِ معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

یعنی "مجھے قید و بند سے خوشی ہوئی کیونکہ اس طرح میں فکرِ معاش سے آزاد ہوں۔ قید خانہ میں مجھے کوتوال کے ہاتھوں روٹی اور کپڑا تو مل جاتا ہے"۔
لیکن اس قید و بند اور احباب کی بے مہری نے ان کی روح کی گہرائیوں پر شدید ضرب لگائی۔ کہتے ہیں ؎

بس کہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامیٔ من
غیر نشگفت خورد گر غمِ ناکامیٔ من

یعنی "بہت سے میرے اپنے میری بدنامی کی وجہ سے بیگانے ہوگئے لیکن کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیونکہ میرے بہت سے غیر بھی ایسے ہیں جنھیں میری ناکام و نامراد زندگی کا غم ہے"۔ اس سخت آزمائش اور ابتلا کی گھڑی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے حق دوستی ادا کیا اور ہر طرح سے ان کی اعانت کی، جس کا اعتراف غالب کی زبان سے سنیے ؎

مصطفیٰ خاں کہ درین واقعہ غم خوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ، عزادارِ من است

یعنی "اس مصیبت کی گھڑی میں نواب مصطفیٰ خاں میرے غم گسار ہیں۔ ایسے میں اگر موت بھی آجائے تو موت کا کوئی غم نہیں ہے کیونکہ میرا ماتم کرنے والا تو موجود ہے"۔

غالب جیسے عظیم فن کار کو سخت افلاس اور بدحالی کی زندگی گزارنا پڑی، اور اسے بقول مولانا ابوالکلام آزاد "زمانے کی ستم ظریفی نہ کہیں تو کیا کہا جائے"۔

انگریز افسروں اور حاکمانِ وقت سے غالب کے تعلقات "نیازمندانہ" تھے۔ وہ ان کی تمدنی برتری کے بھی قائل اور معترف تھے اور پھر حالات کے تقاضے سے بھی مجبور تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے زمانے میں ہرچند کہ غالب نے خاموشی اور علیحدگی پسندی کی زندگی گزاری۔ پھر بھی ان پر اربابِ انقلاب کی طرفداری کا الزام عاید ہوا جس کے نتیجہ میں ان کی خاندانی پنشن بند کردی گئی اور اس کی بحالی اور اپنی صفائی کے لیے غالب کو سخت کوششیں

کرنا پڑیں۔

غالب اپنے موحدِ[۱۳] خالص اور مومن کامل ہونے پر خود زور دیتے ہیں۔ وہ تصوف سے بھی بے حد متاثر تھے۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں، جن سے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر وغیرہ کی ثنا خوانی ثابت ہوتی ہے۔ سرکارِ دوعالم علیہ التحیۃ والتسلیم اور ان کے اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین سے گرویدگی عشق کی حد تک تھی لیکن وہ ایسے نمائشی عالموں، زاہدوں اور عبادت گزاروں پر حافظ شیرازی کی طرح سخت تنقید کرنے سے گریز نہیں کرتے جو انسانیت کو فراموش کر بیٹھیں، عمل سے دُور جا پڑیں اور مذہب کی آڑ میں انسان دشمنی کریں۔ ان کے نزدیک دین اور کفر پندارِ وجود کی آرائش کے سوا کچھ نہیں۔ وہ صرف پاکیٔ دل پر زور دیتے ہیں اور اسے حالتِ کفر میں بھی گوارا کر سکتے ہیں ؎

کفر و دین چیست جز آرائشِ پندارِ وجود
پاک شو پاک کہ ہم کفرِ تو دینِ تو شود

یعنی کفر ہو یا دین داری، اس کی حیثیت پندارِ وجود کی آرائش کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سب سے اچھا تو یہ ہے کہ پاک ہو جاؤ کہ اس طرح تمہارا کفر بھی دین ہو جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ دل کی پاکی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس کی ضرورت دونوں حالتوں میں ہے دین ہو یا کفر۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

خوش بود فارغ ز بندِ کفر و ایمان زیستن
حیف کافر مُردن و آوخ مسلمان زیستن

شیوۂ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس
این قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

یعنی کفر و ایمان کی قید سے آزاد ہو کر جینا اچھا ہے۔ حالتِ کفر میں یا حالتِ اسلام میں مرنا قابلِ افسوس ہے۔ بے پروا خرام رندوں کا طریقہ مجھ سے نہ پوچھو، بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آسانی سے زندگی گزارنا ہی دشوار ہے۔

غالب کا فارسی کلیات جسے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے پہلی جنگِ آزادی یا غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، نول کشور نے ۱۸۶۳ء میں اسے اپنے مشہور مطبع سے شائع جس کی تقریظ خود غالب نے لکھی تھی۔ انھوں نے گیارہ سال سے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ بیدل، ظہوری، نظیری، عرفی اور وغیرہ سے وہ بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں شعراء اور امیر خسرو دہلوی کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف اپنے اردو دیوان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک
مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان
جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔
اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے
نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔"

بہر حال مرزا غالب کی شخصیت اور شاعری بقول پرو رشید احمد صدیقی مرحوم:

"ہماری تہذیبی زندگی کا ایسا سرچشمہ ہے جو اعلیٰ
تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کی مسلسل آبیاری کرتا
رہے گا۔" [۱۴]

غالب کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ نفسیاتی مطالعہ حقائق کے آئینہ میں کیا جائے۔ وہ جس اعلیٰ کے فرد تھے، سوسائٹی میں اُسی جگہ کے طالب، لیکن حالات تھے۔ اس لیے فطری طور پر ان کے مزاج میں ایک طرح کی محرو احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہی محرومی، یہی احساس برتری اور کے لوازمات ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ پھر بھی بقول رشید احمد صدیقی؛

"ان کی شاعری میں وہی تب و تاب اور فرزانگی
ملتی ہے جو کلاسیکی شاعری کا امتیاز ہے۔" [۱۵]

حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری کا پس منظر اتنا کہ اسی کے نقوش ان کی ذات، عادات اور فن میں نمایاں ہ اسی پس منظر نے غالب کو غالب بنایا ہے۔

غالب کی وسیع المشربی، انسان دوستی اور انسان و کائنات
کے باہمی روابط کی نشان دہی غالب کے کلام سے نمایاں ہے اور
شاید کسی دوسرے شاعر کے یہاں اس کے رنگ اتنے شوخ نہ ہوں
گے جتنے کہ غالب کے یہاں نظر آتے ہیں۔ پھر بھی غالب کی شخصیت
جتنی ان کے خطوط میں بے نقاب ہوئی ہے اتنی اشعار میں نہیں
ہو سکی۔ ان کی شخصیت کی بوقلمونی اور رنگا رنگی دیکھنا ہے تو ان کے
وہ خطوط دیکھنے کے قابل ہیں جو انھوں نے اپنے شاگردوں،
بے تکلف دوستوں اور ملاقاتیوں کو لکھے ہیں۔ اشعار تو پھر فکر و
تخیل سے گراں بار ہو جاتے ہیں لیکن خطوط میں غالب پورے
طور پہ بے نقاب ہیں، اور ان پر فکر و تخیل کی کوئی پرچھائیں نہیں نظر
آتی۔ پھر بھی دیوان غالب کو "الہامی کتاب" کہا گیا ہے اور یہ کہنا
شاید مبالغہ پر مبنی نہ ہوگا کہ اقبال کے علاوہ کوئی دوسرا اُردو شاعر یا
ادیب ایسا نہیں جس پر غالب سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہوں، دیوان
کی شرحیں کی گئی ہوں اور تحقیقی مقالے لکھے گئے ہوں۔

مولانا حالی نے "یادگار غالب" لکھ کر غالبیات کی داغ بیل
ڈالی اور اس کے بعد سے آج تک درجنوں کتابیں غالبیات سے متعلق
لکھی جا چکی ہیں جن میں "خطوطِ غالب" مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، "شرح
غالب" از نظم طباطبائی، "شرح دیوانِ غالب": از مولانا حسرت موہانی،
مقدمہ نسخۂ حمیدیہ، "دیوانِ غالب" مرتبہ مولانا عرشی، دیوانِ غالب
برلن ایڈیشن، دیوانِ غالب نظامی بدایونی ایڈیشن، "احوالِ غالب"
از ڈاکٹر مختار الدین آرزو اور "تلامذۂ غالب": از مالک رام خصوصیت
سے قابلِ ذکر ہیں۔

غالبیات کے سلسلے کا کام تنہا ہندستان ہی میں نہیں بلکہ
پاکستان، انگلستان، امریکہ، کناڈا اور جرمنی وغیرہ میں بھی جاری ہے
اور دنیا کی مختلف زبانوں میں غالبیات کا لٹریچر روز افزوں ہے۔
ماہرین غالبیات نے غالب کی شخصیت اور فن پر یادگار کتابیں اور
مقالے لکھ کر اپنی غالب شناسی، ادب دوستی اور ژرف نگاہی کا ثبوت
دیا ہے۔

غالب کی مشکل پسندی، ان کے شوخ لہجے، شخصیت، عظمت
کے راز، فارسی شاعری، مسائل تصوف، نظریۂ وحدت الوجود، پسندیدہ
اوزان، تصورِ حیات، جدید کلاسیکی غزل، ان کی شاعری میں بیرونی عناصر
کی آمیزش، ادبی معرکے، مابعد الطبیعیاتی شاعری اور ان کے معاصرین
سے روابط، ان کی فارسی نثر اور دیگر تصانیف کے ہر ہر پہلو پر تحقیق اور
تجسس، تنقید اور تبصرہ کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ اور حقیقت یہ ہے
کہ تحقیق وہ ناپیدا کنار سمندر ہے جس میں غواصی کرنے والے کچھ نہ کچھ موتی
ضرور ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اس طرح غالب کی زندگی اور ان کے فن کے
مختلف پہلوؤں پر سے نقابیں اٹھتی جا رہی ہیں، اس لیے غالب پر کسی
سیر حاصل بحث کا تصور بیکار ہے۔ سطور ذیل میں ان کی صرف اُردو
شاعری کے خصوصیات کا اجمالی جائزہ لیا جا رہا ہے جن سے ان کے
فن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اندازِ بیان

اندازِ بیان کی ندرت اور انفرادیت غالب کی شاعری کا بہت
نمایاں وصف ہے، وہ خود کہتے ہیں ؎

ہیں یوں تو زمانے میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیان اور

وہ پامال اور فرسودہ مضامین کو بھی اپنی طرزِ ادا سے جان دار اور توانا
بنا کر پیش کرنے پر قادر نظر آتے ہیں۔ لوگ فنا ہو کر زیر زمین چلے جاتے
ہیں اور زمین سے لالہ و گل اُگتے ہیں۔ غالب کی معنی آفرینی کا انداز
دیکھیے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

عشق کا انجام ناکامی، مایوسی اور حرمانِ مسلسل ہے سب ہی واقف ہیں،
لیکن غالب نے اسی مضمون کو اپنی طرزِ ادا سے نئے معنی عطا کر دیے ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی؛
"سادگی کے ساتھ یہ پرکاری غالب کے آخری دور کی شاعری

تک قائم رہی۔ اسی نے مرزا غالب کو "انداز بیاں اور
کا مرتبہ بخشا ہے۔" [۱۹]

حزن و ملال

عام طور پر غالب کے کلام کا لہجہ حزنیہ ہے اور ان کے اکثر اشعار سے ان کا ذاتی حزن و ملال ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ رونا چاہتے ہوں، لیکن حالات کے تقاضے کی بنا پر کھل کر رو بھی نہ سکتے ہوں۔ کہتے ہیں ؎

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

یا ایک دوسری غزل میں اس طرح اپنا دردِ دل بیان کیا ہے ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

یا ایک دوسری جگہ یوں نغمہ سرا ہیں ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

حقیقت یہ ہے کہ یہ حزن و ملال ان کے شخصی حالات، افتادِ طبیعت احساسِ برتری اور سماجی بے انصافی کے سبب تھا کیونکہ غالب طبقۂ خواص کے ایک فرد تھے، حالات نے انھیں تنگ دست، مجبور اور مقروض کر رکھا تھا۔ ان کے حوصلے بلند، ہاتھ کھلا ہوا تھا، عادات امیرانہ تھے لیکن وقت نامساعد، زمانہ ناموافق اور فضا ناہموار تھی، جس سے ان کا سابقہ تھا، ایسے میں حزنیہ لب و لہجہ پیدا ہونا ناگزیر تھا۔

صوفیانہ خیالات

غالب خود کہتے ہیں ؎

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

وہ نظریاتی طور پر وحدت الوجود کے قائل تھے یعنی خدا کے سوا کوئی موجود نہیں۔ اس ذاتِ باری کے سوا ساری مخلوق محض وہم ہے کہتے ہیں ؎

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

وہ حضرت منصور پر بھی نکتہ چینی سے باز نہیں آتے اور فرماتے ہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

کبھی وہ استفہامی انداز میں کہتے ہیں ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

اور ذیل کے شعر میں تو بڑی صاف گوئی اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ابہام

بقول شمس الرحمان فاروقی : ـــــــــ

" اشکال عموماً شعر کا عیب ہے اور ابہام شعر کا حسن۔ اشکال ایک قطعی صورت حال کا نتیجہ ہوتا ہے ابہام کی بنیادی خصوصیت غیر قطعیت ہے۔ اشکال کی نوعیت معمے (CODE) کی ہوتی ہے جسے حل کر کے ما فی الضمیر تک پہنچ سکتے ہیں۔ ابہام ایک ایسا معمہ ہے جس میں ہر طرف اشارے ہی اشارے ہیں اور ہر اشارہ صحیح ہوتا ہے۔ اشکال صرف ایک سطح کو چھپاتا ہے۔ ابہام بیک نظر مختلف سطحوں پر حاوی ہوتا ہے اور اس ذہن کی خصوصیت ہوتا ہے جو

مختلف المعنی یا مختلف الکیفیت حقائق کو ایک ساتھ ظاہر کرسکتا ہے ---- ابہام کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ شعر ہر ایک کے لیے کچھ نہ کچھ معنی رکھتا ہو۔" ۱۸

اگر ابہام کو شعر کا حسن قرار دے دیا جائے تو غالب کی اولین دَور کی شاعری کا بیشتر ذخیرہ اس لحاظ سے خوبصورت شاعری کی تعریف پر پورا اُترتا ہے لیکن غالب پرستی کے جوش میں ابہام کے وہ نمونے جو اشکال کی حدوں کو چھوتے ہیں اور پیچیدگی سے گزر کر محض چیستاں کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں، شاعری کا معیاری نمونہ کہے جانے کے قابل ہرگز نہیں۔ ورنہ غالب اپنے اس طرز ادا کو بدلنے پر کبھی تیار نہیں ہوتے۔ انھوں نے ابہام یا اشکال پسندی کے بجائے سلیس اور سادہ اندازِ بیان کو قبول کیا اور اپنے طرز ادا میں تبدیلی کی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ چند نمونے دیکھیے کہ ابتدا میں ان کا کیا رنگ تھا اور بعد میں انھوں نے کیا تبدیلی پیدا کی ہے

ابتدائی رنگ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق!
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

پھر وہ اپنے اس رنگ کی عدم مقبولیت کی بنا پر اس میں تبدیلی کرتے ہیں اور ابہام و اشکال سے گزر کر ایسا اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں کہ ان کی آواز ہر دل کی آواز معلوم ہونے لگتی ہے

اس کے نمونے مروجہ دیوان کی بہ کثرت غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔

بعد کا رنگ

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غرض کہ مروجہ دیوان کا بیشتر حصہ اسی رنگ پر مشتمل ہے اور ابتدائی رنگ کی نامقبولیت کے سبب غالب نے اسے ترک کیا اور صرف قدیم رنگ کے چند نمونے ہی مروجہ دیوان میں شامل رہنے دیئے۔ نسخۂ حمیدیہ کے بیشتر اشعار رنگ قدیم پر مشتمل ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب نے اپنے رنگ شاعری کو خود نکھارا، سنوارا اور اسے رفتہ رفتہ فارسی کے اثرات سے آزاد کیا۔ ابتداء میں وہ طرزِ بیدل کے پیرو تھے لیکن اس روش کو ترک کرکے اپنے جداگانہ (و منفرد طرزِ بیان سے اُردو شاعری کی دُنیا میں بقائے دوام حاصل کی۔ ★★

حواشی:

۱؎ احوالِ غالب۔ از ڈاکٹر مختار الدین آرزو مطبوعۂ دہلی
۲؎ رسالہ ذخیرہ بالگوبند۔ مارچ ۱۸۶۹ء
۳؎ مہر نیمروز: از غالب مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ
۴؎ احوال غالب از آرزو مطبوعہ دہلی
۵؎ غالب۔ از مولانا غلام رسول مہر ص۴۲ مطبوعہ لاہور
۶؎ خطوط غالب (خط نمبر ۳۴) ص۴۵۰
۷؎ رسالہ صلائے عام۔ جنوری ۱۹۱۱ء
۸؎ مکاتیب غالب ص۶۲
۹؎ کلیات نثر غالب ص۲۳۵ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ
۱۰؎ خطوط غالب (خط نمبر ۲۲) ص۴۹
۱۱؎ دہلی کا آخری سانس۔ از خواجہ حسن نظامی ص۱۲
۱۲؎ نقشِ آزاد ص۲۹
۱۳؎ خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر (خط نمبر ۲۲ بنام علائی)
۱۴؎ اُردوئے معلیٰ غالب نمبر حصہ سوم، ص۷ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء
۱۵؎ ایضاً ص۱۰ ۱۶؎ ایضاً ص۶۲
۱۷؎ غالب کی مشکل پسندی۔ از شمس الرحمٰن فاروقی۔ ماخوذ از نوائے سروش مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۹ء

بی اے بہادر مخشوؔ بریلوی
۴۶۶ بی۔ ریلوے اسٹیشن کالونی
گورکھپور

غزل

انکار کی جھیلوں کو رنگین کنول دیتے
ہم اپنے جو کہنے کا انداز بدل دیتے

راس آتا اگر ہم کو ماحول بہاروں کا
گلدستۂ اُردو کو پھولوں سی غزل دیتے

مٹ جاتی ہماری بھی تہذیب زمانے سے
جو صبح کو تُلسی کے پودے میں نہ جل دیتے

جن پیڑوں کی شاخوں پر پتّے بھی نہیں اُگتے
موسم کی نظر پڑتی یہ پیڑ بھی پھل دیتے

رہبر نے ہمیں تنہا چھوڑا ہی نہیں ورنہ
بن جاتی وہی منزل جس راہ پہ چل دیتے

قارونؔ کے خزانے کے مالک نہ ہوئے ورنہ
ہم اپنی تمنّا کو اک رنگ محل دیتے

چبھتے ہی نہیں اپنے تلووں میں کبھی کانٹے
اُگتے ہی اگر مخشوؔ ہم ان کو کچل دیتے

غزلیں

گنیش بہاری طرزؔ لکھنوی
۴۰۳۔ آئی۔ پیکوٹا ودرس
کنٹ پریڈ، گولا، بیگ

چند آنسو کم نصیبِ عشق پر بھی وار یو
سنگساروں میں بھی ہو تو تم نہ پتھر ماریو

اِس جہانِ رنگ و بُو سے میں تو پیاسا اُٹھ گیا
اے خدائے تشنگی اُس کو نہ پیاسا ماریو

موہ سوبھادک ہے اس مایا بھرے سنسار میں
پیار جوگی سا مگر کرنا یہاں سنساریو

بیچ کر مالک کو تم پا بھی گئے دُنیا تو کیا
عاقبت کی بھی تو سوچو مطلبی درباریو

اک تمہارے ہی سہارے ظلم سب سہہ جاؤنگا
تم نہ مجھ کو چھوڑ جانا اے مری سرشاریو

داؤں جیسا بھی ہو کھیلو صبر اور استقلال سے
عشق ہو تو طرزؔ بازی جیت کر بھی ہاریو

مہدیؔ پرتاپگڑھی
معرفت ایگزیکیوٹیو انجینئر
ایریگیشن ڈویژن۔ پرتاپ گڑھ

بڑا خوف اونچی اُڑانوں میں تھا
مگر خلفشار آشیانوں میں تھا

حکومت مری آسماں بھر میں تھی
میں خود ذہن کے قیدخانوں میں تھا

نہ تریاق جس کا کہیں مل سکا
عجب زہر میٹھی زبانوں میں تھا

کسی دشتِ تیشہ کا تھا منتظر
جو شہد آگیں دریا چٹانوں میں تھا

سُنا میری خانہ خرابی کا ذکر
کسی شوخ کی داستانوں میں تھا

کسی چھت کے نیچے نہ تھی عافیت
کہ مقتل سجا سب مکانوں میں تھا

تھا ذکرِ پری وش کا اسلوب الگ
مزا اتنا ہی داستانوں میں تھا

وہی جس نے مہدیؔ کیا مجھ پہ وار
وہی تو میرے پاسبانوں میں تھا

افسانہ

ایک شام کا جلوس

ایم۔ جو کھیاوی راہی
اشتراک ویکلی
قاضی پور خورد، گورکھپور

معصومیت سے بھری خوبصورتی اچھی کیوں لگتی ہے؟
ٹوٹے ہوئے مجبور، بے بس لوگوں پر ترس کیوں آتا ہے؟
زندگی سے اُلجھن کیوں ہوتی ہے۔؟

جب سے آنکھ کھولی ہے، جب سے کچھ سوچنے، بچارنے کی عادت پڑی ہے ـــــ اس قسم کے سوالوں کے جواب مانگتا ہوں ـــــ کسی اور سے نہیں ـــ اپنے آپ سے ـــــ کوئی جواب نہیں ملتا۔ اکثر سوچتے سوچتے شام اور پھر رات ہو جاتی ہے اور پھر سُورج نکل آتا ہے۔

میرا رفیق کار اکثر پوچھ بیٹھتا ہے۔ "کیا سوچا کرتے ہو۔ یہ بھی کوئی موڈ ہے، کام نہیں کروگے تو نوکری چھوٹ جائے گی، بھوکوں مروگے تب پتہ چلے گا۔ آج بھی تمھارا کام مجھے کرنا پڑا ہے"

یہ رفیق کار بھی عجیب آدمی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنا چاہنے لگا ہے واقعی میری فائلیں بھی اکثر وہی نپٹاتا ہے ـ کچھ لوگ شاید اسی لیے پیدا ہوتے ہیں۔ میں سوچنے لگتا، اگر ایسے کار آمد لوگ نہ ہوں تو ہم جیسے نکموں کا انجام معلوم ـ!

معصومیت سے بھری خوبصورتی والی ایک عورت........ نہیں نہیں، وہ عورت نہیں ہو سکتی...... لڑکی...... مگر نہیں۔ لڑکی بھی نہیں ــــ چہرے سے بچے عورت، نری عورت....... جسمانی اعضاء کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے کسی بھی شادی شدہ لڑکی کا تصور کافی ہے .... کیفے میں سب سے الگ تھلگ، ایک کونے والی میز پر بیٹھی ہے نہ جانے کب سے، اکیلی...... خالی نگاہ کر بیرا میرے پاس آیا۔ میں نے بھی اسے کافی لانے کے لیے کہا ہے...... اس نے کپ ہونٹوں سے لگا کر پرچ میں رکھ دیا ہے، کچھ سوچ رہی ہے ـــــ میں سوچ رہا ہوں، کیا سوچ رہی ہے؟ بیرا میرے لیے بھی کافی لایا ہے ـ میز پر رکھ کر دوسری طرف بڑھ گیا ہے۔ میں نے بھی کپ ہونٹوں سے لگا کر پرچ میں رکھ دیا ہے میں بھی سوچ رہا ہوں، مجھے معلوم ہونا چاہیے میں کیا سوچ رہا ہوں؟ ـــــ کچھ پتہ نہیں کیا سوچ رہا ہوں! ـــــ اس نے پھر کپ ہونٹوں سے لگایا ہے اور میں نے بھی۔

میرا جی چاہ رہا ہے، اٹھوں اور اس کے سامنے والی خالی کرسی پر بیٹھ جاؤں۔ قریب سے دیکھوں ـــ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا بھی جی یہی چاہ رہا ہو ـــــ مجھے ہنسی آگئی ہے۔ عجیب بات ہے۔ اسے بھی ہنسی آگئی ہے۔ اُسے کیوں ہنسی آگئی؟ ـــــ میں سوچ رہا ہوں، آدھ گھنٹہ گزر گیا ہے اس بیچ کئی بار اس نے میری طرف دیکھا ہے۔ اور جب بھی اس نے ایسا کیا ہے میری نظریں خود بخود جھک گئی ہیں ـــــ ایسا کیوں ہے؟
اب وہ اُٹھ کر جانے لگی ہے۔ میں بھی بل چکا کر چکا ہوں۔ مجھے بھی چلنا چاہیے۔

ہم دونوں باہر نکل آئے ہیں۔ چمکتی ہوئی کشادہ مصروف سڑک پر گاڑیاں ادھر اُدھر بھاگ رہی ہیں اور دونوں طرف کے فٹ پاتھوں پر پیدل چلنے والوں کا ہجوم ـــــ یہ شام نہ جانے کیوں خوبصورت سی ہو گئی ہے۔ کیوں ایسا ہو گیا ہے؟ اس سے پہلے کی شام تو ایسی نہ تھی ـــــ اس سے پہلے کی شام کیسی تھی؟ یاد کر رہا ہوں

ں سڑک پر اس ماحول میں میں اکیلا تھا۔ بے مقصد۔ بے منزل۔ بے ارادہ چلا جا رہا تھا۔ خالی خالی سا۔ گم گم سا، کھویا کھویا سا کہ اچانک نظر ایک ٹوٹے ہوئے بھکاری پر جا پڑی، جس سے چلا نہیں جا رہا تھا، جو بہت زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ سوکھے بدن، زرد استخوانی چہرے والا بیمار بھکاری، جس کے ساتھ نو دس سال کا ایک کالے دھنے پیٹ والا نیم برہنہ لڑکا بھی تھا۔ بھکاری کی پیوند لگی جھولی اٹھائے۔ اور دوسرے ہاتھ میں پچکا ہوا المونیم کا لوٹا لیے۔ یہ شاید اُس بھکاری کا لڑکا تھا ـــــــ

میرے پاؤں فٹ پاتھ پر تھم سے گئے، وہ دونوں پاس سے گزرنے لگے۔ "مولیٰ دے" کی صدا لگاتے ـــــ یہ کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔ پھر بھی میں اندر ہی اندر ریزہ ریزہ ہوا جا رہا تھا۔ میرے اندر کے ریزے شاید میری خشک آنکھوں میں سینگنے لگے تھے۔ شاید اسی لیے اب مجھے ان میں کچھ نمی سی محسوس ہونے لگی تھی ـــــ اس وقت میری جیب دفعاً ایک عجیب سی وحشت کے ساتھ خالی ہو گئی تھی۔ ارد گرد کے لوگ مجھے حیرت سے تکنے لگے ـــــ بھکاری اور اس کے ساتھ کا لڑکا بھی حیرت زدہ افراد میں شامل تھے۔

ہو سکتا ہے اس گھڑی بھی کوئی ٹوٹا ہوا بھکاری راہ گیروں میں موجود ہو مگر اس گھڑی میں اور کچھ نہیں دیکھ پا رہا ہوں۔ اس گھڑی معصومیت سے بھری خوبصورتی ہی مرکزِ نگاہ بنی ہوئی ہے ـــــ معصومیت سے بھری خوبصورتی والی وہ عورت آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی ہے۔ میں کبھی پیچھے ہو جاتا ہوں، کبھی آگے اور کبھی برابر ـــــ دوش بدوش...... وہ یہاں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے پر میری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ میری نظریں یہاں بھی اس کی نظروں سے نہیں مل پا رہی ہیں، اور جھک کر رہ جاتی ہیں۔ خدا جانے ایسا کیوں ہے؟ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے ـــ پتہ نہیں وہ یہ سوچ رہی ہے یا کچھ اور سوچ رہی ہے، یا کچھ بھی نہیں سوچ رہی ہے ـــــ میں زیرِ لب مسکرا رہا ہوں، وہ بھی ایسا ہی کر رہی ہے۔ مجھے اس کا نام پوچھنا چاہیے۔ کیا وہ بھی میرے نام کے بارے میں سوچ سکتی ہے؟ اسے سوچنا چاہیے۔ ایک اجنبی شخص اتنی دیر سے اس کے ساتھ ہے، کبھی دور سے، کبھی قریب سے، آخر ایسا کیوں ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سوچتی، اور اگر سوچتی ہے تو کیوں نہیں پوچھتی ہو سکتا ہے میرے متعلق وہ یہ سوچ رہی ہو کہ میں اس سے مخاطب کیوں نہیں ہو رہا ہوں ـــــ معصومیت سے بھری خوبصورتی والی اس عورت کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ سیاہ اور گہری بھی۔ اس کے بال کمر تک لمبے ہیں، کھلے اور بکھرے بکھرے سے۔ اس کا قد لمبا ہے اور جسم اکہرا۔ پتلے پتلے ہونٹ، بھرے بھرے رخسار، چمکتی ہوئی پیشانی اور نقرئی بادلوں میں ڈھکے آسمان کی طرح دودھیا رنگ جس پر جابجا قوس قزح سی کھلی ہوئی ہے۔

حیرت ہے فٹ پاتھ پر دوڑتے بھاگتے لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اسے دیکھتا ہو، صرف ایک میں ہوں جو دیکھ رہا ہوں ساتھ ساتھ چل رہا ہوں کبھی پیچھے۔ کبھی برابر، دوش بدوش۔ میرا کوئی رقیب نہیں ہے! مجھے پھر ہنسی آ رہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں اسے بھی ہنسی آ گئی ہے ـــ شاید وہ مجھ پر ہنس رہی ہے۔ مگر میں اس پر نہیں ہنس رہا ہوں ـــ میں اگر خود اپنے آپ پر ہنس رہا ہوں تو پھر اس کے ہنسنے پر حیرت کیوں؟ ـــ اب مجھے اس کا نام پوچھ لینا چاہیے ـــ میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنے بدن میں ایک جھرجھری سی محسوس کی ہے ـــ اسے شاید میری نیت کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ اچانک رُک گئی ہے اور سوالیہ نظروں سے میری طرف گھورنے لگی ہے۔ میں سٹپٹا سا گیا ہوں۔ میرے قدم پھر تیز ہو گئے ہیں، وہ بھی چل پڑی ہے۔ اس بار مجھے ہنسی نہیں آئی ہے، مگر وہ ہنس رہی ہے۔

چمکتی ہوئی کشادہ سڑک ختم ہو گئی ہے۔ فٹ پاتھ ٹوٹی ہوئی ناہموار پٹری سے بدل گیا ہے۔ اب ہم ایک گلی سے گزر رہے ہیں، جہاں صرف پیدل چلنے والے لوگ ہی نظر آ رہے ہیں۔ مگر یہاں بھی کوئی اس معصومیت سے بھری خوبصورتی والی عورت کو نہیں دیکھ رہا ہے۔ صرف میں دیکھ رہا ہوں۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں ـــ وہ مجھ سے ٹکرا گئی ہے۔ میں نے اسے سنبھالا ہے۔ مگر ہونٹ ساکت ہیں، سانسوں کی روانی بڑھ گئی ہے، آنکھوں کے پپوٹے جلنے لگے ہیں، گلی میں دونوں طرف چراغ اور لالٹینیں جل رہی ہیں اور کہیں کہیں پٹرومکس بھی۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے لوگ ہر طرف نظر آ رہے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے، بس اب ایک دو لمحے میں ہونٹ پھڑک اٹھیں گے۔ میں پوچھ بیٹھوں گا،

"خوبصورت معصوم خاتون! تم کون ہو، تمہارا نام کیا ہے، مجھے اتنی اچھی کیوں لگ رہی ہو۔ مجھے میری سب کچھ کیوں محسوس ہونے لگی ہو؟"

مجھے معلوم ہے، یقین ہے، وہ بھی یہی سوال پوچھے گی ـــ تو میں

سب کچھ کہہ دوں گا، اور کہہ دوں گا ..... کیا کہہ دوں گا؟ ... کہنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں یہ سوچ کر رہ گیا ہوں۔ وہ پھر اچانک رک گئی ہے ___ اس بار عجیب معنی خیز نظروں سے گھور رہی ہے کہ اچانک لاشعوری طور پر میری آنکھیں دوسری جانب مڑ گئی ہیں ___ کانپ اٹھا ہوں ___ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا ہے۔ اپنا معصوم چہرہ اس نے میری آنکھوں کی کی طرف کر دیا ہے۔ میری آنکھیں پھر مڑ گئی ہیں ...... اس طرف مڑ گئی ہیں جس طرف سے ایک چھوٹا سا جلوس چلا آرہا ہے ___ خاموش جلوس جیسے صدیوں سے سوگ میں ڈوبا ہوا۔ جس کے ایک فرد کے داہنے ہاتھ میں جا بجا پیلے اُجالے کی قے کرتا پٹرومکس لٹک رہا ہے۔ چار افراد کے کاندھوں پر ایک تابوت، سیاہ چادر سے ڈھکا ہوا رکھا ہے .... اس کا معصوم چہرہ میرے چہرے سے چھو گیا ہے، اس کی بڑی بڑی بے پناہ معصوم آنکھیں میری آنکھوں میں ڈوب کر دوسری طرف پھسل گئی ہیں۔ اس کے نرم و نازک ہاتھ، میرے شانوں پر لٹک گئے ہیں ...... میرے شانے اس کے نرم و نازک ہاتھوں سے نکل کر تابوت کی طرف بڑھ گئے ہیں۔ وہ رونے لگی ہے اس کی سسکیاں میرے کانوں میں مسلسل اُتر رہی ہیں، میں جنھیں اس گھڑی کسی اُداس ماں، کسی بیوہ خاتون کی سسکیاں محسوس کرنے لگا ہوں ....

معصومیت سے بھری خوبصورتی، ٹوٹے ہوئے لوگوں کے احساس کو تمام کر چکنے کے بعد، موت کا سفر طے کرنے والے جلوس سے چھوٹ گئی ہے ...!

★★

اُردو زبان اور شاعری

___ صفحہ ۳۶ کا بقیہ

میں جگہ حاصل کی، اور لازوال شعری سرمایہ یادگار چھوڑا۔

فیض احمد فیض کا نام بھی ترقی پسند شاعری کے ممتاز ترین شعرا میں لیا جاتا ہے۔ ان کے لہجہ اور انداز فکر نے نئی نسل کو بہت متاثر کیا۔ ہندوستان میں بھی وہ اسی طرح مقبول و محترم ہیں جس طرح پاکستان میں۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال، اصغر، فانی، حسرت اور جگر کے بعد فراق و فیض انفرادی مقام کے حامل ہیں۔ پھر ترقی پسند شعرا میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری وغیرہ اردو شاعری کی عظمت بڑھانے والے ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ جدید ترین شعرا کا ایک قافلہ ہے جو تجربات کی حدوں سے گزر رہا ہے۔ تاریخ ادب میں ان کے مقام کا تعین ہونا ہے۔ قدیم و جدید شعرا کے جو اسمائے گرامی میرے مضمون میں آئے ہیں ان کے علاوہ کافی تعداد معتبر اور باکمال شعرا کی ہے جن کا تذکرہ میرے مضمون کو بے حد طوالانی بنا دیتا۔ اس کے لیے میری علالت وقت نہیں نکال سکی۔

میرا مقصود تحریر سر دست اُردو زبان کی شاعری کا اجمالی خاکہ پیش کرنا ہے جس سے اُردو زبان کی اہمیت ہندستان کی معاشرتی اور تہذیبی فضا میں واضح ہو جائے۔

غزل

نجمی لکھنوی

غضب ہے صاحبِ دل ہو اور اختیار نہ ہو
کمال ہے کہ گریباں بھی تار تار نہ ہو

ہمارا دل جو رہینِ خیالِ یار نہ ہو
قرار کے لیے پھر اتنا بے قرار نہ ہو

چمن میں پھر گل و بلبل کی آبرو ہی کیا
تمہارے حسن کی گلشن میں جب بہار نہ ہو

ہمارے آبلے کہتے ہیں پھوٹ کر ہم سے
چلو وہاں کہ جہاں کچھ سوائے خار نہ ہو

مرا تو دو گھڑی جینا محال ہو جائے
جو ہم سفر کہیں نجمی جمالِ یار نہ ہو

غزلیں

شاد قادری گکرپوی

محلہ سوتھا، بدایوں

حاصلِ کونین بھی سرمایۂ حرماں بھی ہے
دل وہ بستی ہے کہ جو آباد بھی ویراں بھی ہے

وہ نظر برباد کن بھی ہے سرورِ جاں بھی ہے
یہ وہی شے ہے کہ جس میں درد بھی درماں بھی ہے

پاسِ عشق بھی خیالِ خاطرِ دوراں بھی ہے
چار دن کی زندگی سرمایۂ انساں بھی ہے

آپ کو پہچانتے ہیں، غیر کا عرفاں بھی ہے
امتیازِ دوستی مشکل بھی ہے آساں بھی ہے

اشکِ غم صرف ایک قطرہ ہے اگر دیکھے کوئی
اور تم اس کو ہوا دے دو تو یہ طوفاں بھی ہے

توڑ کر قیدِ تعین یہ نکل جائے تو خیر
ورنہ انساں کو وہی گھر ہے وہی زنداں بھی ہے

آدمی کو مٹ کے مل جاتی ہے معراجِ حیات
زیست کا تاریک اک رُخ ہے تو اک تاباں بھی ہے

جامِ چشمِ غمزدہ کو گردشِ دوراں نہ چھیڑ
یہ چھلک جائے تو پھر اندیشۂ طوفاں بھی ہے

جو کبھی ہم نے کیا تھا شادؔ پائے ناز پر
اب وہی اِک اپنا سجدہ حاصلِ ایماں بھی ہے

شاکرِ جرولی

اونچا مکان، جرول بہرائچ

شہر میں آکے طوفاں کدھر دیکھتے
مڑ کے جب دیکھتے میرا گھر دیکھتے

بھیگے موسم کی پرواز گر دیکھتے
سر پہ اُڑتی گھٹاؤں کے پر دیکھتے

کب سے چہرہ بہ چہرہ مخاطب تھا وہ
کس گھڑی گھر کے دیوار و در دیکھتے

اپنی نظروں سے خود خوف کھاتے نہ گر
ہم جدھر دیکھتے بے خطر دیکھتے

بات کوئی تو تھی ورنہ مُڑ مُڑ کے یوں
راہ گیر دل کو کیوں راہبر دیکھتے

ساری دیواریں اب جیسے پتھر کی ہوں
تم ذرا میرا شیشے کا گھر دیکھتے

مجھ کو شاکرؔ پرکھیے کتابوں سے کیوں
لوگ تو اعتبارِ نظر دیکھتے

سُلطان احمد ناؔدم

ٹوٹنا دل کا بہت اچھا ہوا
مستقل یوں درد کا رشتہ ہوا

یا تری زلفوں میں ہے مشکِ ختن
یا ہے دل کا زخم ہی مہکا ہوا

ریزہ ریزہ وسعتِ افکار میں
آدمی ہے سر بسر بکھرا ہوا

فکر گھر واپس پہنچنے کی رہی
چھوڑ آیا تھا دیا جلتا ہوا

اب کسی سے کچھ تعلق ہی نہیں
ان سے مل کر ۔ اور بھی تنہا ہوا

میری منزل بن گئیں پرچھائیاں
میں چلا تھا سائے سے بچتا ہوا

روشنی بکھری سنہرے کھیت میں
ارغوانی ہے دُھواں اُٹھتا ہوا

خود سے ناؔدم اجنبی بن کر ملے
اپنا چہرہ تھا بہت بدلا ہوا

انیس نصرت

پنچھی کرے نہ چاکری

داس ملوکا نے تو اجگر اور پنچھی کے لیے کہا تھا لیکن ایسے انسان بھی ہیں اور ایک دو نہیں بہت سے جو کبھی کچھ نہیں کرتے لیکن سب کے داتا رام کی کرپا سے ان کی بھی چین سے کٹتی ہے اور وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے منڈلاتے پھرتے ہیں۔

ایسے ہی ہمارے مرزا صاحب ہیں۔ سسرال سے اتنا کچھ ملا کہ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ شادی سے پہلے ماں باپ کے سہارے اپنی فیس سے اسکول اور کالج چلاتے رہے یعنی ہر درجہ کا امتحان کم سے کم تین حملوں میں پاس کیا۔ نویں درجہ تک پہنچتے پہنچتے اتنی عمر کے ہو گئے تھے کہ کلاس کیا سارے کالج کے لڑکے ان کو ڈیڈی کے نام سے پکارتے تھے اور پھر یہ نام ایسا مشہور ہوا کہ ٹیچر اور حد یہ کہ پرنسپل بھی ان کو اسی نام سے پکارنے لگے۔ ان کا ایک لطیفہ اب تک مشہور ہے۔ جب دسویں درجہ میں تیسری بار فیل ہوئے تو ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور ماں سے بولے ——

"امی اس بار تو میں نے ریکارڈ توڑ دیا۔"

"کیا بیٹا فرسٹ آ گئے؟" ماں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں" وہ پھر ہنسے۔ "تیسری بار بھی فیل ہو گیا۔"

ماں نے امتحان لینے والوں کو برا بھلا کہا اور کچھ بد دعائیں دیں کہ ان کے سپوت کو بار بار فیل کر کے جانے کب کا بدلہ لے رہے ہیں اور بات آئی گئی ہو گئی۔

گھر کے کھاتے پیتے اکلوتے بیٹے تھے اس لیے شادی کے وقت یہ نہ پوچھا کہ لڑکا کرتا کیا ہے۔ پھر سسرال بھی ایسی ملی کہ گھر بھر گیا۔ نہ انھوں نے کبھی نوکری یا اور کوئی کام کرنے کی سوچی نہ کی۔ پھر جب پتنگیں، کبوتر، چوسر، شطرنج اور بٹیریں موجود ہوں تو بھلا کاموں کی کمی —— لیکن کبھی معمولی سے بیمار بھی پڑتے تو آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ ویسے ان کی یہ عادت کوئی نہ جانتا ہو تو یہی سمجھتا کہ بس دو چار دن کے مہمان ہیں۔

"میرے مولا بلا لے مدینہ مجھے" مرزا صاحب نے گاتے ہوئے بیوی سے کہا —— ارے بیگم تم تو میری بالکل دشمن ہو رہی ہو تمھیں تو میرا ذرا بھی خیال نہیں —— دیکھو کتنا تیز بخار ہے اور تمھیں میری کچھ بھی فکر نہیں۔

بیگم جو کئی دنوں سے مرزا صاحب کے ذرا سے بخار سے اتنی بوکھلا گئی تھیں کہ ان دنوں کسی کام کے کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بلکہ گھر کے سب لوگ مرزا صاحب کے چاروں طرف جمع رہے۔ مرزا صاحب اپنی اتنی شدید بیماری میں بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھر کے سارے لوگوں کی گنتی کر لیتے اور اگر کوئی بھی ذرا ادھر ادھر ہوا تو چلانا شروع کر دیتے۔

جاوید میاں کہاں ہیں کیا کالج چلے گئے —— میرا آخری وقت ہے، بیگم کوئی بچہ اسکول نہ جائے کیا معلوم کس وقت خدا کے گھر سے پروانہ آ جائے۔

بیگم نے کہا خدا نہ کرے دشمنوں کے کان بہرے۔ آپ

نے اس ذرا سے بخار کو اتنی بڑی بیماری کیسے سمجھ لیا۔ اتنے بخار میں تو لوگ دنیا کے کام کرتے رہتے ہیں۔ اتنے بخار میں تو لوگ دفتر کچہری جاتے رہتے ہیں اور آپ نے خدا سے لو لگالی اور منکر نکیر کا انتظار کرنے لگے۔

مرزا صاحب نے ایک بار پھر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"میرے مولا بلالے مدینے مجھے ـــ"

بیگم اس کو ذرا سا بخار نہ کہو، بس یہ سمجھو کہ اب اس دنیا سے ناتہ ٹوٹنے والا ہے ـــ ہائے ہائے کیا کیا پروگرام بنائے تھے ـــ سوچا تھا جاوید میاں بیرسٹر بن جائیں گے تو ان کی خوب دھوم دھام سے شادی کریں گے۔ لڑکیوں کا فرض بھی پورا نہ کر سکا۔

ہائے بیگم اب چھوٹے میاں کو ولایت کون بھیجے گا۔ اب تو سب ارمان ٹوٹتے نظر آرہے ہیں۔

بیگم نے ذرا بگڑتے ہوئے کہا ـــ آپ نے اس معمولی سے موسمی بخار کو جان لیوا کیسے سمجھ لیا۔ بچے تو اتنے بخار میں کھیلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اور آپ ـــ"

مرزا صاحب نے کراہ کر کہا ـــ تم سب میرے دشمن ہو گئے ہو اس کو ذرا سی بیماری کہہ رہے ہو ـــ

بس اب جان نکلی ...... تم لوگوں کو خدا رسول کے سپرد کیا ـــ یہ کہتے ہوئے مرزا صاحب نے آنکھیں بند کرلیں۔

اسی وقت خیرو نے آکر بتایا کہ منشی سجاد حسین اور مادھو جی ـ مرزا صاحب نے آنکھیں کھول دیں اور بڑے زور سے کراہ کے کہا ـــ" دیکھا تم لوگوں نے میں مر رہا ہوں اور تم لوگ اس کو معمولی بیماری کہہ رہے ہو۔ تم لوگوں سے تو اچھے ہمارے دوست ہیں جو مجھے دیکھنے آئے ہیں ـــ ہائے اگر میں واقعی بیمار نہ ہوتا تو یہ لوگ دیکھنے کیسے آتے؟"

بیگم نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ان لوگوں کے پاس نہ کچھ کام ہے نہ دھام۔ سوچا چلو مرزا کو ہی دیکھ آئیں۔

" بیگم تم ان لوگوں کو بیکار آدمی سمجھتی ہو، جبکہ انھیں فرصت ہی نہیں۔ ان کے پاس کام ہی کام ہیں۔ مادھو جی سوشل ورکر ہیں، سب کے کام آتے ہیں۔ کسی کا کام ہو، مادھو جی چٹکی بجاتے ہی کر دیتے ہیں۔ اور منشی سجاد حسین نیتا ہیں نیتا۔ منشی گیری میں کیا رکھا تھا اب دیکھو ٹھاٹ ہیں۔

بیوی نے اٹھتے ہوئے تنک کر جواب دیا۔

"تم کو تمہارے دوست مبارک" یہ کہتے ہوئے وہ اندر چلی گئیں ـــ بچے بھی دھیرے دھیرے ادھر ادھر کھسک گئے

منشی سجاد حسین اور مادھو جی نے آتے ہی مرزا صاحب کی خیریت پوچھی ـــ مرزا صاحب نے کراہتے ہوئے بتایا ـــ

"چار راتوں سے سو نہیں سکا ہوں، مارے تکلیف کے آنکھوں میں رات کٹتی ہے ـــ بخار میں وہ شدت ہے کہ چنے ڈالو تو بھن جائیں۔ اس پر سے غضب یہ ہے کہ کوئی مجھے بیمار نہیں سمجھتا۔ درد کے مارے سر پھٹا جا رہا ہے۔ سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ کوئی ایسا آلہ بھی تو نہیں بنا جو یہ بتا سکے کہ درد کتنا تیز ہے تاکہ گھر والوں کو معلوم تو ہو کہ میری کیا حالت ہے۔ ہائے ہائے اب دن پورے ہو گئے۔ بس اب خدا حافظ .... میرا کہا سنا معاف کرنا۔"

مادھو جی نے گھبرا کر مرزا صاحب کے سر پر ہاتھ رکھا تو مرزا صاحب نے کہا ـــ" دیکھا کتنا تیز بخار ہے"

مادھو جی نے کہا" ابھی صحیح اندازہ نہیں ہو رہا"۔

منشی سجاد حسین بولے۔ ٹھہرئیے میں ذرا نبض دیکھتا ہوں۔"

مرزا صاحب نے کراہ کر کہا" کس کی نبض دیکھو گے؟ میری نبض تو بالکل ڈوبی جا رہی ہے۔ بس دو چار گھڑی کا مہمان ہوں ـــ"

منشی جی نے نبض پر ہاتھ رکھا اور کچھ دیر آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے پھر انھوں نے آنکھیں کھول کر کہا۔

" املی تلے والے عطار کے یہاں سے جوشاندہ میں نیم کی پنڈی ڈلوا کر منگوا لیجئے۔ لونگ، سپستان اور شربت

شہتوت کے ساتھ استعمال کیجئے، دیکھیے گا انشاء اللہ بہت جلد شفا ملے گی۔

یہ سن کر مادھو جی بولے، "اتنی بڑی بیماری اور بس جوشاندہ سے چلی جائے۔ کیا غضب کرتے ہیں منشی جی۔ جب تک مرزا صاحب کو چورستے والے دید جی کو نہ دکھایا جائے گا اس وقت تک اس جان لیوا بیماری سے چھٹی نہ ملے گی۔ کچھ دن پہلے ہمارے سادھو کو بخار آیا، ہوتے ہوتے وہ چارپائی سے لگ گئے۔ مجھے اپنے کام سے تحصیل جانا پڑا سوچا ان سے بھی مل لوں، اب جو دیکھا تو ان کا حال برا۔ انھیں اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ اور چورستے والے دید جی کی بس چار دن دوا ہوئی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ باتیں سن کر مرزا صاحب زور سے کراہے ——— ارے مرا ——— یا اللہ میرے گناہوں کو معاف کر لو ———،

یا خدا تڑپ تڑپ کے مرنے سے تو بہتر ہے کہ ایک دم جان نکل جائے۔

اتنے میں مرزا صاحب کے دو تین اور دوست آ گئے۔

مرزا صاحب زور زور سے کراہ رہے تھے اور کہتے جاتے تھے قسم خدا کی تم لوگوں نے دوستی کی لاج رکھ لی۔ ایسے ہی محبت کرنے والوں سے دنیا قائم ہے۔ یا اللہ بس اب برداشت نہیں ہوتا ——— کیا کروں ——— تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد مرزا صاحب نے پھر دہرایا۔

"میرے مولا بلالے مدینے مجھے۔ میرے مولا بلالے مدینے مجھے" ——— یہ کہتے ہوئے مرزا صاحب نے آنکھیں بند کر لیں ——— ذرا دیر بعد آنکھ کھول کر سب کو دیکھا اور زور سے نوکر کو آواز دی ——— ارے خیرو کہاں مر گیا ——— آیا میاں کہتا ہوا خیرو آ گیا۔ اتنے لوگ میری عیادت کو آئے ہیں اور نہ چائے نہ پانی ——— یہ کہتے کہتے مرزا صاحب پھر کراہنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد خیرو چائے اور ناشتہ لے کر آ گیا۔

منے نواب جو ابھی ابھی آئے تھے بولے۔ "ارے آپ نے کچھ سنا۔ کل تو محمد میاں کو ایسی مات دی ایسی مات دی کہ خدا دشمن کو بھی نہ دے

محمد میاں چیخ کر بولے ——— "مات کیا تھی ذرا میرا شہ سوار پیچھے رہ گیا اور آپ لے اڑے ——— منے نواب نے کہا، خدا جھوٹ نہ بلوائے سراسر مات تھی۔ اس پر مرزا صاحب نے کراہتے ہوئے کہا۔ "بھئی اتنا شور شرابہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ نکالو شطرنج اور ہو جائے فیصلہ بساط بچھ گئی اور شطرنج شروع ہو گئی۔ کچھ دیر تو مرزا صاحب کراہتے ہوئے کنکھیوں سے کھیل دیکھتے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد وہ چالیں بتانے لگے۔ اس کے بعد تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور کچھ دیر بعد خود بھی میدان میں اتر آئے۔

بیگم جو دروازے کی دراز سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں، "کہاں تو اتنا تیز بخار تھا اور کہاں چند بے فکرے جمع ہوئے تو شطرنج کی بساط بچھ گئی۔ ابھی اگر میں کہوں کہ کھیل بند کرو تو وہی واویلا، وہی چیخ و پکار۔ وہی مرنے کی دھمکیاں شروع ہو جائیں گی۔ آزاد پنچھی ہیں کوئی کام کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ایسے ہی اٹھ بیٹھ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ لو اب سب جمع ہو گئے رات تک کی فرصت ہو گئی۔ خیر اسی بہانے مرزا صاحب کی بیماری تو گئی۔

وہ جو کسی نے کہا ہے" یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا"۔ اپنی جگہ صحیح ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ایسے سازوں کی کمی نہیں اب نہ تو وہ پہلے سے شکار رہ گئے ہیں نہ شکار کھیلنے والے لیکن شکاری شکار کھیلیں اور بے کار ساتھ بھریں والی کہاوت اب بھی صحیح ہے البتہ اس کی صورتیں بدل گئی ہیں الگ بات ہے۔ ایسے لوگ تو مرزا صاحب سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔ مرزا صاحب پتنگ بازی کرتے ہیں، بٹیر لڑاتے ہیں، شطرنج کھیلتے ہیں۔ چوسر سے ان کو شوق ہے، لیکن کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جن سے یہ پوچھئے کہ اسٹک کیسے پکڑی جاتی ہے اور اس میں اور کرکٹ کے بیٹ میں کیا فرق ہوتا ہے اور دونوں کھیلوں کی گیندیں ایک ہی ہوتی ہیں ——— یا

الگ الگ تو ایک سوال کا جواب بھی نہیں دے پائیں گے لیکن جہاں کرکٹ اور ہاکی کے میچ شروع ہوئے ان کے ماہر بن گئے۔

ایسے ہی کچھ ماہر ٹرانسسٹر کے چاروں طرف جمع تھے

"یہ میچ تو ڈرا ہوگا ڈرا" رمیش نے کہا۔

"اماں ڈرا کیسے ہوگا تمہیں تو بس ڈرا کے علاوہ کچھ آتا ہے۔ اس دن ون ڈے: one day میچ کو ڈرا کیے دے رہے تھے۔" راجہ نے جواب دیا۔

"اسے چھوڑو" رمیش بھلا ہار ماننے والا ہے۔ بولا یہ میچ تو ڈرا ہو کر رہے گا۔ کانپور کی پچ ہی ایسی ہے۔

"چوا" کسی نے زوردار آواز لگائی۔

"چوا نہیں چھکا"۔ راجہ بولا۔

"اماں چپ بھی رہو کمنٹری سننے دو۔ شیتل جو اتنی دیر سے خاموش تھا بول اٹھا اور سب کے کان ریڈیو کی طرف لگ گئے۔

"مارشل آؤٹ"۔ ریڈیو نے بتایا۔

"دیکھا"۔ رمیش بولا۔ روی شاستری نے فیلڈ سے باہر نکل کر کیچ لے لیا۔ یہ کہہ کر اس نے راجہ کی طرف دیکھا۔

اب میچ ڈرا ہوگا کہ نہیں۔ اب تو مارشل بھی آؤٹ ہوگیا۔

"ان کو دیکھو" راجہ نے ہنستے ہوئے کہا' فیلڈ سے باہر نکل کر لیا ہے۔ کہیں فیلڈ سے باہر بھی کیچ لیا جاتا ہے۔

کچھ بھی ہو میچ ضرور ڈرا ہوگا۔ رمیش بولا۔

"بدتے ہو شرط"۔

"کیوں نہیں"۔

"دس دس روپئے کی رہی"۔

"نہیں ایک ایک سیر مٹھائی کی رہی"۔

"بات پکی؟"

"پکی"۔

"تو لاؤ ہاتھ"۔

دونوں نے ہاتھ ملائے تو میچ ہو چکا تھا۔

رمیش نے ہاتھ تو ملالیا لیکن ایک بار پھر کہا۔" راجہ اس بار مٹھائی تمہیں کو کھلانی پڑے گی"۔

"اماں جاؤ بڑے آئے مٹھائی جیتنے والے۔ کبھی بیٹ بھی پکڑا ہے"۔

"تو اس سے کیا ہونا ہے کمنٹری تو سنی ہے"۔

شیتل نے کہا تو سب لوگ ہنس دیئے۔

"بچو" ابھی چاہے جتنا چہک لو لیکن مٹھائی تمہیں کو کھلانی پڑے گی۔

"تمہاری بلا سے" رمیش نے جواب دیا۔" بھگوان نے اتنا دیا ہے کہ ایک کلو کیا سو دو سو کلو مٹھائی سے کمی پڑنے والی نہیں"۔

"کمائی چاہے کسی کی ہو" راجہ نے کہا" اپن کو تو کوئی فکر نہیں جب تک پتا جی چلیں گے ان کے پیسے پر عیش کریں گے۔ اس کے بعد بڑے بھیا ہیں"۔

ایک ساتھی نے کہا۔" ہم تو مست رہتے ہیں مست' کام دھام کے چکر میں کون پڑے۔

باہر سڑک پر کوئی زور زور سے گاتا جا رہا تھا۔

اجگر کرے نہ چاکری
پنچھی کرے نہ کام
داس ملوکا کہہ گئے
سب کے داتا رام

غزلیں

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی
ایس۔ این کالج، کٹرہ پھول خاں
اٹاوہ

جب بھی اظہارِ وفا میرے لبوں پر آیا
دستِ قاتل میں دمکتا ہوا خنجر آیا

جوش میں جب بھی کوئی آگ کا لشکر آیا
میری امداد کو رحمت کا سمندر آیا

اسکی سانسوں میں تھی امرت سی گلابوں کی مہک
بزم میں تلخیٔ زہراب جو پی کر آیا

زندگی سایۂ گلشن میں بسر کی بے سود
خار آیا نہ مرے ہاتھ گلِ تر آیا

ذرّے ذرّے سے ابھرنے لگا سورج کا شباب
دشتِ ظلمات میں جب نور کا لشکر آیا

اہلِ دنیا نے بہر طور اڑایا ہے مذاق
جب ہدایت کے لیے کوئی پیمبر آیا

جب بھی ارمانوں کی کشتی کو سجایا ہم نے
ایک طوفانِ بلاخیز امنڈ کر آیا

رازؔ درپیش سرابوں کا سفر تھا لیکن
ذرّے ذرّے میں نظر مجھ کو سمندر آیا

اختر شاہجہانپوری
رنگین چوپال۔ شاہجہانپور

آسمانوں پہ جو ہوتا تھا وہ چرچا ہوں میں!
مجھ کو آنکھوں سے لگا لو کہ صحیفہ ہوں میں

رشتۂ خالق و مخلوق میں ہوتا ہے یہی
شعر کہتا ہوں، اسی واسطے تنہا ہوں میں

زندگی مجھ کو حفاظت سے سنبھالے رکھنا
کام آؤں گا کہ تیرا ہی تو نوحہ ہوں میں

میری ہستی کا بھروسہ نہ کرو تم لوگو!
اب تو گرتی ہوئی دیوار کا سایہ ہوں میں

انگنت بار وہاں خوف سے پتھر بھی ہوا
پانچویں سمت مگر آج بھی جاتا ہوں میں

میں تو دریا ہوں یہ تسلیم مگر اے اخترؔ
اپنی مرضی سے کسی سمت بھی بہتا ہوں میں

عامر قدوائی

بھولے سے بھی کسی پہ نہ اب اعتبار کر
میں بھی ترا حریف ہوں مجھ پر بھی وار کر

جو زندگی کو بھائے وہ روپ اختیار کر
رکھ دے خدا کے واسطے چہرہ اتار کر

ایسی روش تو آج ذرا اختیار کر
ٹھہری ہوئی ہواؤں کو پھر بے قرار کر

کب تک پھروں میں خواب کے صحرا میں دربدر
اپنی حدوں کو کاش کبھی تو بھی پار کر

لگتا ہے ڈوبنے کو ہے نبضِ حیات پھر
ہنستے ہوئے اس آگ کے دریا کو پار کر

خوابوں کے آسرے پہ کٹے گی حیات کیا
تجھ سے جو ہو سکے تو حقیقت سے پیار کر

چہرہ اداس اداس ہے آنکھیں بھری بھری
آئے ہو تم کہیں سے کوئی جنگ ہار کر

کیا وقت آ گیا ہے، جو ہمدرد ہے بہت
گھبرا رہے ہیں لوگ اسی کو پکار کر

نقد و تبصرہ

[illegible] کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں!

نام کتاب: "علامہ کنتوری اور طب"
مصنف: پروفیسر حکیم سید کمال الدین ہمدانی۔ قیمت: پچیس روپے
ملنے کا پتہ: ادارہ ہمدانیہ۔ المعباڑہ سید خیرات علی جلالی۔ علی گڈھ

علمی و ادبی لحاظ سے اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ "کنتور" کے خاندان سادات کے مایہ ناز فرزند علامہ سید غلام حسنین کنتوری کی ہمہ گیر شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ دینی و علمی اور طبی حلقوں میں وہ یکساں طور پر مقبول ہیں۔ تبحر علمی میں بے مثال، تفقہ میں عدیم النظیر اور فن طب میں لاثانی بلکہ مجتہدانہ حیثیت کے ساتھ وہ ایک بے مثال مترجم اور ادیب بھی تھے۔ اس حیثیت سے ان کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طب کی تمام بنیادی اور اہم کتابوں کا ترجمہ مفید شرح اور ضروری حواشی کے ساتھ کر کے فن طب کی بقا کا سامان فراہم کر دیا۔

علامہ کنتوری کی اس ہمہ گیر شہرت و مقبولیت کے باوجود ایک خوف کہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ غفلت کی حائل ہوتی ہوئی دیوار اگر کچھ اور اونچی ہو جاتی تو بالخصوص نئی نسل اپنے ان بزرگوں کے کارناموں اور شخصیت سے ناواقف رہ جاتی۔ کیونکہ علامہ کی بیشتر تالیفات نایاب یا انتہائی کمیاب ہو چکی ہیں۔ ان کے معاصرین دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں اور اصلی مصادر و مراجع تک رسائی نہایت دشوار ہو چکی ہے۔ خدا سے جزائے خیر دے ہمارے دور کے لائق و فائق محقق، پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی (چیرمین شعبہ کلیات اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو جنھوں نے صورت حال کی نزاکت کو محسوس کیا اور پھر علامہ سید مجتبیٰ حسین کامونپوری کے الفاظ میں: —— "علامہ کنتوری کے طویل و عریض و عمیق زندگی کے وسیع مرحلہ میں حکیم سید محمد کمال الدین صاحب کا صبر آزما اور لمبا سفر کامیاب رہا۔"

زیر نظر کتاب پروفیسر حکیم سید کمال الدین ہمدانی کے تحقیقی مقالہ "علامہ کنتوری کی حیات اور خدمات" کا ایک اہم اور قابل قدر حصہ ہے۔ اس تحقیقی مقالہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے حکیم کمال الدین صاحب کو "پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ اسی طویل مقالہ سے علامہ کنتوری کی سوانح اور طبی خدمات پر مشتمل ابواب کا انتخاب کر کے موصوف نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

مصادر و مراجع کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے تحقیق و جستجو میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، نہایت سادہ اور آسان زبان میں علامہ کنتوری کی شخصیت، سوانح اور علمی و فنی خدمات کا پورا احاطہ کر لیا ہے۔ علامہ کے معمولات و تجربات کی شمولیت نے کتاب کی قدر و قیمت نیز افادیت اور بڑھا دی ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب صرف اطبا اور طلبا طب کے لیے ہی نہیں، علوم مشرقیہ کے طالبین اور اسکالروں کے لیے بھی یکساں طور پر مفید ہے۔ توقع ہے کہ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

—————— ڈاکٹر تسخیر فہمی

نام کتاب: "غزالاں" (شعری مجموعہ)
شاعر: حفیظ بنارسی قیمت: پچیس روپے
ملنے کے پتے: بک امپوریم۔ سبزی باغ، پٹنہ۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی
کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ۔ پروفیسر حفیظ بنارسی، ملکی محلہ آرہ

"درخشاں" کے بعد "غزالاں" حفیظ بنارسی کا تازہ مجموعہ کلام ہے جو تقریباً ایک سو آٹھ غزلوں اور ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں جو حفیظ بنارسی کی تیرہ چودہ سالہ شاعری کا احاطہ کرتی ہیں۔ حفیظ بنارسی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی شاعری کے متعلق "پیش گفتار" میں وہ سب کہنے کی کوشش کی ہے جو ایک باصلاحیت فن کار یا شاعر کہنا چاہتا ہے۔ میں نے عموماً ان کے فن کار کے وسیلے سے حفیظ کو نہیں پہچانا ہے جو پروفیسر احتشام حسین فراق اور جگن ناتھ آزاد وغیرہم کی مرہون منت ہیں۔

حفیظ صاحب نے "پیش گفتار" میں جدیدیت کو وہ "شجرِ ممنوعہ" بھی نہیں سمجھا ہے جس کے چکھنے سے شاعر پر عتاب نازل ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ صالح روایت کے علمبردار بھی ہیں۔ جدیدیت، ترقی پسندی اور روایت کے بیچ ان کی صالح روایت کس موڑ کی نشان دہی کرتی ہے یہ وہ خود ہی جان سکتے ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ انہوں نے کیا کہا ہے اور کیونکر کہا ہے اور "نیم وحشی صنفِ سخن" کو اردو ادب کی آبرو بنانے میں ان کا کتنا ہاتھ ہے۔

"غزالاں" میں جگہ جگہ ان کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ صرف خونِ جگر سے فن کی آبیاری ہی نہیں کرتے بلکہ فن کو بھی خونِ جگر بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یوں نگر نگر پھرنا اک عذاب ہے یارب
تو ہمارے ہاتھوں میں اور کچھ ہنر رکھ دے

بجھتے بجھتے ایک دن سارے دیے بجھ جائینگے
بس گھٹن رہ جائے گی بس اک دھواں رہ جائے گا

اپنی پرچھائیں بھی ڈس لیتی ہے
ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھیے

روح لرزاں ہو گئی جسموں سے کپڑے اُڑ گئے
ایسی طوفانی ہوا تھی ہوش سب کے اُڑ گئے

خدا آباد رکھے میرے گھر کو!
کہیں بھی ایسی ویرانی نہیں ہے

کون گزرا مرے برابر سے
بوئے گل، موجِ صبا کی طرح

چند سطروں میں غزالاں کا پوری طرح سے احاطہ کرنا ممکن نہیں، مجموعی طور پر حفیظ بنارسی کا یہ کارنامہ اس لائق ہے کہ ادب شناس اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں۔

بہار اردو اکیڈمی کے جزوی تعاون سے شائع ہونے والی اس کتاب کی طباعت اور کتابت حفیظ صاحب کے ستھرے ذوق کا پتہ دیتی ہے۔

_______ وقار ناصری

نام کتاب: "نئی کروٹ"

مصنف: مضطر انصاری ۔ قیمت: پچیس روپے

ملنے کا پتہ: مضطر انصاری۔ محلہ ککرہ کلاں، شاہ جہاں پور

مضطر انصاری صاحب کم و بیش ۳۰، ۳۵ سال سے زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ افسانہ ان کا محبوب موضوع ہے۔ "نئی کروٹ" کے عنوان سے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس میں ان کے چودہ افسانے شامل ہیں جن میں بعض مختلف رسائل میں شائع شدہ اور بعض غیر مطبوعہ ہیں جو موضوع اور مقصد کے اعتبار سے ضرور کامیاب ہیں لیکن ان کا طرزِ تحریر پچھلے والا ہے جبکہ اردو افسانہ کتنی کروٹیں لے چکا ہے اور کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔

مضطر صاحب کو کہانی بننے کا فن آتا ہے اور وہ کامیابی سے اپنے کرداروں کے ذریعے اپنا مقصد حل کر لیتے ہیں۔ وہ سماج میں بسنے والے بے یار و مددگار، مفلس، بے روزگار اور پس ماندہ افراد سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں، ان کے دکھ درد کا مداوا کرنا ہی اپنا مقصدِ اولیں تصور کرتے ہیں اسی لیے وہ اپنے افسانوں کے ذریعے قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ان کی فلاح و بقا کے لیے کچھ کرنے کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اسمگلنگ، رشوت خوری اور ڈاکٹروں کی بے رحمانہ روش پر بھی مضطر صاحب نے بے باکی سے قلم اٹھایا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان برائیوں کے مضر اثرات کو اتنی شدت سے محسوس کیا جائے کہ سوائے توبہ کے راہِ فرار نہ مل سکے۔

نئی تہذیب کے کھوکھلے پن اور نئی تعلیم کے مضر اثرات کو بھی افسانوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ "روشنی کا مینار"، "تھپڑ"، "سائنسی دور کا عشق" جیسے افسانے اس کے مظہر ہیں اسی طرح لالچ، خود غرضی اور بے حسی

کو انتہا پر پہنچ کر ناسور بنتے ہوئے، گھاؤ، چاندنی، مشاعرہ اور جاند جیسے افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے اس سے افسانہ نگار کی فن کاری ظاہر ہوتی ہے۔

_____ احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: "روشنی اور دھوپ" (ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ)
مصنف: فضل حسنین قیمت: دس روپے
ملنے کا پتہ: کتابستان ۳۰۔ چک، الہ آباد ۳

اردو ادب میں ڈراموں کی قلت ہنوز برقرار ہے اور ایسے ڈراموں کی تعداد تو آج بھی نہایت قلیل ہے جو فن کی کسوٹی پر بھی پورے اترتے ہوں۔ بہر حال ڈرامے لکھنے کی رسم جاری ہے اور بعض اہل قلم ایسے ڈراموں کی تخلیق کر بھی رہے ہیں جن میں عصری زندگی اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب "روشنی اور دھوپ" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مذکورہ کتاب جناب فضل حسنین کے چار ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے جو آل انڈیا ریڈیو کے مختلف مرکزوں سے وقتاً فوقتاً نشر ہو چکے ہیں۔

مجموعے میں "حرفِ آغاز" کے عنوان کے تحت مصنف رقمطراز ہیں کہ: _____

"ان ڈراموں میں روزمرہ زندگی میں پیدا ہونے والے بعض اہم مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

سطور بالا کی روشنی میں ان ڈراموں کا مطالعہ کرنے سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

ان ریڈیائی ڈراموں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھیں کامیابی کے ساتھ اسٹیج پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

مجموعی طور پر زیر تبصرہ کتاب "روشنی اور دھوپ" متوسط طبقے کے افراد اور حادثات و واقعات کا بڑی کامیابی سے احاطہ کرتی ہے۔ سماج کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی مسائل کی اس کتاب میں بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی گئی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ کتابت و طباعت غنیمت اور قیمت مناسب ہے۔

_____ جعفر عسکری

نمائندہ اردو شاعرات ...... ص ۲۲ کا بقیہ

میرا جینا ہے مالک تری بندگی
تیری چاہت میں ہے اب مری زندگی
سرزمینِ حرم کی عبادت مری
تو نے بخشی ہے حرم کو سعادت بڑی
چوموں کعبے کی دہلیز آنکھوں سے میں

_____ (تجلیاتِ حرمین)

یہاں بھی نسوانی لب و لہجہ اور نسوانی جذبہ ہے لیکن کس قدر پاکیزہ۔ آنکھوں سے کعبے کی دہلیز چومنا صنفِ نازک ہی کا حصہ ہے۔ پاکیزہ لطیف جذبوں کی ترجمانی ام ہانی کے کلام کی بنیادی صفت ہے۔ ان کا شعری مجموعہ پاکیزہ کلام کا مرقع ہے۔ ان کی نظمیں سوز و گداز، رنگ و موسیقی اور والہانہ جذبہ اور کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

ام ہانی اور صائمہ شیری کی آواز موجودہ شاعرات کی محفل میں منفرد ہے۔ نئی نسل کو ایک صحت مند رجحان اور اعلیٰ اقدار سے روشناس کرانے میں یہ آواز بڑی موثر ثابت ہوگی۔

اردو شاعرات کی فہرست طویل ہے اور اس مختصر مضمون میں سب کا احاطہ ممکن نہیں اس لیے ہم نے صرف نمائندہ شاعرات کے تذکرہ پر اکتفا کیا ہے۔

موجودہ تہذیب نے صنفِ نازک کو جو آزادی دی ہے اس سے ان کے اندر ہر میدان میں مردوں سے مسابقت کا جذبہ ابھرا ہے۔ شعر و ادب کے ذریعہ تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے روشن امکانات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعرات اپنی ذات اور شخصیت کا تعارف اور اپنی پہچان بنا سکتی ہیں جس سے قدیم عہد کی عورت محروم تھی۔

نیا دور

جلد ۴۲ — نمبر ۸و۹

نومبر، دسمبر سنہ ۱۹۸۷ء

عنوانات

ایڈیٹر: — امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: — شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر: — ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: — ۴۷۱۰۸

پبلشر: اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو پی لکھنؤ

اپنی بات

ہمارے ملک میں بنیاد پرست، تشدد پسند اور فرقہ پرست طاقتیں اپنی تخریبی کارروائیوں سے ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتی ہیں جو تعمیر و ترقی کے تمام سلسلوں کو روک کر ملک کو دورِ وحشت میں لے جائے جہاں روایت پرستی، تنگ نظری اور علاحدگی پسندی کا راج ہو، انتشار، تناؤ اور تصادم کا بازار گرم ہو اور جس کے نتیجے میں جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم یہاں تک کہ ہماری آزادی کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے، روشن خیالی اور سائنسی اندازِ فکر کا کہیں کوئی وجود ہی نہ رہے جسے عام کرنے کے لیے نئے ہندستان کے معمارِ اوّل پنڈت جواہر لال نہرو تمام زندگی کوشاں رہے۔ انھوں نے سائنسی اندازِ فکر پیدا کرنے پر بہت زور دیا اس ملک کی تعمیر و ترقی کا جو نقشہ انھوں نے بنایا اس کی بنیاد ہی انھوں نے سائنسی نقطۂ نظر پر رکھی۔ لیکن بنیاد پرست اور فرقہ وارانہ طاقتیں اس ملک اور اس کے عوام کو سائنسی فکر سے دور، بہت دور، تنگ نظری اور تعصب کے اندھیرے میں گم کر دینا چاہتی ہیں۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان طاقتوں سے ہوشیار رہیں، ان کے بہکانے میں نہ آئیں اور انھیں بے نقاب کرتے ہوئے ان کی ناپاک سازشوں کو ہر قیمت پر ناکام بنا دیں۔ تبھی ہم مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی کے خوابوں کے ہندستان کی تعمیر و ترقی کا سلسلہ قائم رکھ سکیں گے اور اس ملک کے عوام کو سائنسی اندازِ فکر کی راہ پر آگے لے جا سکیں گے۔

●

آہ! مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن

ممتاز دانشور، عالمِ دین، مورخ اور ادیب مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کا ۱۸؍نومبر کو لکھنؤ میں ایک سڑک حادثے میں انتقال ہوگیا۔

انھوں نے مذہب، تاریخ اور ادب — تینوں موضوعات پر بہت کچھ لکھا جو ناقابلِ فراموش ہے۔ ان کی تصنیفات مذہبی، تاریخی اور ادبی اعتبار سے گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے مذہب، تاریخ اور ادب کو ہم آہنگ کر دیا تو غلط نہ ہوگا۔ یہی نہیں، ایک صحافی کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ مشہور و ممتاز جریدے ماہنامہ 'معارف' کے مدیر تھے جس کے توسط سے علماء اور دانشوروں کا ایک بڑا حلقہ ان کی تحریروں کا منتظر رہا کرتا تھا۔ انھیں بیک وقت چار زبانوں — عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی پر عبور حاصل تھا اور عربی، فارسی، اُردو میں ان کی تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔ ان کی متعدد کتابیں ابھی غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے متعدد کتابوں کے انگریزی ترجمے بھی کیے، وہ بھی ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔

ان کا تعلق بہار کے ضلع نالندہ سے تھا اور وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے حقیقی بھانجے تھے۔ حصولِ تعلیم کے بعد وہ شبلی کالج اعظم گڑھ میں لکچرر ہو گئے تھے۔ پھر بعد میں دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے وابستہ ہوئے۔ انتقال کے وقت تک وہ دارالمصنفین کے ناظم تھے۔

مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن انتہائی گوشہ نشین قسم کے انسان تھے۔ انھوں نے جتنی علمی و ادبی خدمت انجام دی، وہ انتہائی خاموشی کے ساتھ انجام دی۔ جوڑ توڑ کی سیاستوں، مصلحتوں اور نمائش پسندی سے وہ ہمیشہ دور رہے۔ وہ انتہائی منکسر المزاج اور مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ علمی اعتبار سے اتنا بلند قد و قامت رکھتے ہوئے بھی انکساری ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔

ان کا انتقال علم و ادب اور ہماری معاشرتی زندگی کا ایک نقصانِ عظیم ہے، جس پر ادارہ 'نیا دور' اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

●

ایڈیٹر

کنیز زرینہ عقیل
رآباد یونیورسٹی
رآباد۔

پنڈت نہرو

اپنے افکار و عمل کی روشنی میں

۔ ہندوستان کی سرزمین نے اپنی تاریخ میں بڑے بڑے
ںاؤں کو جنم دیا ہے۔ روحانیت، اخلاقیات، سائنس و حکمت،
مفہ و منطق، جوتش و ریاضی، سیاست اور سپہ گری، رقص و موسیقی۔
ن زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں بچا ہے جس میں ہندوستان کے
پوتوں نے عالمگیر شہرت حاصل نہ کی ہو۔ پنڈت نہرو بھی اُن
ظیم سیاست دانوں میں تھے جن کے متعلق لاکھوں صفحے لکھے جاچکے
ں۔ اور جن کی عظیم شخصیت اور قابل فخر کارناموں کے تذکرے
ریبًا تمام زبانوں میں قلم بند ہوچکے ہیں۔ اپنے مثالی کردار اور لائق
ادت سے پنڈت نہرو نے ہندستانی عوام کی زندگی کے ہر شعبے
متاثر کیا۔ عوام کے احساسات، رجحانات اور تصورات کو انھوں
ے ایک نئی سمت عطا کی، قوم کے خیالات، روایات اور اعمال کو
ھوں نے متحرک کردیا، اور ملک کی تاریخ میں ایک نئے باب
اضافہ کیا اور اپنی لامحدود صلاحیت کا ثبوت دیا۔ وہ ماہر
یاست داں، ناانصافیوں اور برائیوں کے دشمن، انسانیت کے
شا، ثقافت کے رہبر، اخلاقیات کے معلم، سماج کے مصلح اور
ی یکجہتی ہندستانی قوم کے سچے ہمدرد اور معمار تھے۔ جنھیں اپنی
ندگی ہی میں غیر معمولی شہرت ملی۔ ہندستان کے سیاسی افق پر طلوع
ونے کے بعد سے زندگی کے آخری لمحوں تک پنڈت نہرو نے ہندستان
ے حقیقی نمائندے کی حیثیت سے شہرت و عزت حاصل کی۔

وہ بیک وقت مفکر سیاست داں، ہندستانی عوام اور
خاص طور پر بچوں سے بے پناہ محبت کرنے والے، مصنف، مطالعہ

کے رسیا، سنجیدہ طبیعت، دوستوں کے دوست اور مخالفوں کے بہی خواہ
تھے۔ ایک قسم کا فلسفیانہ موڈ، فکری انداز اور ایک گونہ بے تعلقی
پنڈت نہرو کی شخصیت کا خاصہ رہا۔ بچپن انھوں نے بغیر ساتھیوں کے
گذارا۔ تعلیم۔ گھر اور وطن سے دُور غیر ممالک میں حاصل کی۔ جوانی
کا زیادہ تر حصہ مختلف جیلوں میں گذرا اور آزادی کے بعد ان کو ایسا
عہدہ ملا جو مصروفیات سے پُر تھا۔ وزیر اعظم ؟ ملک کی سب
سے بڑی سیاسی جماعت کے بے تاج بادشاہ، جدو جہد آزادی کے
ہیرو۔ نعروں، جلسوں، جلوسوں اور ہنگاموں سے وہ کبھی پریشان
نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ سرگرم عمل رہے جیسا کہ تلاشِ ہند میں وہ
خود لکھتے ہیں :۔

"جدو جہد اور سرگرمی کے دوران میں خود کو اس سے
علٰحدہ کرلیتا اور اس پر اس طرح غور کرتا جیسے وہ کوئی
بالکل مختلف چیز ہو۔ کبھی کبھی میں اپنی معمول کی
مصروفیات سے ایک دو گھنٹے چھین کر اور ان مصروفیات
کو بالکل فراموش کرکے، اپنے ذہن کے تنہا کمرے میں
لوٹ جاتا اور تھوڑی دیر کے لیے ایک بالکل دوسری
زندگی گذارتا۔"

ان کی زندگی کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ سیاسی
سرگرمیوں کے باوجود وہ سماجی اصلاح کے کاموں سے کبھی غافل نہیں
ہوئے۔ سیاست میں اخلاقیات اور انسانیت میں شامل کرکے انھوں
نے قومی اتحاد، دیہات، کسان مزدور اور خواتین سب کی فلاح و بہبود

پر توجہ دی اور سارے ملک میں ان مسائل سے دلچسپی پیدا کر دی۔ وہ ہندوستان کے سارے رہنے والوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا سلوک کرنے کی تلقین آخری لمحوں تک کرتے رہے۔

ہندوستان جو کسی زمانے میں اپنی خوشحالی اور دولت کے سبب سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ جب برسہا برس کی جدوجہد کے بعد انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہوا تو جیسے یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ہر طرف بھوک، افلاس، پسماندگی اور جہالت کا بول بالا تھا۔ غیر ملکی حکمراں یہاں کے مال و متاع کو جتنا لوٹ سکتے۔ تھے انھوں نے لوٹا۔ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ جب وہ یہاں سے بدرجۂ مجبوری جائیں تو اس جنت کو جہنم بنا جائیں تاکہ یہاں کے رہنے بسنے والے برسوں اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی ہمسری نہ کر سکیں۔ اگر ہندوستان کو پنڈت نہرو جیسا مدبّر اور ہوشمند حکمراں وزیر اعظم کی صورت میں نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہندوستان کی وہی کیفیت ہوتی جس کا منصوبہ غیر ملکی حکمرانوں نے بنایا تھا۔

نہرو جی نے بہت پہلے آزادی کے بعد کے مسائل کا اندازہ کر لیا تھا بلکہ ان کے حل کے لیے ایک بہت ہی واضح لائحہ عمل بھی ذہن میں بنا لیا تھا۔ آزادی کے بعد جب وہ وزیر اعظم ہوئے تو ان کو اپنے سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرنے کا موقع ملا۔ پنڈت نہرو کی مدبرانہ قیادت ہندوستان کی تعمیر نو میں جتنی مدد و معاون ثابت ہوئی اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ملک تقریباً ایک صدی کی غلامی کے بعد آزادی حاصل کرتے ہی دنیا کی نظروں میں چڑھ گیا۔ پنڈت نہرو نے کامن ویلتھ کا تصور پیش کیا جس کو بہ نظر تحسین دیکھا گیا۔ اور نہ صرف برطانیہ اس کے لیے بہ خوشی رضامند ہوا بلکہ دنیا کے بیشتر تو آزاد ممالک نے اس کی ممبری قبول کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھا۔ کامن ویلتھ کے علاوہ پنڈت نہرو نے ایسی بین الاقوامی پالیسی اختیار کی جس سے ہر ملک کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم ہوئے۔ اس پالیسی کے نتیجے میں ہندوستان کی عزت دوسرے ملکوں میں بڑھ گئی۔ غیر ملکی حکمرانوں نے ملک میں ایسا تناؤ کا ماحول پیدا کر دیا تھا اور ملک کا بٹوارہ کر کے یہاں کی اکثریت کو اقلیت سے اتنا بدظن کر دیا تھا کہ ہر وقت کشیدگی اور تصادم یقینی ہو گیا تھا۔ اس صورت حال سے بھی پنڈت نہرو اچھی طرح واقف تھے، چونکہ ان کی نگاہ بھی دور رس تھی اس لیے انھوں نے اس کا بھی حل ڈھونڈ نکالا ہندوستان اکثریتی فرقے کا ملک ہوتے ہوئے بھی سیکولر ملک قرار پایا جس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، غرض کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مساوی حقوق دیے گئے۔ اس میں بھی نہرو کی ذہانت کارفرما تھی۔ ہندوستان ہمیشہ مختلف مذاہب اور مختلف عقائد کا ملک رہا ہے۔ اس کی وسعت اور عظمت کے دائرے میں مختلف تہذیبیں، مذاہب، ملتیں، نسلیں اور فرقے و طبقے شامل ہیں۔ یہاں مختلف رسم و رواج پر کاربند رہنے والے مختلف النوع نظریات رکھنے والے اور مختلف قسم کی زبانیں و بولیاں بولنے والے افراد موجود ہیں اس لیے نہرو جی نے سیکولرازم کی واضح تعریف کرتے ہوئے کہا کہ سیکولرازم کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ حکومت مذہب کو نیست و نابود کر دے گی یا ان کی اہمیت کو یکسر نظر انداز کر دے گی بلکہ یہاں اس کا مقصد یہ ہے کہ ملک میں جتنے بھی مذاہب پائے جاتے ہیں حکومت ان کا احترام کرے گی اور سرکاری کام کاج میں کسی مذہب کو بھی دخل نہ ہوگا اور یہاں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے اپنے طور پر مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ حکومت کا نہ کوئی مذہب ہوگا اور نہ وہ کسی مخصوص مذہب کی سرپرستی کرے گی۔ پنڈت نہرو کی یہ تدبیر پوری طرح اثر انداز ہوئی اور کشیدگی و تناؤ کا ماحول کافی تبدیل ہوا۔ ملک کے مخصوص ماحول اور حالات کو دیکھتے ہوئے سیکولرازم کا راستہ اختیار کرنا ملک کی بہتری کے لیے از حد ضروری تھا۔ اس لیے کہ وہ اس راز سے بخوبی واقف تھے کہ قوس و قزح کی سی رعنائی اور عظمت رکھنے والی ہندوستانی تہذیب کی تشکیل میں یہاں کے ہر علاقے کے رہنے بسنے والے لوگوں اور مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے افراد کا برابر کا حصہ ہے اور ان کا باہمی اشتراک و تعاون اس ملک کے بہتر و خوشگوار مستقبل کا ضامن ہے۔

ہندوستان کو عالمی برادری میں معزز مقام دلانے اور ملک میں امن و امان کے مسائل سے نپٹنے کے بعد سب سے اہم مسئلہ ملک کی معیشت کا تھا بے کاری، بے روزگاری اور مفلسی کے سبب سائے ہماری معیشت پر چھائے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس ملک کا ایک مخصوص طبقہ شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک ہی ملک کے لوگوں کے درمیان زمین و آسمان کا

فرق تھا، اور ایک نوآباد ملک میں خصوصاً جس نے جمہوری طرز حکومت اختیار کیا ہو، یہ کیفیت بڑی سنگین صورت حال پیدا کر سکتی تھی۔ نہرو جی ان حقائق سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے نئے آزاد ہونے والے ملکوں کے مزاج کو اچھی طرح سمجھا تھا اسی لیے انھوں نے سوشلزم کا راستہ اختیار کیا اور عوام کو جمہوری سوشلزم سے روشناس کرایا، تاکہ ملک کی معیشت بہتر ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ غریب عوام کی فلاح و بہبود پر توجہ دی جا سکے، دولت کی مساویانہ تقسیم ہو اور ہر فرد کو اپنی محنت کا صلہ ملے۔ انھوں نے سوشلزم کا راستہ اختیار کیا اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے کروڑوں عوام نے ان کو اپنا حقیقی رہنما تسلیم کیا اور ان کے نقش قدم پر چلنا باعث مسرت سمجھا۔

پنڈت نہرو نے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کچھ کیا۔ ان کی وسیع النظری اور مدبرانہ قیادت کی بدولت آج ہندستان ہر شعبۂ حیات میں خود کفالتی کی منزل سے ہمکنار ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، اور ہندستان شاہراہ ترقی پر آگے بڑھتا جائے گا، پنڈت نہرو کی عظمت اور ان کی اختیار کردہ پالیسیوں کی افادیت منکشف ہوتی جائے گی۔

پنڈت نہرو امنِ عالم کے حامی تھے وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ اگر انسان کے اندر یا دو انسانوں کے درمیان تناؤ رہتا ہے تو اس کا انجام ہوگا جنگ، اور اس ایٹمی دور میں ہمہ گیر تباہی و تاراجی، اس لیے انسان کو تناؤ سے آزاد رہنا چاہیے۔ انھوں نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ ہمارے ملک میں دولت کی غیر مساوی تقسیم اور نابرابری کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے اگر یہی حالت رہی تو عوام میں بے اطمینانی بڑھتی جائے گی اور سماجی و اخلاقی اقدار کی کوئی پروا نہ کرے گا، اور اگر حالات نہ سدھرے تو ہماری آزادی اور جمہوریت دونوں خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ اس لیے ہندستان کا مطالبہ ہے کہ موجودہ حالات کو بدلا جائے اور نابرابری و استحصال کو مٹا کر مساوات پر مبنی ایک معاشرہ قائم کیا جائے، جس میں زور زبردستی نہ ہو اور ملکیت نہ فرد کی ہوگی اور نہ حکومت کی بلکہ معاشرہ کی ہوگی۔ ایسے معاشرے کا سنگِ بنیاد پنڈت نہرو رکھ گئے ہیں۔

پنڈت نہرو ہندستانیوں کی سیرت میں سادگی، خودداری، محبت، سماجی ہمدردی، باہمی میل جول، انصاف پسندی اور خدمت انسانی کی صفات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہی نہیں، وہ تمام دنیا کو زیادہ حسین اور اس کے باشندوں کو زیادہ خوش و خرم دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا ایک ہی نصب العین تھا یعنی نوع انسان کی فلاح و بہبود۔ وہ جانتے تھے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے عمل ہی واحد طریق کار ہے۔ ماضی ہمیں عمل کے لیے اکساتا ہے، حال عمل کا لمحہ ہے اور مستقبل اس عمل سے وجود میں آتا ہے۔ وہ عہد جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے اور وہ روحانی بحران جو پرانی قدروں کی شکست اور نئی قدروں کے تشکیل نہ پا سکنے سے پیدا شدہ صورت حال کی پیداوار تھا، انھیں بے چین کیے رہتا تھا۔ وہ تادم آخر جد و جہد میں مصروف رہے۔ تھک کر بیٹھ جانا یا ہمت ہارنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ پرانے رسم و رواج کو اب ہم تسلیم نہیں کر سکتے ساری دنیا کے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں، اس لیے ہم کو بھی نئے راستوں کی تلاش کرنی چاہیئے اور اپنی فکر کو نئے ماحول سے ہم آہنگ کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نہرو جی کے افکار و نظریات نے انسانی سماج کے ارتقا کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ❋❋

خریدار اور ایجنٹ صاحبان سے

خریدار حضرات سے گذارش ہے کہ وہ جب بھی زر سالانہ ارسال کریں، یا خط و کتابت کریں تو اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

اپنے ایجنٹ صاحبان سے بھی گذارش ہے کہ اگر کسی سبب انھیں منی آرڈر نمبر سے موصول ہو تو اسے ضرور چھڑا لیا کریں۔ نہ چھڑانے کی صورت میں ادارے کو دوگنا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

—— ادارہ

مظفر حنفی
۳۵۸ - بٹلہ ہاؤس
نئی دہلی - ۲۵

شجاع فرخی
۱۸، دیار حبیب - جنسی جہانگیر آباد
بھوپال

غزلیں

پر شکستوں کی نہ چھیڑو داستاں اس مرتبہ
بیٹھ جائے گا یہ خستہ آسماں اس مرتبہ

ڈھا چکی میرا حصارِ ابر لیکن اے ریگِ رواں!
اتنا غم تو لے کے جائے گی کہاں اس مرتبہ

بات کرنا جرم ہے امسال میرے شہر میں
اور زوروں پر مری طبعِ رواں اس مرتبہ

کیا خبر اب کے بھنور سے ہاتھ نکلے یا نہیں
دیکھیے کیا گل کھلائے بادباں اس مرتبہ

بے سلاخ اب ایک بھی کھڑکی نہیں رہ جائے گی
ہر طرف سے اُٹھ رہی ہیں آندھیاں اس مرتبہ

وہ دریچہ بند ہے، پچھلے برس ایسا نہ تھا
دُور کتنی ہو گئی ہے کہکشاں اس مرتبہ

اے مظفرؔ جمع ہوں گے ساری بستی کے چراغ
آگ سے بچتا نہیں کوئی مکاں اس مرتبہ

رات کنجِ آرزو لذّت بھری سرگوشیاں
اور اس کے بعد سارا دن اذیت کوشیاں

ریشمی سانس، چڑھتی سانس، بڑھتا اضطراب
ساعتِ تخلیق خوشبو سے لدی خاموشیاں

پھر گذشتہ کی طرح اس سے سوالِ آرزو
پھر وہی کیفیتِ دل پھر وہی بے ہوشیاں

تیری آنکھوں تک تھا جیسے بادہ و ساغر کا کھیل
اب کہاں وہ چاندنی راتیں، کہاں مے نوشیاں

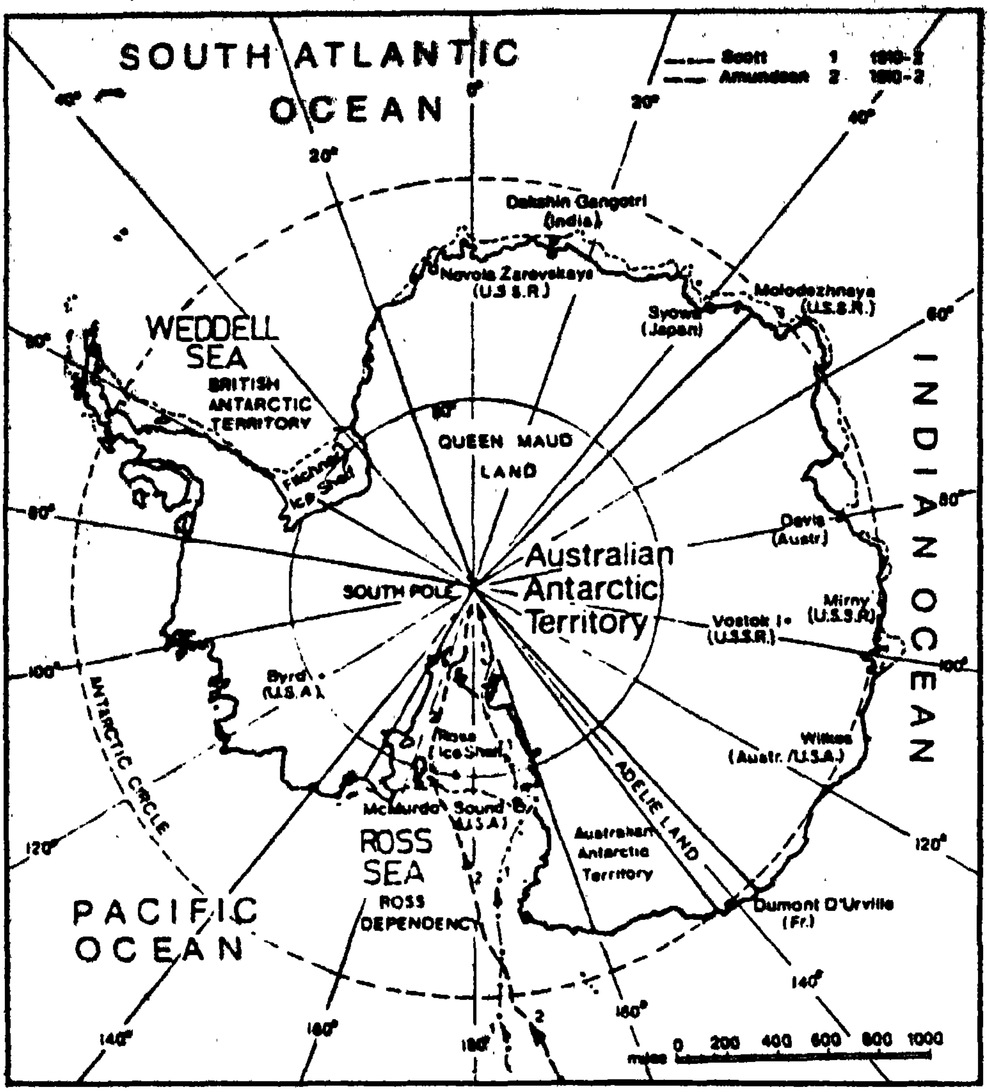
زندگی رقصِ عمل کے مرحلے میں آ گئی
اب سزا دینے لگیں مجھ کو مری مدہوشیاں

سچ کے کڑوے گھونٹ پی کر صاف کہنا سیکھ لو
جرم بن کر سامنے آتی ہیں پردہ پوشیاں

بھولی بسری کتنی یادوں کو جگاتی ہیں شجاعؔ
یہ درختوں سے ہواؤں کی حسیں سرگوشیاں

محمد اسحٰق صدیقی

ساتویں براعظم کی دریافت



برف پوش براعظم اینٹارکٹکا

پُرانے زمانے کے لوگ سات کو ایک بڑا پاک عدد مانتے تھے۔ ہفتے کے سات دنوں کے نام اس زمانے کی یادگار ہیں جب انسان کو قدرت کے نظام میں ہر جگہ عدد سات کی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ سات سیّارے، سات آسمان اور سات زمینیں، اس کی دوسری مثالیں ہیں۔ سطحِ زمین پر خشکی اور تری کے بڑے بڑے حصّوں کی تقسیم سے بھی یہ بات نمایاں ہے۔

سات براعظموں کے نام ہیں: (۱) ایشیا (۲) یورپ (۳) افریقہ (۴) آسٹریلیا (۵) شمالی امریکا (۶) جنوبی امریکا (۷) اینٹارکٹکا۔

سات بحرِ اعظموں کے نام ہیں: (۱) شمالی اٹلانٹک (۲) جنوبی اٹلانٹک (۳) شمالی پیسفک، (۴) جنوبی پیسفک، (۵) بحرِ ہند (۶) آرکٹک، اور (۷) اینٹارکٹک۔

اینٹارکٹکا ساتواں براعظم ہے جو آباد دنیا سے بہت دور قطبِ جنوبی کے اردگرد واقع ہے، اس کی دریافت سب سے بعد میں ہوئی۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز میں دنیا کے نقشوں میں قطبِ جنوبی کے اردگرد کی جگہ خالی دکھائی جاتی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہاں کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ زمین کے جنوبی سرے پر شمالی براعظموں کے جواب میں ایک براعظم ہونا چاہیے، جس کا نام نہ جانے کس نے اور کب "ٹیرا آسٹریلس

ان کاگ نیٹا (TERRA AUSTRALIS INCOGNITA) رکھ دیا۔ یہ نام لاطینی زبان سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں "انجان جنوبی سرزمین"۔ عرصے تک اس بات کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس براعظم کا حقیقتاً کوئی وجود ہے یا یہ محض قیاس آرائی ہے۔

۱۷۷۰ء میں انگلستان کے مشہور سیاح کپتان جیمس کُک (JAMES COOK) نے وہ براعظم دریافت کیا جو بعد میں آسٹریلیا AUSTRALIA کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ نام بھی لاطینی زبان سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "جنوب کا"۔ کُک نے نیوزی لینڈ کا بھی پتہ لگایا۔ اس کے بعد یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کیا نیوزی لینڈ کے آگے بھی کوئی اور ملک ہے، اس نے ۱۷ر جنوری ۱۷۷۳ء کو ریزولیوشن (RESOLUTION) نامی جہاز سے پہلی بار دائرہ قطب جنوبی (ANTARCTIC CIRCLE) کو پار کیا۔ اس نے ۱۷۷۳ء اور ۱۷۷۵ء کے دوران نیوزی لینڈ اور کیپ ہارن[1] (CAPE HORN) کے درمیان تین مختلف مقامات پر دائرہ قطب جنوبی کو پار کیا لیکن سمندر میں تیرتی برف اور کہرے کی وجہ سے وہ اتنی دور تک نہ جا سکا کہ خاص براعظم کو دیکھ سکتا۔

اس نے انگلستان واپس جاکر اطلاع دی کہ بحر جنوبی میں کسی براعظم کا وجود ناممکن ہے اور جہاں سے دائرہ قطب جنوبی شروع ہوتا ہے (۶۶½ درجہ عرض البلد جنوبی) اس کے آگے برف کی چٹانوں اور کہرے کی وجہ سے جہازوں کا جانا محال ہے۔ اس کے بیانات سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ دائرہ قطب جنوبی کے نزدیک سیل (SEAL) اور وھیل[2] (WHALE) کثرت سے پائی جاتی ہیں، جن کے شکار نے اس زمانے میں باقاعدہ تجارت کی صورت اختیار کرلی تھی۔

یہ خبر پاکر بہت سے ملکوں کے جہاز شکار کے لالچ میں وہاں پہنچ گئے۔ وہ سیل اور وھیل کا بڑی بے رحمی سے شکار کرتے رہے لیکن ان کا ایک بھی جہاز خاص براعظم تک نہ پہنچ سکا۔

اتفاق سے ۱۸۲۰ء میں تین ملکوں کے چھوٹے بڑے جہاز چند دنوں کے فرق سے ایک ہی مقام پر انٹارکٹکا پہنچے۔ ایک جہاز انگلستان کا تھا جو وھیل کے شکار کے لیے گیا تھا، دوسرا امریکا کا تھا جو سیل کے شکار کے سلسلے گیا تھا اور تیسرا روس کا تھا جو تحقیقی مہم پر گیا تھا۔ انگلستان، امریکا اور روس یہ تینوں ملک براعظم انٹارکٹکا کی دریافت کے مدعی ہیں، دریافت کا سہرا کس کے سر ہے اس کا فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔

جب انگلستان کا جہاز براعظم کے نزدیک پہنچا تو اس کے کپتان ولیم اسمتھ (WILLIAM SMITH) کو پہلی بار وہاں کی برف کی چٹانیں نظر آئیں۔

امریکی جہاز کے کپتان نیتھ نیل براؤن پامر (NATHANIEL BROWN PALMER) نے ۱۷ر نومبر ۱۸۲۰ء کو انٹارکٹکا کے اس لمبے اور پتلے جزیرہ نما کو دیکھا جس کا نام بعد میں اس کے نام پر پامر پینن شلا (PALMER PENINSULA) رکھا گیا۔

۱۸۲۰ء ہی میں روس کے زار (حکمران) الیگزینڈر اوّل (ALAXANDER I) نے بحر جنوبی کا جائزہ لینے اور نئے ملکوں کی کھوج کے لیے کمانڈر فے بین فان بیلنگ شوسین (FABIAN VON BELLI-NG SHAUSEN) کو بھیجا، جس نے براعظم انٹارکٹکا کا چکر لگایا۔ ساحل کے جابجا نقشے بنائے، کئی خلیجیں اور ساحل سے دور دو چھوٹے جزیرے دریافت کیے جن کے نام روس کے حکمرانوں کے نام پر جزیرہ الیگزینڈر اوّل (ALAXANDER I ISLAND) اور جزیرہ پیٹر اوّل (PETER I-ISLAND) رکھے۔ خود اس روسی محقق اور سیاح کے نام پر آبنائے پامر کے نزدیک سمندر کا نام بیلنگ شوسین سی (BELLING SHAUSEN SEA) رکھا گیا۔ روسی مہم میں دو جہازوں نے حصہ لیا تھا، جن کے نام تھے ووسٹوک (VOSTOK) اور مرنی (MIRNY)، ان کے نام پر بھی انٹارکٹکا میں دو مقامات ہیں۔

انگلستان کے سیل کے شکاری اور تجربے کار سیاح جیمس ویڈیل (JAMES WEDDELL) نے ۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۴ء کے دوران اپنے جہاز جین (JANE) میں تین بار انٹارکٹکا کے ساحل کا مختلف مقامات پر جائزہ لیا۔ اس نے ۱۸۲۲ء میں ان جزائر کا پتہ لگایا جن کا نام ساؤتھ آرکنی آئی لینڈس (SOUTH ORKNEY ISLANDS) رکھا گیا۔ اس نے انٹارکٹکا کے اس سمندر کی کھوج بھی کی جو بعد میں اس کے نام پر ویڈیل سی (WEDDELL SEA) کے نام سے موسوم ہوا، وہ اپنی سیاحت میں ۷۴ درجہ عرض البلد جنوبی تک پہنچ گیا جو اس زمانے میں انسان کی بحر جنوبی میں بعید ترین رسائی تھی (اس سے پہلے جیمس کُک ۷۱ درجہ عرض البلد جنوبی تک پہنچا تھا۔)

فرانسیسی حکومت نے ژول دیومونٹ ڈی اُروِلے (JULES-

(DUMONT D' URVILLE) کو ۱۸۳۸ء اور پھر ۱۸۴۰ء میں اس نئے براعظم کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا، اس نے ساحل کا ایک نیا حصہ دریافت کیا، جس کا نام اس نے اپنی بیوی کے نام پر اے دے لی لینڈ (ADELIE LAND) اور اس کے مقابل سمندر کا نام اپنے نام پر ڈ. اروِلے سی (D' URVILLE SEA) رکھا۔

انگلستان کی ایک جہازران کمپنی کے مالکان اینڈربی برادرس (ENDERBY BROTHERS) نے نامور سیاح جان بسکو (JOHN-BISCOE) کو کھوج بین کے لیے اینٹارکٹکا بھیجا۔ اس نے براعظم کے ساحل کا ایک نیا حصہ دریافت کیا، جس کا نام اس نے اینڈربی لینڈ (ENDERBY LAND) رکھا۔

۱۸۴۰ء میں امریکی حکومت نے لیفٹننٹ چارلس ولکس (LT. CHARLES WILKES) کی قیادت میں چھ جہازوں پر ایک مہم بھیجی، جس نے اسے دے لی لینڈ اور اینڈربی لینڈ کے درمیان تقریباً ۱۵۰۰ میل تک پھیلے ہوئے قطعۂ آراضی کا جائزہ لیا جس کا نام ولکس لینڈ (WILKES LAND) رکھا گیا۔ ولکس نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ اس براعظم کے مختلف حصوں کے بارے میں اس وقت تک سیاحوں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کو یکجا کرنے کے بعد بڑے وثوق سے یہ اعلان کیا کہ زمین کے جنوبی سرے پر ایک ساتواں براعظم ہے جس کے بارے میں صدیوں سے قیاس آرائی ہو رہی تھی، اس نے اس نئے براعظم کا نام انٹارکٹکا رکھا، یہ نام رکھنے کی ایک خاص وجہ تھی۔

سرزمین قطب شمالی کا خاص جانور سفید بھالو (POLAR BEAR) ہے، اسی لیے ٹھیک اس کے اوپر آسمان کے بیچ میں سات سات تاروں کے جو دو مجموعے ہیں ان کی شکل بھی بھالو کی مانی جاتی ہے۔ انھیں عربی اور انگریزی میں دُبِ اکبر (GREAT BEAR) یعنی "بڑا بھالو" اور دُبِ اصغر (LITTLE BEAR) یعنی "چھوٹا بھالو" کہتے ہیں (قطب تارا چھوٹے بھالو کی دم میں واقع ہے)۔ بھالو کو یونانی زبان میں آرکٹوس (ARKTOS) کہتے ہیں، جو ستاروں کے ان مجموعوں کا نام بھی ہے۔ ان کے نیچے جو منجمد بحر اعظم ہے اسے آرکٹک اوشن (ARCTIC OCEAN) کہتے ہیں، اس کے جواب میں زمین کے جنوبی سرے پر جو براعظم ہے اس کا نام ولکس نے اینٹی آرکٹک (ANTI-ARCTIC) یعنی "آرکٹک کا اُلٹا" رکھا جو مختصر ہو کر اینٹارکٹکا (ANTARCTICA) ہو گیا۔

انگلستان کے مشہور سیاح کپتان جیمس کلارک راس (JAMES CLARK ROSS) نے ۱۸۱۸ء اور ۱۸۳۳ء کے درمیان آرکٹک بحر اعظم میں کھوج بین کی تھی اور ۱۸۳۱ء میں زمین کے شمالی مقناطیسی قطب کا پتہ لگایا تھا۔ ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان وہ دائرہ قطب جنوبی میں تحقیق کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس نے تین سال کے عرصے میں اینٹارکٹکا کے ساحل کا چکر لگایا اور پورے براعظم کا نقشہ بنایا۔ اس نے وہاں ایک نئی سرزمین کا پتہ لگایا جس کا نام جنوری ۱۸۴۱ء میں ملکۂ انگلستان کے نام پر وکٹوریہ لینڈ (VICTORIA LAND) رکھا۔ اینٹارکٹکا کے کئی مقامات کے نام خود اس عظیم سیاح کے نام پر ہیں۔ راس سی (ROSS SEA) راس آئس شیلف (ROSS ICE SHELF) وغیرہ۔

راس نے براعظم اینٹارکٹکا میں ساحل کے نزدیک دو جوالا مکھی پہاڑ بھی دریافت کیے جن کے نام اس نے اپنے جہازوں کے نام پر ماؤنٹ ایرے بس (MOUNT EREBUS) اور ماؤنٹ ٹیرر (MOUNT TERROR) رکھے۔

اگر آپ اینٹارکٹکا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو اس میں مذکورہ بالا مقامات کے علاوہ اور بھی بہت سے نام پڑھنے کو ملیں گے۔ یہ نام مختلف ملکوں کے سیاحوں کی دریافتوں کے بعد ایک ایک کر کے رکھے گئے ہیں۔ ان سب کی تاریخ موجود ہے لیکن طوالت کے خوف سے باقی مقامات کے ناموں کی وجہ تسمیہ کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

قطب جنوبی کی فتح

اب تک سیاح اینٹارکٹکا کے ساحلی خطوں میں کھوج بین کرتے رہے تھے، کوئی قطب جنوبی تک نہ پہنچا تھا جو براعظم کے بیچ میں واقع ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے مختلف ملکوں کے مہم جو کوشش کر رہے تھے۔ اس دوران قطب شمالی فتح کرنے کی بھی تیاریاں ہو رہی تھیں جو بحر منجمد شمالی (ARCTIC-OCEAN) کے بیچ میں واقع ہے۔ انسان پہلے قطب شمالی پر پہنچا اور بعد میں قطب جنوبی پر۔

قطب شمالی کے فاتح کا نام تھا رابرٹ ایڈون پی یرے (ROBERT EDWIN PEARY) اس نے ۶ اپریل ۱۹۰۹ء کو قطب شمالی پر پہنچ کر امریکی جھنڈا

کا دیا۔ یہ کارنامہ انجام دینے میں ایک نیگرو اور چار اسکیمو بھی شریک ہوئے تھے۔ پی یرے کا تعلق امریکہ کی بحری فوج سے تھا۔ قطب شمالی سے واپسی کے بعد اسے ریرایڈمرل (REAR ADMIRAL) بنا دیا گیا۔

قطب جنوبی پر پہنچنے کا پہلا منصوبہ انگلستان کے رابرٹ فالکن اسکاٹ (ROBERT FALCON SCOTT) نے بنایا جو برٹش رائل نیوی میں کپتان تھا۔ ۱۹۰۱ء میں اسکاٹ نے قطب جنوبی تک پہنچنے کی پہلی کوشش کی۔ برف سے ڈھکے سمندر میں سفر کرنے کے لیے ایک خاص جہاز بنایا گیا جس کا نام ڈسکوری (DISCOVERY) تھا۔ یہ جہاز انگلستان سے روانہ ہو کر اینٹارکٹکا پہنچا اور جب وہ جزیرۂ راس (ROSS ISLAND) کے جانب جنوب ایک بندرگاہ میں ٹھہرا ہوا تھا، برف میں پھنس گیا اور جاڑے بھر پھنسا رہا۔ اس عرصہ میں اسکاٹ نے وکٹوریہ لینڈ (VICTORIA LAND) کا جائزہ لیا اور اینٹارکٹکا میں ایک نیا خطۂ زمین دریافت کیا، جس کا نام کنگ ایڈورڈ ہفتم لینڈ (KING EDWARD VII LAND) رکھا گیا۔ گرمی کا موسم آنے پر اسکاٹ ۲؍نومبر ۱۹۰۲ء کو قطب جنوبی کے لیے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوا، جن کے نام تھے شیکلٹن (SHACKLETON) اور ولسن (WILSON)۔ وہ اپنے ساتھ برف پر پھسلنے والی بے پہیے کی گاڑیاں لے گئے تھے جنھیں سلیج (SLEDGE) کہتے ہیں۔ انھیں گھسیٹنے کے لیے ۱۹ سدھائے ہوئے کتے تھے۔ سفر کے دوران یہ کتے بڑے کمزور ثابت ہوئے اور ایک ایک کر کے مر گئے۔ اس لیے خود انسانوں کو سامان سے لدی سلیج گاڑیاں گھسیٹنا پڑیں۔ جب وہ قطب جنوبی سے صرف ۵۳۲ میل کی دوری پر تھے ان کی ہمت جواب دے گئی، وہ لوٹ پڑے۔ واپسی پر وہ بڑی مشکل سے اپنے جہاز ڈسکوری کو برف کی گرفت سے آزاد کرا سکے۔ ستمبر ۱۹۰۴ء میں جب جہاز انگلستان پہنچا تو اسکاٹ کا شاندار استقبال کیا گیا۔

کسی بات پر اسکاٹ اور شیکلٹن میں ان بن ہو گئی۔ اگرچہ شیکلٹن کو بھی مہم نے کافی کمزور کر دیا تھا اور وہ بیمار بھی تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور قطب جنوبی فتح کرنے کے لیے ایک دوسری مہم کی تیاری کی۔ اس کے لیے سیل پکڑنے والا ایک چھوٹا جہاز خریدا گیا جس کا نام نمرود (NIMROD) تھا۔ یکم جنوری ۱۹۰۸ء کو یہ جہاز نیوزی لینڈ سے راس ساگر (ROSS SEA) کے لیے روانہ ہوا۔ شیکلٹن نے سلیج گھسیٹنے کے لیے ٹٹو ساتھ لیے تھے لیکن ان میں سے بہت سے ٹٹو برف کے طوفان میں پھنس کر مر گئے۔ ۲۹؍اکتوبر ۱۹۰۸ء تک شیکلٹن اور اس کے آٹھ ساتھی بڑی مستعدی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ اس جگہ پہنچنے کے بعد جہاں ۱۹۰۲ء میں وہ اور اسکاٹ پہنچے تھے انھیں نئے نئے پہاڑ نظر آنے لگے جو راستہ روکے کھڑے تھے اور اس کی بلندی پر سے بیرڈمور گلیشیر (BEARDMORE GLACIER) نظر آ رہا تھا، جس کی چوڑائی تقریباً ۴۰ میل اور لمبائی ۱۵۰ میل تھی۔

۹؍جنوری ۱۹۰۹ء کو جب شیکلٹن اور اس کے ساتھی قطب جنوبی سے صرف ۱۱۱ میل دور رہ گئے تھے، ان کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا اور وہ ۹ ہزار فٹ کی بلندی پر انگلستان کا جھنڈا گاڑ کر لوٹ پڑے۔ انھیں کھانے کی کمی کی وجہ سے واپس ہونا پڑا۔ برف سے ڈھکی زمین پر ۸۵۰ میل جانا اور پھر اتنے ہی میل چل کر واپس آنا (۱۷۰۰ میل) بجائے خود ایک بڑا کارنامہ تھا۔

قطب جنوبی پر پہنچنے والے پہلے شخص کا نام تھا روالڈ ایمنڈسین (ROALD AMUNDSEN) جو ناروے کا باشندہ تھا۔ دراصل اس کا ارادہ قطب شمالی فتح کرنے کا تھا اور وہ وہاں تک پہنچنے کی پوری تیاریاں کر چکا تھا کہ اس نے یہ خبر پڑھی کہ امریکا کا پے یری ۶؍اپریل ۱۹۰۹ء کو یہ کارنامہ انجام دے چکا ہے لیکن قطب جنوبی پر پہنچنا باقی ہے اس لیے وہ قطب جنوبی کے لیے روانہ ہو گیا اور اسکاٹ کو ایک تار کے ذریعہ اپنی روانگی کی اطلاع کی۔

اگست ۱۹۱۰ء کو ناروے کا ایک جہاز اینٹارکٹکا کے لیے روانہ ہوا جس کا نام تھا فریم (FRAM) اس کا کپتان تھا ایمنڈسین۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر تیاری کی تھی۔ ناروے کا باشندہ ہونے کی وجہ سے وہ اور اس کے ساتھی برف پوش سرزمین پر رہنے اور انتہائی سرد موسم کی سختیاں جھیلنے کے عادی تھے۔ مہم میں حصہ لینے والے سبھی لوگ اسکی (SKI) کی مدد سے برف پر پھسلنے میں ماہر تھے۔ (اسکی لکڑی کی ان تختیوں کو کہتے ہیں جنھیں جوتوں کے تلے سے باندھ کر برف پر پھسلتے ہیں۔ سہارے کے لیے ہاتھوں میں دو چھڑیاں ہوتی ہیں چھڑیوں کے سرے پر ایک چرخی لگی ہوتی ہے تاکہ وہ برف میں دھنسنے نہ پائیں) اینٹارکٹکا کی برف پوش سرزمین پر سفر کرنے کے لیے ان کے ساتھ چار سلیج گاڑیاں تھیں، انھیں کھینچنے کے لیے اس نسل کے ۵۲ کتے تھے جو اسکیمو ہسکی (ESKIMO HUSKY) کہلاتے ہیں۔

اے منڈسین نے انٹارکٹکا پہنچ کر راس ساگر (ROSS SEA) کی خلیج وھیل (BAY OF WHALES) کے ساحل پر اپنا بنیادی خیمہ (BASE CAMP) قائم کیا۔ ۱۹ ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو وہ اپنے چار ساتھیوں اور چار سلیج گاڑیوں کو لے کر قطب جنوبی کے لیے روانہ ہوا۔ ہر سلیج کو ۱۳ کتے کھینچ رہے تھے۔ ہموار برف پر وہ بڑی تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ وہ سلیج میں رسی باندھ دیتے جب کتے گاڑیاں گھسیٹتے تو وہ رسی پکڑے اس کے ساتھ خود بھی گھسٹتے چلے آتے۔ آخر میں وہ ایک پہاڑی سلسلے کے پاس پہنچے۔ ان کے سامنے ایک بڑا گلیشیر پھیلا ہوا تھا جس کا نام بعد میں ایکسل ہائی برگ گلیشیر (AXEL HEIBURG GLACIER) رکھا گیا۔ کڑی محنت کے بعد وہ اس کی چوٹی پر چار دن میں پہنچ سکے۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر انھوں نے خیمہ نصب کیا، اب راستہ صاف تھا اور وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ قطب جنوبی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ۱۴ ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو اے منڈسین نے آلات کی مدد سے اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ کیا اور بڑے سکون کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ زمین کے پیندے پر ۹۰ درجہ عرض البلد جنوبی پر کھڑے ہیں۔ اس جگہ سے تمام سمتیں ایک ہی طرف کو جاتی ہیں یعنی شمال کو۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک خیمہ نصب کیا اس پر ناروے کا جھنڈا لگایا، خیمے میں کچھ رسد اور دو خط رکھے۔ ایک ناروے کے بادشاہ ہاکون (KING HAAKON) کے نام اور دوسرا کپتان اسکاٹ کے نام، کیونکہ اے منڈسین کو یقین تھا کہ وہ اس کے بعد قطب جنوبی پر پہنچنے والا دوسرا انسان ہوگا۔ اے منڈسین نے اپنے خط میں اسکاٹ سے درخواست کی تھی کہ اگر وہ (اے منڈسین) اور اس کے ساتھی واپسی کے دوران کسی حادثے کا شکار ہو جائیں تو وہ اس کا خط ناروے کے بادشاہ تک پہنچا دے تاکہ انھیں اس کامیابی کی اطلاع ہو جائے۔

قطب جنوبی پر پہنچنے کا تاریخی کارنامہ انجام دینے کے بعد وہ لوٹ پڑے ۲۵ ر جنوری ۱۹۱۲ء کو اپنے بنیادی خیمے میں لوٹ آئے۔ واپسی پر چار میں سے دو سلیج گاڑیاں اچھی حالت میں تھیں اور ۵۲ میں سے ۱۱ کتے زندہ تھے۔ جو کتے راستے میں مر گئے یا کمزور ہو گئے انھیں مار کر ان کے ساتھی کتوں کو کھلا دیا گیا۔

اس دوران انگلستان میں قطب جنوبی فتح کرنے اور انٹارکٹکا میں سائنسی کھوج بین کرنے کے لیے بڑی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نہ صرف برطانیہ بلکہ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کی حکومتیں بھی (جہاں انگریزوں کا راج تھا) غیر سرکاری طور پر اس مہم کے لیے چندہ جمع کر رہی تھیں۔ اس تحریک کا روح رواں تھا اسکاٹ۔ جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو یکم جون ۱۹۱۰ء کو وھیل پکڑنے والا ایک جہاز ٹیرا نووا (TERRA NOVA) انگلستان کے دریائے ٹیمس سے انٹارکٹکا کے لیے روانہ ہوا۔ یہ جہاز جنوبی افریقہ کے سرے پر واقع کیپ ٹاؤن (CAPE TOWN) ہوتا ہوا ۱۲ ر اکتوبر ۱۹۱۰ء کو



روالڈ اے منڈسین

ملبورن (آسٹریلیا) پہنچا۔ یہاں اسکاٹ کو اے منڈسین کا بھیجا ہوا تار ملا جس سے اسے پتہ چلا کہ وہ بھی قطب جنوبی کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ اسکاٹ نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ عین موقع پر اس کا کوئی حریف پیدا ہو جائے گا۔ اسے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اے منڈسین سبقت لے جائے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایسا ہی ہوا)

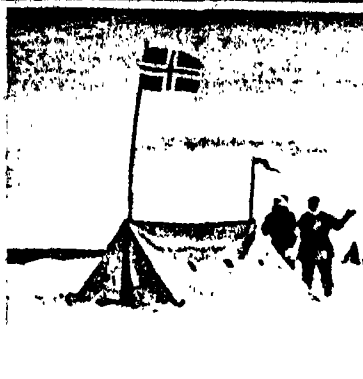
ملبورن سے جہاز انٹارکٹکا کے جزیرہ راس پہنچا۔ اسکاٹ نے براعظم کے ساحل کے اس مقام پر جس کا نام ہٹ پوائنٹ (HOT POINT) تھا، اپنا خیمہ نصب کیا (اسکاٹ کو بعد میں پتہ چلا کہ اسی سمندر کے دوسرے کنارے پر خلیج وھیل میں اے منڈسین کا خیمہ تھا)۔

۱۳ جنوری ۱۹۱۱ء کو سارا سامان جہاز سے ساحل پر اتار لیا گیا۔ اسکاٹ باربرداری کے لیے اپنے ساتھ منگولیا کے دس ٹٹو، ۱۳ سلیج اور ۳۳ کتے لایا تھا۔ مہم میں ۱۶ لوگ شامل تھے، جن میں کئی نامور سائنس داں بھی شامل تھے۔

سامان اتارنے کے بعد جہاز "ٹیرا نووا" نیوزی لینڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کیونکہ قطب جنوبی کی لمبی رات اور جاڑا شروع ہونے والا تھا اور جہاز کے برف میں پھنس جانے کا اندیشہ تھا (وہاں رات اپریل سے ستمبر تک ہوتی ہے) پورا سال اگلے سفر کی تیاریوں میں لگ گیا۔ مناسب فاصلوں پر رسد خانے (ڈپو) قائم کیے گئے جن میں کھانے پینے کا سامان، ایندھن اور ضرورت کی دوسری چیزیں مناسب مقدار میں رکھی گئیں تاکہ سفر کے دوران ان کا استعمال کیا جا سکے۔

انٹارکٹکا کی رات ختم ہونے پر پہلی نومبر ۱۹۱۱ء کو (اے منڈسین کی روانگی کے دو ہفتے بعد) یہ لوگ قطب جنوبی کے لیے روانہ ہو گئے۔ سفر کو تین منزلوں میں بانٹا گیا۔ پہلی منزل ۔ برف کے اس میدان کو پار کرنا جس کا نام "برفانی روک" (ICE BARRIER) ہے ۔ دوسری منزل ۔ برف کا وہ دریا پار کرنا جس کا نام بیرڈ مور گلیشیر (BEARDMORE GLACIER) ہے۔ تیسری منزل ۔ اس بلند پٹھار (PLATEAU) کو پار کرنا جہاں ہر طرف برف ہی برف نظر آتی ہے۔

پہلی منزل بخیر و خوبی طے ہوئی ۔ اس کے بعد چار چار کی دو جماعتیں روانہ ہوئیں جن میں سے ایک کی قیادت خود کپتان اسکاٹ کر رہا تھا ۔ اس کے ساتھی تھے ڈاکٹر ولسن (DR. WILSON) کپتان اوٹس (CAPT. OATES) پیٹی افسر ایڈگر ایونز (EDGAR EVANS)۔



قطب جنوبی پر اے منڈسین کا خیمہ

دوسری جماعت کا قائد تھا لیفٹیننٹ ایونز (Lt. EVANS) اس کے ساتھی تھے لیفٹیننٹ باورز (Lt. BOWERS) لیشلی (LASHLY) اور ٹام کرین (TOM CREAN)۔

جنوری ۱۹۱۲ء کو وہ ۸۷ درجہ عرض البلد جنوبی تک پہنچ چکے تھے۔ وہاں سے دوسری جماعت کو واپس کر دیا گیا اور صرف اس کے ایک فرد باورز کو لے کر پہلی جماعت کے چار لوگ (کل پانچ) قطب جنوبی کے لیے روانہ ہوئے جو وہاں سے ۱۵۰ میل دور تھا۔ وہ جلد ہی تھک گئے کیونکہ وہ سطح سمندر سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر سلیج پر لدا بھاری بوجھ کھینچ رہے تھے (یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سفر کے دوران ٹٹو بڑے اڑیل ثابت ہوئے۔ وہ بیٹھ جاتے پر اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ جب ان کی طاقت جواب دے گئی تو انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا اور ان کا گوشت کھا لیا گیا۔ جب کتے سلیج گھسیٹنے کے قابل نہ رہے تو انہیں بھی پیچھے چھوڑ دیا گیا، اس لیے اسکاٹ اور اس کے ساتھیوں کو سامان سے لدے سلیج کو تقریباً ساڑھے تین سو میل تک خود گھسیٹنا پڑا)۔ ان کی مایوسی کا اندازہ کیجیے کہ جب وہ قطب جنوبی سے بیس میل کی دوری پر تھے تو انہیں برف پر سلیج گھسیٹنے اور کتوں کے پنجوں کے نشانات ملے۔ وہ سمجھ گئے کہ ہم بازی ہار چکے ہیں۔ جب وہ ۱۸ جنوری ۱۹۱۲ء کو قطب جنوبی پر پہنچے تو انہیں وہاں اے منڈسین کا خیمہ ملا۔ اس پر ناروے کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور اندر دو خط رکھے تھے۔ ایک خط میں اسکاٹ کے نام یہ پیغام تھا کہ بعد میں آنے والے خیمہ کے اندر رکھا ہوا سامان اور باہر رکھی ہوئی سلیج استعمال کر سکتے ہیں۔ اسکاٹ نے اپنی ڈائری

میں لکھا: ـــــــــ

"خدائے عظیم! کتنی بھیانک اور کیسی خطرناک جگہ ہے۔ کیا اسی لیے ہم نے اتنی تکلیفیں جھیلی تھیں کہ سبقت نہ لے جا سکیں"۔

اس نے یہ بھی لکھا: ـــــــــ

"اب تیزی سے گھر لوٹنا ہے اور وہ بھی بڑی جدوجہد کے بعد۔ میں حیران ہوں کہ کیا ہم ایسا کر سکیں گے"؟

اس کا اندیشہ بالکل صحیح تھا۔ ۹۰۰ میل لمبا سفر تھا، جاڑا آ رہا تھا اور سبھی اسکروی (SCURVY) کے مرض میں مبتلا تھے، کھانے کی کمی تھی۔ اوٹس اور ایونز کے ہاتھ پاؤں برف سے جل چکے تھے۔ ولسن کی نس چڑھ گئی تھی۔ خود اسکاٹ ایک جگہ گر پڑا تھا اور اس کا شانہ چھل گیا تھا۔

۸ فروری کو انھوں نے پٹھار کو پار کر لیا اور گلیشیر تک پہنچ گئے۔ ایونز کی حالت بہت خراب تھی، وہ دو بار چلتے چلتے سلیج کے پیچھے گر پڑا۔ جب اسکاٹ اور اس کے ساتھی اسے اٹھانے گئے تو وہ برف پر اوندھا پڑا تھا اور بغیر دستانوں کے ہاتھ آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اسے اٹھا کر خیمے میں لایا گیا، لیکن ۱۷ فروری کی رات کو وہ مر گیا۔ اسے وہیں برف میں دفن کر دیا گیا۔

باقی چار لوگ بڑی ہمت کر کے آگے بڑھ رہے تھے لیکن وہ روز بروز کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ سب سے خراب حالت اوٹس کی تھی، اس کے دونوں پاؤں برف سے جل کر سیاہ پڑ گئے تھے۔ اس کے لیے چلنا مشکل تھا ۱۰ مارچ کو اوٹس نے محسوس کیا کہ محض اس کی وجہ سے اس کے ساتھی تیزی سے آگے نہیں بڑھ پا رہے ہیں۔ اس کی ہمت جواب دے چکی تھی لیکن ساتھیوں کا کہنا تھا کہ جب تک دم میں دم ہے چلتے رہو۔

ڈاکٹر ولسن نے اپنے ہر ساتھی کو ضرورت بھر افیم دی اور کہا کہ جب بچنے کی کوئی امید نہ رہے تو افیم کھا کر سو جائیں تاکہ بغیر تکلیف کے مر سکیں۔

۱۵ مارچ کو اوٹس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب وہ آگے نہیں بڑھ سکتا اس لیے وہ اسے بستر میں سوتا چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں لیکن کوئی اس پر تیار نہ ہوا۔ اس نے جیسے تیسے رات کاٹی اور دوسرے دن وہ خیمے سے باہر نکل کر برفانی طوفان میں غائب ہو گیا۔ چلتے ہوئے اس نے



رابرٹ فالکن اسکاٹ

کہا: "میں ذرا باہر جا رہا ہوں اور کچھ دیر میں واپس آؤں گا۔"

اسکاٹ نے اپنی ڈائری میں لکھا: ـــــــــ

"ہمیں معلوم تھا کہ بے چارا اوٹس مرنے کے لیے باہر جا رہا ہے۔ یہ ایک بہادر انسان اور شریف انگریز کا کام تھا۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا اور ہمارا انجام دور نہیں ہے"۔

اوٹس نے اپنے ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دے دی، برف میں آج بھی کہیں نہ کہیں اس کی لاش دفن ہوگی۔

دوسرے دن اسکاٹ کی ٹانگ بیکار ہو گئی۔ اس کے پاؤں کی انگلیاں برف میں بری طرح جل چکی تھیں۔ ۱۹ مارچ کو تھکے ہارے لوگوں نے اپنا خیمہ آخری بار نصب کیا۔ ان کے کھانے اور ایندھن کا ذخیرہ جس کا نام "ون ٹن ڈپو" (One Ton Depot) تھا، وہاں سے صرف گیارہ میل دور تھا۔ وہ وہاں تک ایک دن میں پہنچ سکتے تھے، لیکن برفانی طوفان کی وجہ سے یہ ناممکن تھا۔ طوفان دس دن تک چلتا رہا۔ اس دوران وہ خیمے میں بند رہے۔ وہ ایک ہفتہ تک بغیر کچھ کھائے زندہ رہے۔ اسکاٹ کی آخری تحریر ۲۹ مارچ ۱۹۱۲ء کی ہے اس کے آخری الفاظ یہ ہیں،

"خدا کے لیے میرے ساتھیوں کا خیال رکھنا"۔

غالباً اس تحریر کے بعد ہی موت نے ان بہادر انسانوں کی مصیبتوں کا خاتمہ کر دیا۔ آٹھ مہینے تک ان کی لاشیں خیمے میں پڑی رہیں۔ کسی کو ان کے

انجام کا پتہ نہ تھا۔ جب اسکاٹ اور اس کے ساتھی بنیادی خیمے میں واپس نہ آئے تو ان کی تلاش میں ایک دوسری جماعت بھیجی گئی۔ اس جماعت کو ۱۲ر نومبر ۱۹۱۲ء کو خیمے کے اندر اسکاٹ اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں اس حال میں ملیں کہ ایک طرف ڈاکٹر ولسن بڑے اطمینان سے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر موڑے لیٹا تھا۔ دوسری طرف باورز موت کی گہری نیند سو رہا تھا ان کے بیچ میں اسکاٹ لیٹا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ اپنے دوست ولسن کے سینے پر رکھا تھا۔ اس کی ڈائریاں اور تصویریں سر کے نیچے بستر میں رکھی تھیں۔ پاس ہی وہ خط رکھے تھے جو اس نے اپنی بیوی اور عزیز و اقارب کو لکھے تھے۔ ڈائریوں میں اس بدنصیب مہم کی ساری تفصیلات موجود تھیں باہر سلیج پر مختلف قسم کے پتھروں کے ۳۵ پونڈ نمونے رکھے تھے جنہیں ولسن نے سفر کے دوران سائنسی مطالعے کے لیے جمع کیا تھا۔

مناسب معلوم ہوا کہ ان عظیم انسانوں کی لاشوں کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ سب نے مل کر مرنے والوں کے لیے دعا کی۔ ڈاکٹر ایٹ کِن سَن (DR. ATKINSON) نے امامت کے فرائض انجام دیے۔ لاشوں کو پتھروں سے گھیر کر ایک ٹیلہ بنا دیا گیا اور اس پر لکڑی کی ایک صلیب نصب کر دی گئی۔ ایک دوست نے کہا:

"اپنی عظمت کی تنہائی میں وہ یہاں لیٹے رہیں گے اس حال میں کہ نہ تو ان کے جسم میں تبدیلی ہوگی نہ وہ خراب ہوگا۔ دنیا میں ان کے شایانِ شان یہی مقبرہ ہے۔"

اس حادثے کے ۷۴ سال بعد (۵ر مارچ ۱۹۸۶ء کی خبر) اینٹارکٹکا جانے والے نیوزی لینڈ کے سائنس دانوں کو اسکاٹ کا برف



اسکاٹ کی آخری آرام گاہ

میں دبا ہوا ایک ذخیرہ ملا جس میں موم بتیاں، دیاسلائی کی ڈبیاں، انڈوں کا پاؤڈر اور سارڈائن (SARDINE) مچھلیاں وغیرہ شامل تھیں۔ ان میں سے بعض چیزیں ۱۹۱۰ء کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ چیزیں نیوزی لینڈ کے شہر ولنگٹن (WELLINGTON) کے کرائسٹ چرچ میوزیم میں نمائش کے لیے رکھ دی گئی ہیں۔



حواشی

۱؎ کیپ ہارن۔ جنوبی امریکا کے سرے پر واقع ہے۔ کیپ کو اردو میں "راس" کہتے ہیں۔
۲؎ یہ دودھ پلانے والے جانور (MAMMALS) ہیں جنھیں عام طور پر لوگ مچھلی سمجھتے ہیں۔
۳؎ زمین کے مقناطیسی قطب (شمالی اور جنوبی) کے مقام بدلا کرتے ہیں، جبکہ جغرافیائی قطب مستقل ہیں۔

رزّاق افسرؔ
۱۹۳۔ حیدر علی روڈ۔
لشکر محلہ۔ میسور

تو نے کل کھینچا تھا نقشہ آج کی تقدیر کا

۷ نومبر ۱۹۶۲ء کو بہادر شاہ ظفر کی پہلی صد سالہ برسی کے موقع پر

اے بہادر شاہ ظفر اے عظمتِ ہندوستاں
تو وطن سے اور تجھ سے یہ وطن ہے جاوداں

عزم تیرا حاکمِ بنگال کی اُمید تھا
تو پیامِ ٹیپو سُلطاں کی حسیں تجدید تھا

نامۂ آزادیٔ ارضِ وطن کا تو نقیب
اور صدا سے تیری جاگا ہند کا سویا نصیب

تیری ہر اک سانس میں حُبِّ وطن آباد تھی
ورثۂ آبا کی تجھ کو قدر و قیمت یاد تھی

راہ میں تو نے وطن کی خود کو قرباں کردیا
یعنی جاری جہدِ آزادی کا فرماں کردیا

جاں نثارانِ وطن کا تو سپہ سالار تھا
اک نمونہ وقتِ مشکل بھی ترا کردار تھا

تجھ کو تھی اولاد کی پروا نہ اپنی جان کی
تجھ کو پیاری تھی جہاں سے آن ہندستان کی

دسترس میں جو تری تھا وہ وطن کو دے دیا
کرکے بیٹوں کو نچھاور فرض پُورا ہے کیا

دل شکن حالات میں بھی اے بہادر شہ ظفر
تھا یقیں تیرا بلند اور دُور بیں تیری نظر

ڈھل گیا الفاظ میں تیرا یقیں ہی سر بسر
دشمنوں کے منھ پہ کہدی تو نے دل کی بے خطر

جس کو سُن کر دشمنوں کے ہوش تھے زیر و زبر
جس کے شاہد آج بھی زنداں کے ہیں دیوار و در

ترجمانی تھی وطن والوں کی اپنی اوج پر
جنگ کا اعلان تھا یہ شعر تیرا اے ظفر

غازیوں میں[1] جب تلک باقی ہے بُو ایمان کی
جا کے لندن میں چلے گی تیغ ہندستان کی

تو نے کل کھینچا تھا نقشہ آج کی تقدیر کا
کُل وطن مرہونِ منت ہے تری تدبیر کا

جب تلک گنگ و جمن بہتے رہیں گے اے ظفر
تیرے چرچے بھی یہاں چلتے رہیں گے اے ظفر

---

[1] زیر حراست بہادر شاہ ظفر کو انگریز افسر علا نے جو خود بھی اردو کا ایک شاعر تھا یہ طنزیہ شعر سنایا تھا
دمدمے میں دم نہیں ہے خیر مانگو جان کی ۔۔۔ بس ظفر بس چل چکی اب تیغ ہندستان کی
تو ظفر نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر پڑھا تھا۔

ریاض صدّیقی
لیاقت کالج، کراچی
پاکستان

فنِ واقعہ نگاری میں امیر خسرو کا مقام

برِصغیر کی ادبی اور تہذیبی تاریخ کے ابتدائی سالوں میں کاغذ کی شدید کمیابی اور تصنیف و تالیف کے مشاغل کا فقدان بہت بڑا مسئلہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی ادبی و علمی اور تہذیبی تاریخ کے لاتعداد بامعنی اور قابلِ حوالہ واقعات پردۂ گمنامی میں رہ گئے۔ خسرو اسی عہد کے شاعر ہیں۔ وہ باغ و بہار طبیعت رکھتے تھے۔ علوم و ادب اور زبان و بیان پر انھیں ایسی قدرت حاصل تھی کہ غالب جیسے خود پسند شاعر نے خسرو کی زبان کو سند قرار دیا ہے۔ خسرو پنجابی، سنسکرت، ہندی، ترکی، فارسی، عربی، پوربی اور اودھی زبانوں کے ماہر تھے۔ ان کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا مانا گیا ہے۔ برِصغیر کی کلاسیکی موسیقی خسرو کے بارِ احسان کو فراموش نہیں کر سکتی کہ انھوں نے فارسی اور ہندی سروں کو ملا کر ہندستانی موسیقی میں نہ جانے کتنے راگوں اور راگنیوں کا اضافہ کر دیا۔ تمام گوناگوں خواص کے ساتھ وہ درباری سیاست اور امورِ سلطنت میں نمایاں مرتبہ رکھتے تھے چنانچہ سات بادشاہوں کے درباروں میں وہ کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔

خسرو کے جملہ کمالات کا ذخیرہ بجائے خود ایک مختصر موضوعات ہے لیکن ان کے اس سرمائے کا ایک گم شدہ ورق خاکہ نگاری، تاریخ نویسی اور وقائع نگاری بھی ہے۔ خسرو نے اپنے دیوانوں پر جو دیباچے لکھے ہیں وہ علم و ادب، تاریخی و تہذیبی واقعات، اہلِ اقتدار کی سیاست اور کوائفِ زمانہ کا مرقع ہیں۔ بعد کے سوانح نگاروں اور مورخوں نے اسی ذخیرہ سے استفادہ کیا ہے۔ خسرو کی پیدائش کا صحیح سن ۶۵۱ھ کا تعین بھی دیباچہ غرۃ الکمال کی اطلاع کا نتیجہ ہے۔ امیر خسرو کی وقائع نگاری کی صحت کا اندازہ بعض وقائع نگاروں کی تحریروں کے تقابل سے ہوتا ہے چنانچہ فرشتہ کی اکثر اطلاعات غلط اور خود ساختہ ثابت ہوتی ہیں۔ فنی اعتبار سے بھی امیر خسرو کی واقعہ نگاری اور تاریخ نویسی قابلِ توجہ ہے۔ تاریخ اور عہد بہ عہد واقعات کا ذکر صرف دیباچوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بعض نظموں میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ مثنوی نہ سپہر ۷۱۸ھ (۱۳۱۹ء)، قرآن السعدین ۶۸۹ھ (۱۲۸۸ء)، مفتاح الفتوح ۶۹۵ھ (۱۲۹۰ء)، مرثیہ لیلیٰ مجنوں ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء)، تاریخ جبلی ۷۱۱ھ—(۱۳۱۱-۱۲ء) اور تغلق نامہ ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) میں اس زمانے کے تاریخی، ثقافتی، درباری، علمی اور عسکری واقعات تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ قرآن السعدین میں ایک جگہ حاکم اودھ خان جہان کا ذکر ہے جو امیر خسرو کو اودھ کے سفر میں ساتھ لے گیا تھا۔

خان جہاں حاتمِ مفلس نواز
گشت بہ اقطاعِ اودھ سرفراز

واقعہ نگاری، تاریخ اور خود نوشت (Autobiography) کے فنی ربط کا مطالعہ دواوین کے دیباچوں میں کیا جا سکتا ہے۔ تحفۃ الصغر کا سنِ ترتیب ۶۷۱ھ (۱۲۷۳ء)، دیوان وسط الحیوٰۃ کا سنِ ترتیب ۶۸۴ھ (۱۲۸۵ء)، دیوان غرۃ الکمال کا سنِ ترتیب ۶۸۵ھ (۱۲۸۷ء) اور دیوان نہایۃ الکمال کی ترتیب کا سال ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) ہیں۔

تحفۃ الصغر کے دیباچے میں سلطان التمش کے عہد سے سلطان بلبن

کے عہد تک کے تاریخی واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہ واقعات ۱۲۷۲ء تک کی مدت کا احاطہ کرتے ہیں۔ خاقانی اور سنائی کے مطالعے کا ذکر بھی اسی دیباچے میں ہوا ہے اور اس حقیقت کا ذکر بھی کہ امیر خسرو کا کوئی اُستاد نہ تھا۔ خواجہ عزیز الدین سے ملاقات اور بعمر آٹھ سال اولین دو شعر موزوں کرنے کا واقعہ بھی اس دیباچے ہی میں رقم ہوا ہے۔ خسرو کے تمام سوانح نگاروں نے ان واقعات کا ذکر اسی دیباچے کے حوالہ سے کیا ہے۔ وسط الحیوٰۃ میں امیر نے اپنے کلام پر ریویو کیا ہے اور صنعتوں پر بحث کی ہے۔ دیباچہ غرۃ الکمال ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ یہاں علمی و فنی بحثوں اور زبان و قواعد کے موضوعات پر نہایت پر مغز بحث کی گئی ہے۔ اس دیباچے میں عہد بلبن سے جلال الدین فیروز خلجی تک کے عہد کا احاطہ کیا گیا ہے۔ گویا یہ دیباچہ ۱۲۶۰ء سے ۱۲۹۵ء تک کے تاریخی واقعات کی اطلاع دیتا ہے۔ دیباچہ غرۃ الکمال "½۷×"۵ کے پچانوے صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ زبان و بیان مقفیٰ نہیں ہے لیکن مسجع ضرور ہے۔ امیر خسرو کو صنائع و بدائع کے استعمال کا شوق تھا چنانچہ نثری عبارت میں اس شوق کا مظاہرہ ہوا ہے اور جگہ جگہ عبارات بہت دقیق اور مبہم ہو گئی ہے۔ بعض جگہوں پر توسع کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔

امیر کی انشا پردازی کا کمال یہ ہے کہ بعض مقامات پر ایک ہی جملے میں کسی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو سمو دیتے ہیں۔ دیباچہ کیا ہے دبستانِ تاریخ ہے، شاعر کے لیے وسیلہ آگہی اور سوانح نویس کے لیے معلومات کا خزانہ بے بہا ہے۔ خسرو کے خود نوشت دیباچوں کے مربوط و منظم ترجمے یہاں پیش نہیں کیے جا سکتے تاہم نمونے کی خاطر چند اقتباسات قلم بند کیے جا رہے ہیں۔ ان اقتباسات سے مختلف متضاد موضوعات پر بحث و اظہار خیال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

" ان لوگوں کے نزدیک کہ صاحبان دانش ہیں اور ہر معاملہ میں سوچ سمجھ کر فیصلے دیتے ہیں، انسان احساس و معنی کا سمندر ہے۔ قدرت نے انسان کو قوتِ گویائی کا جوہر عطا فرمایا ہے ورنہ انسان اور جانور کے درمیان فرق کیونکر ہوتا۔

وگرنہ فرق چہ بودی میان مردم و خر

ہنر جس میں شعر گوئی بھی شامل ہے آدمیت کی پہچان ہے ۔

نزد من نیست آدمی ہر کس

مگر آنکس کہ صاحبِ ہنر است

قرآن مجید میں مبالغہ آمیز شاعری کو رد کر دیا گیا ہے لیکن با مقصد اور حکیمانہ شاعری کے لیے لفظ حکمت استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن میں لفظ حکمت بمعنی علم استعمال ہوا ہے۔ سرورِ کائنات نے قرآن کے معنوں کی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے شعر کو حکمت ہی کی ایک قسم فرمایا ہے لیکن حکمت از قسم شعر نہیں ہو سکتی۔

حکمت را قسمی از شعر نہ کہ شعر را قسمی از حکمت"

(دیباچہ غرۃ الکمال ص۶ تا ۹ اور ص۲۰ تا ۲۲)

صفحات ۶۸ تا ۷۵، سرگزشت خویش کے عنوان سے امیر نے اپنی آپ بیتی نہایت رواں زبان میں بیان کی ہے۔ دیباچہ تحفۃ الصغر میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

" بطور خود کلام کہتا رہا، استاد کوئی نہ تھا، البتہ اساتذہ کے کلام کی پیروی ضرور کرتا تھا۔ انوری و سنائی کا کلام پڑھا تو ان دونوں کے رنگ میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ خاقانی کا کلام غور سے پڑھا لیکن اس شاعر کی بلاغت کے معیار کو سمجھنا میرے بس سے باہر تھا۔"

زیر نظر دیباچوں میں تفصیل کے ساتھ تاریخی واقعات رقم کیے گئے ہیں، ان واقعات میں زمانی ربط و تسلسل موجود ہے البتہ دیباچہ غرۃ الکمال میں دو مقامات پر سنین کا ربط مبہم ہو گیا ہے۔ یہ ابہام دیباچے کے حوالے سے ہمیں بغرا خاں اور شاہزادہ محمد خاں کے واقعات میں نظر آتا ہے۔ خسرو کی خود نوشت کا انداز بتلاتا ہے کہ وہ بغرا خان کے ساتھ لکھنوتی گئے اور وہاں سے واپسی پر فوراً محمد خاں کے ساتھ ملتان چلے گئے۔ خسرو نے ۶۷۷ھ (۱۲۷۹ء) میں لکھنوتی کا سفر شروع کیا۔ ۱۲۸۰ء میں لکھنوتی پہنچے اور ۱۲۸۲ء میں دہلی واپس آتے ہی ملتان روانہ ہو گئے لیکن مستند مورخین نے سنین کی جو فہرست نقل کی ہے اس کی رو سے واقعہ ملتان کا سال ۱۲۸۰ء متعین ہوا ہے۔ گویا مندرجہ بالا دو واقعات کے درمیان پانچ سال کی طویل مدت حائل ہے اس مدت میں جو واقعات

رونما ہوئے ہیں دیباچے میں ان کا ذکر نہیں تھا۔ خسرو نے زیر نظر دیباچے میں سلطان جلال الدین خلجی کی تخت نشینی ۶۹۵ھ (۱۲۹۵ء) تک کے واقعات قلم بند کیے ہیں لیکن آخر میں لکھتے ہیں کہ دیباچہ ۶۸۵ھ (۱۲۸۷ء) میں تمام ہوا۔ خلجی کی تخت نشینی کا واقعہ ۶۹۵ھ (۱۲۹۵ء)۔ گویا ان دو موضوعات کے مابین بھی پانچ سال کا عرصہ حائل ہے اور خسرو کا بیان متنازعہ نظر آتا ہے۔

واقعہ نگار اور تاریخ نویس خسرو کے اظہار و بیان کا انداز ذیل کے اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے:

"بغرا خان کی محفل میں میرے جوہر پوری طرح نمایاں نہیں ہوئے تھے کہ علم بلند ہوا اور شاہی لشکر بغرا خاں کی قیادت میں طغرل کی بغاوت پر قابو پانے کے لیے لکھنوتی روانہ ہوا[۴] مجھے بھی سفر کا حکم ہوا۔ ہم بہ مشکل تمام ایک سال بعد لکھنوتی کے قریب پہنچے۔ منزل کا اب بھی پتہ نہ تھا (راہ منقطع نہ بود) چنانچہ اصل جگہ سے ڈیڑھ سو کرہ[۵] پیچھے رُکنا پڑا۔"

اس واقعے کے بعد ملتان کا واقعہ قلم بند ہوا لیکن بغرا خاں اور معز الدین کے درمیان معرکہ آرائی اور مصالحت کا واقعہ دیباچے میں نہیں بیان ہوا ہے۔ اس واقعہ کی پوری تفصیلات امیر نے مثنوی قران السعدین ۶۸۸ھ (۱۲۸۹ء) میں بیان کی ہیں۔ یہ مثنوی معز الدین کیقباد کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔

غرۃ الکمال کے دیباچے میں صفحہ ۶۶ پر خسرو نے ہندی نثر نگاری اور شاعری کا ذکر کیا ہے۔ اس تحریری ثبوت کے بعد ہمارے محققین کے خدشات بے معنی ہو جاتے ہیں اور ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ امیر خسرو کا شمار اردو کے اولین شاعروں میں ہوتا ہے۔ امیر نے ص ۶۲ پر اپنی ہندوی بیت کا نمونہ بھی نقل کیا ہے۔

آئی آئی ہمان بیاری آئی

ماری ماری براہ موری آئی (ص ۶۲)

"اس دیوان میں کہیں کہیں فارسی کے ساتھ ہندوی (اُردو) لفظ پیوند کئے ہیں اس عمل کے لیے معذرت چاہوں گا۔ میں نے ہندوی (اردو) میں نثر اور نظم دونوں لکھی ہیں مگر یہاں اس کو شامل کرنے کا جواز نہیں ہے کیونکہ زبان فارسی کی لطافت کسی دوسری زبان کے پیوند کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ چند ہندی لفظ جہاں ضروری تھا پیوند کر گیا ہوں۔ ہندوی زبان کا ماہر ہوں اور اس زبان پر ناز کیوں نہ کروں۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب

شکر مصری[۵] ندارم کز عرب گویم سخن

بلکہ یہ کہوں تو مضائقہ نہ ہوگا کہ ہندوستان کے طیور بھی مجھ سے ہندوی (اُردو) میں باتیں کرتے ہیں۔

چو من طوطی ہندم[۶] از راست پرسی

ز من ہندوی بہ پرس تا نغز گویم

(ص ۶۵ تا ص ۶۶)

خسرو نے ص ۶۶ پر پنجاب کے اُردو شاعر مسعود سعد سلیمان کا ذکر کیا ہے۔ مسعود سعد سلیمان کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی ہے۔ عہد حاضر کے اہل تحقیق ابھی تک مسعود سعد سلیمان کے بارے میں کوئی واضح فیصلہ رقم نہیں کر سکے ہیں۔ خسرو کے حوالے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسعود یقیناً اُردو کے اولین صاحبِ دیوان شاعر ہیں چنانچہ اردو شاعری کی اولیت کا شرف بھی پنجاب کو حاصل رہے گا۔ مزید یہ کہ مسعود سلیمان صاحبِ دیوان تھے چنانچہ قلی قطب شاہ کی اولیت کا دعویٰ بھی باطل ثابت ہو جاتا ہے۔

"مسعود سعد سلیمان را اگرچہ است اما آں سر دیوان در عبارت عربی و پارسی و ہندی بُود[۶]۔"

اپنے تین فارسی دواوین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "مسعود سعد کے بھی تین دیوان ہیں لیکن یہ دیوان بالترتیب ہندی، فارسی اور عربی میں ہیں۔ صرف فارسی میں تین دیوان میرا ہی سرمایہ ہیں[۶]۔"

حواشی:

[۱] ڈاکٹر وحید مرزا نے تحقیق کے بعد خسرو کی پیدائش کا سن ۶۵۱ھ متعین کیا ہے اور اس سن کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ خسرو کے دیباچے سے بھی اس سن کی سند ملتی ہے۔ دیباچہ ص ۴۵ (باقی ص ۵۹ پر)

عادل صدیقی
جبستی پورہ، کوٹھی حبیب صاحب
غازی آباد (یوپی)

کلاسیکی شاعری کی آبرو

محمد عثمان عارف

پیکرِ علم ودانش، حرکت وعمل کا اعلیٰ ترین نمونہ، ادبی و تہذیبی زندگی کی متحرک علامت، فخرِ روزگار نیز قلب ونظر کی وسعتوں کو سمیٹنے والے، رفتار وگفتار کی سچائی اور جراَتِ اظہار کی خوبیوں کو حرزِ جاں بنانے والے، علم وحکمت کی سربلندیوں اور کائنات کا رشتہ قائم کرنے والے، انسانوں کے درمیان محبت کا بیج بولنے والے، ادب کے راستے وحدتِ انسانی کے راستوں کو تلاش کرنے والے، اظہار وابلاغ کے صحت مند رشتوں کو اپنی شاعری کے وسیلے سے مضبوط کرنے والے، اپنی مصروف زندگی میں علم مجلسی کو زندہ رکھنے والے، مختلف الخیال اور شدید متضاد نظریات کے حامل انسانوں کے درمیان خلوص کا پُل تعمیر کرنے والے، قلم کی کاشت سے بلند انسانی اقدار کی فصل کو دلآویز ودلنشین بنانے والے، عرفانِ ذات اور عرفانِ کائنات کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے والے، دولت شاعری کی وراثت سے فیض یاب ہوکر اس فیض کو دوسروں تک پہنچانے والے جناب محمد عثمان عارف نقشبندی نے اپنی شاعری کی تڑپ سے ایسے سرسبز وشاداب گل بوٹے کھلائے ہیں جو غالب کے اس شعر کا مصداق ہیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شاعر کے منصب اور عام انسانوں پر اس کے تفوق کو سمجھنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ شاعری دراصل ساری حیاتِ مرتی پر چھائی ہوئی ہے۔ دُنیا کا کارخانہ محض کمپیوٹر اور برقیات پر ہی منحصر نہیں، یہ ضرور ہے کہ ہماری روزمرّہ کی زندگی میں ان کی افادیت اور ضرورت بڑھتی نظر آتی ہے لیکن جس قدر ان کی ضرورت بڑھے گی، اسی قدر شاعری کی قدرومنزلت بڑھے گی۔

محمد عثمان عارف ۵ راپریل ۱۹۲۳ء کو بیکانیر (راجستھان) میں پیدا ہوئے آپ کا تعلق ایک علمی اور مذہبی خاندان سے رہا ہے۔ آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ مذہبی رواداری کا دور تھا۔ چنانچہ آپ کے والد ماجد علامہ الحاج محمد عبداللہ نے بیکانیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوششیں کیں۔ ان دنوں میں تعلیم کے لیے بہت کم مواقع ملتے تھے، مگر آپ نے اپنی خداداد صلاحیت اور علمی ذوق وشوق کو اس طرح پروان چڑھایا کہ سادول ہائی اسکول اور ڈونگر کالج بیکانیر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آگرہ یونی ورسٹی سے بی۔اے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی میں کامیابی حاصل کی۔ آپ کے والد ماجد عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی کے جیّد عالم تھے۔ شاعری سے شوق تھا تو اس کی آبیاری حضرت بیخود دہلوی مرحوم سے کی۔ آپ کے والد بیکانیر میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے عہدے پر فائز تھے آپ کے خاندان کا شمار راجستھان کے علمی اور برگزیدہ خاندانوں میں ہوتا ہے۔

چنانچہ محمد عثمان عارف کو شاعری ورثے میں ملی۔ وہ خود بھی ایک حسّاس اور عالی ظرف انسان اور حقیقت نگار شاعر ہیں۔ شرفا کی ابتری، ملک میں پھیلی ہوئی بے روزگاری اور خوفناک بھوک، بدلتی ہوئی اقدار اور انسانی

معیار کی گراوٹ سے بے حد متاثر ہیں۔ سماجی شکست و ریخت سے کبیدہ خاطر ہیں
آپ کا اندازِ شاعری محض تخیلاتی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں۔ آپ کا کلام جذبات نگاری کی عمدہ مثال ہے، لیکن مایوسی، نااُمیدی اور قنوطیت ان کے یہاں کم ہیں۔ آپ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ انسان کو زندگی میں قلم کی کاشت ہی سرسبز و شاداب رکھتی ہے اور یہ وہ صفت ہے جو دوامی زندگی کے لیے حد درجہ ضروری ہے۔ لہٰذا آپ اپنی انتہائی مصروفیت میں بھی اس کھیتی کو سوکھنے نہیں دیتے بلکہ خونِ جگر سے راتوں کی تنہائی میں اس کی آبیاری کے لیے وقت نکال لیتے ہیں، مگر آپ نے صحت مند ادب اور دیرینہ مگر باوقار روایات کو قلم بند کرنے اور انھیں زندہ کرنے ہی پر اکتفا کی اور وفاداری بشرطِ استواری کے قائل رہے۔ موصوف ایک تابندۂ روزگار شاعر ہی نہیں بلکہ آپ کو اپنے ملک سے محبت ہے۔ آپ کے اشعار ہندستان اور ابنائے وطن سے محبت کے مظہر ہیں۔ آپ ہم وطنوں کے مذہب و تمدن کا بلا لحاظ تفریق احترام کرتے ہیں۔ اولیائے عظام کی تعلیم اور صوفیائے کرام کے مسلک سے خصوصی عقیدت رکھتے ہیں۔ بزرگانِ دین کی تعلیمات آپ کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہے۔ وحدت الوجود کے نکات اور حقائق سے باخبر ہیں۔ ملی جلی تہذیب کی عظمت کے قائل ہیں۔ اس محاذ پر وہ اس شعر کا مصداق ہیں ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشت حاجتِ زنّار نیست

شعر و شاعری سے طبعی مناسبت ہونے کے باعث اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں اور اپنے قوی احساسات کو شعر کے سانچے میں بخوبی اور کامیابی کے ساتھ ڈھال لیتے ہیں۔ آپ ایک دانا اور بالغ نظر شاعر ہیں اور کلاسیکی رنگ کی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ جو کچھ دیکھتے، سوچتے اور سمجھتے ہیں اس کے پیش نظر پس و پیش نہیں کرتے۔ ان کے کردار کی ایک بڑی خوبی ان کی استقامت ہے جو بہر صورت قائم رہتی ہے۔ آپ ایک عالی ظرف انسان ہیں اور غالب کی زبان میں آپ صحیح معنٰی میں "آزاد مرد" ہیں۔ آپ کی شاعری ہمارے دل و دماغ دونوں کو آسودہ کر دیتی ہے۔ زندگی کے نئے تقاضوں کی موجودگی میں وسیع زاویوں کے ساتھ ہماری رہنمائی کرتی ہے اور ہمیں ادبی اقدار کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ آپ کے اشعار میں بھرپور غنائیت ہے۔ مترنم الفاظ کی کثرت ہے۔ غزلوں کی جذباتی فضا ذہن کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اندازِ بیان کی سادگی اور مترنم بحروں سے انکار ممکن نہیں۔ آپ کا دلکش اور شعری اسلوب کلاسیکی شعراء سے متاثر ہے۔ آپ کے اشعار اپنی نغمگی کے باعث براہِ راست موسیقی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ انسان کی جذباتی دنیا پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس پیچیدگی کے اظہار کے لیے آپ نے شعر کا سہارا لیا ہے۔ آپ نے اس خیال کو اپنے کلام سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ شاعری وہ نہیں ہے جو زندگی اور عام انسانوں سے ہٹی ہوئی ہے۔ جو اشعار زندگی کی عکاسی نہیں کریں گے وہ دل میں نہیں اُتر سکتے۔

پدم بھوشن جناب ساغر نظامی نے "قلم کی کاشت" میں آپ کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا:-

"جدید غزل"—— جدید غزل میں سیاسی، سماجی، مذہبی فکری ہر قسم کے عناصر داخل ہوئے۔ تغزل اور عشق کا روپ بھی بدل گیا اور اس کے بعد غزل اقبال کے بالواسطہ اظہار سے بھی آگے بڑھ گئی۔ اس تبدیلی کے اثرات نہایت خوبصورت اور مثبت اور دلدوز انداز میں عارف کی غزل میں نظر آتے ہیں۔

عارف کا کلام غزل کی آفاقی وسعتوں کو بھی چھوتا ہے اور دل کی گہرائیوں کو بھی تجسس اور کیفیات کے اظہار نے اندر اور باہر کی دنیاؤں کو ایک مقامِ اتصال پر لا کھڑا کیا ہے۔ آپ کے اشعار الفاظ کی نبضوں کے سہارے وقت کی دھڑکن کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔ جو افراد "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" پر ایمان رکھتے ہیں وہ کلام کے مطالعے کے دوران خوبصورتی اور کشش کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔"

محمد عثمان عارف نعتیہ کلام سے اس حقیقت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اپنے سادہ دل دلداروں کی دعاؤں کو عزیز رکھتا ہے اور دعا کے قبول ہونے کا انحصار اس بات پر نہیں ہوتا کہ دعا کرنے والا کون ہوتا ہے بلکہ اس کا انحصار صرف رحمتِ خداوندی پر ہوتا ہے۔ محمد عثمان عارف کو خدا پر جو یقین ہے اور اس پر جو توکل ہے اس کی

بنیاد اخلاص و محبت پر ہے۔ عارف نقش بندی نے داغ اسکول سے اپنے والد
بدر کے توسط سے جو رشتہ قائم کیا، اسے بخوبی نبھایا۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے
عثمان عارف کو زندگی کی صداقتوں کا شاعر بتاتے ہوئے لکھا کہ:

"عارف نقش بندی صاحب نے ایک طرف زبان و
عروض کی صحت پر اصرار کیا ہے تو دوسری طرف انھوں نے
لہجہ کی ندرت بیان کی، لطافت اور انداز پیش کش کی ندرت
کا خیال رکھا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں تغزل
کی روح جلوہ گر ہو گئی ہے۔"

ذیل میں چند اشعار نمونہ کلام کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ قارئین
کو یہ اندازہ ہو سکے کہ آپ کی شاعری حسن و عشق کے بیان، کیفیتِ
بیان اور تغزل کی فراوانی سے کس درجہ مملو ہے ۔

راہِ غمِ حیات میں ایسے بھٹک گئے
دیکھا جو ہم کو اُن کے بھی آنسو ڈھلک گئے

گلشن کو نہ برباد کریں، پھول نہ توڑیں؛
احساس تو ہوتا ہے یہ کانٹوں کی چبھن سے

فن کار قلم خون میں اپنے ہی ڈبو کر
سو نقش بنا سکتا ہے اک نقشِ کہن سے

دل ٹوٹ کے آتا ہے جب آتا ہے کسی پر
عارف یہ جوانی بھی قیامت کی بلا ہے

تم نے پوچھا بھی کبھی آج کے انسان کا غم
اپنی گفتار میں وہ زہر اُگلتا کیوں ہے

برق بلا گری کہ قیامت گزر گئی
دنیا اسی کا نام ہے پتھر بنا رہی

محبوب کا ہر ناز، ہر اک غمزہ و انداز
دیکھو تو ادا ہے اسے سمجھو تو قضا ہے

آئینۂ حیات جو دھندلا دکھائی دے
دل کو جگا ابھی یہ چمکتا دکھائی دے

رنگ سو سو نہ بدل اتنے تو منظر نہ بنا
پیاس آتی نہ بڑھا، دل کو سمندر نہ بنا

رنگینیٔ دُنیا سب جینے ہی پہ نربھر ہے
جینے کے جتن کر لو، مرنا تو مقدر ہے

دُودھ کے ڈیپو پر آدھی رات سے جمع لگے
اک پیالی چائے کی یوں صبح لے پاتے ہیں لوگ

آسائشِ حیات کے ساماں کے باوجود
کاندھوں پہ زندگی کا جنازہ دکھائی دے

آپ کے کلام میں عصری حسیت بدرجۂ اتم موجود ہے، آپ ہمیشہ ابدی اقدار
کو گلے لگانے ہی میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس کی ایک ادنیٰ سی جھلک
اس بات سے ملتی ہے کہ آپ نے قلم کی کاشت کا انتساب سعدی کے
اس شعر سے کیا ۔

بنامِ جہاں دار جاں آفریں
حکیمِ سخن بر زباں آفریں

جو شخص بغداد میں کربلائے معلیٰ پر حاضری دے چکا ہو، جوانانِ شہیدِ اعظم
امام عالی مقام حسینؓ، امام اعظم ابوحنیفہؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور
حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے آستانوں پر سر نیاز اور سر عقیدت خم
کر چکا ہو، جس نے حضرت امام حسینؓ کے مزار پر اپنا سلام اور حضرت غوث اعظم
کے آستانے پر منقبت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہو، نیز مسجد نبوی میں
حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اپنا نعتیہ کلام کا نذرانہ عقیدت پیش

کیا ہو، اس سے زیادہ خوش نصیب اور روشن ضمیر انسان اور کون ہو سکتا ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ عارف نقش بندی کا کلام جذبات کی پاکیزگی، بلندیٔ افکار، خود آگہی کی کیفیات اور وارفتگیٔ خیالات کا مظہر ہے۔ ان کا پورا کلام پڑھ جائیے، کہیں بھی ابتذال کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ وہ انسان کی عظمت کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔ آپ کا کلام خود اعتمادی، یقینِ کامل اور معرفت انسانی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ دورِ حاضر میں ایسا پاکیزہ اور باطن کشا اور صاف شفاف کلام ہو خاص و عام کی لذیذ روحانی غذا ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ایک آواز سنتے ہیں اور پہروں گویا ہوتے ہیں ؎

کہکشاں چاند ستارے ترے نقشِ پا ہیں
آسمانوں کو ترا حسن سجا آیا ہے

نئی زندگی اور عصر حاضر کے تقاضوں کی ترجمانی کے لیے وہ کہتے ہیں ؎

ضمانت ہے حیات نو بہ نو تازہ بہ تازہ کی
نئے خورشید کا ہر صبح کرنوں میں بکھر جانا

تیکھے انداز میں سماج پر وار اس طرح کرتے ہیں ؎

سجاؤ چاند تارے بھی اگر اونچے مکانوں میں
سیہ خانوں میں ہوتا ہے چراغاں کون کہہ دے گا

محمد عثمان عارف کی ایک اور کتاب "عقیدت کے پھول" کے نام سے ہے، یہ اگست ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ مجموعۂ کلام نعت، سلام اور منقبت پر مشتمل ہے۔ اس میں جو نعتیں اور سلام کہے گئے ہیں وہ غزل، مسدس یا مخمس کے انداز پر ہیں۔ نعت گوئی ایک مشکل فن ہے اور یہ فن

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سے عبارت ہے۔ اس میں دل کو چھو لینے والی بات یہ ہے کہ نعت شریف کہنے کے لیے جس قدر خلوص اور عاجزانہ لب و لہجہ درکار ہوتا ہے اس کی جھلک بدرجۂ اتم ہے۔ کربلا کا واقعہ تاریخ عالم کا اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ ہے۔ بقول پروفیسر ظہیر احمد صدیقی جس تسلیم و رضا کی ابتدا اسمٰعیلؑ سے تھی اس کی انتہا حسینؑ ہیں۔ آپ نے "درسِ شہادت" لکھ کر خاندانِ نبویؐ سے اپنی عقیدت کا ثبوت دیا ہے۔ مگر فرقِ مراتب کا خیال ضرور رکھا ہے۔ اس نظم کا ہر بند سبق آموز اور لائق مطالعہ ہے۔ آپ نے حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی عقیدت میں نذرانے پیش کیے ہیں لیکن ان تمام مقالات پر انھوں نے خلوص اور فراوانی کے دریا بہائے ہیں اور اس کے ساتھ ہی فن شعر کے لوازمات کا التزام بھی پورا پورا رکھا ہے۔ انتہائی سادہ اور دل کش زبان میں خوبصورت تشبیہات کی مدد سے آپ نے والہانہ رنگ میں نعتیہ کلام پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

انوار ہی انوار، تجلی ہی تجلی
ہر منظرِ دل کش یہی کہتا ہے ادھر دیکھ
ہیں عرش پہ یا گنبدِ خضرا پہ نگاہیں
اے دیکھنے والے، یہ ہے معراجِ نظر دیکھ

چہرہ ہے محمدؐ کا گیسو ہیں محمدؐ کے
جو صبح مدینہ ہے جو رات مدینے میں

سینہ ہے کہ گنجینۂ اسرارِ الٰہی
چہرہ ہے محمد کا کہ قرآن مبیں ہے
طیبہ کی تجلی ہو کہ ایمن کا نظارہ
بدلے ہوئے عنوان ہیں افسانہ وہی ہے

محمد عثمان عارف کے احساسِ عقیدت، خاندانِ نبوی سے تعلق اور بزرگانِ دین کے تئیں خلوص بھرے جذبات نے آپ کی شاعری کو ابدی بنا دیا ہے۔ وہ فنا فی اللہ کی سرحدی کیفیت سے اثر انگیز اشعار کہتے ہیں جس سے نہ صرف معراج نبوی کا مقصد پورا ہوتا نظر آتا ہے بلکہ انسان کی عظمت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

اک آن میں کس شان سے پہنچا ہے کہاں تو
یہ چاند، یہ خورشید تری گردِ سفر ہے
اے سیدِ کونین تری ذات گرامی
تکمیل ہے انسان کی معراجِ بشر ہے

مختصراً یہ کہ محمد عثمان عارف کا کلام معیارِ تغزل، احساس، جذبے، تخیل اور عقیدت کی ملی جلی صورتِ حال پر مبنی ہے۔ انہیں کے سہارے آپ نے غزل کی رگ و پے میں جو فضا باندھی ہے وہ نہ صرف موثر اور دیرپا ہے بلکہ آفاقی نوعیت لیے ہوئے ہے۔

اخلاق ان کا شیوہ تو الطاف ان کی خو
پھولوں سے نرم غنچوں سے نازک ہے گفتگو
قسمت سے جس نے دیکھ لیا چہرۂ نکو
آنکھیں ہوئی ہیں پاک، ہوا قلب باوضو

آپ کی شاعری انسانیت اور خاص کر مذہبِ انسانیت سے آپ کی قربت کا اظہار ہے۔ وہ شاعری کے وسیلے سے مذہب کے نام پر ماضی سے رشتہ استوار کرتے ہیں اور اعلیٰ انسانی اقدار کی اپنی شاعری سے تبلیغ و اشاعت کرتے ہیں البتہ غیر ضروری اصطلاحوں اور نام نہاد سائنسی عقلیت پسندی سے گریز کرتے ہیں۔ کلام کو اس طرح کی فلسفانہ موشگافیوں سے بوجھل نہیں کرتے۔ وہ انسان دوست اور وطن پرست شاعر ہیں۔ وہ اپنا تراشیدہ کلام تازگی اور جودتِ طبع نیز صداقت اور خلوص کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ مصرعوں کا آہنگ بے حد موزوں اور متناسب ہے۔ آپ کے اشعار سے شدّتِ احساس اور پروازِ تخیل کا حسین امتزاج واضح ہوتا ہے۔ وہ فکر و فن کی سلاست روی اور فکری اعتدال کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ ذہن کی بلندیوں، افکار کی وسعتوں اور شعور کی پاکیزگی کو عزیز ترین سرمایہ جانتے ہیں۔ اُردو شاعری کو ایسے پاکیزہ ذوق سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ کے کلام کی روشنی میں امید ہے کہ یہ ذوقِ شاعری اور نکھرے گا اور اپنی فکری و فنی صلاحیتوں سے شعرائے کرام میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہوگا۔

* *

مظھر رائے بریلوی

رائے بریلی سپر مارکیٹ

یک جہتی

قریہ قریہ چپّہ چپّہ یک جہتی کی بات کرو
مندر، مسجد، گردواروں میں بات یہی دن رات کرو

گیتوں، نظموں، تقریروں تک بات نہ یہ سرکار رہے
دردِ محبّت کی صہبا سے ہر اک دل سرشار رہے

لوگ ہلاہل گھول رہے ہیں وقت کی ستھری صہبا میں
موت کے سائے ڈول رہے ہیں یاد و ساری دنیا میں

آج تلک جن ہاتوں میں ہیں خون کی پیاسی شمشیریں
کاش اُن ہاتوں میں ہم دیکھیں عہدِ وفا کی تحریریں

فصلِ خزاں کے بعد یقیناً فصلِ بہاراں آئے گی
پھر بھارت کی پھلواری پر مست ہوا لہرائے گی

اندر کے انساں کو جگاؤ تو لوگو کچھ بات بنے
بیداری کا گجر بجاؤ تو لوگو کچھ بات بنے

رامؑ، محمدؐ، عیسیٰؑ، گوتم سب نے یہی پیغام دیا
سب نے پیار کی جوت جگا کر ہر دشمن کو رام کیا

دیکھ کے چاروں سمت اندھیرا کیوں افسردہ ہو مظہر
اس اندھیارے کے دامن سے اُبھرے گا مہرِ تابندہ

خورشید افسر بسوانی
بسواں ضلع سیتاپور

منشی پریم چند کی کہانی

منشی پریم چند ۳۱ر جولائی ۱۸۸۰ء بروز دوشنبہ بنارس سے سات کلومیٹر دور لمہی گاؤں کے ایک متوسط کائستھ گھرانے میں پیدا ہوئے، اُن کے والد نے ان کا نام دھنپت رائے رکھا لیکن چچا نے نواب رائے کہنا شروع کیا۔ والد ڈاک خانہ میں کلرک تھے اور بیس روپیہ ماہوار تنخواہ پر سارے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ قلیل تنخواہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ معاشی پریشانیاں گھیرے رہتی تھیں لیکن جب یہ تنخواہ بیس روپیہ سے بڑھ کر چالیس روپیہ ماہوار تک پہنچی تو کچھ ہی دنوں میں پریم چند کے والد "عجائب رائے" سورگباشی ہو گئے۔ دھنپت رائے اپنے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھے ہمیشہ معاشی پریشانیوں میں دن گزارنا پڑے"۔۔۔۔ اپنے بچپن کے حالات میں تحریر کیا ہے:۔۔۔۔۔

"آندھرا کے پُل کا جوتا جو دھا میں نے بہت دنوں پہنا ہے۔ جب تک والد صاحب زندہ رہے انھوں نے میرے لیے بارہ آنے سے زیادہ کا جوتا کبھی نہیں خریدا، اور چار آنے گز سے زیادہ کا کپڑا کبھی نہیں خریدا۔" [1]

پھر لکھتے ہیں:۔۔۔۔۔

"جب میرے پتا جی کا تبادلہ جمیمن پور ہو گیا وہاں پتا جی نے جو مکان لے رکھا تھا اس کا کرایہ ڈیڑھ روپیہ ماہوار تھا نہایت گندہ مکان تھا۔ اس مکان کے دروازے پر ایک کوٹھری تھی وہی مجھے سونے کے لیے ملی۔"

پیسوں کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔ "بارہ آنے اسکول کی فیس پڑتی تھی اسی میں ایک آدھ آنہ کھا جاتا تھا اس لیے فیس دینے میں دقت ہوتی تھی۔"

دھنپت رائے ابھی مشکل سے پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد نے انھیں اُردو پڑھانے کے لیے ایک مولوی صاحب کے پاس بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ جب یہ آٹھ برس کے ہوئے تو ان کی والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں، کچھ ہی دنوں بعد عجائب رائے نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ایک تو خورد و نوش کی پریشانیاں تھیں ہی دوسرے یہ کہ وہ اپنی ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو گئے۔

پریم چند میں حسّی اور جمالیاتی جذبہ بچپن ہی سے پیدا ہو چلا تھا۔ چونکہ وہ ایک ذہین اور ہونہار طالب علم تھے اور پھر آس پاس کے ماحول کا بھی ان پر اثر پڑا تھا، اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"میں جس مکان میں رہتا تھا وہ ایک اہیرن (گوالن) کا مکان تھا، وہ بیوہ تھی، اس میں اور میری چاچی (سوتیلی ماں) میں کافی ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ میں بھی سنتا، مجھے ان کے ہنسی مذاق میں مزہ آتا تھا۔"

آگے لکھتے ہیں کہ:۔۔۔۔۔

"مجھے تیرہ سال کی عمر ہی سے ان باتوں کا علم ہو گیا تھا جو بچوں کے لیے بڑی مسرّت رساں ہوتی ہیں۔"

ممکن ہے کہ اسی جذبے کے تحت انھوں نے افسانے اور ناول پڑھنا شروع کیے ہوں اس لیے کہ ان کا خود بیان ہے:

"میری تیرہ سال کی عمر رہی ہوگی، میں ہندی بالکل نہیں

جانتا تھا۔ اُردو میں ناول پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ مولانا شررؔ، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، مرزا رسواؔ، مولوی محمد علی رہر دولوی اس وقت عوام کے مقبول ناول نگار تھے۔ ان کے ناول جہاں ملتے تھے اسکول کی یاد بھول جاتی تھی اور ناول ختم کر کے ہی دم لیتا تو ا۔ اس زمانے میں رینالڈز کے ناولوں کی دھوم تھی، اُردو میں ان کے ترجمے دھڑا دھڑ نکل رہے تھے میں بھی ان کا عاشق تھا۔ حضرت ریاضؔ خیرآبادی نے جو اُردو کے مشہور شاعر تھے اور جن کا حال میں انتقال ہوا ہے، رینالڈز کی ایک تخلیق کا ترجمہ "حرم سرا" کے نام سے کیا تھا۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ کے ہفت روزہ "اودھ پنچ" کے ایڈیٹر مولانا سجاد حسین مرحوم جو مزاح کے زندہ جاوید فن کار تھے، رینالڈز کے دوسرے ناول کا ترجمہ "دھوکا یا طلسمی فانوس" کے نام سے کیا تھا۔ یہ ساری کتابیں میں نے اسی زمانے میں پڑھیں، اور پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ سے تو مجھے قلبی تسکین ہوتی تھی۔ ان کی ساری تخلیقات میں نے پڑھ ڈالیں۔"

فراقؔ گورکھپوری ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"ان کی (پریم چند) دوستی ایک تمباکو بیچنے والے لڑکے سے ہوگئی تھی۔ اسکول سے واپسی پر پریم چند اس لڑکے کے گھر جاتے وہاں بزرگوں میں حقے کا دور جاری رہتا تھا، اور "طلسم ہوش رُبا" روزانہ پڑھا جاتا تھا۔ "طلسم ہوش رُبا" سنتے سنتے پریم چند کی کلپنا جاگ اٹھی تھی۔" ۵

پریم چند نے اپنے ابتدائی مطالعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"جب میں تیرہ سال کا ہوا تو میرے والد کا تبادلہ گورکھپور ہوگیا وہاں ریتی (محلہ) میں بدھ لال نام کا ایک بک سیلر رہتا تھا اس کے یہاں سے ناولیں لاکر پڑھا کرتا تھا اور اس کے عوض میں کورس کی کنجیاں اور نوٹس اپنے اسکول میں فروخت کرتا تھا۔ (اس طرح بک سیلر کو بھی ناولیں دینے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ) "اس عرصہ میں سیکڑوں ناول پڑھ ڈالے۔"

پہلی تخلیق

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ان میں جمالیاتی اور جنسی جذبہ تیرہ برس کی عمر میں پوری طرح سے بیدار ہو چکا تھا اور انھیں کے قول کے مطابق ان کو ان باتوں کی بھی معلومات ہو چکی تھیں جو اس عمر کے بچوں کے لیے خطرناک ہوتی ہیں۔ یعنی جنسی حس اور جنسی تحریکات سے واقفیت وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ایک طرف کہانیوں اور ناولوں کا پڑھنا اور دوسری جانب احساس کی بالیدگی، جس نے ان کو بھی قلم گھسنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں ایک حادثہ ایسا پیش آیا جو ان کے لیے دل چسپ بھی تھا اور نیک فال بھی۔ پریم چند لکھتے ہیں:

"میں نے جیمن پور ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لکھتا اور پھاڑ دیتا۔ کبھی کبھی پتاجی بھی حقہ پیتے پیتے میری کوٹھری میں چلے آتے، جو کچھ لکھ کر رکھتا، دیکھتے اور پوچھتے۔ نواب! کچھ لکھ رہے ہو؟ میں شرم سے گڑ جاتا۔"

تو ہاں، وہ خوبصورت حادثہ یہ تھا کہ ان کے ایک رشتے کے ماموں تھے جو کبھی کبھی ان کے یہاں بھی آیا کرتے تھے۔ ادھیڑ عمر گزار لانے کے بعد بھی شادی نہیں کی تھی۔ پریم چند لکھتے ہیں:

"ایسے لوگ عام طور پر جو کرتے ہیں انھوں نے بھی وہی کیا۔ ان کا عشق ایک چمارن سے ہوگیا، یہ عشق یہاں تک بڑھا کہ چمارن ہی گھر کی مالکہ بھی بن گئی۔ ادھر ایک شام چماروں نے پنچایت کی کہ بڑے آدمی ہیں تو ہوا کریں کیا کسی کی عزت لیں گے۔ عزت کا بدلہ خون ہی سے چک سکتا ہے، لیکن پٹائی سے بھی کچھ ازالہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے دن جب چمپا ماموں صاحب کے گھر آئی تو انھوں نے اندر کا دروازہ بند کر دیا۔ اُدھر چماروں کا گروہ تاک میں تھا۔ بڑھئی بلوایا گیا کواڑ پھاڑے گئے اور ماموں صاحب بھوسے کی کوٹھری میں چھپے ہوئے ملے۔ چمپا آنگن میں کھڑی رو رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی بھاگ گئی۔ کوئی اس سے نہیں بولا۔ ماموں صاحب بھاگ کر کہاں جاتے، مار پڑنے لگی اور بے بھاؤ کی پڑنے لگی۔ اس حادثے کی خبر اُڑتے اُڑتے ہمارے یہاں بھی پہنچی۔ میں نے بھی اس واقعہ کا خوب مزہ لیا،

پٹنے وقت ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی اس کا تصور کر کے مجھے
خوب ہنسی آئی۔ آخر میں نے ایک دن یہ سارا حادثہ ایک
ناٹک کی شکل میں لکھ ڈالا اور اپنے دوستوں کو سنایا۔"

کسی حد تک پریم چند اس ناٹک کو اپنی پہلی تخلیق سمجھتے ہیں انھیں اس کا افسوس بھی رہا کہ ایک دن ماموں صاحب آگئے۔ اس ناٹک پر ان کی نظر پڑ گئی۔ انھوں نے اس کو "چراغ علی" کے سپرد کر دیا یا اپنے ساتھ لیے چلے گئے۔[۳]

ان کے لیے یہ واقعہ دل چسپ تو تھا ہی لیکن اپنے دور کے معاشرے کا عکاس بھی تھا۔ یہیں سے اظہار کی قوت، معاشرے کی مصوری اور طنز لطیف کے سرچشموں کا سراغ بھی لگا جو آگے چل کر پریم چند کے فن کی شناخت بن گئے۔ اُسی سال ان کی شادی ہوگئی۔ غریبی نے ساتھ چھوڑا نہیں۔ شادی کے لیے جو گڑ ان کے پاس ان کے پتا جی نے رکھ دیا تھا وہ یار دوستوں کے ساتھ مل کر کھا ڈالا۔[۴]

پریم چند اپنی شادی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں کہ:

"میری شادی ہوئی، میں اپنی شادی سے بہت
خوش تھا۔ منڈپ چھانے کے لیے (جنگل سے) بانس
میں نے خود کاٹا تھا۔"[۵]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"میرے والد بہت سوچ سمجھ کر اور آنکھیں کھول کر جیون پتھ
پر چلنے والے آدمی تھے لیکن آخر دنوں میں ایک ٹھوکر کھا ہی
گئے اور خود گرے ہی تھے مجھے بھی گرا دیا۔ پندرہ سال کی عمر میں
انھوں نے میری شادی کر دی اور سال بھر بعد پرلوک سدھار گئے۔"[۶]

پریم چند کی شادی کی بات ان کی چاچی کے والد نے ٹھہرائی تھی ـــــ پریم چند پہلے ہی اپنی بیوی کی بے حیائی اور بدصورتی کی وجہ سے بددل ہو گئے تھے ایک تو وہ ان سے عمر میں بھی زیادہ تھیں، دوسرے بقول پریم چند حد درجہ بدشکل اور بے حیا تھیں۔ بہو رخصت ہو کر جس دن گھر آئی اسی دن ان سب باتوں کا احساس ان کے والد کو بھی ہوا بلکہ انھوں نے کہا کہ "لالہ جی نے میرے لڑکے کو کنویں میں ڈھکیل دیا ہے۔ افسوس میرا گلاب سا لڑکا اور اس کی یہ بیوی۔"

مختصر یہ کہ پریم چند نے جب سے آنکھیں کھولیں ہمیشہ پے در پے حادثات و مصائب کا شکار رہے۔ کبھی غریبی نے کمر توڑ کر رکھ دی تو کبھی سوتیلی ماں کے جبر نے خون کے آنسو رلائے۔ کبھی معاشرے نے تیر پھینکے تو کبھی ازدواجی زندگی عذاب ہو گئی۔ عمر کے ساتھ ساتھ معاشی بدحالی بھی بڑھتی گئی بلکہ جب دھنپت رائے نے میٹری کولیشن پاس کیا اس وقت ماں اور باپ دونوں کی سرپرستی سے محروم ہو چکے تھے اور چار چار افراد کی پرورش و پرداخت کا بوجھ بھی ان کے سر پر آپڑا تھا۔[۷]

ایک تو بیکاری، گھر میں کھانے کو نہیں دوسرے اپنا خرچ اور تعلیم کا بوجھ۔ کچھ دنوں بعد ایک وکیل صاحب نے پانچ روپیہ ماہوار اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے پر انھیں رکھ لیا تو قدرے اطمینان ہوا۔ دو روپئے یہ اپنے تعلیمی خرچ کے لیے رکھ لیتے تھے اور تین روپیہ ماہانہ اپنے گھر بھیج دیا کرتے تھے غریبی بدستور قائم رہی۔ ظاہر ہے کہ دو روپیہ میں ان کا خرچ کیسے پورا ہوتا، اکثر اُدھار لے کر کام چلاتے تھے۔ ایک مرتبہ انھیں اپنا کوٹ بیچنے کی بھی نوبت آگئی تھی جو مہینوں کی کد و کاوش کے بعد تیار کرایا جا سکا تھا۔ حسن اتفاق تھا کہ ایک دن ان کی ایک ایسے صاحب سے ملاقات ہوگئی جو کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے وسیلے سے ۱۸۹۹ء میں اٹھارہ روپیہ مہینے پر پرائمری اسکول میں نائب مدرس کی جگہ مل گئی۔ نوکری سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس وقت کے موجودہ تعلیمی مسائل سے بھی دل چسپی بڑھی چنانچہ رفتہ رفتہ طریقۂ تعلیم کے سارے پہلوؤں پر غور و فکر شروع کر دیا۔ اکثر اوقات انھوں نے تعلیمی مسائل پر مضامین بھی لکھے۔ وہ انگریزی سرکار کے تعلیمی نظام سے مطمئن نہیں تھے۔ پریم چند نے ڈرامے کے ذریعہ ہی اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ شاید وہی ڈرامہ تھا جسے ماموں صاحب کے کردار کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا۔ یہیں سے ان کی گہری سوچ اور عمیق مشاہدے کا آغاز ہوتا ہے۔ خاص کر انھوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں جو کہانیاں لکھیں ان کی بنیاد بیشتر وہی تجربات تھے جو ان پر بیتے یا ان کو نظر آئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ انھوں نے بیوہ کے مسئلے پر ہمیشہ سوچا اور آخر ۱۹۱۵ء کو شیورانی نام کی ایک بیوہ سے شادی بھی کر لی۔ ہندوؤں میں بیوہ کی شادی کے مسئلے پر وہ سنجیدگی سے سوچتے رہتے تھے۔ اسی درمیان انھوں نے اسی موضوع کو لے کر ادبی تخلیق کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۰۲ء میں ٹریننگ کالج الٰہ آباد میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ۱۹۰۴ء میں فرسٹ ڈویژن سے جے۔ ٹی۔ سی کا امتحان پاس کیا۔ پرنسپل نے خوش ہو کر ایک مقامی

ماڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا۔ ۱۹۰۵ء میں ان کا تبادلہ کان پور ہو گیا جہاں انھیں مشہور صحافی منشی دیا نرائن نگم کے قریب آنے کا موقع ملا، اور وہ نگم کے رسالے "زمانہ" میں کہانی اور تنقیدیں لکھنے لگے۔

۱۹۰۸ء میں ان کو ترقی ملی اور سب ڈپٹی انسپکٹر بنا کر ہمیر پور ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔ پریم چند اس تبادلہ سے خوش نہیں تھے پھر بھی ترقی کا معاملہ تھا لہذا منشی دیا نرائن نگم جیسے عظیم دوست اور مشیر کا ساتھ چھوڑ کر ہمیر پور چلے گئے، لیکن مراسلت کے ذریعہ نگم صاحب سے خیالات کا تبادلہ ہوتا رہا۔

دراصل معاشی مجبوریوں سے تنگ آکر انھیں ملازمت کرنا پڑی تھی ورنہ ذہنی طور پر وہ ملازمت کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ پیٹ کے مریض پہلے ہی سے تھے۔ محکمہ تعلیم کی ملازمت میں ترقی کے بعد مختلف مقامات پر تبادلے ہوتے رہے۔ بار بار آب و ہوا بدلنے اور لگاتار دورے کرنے کی وجہ سے صحت متاثر ہوئی۔ اسی اثنا میں پیچش جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ آخر کار یہ مرض مرض الموت ثابت ہوا، اور ۸ راکتوبر ۱۹۳۶ء کو وہ ہمیشہ کے لیے دُنیا چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

نواب رائے نے "زمانہ" کے مئی جون ۱۹۰۹ء کے شمارہ میں "صوبہ متحدہ میں ابتدائی تعلیم" کے عنوان سے آخری مضمون لکھا۔ اس میں ابتدائی تعلیم کے رائج اصولوں کے نقائص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مضمون سات صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کے بعد دھنپت رائے اپنے قلمی نام 'نواب رائے' کے نام سے پھر کچھ نہ لکھ سکے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی پانچ کہانیاں 'سوزِ وطن' کے نام سے کتابی شکل میں ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئیں۔ ان کہانیوں میں ہرچند کہ حکومتِ وقت کے خلاف کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہ تھی کہ کتاب ضبط کرلی جاتی اور نسخے ضائع کرنے کا حکم ہوتا لیکن ان میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ ضرور ابھارا گیا ہے۔ "سوزِ وطن" "زمانہ" کے مطبع سے شائع ہوا اور "زمانہ" ۱۹۰۸ء کے شماروں میں اس کا اشتہار بھی نکلا تھا جو یوں تھا:

سوزِ وطن ! سوزِ وطن ! سوزِ وطن !

زمانہ کے مشہور مقبول مضمون نگار منشی نواب رائے

کی تازہ ترین اور بہترین تصنیف .... وغیرہ

" اُردو زبان میں حسن و عشق، وصل و فراق، عیاری و مکاری، جنگ و جدل کی بہت سی داستانیں موجود ہیں اور ان میں بعض بہت ہی دل چسپ ہیں مگر ایسے قصے جن میں سوزِ وطن کی چاشنی ہو، جن میں حُبِ وطن ایک ایک حرف سے ٹپکے اس وقت تک معدوم ہیں۔ اس کتاب میں پانچ قصے لکھے گئے ہیں اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں۔ ممکن نہیں کہ انھیں پڑھ کر ناظرین کے دل میں وطن کی محبت کا پاک جذبہ موج زن نہ ہو جائے۔ پیرایہ نہایت لطیف اور دل کش ہے اور اندازِ بیان رقت آمیز ہے۔ سائز چھوٹا، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا سفید۔ قسم اول دبیز سفید کاغذ پر قیمت ۱۲؍ قسم دوم معمولی کاغذ قیمت ۸؍۔"

"زمانہ" میں یہ اشتہار نکلتے ہی فرمائشیں آنا شروع ہو گئیں لیکن سرکار کو خبر ہوتے ہی "سوزِ وطن" کی ضبطی کا حکم ہو گیا۔ کتاب کے خلاف کارروائی یہ کہہ کر کی گئی کہ اس کتاب پر پبلشر کا نام نہیں ہے۔ حالانکہ منشی دیا نرائن نگم جیسے جہاندیدہ شخص سے ایسی غلطی کا امکان نہیں تھا پھر بھی کسی سبب سے مطبع وغیرہ چھپنے سے رہ گیا تھا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی طرف سے نواب رائے کو یہ ہدایت کی گئی کہ آئندہ جو کچھ بھی لکھا جائے چھپنے سے پہلے دکھا لیا جائے۔ چنانچہ نواب رائے جو کچھ لکھتے پہلے منظوری کے لیے بھیج دیتے لیکن ہر تحریر کافی تاخیر سے واپس ملتی۔ چونکہ نگم صاحب مضامین پر معاوضہ بھی دینے لگے تھے جس سے نواب رائے کو کسی حد تک سہارا مل جاتا تھا لہذا مضمون میں تاخیر ان کی مالی دشواریوں کا سبب بھی ثابت ہونے لگی۔ انھوں نے اس سلسلے میں منشی دیا نرائن نگم سے مشورہ لیا۔ نگم صاحب نے ان کو اطمینان دلایا کہ تمھارے مضامین ہمیشہ کی طرح شائع ہوتے رہیں گے صرف نام بدلنا پڑے گا، لہذا منشی دیا نرائن نگم نے مشورہ دیا کہ میں نے تمھارے لیے "پریم چند" نام تجویز کیا ہے۔ نواب رائے نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے نگم صاحب کو خط لکھا:

ستمبر ۱۹۱۰ء

"پریم چند اچھا نام ہے، مجھے پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سالوں میں نواب رائے کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ اکارت ہو گئی۔ یہ حضرت ہمیشہ قسمت کے نشدے رہے اور شاید رہیں گے۔"

۱۹۱۰ء کے "زمانہ" میں ان کی کہانی "منتر" بھی نواب رائے کے بجائے پریم چند کے نام سے چھاپی گئی۔ اسی سن کی بات ہے منشی دیا نرائن نگم نے ذکر کیا تھا کہ میں ہندی رسالہ بھی نکالنا چاہتا ہوں۔ پریم چند نے اس سلسلہ میں انھیں لکھا بھی تھا کہ "اگر آپ ہندی رسالہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں ہندی میں لکھنے کی مشق شروع کردوں"۔ کسی وجہ سے نگم صاحب ہندی رسالہ نہ نکال سکے لیکن منشی پریم چند نے ضرور ۱۹۱۳ء سے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ [۵۸]

پریم چند "سیوا سدن" کے ذریعہ ہندی میں داخل ہوئے۔ یہ ہندی کا پہلا ناول تھا جس کی وجہ سے ہندی میں صحت مند ناولوں کا رواج ہوا۔ [۵۹]

"سیوا سدن" ایک سماجی ناول ہے جس میں افسانوی ڈھنگ سے جہیز کے مسئلے پر عوامی بیداری کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد "سیوا سدن" شائع ہوئی جس نے ہندی ادبا کو ان کی طرف خصوصی طور سے متوجہ کر لیا اور کچھ دنوں کے لیے ان کی شخصیت متنازعہ بھی ہو گئی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ہندی والوں نے ان کے طرز تحریر اور زبان کی نرمی کا اعتراف کر لیا اور اردو کی طرح ہندی میں بھی ان کی امتیازی حیثیت نمایاں ہو گئی۔

ہندی میں لکھنے کی وجہ سے انھیں ایک مناسب معاوضہ ضرور ملنے لگا تھا۔ پھر بھی معاشی پریشانیوں سے کما حقہ نجات نہیں مل سکی تھی، لہٰذا انھیں اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ وہ ہندی اردو کے رسائل میں لکھنے سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ رسائل ہماری کفالت نہیں کر سکتے۔ وہ مصائب اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ چکے تھے۔ انھیں اپنی پریشانیوں کا قطعی احساس نہ تھا لیکن متعلقین کی پریشانی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

پریم چند نے دیا نرائن نگم کو ایک خط میں لکھا کہ، "میں اپنی قربانی دے سکتا ہوں، عیال کو اس چکی میں پیسنا نہیں چاہتا"۔ غالباً اسی جذبہ کے تحت انھوں نے فلمی دنیا سے رابطہ قائم کیا اور ۱۹۳۴ء میں فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن وہاں پہنچ کر انھیں روحانی صدمہ پہنچا۔ انھوں نے خود اس کا اظہار کیا کہ؛

"فلمی دنیا ایک انڈسٹری ہے یہ صنعت بھی اسی طرح
سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب فروشی، انھیں
اس سے مطلب نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے

انھیں تو پیسے سے مطلب۔ برہنہ رقص، بوسہ بازی اور عورتوں
پر مردوں کا حملہ یہ سب ان کی نظروں میں جائز ہے۔"

دوسرا خط اندر ناتھ مدان کو بمبئی سے لکھا کہ،

"ایک ادبی انسان کے لیے سینما میں کوئی گنجائش نہیں
ہے۔ میں اس لائن میں اس لیے آیا کہ مجھے اس میں
مالی نقطہ نظر سے آزاد ہونے کے کچھ امکان نظر آئے لیکن
اب میں دیکھتا ہوں کہ میں دھوکے میں تھا، اور اب میں
پھر لوٹ کر ادب کی طرف آرہا ہوں"۔ [۶۰]

پریم چند اپنے ضمیر کا سودا کر کے فلم انڈسٹری سے وابستہ نہیں رہ سکے، لہٰذا ایک مختصر قیام کے بعد وہاں سے واپس چلے آئے۔

پریم چند کو ناٹک سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی وہ خود لکھتے ہیں؛

"میں نے سنجیدگی سے ناٹک لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی"

اور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اردو ہندی کے پاس "رنگ منچ" نہیں ہے"۔ [۶۱]

پریم چند کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس کا ذکر کرنے میں انھیں فخر محسوس ہو، وہ تو خود لکھتے ہیں کہ، "میری زندگی چٹیل میدان کی طرح تھی جس میں نہ کہیں اونچا نیچا تھا نہ جھرنے تھے نہ پہاڑ کی چوٹیاں"۔ ان کو حالات نے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ زندگی کی رنگ رلیوں سے قریب ہو سکتے۔ حالانکہ زندگی کے آخری لمحوں میں انھوں نے اپنی دوسری بیوی، (جو مزاج داں بھی تھیں اور ادیب بھی) سے مخاطب ہو کر کہا کہ،

"اچھا ایک اور چوری سنو کہ میں نے اپنی پہلی بیوی کی
زندگی ہی میں ایک عورت رکھ چھوڑی تھی، تمھارے آنے
پر بھی اس سے میرا تعلق تھا؟" [۶۲]

پریم چند کی اس بات کی تصدیق کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکی مگر پہلی بیوی سے اختلاف کی صورت میں بہت ممکن ہے کسی عورت نے انھیں اپنی طرف راغب کر لیا ہو۔ انھوں نے ایسے حالات اور ماحول میں آنکھ کھولی تھی کہ ان میں موجودہ سماجی نظام کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکنا فطری تھا۔ بچپن سے ان کے ذہن میں غریبی اور امیری کا مسئلہ سوالیہ نشان بن چکا تھا۔ دیہات کے غریب کسانوں کا استحصال، زمینداروں کا جبر اور

مہاجنوں کا عفریت ان کے سامنے تھا۔ یہ سوچا کرتے تھے کہ آخر وہ دن کب آئے گا جب غریب کی گردن ان کے آہنی پنجوں سے آزاد ہوگی۔ ایک طرف یہ سماجی استحصال دوسری جانب بیوہ کی بے آبروئی اور جہیز کی لعنت جیسے رسوم سے بھی ان کا جی کڑھتا رہتا تھا اور پھر سونے پر سہاگہ انگریزوں کی غلامی جس نے زبان پر بھی تالے لگا رکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کا شعور پختہ ہوا تو اشتراکیت کی طرف مائل ہوگئے۔ اس سلسلے میں پریم چند نے کہا کہ

"میں کمیونسٹ ہوں لیکن میرا کمیونزم صرف اتنا ہے کہ ہمارے دیش میں زمیندار اور سیٹھ وغیرہ جو کسانوں کا استحصال کرتے ہیں، نہ رہیں اور دوسرے یہ کہ میں گاندھی وادی نہیں ہوں، گاندھی جی کے چیلنج "آؤ ہارٹ" میں یقین رکھتا ہوں"[13]

اس مقام پر پریم چند نے گاندھی وادی ہونے سے انکار ضرور کیا ہے لیکن ہمیشہ وہ گاندھی جی کو اپنا روحانی پیشوا مانتے رہے۔ وہ شروع ہی سے مہاتما گاندھی کے نادیدہ بھگت تھے لیکن گورکھپور کی ایک ملاقات کے بعد سے تو عملی طور پر بھی ان کے نظریات پر کاربند ہوگئے تھے۔ ملک کی آزادی کے سلسلے میں بھی یہ اپنے طور پر جدوجہد کرتے رہے لیکن جیل خانے سے ہمیشہ کتراتے رہے اس کی ایک وجہ معاشی حالات بھی ہو سکتی ہے، جب کہ پریم چند کی دوسری بیوی دو ماہ کی قید سخت کی سزا بھگت چکی تھیں اور پریم چند ان کے اس اقدام سے خوش بھی تھے۔ دیش بھگتی، معاشرے کا کرب، گاؤں کی زندگی اور اس کا گہرا مشاہدہ، سماجی استحصال اور ریت رواج کے بھونڈے چلن نے ان کے ذہن میں تخلیقی عمل کی حیثیت حاصل کر لی تھی اس اعتبار سے یہ اپنے معاصرین میں سب سے نمایاں اور ممتاز ہو جاتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے پریم چند نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگا۔"[14]

پریم چند کردار کے بھی غازی تھے انھوں نے جتنا بھی ادب تخلیق کیا وہ ہماری زندگی سے اتنا قریب ہے کہ ہم اپنی زندگی اور معاشرے کے تمام نشیب و فراز ان کے ادب کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ پریم چند کی تخلیقات ہمیں اس لیے بھی متاثر کرتی ہیں کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے اس پر خود بھی عمل کرتے تھے۔ ہمیشہ انھوں نے متوسط طبقہ کی اپنے ادب کے ذریعہ نمائندگی کی۔ وہ تخلیقی اجتہاد تو کر ہی رہے تھے، لسانی اعتبار سے بھی چاہتے تھے کہ ہماری زبان اردو اور ہندی کے تنازعات سے قطع نظر وہ ہندستانی ہو جس کی کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ، لطیف اور بلیغ ہے بلیغ اس معنی میں کہ یہ سادگی کے ساتھ بڑی سے بڑی بات کو مختصر سے مختصر جملے میں موثر طور پر کہہ جانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

پریم چند ہمارے ادب میں اس لیے بھی زندہ رہیں گے کہ ان کے فن پاروں میں ہمارے معاشرے کی تصویریں محفوظ ہیں اور ان کا ادب آفاقی ہوتے ہوئے بھی اپنے میں ہندستانیت رکھتا ہے اور ہندستانیت بھی وہ جسے فراق جیسے بڑے شاعر نے اپنے ادب میں سمونے کی کوشش کی تھی اور بیشتر موقعوں پر اس کا اظہار بھی کیا کہ میں ادب میں پریم چند جیسی ہندستانیت چاہتا ہوں۔

* *

حواشی:

۱۔ پریم چند گھر میں
۲۔ 'آج کل' اکتوبر ۱۹۵۲ء
۳۔ پریم چند گھر میں ص ۸
۴۔ پریم چند ایک ادھین ص ۲۸
۵۔ پریم چند گھر میں ص ۹
۶۔ کفن ص ۶۱-۶۰
۷۔ پریم چند ایک ادھین ص ۳۰
۸۔ پریم آشرم ص ۱۳۳
۹۔ ہندی ساہتیہ اور ساہتیکار ص ۲۳۰
۱۰۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ
۱۱۔ پریم چند دو چک ص ۱۷۲
۱۲۔ پریم چند گھر میں ص ۳۵۶
۱۳۔ پریم چند ساہتیہ ص ۱۰۱
۱۴۔ لکھنؤ کی ادبی روایات ص ۲۲ 'نیا دور' مئی ۱۹۸۰ء

کُسُم پاراشر
۵۲ - اشوکا گارڈن، رائے سین روڈ، بھوپال

پریہ درشنی

ایک طاقت ایک وحدت وقت کی آواز تھی!   زندگی کے نام پر اک دور کا آغاز تھی
علم کے ہونٹوں کو بخشی آگہی کی آبرو   دیکھ کر اس کا تبسّم مسکرائے رنگ و بو
رُوح کی گہرائیوں میں اس نے پالی ایکتا   عزم و استقلال کے دل میں بسا دی ایکتا
ہر نفس وہ کرشن گیتا دھرم پر قربان تھی   لوگ کہتے ہیں حقیقت میں وہ ہندوستان تھی
ملک کو اس نے نکالا غفلتوں کی دُھند سے   ذہن کو روشن کیا سب نفرتوں کی دُھند سے
بیس راہیں بیس سپنے دیش کو ارپن کیے!   اک نئے احساس کے حالات نے درشن کیے
نُور بن کر عزم کے ماتھے پر اُجاگر ہوگئی   اندرا دراصل بھارت کا مقدّر ہوگئی
تنگ ذہنوں کو ہٹایا اس نے اپنی راہ سے   لاج انساں کی بچائی روشنی کی چاہ سے
آنکھ اندھوں کی بنی، ٹوٹے دلوں کا اعتبار   اس کے دم سے مسکرائی تھی اُجالوں کی بہار
عورتوں کو زندہ رہنے کا سلیقہ دے دیا   چل سکیں جس پر سبھی اک ایسا رستہ دے دیا
بوند تھی لیکن سمندر سے بھی گہری ہوگئی   فصل اک امید کی بنجر زمیں پر بوگئی
وقت کے ماتھے پہ تاریخِ جنوں لکھ دی گئی   دوستوں کی رُوح پر تہذیبِ خوں لکھ دی گئی
جان لی تھی جس نے باپو کی وہی پیدا ہوا   تیرگی نے پھر سے اپنے آپ کو دُہرا لیا
درحقیقت آج مر کر بھی امر ہے اندرا   جو کبھی نہ ختم ہو ایسا سفر ہے اندرا

خون کا ہر ایک قطرہ جاوداں ہونے کو ہے
اندرا کا خواب اب ہندوستاں ہونے کو ہے

شورش صدیقی

اظہار کی مجبوری

انسان جسے ہوموسیپین Homo Sapien کہا جاتا ہے اچانک اس دُنیا میں اُبھرے اور سب سے افضل جانور بن کر چھا گئے۔ اب سے دس لاکھ سال قبل تک ان کی تعداد محض ایک کروڑ تھی۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کو بات سمجھا سکنے سے لے کر پوری دُنیا کو اپنے اثر میں رکھنے تک کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن ان پر دوسرے جانداروں کے قانونِ پیدائش اور قواعد تو عاید رہی ہوتے ہیں اس لیے ان کی تعداد کو بھی حدود میں رہنا چاہیے تھا لیکن ان کی تعداد چار ہزار سالوں میں بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوئی اور آج چار سو کروڑ ہو چکی ہے۔ گمان ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام تک یہ تعداد بڑھ کر چھ سو کروڑ ہو جائے گی۔ دُنیا کے ہر کونے میں یہ غیر معمولی جانور موجود ہے۔ وہ اونچی سے اونچی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ چکا ہے جہاں آکسیجن مشکل سے ملتا ہے اور اس دُنیا کو چھوڑ کر چاند تک ہو آیا ہے۔

ایسا کیونکر ممکن ہوا؟ اس میں اتنی غیر معمولی صلاحیت، طاقت اور عقل کیسے آگئی کہ آج وہ کامیاب ترین جانور ہے؟ یہ قصہ اب سے پچاس لاکھ سال قبل افریقہ کے براعظم میں شروع ہوا تھا جہاں آج کے مقابلے زمین کا بڑا علاقہ جنگلوں اور اونچی اونچی گھاس سے ڈھکا ہوا تھا، اس کے علاوہ اور جانور بھی وہاں رہتے تھے جیسے گائے کے برابر بڑے سور، جن کے لمبے دانت ایک میٹر باہر نکلے رہتے تھے۔ بڑے بڑے سانڈ، چھوٹے چھوٹے ہاتھی جن کا قد آج کے ہاتھی کا ایک چوتھائی تھا۔ زیبرے، گینڈا، زرافہ، بن مانس جن کے قد چمپینزی کے برابر تھے۔

بن مانس افریقہ کے علاوہ ایشیا اور یورپ بھر میں پھیلے ہوئے تھے اس کے ثبوت اس بات سے ملتے ہیں کہ ان کے پتھرائے اجسام ان سب ملکوں میں دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ پتھرائے اجسام یکساں نہیں تھے، اور کچھ ہڈیاں، خاص طور سے کھوپڑی، جبڑے، پیر کی ہڈیاں اور آنکھوں کے حلقے بہت کچھ انسانوں سے ملتے جلتے بھی ہیں، چنانچہ جب بھی کوئی ایسا پتھرایا ڈھانچہ ملا، دنیا بھر میں یہ بحث چھڑتی رہی کہ انسان بن مانس کی نسل سے ہے کہ نہیں۔ اگرچہ بن مانس کا بڑا گروہ آج بھی دنیا میں موجود ہے اور انسان سے ملتا جلتا بھی ہے لیکن پتھرائے اجسام ملنے پر بحث یہی ہوتی ہے کہ یہ بن مانس کے ہیں کہ انسان کے۔

جو ڈھانچے ملے ان کے ہاتھ پیر درختوں پر چڑھنے والے بندروں جیسے ہیں جن کی گرفت مضبوط ہے، پنجوں کے بجائے انگلیوں پر ناخن ہونے کے ثبوت ہیں لیکن ان ڈھانچوں کے پیر زمین پر تیزی سے دوڑنے کے لائق نہیں ہیں۔ وہ ہرن اور بارہ سنگھے کی طرح تیز دوڑنا نہیں جانتے تھے۔ کھوپڑی جنگلی بن مانس جیسی تھی اور آنکھیں ہڈی کے حلقوں کے اندر تھیں۔ اندازہ ہے کہ ان کے سونگھنے کی قوت اور بندروں سے کم تھی اور وہ درختوں کی ملائم جڑیں، بیر، اخروٹ اور پھل کھاتے تھے اور جانور کا شکار کر کے کھا جاتے تھے۔

کولھے کی ہڈی دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سیدھے کھڑے ہونے لگے تھے ان کی یہ صلاحیت بھی درختوں پر چڑھنے والے بندروں جیسی ہے۔ میدانوں میں کھڑے ہو کر چلنا کارآمد بھی تھا۔ بن مانس بغیر کسی حفاظتی سامان کے خود کو خونخوار جانوروں کے حملوں سے بچا سکتے تھے، کھڑے ہو کر دیکھنا اور چل سکنا ان کا مددگار تھا اور تیز رفتاری

کی وجہ سے وہ دُور تک دیکھ سکتے تھے۔ بندر بھی خطرے کے وقت کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔

کھڑے ہو کر تیز دوڑ سکنا ممکن نہیں ہوتا بلکہ اس سے بن مانس کی رفتار گھٹ گئی۔ وہ مشکل سے ۴۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا تھا جبکہ چاروں ہاتھ پیروں سے بندر اس سے دگنی رفتار سے دوڑ سکتے ہیں۔ کھڑے ہونے کے فائدے بھی تھے، مضبوط پکڑ اور ہاتھوں سے سامان اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ممکن تھا۔ حملہ آوروں کو پتھر گھسیٹ کر مار سکنا اور ڈنڈا لے کر ان سے لڑ سکنا ممکن تھا۔ ساتھ ہی پتھر پر پتھر مار کر انھیں توڑنا اور دھار دار بنانا بھی تاکہ جانوروں کی کھال اتار سکیں۔ اس طرح کے تیز دھار والے پتھر بھی ان کے ڈھانچوں کے قریب بڑی تعداد میں ملے ہیں۔

یہ حالات تیس لاکھ سال تک چلتے رہے اور نسل در نسل کچھ تبدیلیاں ان کے جسم میں رونما ہوتی رہیں، پیر اچھی طرح دوڑنے کے قابل ہو گئے ہاتھوں کی پکڑ ضرور کم ہو گئی اور دونوں ٹانگوں کے بیچ ایک محراب سا بن گئی، کولھے بدل گئے۔ جوڑوں کی ہڈیاں جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو گئیں اس لیے کہ کھڑے ہونے پر جسم کا بوجھ پیروں کی ہڈیوں پر پڑتا ہے۔ جبڑے اتنے بڑے اور بھاری نہیں رہے اور چھوٹے اور ہلکے ہو گئے۔ پیشانی گنبد نما ہو گئی۔ بھیجا موجودہ گوریلے کے برابر تھا آہستہ آہستہ وہ دوگنا ہو گیا، قد ایک میٹر سے ڈیڑھ میٹر کا ہو گیا اور یہ جانور ہوموایرکٹس (Homo Erectus) کہلایا۔

اس نے پتھروں کے جو ہتھیار اور اوزار بنائے وہ دو دھاری بھی تھے اور اچھی طرح پکڑ میں بھی آتے تھے، کینیا کے قریب جن پتھروں کے ہتھیار اور اوزار ملے وہ اس علاقے میں نہیں ملتے اور کہیں دور دراز سے لائے گئے تھے اس جگہ بیبون (Baboon) بندروں کی بے شمار ہڈیاں بھی ملیں جس سے اندازہ ہوتا ہے یہ انھیں مار کر کھاتے تھے اور ان کی پوری نسل کھا گئے اس لیے کہ اب یہ بندر وہاں نہیں ملتے۔

اس سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت ماہر شکاری ہو گئے تھے اور پتھر کے اوزاروں کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن کیا وہ ایک دوسرے سے بات چیت بھی کرتے تھے؟ اس کے ثبوت ملنا تو مشکل ہے لیکن ایک ساتھ رہنے اور مل کر شکار کرنے سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ وہ بغیر ایک دوسرے کو اپنی بات بتائے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ شور مچانا تو ضرور ہی آتا ہوگا۔ وہ اپنی بات کس طرح دوسروں کو سمجھاتے ہوں گے، اس کا جواب آسان ہے، انسان کے چہرے کے پٹھے اور رگیں چہرے کو مختلف طرح کا بنا سکنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہونٹ، گال، پیشانی، بھویں مختلف نوعیت کے اظہار کی صلاحیت رکھتی ہیں اس لیے جب انسان بولنا نہیں جانتا ہوگا تو اشارے ضرور کر سکتا ہوگا اور چہرے کے تاثرات آج بھی ایک دوسرے کو بہت کچھ سمجھا سکتے ہیں۔

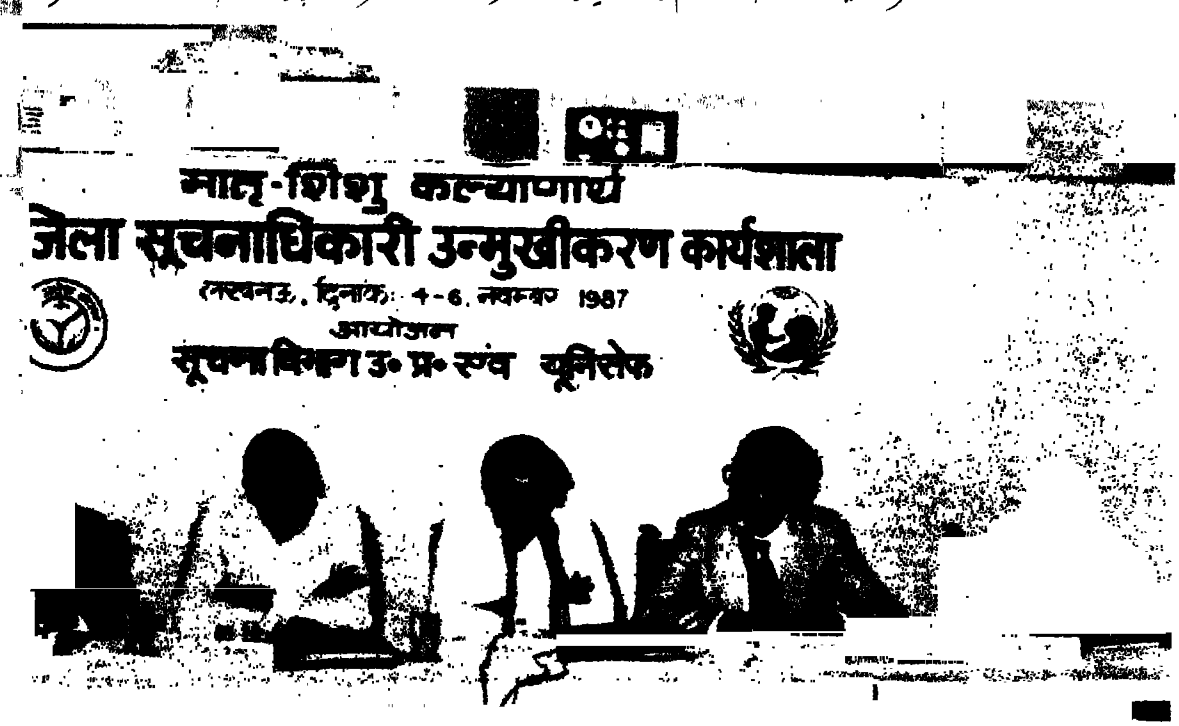
کسی انسان کا چہرہ دوسرے انسان سے بالکل ملتا ہوا نہیں ہوتا۔ پہچاننے کی یہ آسانی اس وقت کام آتی ہے جب ایک جگہ بہت سے لوگ کام کر رہے ہوں۔ لکڑبگھے ایک دوسرے کو سونگھ کر پہچان لیتے ہیں لیکن انسان صرف چہرہ دیکھ کر ایک دوسرے کی شناخت کر لیتے ہیں۔ چونکہ چہرے کے اشارات بدلے جا سکتے ہیں اس لیے کئی طرح کے اظہار بغیر بات کیے بھی ہو سکتے ہیں۔ آج بھی انسان جوش، خوشی، راضی، ناراضگی، ناامیدی اور محظوظ ہونے کے تاثرات اپنے چہرے سے ظاہر کر سکتا ہے۔ کسی بات سے متفق ہونے، کسی کے آنے پر خوش ہونے یا بلانے کی صلاحیتیں ہمیں ودیعت ہوئی ہیں۔ کیا یہ ہم نے وراثت میں پائی ہیں؟ اس کا ثبوت دے سکنا تو ممکن نہیں لیکن کچھ اظہار جیسے گنتی کرنا یا کسی کی بے عزتی کرنا ایک سوسائٹی سے دوسری سوسائٹی میں مختلف ہو سکتے ہیں اور ہم انھیں اپنے ساتھ رہنے والے انسانوں سے سیکھتے ہیں لیکن کچھ اظہار دُنیا بھر میں یکساں ہیں مثلاً کسی چیز سے متفق ہونا یا ناپسندیدگی پر منفی اظہار ہم ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں ہمارا طریقہ ہر صورت میں ایک جیسا ہوتا ہے۔

نیوگنی ایک ایسا پچھڑا ہوا علاقہ ہے جہاں کے لوگ باہر کی کوئی زبان نہیں جانتے ان سے بات محض اشاروں سے کی جا سکتی ہے۔ اپنے دانت کھول کر ہنسی کا اظہار کر دیں گے اور ہونٹ کو اس طرح لٹکائیں گے گویا خوش ہیں۔ ایک عمر دراز چمپینزی کے سامنے کوئی نوجوان چمپینزی اس طرح آنکھیں جھکا کر آتا ہے کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے سامنے حاضر ہوا ہے اور کسی طرح کی لڑائی کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح اپنے جسم کے اشاروں سے اپنی بات ظاہر کرنے کی خصوصیت ہمیں ودیعت ہوتی ہے ورنہ سوچیے کہ ایک بچہ جو بولنا نہیں جانتا نہ کچھ سن اور سمجھ سکتا ہے آپ اسے دودھ دینے لگیں تو وہ اپنے چہرے سے خوشی کا اظہار کیسے کر لیتا ہے، اسے سکھانے کی نہ کوشش کی گئی نہ وہ سیکھ سکتا ہے پھر بھی وہ خوشی کا اظہار کرتا ہے۔



وزیر ریاست برائے اطلاعات شریمتی دیپا کول ۲۴ر نومبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی یاد میں منعقدہ تصا
نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد نمائش دیکھتے ہوئے۔

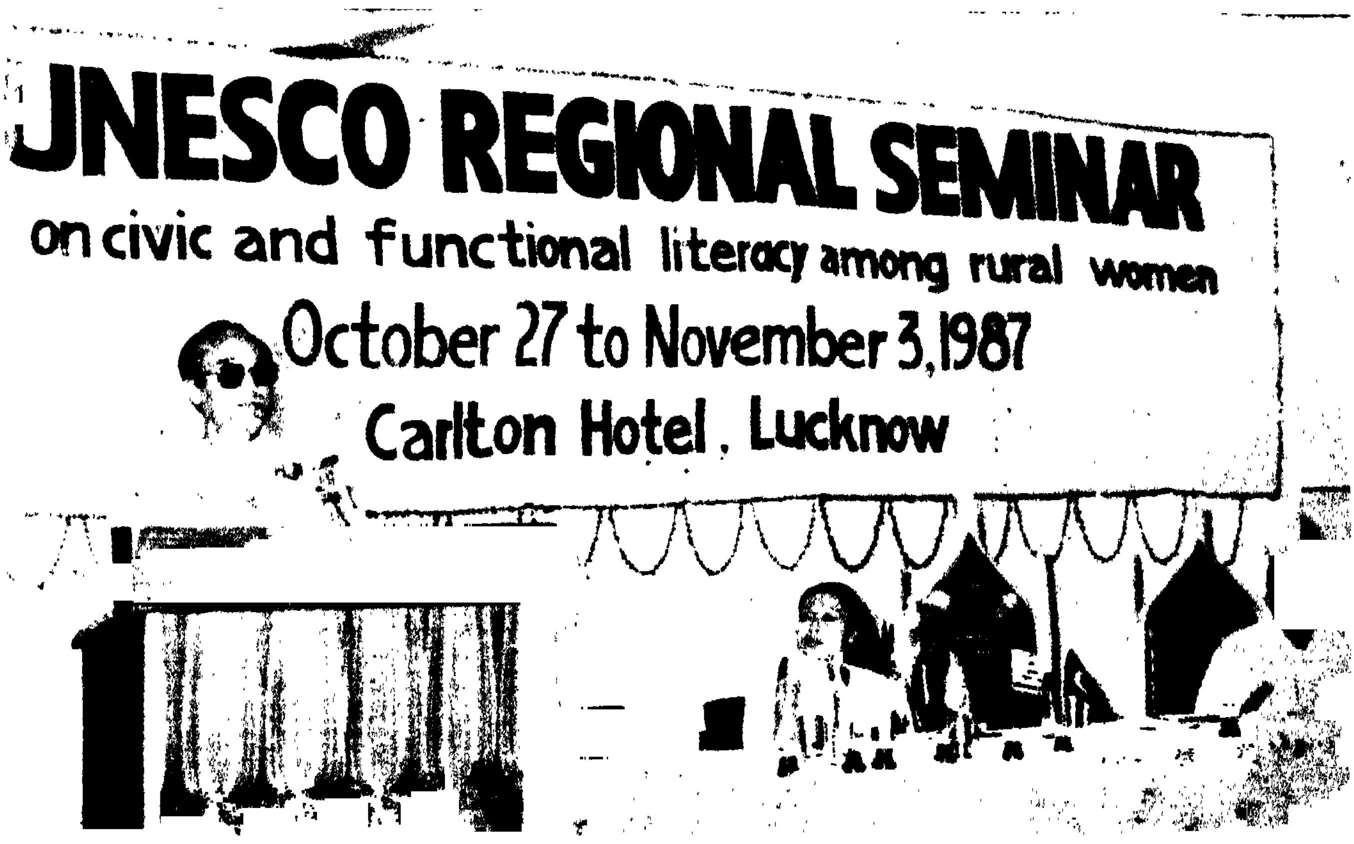
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش نے نومبر ۱۹۸۷ء میں گومتی ہوٹل لکھنؤ میں یونیسیف کے اشتراک سے زچہ بچہ بہبو
متعلق ضلع اطلاعات افسران کی ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا۔ تصویر میں ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات شری اشوک پریہ درشی اظہار خیال کرتے ہوئے نظر آر





وزیراعلیٰ شری ویر بہادر سنگھ ، ۲ نومبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں مدھیہ پردیش کی پریس گیلری کمیٹی کے ممبران سے گفتگو کرتے ہوئے
وزیراعلیٰ کے دائیں جانب اترپردیش کے ڈائرکٹر اطلاعات شری اشوک پریہ درشی بھی نظر آرہے ہیں۔

وزیرتعلیم شری سبط رضی ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں یونیسکو کے منطقائی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے۔





گورنر اترپردیش شری محمد عثمان عارف ۱۹ نومبر ۱۹۸۷ء کو راج بھون (لکھنؤ) میں قومی یک جہتی ہفتے کے سلسلے میں جلسے کو خطاب کرتے ہوئے۔ وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ بھی اس موقع پر نظر آرہے ہیں۔



وزیر اعلا اترپردیش شری ویر بہادر سنگھ یکم نومبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں اپنی رہائش گاہ پر پانڈیچیری کے لفٹنٹ گورنر شری تربھون پرشاد کا خیر مقدم کرتے ہوئے



دسمبر ۱۹۸۰ء میں اتر پردیش قانون ساز اسمبلی کی گولڈن جبلی تقریبات کے موقع پر نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما تقریر کرتے ہوئے۔ تصویر میں گورنر اتر پردیش شری محمد عثمان عارف، اسپیکر ریاستی اسمبلی شری نیاز حسن، وزیر اعلا شری وی پی سنگھ، وزیر بہادر سنگھ اور دیگر وزرا بھی نظر آرہے ہیں۔



ستی اسمبلی کی
لڈن جبلی تقریبات
لے موقع پر پہلی
ی اسمبلی کے اُن
ن کو، جو ابھی بقید
ت ہیں، خصوصی
از دیا گیا یہ تصویر
موقع کی ہے
میں وزیر اعظم
راجیو گاندھی،
ت کملاپتی ترپاٹھی
عزاز دیتے ہوئے
۔ آرہے ہیں

اشاروں سے بات سمجھا سکنے اور چہرے کے تاثرات سے بات سمجھنے اور اظہار کی صلاحیت، ہتھیار بنا سکنے کی صلاحیت اور کھڑے ہو کر چلنے والا ہومو سیپینس نما انسان بہت جلد ترقی کرتا چلا گیا اور افریقہ، ایشیا، بلقان، بحر کاہل کے کنارے، دریائے نیل اور یورپ، جاوا، سماترا، چین، غرضکہ دنیا کے ہر حصے میں اس زمانے کے اس انسان کے پتھر لیے اجسام ملے ہیں۔

اب سے چھ لاکھ سال پہلے یورپ کا موسم ایک دم بدلا اور سخت سردی پڑنے لگی جو برداشت سے باہر تھی۔ بہت سے انسان وہاں سے معتدل اور گرم خطوں کی طرف کوچ کر گئے جو رہ گئے وہ یا تو پہاڑوں کی کھو میں چھپ کر رہنے لگے یا جانوروں کا شکار کر کے ان کی کھال اوڑھ کر سردی کا مقابلہ کرتے رہے۔

یورپ میں رہنے والے ان قدیم انسانوں کی بہت سی پوشیدہ جگہوں کا پتہ چلا ہے۔ فرانس اور اسپین کی بہت سی پہاڑیوں کی کھو میں ان کے بنائے ہوئے نشانات اور جانوروں کی، پتھروں پر بنائی گئی تصاویر ملی ہیں۔ وہ مہین ہڈی کی سوئی بنا کر کھالیں سی لیتے تھے اور لکڑی کی تیز نوک پر تیز دھار دار پتھر لگا کر شکار کرتے تھے۔ پتھروں کے جلنے کے نشانات سے آگ رکھنے کا سراغ بھی ملتا ہے۔ یہی انسان ترقی کر کے کمپیوٹر بنانے لگا لیکن اس کے جسمانی اعضا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

انسان نے بہت سے ہنر سیکھے اس لیے وہ سارے جانوروں سے افضل اور اعلیٰ بن گیا۔ کبھی ہم سمجھتے تھے کہ صرف ہم ہی اوزار بنانا جانتے ہیں، اب ہمیں علم ہوا ہے کہ چمپینزی بھی انھیں بنانا جانتے ہیں۔ گالا پیگوز کی ایک فنچ چڑیا مہین لکڑی جو چونچ میں لے کر درخت کی چھال اور اس کے چھیدوں سے کرید کر کیڑے نکال کر کھاتی ہے۔ یہ اوزار استعمال کرنے کے اوزار ہیں۔ ہماری زبان بھی چمپینزی اور ڈالفن سے افضل نہیں، لیکن پینٹنگ کرنا، تصاویر بنانا اور آرٹ صرف انسان ہی جانتا ہے اور ان ہی چیزوں نے انسانی زندگی کو بدلا اور ارفع و اعلیٰ بنایا ہے۔

یورپ کے غاروں میں انسان کی بنائی ہوئی کھوپڑیوں اور چیتوں کی تصاویر دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان غاروں کے پتھروں پر لال، بھورے، پیلے اور کالے رنگوں سے بنائی گئی خوبصورت تصاویر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لوہے کے زنگ، کوئلہ اور مینگنیز سے رنگ بنا کر برش کے بجائے انگلیوں سے انھیں بنایا گیا ہے، کہیں کہیں نلکیوں میں رنگ بھر کر منہ سے پھونک کر انھیں رنگا گیا ہے۔ پتھروں پر کھدائی بھی کی گئی ہے۔ ان سب کا موضوع عام طور پر جانور ہیں جن میں بڑے ہرن، گھوڑے، سانڈ، گینڈا اور دوسرے جنگلی جانور ہیں۔ انسانی شکلیں شاید ایک آدھ ہوں۔ ہاں ہاتھوں میں رنگ لگا کر ان کی نشانیاں ضرور بنائی گئی ہیں۔

آج بھی کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ لوگ پینٹنگ کیوں کرتے تھے۔ شاید یہ مذہبی عقیدہ ہو۔ لیکن سانڈ کی جانب چلتے تیر تو شکار کی نشانی ہیں اگر کسی جانور کو موٹا دکھایا گیا ہے تو اس کے معنی ہوں گے کہ بچہ ہونے والا ہے یا محض تفریح طبع ہوگی، بہرحال کوئی ایک وجہ بتا سکنا ممکن بھی نہیں اور غلط بھی ہوگا۔ ان تصاویر میں کچھ تیس ہزار سال پرانی ہیں اور کچھ محض دس ہزار سال پرانی ہیں انسان آج بھی انھیں بناتا ہے۔ یہ تصاویر اور کچھ نہ ہوں مگر اظہار کا طریقہ ضرور ہیں۔

دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی قدیم تصاویر ملتی ہیں، آج بھی قبائلی شکار پر جاتے ہوئے پتھروں پر ایسی تصاویر بناتے ہیں اور ایسی ایسی جگہوں پر انھیں بنایا گیا ہے جہاں پہنچنا آج بھی مشکل اور دشوار ہے، کہیں مینار بنائے گئے ہیں کہیں مختلف ڈیزائن کی یکساں لکیریں ہی ملتی ہیں لیکن زیادہ تر جانوروں کی تصویریں ہیں جنھیں یہ قبائلی کھاتے ہیں مثلاً مچھلی، کچھوا، چھپکلی اور کنگارو۔

کہیں انھیں اچھے شگون کے طور پر اور کہیں اپنی خواہش کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مذہبی لوگوں نے اپنے عقیدوں کا اظہار بھی ان تصاویر کے ذریعہ کیا ہے جیسے سانپ، قوس قزح، اژدھا وغیرہ۔ گھوڑے کے نال بھی بنائے گئے ہیں جنھیں اچھا شگون مانتے ہیں۔

کوئی ضروری نہیں کہ یہ لوگ عہد ماضی کے پرستار اور جاہل ہی ہوں بلکہ یہ ایک مشغلہ بھی ہو سکتا ہے۔ پریشانیوں اور دقتوں میں گھرا انسان اپنی توجہ ہٹانے کے لیے بھی ان کاموں میں لگا ہوگا۔ پھر انسان کے جینز میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کچھ کالی اور کچھ گوری رنگت کے انسان ہو گئے ضروری نہیں کہ ان کی رشتہ داری بھی ہو تیز دھوپ میں کالی کھال موزوں ہے جسموں کا دبلا پتلا ہونا بھی ماحول پر منحصر ہے ٹھنڈے ممالک میں لوگ موٹے اور تندرست ہوتے ہیں ان کے چہروں پر بال نہ ہونا بھی وہاں کی ضرورت ہے ورنہ ان کے برف جم جاتی۔

شکار پر گذر بسر کرنے والی قومیں آج بھی ہیں، کچھ لوگ ریگستانوں میں کچھ گھنے جنگلوں میں رہتے ہیں۔ کسی جگہ عمر کا اوسط کم ہو جاتا ہے، کہیں غذا کی کمی کم عمری اور موت کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ حالات انسان کے ہمیشہ سے رہے ہیں۔ اگرچہ دس لاکھ سال قبل سیدھے کھڑے ہو کر چلنے والا ہومو اِرِکٹس

وجود میں آیا اور آج تک اس کی اولادیں وسیع پیمانے پر زندگی گزار رہی ہیں پھر بھی ایک سال میں ایک فی صد کے حساب سے انسانی آبادی بڑھ رہی ہے۔ ہر ملک کا یہی حال ہے۔ آٹھ ہزار سال سے پیدائش کی رفتار تیز ہوگئی اس لیے کہ اب انسان محض اتفاق پر زندہ نہیں بلکہ وہ فصلیں اگاتا ہے کھیتی باڑی کرتا ہے۔ دواؤں کا استعمال کرتا ہے ایک جگہ جم کر رہتا ہے نیز قصبے اور شہروں کی بنیادیں ڈالتا جارہا ہے۔

ارک (Uruk) عراق کا ایک شہر تھا، دلدل اور نرکل کے پودوں کے درمیان بنایا گیا جو دجلہ (Tigres) اور فرات (Euphrates) کے ڈیلٹا پر واقع تھا اب وہ ایک ریگستان ہے۔ کسی زمانے میں اس شہر کے اردگرد گیہوں کی کھیتی ہوتی تھی اور لوگ بھیڑ بکریاں پالتے تھے۔ برتن بناتے تھے جن کے ٹکڑے اس ریگستان میں بکھرے ملتے ہیں۔ وسط شہر میں اینٹیں پکانے کا بھٹہ تھا اس میں نرکل جلا کر اینٹیں پکائی جاتی تھیں۔ اس شہر کے متمدن لوگوں نے ایک غیر معمولی کارنامہ انجام دیا، اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے مٹی کی ٹکیاں بنائیں جنھیں ٹائپ کے حروف کی طرح پکا کر مضبوط بنایا گیا۔ یقین سے کہہ سکنا تو مشکل ہے لیکن اندازے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ راشن کا ریکارڈ رکھنے کے لیے بنائے گئے ہوں گے اور اس زمانے میں وہاں رہنے والے ان کا مطلب اور معنی بھی جانتے ہوں گے۔ ان ٹکیوں نے ہی چھپائی کی راہ دکھائی اور آج مٹی کے بجائے لوہے کے الفاظ بنا کر ٹائپ اور چھاپہ خانوں میں استعمال کیے جاتے ہوں گے ان کی غیر معمولی عقل و فہم نے یہ انقلاب برپا کیا۔

دوسرے مقامات جیسے وادیٔ نیل یا وسطی امریکہ کے جنگلوں میں بھی ایک کارنامہ انجام پایا وہاں انھوں نے آواز کے نشان مقرر کیے اور دنیا بھر میں گانے اور تقریریں مقید کرلی گئیں، جنھیں چھاپا بھی جا سکتا ہے۔

اس طرح ایجاد و اختراع کا دور شروع ہوگیا۔ ایک دوسرے سے انسان سیکھتا رہا۔ چین کے لوگوں نے تو ان دونوں ایجادوں کو مشینوں کی شکل دے دی۔ یورپ میں چھپائی بہت بعد میں پہنچی لیکن ان کی لائبریریاں کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ کتابیں اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ اظہار کی صورتیں بن گئیں، ان کی مدد سے ہم خود کو ماحول کی سختیوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہمارا علم نباتات، میکانکی، معاشیات، انجینیری، حساب، خلا کی پرواز کے تجربے انسانی تہذیب کا نچوڑ ہیں۔

ہم اپنی بات محض اپنے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ آنے والی نسلوں تک پہنچاتے ہیں۔ ارک (Uruk) کی ٹکیاں جمع کی جارہی ہیں اور انھیں سمجھنے اور پڑھنے کی کوشش ہورہی ہے ان میں کوئی ایسا پیغام ہو سکتا ہے جو اس عہد کا انسان ہم تک پہنچانا چاہتا ہوگا لیکن ہم اس سے محروم رہ گئے۔ آج ہمارے شہروں میں اسی طرح کے پیغام اور عصری معلومات کو فولاد کے سلنڈروں میں محفوظ کر کے زمین میں دفن کیا جارہا ہے تاکہ ہماری آنے والی نسلوں تک ہمارے پیغام اور معلومات پہنچ سکیں۔ ہماری سب سے اہم زبان ہے ریاضی (Mathmetics) جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ سرنگوں کو ناپنا، کرنوں کے راستے طے کرنے کی رفتار، کہکشاں کی روشنی زمین تک پہنچنے کا عرصہ، ہمارا تین ہزار سال کا سرمایہ ہے اور ہم اس سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

ہماری ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سارا انقلابی کارنامہ انسان نے انجام دیا ہے اور یہ ساری دریافت اس کی کاوش کا نتیجہ ہے یا محض اسی کی ترقی اور فلاح کے لیے ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان ہمیشہ زندہ اور قائم رہے گا۔ ارتقا کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ہے اور آج بھی جاری ہے جس کے تحت سب کچھ بدل سکتا ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان چند وجوہات کی بنا پر صفحۂ ہستی سے ناپید بھی ہوگیا تو کوئی دوسرا جانور اس کی جگہ ضرور لے لے گا۔

زمان و مکان کی لامحدود وسعت کے سامنے ہمارا وجود بہت معمولی حیثیت کا حامل ہے ہمیں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے بجائے بہانے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی مخلوق نہیں ہوئی جیسا انسان ہے، جو موت اور زندگی پر اپنا اختیار قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہے اور بڑی حد تک اس نے کامیابی بھی حاصل کرلی ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے حیوانات اور جانداروں کی زندگیوں کا دارومدار ہے جو آج ہمارے ساتھ اس دنیا میں رہتے ہیں۔ اس طرح انسان کی ذمہ داریاں وسیع بھی ہیں اور اہم بھی اور اسے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے اور ان کی تکمیل کرنا ہے۔

سرشار صدیقی

ڈی ۹۔ حق باہو پلازہ
گلشن اقبال، یونیورسٹی روڈ
کراچی (پاکستان)

آخرِ شب سحر

مدت سے کرنوں کی تمنا
آنکھوں کی تقدیر ہوئی ہے
ہم سورج کے پرستاروں سے
جانے کیا تقصیر ہوئی ہے

صبح کی ایک لگن تھی جی میں
اس کی نازک ڈور نہ کاٹی
مایوسی کا کھنڈر بھی توڑا
ظلمت کی دیوار بھی چاٹی

لیکن دیوارِ زنداں میں
اک روزن اک در بھی نہیں ہے
صرف حصار ہے تاریکی کا
تاریکی پتھر بھی نہیں ہے

ہاتھ بڑھاؤ پردۂ شب تک
پردۂ شب زندانِ سحر ہے
کون جیا ہے سحر ہونے تک
زلفِ شبِ غم تابہ کمر ہے

ڈاکٹر نفیس تقی

سرونج ۲۲۸-۴۶۴ (ایم پی)

وشواس کا جادو

جب تک میرے جسم کے اندر
سرخ لہو کا
بہتا دریا
زندہ ہے!
رگ رگ میں سورج کی تمازت
آنکھوں میں وشواس کا جادو
سوچوں کی پرواز خلا میں
چاند ستارے ایک قدم پر
مٹھی میں دھرتی کا گولا!
جب تک میرے جسم کے اندر
سرخ لہو کا
بہتا دریا
زندہ ہے۔!!

عبدالمبین ندوی
دارالمصنفین اعظم گڑھ

غالب کا تصورِ عشق

اُردو شاعری میں جذبۂ عشق یا تصوراتِ عشق کی ترجمانی بہ نسبت دیگر موضوعات کے کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے لے کر موجودہ دور کے شعرا نے مختلف طرزِ ادا اور متفرق زاویۂ نگاہ سے مختلف ماحول کے زیرِ اثر اپنے اپنے تصوراتِ عشق پیش کیے ہیں۔ غالب نے بھی اُردو شاعری میں اپنا تصورِ عشق پیش کیا ہے بلکہ جس طرح بحیثیتِ مجموعی اپنے کلام میں جدت طرازی اور ندرت پسندی سے سخن آفرینی کی ہے اور رسم و راہ کی پابندیوں کو توڑ کر اپنے منفرد اسلوبِ بیان کی ایک جداگانہ راہ اختیار کی ہے۔ اسی طرح وہ عشقیہ شاعری میں بھی اپنی انفرادیت اور اپنا امتیاز برقرار رکھتے ہیں اور مروجہ ڈگر سے ہٹ کر بعض نئے پہلوؤں کی ایجاد کی ہے جو مختلف النوع پہلوؤں پر مشتمل ہے، بقول طالب کشمیری جس میں آفاقیت کی شان اور کائناتی رنگ کی بہار جلوہ گر ہے، اس میں وارفتگی ہے، بیچارگی نہیں۔

غالب کا تصورِ عشق سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم یہ تعین کرلیں کہ اُردو شاعری میں کون کون سے تصوراتِ عشق پائے جاتے تھے چنانچہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"غالب سے قبل اُردو شاعری کی روایت میں عشق کے جو تصورات موجود تھے، ان میں بیشتر کی بنیادیں روایتی تصورات پر استوار تھیں۔ بعض تصورات فارسی شاعری سے اُردو شاعری میں آئے جس کی وجہ سے اُردو شاعری کی روایت میں کہیں عشق کے پرانے اور فرسودہ تصورات کو قیس و فرہاد، لیلیٰ اور مجنوں، شیریں اور فرہاد کی داستانوں کے پردے میں پیش کیا گیا ہے، کہیں عشق کے خالص جنسی اور جسمانی تصورات کی ترجمانی کی گئی ہے، کہیں عشق و عاشقی کے بعض تصورات کی حدیں تصوف و معرفت سے جا ملی ہیں اور کہیں عشق و عاشقی کے اس تصور میں وسعتیں پیدا کی گئی ہیں اور کہیں اس کے فلسفیانہ تخیل کا رجحان نظر آتا ہے۔ غرض اُردو شاعری کی روایت نے مختلف اور متنوع تصوراتِ عشق کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے، یہی سبب ہے کہ وہ ان تصورات کے رنگارنگ پھولوں کا ایک گلدستہ نظر آتی ہے۔"

غالب نے بھی اردو شاعری میں اپنا تصورِ عشق پیش کر کے بعض نئے پہلوؤں کی انوکھی ترجمانی کی ہے۔ شروع شروع میں غالب کے یہاں عشق کا جو تصور ملتا ہے وہ روایتی اور محدود ہے، جو بندھے ٹکے خیالات ہوتے تھے اور فارسی سے اُردو شاعری میں منتقل ہوئے تھے لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے مختلف ادوار میں ان کے عشق میں تبدیلی آتی گئی جس کا اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ غالب نے اپنے کلام میں جن افکار و خیالات کی ترجمانی کی ہے ان میں بیشتر حصہ حسن و عشق کی کیفیات و واردات سے عبارت ہے وہ حسن کو ہر رنگ میں اور ہر انداز میں دیکھنے اور اس سے حظ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے عشق نے بھی نہ جانے کتنے روپ بدلے جن کے ہزاروں رنگ ان کے غزلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی عشقیہ شاعری کے عوامل و محرکات کیا تھے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔ ـــــــ

"غالب کی عشقیہ شاعری کے ان پہلوؤں اور عوامل و محرکات کو سمجھنے کے لیے ان کے خاندان، ان کی شخصیت اور کردار، ان کے زمانے کی فضا اور ماحول، ان کے عہد کے ذہنی و فکری رجحانات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ ان کی عشقیہ شاعری اور عشقیہ تصورات کی تشکیل و تعمیر میں ان تمام پہلوؤں نے نمایاں حصہ لیا۔"

مزید لکھتے ہیں: ـــــــ

"غالب مغلوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، وہ مغل جو جنگجو اور بہادر ہونے کے باوجود لطیف اور حسین و جمیل چیزوں کے شیدائی تھے، سو پشت سے جن کا پیشہ سپہ گری تھا اور بہ ظاہر شعر و شاعری جن کے نزدیک ذریعہ عزت نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود شعر و شاعری کی دنیا میں بسر کرتے تھے، حسن و جمال کا احساس اور ادب و فن کا مذاق ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ وہ مرتے دم تک ان سے دلچسپی لیتے رہے۔ حسن و جمال جس حال میں ہو، جس جگہ بھی ہو ان کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا رہا۔"

ان نسلی و خاندانی حالات نے ان کی طبیعت و مزاج پر اثر ڈالا، کیوں کہ آنکھ ایسے ماحول و خاندان میں کھولی تھی جہاں جاہ و جلال، ریاست و امارت تھی، اس لیے بچپن تو امارت کے سائے میں بسر ہوا، لیکن بعد میں ناسازگار حالات سے دوچار ہونے کی وجہ سے وہ انداز خسروانہ باقی نہ رہا۔ تاہم وہ امیرانہ خصوصیات کو خیرباد بھی نہ کہہ سکے اس کا ثبوت ان کی بلندیِ فکر اور احساسِ برتری ہے، جو ان کی زندگی کا جزو بنی رہی۔ غالب کے مزاج و ماحول کی یہی خصوصیات ان کی عشقیہ شاعری اور ان کے تصورِ عشق پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے تصورِ عشق کا تار و پود انھیں خصوصیات سے تیار ہوا اور پروان چڑھا ہے۔

حسن اور حسن پرستی غالب کی شخصیت و شاعری دونوں میں نہ صرف نمایاں ہے بلکہ ان کی انفرادیت کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے، غالب نے حسن و عشق کا بیان بڑی نفاست اور لطافت بلکہ بڑی جرأت و بے باکی سے اس زمانہ میں کیا ہے جبکہ معاشرہ آج کی طرح ترقی یافتہ یا مغرب زدہ نہیں تھا بلکہ مخصوص تہذیبی و معاشرتی اقدار نے اسے عام نہیں ہونے دیا تھا۔ اس وقت عشق کے متعلق غالب جو کچھ سوچتے تھے، بعینہٖ اس کا اظہار اپنے اشعار میں بے جھجک کر دیتے تھے، جو ان کی عشقیہ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

اور بقول حالی: "غالب ہمیشہ ریاکاری سے کوسوں دور رہے" ـــــــ

اور یہی وجہ ہے کہ غالب کا نقطۂ نظر ہر معاملہ میں جذباتی ہونے کے بجائے عقلی ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ غالب اس میں ڈوب گئے ہیں اور اس حسن کے شدید احساس ہی نے انھیں صنفِ نازک کا شیدائی بنا دیا ہے۔ نسوانی حسن کہیں بھی ہو وہ اس سے متاثر ضرور ہوتے ہیں اور صرف نسوانی فطرت ہی نہیں بلکہ مناظرِ فطرت سے بھی متاثر ہوتے ہیں لیکن بالآخر اس کی تان نازنینِ بتانِ خود آرا، ان کی صبر آزما نگاہوں، اور طاقت رُبا اشاروں پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ سفرِ کلکتہ میں جو کچھ انھوں نے دیکھا اور جن حالات سے دوچار ہوئے اس کی یاد ہمیشہ ان کے دل پر ایک تیر مارتی رہی، وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنین بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

غالب حسن اور حسن کی اداؤں سے، اس کی شوخیوں سے، اس کی سج دھج سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، وہ عام ہندوستانی شاعروں کی طرح حسن سے صرف

ہوس پوری کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بوالہوسوں نے جس طرح حسن پرستی کی ہے اس سے اہلِ نظر کی آبرو جاتی رہی ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

غالب اپنے معشوق کے سروقد سے، اس کی چشم مژگوں سے، اس کی عنبریں زلفوں سے کھیلتے ہیں، وہ اس کی تقریر، اس کے خرامِ ناز، اس کے نقشِ پا، اس کی عبارت، اشارت اور ادا سے متاثر ہوتے ہیں اور مست ہو جاتے ہیں، اور مست ہو کر جھومنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

غالب اپنے معشوق کو کبھی حسین کہتے ہیں کبھی شعلہ خو اور آتش نفس قرار دیتے ہیں اور کبھی سروقد اور پری تمثال سے تشبیہ دیتے ہیں۔ غرض وہ عشق ہی کو رونقِ ہستی کا راز تصور کرتے ہیں ؎

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یہاں حسن و عشق کے تلازم و رشتہ کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر حسن ہو اور عشق نہ ہو، اور عشق ہو اور حسن ناپید ہو تو دونوں کے بغیر ایک دوسرے کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے، اور حسن و عشق ہی ایسی چیزیں ہیں جو کائنات مدرکہ کے اہم مظاہر ہیں، جیسے غالب نے انجمن اور شمع سے تشبیہ دی۔ اگر خرمن میں برق نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں حسن و عشق کے اس ربط کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"عشق انسانی فطرت میں ودیعت ہے، کوئی انسان چاہے کتنا ہی بے حسن کیوں نہ ہو، اپنی فطرت کی اس اساسی حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ حسن کی قدر عشق کے بغیر ممکن نہیں۔ عشق و حسن کائناتِ مدرکہ کے اہم مظاہر ہیں جس طرح عشق کی لپکتی امنگوں کے بغیر حسن کا وجود بے معنی ہے اسی طرح حسن کے بغیر عشق کا مقصود و منتہا متعین نہیں کیا جا سکتا۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"حسن کا احساس اور اس کی قدر افزائی عشق کے چراغ کی روشنی ہی میں ممکن ہے۔"

بہرحال حسن و عشق کے متعلق جس قدر بلند اور لطیف اشعار غالب کے کلام میں ہیں اور حکمتِ عشق کی نسبت جو گہرائی و گیرائی ان کی نظر میں ہے وہ اردو زبان کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ غالب نے عشق و محبت کے جذبے کو تخیل کے رنگ میں جس طرح رنگ دیا ہے اسے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا، جب وہ کہتے ہیں ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

تو عشق کے متعلق جتنا مکمل نقشہ اور تصور اس غزل میں ملتا ہے کہیں اور نظر نہیں آتا، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی بھرپور توانائیوں کے ساتھ عشق کرتے ہیں۔ بقول شہید صفی پوری :۔

"دل و جگر بھی عشق کے اہتمام میں مصروف ہیں، خامۂ مژگاں خونِ دل سے چمن طرازیِ داماں کا ساز کیے ہوئے ہے دل و دیدہ، نظارہ و خیال کی تیاری کر رہے ہیں، خیالِ بوستانِ حسن کے نظاروں سے نگاہوں کے لیے سامانِ مسرت فراہم کرنے میں سرگرم ہے، اور ہوس کو تمنا ہے کہ وہ کسی کو لبِ بام رخ پر زلفِ سیاہ پریشاں کیے ہوئے دیکھے، یعنی ان کے عشق کے اجزائے ترکیبی میں جذبات کی کارفرمائی بھی ہے احساسات کی بھی، عقل کی بھی اور تخیل کی بھی، وہ ذہنی بھی ہے اور جذباتی بھی اور مادی بھی۔ اس طرح ان کا عشق رومانیت کی اور حقیقت پسندی کی تمام دلفریبیوں اور توانائیوں سے معمور نظر آتا ہے۔ یہ شعر ان کے جنسی تصور کی عکاسی کرتا ہے ؎

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

روایتی اور جنسی تصورِ عشق پیش کرنے کے ساتھ ساتھ غالب نے شعر میں تصوف اور معرفت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ انفرادیت پسند جذبے کے

ساتھ تو ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں ان کی رُوح ساتھ بولتی نظر آتی ہے۔ ان کی دنیائے عشق و عاشقی بہت وسیع ہے۔ اس میں جہاں خیالات کا تنوع ہے وہیں رنگینی و رعنائی کی بہار بھی ہے اور کیف و سرمستی کا لطف بھی۔ طالب کشمیری اپنی کتاب جوہر آئینہ میں لکھتے ہیں :۔

"جن اشعار میں غالب حسن و عشق کے جذبات و احساسات
اور دل پر گزری واردات کی مختلف حالتوں کا نقشہ کھینچتے ہیں
ان سے ان کے ذہنی میلانات و رجحانات کا پتہ چلتا ہے، ان
کے یہاں عشقِ حقیقی کا تصور کمیاب ہے۔ کبھی عالمِ روحانیت
کی سیر کرتے ہیں تو ایک چھلتی نظر سے، تصوف یا معرفت
پر قلم اٹھاتے ہیں تو رسمی طور پر۔ خود بقول ان کے 'محض
آرائشِ شعر کے لیے' ان کے اکثر عشقیہ اشعار میں جسمانی لذت
پرستی، تعیش اور عشق کے جنسی و مادی تصور کا رنگ صاف
جھلکتا ہے، جس سے نفسیاتی حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے"!

غالب عشق دل و جان سے کرتے ہیں لیکن ان کا معشوق طوائف کے بھیس میں نظر نہیں آتا بلکہ وہ صحیح معنوں میں انسان ہے اور اس زمین پر بسنے والا انسان ہے اسی لیے اس سے "چھیڑ خوباں" بھی ہوتی ہے، اور کبھی تصورِ جاناں میں گم ہوتے ہیں تو یوں گویا ہوتے ہیں ؎

دل ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کیے ہوئے

وہ صرف حسن کی تعریف اور تصورِ جاناں ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے کردار کو بھی نمایاں کرتے ہیں اور کبھی عادات و اطوار کی تصویر کھینچتے ہیں، کہتے ہیں وہ ستم شعار اور جفا پیشہ ضرور ہے لیکن ازراہِ لطف و محبت کبھی کبھی اس کے جی میں نیکی بھی آجاتی ہے اور اپنی جفاؤں پر شرمسار ہوتا ہے ؎

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ صداقت و صاف گوئی ان کی شخصیت کا اہم حصہ ہے اور جرأتِ اظہار ان کی بہت بڑی دین ہے، چاہے خدا کے سامنے ہو یا معشوق کے وہ آنتالی دنیا کے سامنے حق بات کہہ دیتے ہیں اور خدا کے روبرو اور معشوق کے روبرو عاشق کا دعویٰ قائم رکھتے ہیں۔ ایسے طرزِ بیان غالب سے پہلے تقریباً نایاب ہیں، مثلاً ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اس لیے یہ جرأت انھیں روایتی تصورِ عشق اپنانے کی اجازت نہیں دیتی چنانچہ جب وہ کہتے ہیں کہ ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر نظریۂ عشق کے متعلق ان کا یہ خیال ہے بلکہ موجودہ روایتی تصورِ عشق ان کو دماغ کا خلل معلوم ہوتا ہے جس سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا ہے۔ ویسے جہاں تک عقلی تصورِ عشق کا تعلق ہے تو اس کی اہمیت کے غالب قائل ہیں۔

اور غالب کا یہ بھی خیال ہے کہ عشق کے میدان میں قدم رکھنا معمولی دل گردہ کے آدمی کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے پتھر کا کلیجہ رکھنے کی ضرورت ہے جو ہر مصیبت کو سہہ سکتا ہو، اس کے لیے وہ صرف اپنے آپ کو مناسب و موزوں سمجھتے ہیں، کہتے ہیں ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غرضیکہ غالب عشق کی اہمیت اور اس کی بڑائی کے قائل ہیں، انھیں اس بات کا احساس ہے کہ عشق کے تمام مطالبات پر وہی پورے اترتے ہیں۔ ان کے عشق کا یہ تصور ایک مخصوص تصور ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی : "اس میں جذباتیت سے زیادہ عقلیت ہے، روحانیت سے زیادہ مادیت ہے، رومانیت سے زیادہ حقیقت ہے، عینیت سے زیادہ واقعیت ہے"۔

طوالت سے بچنے کے لیے غالب کے تصورِ عشق سے متعلق ہم چند نقادوں کے خیالات پیش کر دیتے ہیں جس سے قاری یا طالب علم خود فیصلہ کر لے گا، اور ایک نتیجہ پر پہنچ جائے گا۔

جناب طالب کشمیری کا خیال ہے ـــــــ

"حسن و عشق کے جذبات و احساسات اور واردات و
کیفیات کی ترجمانی کے سلسلے میں انسانی نفسیات کے رنگ
میں رنگی ہوئی جیسی تصویریں غالب نے کھینچی ہیں ان کی مثال
ملنی مشکل ہے۔ معشوق کا ناز و انداز، عشوہ و ادا، شرم و حیا،
چھیڑ چھاڑ، راز و نیاز، درد ہجر، کیفیت وصل، خواہش بوس و
کنار، لذتِ دشنام عاشق کی سادگی، تمنا، جوشِ جنوں، ذوق

صحرا نوردی بے اثر کیا آ ہو نا یاب ، غالبؔ غیر و سب یہاں ان کے یہاں موجود ہے۔ غرض فطرتِ انسانی کے تمام تقاضے جو جذبۂ عشق سے متعلق ہیں اور معاملہ بندی کے محرک ہوتے ہیں، وہ اپنی فن کاری سے اس طرح اُجاگر کرتے ہیں کہ یہ عمل اوروں کی دسترس سے باہر ہے۔"

ناحسرت موہانی کہتے ہیں :۔

"مرزا کی شاعری عاشقانہ ضرور ہے لیکن انھوں نے عشق کے معنی داغؔ دہلوی یا آزاد لکھنوی کی مانند بوالہوسی کے نہیں لیے ہیں، اس لیے ان کے خیالات میں دنائت اور پستی کے بجائے متانت اور شائستگی کی ایسی شان پائی جاتی ہے جس کی مثال شعرائے لکھنؤ کے کلام میں ناپید ہے اور متاخرین شعرائے دہلی کے کلام میں کمیاب۔"

جناب مجنوں گورکھپوری غالبؔ کے تصورِ عشق پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں :۔

"عشق فطرتاً آزاد ہوتا ہے اس کو روایت سے واسطہ نہیں، اس کا اپنا ایک ناموس ہے، اس کی اپنی ایک شریعت ہے، مروجہ شرع و آئین اور رسوم و قیود اس پر عاید نہیں کیے جا سکتے۔ رسمی قاعدوں اور طریقوں سے عاشق محبوب کو نہیں پا سکتا۔ غالبؔ "کوششِ فرہاد" کے ایک نئے رُخ کو ہمارے سامنے لاکر عشق کی فطرتِ آزاد کا احساس دلاتے ہیں ؎

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا !

غالبؔ کہتے ہیں کہ آدمی یا انسان کا امتیازی نشان مردانگی ہے، اگر انسان میں یہ فتوت و مردانگی نہیں تو کچھ بھی نہیں، اور غالبؔ مرد کی پہچان یہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنے دل میں عشق کا درد رکھتا ہو اور یہ دردِ عشق ہونٹوں سے ولولہ انگیز ترنم کی شکل میں ظاہر ہو۔"

اور مجنوں ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ :

"انسانی ہستی اور عشق غالبؔ کے تصور میں ایک ہی قوت کے دو نام ہیں، عشق ایک فعّال اور خلّاق قوت ہے، جس کو جوہرِ اول کہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کہیں کہیں غالبؔ نے عشق کا وہ تصور پیش کیا ہے جس سے عوام آشنا اور مانوس ہیں، مثلاً ؎

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ اس لیے ہے کہ غالبؔ زندگی کی ہر سطح کے شاعر تھے، غالبؔ کے ذہن میں عشق اور زندگی دونوں باہم مترادف ہیں، ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں :۔

" غالبؔ کے کلام میں حسن و عشق کے متعلق نہایت بلند اور لطیف اشعار کی کمی نہیں، میں سمجھتا ہوں حکمتِ عشق کی نسبت ان کی نظر میں جو گہرائی و گیرائی ہے وہ ہماری زبان کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ غالبؔ نے بڑی خوبی سے عشق و محبت کے بیان میں جذبے کو تخیل کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔"

بشر نواز کا خیال ہے کہ :

" غالبؔ زندگی میں بھی اور عشق میں بھی فائدہ نقصان، کھونے پانے، کوشش اور حصول پر نظر رکھتے ہیں۔"

غرض غالبؔ نے تصورِ عشق سے متعلق جو رنگا رنگ تصویریں پیش کی ہیں، وہ انھیں کا حصہ ہیں، دورِ حیات کی دھوپ چھاؤں میں ان کے عیش و تنعم اور افسردگی میں ان کے مزاج و طبیعت کے تحت جو مختلف الاثر نقوش ان کے ذہن و دماغ پر مرتسم ہوئے ہیں۔ اس افتادِ طبع سے ان کے عشق میں بھی یکسوئی و ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی جس سے ان کا تصورِ عشق پلٹے کھاتا رہا ہے۔ مختلف وقتوں میں مختلف النوع تصورات پیش کیے، روایت سے بغاوت بھی کی، جو ان کی زندگی کا اہم حصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ خود پسندی اور انانیت کا رنگ ان کی زندگی میں غالب اور نمایاں رہے جس کے واضح اثرات ان کے تصورِ عشق میں ملتے ہیں۔ مثلاً جب وہ کہتے ہیں ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

تو اس وقت اپنی ذات کے سامنے معشوق تک کو کچھ نہیں سمجھتے جس کے ہر ناز و انداز پر اپنی ہزار جانیں نثار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن پیری میں جب قویٰ مضمحل ہو گئے اور پہلے سا دم خم باقی نہیں رہا اور وہ رنگینیِ خیال باقی رہی

جو جوانی میں تھی تو عشق سے وہ بعد ظاہر کیا ہے جو ایمان سے کفر کو ہے۔

غالب اپنی افتادِ طبع پر خود اظہارِ خیال فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب ان سے ان کے ایک ہم عصر مرزا علائی نے کچھ تازہ اشعار کی فرمائش کی، تو ان کو جواباً تحریر کیا کہ،

"اشعارِ تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ
اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو، گورنمنٹ کا
بھاٹ تھا، مدحتی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا، خلعت موقوف
مدحتی متروک، نہ غزل نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں
پھر کہو کیا لکھوں، بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتلانے کو رہ گیا
ہوں"!

اس کی روشنی میں ایک قاری خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان کا تصورِ عشق کیا ہے، مذکورہ بیان آخری عمر کا ہے۔

الغرض مختلف انداز سے بحث و تمحیص کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ ان کے یہاں رنگا رنگی بھی ہے، انوکھاپن اور انفرادیت بھی ہے لیکن ایک مربوط تصورِ عشق نہیں ہے، جیسا کہ ہم مختلف پہلوؤں سے اس مضمون پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ بہرحال ان کے تصورِ عشق کی ایک جھلک مندرجہ ذیل متفرق اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے ؎

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

غالب یہاں مجنوں سے بڑھ کر کسی اور کو عاشقِ کامل نہیں مانتے ہیں۔

غالب زندگی کو ایک درد اور عشق کو اس کی دوا سمجھتے ہیں جبکہ عشق خود ہی ایک دردِ بے دوا ہے۔ کہتے ہیں ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

وہ دل کے لیے غم کا ہونا بھی ضروری سمجھتے ہیں ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

اسی طرح وہ عاشق کا فریاد کرنا شانِ عشق کے خلاف سمجھتے ہیں ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

اور جب وہ عشق و وفا کا دعویٰ کرتے ہیں اور معشوق اسے غلط تصور کرتا ہے تو کہتے ہیں

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا!
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

بہرکیف اس تمام حکایتِ وفا و جفا کے باوجود عشق میں بیخود و وارفتہ ہو ہو جاتے ہیں اور ان کی ہر نگاہ رُخِ یار تک پہنچ کر ایسی مست ہو جاتی ہے کہ اس کے تار بکھر کر نقاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس وقت نظارہ سے محروم ہو کر کہنے لگتے ہیں ؎

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

اور کبھی اس پر کفِ افسوس ملتے ہیں کہ ان کے معشوق کا خنجر بھی کتنا تیز ہے جو چشم زدن میں کام تمام کر دیتا ہے۔ حالانکہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش یہ کُند ہوتا اور جتنی دیر گلا کٹتا اتنی دیر تو وہ معشوق کو دیکھ کر اپنی حسرت پوری کرتے ؎

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

غرضیکہ ان کی داستانِ عشق اس قدر طویل ہے کہ قاصد بھی سن کر گھبرانے لگتا ہے پھر معشوق اسے کب سُننا گوارا کرے گا۔

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اس تجزیہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ غالب کی زندگی میں اور شخصیت میں عشق و عاشقی کا رنگ پوری طرح رچا ہوا تھا۔ اس راہ میں جو منزلیں آتی ہیں اُن سب سے غالب گزرے ہیں اور وہ راہِ عشق کا مکمل تجربہ رکھتے تھے اس لحاظ سے غالب کی عشقیہ شاعری اُردو شاعری کی روایت میں ایک منفرد و ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر

گل مہر فلیٹ جی تھری، دیپانکر
بھیونڈی (تھانہ)

رباعیات

نرمیٔ سخن جان لیے لیتی ہے
گیسو کی شکن جان لیے لیتی ہے
اس شوخ کی دزدیدہ نظر کے صدقے
بے دار و رسن جان لیے لیتی ہے

گھنگھور گھٹا جب بھی برس جاتی ہے
برہا کی اگن میں وہ جھلس جاتی ہے
برہن کی دشا جانے تو برہن جانے
اک لمس کو بیچاری ترس جاتی ہے

ساون کی گھٹا جھومتی گاتی برسے
گھونگھٹ میں برہن کو رلاتی برسے
بھادوں کی گھٹا برسے تو وہ بھی ظالم
جذبات میں اک آگ لگاتی برسے

کوئل کی صدا کانوں میں رس گھولے ہے
تن ڈولے ہے گوری ترا من ڈولے ہے
یوں کہنے کو تو سب سے ہنسے بولے ہے
پر حال جو ہے دل کا وہ کب کھولے ہے

پردیس میں کیوں جا کے بسے ہو، لکھو
تم کون سی ناگن کے ڈسے ہو، لکھو
کس موہ نے واں تم کو جکڑ رکھا ہے
تم کون سی رسی میں کسے ہو، لکھو

گل پاش و گل انداز و گل افشاں آیا
وہ روح چمن جانِ بہاراں آیا
اے نرگسِ بیمار بچھا دے آنکھیں
آیا وہ مرا سروِ خراماں آیا

یا تو وہ حسیں سوئے زمیں دیکھے ہے
یا دور فضاؤں میں کہیں دیکھے ہے
دیکھے ہے مری سمت بھی پریوں کہ ظفر
سب لوگ یہ سمجھیں کہ نہیں دیکھے ہے

وہ صبح بصد رنگِ سحر ملتا ہے
راتوں کو وہ خوابیدہ نظر ملتا ہے
اور شام اگر دیر سے گھر آتا ہوں
بے چین پسِ پردۂ در ملتا ہے

وہ گل رخ و گلفام گلستاں کو چلا
آدابِ محبت کے دبستاں کو چلا
اور رات گئے رات ڈھلے شرماتا
خاموش و سبک گام شبستاں کو چلا

حبیب احمد
۱۸۔ گلی خزانچی، نزد جدید کوتوالی
بھوپال

سراج میر خاں سحر حیات و شاعری

ریاست بھوپال کی تاریخ میں انیسویں صدی کا آخری نصف حصّہ علمی اور ادبی سرگرمیوں کا عہدِ زرّیں شمار کیا جاتا ہے۔ بھوپال میں عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی آمد بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ سکندر جہاں بیگم کے عہد میں مولانا عباس رفعت شیروانی، مولوی جمال الدین افغانی گمنام، سید یوسف علی یوسف، حکیم اصغر حسین اکبر، عبدالواحد مسکین، نواب صدیق حسن خاں توفیق، خاں محمد شہیر، سید امجد علی اشہری، شاہ رؤف احمد رافت جیسے مشاہیر علم و ادب بھوپال میں قیام پذیر تھے۔ ان کی سرگرمیوں سے بھوپال علم و ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ اسی عہد میں ۱۸۵۵ء میں سراج میر خاں سحر بھوپال میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کے دو نام رکھے۔ افضل میر خاں اور سراج میر خاں۔ لیکن اوّل الذکر نام زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا اور وہ سراج میر خاں ہی کے نام سے جانے گئے۔ ان کا خاندان اپنی فوجی خدمات کی وجہ سے ریاست میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ زمانے کے رواج اور خاندانی روایات کے مطابق انھیں علوم متداولہ اور فن سپہ گری کی تعلیم دی گئی۔ چونکہ وہ مزاجاً آزاد پسند تھے اس لیے کبھی ملازمت اختیار نہ کی۔ صرف ریاست کی سرپرستی کی بدولت فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ ان کا انتقال بھوپال میں ۲۰ رجون ۱۹۱۸ء کو ہوا۔

نواب شاہ جہاں بیگم کے عہد میں بھوپال میں شاعری کا چرچا اور بڑھ گیا تھا وہ خود بھی شاعرہ تھیں اور شیریں تخلص کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ نواب سکندر جہاں بیگم نے غالب کو بھوپال آنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ بعض وجوہ سے بھوپال نہ آ سکے تھے۔ شاہ جہاں بیگم کی ادب پروری اور ادیب نوازی کی بدولت ہندستان کے مختلف شہروں سے متعدد شعراء بھوپال آ گئے تھے جن میں دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ کے بعض شاگرد بھی شامل تھے۔ شعر گوئی خاص و عام کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس زمانے میں مشاعرے اور مخصوص شعری محفلیں بکثرت منعقد ہوتی تھیں۔ اس ادبی ماحول میں سراج میر خاں سحر نے شاعری شروع کی۔ ابتدا میں سراج تخلص کرتے تھے۔ تذکرہ آثار الشعراء میں اسی تخلص کے ساتھ ایک غزل شامل ہے۔ تذکرہ میں ممتاز علی اعجاز ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سراج تخلص افضل میر خاں بن ہزارہ میر خاں مرحوم
ساکن قدیم بھوپال نبیرہ نواب نظیر الدولہ امراؤ دولہا باقی محمد
خاں صاحب بہادر قوم میرزائی خیل و خوش خصال، جواں بخت
و جواں دولت جواں سال"۔ [1]

بعد میں نامی خیرآبادی کے مشورہ پر سحر تخلص اختیار کیا اور نامی خیرآبادی سے رشتہ تلمذ قائم کیا۔ شاہ ممتاز علی آہ نے امیر مینائی کی سوانح عمری "سیرت امیر احمد امیر مینائی" میں امیر مینائی کے ممتاز شاگردوں کی فہرست میں سراج میر خاں سحر کا نام بھی درج کیا ہے لیکن کسی دوسرے حوالے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ البتہ یہ روایت ضرور ملتی ہے کہ جس زمانے میں امیر مینائی بھوپال میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن سراج میر خاں سحر نے اپنی ایک غزل اصلاح

کے لیے پیش کی۔ امیر مینائی نے پہلے تو کہا کہ کلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں ہے لیکن جب سحر نے بہت اصرار کیا تو انھوں نے ان کے ایک شعر میں "بہارِ صد چمن" کو بدل کر "بہارِ یاسمن" کر دیا۔ وہ شعر اس طرح تھا

وہ جب تقریر کرتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں
لبوں پر بات کیا آئی بہارِ صد چمن آئی

بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر:

"ممکن ہے سراج میر خاں کو امیر کے تلامذہ میں شامل کرنے کا انحصار صرف اسی واقعے پر ہو"۔ ؎۵

سراج میر خاں سحر نے تقریباً اکسٹھ ۶۱ برس کی عمر میں وفات پائی ان کی زندگی کا ایک بڑا حصّہ ادبی سرگرمیوں میں گزرا تھا لیکن ادبی سرمایہ دست بردِ زمانہ سے تباہ ہوگیا۔ سر راس مسعود کے حکم پر عبد الجلیل اَمل نقوی نے ان کی باقیات کو "بیاضِ سحر" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں مرتب کیا۔ اس مجموعہ میں پینتیس ۳۵ اردو غزلیں، دو ۲ تضمینیں، تین ۳ مسدس، ایک نامکمل قصیدہ، ایک قصیدہ کا مطلع، تین ۳ تاریخی قطعات اور نو متفرق اشعار کے علاوہ ایک فارسی مسدس اور ایک فارسی قطعہ بھی شامل ہے۔

"بیاضِ سحر" سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج میر خاں سحر غزل گوئی کی طرف مائل تھے۔ انھوں نے طرحی مشاعروں کے لیے کتنی غزلیں لکھیں اس کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا، البتہ "بیاضِ سحر" میں تین طرحی مشاعروں کی غزلوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان تین غزلوں میں سے ایک غزل راجہ عبد العلی کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی جس کا مطلع ہے ؎

اجزا بکھیر دوں گا آہِ شرر فشاں سے
گن گن کے بدلے لوں گا اک روز آسماں سے

باقی دو غزلیں "پیامِ عاشق" اور "گلبنِ سخن" میں شائع ہوئی تھیں۔

"پیامِ یار"، "پیامِ عاشق" اور "گلبنِ سخن" اس زمانے کے مشہور گلدستے تھے۔ سحر کا کلام بھی ان گلدستوں میں شائع ہوا۔ ہر چند کہ "بیاضِ سحر" کے مرتب نے کلام کی تلاش و جستجو میں بڑی کد و کاوش کی ہے اور اسے سلیقے سے مرتب کیا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ "بیاضِ سحر" کی ابتدا میں سحر کی ایک قلمی غزل کا جو عکس دیا گیا ہے اس کے مندرجہ ذیل دو اشعار متن میں شامل نہیں کیے گئے ؎

یوں ان کے در پہ جھگڑا ہر آن ہی رہے گا
ہم ہی رہیں گے یا اب دربان ہی رہے گا
کہتے ہیں وہ عدو سے مجھ کو سنا سنا کر
دل میں کسی کے میرا ارمان ہی رہے گا

اگر توجہ سے قلمی غزل کا مطالعہ کیا گیا ہوتا تو مذکورہ بالا دو اشعار متن میں شامل ہونے سے نہ رہ گئے ہوتے۔ علاوہ ازیں پندرہ روزہ "شعلۂ حیات" بھوپال کے "مدھیہ پردیش اردو نمبر" (یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء) میں "گلبنِ سخن" کے حوالے سے سحر کے جو اشعار درج کیے گئے ہیں ان میں سے مندرجۂ ذیل شعر "بیاضِ سحر" میں شامل نہیں ہے ؎

کیا جانے کس کو یاد ہے اس ناتواں کی آج
مشکل ہوا ہے توڑنا ہچکی کے تار کا۔

سراج میر خاں سحر کی بیشتر غزلیں اساتذہ کی مشہور زمینوں میں ہیں اس کا سبب طرحی مشاعروں کی شرکت گلدستوں کی فرمائش یا اس زمانے کا ادبی فیشن ہو سکتا ہے۔ بہر حال انھوں نے حسن و عشق کے محدود دائرے میں معنی آفرینی کی بہار دکھائی ہے۔ غزل کا یہ موضوع زمانۂ قدیم سے شعرا کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور اس میں آدابِ عشق کی کچھ مخصوص روایات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں رنگینی کے باوجود یکسانیت پائی جاتی ہے، لیکن شاعر اگر اظہار پر قادر ہے تو فرسودہ مضامین میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔

غزل ایک روایتی صنفِ سخن ہے۔ اس میں شعرائے سلف سے استفادہ نہ تو کوئی نئی بات ہے اور نہ اس سے شاعر کے مرتبے پر حرف آتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر جن خیالات کو قبول کرتا ہے ان سے اس کی فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کی انفرادیت کا انحصار خیالات سے زیادہ اسلوب پر ہوتا ہے۔ اندازِ بیان کا نیا پن بار ہا کسی معمولی خیال کو جدّت و ندرت عطا کر دیتا ہے اور کلام میں ایک خاص قسم کی تازگی و توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی تازگی و توانائی شاعر کی حیاتِ ابدی کی ضامن ہوتی ہے ورنہ اکثر شعرا اپنے زمانے ہی میں غیر اہم ہو جاتے ہیں۔ سراج میر خاں سحر نے بھی جا بجا اپنے اندازِ بیان کی روانی، تازگی، برجستگی اور شوخی سے لطف پیدا کر دیا ہے ؎

قفس میرا بچا کر دو کہ ہوا کے رُخ سے اے گلچیں
پھڑک کر جان دے دوں گا اگر بوئے چمن آئی

جلوے نے تیرے دھوم مچا دی جہان میں
اُجڑے دیار، مصر کے بازار ہو گئے

گو بکتے ہیں نالہ ہائے قیس کوہ و دشت میں
اب کدھر لے جائے ناقۂ ساربان چکر میں ہے

ہوتے ہی جواں اے سحر اک شوخ پہ مر بیٹھے
اللہ تمہیں بخشے کچھ اور جیے ہوتے

سراج میر خاں سحر نے مستقل طور پر نعتیہ شاعری نہیں کی لیکن معلوم ہوتا ہے ان کا دل عقیدتِ رسولؐ سے سرشار تھا۔ ان کو گمنامی سے نکال کر ادبی دُنیا میں دوبارہ روشناس کرانے کا ذریعہ ان کی ایک ایسی غزل تھی جس کے بعض نعتیہ اشعار عدیم المثال تھے۔ سر راس مسعود کو کسی گویے سے ان کی یہ غزل سُن کر ہی ان کے کلام کو شائع کرانے کا خیال پیدا ہوا تھا ؎

سینے میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق
باندھ کے صف ہوں سب کھڑے، تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق
سر کو کٹا کے لوٹ لی دولتِ وصل سرمدی
تیغ کے گھاٹ قطع کی ہم نے رہِ درازِ عشق
پردے میں چھپ کے الحذر، گوشے میں رہ کے الاماں
ہم کو خبر ہے ہوگیا حسن سے ساز بازِ عشق
نام و نشاں مٹا چکے شوقِ جفا و ذوقِ جور
جان و جگر جلا چکے سوزِ دل و گدازِ عشق
خاصِ خدا کا وہ مقام دل میں خدا کے اس کا گھر
عرش سے بھی بلند ہے درگہِ بے نیازِ عشق
فرش زمیں پہ مصطفیٰؐ عرش بریں پہ کبریا
پہنچا کہاں ہے دیکھنا سلسلۂ درازِ عشق
دار پہ کوئی چڑھ گیا، پھوڑ کے سر کوئی مرا
نام جہاں میں کر گیا سحر اُٹھا کے نازِ عشق

مائل نقوی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ،

"یہ غزل وہ مایہ ناز غزل ہے جو ان کی شاعری کا حاصل بھی جاتی ہے۔ یہ غزل ان کے دل و زبان سے نکل کر تمام ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ نصف صدی اُدھر سے آج تک دلوں اور محفلوں کو برابر گرما رہی ہے اکثر رنگین طبع اور خوش گو شعرا نے اس غزل پر غزلیں لکھیں، ہر قافیے کے لیے نئے نئے پہلو اختیار کیے، جداگانہ مضامین پیدا کیے، مختلف اندازِ بیان ایجاد کیے، مگر جو بات ان کے یہاں ہے وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی"[۳۵]

اُردو غزل کے مقبول موضوعات میں عشقِ حقیقی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بعض شعرا تو صرف اپنے صوفیانہ کلام کے سبب پہچانے جاتے ہیں۔ سحر نے بھی غزل کی اس روایت سے خود کو وابستہ کر رکھا ہے ان کے بعض اشعار میں تصوف کی چاشنی ہی نہیں، گرمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

اَناالحق کے عوض لب سے اَناالمحبوب جاری ہو
چڑھائیں دار پہ مجھ کو اگر منصورؔ کے بدلے

پڑا جس بُت کا عکس اس میں، نظر آیا خدا ہو کر
رہا پہلو میں دل آئینۂ وحدت نما ہو کر

غزل کی دوسری روایات میں رندی و سرمستی کا بیان بھی شامل ہے۔ واعظ و ناصح پر طنز و تعریض کرنا اور اس کے ساتھ اخلاقی نکات بیان کرنا بھی اُردو شاعروں کا پسندیدہ موضوع ہے۔ سحر نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے ؎

اک جام کے عوض ہم جنت کو بیچ ڈالیں
زاہد غریب اتنا دل لائے گا کہاں سے

سحر ایک جام کے عوض جنت کو بیچ دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اسی

(باقی ص ۹۵ پر)

غزلیں

کمال احمد صدیقی

۲۰۔ راؤز ایونیو۔ نئی دہلی

کچھ آج ترا چہرہ ہے شاداب زیادہ
کچھ آج مرا دل بھی ہے بیتاب زیادہ

اس عشق کے دریا میں جو ڈوبے وہی جانے
منجدھار وہیں ہے، جہاں پایاب زیادہ

محفل تو بم و زیر میں نغمات کے گم ہے
سکتے میں ہیں کچھ صاحبِ مضراب زیادہ

ہر خواب کو تعبیر بناتے ہیں با تدبیر
جو میری طرح دیکھتے ہیں خواب زیادہ

تحریر میں بھی ایک تکلّف کا ہے انداز
مضمون ہے کم، اور ہیں القاب زیادہ

نشتر میں اثر ہے نہ دواؤں میں اثر ہے
کچھ درد سے ہوں آج میں بیتاب زیادہ

اُٹھنے کی سکت اور نہ چلنے کی ہے طاقت
شاید ہیں مرے جسم میں اعصاب زیادہ

میخانے میں یہ بحث ہے اب اچھی شرابیں
کمیاب زیادہ ہیں کہ نایاب زیادہ

یوں بھی ہیں کمال آپ مزاجاً متلوّن
کچھ آج ہے کیفیتِ سیماب زیادہ

جلیل فتحپوری

۸۹/۸۸ ۔ چمن گنج، کان پور

اے حُسن میرے عشق کا معیار دیکھنا
عیدِ نظارہ ہے رسن و دار دیکھنا

اک اک نفس ہے کیفِ محبّت لیے ہوئے
کس درجہ ہے لطیف غمِ یار دیکھنا

اہلِ ہوس کے لب پہ بھی دعوائے عشق ہے
گر جائے گی یہ ریت کی دیوار دیکھنا

اشعارِ دلنواز کا ہم پر اثر سہی
مشکل مگر ہے عظمتِ فن کار دیکھنا

جی چاہتا ہے حُسن کی ہر شے سمیٹ لے
بیتابیِ مزاجِ خریدار دیکھنا

بجلی یہ کہہ رہی ہے کہ آنے تو دو بہار
ہر شاخ و ہر شجر کو شرر بار دیکھنا

شک ہے اگر عنایتِ پروردگار میں
رحمت کو اس کی بن کے خطا کار دیکھنا

حُسنِ مجاز حُسنِ حقیقت کا عکس ہے
اہلِ نظر نزاکتِ اسرار دیکھنا

ان خشک پتّیوں پہ ہے کیوں باغباں کو ناز
سایہ نہ دے سکیں گے یہ اشجار دیکھنا

کعبہ میں تُو ملے کہ ہمیں دیر میں جلیل
اے حُسن ہم ہیں تیرے پرستار دیکھنا

غزلیں

کرشن بہاری نُور

لفظوں کے یہ نگینے تو نکلے کمال کے
غزلوں نے خود پہن لیے زیور خیال کے

ایسا نہ ہو گناہ کی دَلدل میں جا پھنسوں
اے میری آرزو مجھے لے چل سنبھال کے

کھوٹے میں اور کھرے میں زیادہ نہیں ہے فرق
سَودا جو کرنا، کرنا بہت دیکھ بھال کے

موسم ہیں دو ہی عشق کے صُورت کوئی بھی ہو
ہیں اس کے پاس آئینے ہجر و وصال کے

اب کیا ہے "اَرتھ ہین" سی پُستک ہے زندگی
وہ لے گیا حیات سے کچھ دن نکال کے

یوں زندگی سے کٹتا رہا، جُڑتا بھی رہا
بچّہ کھلائے جیسے کوئی ماں اُچھال کے

یہ تاج، یہ اجنتا الورا کے شاہکار
افسانے کہہ رہے ہیں عُروج و زوال کے

تسنیم فاروقی

ان کی آنکھوں کے نام ہوتی ہے
جب جزیروں میں شام ہوتی ہے

آپ آخر یہ کیوں نہیں پیتے
اس میں کیا شئے حرام ہوتی ہے

دل سمجھتا ہو فاصلوں کی زباں
وہ نظر بھی سلام ہوتی ہے

ظلم کو اپنے اتنا پیار نہ دے
آہ بھی انتقام ہوتی ہے

تشنگی کی دُعائیں کرتے رہو
پیاس ہی بڑھ کے جام ہوتی ہے

لَو بڑھا دیجیے ساعت کی
خامشی بھی کلام ہوتی ہے

نشّہ بنتی ہے جب وہ مست نظر
آئینے کی غُلام ہوتی ہے

شاعری ویسی کیجیے تسنیم
جو برائے عوام ہوتی ہے

مسعود انور علوی کاکوروی
مکیہ شریف کاظمیہ۔ کاکوری

مرزا سکندر بیگ قدر کاکوروی حیات و شاعری

لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر واقع مشہور تاریخی قصبہ کاکوری کے مردم خیز خطے نے بہ کثرت علماء، فضلاء، ادبا، اور شعراء پیدا کیے۔ یہ مردم خیز خطہ رشک شیراز رہا ہے۔ یہاں کی خاک دلنشین سے ایسے ذرات رشک ماہتاب و آفتاب بنے جن کی ضوفشانی سے ایک عالم کو نور و معرفت سے بھر دیا اور جن کا انتساب اور روحانی تعلق خانقاہ کاظمیہ قلندریہ سے ہوا ان کو جمال ہم نشیں نے مشک دا ذفر کی دلآویز خوشبو بھی عطا کردی اور اقصائے عالم میں ان کی شہرت کے ڈنکے بج گئے۔ علامہ محسن کاکوروی، نورالحسن نیر، نادر کاکوروی، شرر کاکوروی، ذوق کاکوروی، نطق کاکوروی، ناظر کاکوروی، قیصری کاکوروی، خسرو کاکوروی، قیس کاکوروی اور ان جیسے بے شمار سخن وروں نے بیرون صوبہ اودھ بھی اپنی شاعری کا سکہ جمایا ہے۔

حالاتِ زندگی

مصور فطرت مرزا سکندر بیگ قدر کاکوروی (۴ ۱۹۰ء۔ دسمبر ۱۹۸۵ء) مرزا صفدر بیگ تورانی کے بیٹے تھے۔ ان کے جد اعلیٰ مرزا حیدر بیگ تورانی ترکی النسل تھے۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ہند کے دورِ حکومت میں مع اہل و عیال اپنے ایک فوجی قبیلہ کے ہمراہ توران سے ہندستان آئے تھے۔ بعد ازاں ان کے اخلاف میں سے ایک سالار مرزا وزیر بیگ صفدر جنگ نے مستقل طور پر کاکوری میں سکونت اختیار کرلی۔ وہ بڑے جری اور بہادر تھے شجاع الدولہ کی فوج میں ملازم تھے۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف لڑکر شہید ہوئے۔ قدر صاحب کے دادا مرزا باقر بیگ بڑے صائب الرائے باعزت اور با اثر انسان اور حکومت اودھ کے سرکاری وکیل اور مشیر کار تھے۔

قدر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر مولوی نیاز حسین خاں آفریدی سے پائی۔ فارسی تعلیم کاکوری کے عام دستور کے مطابق خانقاہ کاظمیہ پر حضرت مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر کے روبرو حاصل کی۔ بعد ازاں اپنے بھائی حکیم مرزا عبدالشکور بیگ صاحب مرحوم، جو بڑے حاذق طبیب تھے، کے ہمراہ ناگ پور میں رہ کر انگریزی تعلیم سنٹ فرانسس رومن کیتھولک اسکول میں حاصل کی۔ ناگ پور ہی میں انھیں مسٹر ایڈورڈ مرسی سے استفادہ کا موقع ملا جس سے قدر صاحب کی مصوری اور فطری فن کارانہ صلاحیتوں کے وہ جوہر کھلے جنھوں نے انھیں مصور فطرت بنا دیا۔ اپنی فن کاری اور تخیل کی گل کاری سے جس مقابلے میں شریک ہوئے خراج تحسین حاصل کیا۔

قدر صاحب اپنی آزادہ روی کی بنا پر شروع سے انقلابی طبیعت کے مالک تھے۔ ۱۹۲۲ء میں کانگریس کے سرگرم کارکن بنے۔ واردھا میں گاندھی جی کا آشرم بھی آباد کیا۔ ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ آکر آرٹ اسکول سے وابستہ ہوگئے۔ یہیں ان کی ملاقات اشفاق اللہ خاں اور رام پرشاد بسمل سے ہوئی جو رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ ۱۹۲۵ء میں کاکوری ڈکیتی کیس میں قدر صاحب کا نام بھی آیا۔ ناگ پور جاکر روپوش ہوگئے، ایک عرصہ تک وہیں رہے۔ کچھ دن سرکاری ملازمت بھی کی۔ مگر آزاد منشی اور افتاد طبع بھلا کب اس کو گوارا کرتی۔ ۱۹۳۰ء میں کاکوری آگئے اور پھر مدت العمر یہیں رہے۔ تمام عمر کانگریس

کے سچے و مخلص کارکن رہے۔

قدر صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے جس کام کو ہاتھ میں لیا اسے حتی الوسع اوجِ کمال کو پہنچادیا۔ ہاکی اور کرکیٹ کا ذوق ہوا تو اپنے زمانے کے مشہور کھلاڑی بنے۔ اونچی کود اور لمبی دوڑ کا شوق پیدا ہوا تو چار سو چالیس یارڈ کی دوڑ اور اونچی کود میں سب کو پیچھے چھوڑ کر انعامات و تمغے حاصل کیے۔ سائیکل چلانے کی دھن سوار ہوئی تو بہتر گھنٹے مسلسل سائیکل چلاکر خراجِ تحسین حاصل کیا۔ مصوری کا سودا سر میں سمایا تو مناظرِ فطرت کے وہ حسین و جمیل مرقعے پیش کیے کہ نہ پوچھیے۔ مے نوشی پر آئے تو یہ عالم ہوگیا کہ حضرت خسروؔ کاکوروی کی زبان میں ساقی سے کہہ اُٹھے ؎

سارا میخانہ اُڑا جاؤں بلا نوش ہوں میں
تجھ سے سب چھین کے کردوں تجھے خالی ساقی

قدؔر صاحب نے شاعری کے جس میدان صنف میں خنگِ فکر دوڑایا اسے پوری طرح سر ہی کرڈالا۔ وہ مولوی نورالحسن صاحب نیرؔ مولف نوراللغات بن حسان الہند علامہ محسن کاکوروی کے شاگردِ رشید تھے۔ انھوں نے اس دور میں آنکھ کھولی جب کاکوری کا ہر گھر شعر و ادب کا مرکز تھا۔ ادبا و شعراء کی صحبت سے نوجوان شعراء کی ہمّت افزائی ہوتی اور جن میں ذرا بھی مذاقِ شاعری اور ملکۂ شاعری قدرت سے ودیعت ہوتا ان کے جوہر نکھرتے۔ خصوصاً گرمیوں کی تعطیل میں تو یہ قصبہ علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ بن جاتا تھا۔ آئے دن مشاعرے ہوتے، بیت بازی کی محفلیں جمتیں اور فضا نغموں سے معمور ہوجاتی۔ یہاں کے خمیر میں شعریت، یہاں کی مٹی میں لطافت، یہاں مزاجوں میں نزاکت، یہاں قلوب میں محبت خالقِ کائنات نے کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ یہ سب چیزیں اچھی شاعری کے وہ عناصر ہیں جن سے زلفِ سخن سنورتی اور شاعری کا رنگ و آہنگ نکھرتا ہے۔ قدؔر صاحب نہ صرف اچھے شاعر تھے بلکہ اچھے مصوّر بھی تھے ؎

میں شاعر ہوں اردو کا سب پر عیاں ہے
مصور ہوں گھر میرا ہندوستاں ہے
مجھے کیا خبر قدؔر کہتی ہے دُنیا
سکندر ہے فن کار اہلِ زباں ہے

کلام میں محاکات کا عنصر غالب ہے۔ وہ موئے قلم سے جذبات کی وہ دل کش مصوری کرتے کہ دل عش عش کر اُٹھتا۔ ان کے کلام میں اندازِ سرمستی، نشہ پرور کیف و کیفیت خود فراموشی اور ربودگی اشعار کے قالب میں ڈھل کر سامع نواز ہوتی ہے۔ برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ جذبات کی مُرقع کشی کرتے ہیں۔ قلب کو ایک سوز اور گداز عطا ہوا تھا، ایسا سوز و ساز اور تب و تاب جو صرف ان ہی کا حصّہ تھا، اشیائے حیات اور ساز و برگ راحت سے محرومی بھی قلب کو شمع کا گداز، پروانہ کا سوز عطا کرتی ہے یہ نعمت ہر دل کو عطا نہیں ہوتی۔ قسامِ ازل کچھ ہی دل اس آزمائش اور ابتلار کے لیے انتخاب کرتا ہے۔

ان کی پوری زندگی سرمستی میں بسر ہوئی۔ دن کو کسی نو بہارِ ناز کے ہاتھوں اس طرح لُٹے کہ رات کو بے خبر سوتے رہے، شاعری کرتے رہے، مصوری کرتے رہے۔ خم کے خم لنڈھاتے رہے، اپنی قدح نوشی کا مظاہرہ کرتے رہے اور عالمِ سرمستی میں پکار پکار کر غالبؔ کی زبان سے کہتے رہے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد، کے بعد بھی کوئی مقابلہ پر نہ ٹھہر پایا اور کاکوری، ملیح آباد اور قرب و جوار کا بڑے سے بڑا قدح خوار اور رندِ بلانوش ان کی مے نوشی کے آگے سپر انداز رہا۔ یہ شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ کلمۂ حق تھا کہ ؎

قدؔر کعبہ میں مے پرستوں کا
کون میرے سوا امام ہوگا

انھوں نے ایک لمبی مدت تک مے خانے کو آباد رکھا۔ شراب، جامِ شراب، خم و ساغر، مستی و سرمستی سے متعلق ان کے دیوان میں بکثرت اشعار موجود ہیں ؎

پردے اُٹھ جاتے ہیں مٹ جاتا ہے دنیا کا حجاب
پھول کھل جاتے ہیں بجتا ہے محبت کا رباب
آسمانوں سے اترتے ہیں فرشتے سُن لے
قدؔر جب پڑھتا ہے تسبیحِ خدا پی کے شراب
خون تو خون ہے رگ رگ میں سماہے مہمان شراب
مے پرستی مرا مذہب ہے مری جان شراب

سمجھو اے قدر زاہد تم بھی عقیدہ اپنا
ہے کہ کعبہ مرا ہے مرا ایمان شراب

خلد جاؤں گا کہ دوزخ ہے جہاں جاؤں گا
مجھ کو معلوم نہیں ہے کہ کہاں جاؤں گا
لیکن مستی کی قسم حشر میں آئے گی بہار
قدر میں جھومتا جب پی کے وہاں جاؤں گا

ساقی کے پاؤں چوم کے لہرا کے پی گیا
میں مستان کعبہ میں اٹھلا کے پی گیا
وہ جن کا نام کلمہ میں ہے ان کے نام پر
قربان ہو کے دنیا کو ٹھکرا کے پی گیا

بھر کر نئی شراب کو جام شراب میں!
دیکھیں گے ان کے حسن کو ہم آفتاب میں
اے قدر اس کو سمجھو نہ پروازِ خیال
اب میکدہ بنائیں گے ہم آفتاب میں

بزمِ ساقی میں نہیں ہوش کہ کیا کیا ٹوٹا
جام ٹوٹا کبھی ساغر کبھی مینا ٹوٹا
قدر کا دل کبھی ٹوٹا کبھی توبہ ٹوٹی
ٹوٹی نیت کبھی شیشہ کبھی روزہ ٹوٹا

پھر ایک دور آیا، تائیدِ غیبی ہوئی، ہوش نے بے ہوشی کی جگہ چھین لی۔ خانقاہ کاظمیہ کے صدر نشین حضرت مولانا شاہ مصطفےٰ حیدر قلندر مدظلہٗ کے جلووں کی تجلی سے دل کی دنیا کے بند دریچے کھل گئے۔ دنیاوی لذتوں اور وقتی کیف و مستی سے دل سیر ہوگیا تو مجذوب کی آواز میں نالہ زن ہوتے ہوئے صنم کدۂ حیدری میں در آئے شرفِ بیعت سے سرفراز ہوئے۔ مرشدِ کامل نے اپنی توجہ باطنی سے دل کی دنیا ایسی بدل ڈالی کہ دخترِ رز کو طلاق بائن دے دی اور پھر تمام عمر کبھی اس کو

منہ نہ کیا۔

راہ میں اس کی بیعت پوچھو کہ کیا کیا چھوڑا
ظلمتِ کفر کی پرچھائیں کا نہ پیچھا چھوڑا
قدر جب رُخ کیا کعبہ کا تو رندوں کے لیے
میکدہ چھوڑ دیا ساغر و مینا چھوڑا

نشۂ محبت سے ایسا سرشار ہوئے کہ تمام عمر —
جب سے آنکھوں میں سمائی ہیں وہ کافر نظریں
رات دن اپنی نظر سے ہے تو ہستم مجھ کو

۱۹۶۵ء میں حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین سے سرفراز ہوئے تو یہ شعر ان کے حسب حال ہوگیا —

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ
انداز سرنیاز بہ دارالسلام رفت

یہاں قدر صاحب کی شاعری پر ایک اجمالی تبصرہ مقصود ہے۔ ان کے کلام میں نعتیہ اشعار منقبت، اپنے پیر و مرشد اور استاد کی شان میں رباعیات و قطعات بھی موجود ہیں۔

دل قدر ان کی یاد سے بہلا رہا ہوں
صحنِ چمن میں پھولوں کو ٹھکرا رہا ہوں
سرکارِ دو جہاں کی غلامی مرا نصیب
اتنی سی بات ہے جو اترا رہا ہوں

آج رحمت نے اس کی کام کیا
بڑھ کے ساقی نے پیش جام کیا
قدر صدقہ میں شاہِ بطحا کے
میرا رضواں نے احترام کیا

چمکا ہوا آج کل نصیب ہے اپنا
ہمدرد ہر اک رقیب ہے اپنا
کیوں کر نہ ہو عرش پہ دماغ اے قدر
اللہ کا محبوب حبیب ہے اپنا

وہ اہلِ بیت اطہار اور شہدائے کربلا کی محبت کو جزوِ ایمان نہیں بلکہ کلِ ایمان سمجھتے تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

روشن ہے دو جہان میں عظمت حسینؑ کی
دنیا میں مستند ہے امامت حسینؑ کی
اے قدر حق تو یہ ہے کہ ایمان کی قسم
بنیادِ دینِ حق ہے شہادت حسینؑ کی

نقشِ قدم ہے سینہ پہ خیر الانام کا
سایہ ہے سر پہ سیدِ عالی مقام کا
اے قدر بے خطر ہوں میں ایمان کی قسم
بندہ ہوں میں حسین علیہ السّلام کا

ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں : ؎

حسینؑ تم کو مشیت سلام کہتی ہے
دبی زبان میں قدرت سلام کہتی ہے
تمہاری تشنہ لبی پر عرق عرق ہو کر
فرات تم کو بہ حسرت سلام کہتی ہے
قبول کیجیے للہ سید الشہداءؑ
غریب قدر کی الفت سلام کہتی ہے

قدر صاحب اپنے پیر و مرشد کی محبت میں سرشار و سرمست نظر آتے ہیں اپنی غلامی پر بجا طور پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

شاہ در شاہ کا امیر دیا   درِ حیدر بھی بے نظیر دیا
کیوں نہ کاظمؑ کا سنگِ در چوموں
اس نے ایسا ہی مجھ کو پیر دیا

شبیر حضرت اکبر ہیں مصطفےٰ حیدر
امیرِ خلد کے دلبر ہیں مصطفےٰ حیدر
حبیبِ نور ہیں سے قدر آ زیارت کر
حبیبِ حیدرِ انور ہیں مصطفےٰ حیدر

گلِ گلزار کا طلسم ہو بہارِ جاوداں تم ہو
نسیم باغِ حیدر ہو شمیمِ گلستاں تم ہو
حبیبِ کبریا ہو دلربا جانِ جہاں تم ہو
سراپا نور کے پیکر ہو نورِ جاوداں تم ہو
ہمیں ہے فخر ہم پر ساقیِ کوثر کا سایہ ہے
ہمارا ناز ہے تم پر کہ ہم پر مہرباں تم ہو
مرے جی سے ذرا پوچھو تم اپنی شانِ محبوبی
امیرِ خلد کے دلبر ہو میرِ کارواں تم ہو
اٹھا پردہ تو دیکھا قدر کی چشمِ عقیدت نے
سراجِ بزمِ انور ہو امامِ عارفاں تم ہو

بڑے والہانہ انداز میں اپنے مرشدِ کامل کے سراپا کی تصویر کشی کی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عجب حسن ہے اس کا عالم ہے قرباں
ستم گر ہے وہ دشمنِ جان و ایماں
نظر ہے جو فتنہ تو ناوک ہیں مژگاں
بھویں اس کی ہیں جیسے شمشیرِ عریاں
حسین اس کی رنگین مخمور دل کش
وہ آنکھیں ہیں یا جامِ صہبائے ایراں
وہ مستی بھری اس کی محشر خرامی
کہ جیسے چمن میں ہو طاؤس رقصاں
حقیقت تو یہ ہے بجا نے کہ کیا ہے
وہ چشمہ ہے رحمت کا یا نورِ یزداں

قسم لے لو مری آنکھوں سے شکلِ مصطفےٰ تم ہو
حبیبِ حیدرِ انور ہو نورِ مرتضےٰ تم ہو
یہ مانا رند مشرب قدر کیا جانے طریقت کو
مگر راہِ طریقت کے حقیقت میں خدا تم ہو

قدر مرحوم حضرت نیر کاکوروی صاحب نور اللغات کی شاگردی پر فخر کرتے ہوئے یوں رطب اللسان ہیں ؎

رشکِ سپہرادہوں ہم مرتبہ ثانی ہوں

قدرؔ پھر چمکوں نہ کیوں مہرِ درخشاں بن کر

نیّرِؔ دہر کا اک خادمِ نورانی ہوں

فاضل اُستاد کی جُدائی پر یوں نوحہ کناں ہیں ؎

رستم وہ ابنِ زال سپہ گر کہاں گیا

دارا کہاں گیا وہ سکندر کہاں گیا

میدانِ رزم صاف ہے بزمِ سخن خموش

نیّرؔ کا ایسا قدرِ سخنور کہاں گیا

واعظ و مولوی اور زاہد و محتسب، شیخ و برہمن سے شاعرانہ چشمک ان کے کلام میں جابجا ملتی ہے ؎

پرکیف ہے بہار تو دل کش ہے صبح و شام

اے شیخ لا پلا مجھے تو سر پہ رکھ کے جام

اُٹھ باادب صراحی اُٹھا جُھک سلام کر

پہچان لے امام ہوں رندوں کا میں امام

مے کدے میں رات کو آنے کے بعد

شغل مے رندوں میں فرمانے کے بعد

چل دیے ساقی سے کرکے چھیڑ چھاڑ

شیخ جی پگڑی اُچھلوانے کے بعد

خود کو گم کردہ راہ کر ڈالا دین اپنا تباہ کر ڈالا

شیخ پی لے تو کوئی بات نہیں ہم جو پی لیں گناہ کر ڈالا

ایک مُلّا پی رہا تھا کل شراب

میں نے پوچھا کیا ہے یہ عالی جناب

ہنس کے فرمایا کہ عقبیٰ کے لیے

دھو رہا ہوں دامنِ شرک و عذاب

حضرت مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر کاکوروی سے فارسی میں شرفِ تلمذ مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے البتہ فارسی اشعار کے اکثر مضامین کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ انوری کہتا ہے ؎

هر بلائے کز آسماں آید گرچہ بردیگرے قضا باشد

بر زمیں نارسیدہ می پرسد خانۂ انوری کجا باشد

قدرؔ صاحب اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

آسماں سے بلا بھی آئی اگر دوسروں کے لیے قضا بن کر

آتے آتے وہ پوچھتی ہے یہی قدرؔ ہے کون اس کا گھر ہے کدھر

قدرؔ صاحب کی غزلوں میں بھرپور تغزل اور غزل کا رنگ و آہنگ جلوہ گر ہے، چند اشعار درج ہیں ؎

شکوہ آدابِ وفا نے مجھے کرنے نہ دیا

مرنا چاہا بھی تو ارمانوں نے مرنے نہ دیا

آئینے میں وہ سنورتے رہے لیکن ان کو

جلوۂ حسن کی شوخی نے سنورنے نہ دیا

زخم کھاکر دل جو تڑپا اس کے پائے ناز پر

رقصِ بسمل دیکھ کے اس کو پیار آہی گیا

اپنی توبہ کی قسم میری قسم کو توڑنے

آج وہ ساغر بہ کف جانِ بہار آہی گیا

رات کسی کی یاد میں آنسو اختر بن کر ٹوٹ گیا

جیسے دن میں قطرۂ شبنم گوہر بن کر ٹوٹ گیا

ان کا آنا آکر ہنسنا میرا رونا ان کا جانا

ایک طلسمِ رنگیں تھا جو پل بھر بن کر ٹوٹ گیا

قدرؔ صاحب نے غزلوں کے علاوہ تقریباً چار سو رباعیات و قطعات کا سرمایہ بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی غزلیں و نظمیں اکثر کاکوری اخبار، قومی آواز اور دیگر اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔

انھوں نے انقلاب زمانہ، سیاسی حالات اور ملکی سیاست سے متاثر

ہوا کی نظمیں بھی ہیں۔ بہت اچھے کلاسیکی اور کامیاب غزل گو تھے۔ عنوانِ مسلم، محبت، صبح کوثر، دولت، فاقہ کش غریب، زمانہ، اُردو زبان، مجاہدِ ہندوستان، آرزو، جوانوں سے خطاب، کہکشاں، میرا خواب، شہیدانِ کاکوری، میں چاند (میں کاتی پروگرام) ناگن، اور لس بندی جیسی ان کی متعدد نظمیں ان کے قدرتِ کلام، سلاستِ زبان اور برجستگی و شستگی کا نمونہ ہیں۔ واقعات نگاری بڑی سبک دستی اور لطیف پیرائے میں ایسے کرتے ہیں کہ قاری و سامع کے پردۂ تخیل پر وہ پورا واقعہ مرتسم ہو جاتا ہے۔

ان کے بکثرت اشعار اور غزلیں ضائع بھی ہو گئیں۔ عالمِ بدمستی میں اکثر کہے ہوئے اشعار عالمِ ہوش و خرد میں یاد نہیں رہے جو اگر محفوظ کرلیے جاتے تو ان کا شاہکار ہوتے، کیونکہ وہ ہر قسم کے آورد و تکلف سے پاک ہوتے تھے۔ نمونۃً صرف دو اشعار جو عم محترم غلام مرتضیٰ صاحب غالدی کیف کاکوروی کو یاد رہ گئے، وہ درج ذیل ہیں ؎

جل گیا پروانہ سوزِ عشق کا بسمل ہو گیا
دل کا شعلہ بھی شریکِ شمعِ محفل ہو گیا

پھول ہنستے ہیں گلستاں میں گریباں دیکھ کر
راہ چلنا تیرے دیوانے کا مشکل ہو گیا

بنو اُمیّہ کے دورِ حکومت میں جب ہشام بن عبدالملک تختِ حکومت پر متمکن تھا، دورانِ حج مجمع کی کثرت کی وجہ سے طوافِ کعبہ میں دقت ہو رہی تھی۔ اچانک اس نے حضرت امام زین العابدینؑ کو دیکھا کہ وہ تشریف لائے تو مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ انھوں نے اطمینان سے طواف کیا، اور واپس ہوئے۔ ہشام بن عبدالملک کو ان کی یہ مقبولیت اور عوام کے دلوں میں عزت و وقعت ایک آنکھ نہ بھائی اور حقارت آمیز تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا:

"یہ کون ہیں؟"

اس کے عہد کے مشہور شاعر ابو فراس ہمام بن غالب تمیمی بصری المعروف بہ فرزدق (سنہ ۔۔۔ھ / ۔۔۔ء) کو اس کا یہ انداز بہت بُرا لگا اور اس نے جرأت مندی سے بادشاہ کو مخاطب کرکے ایک طویل قصیدہ برجستہ کہا:

"تعجب ہے تم انھیں نہیں جانتے ہو، یہ تو وہ شخص ہیں کہ بطحا کی سرزمین ان کے پیروں کی چاپ پہچانتی ہے۔ خانۂ کعبہ، حرم اور غیر حرم سب ہی مقامات ان کو جانتے ہیں۔ یہ خدا کے تمام بندوں میں سب سے بہتر بندے کے فرزند ہیں۔ یہ بڑے خدا ترس، صاف دل، پاکباز اور بلند مرتبہ شخص ہیں۔ تمھارا "یہ کون ہے" کا سوال ان کی قدر و منزلت کم نہیں کرسکتا۔ جسے تم نہ پہچان سکے تمام عرب و عجم اسے پہچانتے ہیں۔ قریشی لوگ انھیں دیکھ کر کہتے ہیں کہ تمام کرم و شرف ان کے بلند اخلاق پر پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔"

قدرؔ صاحب نے اس پورے واقعہ اور فرزدق کے قصیدہ کو ایک سو انہتر (۱۶۹) اشعار میں اس طرح سلاست و روانی اور برجستگی سے سمو دیا ہے کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

غزل

پیام اعظمی
(نیاری، اعظم گڑھ)

دل سے دل بھی مل جائیں گے ہاتھ میں دیکر ہاتھ چلو
جہاں تلک ہے ایک ہی رستہ وہاں تلک تو ساتھ چلو

دیتی ہے آواز سہارا تاریکی کے صحرا میں
سناٹے ڈس لیتے ہیں اکثر کرتے ہوئے کچھ بات چلو

دار و رسن کی وادی ہے یہ راہ گزرنے والی ہے
سچ کہنے کی ہمت ہے تو کفن بھی لے کر ساتھ چلو

ڈوبنے والے ڈوب گئے، اب رونا ہے بیکار پیام
سوکھ گیا سیلاب کا پانی ختم ہوئی برسات چلو

ادب

مولانا [illegible] صدیقی
[illegible] کانپور

جوانیوں کے دہکتے چمن کا موسم ہے
بُتانِ لالہ رُخ و گلبدن کا موسم ہے

تمام سنج ہیں انگڑائیوں کے آئینے
سمن بران صبا پیرہن کا موسم ہے

نصیبِ شاخِ صنوبر ہے جشن کاہکشاں
غزل کا ساز لیے بانکپن کا موسم ہے

اچھل رہا ہے فضا میں لہو گلابوں کا
شکستِ شیشۂ لعلِ یمن کا موسم ہے

جلاؤ شمع کہ روشن ہوں عزم کی راہیں
سجاؤ بزم کہ اظہارِ فن کا موسم ہے

اُٹھاؤ سر کہ ہے اب جرم سرنگوں رہنا
جُنوں کی فصل ہے دار و رسن کا موسم ہے

کہو تو بات کوئی طیش ماورائے سخن!
کہ آزمائشِ تابِ سخن کا موسم ہے

حامد مینائی
تار بین گلی، شاہجہانپور

جب کبھی گر کے ہم سنبھلتے ہیں
پھر نئے راستے نکلتے ہیں

اشکِ غم آنکھ میں مچلتے ہیں:
یہ دیے آندھیوں میں جلتے ہیں

بھول جاؤں انھیں میں ناممکن
وہ تو دریا کا رُخ بدلتے ہیں

گھر کا ملنا محال لگتا ہے
راستے آگ سی اُگلتے ہیں

اس کڑی دھوپ سے بھی گزرا ہوں
سوچتا ہوں تو پاؤں جلتے ہیں

جانے کیا ہوگیا ہے لوگوں کو!
روز کیوں آئینے بدلتے ہیں

وہ مرے نقشِ پا ہیں اے حامد
راہ میں جو چراغ جلتے ہیں

افسانہ

ڈاکٹر سید محمد ظفر امام نظام پوری
ایم۔ ڈی، فلیٹ ۳، ۱۷۴۳ ویسٹ اسٹریٹ
برونکس۔ نیویارک (امریکا)

سفید ہاتھی

جہاز میں مکمل خاموشی تھی، سوائے اس نغمگی کے جو جہاز کی پرواز سے پیدا ہو رہی تھی، اور جب ان چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں یخ بستہ مشروب اس تکلف سے پیش کیا جاتا ہے تو مجھے لکھنؤ یاد آجاتا ہے ور تقریباً دنیا کی تمام انٹرنیشنل فلائٹس اور ہماری ٹرینوں میں جو ایک چیز مشترک ہے اور تھوڑا سا فرق بھی کہ پلاسٹک کے رنگین اور پرکشش بیگ میں چند دانے " نرم اور نازک ہاتھ اتنی نفاست سے پیش کرتے ہیں، جیسے انھیں کھا کر آدم کو ایک بار پھر جنت سے نکلنا پڑے گا۔

میں جنت کی حوروں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا مگر میں نے فضا میں حوریں ضرور دیکھی ہیں۔ ان کا طرزِ تکلم، ان کا اندازِ گفتگو خصوصاً انگریزی کا فرانسیسی تلفظ کان کے پردوں پر ایک مترنم ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ اور میں نے صرف گفتگو کرنے کے لیے اس فضائی میزبان کو مخاطب کیا،

"کیا آپ مجھے کوئی میگزین دے سکتی ہیں۔؟"

"یس موسیو!" اس نے ادائے دلربائی سے کہا۔

ساجد اپنی کتابوں میں مشغول تھا اور میں اس خوبصورت اور خوش رنگ میگزین میں دل چسپ تصویریں دیکھ رہا تھا۔

"ایک جنگل میں ایک ہاتھی رہتا تھا....." ساجد نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ تو زمانہ قدیم سے ہوتا آیا ہے تمام داستانیں اسی طرح شروع ہوتی ہیں۔ دنیا کے سارے بچوں کی طرح اسے بھی جنگلوں اور جانوروں سے بیحد دل چسپی تھی۔

" آخر تم کون سی کتاب پڑھ رہے ہو؟ " میں نے دریافت کیا۔

" ہماری سرزمین پر بسنے والے جانور۔ یہ ڈاکٹر منڈیلا کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔"

میری توجہ پھر ان خوش رنگ اور خوبصورت تصویروں کی طرف مبذول ہو چکی تھی مگر اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "کیا آپ سیاہ چیونٹیوں کے بارے میں جانتے ہیں۔؟"

"نہیں! اور اس وقت مجھے جاننے کی خواہش بھی نہیں۔"

" آپ نے سمجھا نہیں۔ یہ چیونٹیاں انسانوں سے کتنا قریب ہیں، ان کی بھی بڑی بڑی نوآبادیاں ہیں، تنظیمیں ہیں، اور لاکھوں چیونٹیوں پر ایک غار میں بیٹھی ہوئی ملکہ حکمرانی کرتی ہے۔ ان کے الگ الگ فرائض ہوتے ہیں، غذا کی پیداوار، تلاش اور حصول، بچوں کی پرورش، بار برداری، چوریاں کرنا، حفاظت کرنا، قیدی بنانا اور جنگیں لڑنا ـــــ اور یہ سب ایک دوسرے سے کیمیائی لہروں کے ذریعے مربوط رہتی ہیں۔ اور ان میں سب سے زیادہ دل چسپ ہیں گوشت خور، جنگجو سیاہ چیونٹیاں (Army Ant) جن کی نیش زنی سے بڑے بڑے جانور بھی مفلوج ہو جاتے ہیں۔"

میں نے تصویروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں تم پڑھتے رہو۔"

" ابھی تو میں نے آپ کو ایک دل چسپ بات بتائی ہی نہیں۔"

اور میں نے آگے پیچھے دیکھا، تقریباً تمام سیٹیں خالی تھیں اور باقی [illegible] کے آرام میں مخل نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی گفتگو جاری [illegible] رکھتے ہوئے کہا

" ان [illegible] وں میں ایک بار بہت عرصہ تک بارش نہیں ہوئی اور تمام [illegible] ور بھوک پیاس سے مرنے لگے، علاقے کا علاقہ بے آب وگیاہ بن کر رہ گیا تھا، جہاں ہزاروں چھوٹے بڑے جانور اور ان کی لاشیں، ان کے ڈھانچے دیکھے جاسکتے تھے۔ سارا دن سورج چمکتا رہتا تھا، تمام ذی رُوح مخلوق غذا اور پانی کی تلاش میں سرگرداں تھی اور وہ سب ایک مرکز پر جمع ہو رہے تھے، جہاں ایک مختصر سے حصے میں پانی تھا اور سب ہی بقائے حیات کے لیے جدوجہد کر رہے تھے مگر ایک ہاتھی اس پانی پر قابض تھا اور کوئی بھی جانور اس کے قریب نہیں جا پاتا تھا۔ کبھی تو ان کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا، کبھی انمانہ وانعال سے انھیں بھگاتا اور کبھی ان پر حملہ آور ہو کر انھیں پامال کرتا اور کچل کر رکھ دیتا۔

اور تب ہی ایسا لگا، زمین کا ایک حصہ سیاہ ہو گیا ہے اور ڈھیرے ڈھیرے بے پناہ پیاسی سیاہ چیونٹیوں کا جلوس بڑھتا ہی رہا، اور یہ چیونٹیاں اس کے پیروں اور جسم پر چھاگئیں، ہزاروں لاکھوں اس کے پیروں تلے روندی گئیں، ایک بار اس کے جسم میں جنبش ہوئی اور ہزاروں چیونٹیاں زمین پر آرہیں۔ مگر یہ قافلہ آگے بڑھتا ہی رہا۔ تب ایسا لگا کہ اس کے جسم میں ارتعاش پیدا ہو رہا ہے اور اس کے پیر اس کے جسم کو سنبھال نہ سکیں گے۔ ان سیاہ چیونٹیوں کی نیش زنی نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔

پھر ایک دھماکہ ہوا اور وہ زمین پر آرہا" !

" پھر کیا ہوا۔ ؟" میں نے دریافت کیا۔

اچانک جہاز کی تمام روشنیاں جل اُٹھیں۔ خاموش فضا میں جہاز کے کیپٹن کی آواز گونج اٹھی ______

" آپ کا کیپٹن آپ سے مخاطب ہے"...

جہاز میں ارتعاش پیدا ہوا۔ جن لوگوں نے فضائی سفر کیا ہے ان کو اندازہ ہوگا کہ اچانک اور اس طرح کیپٹن کا مخاطب کرنا کسی خطرہ کا سگنل ہی ہوتا ہے چنانچہ تمام مسافر بے حد فکرمند ہو گئے۔

ان حالات میں انسان موت کو قریب محسوس کرنے لگتا ہے، اگر نیچے سمندر ہو تو تیرنے والے بلٹ پر نگاہیں جاتی ہیں اور فضاؤں میں معلق انسان شاید خود کو اپنے خالق سے قریب محسوس کرنے لگتا ہے اور الوداع کہنے والے عزیز واقارب، دوست احباب کے چہرے ایک کے بعد ایک کرکے ابھرنے لگتے ہیں۔ اپنے گناہ، اپنی زیادتیاں، دل شکنیاں، انا، ضد اور اس کی زد میں آنے والے سب یاد آنے لگتے ہیں، کتنا عجیب لگتا ہے یہ سب ____ فضا میں معلق یہ قلعہ، اس کی ساری آرائشیں اور اس کے تمام خوش و خرم حیات تو سے پُر چہرے، تصور میں دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کی خوشیاں لیے۔

متحرک جہاز اور اس فضائی ناخدا کی آواز۔ ہم خود کو زمین اور آسمان کے درمیان ہی نہیں بلکہ زندگی اور موت کے درمیان معلق محسوس کرنے لگتے ہیں۔ چند منٹ اور چند سکنڈ میں کیا ہونے والا ہے ؟ کیا چند لمحوں کے بعد خاموشی ____ وجود سے عدم __ اور پھر مکمل خاموشی ____ صفحۂ ہستی پر کوئی نقش نہیں، فضا میں ذرہ کی طرح بکھر کر ____ کتنا روح فرسا تھا یہ تصور۔ !!

کیپٹن نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا ____ " ہم کیپ ٹاؤن کے ہوائی اڈے پر نہیں اتر سکتے، ملک میں بہت بڑا انقلاب آگیا ہے۔ سیاہ فاموں نے جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ان ہنگامی حالات کی وجہ سے ملک کے تمام ہوائی اڈے بند کر دیئے گئے ہیں اور کسی بھی جہاز کو اترنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے ہمارا جہاز واپس جا رہا ہے اور ہماری پہلی منزل ہوگی نیروبی سکر" ____ !

میں حیرت زدہ سب کچھ سنتا رہا۔ ایک خواب کی طرح خوف و ہراس کے سارے بادل چھٹ چکے تھے۔ کشمکش حیات میں زندگی کا تصور ہی حیات افزا تھا۔

اور تب میں سوچ رہا تھا، سیاہ فاموں کی ملکہ قید تنہائی سے باہر آچکی ہے اور ایک بار پھر سیاہ چیونٹیوں نے 'سفید' ہاتھی پر فتح پالی ہے۔ میں نے جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سفید سفید بادلوں کے درمیان خاموش فضا میں زندگی کی علامت بنا ہمارا جہاز گذر رہا تھا۔ !

نثار اعظمی

مناجات

بے قبول ہے جو ذوقِ کم نگاہی دے
دوستوں کو مرے ظرفِ بے پناہی دے

عطا فراخ دلی، سیر چشمی پہلے کر
مرے خدا جو کبھی شوقِ کج کلاہی دے

جہاں پہ میں ہوں وہاں سب کو مطمئن کر دے
زمانے بھر کے غموں کو مجھے الٰہی دے

بڑی حسین و پُر اسرار ہے تری دُنیا
دل و نظر بھی مجھے کاش بادشاہی دے

عذابِ جاں ہے جنوں و خرد کی آویزش
پئے ظفر مجھے اندازِ خانقاہی دے

کہ آدمی ہوں خطا کار ہوں پشیماں ہوں!
جو ہو سکے مجھے الزام بے گناہی دے

وہ اس کا ہے مہر و وفا سے کیوں خالی
دلِ بشر میں یہ نشہ ذرا ملا ہی دے

●

غزلیں

ظفر اقبال
۱۰۰ - خیلدار، فتحپور

مرے بدن کو ملا ہے لباس پانی کا
صلہ یہ کیسا ملا مجھ کو جانفشانی کا

جو ایک پل میں بکھر جائے آنسوؤں کی طرح
بھروسہ کون کرے ایسی زندگانی کا

مری زباں نہ تراشو کہ بات میری نہیں
ملا ہے حکم مجھے اس کی ترجمانی کا

لکھی ہے آبِ رواں پر اسی کی حمد و ثنا
مٹا سکو تو مٹا دو یہ نقش پانی کا

میں تم کو دوں گا ظفر اپنے خون کی سُرخی
اُفق تلاش کرو تم نئی کہانی کا

آصف طاہری
۹۹/۲۲۲ - تالہ روڈ - سلطان پور

میری شجاعت میری کہانی بھول گیا
پھر مجھ کو وہ دشمنِ جانی بھول گیا

میں ہی نہیں مفہومِ جوانی بھول گیا
دریا بھی اپنی طغیانی بھول گیا

اس کا بدن جب رنگِ شفق جیسا نکھرا
سُورج بھی اپنی تابانی بھول گیا

میری طرف تو سوچ سمجھ کر ہاتھ بڑھا
کیا میری تلوار کا پانی بھول گیا

آصف جو لفظوں کو معانی دیتا تھا
سُنتے ہیں وہ بھی لفظ و معانی بھول گیا

افسانہ

خواہش

شکیل صمدانی
[illegible] ، ایم ، ایل
مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

اُسے یہ دنیا بالکل پسند نہ تھی ، اور اسی لیے وہ اس سے جلد از جلد نکلنا چاہتی تھی۔ چھوٹا سا گھر ، پُرانے فرنیچر ، بوسیدہ اور پھٹے ہوئے ٹاٹ کے پردے ، اور اس پر طرہ یہ کہ گھر میں رہنے والے نو افراد ، پانچ بہنیں ، دو عدد چھوٹے بھائی اور ساتھ میں ماں باپ۔ وہ جب گھر سے صبح اسکول کے لیے نکلتی تو اسے راستے میں سینما ہال ملتے ، پارک نظر آتے ، کلب دکھائی دیتا۔ وہ انھیں بڑی حسرت سے دیکھتی اور جب اس کی نگاہ چاٹ کی دُکانوں پر پڑتی تو اس کے منھ میں پانی بھر آتا۔ مگر وہ ان کا مزہ نہ لے سکتی تھی۔

اگر وہ کسی لڑکی کو اسکوٹر یا کار پر جاتا ہوا دیکھتی تو اس کا دل سرگوشی کرتا کہ کاش اسے بھی کوئی اسی طرح گھمائے ، وہ بھی سینما دیکھے ، پارکوں میں بھاگتی پھرے اور مزے لے کر چاٹ کھائے۔ وہ آزاد رہنا چاہتی تھی۔ وہ اس پرندے کی مانند جینا چاہتی تھی جو دن بھر آوارہ پھرتا رہتا ہے ، جس دیس میں چاہتا ہے چلا جاتا ہے ، جہاں جی چاہتا ہے بسیرا کر لیتا ہے۔ کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ مگر کوئی تو ایسا نہ تھا جو اس کے دل کی آواز پر لبیک کہتا۔ اسے اپنا گھر ایک پنجرہ لگتا ، جس میں اس کی آرزوئیں دم توڑتی نظر آتیں۔

اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی اور اس کا باپ میونسپل کارپوریشن میں ایک معمولی کلرک تھا۔

اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ اسے ایک نوجوان مل گیا ، اس نے شاید اس کی آنکھوں میں پوشیدہ خواہش پڑھ لی تھی۔ نوجوان نے کہا ،

"تم میرے ساتھ اسکوٹر پر گھومو گی۔ ؟"

وہ بغیر کسی پس و پیش کے نوجوان کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ گئی۔

وہ اسے خوب گھماتا ، نئی نئی فلمیں دکھاتا ، پارکوں میں ٹہلاتا ، چٹ پٹے چاٹ کھلاتا اور ساتھ ہی ساتھ زندگی کے نئے نئے تجربات کرواتا۔

اسے یہ دنیا بہت اچھی لگتی۔

ایک دن اس نوجوان نے کہا ..

"جانم ! میں تم سے دُور نہیں رہ سکتا۔ میں تمھاری دُکھ بھری زندگی مزید نہیں دیکھ سکتا۔ تم اپنی گھٹن بھری دُنیا کو چھوڑ کر میرے پاس آجاؤ میں تمھیں دُنیا کا ہر سکھ دوں گا۔ تم ہمیشہ نئے اور خوبصورت کپڑوں میں ملبوس رہو گی۔ ہر وقت قیمتی خوشبوؤں میں تمھارا پھول سا جسم مہکتا رہے گا..."..

اس کے ذہن نے کہا۔ نہیں۔ اگر تم ایسا کرو گی تو تمھارے ماں باپ بھائی بہن سب چھوٹ جائیں گے ، خاندان والوں کی بہت بدنامی ہوگی۔ تبھی اس کے دل نے آہستہ سے سرگوشی کی — بیوقوف مت بنو۔ اگر یہ موقع نکل گیا تو زندگی بھر پچھتاؤ گی۔ گھر پر وہ آرام ، وہ عیش ، وہ مزے کہاں جو تیرا محبوب دینے کو کہہ رہا ہے۔ اور اس نے ایک بار پھر دل کی بات مان لی۔ کیونکہ اس کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اس نے اپنے محبوب کی خواہش کو اپنی خواہش کے ساتھ جوڑ دینے کا فیصلہ کیا ، اور اسی دن وہ گھر چھوڑ کر اس کے پاس آگئی۔

اس کے محبوب نے اسے دن بھر گھمایا۔ خوب شاپنگ کروائی — طرح طرح کی خوشبوئیں دلائیں ، خوب چاٹ کھلائی ...... وہ کسی شہزادی کی مانند گھومتی رہی۔ شام کو وہ اسے ایک ہوٹل لے گیا۔ اتنا شاندار ہوٹل اس نے زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اسے دُلہن کی طرح سجایا۔ بہت دیر تک وہ اپنے کو آئینے میں دیکھتی رہی۔

اس کے بعد اس کے محبوب نے اسے ایک مشروب پینے کو کہا۔ اس کی

خواہش وہ ٹال سکی اور ایک ہی سانس میں وہ پورا گلاس خالی کر گئی —
پھر دوسرا، پھر تیسرا...... اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں پایا۔ اسے اپنا پورا بدن پھوڑے کی طرح دکھتا ہوا محسوس ہوا، اس کی ٹانگوں میں سخت ترین درد ہو رہا تھا۔ اس نے کراہ کر کروٹ بدلی تو اپنے سامنے ایک بوڑھی عورت کو پایا۔

بوڑھی عورت نے کہا۔

"بیٹی گھبراؤ نہیں۔ تمہارا شہر بہت دُور چھوٹ گیا ہے — تمہارے ماں باپ، بھائی بہن سب یہاں سے اتنی دُور ہیں کہ تم اب ان سے کبھی نہیں مل سکتیں..... تمہارا محبوب تمہیں دس ہزار میں بیچ گیا ہے...... اب تم روزانہ نئے نئے مردوں کے ساتھ گھومو گی۔ نئی نئی جگہوں کی سیر کرو گی۔ اب تم اپنی من پسند چاٹ اور آئس کریم کھانے کے لیے آزاد ہو....... بیٹی! تم بھی تو یہی چاہتی تھیں نا!
لو آج تمہاری خواہش پوری ہو گئی۔!!

**

سِراج مِیر خاں سحرؔ ص ۴۵ کا بقیہ

زاہد پر طنز کا پہلو نکال لیتے ہیں۔

رنج و غم اور یاس و حسرت کے مضامین بھی سحرؔ نے بڑے موثر پیرایہ میں ادا کیے ہیں۔ مثلاً ؎

دو چادریں کفن کی دو گز زمیں لحد کی
مر مر کے ہم نے پایا اے سحرؔ اس جہاں سے

عمر گزری تو مری کنجِ قفس میں گزری
در و دیوار بھی گلشن کے مجھے یاد نہیں

بے بسی، تنہائی، یاس و درد و غم
کچھ ہیں ہمدم تنگ سے کچھ تمام سے

سوکھی زباں نکال کے گرمی میں رہ گیا
پرساں ہوا نہ کوئی بیاباں میں خار کا

بیاضِ سحرؔ کی غزلوں میں بھرپور تغزل، شوخی اور برجستگی موجود ہے شاعر نے اکثر مضمون کے تمام اجزاء کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ رمزیت اور اشاریت سے کام لے کر پھیلے ہوئے مضامین کو دو مصرعوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ زیادہ تر مترنم اور رواں بحریں اختیار کی ہیں جن سے کلام میں موسیقیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان عناصر کے مزاج نے سحرؔ کی غزلوں کو خاصے کی چیز بنا دیا۔ نہ صرف بھوپالی معاصرین میں مقام بنا لینا بلکہ دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ سے خراجِ تحسین وصول کر لینا مشکل مرحلہ تھا لیکن سحرؔ نے اپنی فنکاری سے اس میں کامیابی حاصل کی۔ ان کا کلام بھوپال کی آبرو ہے۔ اور اگر اُردو غزل کی تاریخ میں بھوپال کی نمائندگی کا معاملہ زیرِ غور لایا جائے تو شعرائے متاخرین میں سراج میر خاں سحرؔ سے زیادہ کوئی شاعر نمائندگی کا مستحق نہ قرار پائے گا۔

حواشی: ۱ تذکرہ آثار الشعراء۔ مرتبہ ممتاز علی اعجاز، مطبع شاہجہانی ۱۳۰۴ھ
۲ مطالعہ امیر۔ از ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ۔ حاشیہ ص ۴۵۹
۳ بیاضِ سحرؔ۔ مرتبہ آل نقوی ص ۱۷۵، ۱۷۶

امیر خسرو ص ۱۸ کا بقیہ

۲ برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ۔ مرتبہ اشتیاق حسین قریشی
۳ بنگال کا صدر مقام
۴ تین سو میل
۵ مجھ میں مصری رنگ کہاں کہ عربی میں شعر کہوں
۶ کتابت کے نقص کی بنا پر 'ہندم' طبع ہوا ہے دراصل لفظ 'ہند' ہے
۷ اصل نسخے میں نقص کتابت کے باعث لفظ 'بود' چھوٹ گیا ہے۔
۸ جس نسخے سے استفادہ کیا گیا ہے وہ مطبع سلطانی دہلی کا چھپا ہوا ہے اور محترم دوست ضمیر نیازی نے ازراہِ محبت مجھے استفادہ کے لیے فراہم کیا ہے۔

●

غزلیں

مناظر حسن شاہین
موضع و ڈاک خانہ ہارا، وایا پالکھو، ضلع گیا (بہار)

صلیبِ درد سجاؤ کہ غم کی رات کٹے
مسیحِ وقت کو لاؤ کہ غم کی رات کٹے

اُجالے کرب کے نشتر چبھو رہے ہیں بہت
چراغِ اشک بجھاؤ کہ غم کی رات کٹے

وفا کی راہ میں روشن ہیں آنسوؤں کے چراغ
کہیں سے لوٹ کے آؤ کہ غم کی رات کٹے

شریکِ غم نہ ہوئے تم تو کوئی بات نہیں
ہنسی ہی میری اُڑاؤ کہ غم کی رات کٹے

دیارِ قلب میں زخموں کے پھول کھلے ہیں
غموں کا جشن مناؤ کہ غم کی رات کٹے

ذکی حیدر

الفاظ کا جادو ہوں خموشی کی صدا ہوں
میں سینۂ ہستی کے تلاطم کا پتہ ہوں

اک رقصِ مسلسل ہوں کبھی جو نہ تھما ہے
اس رقصِ مسلسل کی مسلسل میں صدا ہوں

آسودۂ منزل ہوں مگر یہ بھی تو دیکھو !
ہر گام پہ میں خون کے قطروں میں بٹا ہوں

میں وہم تماشہ ہوں، تماشہ نہ سمجھنا
تصویر کے پیکر میں مصوّر کی ادا ہوں

اب حدِ سماعت بھی گراں گوش ہے مجھ کو
آواز کی رفتار سے بھی تیز صدا ہوں

اس منظرِ ہستی پہ عجب نقش ہوں یارو
اتنا ہی میں اُبھرا ہوں ذکی جتنا دبا ہوں

ڈاکٹر پیکر جعفری

کچھ صورتِ گُل نکلے کچھ خوابِ پریشاں سے
سوغات ملی کیا کیا مجھ کو شبِ ہجراں سے

کب رُت یہ بہاروں کی دیوانوں کو راس آئی
جب پھول کھلا کوئی ہم اُلجھے گریباں سے

جب دل ہی ٹھہر جائے جب دم ہی نکل جائے
وہ درد گوارہ ہے اس درد کے درماں سے

جینے کا بھرم کچھ تو رکھنا ہے تمھیں یارو
مر جائیں نہ دب کر ہم اس زیست کے احساں سے

دن رات تعاقب میں جن کے یہ نگاہیں تھیں
کچھ اور قریں نکلے وہ میری رگِ جاں سے

انسان ذرا دیکھو پہنچا ہے کہاں پیکر
اک خوف سا لگتا ہے انسان کو انساں سے

عقیل نعمانی

شجاعت پور۔ میرگنج
بریلی

غزل

منعکس پھول پر خوشبو نہیں ہونے دیتا
وہ کبھی درد کو آنسو نہیں ہونے دیتا

سوچنے کے لیے اس عہدِ تعصب کا دھواں
کبھی روشن کوئی پہلو نہیں ہونے دیتا

میرا غم یہ ہے کہ منصف میرے قاتل کے خلاف
کوئی قانون بھی لاگو نہیں ہونے دیتا

اس لیے جنگ سے بچتا ہوں کہ دشمن کا دماغ
میرے بس میں مرے بازو نہیں ہونے دیتا

منکشف مجھ پہ مری ذات کے زخموں کو عقیل
میری خوش فہمی کا جادو نہیں ہونے دیتا

کمال جعفری

۲/۱۸ ذاکر نگر۔ جامعہ نگر
نئی دہلی-۲۵

غزل

میں ہوں نادان اور کم آمیز
گفتگو اس کی اشتعال انگیز

وہ جفاؤں سے باز آئے گا
یہ توقع ہے کتنی معنی خیز

مل کے شاید اداس ہو جاؤں
اس لیے کر رہا ہوں تم سے گریز

بجھ نہ جائے کہیں چراغِ وفا
بے وفائی کی آندھیاں ہیں تیز

شہرِ قاتل میں دیکھ کر چلنا
آج منظر ہے ہر قدم خوں ریز

کیا سہانی فضا تھی بچپن کی
رہگذر رہگذر تھی عنبر بیز

ڈھال لیتا ہے رنگ میں اپنے
ہے زمانہ کمال اک رنگریز

عارف نجمی

غزل

برہنگی انا کو ہے پیرہن کی تلاش
کہ میری روح کو ہے دوسرے بدن کی تلاش

خود اپنے آپ سے ملنے کی جستجو میری
دیارِ غیر میں جیسے ہو ہم وطن کی تلاش

ہر ایک راہ میں حائل ہیں مصلحت کی صفیں
ہے میرے عہد کو یارانِ صف شکن کی تلاش

کسی میں جراتِ اظہار ہی نہیں ہے یہاں
میں لفظِ حق ہوں مجھے ہر جری دہن کی تلاش

وہ کیفیت تو کوئی چھین لے گیا ہم سے
ہم اپنے چہروں پہ کرتے ہیں جس کرن کی تلاش

نہ جانے کب سے ہوں خود اپنے ہی تعاقب میں
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے مجھ کو فن کی تلاش

یہ کائنات تو اظہارِ ذات ہے نجمی
انا پرست کو یعنی تھی انجمن کی تلاش

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: 'مہابھنشکرمن' (طویل نظم)
شاعر: عنبر بہرائچی　　　قیمت: اسّی روپے
ملنے کے پتے: (۱) نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد۔ لکھنؤ
(۲) عنبر بہرائچی، بی۔ ۵ آفیسرس کالونی۔ اناؤ

زیر نظر کتاب "مہابھنشکرمن" گوتم بدھ کے واقعاتِ زندگی اور فلسفے پر ایک طویل نظم ہے جو چودہ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب ایک مکمل اکائی کی صورت میں ہے۔ اس طرح چودہ نظمیں مل کر ایک طویل نظم کی صورت اختیار کرتی ہیں جن کی بحر ایک ہے یعنی "فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن" مگر ردیف اور قافیے ہر باب میں الگ الگ ہیں۔ اپنے دیباچے میں عنبر بہرائچی نے گوتم بدھ کے فکر و فلسفے کا اجمالی تعارف کرایا ہے اس اعتراف کے ساتھ کہ بیشتر خیالات سنسکرت کے مایۂ ناز شاعر اشوگھوش کی عظیم تصنیف "بدھ چریتم" سے اخذ کیے گئے ہیں، مگر اس نظم کا انداز پیش کش ان کا اپنا ہے۔ اس دیباچے میں اس طویل نظم کا جواز بھی فراہم کیا گیا ہے کہ قدیم ہندستان کے اساطیری ادب کو اردو کے قالب میں ڈھالنا اور اس طرح اردو شاعری کو ایک وسیع قومی بنیاد فراہم کرنا آج کے وقت کا اہم تقاضا ہے۔

عنبر بہرائچی نے اس نظم کے عنوان "مہابھنشکرمن" پر احباب کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اس کے اصل معنی بھی لکھے ہیں اور یہ بھی کہ ان کے نزدیک یہی عنوان اس نظم کے لیے موزوں تھا۔ عنبر بہرائچی کی تشریح کی روشنی میں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ 'مہابھنشکرمن' اتنا ثقیل لفظ ہے کہ اہلِ اردو اس کی صحیح قرأت بھی نہیں کر سکتے۔ زیادہ بہتر ہوتا کہ عنبر صاحب اس لفظ کے مفہوم پر اکتفا کرتے اور اس کا نام "ترکِ عظیم" رکھ دیتے۔

طویل نظمیں اردو میں بہت ہیں، مگر اس قبیل کی نظمیں جو رامائن کے طرز پر مسلسل واقعات کا احاطہ کرتی ہوں، کم ہیں۔ گوتم بدھ پر مختصر اشاراتی نظمیں تو ہیں مگر ایسی طویل نظم جس میں نہ صرف گوتم کی پوری زندگی کا بیان ہو بلکہ ان کے فکر و فلسفے پر بھی وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہو، کوئی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ عنبر صاحب کا انوکھا اور واحد کارنامہ قرار پاتا ہے۔ انگریزی میں سر اڈون آرنلڈ (۱۸۳۲ء-۱۹۰۴ء) کا رزمیہ "لائٹ آف ایشیا" ہم میں سے بہتوں نے پڑھا ہوگا، کیونکہ یہ ایک زمانے سے گریجویشن کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ رزمیہ بھی اسی موضوع پر ایک بہترین کاوش ہے۔ عنبر بہرائچی کی نظم اپنی ساخت اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے اس سے بالکل الگ ہے اور ان کی شاعرانہ قادرالکلامی کی ایک خوش نما تصویر ہے، استعارات اور تشبیہات کا انوکھا پن اور ایک ٹھیٹھ ہندستانی فضا کی تخلیق، اس نظم کا خاص جوہر ہے۔ انھوں نے بالالتزام اس نظم کی تشبیہات ہندستان کے دیہات کے احول سے اخذ کی ہیں اور گوتم بدھ کی زندگی کا جغرافیائی پس منظر اس طور سے واضح کر دیا ہے کہ ہم اسے کسی اور خطۂ زمین سے منسلک کر ہی نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ یہ منظر نامہ اپنے موضوع سے اتنا زیادہ ہم آہنگ ہے کہ موضوع اور پس منظر ایک جان دو قالب ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر گوتم بدھ کی سیر کا یہ منظر نامہ ہے

مٹکیوں سے اُڑ رہی تھی دُودھ کی سوندھی مہک
چھپّروں پر پھن کو پھیلائے دُھویں کا ناگ تھا
دُوب پر گھسیارنوں کے ہاتھ تھے بپھرے ہوئے
دھوبنوں کی ہُونک سے تالاب تھا چونکا ہوا
گوریوں کے تیز بانکے تھے چنے کے کھیت میں
کندنی جسموں سے تھا گنگوں پسینہ بہہ رہا
جابجا تھے سُرخ پھل گُولر کی شاخوں پر لدے
بندروں کا غول تھا جس پر کلانچیں بھر رہا
سامنے تھی دُور تک جنگل کی ہریالی کھڑی
گود میں جس کی پہنچ کر کارواں یہ رک گیا

گرُدرح پُر درد تھی فضا گوتم ہو سے کچھ پُرسکوں
آگے آگے تھا گھنیرے سا گھوڑوں کا سلسلہ

یہ منظر نامہ شاعر کے اپنے گہرے مشاہدے پر مبنی ہے، ورنہ گولر کے سرخ پھلوں تک شہر کے متمدن اُردو شاعر کا تخیل مشکل ہی سے پہنچ سکتا ہے۔ اس منظر نامے میں ان کا لفظیاتی ٹریٹمنٹ بھی نیا ہے اور انھوں نے ماحول کی مناسبت سے بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کا چلن دیہاتوں میں زیادہ ہے۔

"بزمِ لالہ رخاں" کا حصہ دوسرا ہے جہاں اُردو کے تمام شاعر افتاں و خیزاں نہیں بلکہ رواں دواں پہنچتے ہیں مگر عنبر بہرائچی کا اندازِ بیان اور جو نہ صرف اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہے بلکہ اسطوری پیکر تراشی کی عمدہ مثال ہے ؎

آ گئیں ہم جولیاں ساتوں اچانک اس جگہ
نرم ہاتھوں میں لیے رنگوں بھری پچکاریاں
یعنی رتبھا جیسے بورایا ہوا سہجن کوئی
چال جیسے شال بن میں تیرتی پُروائیاں
وہ کدلنی جیسے ہو کچنار کی بگیا کھلی
جس کے تلووں کے تلے الکاپُری کی جھانکیاں
چنچلا سیماب کی مانند لہراتی ہوئی
دودھیا بادل میں جیسے رقص کرتی بجلیاں
مادھوی جیسے املتاسوں کی پھلواری سجی
بادلہ اوڑھے ہوئے پل پل بجائے تالیاں

خاص بات یہ ہے کہ اس نظم کی تعمیر میں شاعر نے افراط و تفریط سے دانستہ دامن بچایا ہے اور بعض خاص موقعوں پر، جہاں شوخ بیانی کی پوری گنجائش موجود تھی، شاعر نے محض اشاروں کنایوں میں قاری کو چلتا کر دیا ہے۔ شاعر نے انھیں واقعات اور مناظر کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے جس سے نظم کے مرکزی کردار کی نشوونما میں مدد مل سکے۔ چونکہ یہ نظم شعوری طور پر گوتم کی زندگی کے خاص خاص واقعات اور ان کے فلسفے اور تعلیم کے شاعرانہ اظہار کے لیے لکھی گئی ہے اس لیے اس میں وہ روانی نہیں ہے جس کو اُردو شاعری میں "آمد" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بعض اشعار بے تکلف قصے کو مربوط کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں اس لیے اشعار میں اکثر حروفِ جار کی قسم کے حشو و زوائد سے واسطہ پڑتا ہے۔ تاہم قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عام طور سے مصرعوں کی بندش چست ہے اور پوری نظم ایک ہی موڈ میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔
مجھے اُمید ہے کہ اردو کی طویل نظموں کے سلسلے میں عنبر بہرائچی کی یہ نظم "مہابھنشکرمن یا ترکِ عظیم" ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔ کتاب کی طباعت، کتابت اور گٹ اَپ قابلِ رشک حد تک عمدہ ہیں اور اگر اسے ۱۹۸۷ء کی بہترین طباعت کا انعام بھی مل جائے تو یہ حق بحقدار رسید کے مصداق ہوگا۔

—— نامی انصاری

نام مجلہ: سائنس کی دنیا (سہ ماہی)
مدیر و معتمد: اے. ایم. زتشی گلزار دہلوی
قیمت: فی کاپی ایک روپیہ۔ زرِ سالانہ: چار روپے
ملنے کا پتہ: پبلی کیشن اینڈ انفارمیشن ڈائرکٹریٹ (کاؤنسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ) ہل سائڈ روڈ۔ نئی دہلی (این. ڈی ۱۲)

زیرِ تبصرہ مجلہ قدیم روایتوں کو لیے ہوئے آیورویدک اور یونانی طریقۂ علاج، امراضِ جسمانی اور جدید سائنسی تحقیق کے مدارج کی روشنی میں ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک ادویات اور ان کے استعمال سے روشناس کرانے کے سلسلے میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔
یہ اُردو سہ ماہی گلزار دہلوی کے زیرِ ادارت گذشتہ بارہ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ گلزار دہلوی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس جریدے کے ذریعہ سائنس کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ اس کے ہر شمارہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مجلہ ایک طرح سے اکیسویں صدی کا علمبردار ہے۔ زیرِ نظر خصوصی شمارہ کینسر (سرطان) سے متعلق ہے۔ اس مہلک اور ہیبت ناک مرض کے نتائج روزانہ اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ویسے تو مذکورہ رسالہ کا ہر مضمون قابلِ مطالعہ ہے لیکن بالخصوص ڈاکٹر عبدالجلیل کا مضمون "کینسر کا جدید سائنسی نقطۂ نظر"، ڈاکٹر محمد نعیم انصاری کا مضمون "کینسر کے مختلف زاویے"، ڈاکٹر ایچ ایچ صدیقی کا مضمون "کینسر کے علاج کے ملکی ادارے اور اس کی سہولیات" اور ڈاکٹر مسز بلقیس بانو کا مضمون "کینسر سے کیسے بچیں" قابلِ توجہ ہیں۔ زرِ سالانہ جریدے کے صفحات کی تعداد، کاغذ، طباعت اور گٹ اَپ کو دیکھتے ہوئے برائے نام ہے۔

—— دیاشنکر

نام کتاب: "تم صرف تم" (افسانے)

مصنف: بشیشر پردیپ   قیمت: چالیس روپے

ملنے کے پتے: (۱) نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ امین آباد لکھنؤ

(۲) مکتبۂ دین وادب۔ امین آباد لکھنؤ۔ (۳) نسیم بکڈپو۔ گوتم بدھ مارگ لکھنؤ (۴) ڈاکٹر بشیشر پردیپ۔ ۵۵۵ اے، اندرانگر۔ لکھنؤ

بحیثیت افسانہ نگار بشیشر پردیپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے زیر تبصرہ کتاب "تم صرف تم" کے علاوہ اس وقت تک ان کی جو تصنیفات زیور طبع سے آراستہ ہوکر قبولِ عام کی سند حاصل کرچکی ہیں ان میں "پیاس" (افسانے) "کاجل اور دھواں" (افسانے) "پھر سے اجنبی" (افسانے) "پہلی بار" (افسانے) "ٹکڑے ٹکڑے آئینہ" (افسانے) "وہ سب باتیں" (افسانے) اور "سرخ گلاب" (بچوں کی کہانیاں) شامل ہیں۔

بشیشر پردیپ گزشتہ ۴۶ سال سے افسانے لکھ رہے ہیں اور اس مدتِ دراز میں ان کے خلاقانہ ذہن نے نئی سمتوں کا سفر کیا ہے نیز تصورات وتخیلات کے نئے جہانوں کی جستجو کی ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ مسائلِ حیات سے جڑے رہتے ہیں اور کبھی زمین سے ان کا رشتہ منقطع نہیں ہوا ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ارضی اور محسوساتی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں اور علامتوں، استعاروں، اشاروں اور کنایوں کی مدد سے تخلیقی سفر کے مدارج طے نہیں کرتے بلکہ براہ راست بیانیہ طریقے پر آگے بڑھتے ہیں۔ ایک کھرے اور سچے فن کار کی طرح انھوں نے خیر وشر کے ہنگاموں میں ہمیشہ خیر کی قوتوں کا ساتھ دیا ہے۔ نیز شر کی قوتوں سے نبرد آزما رہے ہیں۔

"تم صرف تم" اکیس افسانوں کا دل کش گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ اور ہر خوشبو کے گل بوٹے موجود ہیں۔ مذکورہ کتاب میں شامل بیشتر افسانے ہم عصر زندگی کے پیچ درپیچ نفسیاتی، اقتصادی، خانگی اور سماجی مسائل کی فن کارانہ تفسیر پیش کرتے ہیں۔ مذکورہ افسانوی مجموعے کے اکثر افسانوں کے کردار، سماج کے مختلف النوع طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں نیز ان طبقات کے کرب، نفسیاتی ومعاشی مسائل ومصائب کی بڑی حقیقی اور اثر انگیز تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اس نوعیت کے افسانوں میں "جلتی بجھتی آنکھیں"، "کہرا" "ممتا"، "زندہ مُردے" اور "گھونسلے نے کہا" بڑے کامیاب افسانے ہیں۔

مجموعی طور سے "تم صرف تم" ایک لائقِ مطالعہ اور قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ کتابت اور طباعت بھی معقول ہے۔

جعفر عسکری ———

نام کتاب: "شفق کے پھول"

شاعر: ایم۔ کوٹھیاوی راہی   قیمت: پچاس روپے

ملنے کا پتہ: اشتراک کتاب گھر، قاضی پور خرد۔ گورکھپور

ایم۔ کوٹھیاوی راہی عہدِ حاضر کے ان شعراء میں ہیں جن کا نام بڑا جانا پہچانا ہے۔ وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی، لیکن ان کے مجموعۂ کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور سے نظم کے شاعر ہیں، ان کی نظمیں بڑی بھرپور اور پُراثر ہیں، وہ جن امور کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہیں ان پر نظریں ٹھہر جاتی ہیں۔

"شفق کے پھول" ایم کوٹھیاوی راہی کا چوتھا شعری مجموعہ ہے اس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ ان نظموں اور غزلوں میں ان کا اپنا مخصوص لب ولہجہ بہت واضح ہے جس سے ان کی شناخت ہزاروں میں بھی آسانی سے ہوسکتی ہے اور یہ بڑی بات ہے کہ دنیا کے اس ہنگامے میں کوئی اپنی شناخت کے سامان مہیا کرے کیونکہ اس کے بعد اس کو منفرد اور ممتاز ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

راہی کے کلام میں خلوص اور جاذبیت بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن ادھر ان کا انداز بیان کچھ اور نکھر آیا ہے۔ "شفق کے پھول" میں شامل حمدیہ نظم "اے خدا" اور نعتیہ "دست گیر" بڑی قابلِ ذکر شعری کاوشیں ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں خلوص اور عجز وانکساری کے علاوہ ندرت بھی ہے اس کے علاوہ "جھیل"، "شب تخلیق" اور "لہو کی پکار" بھی کامیاب اور بھرپور نظمیں ہیں۔ راہی کی نظموں میں جو رومانی فضا ہے وہ بڑی دلفریب ودلکش ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ دکھ سکھ کا احساس رکھنے والا شاعر البیلا اور رنگیلا تو ضرور ہے مگر وہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا چاہتا ہے۔

راہی کے یہاں مسائل کا ادراک، محرومی کا درد اور مصائب کا ذکر سب کچھ ہے لیکن مایوسی نہیں، وہ ہمیشہ پُرامید نظر آتے ہیں۔ مجموعی طور پر "شفق کے پھول" بہترین کتابت وطباعت اور دیدہ زیب سرورق سے مزین ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو خریدنے، پڑھنے اور رکھنے کے قابل ہے۔

——— احمد ابراہیم علوی

نیا دور

جلد ۴۲ نمبر ۱۰

جنوری ۱۹۸۸ء

عنوانات

ایڈیٹر : ——— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر : ——— شاہنواز قریشی

فون { ایڈیٹر : ——— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر : ——— ۴۷۱۰۸

پبلشر
پبلشر اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ : یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
زرِ سالانہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

اپنی بات

ہندستانی جمہوریت ماہ و سال کی جتنی منزلیں طے کرتی جا رہی ہے، اتنی ہی وہ پختہ اور مستحکم ہوتی جا رہی ہے، ہمارے مدبر رہنماؤں نے ہمارے ملک کے لیے جمہوریت کا راستہ منتخب کر کے ایک تاریخی ضرورت کی تکمیل کی کیونکہ یہ راستہ ہمارے خمیر، ہمارے مزاج اور ہماری روایات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، اگر ہم نے جمہوریت کا راستہ نہ اختیار کیا ہوتا تو اس وسیع و عریض ملک کو جو مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور زبانوں کا سنگم ہے، متحد رکھنا مشکل ہو جاتا۔ یہ جمہوریت ہی ہے جس نے اس ملک کو ایک دھاگے میں پروئے رکھا ہے۔ یہ جمہوریت ہی ہے جس نے بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل، سب کو مساوی حقوق دیے ہیں، اور ترقی کے مساوی مواقع مہیا کیے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوریت اس ملک کے عوام کے لیے بیش بہا نعمت ہے، جس کی ہمیں ہر حال میں قدر کرنی چاہیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کی بقا، تحفظ اور اسے زیادہ سے زیادہ مستحکم بنانے کے لیے بھی کوشاں اور فعال رہنا چاہیے۔ کیونکہ بعض غیر ملکی طاقتوں کی نظر میں ہماری جمہوریت بری طرح کھٹک رہی ہے اور وہ اسے کمزور کرنے کی سازشوں میں ملوث ہیں جن کے اشارے پر ہمارے ملک کے مفاد پرست عناصر تنگ نظری، تعصب، فرقہ پرستی، علاقائیت اور منافرت کا بازار گرم کر کے اس ملک کو جمہوریت کے راستے سے ہٹا کر انتشار و تخریب کے راستے پر لے جانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں ان طاقتوں اور ان عناصر کا منھ توڑ جواب دینا ہے اور ان کی ناپاک سازشوں کو ہر قیمت پر ناکام بنانا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں جمہوری نظام قائم ہوئے ۴۰ سال گزر چکے ہوں، غیر جمہوری راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرنا اور غیر جمہوری طریقۂ کار اپنانا ہر اعتبار سے قابل مذمت ہے ہمیں اس طرح کی تمام کوششوں کے مقابلے میں سختی سے پیش آنا ہوگا کیونکہ یہ نہ صرف جمہوریت بلکہ اس ملک کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اگر اس ملک میں جمہوریت باقی نہ رہی تو ہماری بقا، ہماری آزادی، ہمارا اتحاد، سب کچھ خطرے میں پڑ جائیں گے۔

جمہوریت کے راستے کو اختیار کرتے ہوئے ہم نے سیکولرازم اور سوشلزم کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ اگر ہم گہرائی سے دیکھیں تو جمہوریت سیکولرازم اور سوشلزم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم سے نظر آئیں گے۔ مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر تفریق نہ کرنے اور ہر مذہب کا احترام کرنے (سیکولرازم) اور سارے عوام کو مساوات کی بنیاد پر آگے بڑھنے اور ترقی کی ایک مساوی سطح پر آنے کا موقع دینے (سوشلزم) کا آدرش جمہوریت سے جڑا ہوا ہے۔ اس آدرش اور اس تصور کے بغیر جمہوریت ادھوری رہ جاتی ہے۔ اگر مذہب نیز ذات پات کی بنیاد پر تفریق برتی جائے اور تمام مذاہب کا یکساں احترام نہ ہو تو ایسا جمہوری نظام کس کام کا؟ ایسی جمہوریت بلاشبہ لولی لنگڑی جمہوریت کہلائے گی۔ دوسرا پہلو لیجیے یعنی ہمیں حق رائے دہی کے ذریعہ اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق تو ہو لیکن ملک میں چند خاندانوں کی اجارہ داری اور سرمایہ داری کو فروغ پانے کے پورے مواقع اور سہولتیں حاصل ہوں، نیز عوام کے تمام طبقوں کو مساوات کی بنیاد پر آگے بڑھنے اور ترقی کی ایک مساوی سطح پر آنے کا موقع دیے جانے کا کوئی آئینی بند و بست نہ ہو تو ایسی جمہوریت کو ہم کیا کہیں گے؟ ایسی جمہوریت سرمایہ دارانہ جمہوریت ہوگی جسے ہم حقیقی جمہوریت سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بات نہ صرف یہ کہ بڑے اطمینان بلکہ مسرت کی بھی ہے کہ ہمارے مدبر رہنماؤں نے ہمیں جمہوریت کا جو راستہ دکھایا وہ لولی لنگڑی جمہوریت یا سرمایہ دارانہ جمہوریت کا نہیں تھا بلکہ حقیقی اور مکمل جمہوریت کا تھا۔ انھوں نے جمہوریت کو سیکولرازم اور سوشلزم کے ساتھ اپنایا۔ اس طرح انھوں نے جمہوریت کو اپنے آپ میں مکمل کر دیا۔ یہ ایک انوکھا تجربہ بھی تھا کیونکہ اس سے قبل سیکولرازم اور سوشلزم کے ساتھ جمہوریت کا راستہ کہیں بھی اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس تجربے نے ساری دنیا کو چونکا دیا، دنیا کے دوسرے ممالک ہمارے اس تجربے سے استفادہ کرنے لگے۔ لیکن بعض بیرونی طاقتیں اور اندرونی عناصر اس تجربے کو ناکام بنانے پر کمربستہ نظر آنے لگے، یہ طاقتیں اور یہ عناصر آج بھی سرگرم ہیں۔ چنانچہ ہمیں اپنے اس تجربے، اپنے اس آدرش کو محفوظ رکھنے کے لیے ہر حال میں ہر سطح پر مستعد اور چوکس رہنا چاہیے۔

ایڈیٹر

رباب رشیدی

تاریخ کا روشن باب

خان عبدالغفار خاں کی یاد میں

وہ عہد جب کہ نہ تھا اختیارِ آزادی
اسیرِ جور و جفا تھا شعارِ آزادی
سُلگ رہا تھا دلوں میں وقارِ آزادی
ہوا چلی تو اُٹھے جاں نثارِ آزادی
بجھے بجھے ہوئے لفظ و بیاں چمک اُٹھے
کڑی تھی دھوپ مگر راستے مہک اُٹھے

خیال و خواب کے رشتے حقیقتوں سے جُڑے
تمام بکھرے ہوئے لوگ اُلفتوں سے جُڑے
نقوش جتنے بھی مبہم تھے صُورتوں سے جُڑے
غرض کہ فاصلے سمٹے تو قُربتوں سے جُڑے
وطن کے عشق میں جو بد تھے وہ بھی نیک ہوئے
یگانگت کا چڑھا رنگ سب ہی ایک ہوئے

جلو میں نصرت و عظمت کی روشنی لے کر
فضا میں کیفِ نظر، حُسنِ تازگی لے کر
صبا کے دوش پہ پیغامِ آگہی لے کر
بہار آگئی احساسِ زندگی لے کر
جو بے اثر تھے وہ جذبے سدا بہار ہوئے
کہ ہم خود اپنی نگاہوں میں باوقار ہوئے

جو لوگ لائے تھے یہ انقلابِ آزادی
وہ سب تھے اپنی جگہ آفتابِ آزادی
کچھ ایسے بن گئے تعبیرِ خوابِ آزادی
ہوئی انھیں سے مُنوّر کتابِ آزادی
مجاہدوں کی اسی صف کا ایک نامِ جلی
ہے ایک مردِ صفاکیش سرحدی گاندھی

ہمارے عہد میں تنہا تھے سرحدی گاندھی
سراپا زخمِ تمنا تھے سرحدی گاندھی
نشانِ عظمتِ فردا تھے سرحدی گاندھی
محبتوں کا اُجالا تھے سرحدی گاندھی
قدم ہٹائے نہیں، تھے دبنگ، لڑتے رہے
تمام عمر اصولوں کی جنگ لڑتے رہے

نقیبِ امن تھے، انسانیت کے رہبر بھی
شعور و فکر کی گہرائی میں سمندر بھی
بلا کی دھوپ میں اک مہربان چادر بھی
قرارِ جاں کے لیے خوش گوار منظر بھی
وہ ایک شاہدِ فطرت کو ماننے والے
قلندری کے سب اسرار جاننے والے

"نظر بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز"
وہ ان کے نقشِ قدم روشنی، مہر افروز
بس اک خیالِ جمالِ وطن شبانہ روز
بہت سے بیت گئے ان پہ سانحے دلدوز
سجا لیے تھے سلیقے سے داغ آنکھوں میں
کہ ہم نے دیکھے ہیں بجھتے چراغ آنکھوں میں

وہ اپنے باغ کے ممتاز باغباں ٹھہرے
ادائے خاکِ وطن کے مزاج داں ٹھہرے
شریکِ وہم سفرِ "میر کارواں" ٹھہرے
وہاں پہنچ سکے دو ایک، وہ جہاں ٹھہرے
جو بات سچ ہے لبوں پر وہ بات آتی ہے
یہ کامرانی نصیبوں سے ہات آتی ہے

انھیں کا ذکر ہے اب حریت پسندوں میں
انھیں کی بات ہے اس وقت سربلندوں میں
انھیں کا تذکرۂ خیر نیک بندوں میں
ہے ان کا نازِ عقیدت نیازمندوں میں
پئے خلوص ہے نذر اک فقیر ساماں کو
کہ چشمِ ترکی یہ سوغات بادشہ خاں کو

فغاں بچھڑ گئے آخر خدائی خدمت گار
وہ راست باز وہ حق گو وہ صاحبِ کردار
وہ گنجِ سعیٔ مسلسل کے اک دُرِ شہوار
کہاں کھلیں گے اب ایسے ہمہ صفت گلزار
بصد خلوص بصد احترام کہتی ہے
کہ قوم ہی نہیں دنیا سلام کہتی ہے

انھیں کے نقشِ قدم پر چلیں کہ عزت ہے
انھیں کے کام کو اپنائیں یہ سعادت ہے
انھیں کو سامنے رکھیں کہ اوجِ قسمت ہے
رباب آج یہی وقت کی ضرورت ہے
خدا کرے کہ متاعِ حیات مل جائے
جو کھو گئی ہے وہ راہِ نجات مل جائے

●

اختر لکھنوی
ریڈیو پاکستان۔ کراچی

غزل

رنگی حرفوں سے ہر دیوار کیوں ہے
یہ خاموشی سرِ بازار کیوں ہے

سبھی ہیں شاہراہیں سیدھی سیدھی
مگر ہر شخص کج رفتار کیوں ہے

یہ کیسی رت ہے، یہ موسم ہے کیسا
مسیحا شہر کا بیمار کیوں ہے

ہنسی اب ہوگئی ہے زہر سی کیوں
تبسم باعثِ آزار کیوں ہے

جو بستی چین سے سوتی تھی شب بھر
وہ بستی آج شب بیدار کیوں ہے

ادھر کچھ روز سے ہاتھوں میں اپنے
بجائے شاخِ گل تلوار کیوں ہے

بتاؤ بک گئے کیا تم بھی اختر
مقفل اب لبِ اظہار کیوں ہے

**

حبیب الرحمٰن اعظمی عمری
ادارہ تحقیقات اسلامی
جامعہ دارالسلام عمرآباد

جوش ملیح آبادی کی مذہبی اور اصلاحی شاعری

اُردو زبان کے عظیم شاعر جوش ملیح آبادی اگرچہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کے ادبی شہ پاروں کا انمول ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے۔ جوش کے انتقال کے بعد سے اس پانچ سال کے عرصہ میں جوش کی زندگی اور ان کی شاعری پر بے شمار مضامین ہند و پاک میں لکھے جا چکے ہیں۔ تعریفی بھی اور تنقیدی بھی۔ کئی ماہناموں نے اس سلسلے میں خصوصی نمبر بھی شائع کیے، جن میں جوش کی زندگی اور ان کی شاعری پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

جوش کے افکار و خیالات، سیاسی رجحانات و نظریات اور مذہب و عقائد کے سلسلے میں لوگوں کے مختلف تاثرات اور نظریات ہو سکتے ہیں، لیکن زبان و ادب اور فنِ شاعری میں جو امتیازی مقام جوش کو حاصل تھا اس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں، بلکہ اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے فن کا استاد تھا، الفاظ کا شہنشاہ تھا، اقلیم سخن کا تاجدار تھا اور شاعری میں اپنے مخصوص رنگ کے لحاظ سے انفرادی حیثیت کا حامل تھا۔ جوش کی ستر سالہ شاعری میں ہمیں ہر قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ انہوں نے بے شمار نظمیں اور غزلیں بھی کہی ہیں، رباعیات اور قطعات بھی، سلام اور مرثیے بھی کہے ہیں، قصائد اور نغمے بھی۔ ان کے کلام میں ہم کو ایسے مذہبی اور اصلاحی اشعار بھی ملتے ہیں، جن سے رُوح میں بالیدگی پیدا ہو جائے اور ایسی سیاسی اور انقلابی نظمیں بھی ہیں جن کی ولولہ انگیزی سے خوابِ غفلت کا طلسم پارہ پارہ ہو جائے۔ ایسی نظمیں بھی ہیں جو مشاہدات و محسوسات کی سچی عکاسی اور بہترین ترجمانی کرتی ہیں اور ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جو تصورات و تخیلات کی دُنیا کے شاہکار کہلا سکتے ہیں۔ غرض جس موضوع پر بھی اس نے قلم اٹھایا اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے افکار و خیالات ہمیشہ بدلتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اس قدر تضاد پایا جاتا ہے کہ کوئی بھی ان کے عقائد و خیالات کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے کلام میں کہیں مذہب سے گریز اور بیزاری کا پتہ چلتا ہے تو کہیں مذہب اور مذہبی تعلیمات سے والہانہ عقیدت مندی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ایک طرف مذہب پر طنز کے نشتر چلائے جا رہے ہیں تو دوسری طرف "سورۂ رحمٰن" کی منظوم ترجمانی اتنی خوبصورتی سے پیش کی ہے جو قرآن مجید سے ان کے انتہائی شغف اور تعلقِ خاطر کی زبردست دلیل بن سکتی ہے۔ بغرض اس کی شاعری مجموعہ اضداد ہے۔

جوش کے کلام میں واقعہ نگاری، منظر کشی، موسم اور حالات کی بھرپور عکاسی جذبات و تاثرات کا شاندار اظہار، مؤثر اسلوب بیان، حیرت انگیز طلاقتِ لسان، خوبصورت تشبیہیں، نادر استعارے، نازک تلمیحیں، اثر انگیز اشارے کنائے۔ جذب و شوق کی سرمستی، پیرایۂ سخن کی سحر آفرینی، تاثیر کی بے پناہ کیفیت، زبان و بیان کی لذت و حلاوت، اشعار میں تند و تیز دریاؤں کی روانی، پہاڑی ندیوں کا جوش و خروش اور حقیقت پسندی و بے باکی وغیرہ ایسی نمایاں خصوصیات ہیں، جن میں مشکل ہی سے جوش کا کوئی حریف مل سکے گا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جوش کا سارا کلام سیاسی، انقلابی اور رندانہ شاعری پر ہی مشتمل ہے افسوس کہ بہت کم لوگ اس سے باخبر ہیں کہ اُن کے کلام میں مذہبی اور اصلاحی شاعری کا بھی ایک بڑا حصہ موجود ہے۔ جس عظیم شاعر کی روح پرور شاعری کو مذہبی طبقے نے محض ایک بے فیض ویرانہ تصور کر لیا ہے

ہم نے اسی ویرانے سے کچھ ایسے شگفتہ و شاداب پھول چُنے ہیں، جن کا حسن بے مثال اور خوبصورتی لازوال ہے، وہی پھول یہاں ہدیۂ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔

خصوصاً ۱۹۳۰ء سے قبل کی نظموں میں جو توحید، رسالت، شہادتِ حسینؓ اور قوم کے نام بیداری وغیرہ سے متعلق ہیں، شاعر کے خیالات 'اندازِ فکر' مذہبی رجحان اور پھر شرک و اوہام پرستی، بدعات و خرافات اور غیر مذہبی رسوم رواج کے خلاف کھلی اور جاندار تنقیدیں، ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو نظر انداز کیا جا سکے، بلکہ وہ ہر حیثیت سے قابلِ قدر ہیں، جوش نے اگر اسی انداز کو برقرار رکھا ہوتا تو یقیناً آج قوم و ملت کی خدمات میں اس کا نمایاں حصہ ہوتا اور وہ امت کی آنکھوں کا تارا ہوتا۔ قادرِ مطلق نے زبان و بیان اور الفاظ و اسلوب پر جو قدرت و مہارت انھیں عطا کی تھی، اس کے ذریعہ وہ مسلم معاشرے میں بڑا خوش گوار انقلاب لا سکتے تھے۔ بطور نمونہ ان کے کلام کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں، جو مذہب و ملت سے ان کی شیفتگی اور ہمدردی کو ظاہر کرتے ہیں اور اپنے اندر بڑا خوبصورت حکیمانہ اور اصلاحی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ مسلم قوم کی مذہبی بے حسی اور دین و شریعت سے برگشتگی پر کہیں ناصحانہ اور کہیں ناقدانہ انداز میں بھرپور چوٹ کی گئی ہے۔ یہ ایسا کلام ہے، جس میں فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ زبان کے چٹخارے بھی ہیں اور الفاظ کی جادوگری بھی، بے مثال تشبیہیں بھی ہیں اور نادر کنائے اور استعارے بھی، حسنِ بیان کی لطافتیں بھی ہیں اور زورِ بیان کی سحر آفرینی بھی، طنز و ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی ہیں اور جوش و خروش کی آتش فشانیاں بھی، سنجیدگی و متانت کی جھلکیاں بھی ہیں اور رعد و صاعقہ کی حشر سامانیاں بھی، سبک رو ندیوں کا ٹھہراؤ بھی ہے اور تلاطم خیز سمندر کی طوفان خیزیاں بھی پند و نصائح کی ہلکی ہلکی پھوار بھی ہے اور تنقیدوں کی موسلا دھار بارش بھی۔ لیجیے آپ بھی ملاحظہ کیجیے اور دل کھول کر داد دیجیے۔

حیدرآباد کے دوران قیام وہاں کی ایک "محفل میلاد" کے لیے جوش نے قلم برداشتہ ایک نظم کا زِ نعمت مسلمان "کے عنوان سے کہی اور محفل میں سنائی تھی۔ اتنی سچی اور کھری باتیں اس انداز میں کھل کر پیش کرنا انھیں کا حصہ تھا۔ نمونتہً چند اشعار درج ہیں، پڑھیے اور جوش کی بے مثال حق گوئی کی داد دیجیے:

تم نہ بگڑو تو میں پوچھوں ڈرتے ڈرتے ایک بات
سچ بتاؤ کون ہے اس وقت ننگ کائنات
صاف کہنا کون ہے ان ذیل کے عیبوں میں طاق
کذب، غیبت، افترا، اسراف، بدبینی، نفاق
آج کترا تا ہوا وحدانیت کی راہ سے
یہ مرادیں مانگتا ہے کون غیر اللہ سے
جھومتا ہے کون قوالوں کے ہر اک بول پر
کون یہ عُرسوں میں پہروں ناچتا ہے ڈھول پر
حق نے چھیڑا تھا زمین پر نغمۂ امّ الکتاب
تم نے برپا کر دیا ہنگامۂ چنگ و رباب
مومن و مسلم کا بخشا تھا تمھیں اس نے خطاب
شیعہ و سُنی کا نازل کر لیا تم نے عذاب
بندگی اصنام کی ٹھہرائی تھی اس نے حرام
اور تم ہر مقبرے کو جھک کے کرتے ہو سلام
دل میں شرماؤ، ذرا یہ کیا غضب کرتے ہو تم
زندگی کا زور مُردوں سے طلب کرتے ہو تم
ہاں اسی دن نے سُنایا تھا یہ روحانی پیام
ابنِ آدم! ماسویٰ اللہ کی عبادت ہے حرام
ہاں نہ جھکے نوعِ انساں ماسوا کے سامنے
اب جُھکے بندہ تو صرف اپنے خدا کے سامنے
آج بھی کیا تم اسی قانون کے پابند ہو
چپ ہو کیوں؟ اپنے خداؤں کی مجھے فہرست دو

حیدرآباد ہی کی ایک اور "محفلِ میلاد" میں انھوں نے ایک طویل مسدس پیش کی تھی، اس کے بھی دو بند ملاحظہ ہوں ؎

اس ترے انبوہ میں اے مسلم اندوہ گیں
دیر سے موجود ہیں خود "رحمۃ للعالمیں"
زیرِ لب فرما رہے ہیں وائے برجانِ حزیں
کوئی بھی اِتنوں میں میرا چاہنے والا نہیں
ذکرِ دیں ہونٹوں پہ ہے دنیا کی گھاتیں دل میں ہیں
صبحیں چہروں پر ہیں طالع اور راتیں دل میں ہیں
اے مرے معبود! انھیں محسوس ہو سکتا یہ کاش

شدتِ درماندگی سے کتنے دل ہیں پاش پاش
آہ کتنوں کو ہے اک روٹی کے ٹکڑے کی تلاش
کتنے معصوموں کے چہروں پر ہے اشکوں سے خراش
شمع کی حاجت نہیں ہے محفلوں کے واسطے
کچھ چراغوں کی ضرورت ہے دلوں کے واسطے

مسلمانوں کی درماندگی اور پست حوصلگی کو پیش کرکے بارگاہ ایزدی میں کتنے رقت انگیز الفاظ میں مناجات کرتے ہیں ؎

دے ہمیں بارِ دگر خدا جرأت و ہمت کے صفات
دل کو یوں چھیڑ کے پھر جاگ اٹھیں احساسات
پھر سے ہوں تازہ رسولِ عربی کے غزوات
درس مومن کو یہ دے، موت ہے تکمیلِ حیات
جادہ پیماؤں کو چھوٹا ہوا صحرا دے دے
قیس کو پھر خلشِ ناقۂ لیلیٰ دے دے

صبحِ اسلام پہ ہے تیرہ شبی کا پرتو
لبِ مسلم سے ہٹا تشنہ لبی کا پرتو
کانپ کر ماند ہو راحت طلبی کا پرتو
ڈال سینوں میں رسولِ عربی کا پرتو
غل ہو وہ حوصلۂ شوق دوبارہ نکلا
وہ چمکتا ہوا اسلام کا تارا نکلا

زندہ کس طور سے رہتے ہیں بتا دے ہم کو
عقل حیراں ہو، وہ دیوانہ بنا دے ہم کو
سوئے میخانۂ توحید صدا دے ہم کو
عشق کا ساغرِ لبریز پلا دے ہم کو
کج ہوں اس وقت سرِ حشر کلاہیں اپنی
جب ملیں ساقیٔ کوثر سے نگاہیں اپنی

ولادتِ رسولؐ پر اتنے شاندار انداز میں نغمہ ریزی کی ہے کہ پڑھنے اور سننے والے جھوم اٹھیں ؎

آگیا جس کا نہیں ہے کوئی ثانی وہ رسولؐ
زودِ رخِ فطرت پر ہے جس کی حکمرانی وہ رسولؐ
جس کا ہر تیور ہے، حکمِ آسمانی وہ رسولؐ
موت کو جس نے بنایا، زندگانی وہ رسولؐ
محفلِ سفاکی و وحشت کو برہم کر دیا
جس نے خوں آشام تلواروں کو مرہم کر دیا
فقر کو جس کے تھی حاصل کج کلاہی وہ رسولؐ
گلہ بانوں کو عطا کی، جس نے شاہی وہ رسولؐ
زندگی بھر جو رہا بن کر سپاہی وہ رسولؐ
جس کی ہر اک سانس قانونِ الٰہی وہ رسولؐ
جس نے قلبِ تیرگی سے نور پیدا کر دیا
جس کی جاں بخشی نے مردوں کو مسیحا کر دیا

رسالتِ محمدی کا ثبوت اتنے خوبصورت پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ بات دلوں میں اتر جائے ؎

وہ طفلِ پرواں جو چڑھا ہو دیارِ اصنامِ آذری میں
صدائے توحید سے وہ ڈالے شگاف محرابِ کافری میں
اگر صدا اس نبی امیؐ کی آسمانی صدا نہیں ہے
تو پھر کہاں سے یہ فیض پہنچا، جواب اس بات کا نہیں ہے

شانِ رسالتؐ میں ان کی نوا سنجی کا انداز کتنا خوبصورت ہے اور پُر درد بھی ؎

چھین لیں تو نے مجلسِ شرک و خودی سے گرمیاں
ڈال دی تو نے پیکرِ لات و ہبل میں تھرتھری
تیرے قدم پہ جبہ سا روم و عجم کی نخوتیں
تیرے حضور سجدہ ریز چین و عرب کی خود سری
تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
بخشا گدائے راہ کو تو نے شکوہ قیصری
تجھ پہ نثار جان و دل مڑ کے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہِ کافری
جتنی بلندیاں تھیں سب ہم سے فلک نے چھین لیں
اب نہ وہ تیغِ غزنوی، اب نہ وہ تاجِ اکبری

ہجرت کی شب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر مبارک پر سونے کا جو جرأت آزما شرف بخشا تھا اور حضرت علیؓ نے جس خوش دلی کے ساتھ

اس موقع پر بے پناہ جرأت و بسالت کا ثبوت دیا تھا، اس کا نقشہ کتنے دلنشیں اور موثر پیرائے میں کھینچا ہے ؎

خطروں سے ہو سکا نہ کبھی دل میں تو ملول
کانٹوں کو تیرے عزم نے سمجھا ہمیشہ پھول
ہجرت کی شب ملا جو تجھے بسترِ رسولؐ
کیا نفس مطمئن تھا کہ ہنس کر کیا قبول

ایمائے ایزدی کی ادا بھا گئی تجھے
پُر ہول خواب گاہ میں نیند آ گئی تجھے

اسی واقعے کو ایک دوسری جگہ اور بھی پراثر انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

جس روز مدینے کو سدھارے تھے پیمبرؐ
اس روز برادر کی جگہ پر تھا برادر
ہر چند کہ تیغوں کی چمک تھی سرِ بستر
سوتا تھا بڑے لطف سے تانے ہوئے چادر

دنیا میں کوئی ایسا جری ہو نہیں سکتا
جس طرح وہ سویا تھا کوئی سو نہیں سکتا

ذاکر نامی ایک پیشہ ور واعظ جو ماہ محرم میں شہدائے کربلا پر بڑے رقت انگیز انداز میں تقریر کرنے اور مجمع کو رلانے اور شدت سے متاثر کرنے میں بڑا ماہر تھا اور اس فن میں اپنے وقت کا مانا ہوا واعظ تھا، وہ اپنی تقریروں میں زیادہ تر بے بنیاد اور غیر مستند واقعات کو بالکل افسانوی اور ڈرامائی انداز میں پیش کر کے سامعین سے خراج تحسین وصول کرتا تھا اور ساتھ ہی اپنی جھولی بھی بھرتا تھا، اس پر جوش نے "ذاکر سے خطاب" کے عنوان سے ایک طویل مسدس کہی ہے اور ذاکر کے اس غلط رویے پر سخت تنقید کی ہے، ان اشعار میں جن حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ سنجیدہ اور اہلِ دانش حضرات کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اس کے چند بند آپ بھی ملاحظہ کیجیے ؎

سوچ تو اے ذاکرِ افسردہ طبع و نرم خو
آہ تو نیلام کرتا ہے شہیدوں کا لہو
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تری ہاؤ ہو
فیس کا دریوزہ ہے منبر پہ تری گفتگو

عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خونِ اہلِ بیت سے لقمے کو تر کرتا ہے تو

حرص نے تجھ کو سکھایا ہے دنائت کا سبق
کربلا کے ذکر میں لیتا نہیں کیوں نامِ حق
چشمۂ دولت ہے تیرا سیلِ اشک بے قلق
خون کی چادر سے سونے کے بناتا ہے ورق

خانۂ برباد ہے دولت سرا تیرے لیے
اک دفینہ ہے زمینِ کربلا تیرے لیے

سازِ عشرت ہے تجھے ذکرِ امام المشرقین
ڈھالتا ہے تیرے سکّے بستگانِ غم کا بین
تیری دارالضرب ہے اہلِ عزا کا شور و شین
سر جھکا لے شرم سے اے تاجرِ خونِ حسینؓ

ذہن میں آتا ہے جس کا نام تلواروں کے ساتھ
اس کا ماتم اور ہو سکّوں کی جھنکاروں کے ساتھ

آہ تو اور سازِ برگِ عافیت کا اہتمام
کیوں نہیں کہتا کہ باطل کی حکومت ہے حرام
تجھ کو اور زنداں کا ڈر، کیوں اے غلامِ ننگِ نام
جانتا ہے رہ چکے ہیں قید میں کتنے امام

تو مثالِ اہلِ بیتِ پاک مر سکتا نہیں
عشق کا دعویٰ ہے اور تقلید کر سکتا نہیں

دیکھ مجھ کو دیکھ، میں ہوں ایک رند بادہ خوار
رسمِ تقویٰ ہی سے واقف ہوں نہ طاعت سے دوچار
سر پہ شملہ ہے نہ کاندھے پر عبائے زرنگار
موت کو لیکن سمجھتا ہوں حیاتِ پائیدار

رسم و راہِ زہد و تقویٰ کو سبک کرتا ہے تو
قتل سے ڈرتا نہیں میں، قید سے ڈرتا ہے تو

"آفتاب سے خطاب" کے عنوان سے جوش نے ایک بڑی پیاری نظم کہی ہے احساسِ کمتری کی شکار اور جمود و تعطل کی اسیر قوم کو آفتاب کی زبانی جو بیداری کا پیغام دلوایا ہے وہ بے حد حیات افروز اور رُوح پرور ہے، شاعر

آفتاب سے خطاب کرکے کہتا ہے ؎

چھیڑ کچھ باتیں ہمارے نامور اجداد کی
تو تو ہے چھانے ہوئے گلیاں جہاں آباد کی
کچھ تو کیفیت بیاں کر ملتِ برباد کی
تیری نظروں میں تو ہوں گی رونقیں بغداد کی
کتنے سکے تو نے دیکھے ہیں ہمارے نام کے
اے مورخ سطوتِ پارینۂ اسلام کے

مسلم خوابیدہ اب بیدار بھی ہوگا کبھی
کھا رہا ہے ٹھوکریں، خوددار بھی ہوگا کبھی
بزدلی کے نام سے بیزار بھی ہوگا کبھی
جان دینے کے لیے تیار بھی ہوگا کبھی
طور سے کیا پھر صدائے "لن ترانی" آئے گی
سچ بتا کیا پھر زلیخا پر جوانی آئے گی

مرحبا اے آفتابِ روح پرور مرحبا
کیا دیا تو نے جواب امید میں ڈوبا ہوا
تو نے پھر سے مردہ ارمانوں کو زندہ کر دیا
تیرے قرباں، پھر تو دہرا دے یہ تو نے کیا کہا
چھٹ رہی ہیں ظلمتیں شب کی سحر ہونے کو ہے
آفتابِ تاجِ مسلم جلوہ گر ہونے کو ہے

سبزۂ خوابیدہ وہ انگڑائیاں لے کر اٹھا
صبح ہونے کو ہے، ترکِ غفلتیں بستر اٹھا
بحر ہے بے چین، کشتی ڈال دے لنگر اٹھا
تاجِ شاہی منتظر ہے، اے مسلماں سر اٹھا
دیکھ رحمت کی گھٹائیں ماہیِ بے آب ہیں
تیری کھیتی پر برسنے کے لیے بے تاب ہیں

ایک جگہ قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کعبہ میں بار پا گئے اصنامِ آذری
کاشانۂ خلیلؑ کے درباں کو کیا ہوا
اب آستانِ کفر پہ ہیں سجدہ ریزیاں
اے کردگار! مردِ مسلماں کو کیا ہوا
سینے میں اس گروہ کے کیوں اڑ رہی ہے خاک
گنجِ حدیث و دولتِ قرآں کو کیا ہوا
قبضوں پہ ہاتھ ہیں نہ جبینیں ہیں خاک پر
ذوقِ جہاد و جذبۂ عرفاں کو کیا ہوا
پھر ابر سامری سے برستے ہیں اژدہے
یارو! عصائے موسیٰ عمراں کو کیا ہوا

اپنی نظم "آوازۂ حق" میں دنیا کی بے ثباتی اور رنج و راحت کی حقیقت کو بڑے فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں آشکار کرتے ہوئے بیمار اور مایوس دلوں کی ڈھارس بندھاتے ہیں ؎

اے دوست بتاتا ہوں تجھے روح کے اسرار
صدموں سے اگر چور ہے تیرا دلِ بیمار
آنکھیں تو اٹھا دیکھ ذرا حسن کے انوار
یہ چاند، یہ سورج، یہ نباتات، یہ کہسار
کیوں تیرے خیالات پریشاں ہیں برادر
اک غم ہے تو سو عیش کے ساماں ہیں برادر

اے بندۂ زر چونک، مناسب نہیں غفلت
معلوم نہیں کیا تجھے دنیا کی حقیقت
کس نیند میں ہے چھوڑ بھی باطل کی محبت
آ حق کی طرف دیکھ، یہ حوریں ہیں یہ جنت
حوریں ہوں کہ فردوس، یہ ادنیٰ سا صلہ ہے
خود حق میں وہ لذت ہے جو ان سب سے سوا ہے

تکلیف کے اسباب کو راحت نہیں کہتے
جو چند نفس ہو اسے لذت نہیں کہتے
طوفانِ مصائب کو مسرت نہیں کہتے
جس شے کو فنا ہو اسے نعمت نہیں کہتے
آرام کی خواہش نہ کرو قوتِ زر سے
لبریز کرو روح کو اللہ کے ڈر سے
جس قلب میں ہو کفر، وہ دوزخ کا دھواں ہے

جس دل میں معارف ہیں وہ اک برقِ تپاں ہے
باطل کا جو حامی ہے، وہ بے نام و نشاں ہے
جو حق کا طرفدار ہے اک شیر ژیاں ہے
سچائی کے قدموں پہ سرِ فتح و ظفر ہے
جرأت بھی اسی سمت ہے، ایمان جدھر ہے

کالجوں کے طلباء کی حد سے بڑھی ہوئی فیشن پرستی، مغرب زدگی اور چال ڈھال کی نزاکتوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں، اور ایک شفیق و ہمدرد ناصح کے روپ میں ان کو خطاب کرتے ہوئے ہمت و مردانگی کا ایمان افروز سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

مرد کہتے ہیں اُسے اے مانگ چوٹی کے غلام
جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانی عناصر کی لگام
مرد کی تخلیق ہے زور آزمانے کے لیے
گردنِ سرکش حوادث کی جھکانے کے لیے

کیا غضب ہے تم سے بُوئے ایشیا آتی نہیں
سچ کہو! کیا واقعی تم کو حیا آتی نہیں
زندگی طوفان ہے اور ناؤ ہو تم باپ کی
آہ جیتی جاگتی بدبختیو! ماں باپ کی

یہ بھی کوئی زندگی ہے، غم کی ماری زندگی!
لوحِ انسانی کی ذلت ہے تمہاری زندگی
یہ بھی کوئی زندگی ہے، سست و غافل زندگی
بے حمیت، بدگہر، بے روح، بزدل زندگی

اہلِ عالم کی نظر میں محترم ہوتا نہیں
مرد جب تک صاحبِ سیف و قلم ہوتا نہیں
غور سے سن اے نگارِ مجلسِ تہذیبِ خام
گھر در سے ہاتھوں میں رہتی ہے حکومت کی لگام
بل پہ لوہے کے جو لے سکتا ہے دُنیا سے خراج
جگمگاتا ہے اسی کے فرق پہ سونے کا تاج
فکرِ ناقص کو تری سرمایۂ تحقیق دے
کاش! دُنیا مرد بننے کی تجھے توفیق دے

شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں جب داخل ہوتے ہیں تو وہاں کے در و دیوار اور بام و سقف انھیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں —— بہادر شاہ ظفر کی مظلومی، بے کسی اور مقبرے میں ان کی پناہ گزینی کے جانگسل واقعات نگاہوں میں پھرنے لگتے ہیں، شاعر کا دل درد کی شدت سے کراہ اٹھتا ہے اور اپنے محسوسات کو سوز و گداز میں ڈوب کر نظم کرتا ہے خصوصاً اس نظم کے آخری اشعار کی اثر انگیزی بے پناہ ہے ؎

اس ترے گنبد کے نیچے اے جہانِ اضطراب
ایسی دو قبریں ہیں دُنیا میں نہیں جن کا جواب
اک مزارِ کج کلہ، اک کج کلاہی کا مزار
شاہ کی تربت کے پہلو میں ہے شاہی کا مزار
اُف بھر آتے ہیں آنسو دیدۂ غمناک میں
دفن ہے تاتاریوں کا تاج تیری خاک میں

آخر میں سورۂ "الرحمٰن" کی منظوم ترجمانی کا بھی کچھ نمونہ ملاحظہ کر لیا جائے ؎

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا
تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا
کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

خلد میں حوریں تری مشتاق ہیں، آنکھیں اُٹھا
نیچی نظریں جن کا زیور، جن کی آرائش حیا
جن و انساں میں کسی نے بھی نہیں جن کو چھوا
جن کی باتیں عطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صبا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

اپنے مرکز سے نہ چل منہ پھیر کر بہرِ خدا
بھولتا ہے کوئی اپنی انتہا اور ابتدا
یاد ہے وہ دَور بھی تجھ کو کہ جب تو خاک تھا
کس نے اپنی سانس سے تجھ کو منور کر دیا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

(باقی ص ۱۵ پر)

غزلیں

فضل نقوی

دیکھتے ہی دیکھتے گلشن تماشا ہوگیا
زخم لَو دینے لگے ہر پھول شعلہ ہوگیا

تیز طوفاں بن کے پھیلا اضطرابِ مرگ و زیست
چشمۂ ہستی نہ جانے کتنا گہرا ہوگیا

توڑ کر رسمِ حیات و موت بے حس آدمی
کیسا ہونا چاہیئے تھا اور کیسا ہوگیا

فرض سے بیگانہ ہوکر انقلابِ دہر میں
موت کے بیوپار کا بانی مسیحا ہوگیا

آج بھی ہے اہلِ غم کو ایسے آنسو کی تلاش
جو ترے دامن کو بوسہ دے کے دریا ہوگیا

فضلؔ کِس کے خشک لب سے رُوحِ غم ٹکرا گئی
موجیں تھرانے لگیں دریا بھی پیاسا ہوگیا

●

نجم الدّین نقوی

اس کی زلفِ خم بہ خم نے کیا بتائیں کیا دیا
پاؤں کو زنجیر بخشی سر کو اک سودا دیا

آئینہ سازی کی صنعت کو ملا تب سے فروغ
خود نمائی نے تری جب سے اسے جلوہ دیا

واعظا اس بحثِ عقل و عشق و دین و کفر نے
تجھ کو جو کچھ بھی دیا ہو لیک ہم کو کیا دیا

سینہ کاوی معتبر خوننابہ افشانی بجا
آج اس نے زیرِ لب جیسے کہ کچھ فرما دیا

در بدر کی خاک چھنوائی اسی نے ہم کو بھی
جس نے مجنوں کو جنونِ طرّۂ لیلیٰ دیا

عشق نے مجنوں بنائے، ہیر کی تخلیق کی
عشق نے لیلیٰ عطا کی، عشق نے رانجھا دیا

شادؔ[1] کے بارے میں کہنا کیا یہ کم ہے دوستو
شادؔ نے اردو غزل کو اک نیا لہجہ دیا

نقویِؔ آشفتہ سر بھی عشق کا ممنون ہے
قیس کے مانند اس کو بھی دلِ شیدا دیا

---

[1] شادؔ عارفی رامپوری

اظہار صہبائی
از یدھیل ۔ شاہجہاں پور

دلؔ شاہجہاں پوری کے کلام میں امیر اسکول کا رنگ

حضرت دلؔ کے کلام کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ کہیں اکثر اس میں امیرؔ مینائی اسکول کی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے فن کو ہم تقلیدی فن نہیں کہہ سکتے کیونکہ انھوں نے ان خصوصیات کو کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کا ایک انفرادی رنگ بھی قائم کیا ہے وہ سر اسر کوری تقلید کے ہی قائل نہیں۔ جہاں تک امیر اسکول کی خصوصیات کا تعلق ہے، امیرؔ لکھنؤ اسکول کے نمائندے تھے، ان کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی، فصاحت و بلاغت، روانی اور سلاست کی فراوانی ہے۔ شگفتگی و تازگی اور قادر الکلامی میں بھی وہ اپنے ہم عصروں میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ صحت زبان اور فنی پختگی کی بھی بہترین مثالیں، ہمیں حضرت امیرؔ کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ یہ دیگر بات ہے کہ بقول نیازؔ فتحپوری تغزل ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر تھا۔ امیرؔ کے یہاں کہیں کہیں میرؔ و داغؔ اور ناسخؔ و دیگر شعراء کی بھی گہری چھاپ ہے۔ ان خصوصیات میں سے جناب دلؔ نے امیر اسکول کی چند خصوصیات کو اپنے کلام میں اپنانے کی سعی کی ہے۔ ان خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"میں نے غالبؔ مرحوم کی بھی پیروی کی ہے مگر ایک حد تک پیچیدہ ترکیبوں، بعید الفہم استعاروں سے احتراز کیا ہے مومنؔ کے طنزیات اور خودداریٔ عشق سے بھی استفادہ کیا ہے میرؔ کی سادگی بھی میرے اشعار میں اکثر نظر آئے گی۔ حضرت استاد کے پرشکوہ الفاظ اور متین انداز بیان کا بھی مقلد ہوں"[۱]

واقعہ یہ ہے کہ جناب دلؔ نے امیر اسکول کی خصوصیات اور اس رنگ کو انتہائی حسن اور خوبی کے ساتھ اپنے کلام میں جذب کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، شاید اسی بنا پر ہی کلیم الدین احمد جیسے ممتاز نقاد نے ان کے متعلق لکھا ہے ؛

"حضرت دلؔ امیرؔ مینائی کے شاگرد ہیں، ان کا طرز امیرؔ کے طرز سے ملتا جلتا ہے۔ الفاظ، بندشیں، مضامین سب امیرؔ مینائی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ معانی اور بندشوں میں ابتذال سے پرہیز ہے دونوں میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں"[۲]

درحقیقت اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے وقت امیر اسکول کی خصوصیات خود بخود حضرت دلؔ کے کلام میں جذب ہوتی نظر آتی ہیں۔ خوبصورت انداز بیان طرز ادا کی دل کشی، پرشکوہ الفاظ، شگفتگی و تازگی، فصاحت و بلاغت سلاست و روانی، امیر اسکول کی یہ سبھی خوبیاں ان کے کلام میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

بقول مجنوںؔ گورکھپوری :

"دلؔ شاہ جہاں پوری کے کلام میں امیرؔ مینائی کی شستہ و رفتہ زبان کا مزا ہے مگر وہ ابتذال اور عامیانہ پن یا کسی قسم کی عریانی کسی شعر میں نہیں آنے دیتے۔ ان کے یہاں میرؔ کی خستگی اور گداختگی ہے، کہیں کہیں مومنؔ کا انداز بھی پایا جاتا ہے لیکن جو خصوصیات ہم کو سب سے زیادہ ان کی طرف کھینچتی ہیں وہ آلامِ زندگی اور آلامِ عشق کی پرتفکر

احساس، الفاظ کی ترتیب اور فارسی ترکیبوں کا سلیقہ اور
اعتدال کے ساتھ استعمال ہے جن سے ان کے اشعار
میں بلاغت کے ساتھ ایک مدھم نغمگی پیدا ہو جاتی ہے اور
یہ ساری خصوصیات غالب ہی کا مرکہ ہیں"۔ ؎

مثلاً ان کے کچھ اشعار دیکھیں جن میں امیر کا رنگ جھلکتا ہے ؎

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے
اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

جفا کے بعد وہ عہدِ وفا کریں تو سہی   محال ہے کہ مرے دل کو اعتبار نہ تھا

دفعتاً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد
ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

یاد ہے ہاں یاد ہے طرفِ نگاہ مست یار
اک نظر کی پنکھڑی سے پارہ پارہ دل ہوا

بلاشبہ یہ اشعار امیر اسکول کی یادگار ہیں۔ علامہ مجنوں گورکھپوری نے حضرت دل کے اس رنگ کے متعلق ٹھیک ہی لکھا ہے :۔

"حضرت دل کے کلام کے مطالعے سے میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انھوں نے دبستانِ امیر میں زندگی کی نئی لہر پیدا کی ہے اور اس میں نئی صلاحیتوں کا پتہ دیا۔ میرا خیال ہے کہ خالص غزل سرا کی حیثیت سے حضرت مدرسۂ امیر کے تمام شاعروں میں ممتاز ہیں"۔ ؎

اب جہاں تک حضرتِ دل کے اپنے کلام کی انفرادیت کی بات ہے تو ان کے یہاں امیر کی مانند رعایتِ لفظی کی بھرمار نہیں بلکہ ان کا کلام ان معائب سے یکسر پاک ہے۔ کلامِ دل میں ہمیں گہرائی ملتی ہے۔ بقول خود :

"باوجود لکھنوی اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے، میں نے دہلوی رنگ اختیار کیا۔ دہلوی رنگ سے میرا مقصود میر و غالب و مومن کی شاعری ہے۔ جذبات نگاری میں عریانی پسندیدہ نہیں ہے مذاقِ سلیم کا دلدادہ ہوں ؎"

ایک اور جگہ حضرت دل لکھتے ہیں :۔

"میں اس محبوب کا دلدادہ ہوں جس کی بارگاہ میں رقیب کا گزر نہیں۔ میرا محبوب معصوم ہے، میرے حسن و عشق کی داستان میں شکوۂ دشمن بھی شامل نہیں۔ میں ہمیشہ مہجور رہا، اس لیے وصل سے بھی نا آشنا ہوں۔ وصل کی تمنا فطرتِ عشق ہے لیکن اس کا اظہار اور اس تمنا کی صراحت سے بالا ہے"۔ ؎

حضرت دل کے کلام میں ہمیں لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ سوز و گداز، جوش و سرمستی، روانی اور بلندی ان سبھی خوبیوں نے مل کر ان کے کلام کو انفرادیت بخشی ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ نیاز نے ایک جگہ ان کی شاعری کے متعلق لکھا ہے :۔

"امیر کے دوسرے شاگرد دل شاہجہاں پوری ہیں جنھوں نے اپنے استاد کے رنگ سے ہٹ کر خود اپنا علاحدہ رنگ قائم کیا اور فنی و معنوی دونوں حیثیتوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا :

کلامِ دل کا انفرادی رنگ دیکھ کر انھوں نے "نگار" کے ایک اور شمارے میں لکھا ہے :۔

"امیر کے شاگردوں میں دل کی شاعری سب سے الگ ہے یہاں تک کہ جلیل سے بھی۔ دل کی شاعری اتنی ہلکی نہیں جتنی امیر کے دوسرے شاگردوں کی۔ ان کے یہاں غور و فکر کا عنصر غالب ہے اور کہیں کہیں آواز میں بلندی بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر نہایت گوارا قسم کی۔ پختگی و مشاقی ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے لیکن والہانہ ربودگی یا خود رفتگی بہت کم پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں موسیقیت تو نہیں لیکن سنبھلی ہوئی دردمندی ضرور ہے جو کہیں کہیں ترنم کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے، چونکہ وہ اظہارِ جذبات میں کبھی بے اختیار نہیں ہوتے اس لیے ابتذال و سخافت ان کے یہاں بالکل نہیں پائی جاتی"۔ ؎

کلامِ دل کی اس انفرادیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ حضرت دل نے اپنے قلم کو عریاں نگاری سے محفوظ رکھا۔ ان کے یہاں نہ تو وصل کی داستانیں ملیں گی اور نہ رقیب کے چرچے۔ وہ خود لکھتے ہیں :۔

"بیسے لب عارض محبوب تک کبھی نہیں پہنچے۔ جذباتِ محبت آستاں بوسی تک محدود ہیں۔ میرے مجموعے کلام میں لفظ رقیب بھی نظر نہ آئے گا۔ میرا محبوب صرف میرا محبوب ہے' حسن معصوم خلوت پسند ہے' جلوہ سربام نہیں۔ اظہارِ درد و الم کی حالت میں میرا نالہ نالہ رہا ماتم نہیں بنا۔ بحالتِ سرور نشاط میرے لب تبسم کی حد میں رہے۔ میں قہقہے سے ناآشنا ہوں"۔ [9]

اسی بنا پر مولانا عبدالسلام ندوی حضرت دل کے کلام کو ایک بڑے تاریخی دور کا نچوڑ بتاتے ہیں۔ حضرت دل نے اگرچہ کہیں کہیں فارسی تراکیب بھی استعمال کی ہیں لیکن صحت زبان کے سلسلے میں وہ کافی محتاط نظر آتے ہیں ـــــ بقول مرزا احسان احمد: ـــــــــــ

"ان کا کلام صرف ضعف' بے حسی اور موت کا افسانہ نہیں ہے بلکہ اپنے اندر احساس کی کافی گرمی اور زندگی کی روح بھی رکھتا ہے"۔ [10]

پروفیسر آل احمد سرور نے بھی ایک جگہ لکھا ہے۔

"دل اپنے آپ کو امیر کا شاگرد بتاتے ہیں مگر ان کے یہاں جلال کی گرمی بھی مل جاتی ہے' ان کی پختگی اور مشاقی میں کلام نہیں"۔ [11]

حضرت دل کے کلام میں ندرتِ اسلوب کی فراوانی ہے اکثر و بیشتر انھوں نے نادر تشبیہات اور استعارے استعمال کیے ہیں۔ ان کی اس خوبی نے ہی انھیں جدید شعرا کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے ؎

فراق یار میں دشوار ہے آزادِ غم رہنا مرے تارِ نفس اب تو سلاسل ہوتے جاتے ہیں

ـــــــــــ

ان کے لیے اک کھیل ہے ناوک کا چلانا سمجھے ہیں کہ پہلو میں کوئی دل نہیں رکھتا

ـــــــــــ

درحقیقت مضطرب دل کیلیے وہ موت تھی اصطلاح عام میں تسکین جس کا نام تھا

ـــــــــــ

ہنس ہنس کے کہہ رہے ہیں قاتل سے زخم بسمل
ہاں اب نگاہ برہم رو کے ہنسی ہماری

یوں دل میں اس کی یاد ہے نقشہ نظر میں ہے
گویا ہمارے ساتھ وطن بھی سفر میں ہے

اصل میں حضرت دل کا کلام اس گلدستے کی مانند ہے جس میں بیک وقت مختلف رنگوں کے پھول ہمیں ایک ساتھ نظر آتے ہیں' ان کے کلام میں اگر فصاحت و بلاغت کی خوبیاں ہیں تو سلاست اور روانی کی بھی کمی نہیں۔ مضمون آفرینی بھی خوب ہے اثر و تازگی بھی نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے کچھ اشعار دیکھیں ؎

کیا کہیے اب مآلِ محبت کی سرگذشت
یاد اس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

ـــــــــــ

توبہ کے احترام سے تھرا رہے تھے ہاتھ دل کانپتا تھا جام کو ہر بار دیکھ کر

ـــــــــــ

مری خموشیٔ مجبور پر بھی ایک نظر
زباں سے جو نہ ادا ہو وہ ماجرا ہوں میں

ـــــــــــ

ہیں ایسے واقعات محبت کے واقعات تا حشر ختم ہوں جو بہت مختصر کریں

ـــــــــــ

عذابِ جاں ہے خدا جانے کیوں یہ آزادی
سکون تھا جو قفس میں وہ آشیاں میں نہیں

ـــــــــــ

نہ کھینچ اے چارہ گر مجروح دل سے خونچکاں ناوک
سجایا ہے بڑی کاوش سے ہم نے اس گلستاں کو

ـــــــــــ

مرے خاموش ہونے کا یہ عالم دیکھتے جاؤ
دلِ ناکام کی یہ آخری فریاد باقی ہے

چند اور اشعار میں ان کا سوز و گداز بھی دیکھیں جس سے دل و دماغ وجد کرنے لگتے ہیں ؎

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بحالِ زار
مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا

یہ گویا واقعات بزمِ ہستی کا خلاصہ ہے
ترا یوں دفعتاً خاموش اے شمعِ سحر ہونا

آغازِ محبت سے انجامِ محبت تک گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سُنا ہوگا

جھگڑا تو روز ٹھوکریں کھانے کا مٹ گیا
اچھا ہوا کہ خاک نشیں خاک ہو گئے

اگرچہ حضرت دلؔ نے عام شعراء کی مانند اپنے کلام میں کہیں فرسودہ اور روایتی مضامین بھی نظم کیے ہیں۔ قفس و بلبل، نزع و مرگ، ناصح و قبر، محبوب کی کج ادائی، اس کے ظلم و ستم ہمیں کلامِ دلؔ میں بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کے یہاں ان مضامین کی اس قدر بھرمار نہیں ہے جتنی ان کے معاصرین کے یہاں ملتی ہے۔ یہ کہنہ مضامین اکا دکا ہی کہیں نظر آتے ہیں۔ بقول نیازؔ فتحپوری :-

" جنابِ دلؔ کی شاعری میں اس شوخی کا عنصر کہاں جو عہدِ امیرؔ میں داغؔ اسکول کے لیے مشہور تھی "۔ [۱۲]

واقعہ یہ ہے کہ حضرت دلؔ کی شاعری دردکاری، جوش و تڑپ کے عناصر سے بھری ہوئی ہے۔ نیازؔ فتحپوری کے بقول :

" یقیناً ان کے یہاں آپ کو وہ جوش و خروش نظر آئے گا جو عشقِ بیتاب کی خصوصیات میں داخل ہے، نہ ان کے کلام میں آپ کو وہ سوز و گداز ملے گا جو شاعری کو یکسر بین اور مرثیہ بنا دیتا ہے لیکن اس باب میں وہ معذور تھے کیونکہ جو آزادی سے ہنس نہیں سکتا وہ دل کھول کر روتا بھی نہیں ہے، قدرت اس قدر ظالم نہیں کہ جسے وہ ہنسنے نہ دے اسے رُلا رُلا کر ہلاک کر ڈالے "۔ [۱۳]

حضرت دلؔ کے کلام کی یہ متذکرہ خصوصیات ان کے انفرادی رنگ کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ان کی اس انفرادیت کی بنا پر ہی علامہ نیازؔ فتحپوری جیسے ادیب و شاعر اور نقاد نے حضرت دلؔ کو ایک بلند پایہ شاعر تسلیم کیا ہے علامہ اقبالؔ نے ان کے متعلق ٹھیک ہی کہا تھا :

" میں کلامِ دلؔ کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں یوپی میں اصغرؔ گونڈوی اور دلؔ شاہجہاں پوری کا دم غنیمت ہے "۔ [۱۴] ✱✱

حواشی :

۱؎ نگار۔ جنوری، فروری ۱۹۵۷ء ص ۱۳
۲؎ ترانۂ دل۔ گزارشِ مصنف ص ۱۲
۳؎ ترانۂ دل ص ۸
۴؎ غالبؔ، شخص و شاعر۔ مجنوںؔ گورکھپوری
۵؎ ترانۂ دلؔ ص ۵۹
۶؎ دلؔ نمبر: غزل کا معیار اور مذاقِ سلیم کی تعریف ص ۱۱۷
نگار : اردو شاعری دلی سے عہدِ حاضر تک
۷؎ دل نمبر۔ غزل کا معیار اور مذاقِ سلیم کی تعریف ص ۱۱۷
نگار۔ جنوری، فروری ۱۹۵۷ء ص ۱۳
۸؎ نگار۔ جنوری، فروری ۱۹۴۳ء
۹؎ ترانۂ دلؔ، گزارشِ مصنف ص ۱۲
۱۰؎/۱۱؎ " " " ص ۸
۱۲؎ ترانۂ دلؔ۔ مقدمہ ص ۲۵
۱۳؎ " " " ص ۲۸ ۔ ۱۴؎ ترانۂ دل۔ مقدمہ ص ۳

جوشؔ ملیح آبادی

.... صفحہ ۱۰ کا بقیہ

ہر نفس طوفان ہے، ہر سانس ہے اک زلزلہ
موت کی جانب رواں ہے زندگی کا قافلہ
مضطرب ہر چیز ہے جنبش میں ہیں ارض و سما
ان میں قائم ہے تو تیرے رب کے چہرے کی ضیا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

مضمون چونکہ طویل ہوتا جا رہا ہے لہٰذا انھیں چند نمونوں پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان اشعار کے مطالعہ سے ان حضرات کی غلط فہمیاں کسی قدر دور ہو جائیں گی جو یہ سمجھتے ہیں کہ جوشؔ نے کبھی کوئی ایسا کلام پیش نہیں کیا جس سے دین و ملت اور انسانیت کا مفاد وابستہ ہو۔

معجز سنبھلی
نورتی سرائے سنبھل
مراد آباد

۲۶ جنوری

ہم تو یہ کہتے ہیں جو جس کا ہے ایمان رہے
ہم تو یہ کہتے ہیں گیتا رہے قرآن رہے
ہم تو یہ کہتے ہیں انسان سے انسان رہے
اپنے بھارت کا ہو ہندو کہ مسلمان رہے
ہم تو یہ کہتے ہیں سب نیک بنو نیک بنو
ہم تو یہ کہتے ہیں جو کچھ ہو مگر ایک بنو

ہم تو یہ چاہتے ہیں ایک پہ ہو ایک فدا
ہم تو یہ چاہتے ہیں سب ہی بنیں اہلِ وفا
ہم تو یہ کہتے ہیں اک دل بھی نہ ہو دل سے جدا
ملک میں کوئی نہ دے فرقہ پرستی کو ہوا
کبھی ہوں گے نہ جُدا ایسا بنائیں مل کر
ملک کو اپنے ابھی اور اٹھائیں مل کر

مادرِ ہند کی عظمت کے طلب گار بنیں
ملک و ملت کی حفاظت کے نگہ دار بنیں
عظمت و عزت و شوکت کے خریدار بنیں
جو غلامی میں تھے مجبور وہ مختار بنیں
فرض ہے فرض کہ سب شانِ وطن بن کے رہیں
اب دل و جاں سے سبھی جانِ وطن بن کے رہیں

آج جو عہد کیا ہے وہ بتا دو معجزؔ
کل کی جو بات ہو وہ دل سے بھلا دو معجزؔ
عہد پہ اپنے عمل کر کے دکھا دو معجزؔ
رہنماؤں کو بھی یہ بات سنا دو معجزؔ
ہم ہر اک طرح سے اب ملک کے کام آئیں گے
ہر جگہ آپ کے پیغام کو پہنچائیں گے

مشتاق لکھیم پوری
مہراج نگر۔ لکھیم پور کھیری

جمہُوریت کا راگ

امن و اماں کے دیپ جلاتے ہوئے چلو
جنگ و جدل کی آگ بجھاتے ہوئے چلو

نفرت کی تشنگی کو مٹاتے ہوئے چلو
اُلفت کے سب کو جام پلاتے ہوئے چلو

واقف نہیں جو جذبۂ ایثار سے انھیں
قربانیوں کا درس سکھاتے ہوئے چلو

مُردہ دلوں میں بھر کے حرارت حیات کی
احساس زندگی کو جگاتے ہوئے چلو

راہی کوئی بھٹک نہ سکے تیرگی میں اب
ہر رہ گذر پہ شمع جلاتے ہوئے چلو

بے چینیوں میں پاؤ گے منزل سکون کی
قدموں کو اور تیز بڑھاتے ہوئے چلو

ساحل خوشی کا دُور نہیں اہلِ عزم سے
طوفانِ بحرِ غم میں یہ گاتے ہوئے چلو

جو انقلابِ وقت سے مغموم ہیں انھیں
جمہوریت کا راگ سُناتے ہوئے چلو

★★

سید حیات وارثی

سراج لکھنوی

غزل کا ایک منفرد شاعر

اُنیسویں (۱۹) صدی ہر شعبۂ حیات کے بڑے لوگوں اور مقتدر شخصیتوں کی صدی ہے۔ سیاسی، سماجی اور ادبی اعتبار سے متعدد اہم لوگ اس صدی میں ایک ساتھ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ انھیں باکمال اور مقتدر شخصیتوں میں حضرت سراج لکھنوی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت مارچ ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام نورالحسن ہے ان کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے۔ انھوں نے عربی، فارسی اُردو اور انگریزی کی کما حقہٗ تعلیم حاصل کی، کچھ دنوں وہ کیننگ کالج کے بھی طالب علم رہے۔

سراج لکھنوی نے شعر گوئی کا آغاز ۱۹۱۰ء سے کیا۔ ۱۹۱۵ء میں جناب پیارے صاحب رشید لکھنوی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ پیارے صاحب رشید نے چند غزلوں پر اصلاح دی اس کے بعد اپنے بھائی باقر صاحب حمید لکھنوی کے سپرد کر دیا، کیونکہ رشید صاحب غزل گوئی ترک کر چکے تھے۔

رشید لکھنوی نے ۱۹۱۸ء میں اور حمید لکھنوی نے ۱۹۲۲ء میں رحلت فرمائی۔ استاد کے وصال کے بعد سراج لکھنوی نے کسی دوسرے شخص سے مشورۂ سخن نہیں لیا۔

سراج لکھنوی شعر گوئی میں صرف زبان و بیان کی خوبی کے قائل نہیں، وہ فکر و خیال اور عصریت کو ضروری قرار دیتے ہیں، اسی لیے اُن کے کلام میں بیان اور زبان کی خوبیوں کے ساتھ ہی ساتھ فکری جدت پسندی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

سراج لکھنوی اپنے مجموعۂ کلام "شعلۂ آواز" میں خود لکھتے ہیں:

"میں اپنے کلام میں تخصیص کے ساتھ خصوصیاتِ زبان پر داد طلب نہیں ہوں اور نہ محض زبان و محاورہ کو اپنی شاعری کا سنگِ بنیاد سمجھتا ہوں، یہ بات تو لکھنؤ کے ہر شاعر کو اور سب کے طفیل میں مجھے بھی بے سعی کے حاصل ہے۔ میں تو ہمیشہ سے دل کش اندازِ بیان کے ساتھ تخیل اور فکر کا دلدادہ ہوں۔"

ہر نفس اتنی ہی لَو دے گا سراجؔ
جتنی جس دل میں حرارت ہوگی

سراج لکھنوی اپنی فکری اور فنی انفرادیت سے اپنے عہد کے تمام لکھنوی شعرا سے الگ نظر آتے ہیں اور ان کی آواز بھیڑ میں بھی صاف پہچانی جاتی ہے۔ ۱۹۲۵ء کے بعد انھوں نے سب سے پہلے نئی فکری آہٹوں کو سنا اور عصری تقاضوں کو لبیک کہا ؎

وہ سنگ راہ سہی، سنگِ آستاں نہ سہی
صلاحیت بھی تو ہو، قسمت آزمانے کی

ہر ذرۂ بے مایہ کونین کی قیمت ہے
دیکھو مری آنکھوں سے آبادیٔ ویرانہ

نگاہ کرم نے پگھلا دیے آخر یہ شیشے بھی
حبابوں کی عمارت تھی مری آئینہ دیواری

حواس گم اور نظر پریشاں، شکستہ پَر ہوش اُڑے اُڑے سے
بڑی جسارت کا کام ہے یہ، چمن میں ذکرِ بہار کرنا

آنسو ہیں کفن پوش، ستارے ہیں کفن رنگ
لو چاک کیے دیتے ہیں دامانِ سحر ہم

لکھنؤ میں روایت کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنے کا فریضہ سب سے پہلے حضرت سراج لکھنوی نے انجام دیا، انھیں نہ صرف زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی بلکہ جدید سائنسی تجربات اور بدلتے ہوئے اقدار پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔ ان کا کلام ماضی کی عظمت اور حال کی حقیقت کا ترجمان ہے۔ انھوں نے وراثت میں حاصل کیے ہوئے بائیں باغ کی ترتیب نو اس ماہرانہ انداز میں کی ہے کہ اس سے دل و دماغ دونوں کو فرحت و تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

سراج لکھنوی نے تازہ ہوا کے لیے ذہن کے دریچوں کو ہمیشہ کھلا رکھا ہے اس لیے ان کو گھٹن کا احساس نہیں ہوتا ؎

ہر اشک سرخ ہے دامانِ شب میں آگ کا پھول
بغیر شمع کے بھی جل رہے ہیں پروانے

کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال میں

رات بھر شمع جلاتا ہوں، بجھاتا ہوں سراج
بیٹھے بیٹھے یہی شغلِ شبِ تنہائی ہے

چند تنکوں کی سلیقے سے اگر ترتیب ہو
بجلیوں کو بھی طوافِ آشیاں کرنا پڑے

فرصت میں ٹانک لینا کہیں اس کرن کو بھی
لپٹی ہوئی حجاب سے تیری نظر بھی ہے

سراج لکھنوی انکساری اور شرافت کا پیکر تھے، ان کو اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس تھا اور نہ استاد ہونے کا گھمنڈ۔ بحیثیت انسان وہ عہدِ گزشتہ کی پوری طرح نمائندگی کرتے تھے۔ سید صدیق حسن (آئی سی ایس) "شعلۂ آواز" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:-

"بحیثیت انسان سراج صاحب شرافت اور وضعداری کے اونچے درجے پر ہیں۔ دوستوں میں بھی اور محفلِ اغیار میں بھی سراج ہمیشہ مرنجاں مرنج رہے ہیں۔ دوستوں نے تو کبھی کبھی آپ کے ساتھ ایسے برتاؤ کیے جن سے حفیظ جالندھری کا یہ شعر یاد آیا ؎

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

مگر سراج صاحب کا یہ ظرف تھا کہ آپ نے احباب کی ان کوتاہیوں کو اس طرح نظر انداز کیا کہ کسی کو گمان بھی نہ ہو سکا کہ آپ کو تکلیف پہنچی ہے۔"

مرا عزم تشدد بھی ہے شرحِ شانِ مظلومی
جو آیا بھی تو آنسو بن کے جوشِ انتقام آیا

ٹکراؤں کیوں زمانے سے کیا فائدہ سراج
خود اپنے راستے سے ہٹا جا رہا ہوں میں

غالباً ان کے کردار کی یہی خوبی ان کو ایک حساس اور بالغ نگاہ شاعر بنانے میں معاون ثابت ہوئی ہے ؎

خیر ہم دوزخ کو بھی جنت بنالیں گے سراج
جب چمن آرائیاں تھیں، اب قفس آرائیاں

سراج لکھنوی کے نام سے لکھنؤ کے کئی اہم ادبی معرکے منسوب ہیں جن میں سب سے تاریخی واقعہ ایڈیٹر "جام جہاں نما" مولانا سید انفر موہانی وارثی سے مقدمہ ہے جو عدالت تک گیا۔

اس مقدمے میں اس وقت کے تمام شعرا اور ادب دوست کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہے۔ قانونی بحثوں کے علاوہ فنی اور علمی موشگافیوں کا اظہار فریقین کی جانب سے ہوا۔ اس مقدمے سے لکھنؤ کے علاوہ پورا ملک دلچسپی لے رہا تھا۔ سراج صاحب نے اس مقدمہ میں کامیابی حاصل کی لیکن اس کامیابی کا اظہار انھوں نے اپنی زبان سے کبھی نہیں کیا بلکہ اپنے شاگردوں کے پوچھنے پر ناراض ہوتے اور کہتے کہ وہ میرا ذاتی معاملہ تھا جو ختم ہو گیا۔ تم لوگوں کو مولانا سید انفر موہانی کا احترام ایک بزرگ کی حیثیت سے کرنا چاہیے۔

اس کے بعد "سراج دائرہ" کے دو شعر کے عنوان سے "قومی آواز" لکھنؤ

میں ایک تنقیدی مباحثہ شروع ہوا۔ سراج صاحب نے فنی اور علمی سوالات کا جواب علمی انداز میں دیا لیکن اس کو کبھی اپنا ذاتی مسئلہ نہیں بنایا اور معترضین سے تعلقات کی خوش گواری برقرار رکھی۔

سراج لکھنوی ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک مدرسۂ فکر کا نام ہے۔ ہندو پاک کے نہ جانے کتنے عظیم شعراء کے کلام پر اصلاح دیتے لیکن ان کے ناموں کا اظہار کبھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا کلام ملک کے تمام بڑے رسائل میں شائع ہوتا، ریڈیو سے نشر ہوتا، کل ہند مشاعروں میں پسند کیے جاتے۔ تلامذہ کی ایک طویل فہرست ان کی نسبت پر فخر کرتی لیکن وہ تمام شہرتوں اور عظمتوں سے بے نیاز انکساری اور خاکساری کا مجسمہ نظر آتے۔

سراج لکھنوی کا طریقۂ اصلاح بھی دوسرے تمام استادوں سے الگ تھا، وہ کبھی تحریری اصلاح نہیں دیتے تھے بلکہ کہتے سناؤ، پوری غزل سماعت فرمانے کے بعد مطلع سے رائے دینا شروع کرتے اور جو بھی فنی یا لسانی کوتاہیاں ہوتیں ان کی جانب اشارہ کرتے۔ یہ طریقۂ اصلاح ایسا تھا کہ تمام عیب و ہنر شاگرد کے ذہن نشین ہو جاتا۔ سکھانے اور تربیت دینے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔

سراج لکھنوی نے دامن، آنسو اور انگڑائی کی جتنی خوبصورت عکاسی اپنے اشعار میں کی ہے اردو ادب میں انھیں کا حصہ ہے ؎

آنکھوں پہ اپنی رکھ کر ساحل کی آستیں کو
ہم دل کے ڈوبنے پر آنسو بہا رہے ہیں

مرا ایک ایک آنسو غمِ فکرِ دو جہاں ہے
کبھی خشک کرنا دامن کبھی آستیں سکھانا

حبابِ لبِ جو بنیں دونوں آنکھیں — نظر رہ گئی غرقِ دیدار ہو کر

آخری اشک رکا ہے سرِ مژگاں آکر — ڈوب جائے یہ ستارہ تو سحر ہو جائے

نہ ڈال آنسو پہ میرے روشنی برقِ تبسم کی
یہ دریا موج میں آکر کہیں ساحل نہ بن جائے

ترے معصوم دامن کی قسم اے روٹھنے والے
بہت مجبور ہوتا ہوں تو میں آنسو بہاتا ہوں

وہ زکوٰۃِ دولتِ صبر تھی مرے چند اشکوں کے نام سے
وہ نظر گزر کی شراب تھی جو چھلک گئی مرے جام سے

کوئی حد ہے تھک گئی ہوں گی جمال آرائیاں
اک نگاہِ شوق نے سب لوٹ لیں انگڑائیاں

سراج اب شکستہ ہے توبہ کی بندش — ایک انگڑائی کے ساتھ اور اک جماہی

بال و پر پیدا کیے ہیں اضطرابِ شوق نے
اب ہر انگڑائی میں تارے چھو لیا کرتے ہیں ہم

آج تک حسنِ ازل کی دل کشی بھولی نہیں — حسنِ جدت آفریں اک اور انگڑائی سہی
حشر میں بھی خیر تھوڑی دیر رسوائی سہی — اے جنونِ شوق ان اک اور انگڑائی سہی

سراج لکھنوی نے غزل کے دامن کو وسعت اور ہمہ گیریت عطا کی۔ جب لکھنؤ کے دوسرے شعراء نئی آہٹوں سے ان سنی کا رویہ اختیار کیے ہوئے تھے تو سراج صاحب ان آوازوں اور عصری تقاضوں کو شعری پیکر عطا کر رہے تھے۔

سراج صاحب نے انسانی نفسیات سے بہت قریب ہو کر شعر کہے ہیں اسی لیے ان کے ذاتی احساسات آفاقی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کے یہاں غمِ دوراں اور غمِ جاناں ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے سراج لکھنوی اردو ادب کا ایک اٹوٹ حصہ بن کر تاریخِ ادب میں ہمیشہ جگمگاتے اور ضوباری کرتے رہیں گے ؎

مجھ کو بخشی ہے محبت نے حیاتِ جاوداں
تم خفا کیوں ہو تمھاری ہی مسیحائی سہی
لگا کے مہرِ فراق دل پر وہ چلتے چلتے یہ کہہ گئے ہیں
بھرے جو نیت نہ میرے غم سے تو پھر غمِ روزگار کرنا

ستم ہے غم کی دولت بھی عطا کی جائے قسطوں میں
تکلف بر طرف ہونا ہے جو اک بار ہو جائے

مری فنا بھی ہے تکمیل آرزوئے حیات
کہ خاک تو ہوں مگر خاک کوئے یار ہوں میں

اِن تم کو بھول جانے کی کوشش کریں گے ہم
تم سے بھی ہو سکے تو نہ آنا خیال میں

خالق کبھی تو ظلم کا بدلا اسے بھی دے
اب کی زمیں بنے یہ فلک ٹوٹنے کے بعد

نگاہوں کے بدلتے زاویے ہیں
بہارِ صبح کیسی، شامِ غم کیا

کتنے گھر روشنی سے ہیں محروم   جلوۂ آفتاب کیا جانے

ہم نقشِ جاوداں ہیں دُنیا سنوار دیں گے
تعمیر کی ضمانت ہے زندگی ہماری

آخر میں سراج صاحب کا ایک مشہور شعر بھی ملاحظہ فرمائیں جو آج بھی زبان زد خاص و عام ہے ؎

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

۲۲ر جنوری ۱۹۸۸ء کو صبح بزمِ غزل کا یہ سراجِ سخن اپنی فکری تابندگی چھوڑ کر عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو عازمِ سفر ہوا۔

تھا ایک ظاہر و باطن، نہ مکر تھا نہ فریب
سراج اُسے وہ ملی روشنی زمانے کی

دل کولھاپوری

کولھاپور - ۴۱۶۰۰۲
(مہاراشٹر)

جشنِ جمہوریہ

بے خطر جمہوریت ہو شورشِ جذبات سے
باخبر ہو جائے ہر اک گردشِ حالات سے

سازِ دل پر اب ہمارے ایکتا کا راج ہو
ملک سارا گونج اُٹھے پیار کے نغمات سے

پیشِ مقصد ہو سدا دل جیتنے کی آرزو
جیت راس آتی نہیں لوگو! دلوں کی مات سے

قومِ ہندی جس گھڑی بھی متحد ہو جائے گی
بڑھ سکے گا نہ کبھی دشمن کوئی اوقات سے

دیکھ کر ہم کو مخالف خوش نہ ہو جائے کہیں
توڑیئے مت پیار کے بندھن ذرا سی بات سے

سالِ نو پھر ساتھ لایا ہے بہاروں کا ہجوم
لطف پھولوں سے اٹھائیں ہم کبھی باغات سے

ذرہ ذرہ کہہ چکا اے دلؔ جنہیں خوش آمدید
شانتی ہندوستاں میں ہے انہی لمحات سے

پیرزادہ سید شفق شاہ چشتی

میرے پیارے وطن

تیری عظمت، تری شان، گنگ و جمن
تجھ پہ قربان، سورج کی پہلی کرن
تیرے ویروں کا کیا کہنا۔ طوفاں شکن!
ساری دنیا پہ روشن ترا بانکپن
میرے پیارے وطن، میرے پیارے وطن

تھے یہیں کرشن، نانک، یہیں تھے کبیر
تھے یہیں چشتی اور میر و غالب، نظیر
اے وطن تیری ہر اک ادا دل پذیر
مسکنِ دلبراں مرکزِ علم و فن
میرے پیارے وطن، میرے پیارے وطن

لہلہاتی ہوئی کھیتیاں جابجا
سرسوں پھولی ہوئی زعفرانی فضا
حسن ہی حسن ہے آئینہ آئینا
ذرّہ ذرّہ ترا ضو فگن ضو فگن
میرے پیارے وطن، میرے پیارے وطن

برف سے جگمگاتے ہوئے کوہسار
گنگناتے ہوئے مرمریں آبشار
دلنشیں دلنشیں پی کہاں کی پکار
فصلِ گل کے مناظر چمن در چمن
میرے پیارے وطن، میرے پیارے وطن

اے شفق! یہ بہاروں کا دل کش سماں
دل کے جذبات لیتے ہیں انگڑائیاں
اہلِ دل ہی سمجھتے ہیں دل کی زباں
باغ کی پتّی پتّی ہے یوں نغمہ زن
میرے پیارے وطن، میرے پیارے وطن

نیاز سلطان پوری
بستی جرولی۔ سلطان پور

نغمۂ وطن

اُتر جانب کوہ ہمالہ جس کی اونچی شان
پورب میں آسام، مزورم، پچھم راجستھان
دکھن میں رامیشور اپنا تیرتھ راج مہان
یہ ہے میرا ہندستان

اسی دیش میں گنگا جمنا امرت جن کا پانی
کاشمیر کی سندر گھاٹی کہتی امر کہانی
تاج محل کی سندرتا پر موہت ہر انسان
یہ ہے میرا ہندستان

شبد کیرتن سے روز و شب گرودواروں کی زینت
پریم اخوت کی گرجا گھر دیتے سب کو دعوت
مندر میں راماین گونجے، مسجد میں قرآن
یہ ہے میرا ہندستان

جلیانوالہ باغ یہیں پر جس کی امر کہانی
جھانسی والی لکشمی بائی خوب لڑی مردانی
ٹیپو اور سراج الدولہ ہوئے یہیں قربان
یہ ہے میرا ہندستان

اسی دیش کی مٹی سے اُبھرے تھے میر و حالی
پدماوت کے ملک محمد بیگم رُوت کے کالی
میرا اور کبیر یہیں کے تلسی اور رسکھان
یہ ہے میرا ہندستان

ناوک حمزہ پوری
ڈاکخانہ شیرگھاٹی
ضلع گیا (بہار)

غیور حسن
میرا بھائی
میرا دوست

۱۸ر نومبر ۱۹۸۷ء کی ڈاک سے عزیزی سید تنویر حسن امروہوی کا ایک کارڈ موصول ہوا۔

محترمی ناوک صاحب! السلام علیکم
آپ کے لیے یہ خبر نہایت افسوس ناک ثابت ہوگی کہ والد محترم جناب سید غیور حسن صاحب کا مورخہ ۱۳ر نومبر ۱۹۸۷ء بروز جمعہ حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ آپ سے دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔ نیز التماس ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح خطوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے جس طرح والد صاحب کی زندگی میں رکھے ہوئے تھے۔
باقی آئندہ۔
والسلام
تنویر حسن۔ امروہہ
۱۴ر نومبر ۱۹۸۷ء

اور اناللہ کہنے کے بعد کئی لمحے خاموش خاموش میری نگاہیں خلا میں کچھ گھورتی رہیں، کھوجتی رہیں اور بالآخر مہرِ سکوت کو اس شعر نے توڑا ؎

آگے آگے کوئی مشعل سی لیے چلتا تھا
ہائے کیا نام تھا اس شخص کا پوچھا بھی نہیں

غیور حسن مرحوم سے میرا کیا رشتہ تھا؟ بظاہر کوئی خونی رشتہ نہیں، لیکن بعض جذباتی رشتے بھی ایسے ہوتے ہیں جو خونی رشتوں کو شرما دیتے ہیں۔ اور گذشتہ ایک دہے سے ایسا ہی کچھ تعلق مرحوم کی ذات سے تھا

ہمارے درمیان تعلقات کی کڑی جوڑنے کا فریضہ انجام دیا تھا مولانا تابش مہدی پرتاپ گڈھی نے۔ انھیں حضرت علامہ شہباز امروہوی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور اس سلسلے میں امروہہ کی آمد و رفت سے سید غیور حسن مرحوم سے بھی بڑے مخلصانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ ۱۹۷۹ء کی جنوری کے اواخر میں غیور صاحب کا ایک خط آیا:

برادر محترم! سلام و نیاز
آپ کے نام سے ایک مدت سے واقف ہوں۔ رسائل و اخبارات میں اکثر آپ کو پڑھتا رہا ہوں اور آپ کے اندازِ نگارش کا مداح ہوں، طرزِ فکر کا بھی۔ کئی مرتبہ جی چاہا کہ آپ سے مراسلت کا سلسلہ قائم کروں لیکن پھر بات آئی گئی ہوتی رہی۔ اب یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ بھائی تابش مہدی صاحب سے آپ کے مشفقانہ و مخلصانہ تعلقات ہیں۔ گاہے ماہے اس ناچیز کو بھی یاد فرماتے رہیں تو ذرہ نوازی ہوگی۔
والسلام
۲۲ر جنوری ۱۹۷۹ء مخلص۔ غیور حسن

یہ تھی ہمارے تعلقات کی شروعات۔ پھر پابندی سے ہمارے درمیان مراسلت کا سلسلہ چلتا رہا۔ بذریعہ خطوط ادبی مباحث ہوتے رہے۔ خیالات و نظریات کا تبادلہ ہوتا رہا، ایک دوسرے کی تصنیفات پر تنقید و تبصرہ چلتا رہا۔ اور یہ تعلق ایک ایسے تعلقِ خاطر میں بدل گیا کہ میرے خط کے بغیر نہ انھیں

بچین' نہ ان کی خیر خیریت جانے بغیر مجھے آرام ۔ افسوس یہ میرا نادیدہ بھائی دُنیا سے رخصت ہوا، ہائے اب مجھے خطوط سے کون نوازے گا؟ سب سے زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اتنی طویل مدّت کے تعلق کے باوجود قطع نظر اس کے کہ ان کی تصنیفات وتالیفات سے استفادہ کیا، حظ اٹھایا، تبادلۂ خیال کیا لیکن غفلت یہ ہوئی کہ ان کے ذاتی حالات سے کما حقہٗ واقفیت حاصل نہ کی اور رہ رہ کر دُہراتا ہوں کہ ؎

ہائے کیا نام تھا اس شخص کا پوچھا بھی نہیں

۱۹۸۰ء میں رئیس رشیدیؔ امروہوی ایک کتاب بنام "عکسِ غیور" مرتب کر رہے تھے۔ یہ کتاب متعدد اہلِ قلم کے ان مضامین و تاثرات تقریظ و مقالات پر مشتمل تھی جو انھوں نے غیور حسن کی ادبی خدمات بالخصوص خاکہ نگاری کے کمالات کے اعتراف کے طور پر لکھے تھے' مجھ سے بھی فرمائش کی گئی اور چھ صفحے کا ایک مختصر سا مضمون لکھنے کی جسارت میں نے بھی کی تھی جو ازراہ ذرّہ نوازی' کتاب میں شامل ہے ۔ اس مضمون کے اخیر میں میں نے لکھا تھا:

"غیور صاحب کب پیدا ہوئے نہ تو میں اس سے واقف
نہ مجھے یہ معلوم کہ وہ کب انتقال فرمائیں گے ـــــ یہ
باتیں دوسرے لوگ لکھیں گے ۔ مجھے تو ان کی زندگی عزیز ہے
ان کا فن پیارا ہے اس لیے ان کی درازیِ عمر کی دُعا پر اپنی
بات ختم کرتا ہوں" [1]

لکھنے کو یہ بات لکھ گیا تھا۔ اب یہ کیا معلوم تھا کہ ان کے سانحۂ انتقال کی خبر باضابطہ مضمون کی شکل میں ادبی دنیا کو مجھ ہی کو دینا ہوگی ۔ اب تک اس انتظار میں تھا کہ ادب کے اس بے لوث خادم کو جس نے بے شمار افسانے' متعدد ناولیں، مذہبی و نیم مذہبی کتب اور تراجم کے علاوہ بے شمار خاکے اور کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ خدا جانے کتنے بڑے بڑے اصحابِ قلم خراجِ عقیدت پیش کریں گے لیکن چاروں طرف ایک سناٹا ہے ۔ دنیا اس قدر محسن کش ہو سکتی ہے' یہ خواب و خیال میں نہ تھا۔ آخر کار اپنی معلومات کی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ قلم اٹھاتا ہوں ۔

غیور حسن کی زندگی میں غیور پر بہتیرے اصحابِ قلم نے لکھا ہے۔ ان میں جناب مجتبیٰ حسین سے لے کر اس ہیچمدان تک کئی چھوٹے بڑے' مبتدی و منتہی شامل ہیں لیکن ان کی تحریروں سے غیور کے فن پر تو کسی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ غیور کی زندگی کے حقائق پر سے پردہ نہیں اٹھتا ۔ غیور نے جہاں دوسروں پر خاکے لکھے وہاں اپنا خاکہ بھی اڑایا ہے' لیکن شاید دیدہ و دانستہ اپنی زندگی کے حالات بیان کرنے سے وہ بھی کترا گئے' گمان ہے کہ وہ بعض ناپسندیدہ حقائق پر پردہ ڈالنا ہی مناسب سمجھتے تھے ۔ غیور کی زندگانی کے شب و روز کی جھلکیاں ان کے خطوط کی روشنی میں کچھ کچھ نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ مشقت طلب کام کون کرے گا؟ غیور کی پوری زندگی ایک المیہ داستان ہے ۔ بقول حکیم کلب علی شاہد:

"غیور کی آپ بیتی میرؔ کی آپ بیتی سے کہیں زیادہ پُر سوز ہے
...... سوچتا ہوں کہ زندگی کیا یوں بھی قتل کی جا سکتی ہے
اور کیا خون میں نہا کر بھی عروسِ زندگی کے چہرے پر گلال ملا
جا سکتا ہے"؛ [2]

سید غیور حسن کی تاریخ پیدائش ۲۵ر اگست ۱۹۲۰ء ہے۔ سید النسب تھے یہ ان کے نام سے ظاہر ہے ۔ امروہہ کی قدیم تاریخی و ادبی بستی کی خاکِ مردم خیز سے آپ کا خمیر اٹھا ۔ یہ وہی امروہہ ہے جہاں علمی و ادبی ہستیوں میں میر سعادت' ساکتؔ ، قویؔ ، قابلؔ ، حیاتؔ ، حزیںؔ وغیرہ کاملینِ فن کا اگر نام نہ بھی لیا جائے تو بھی امروہہ کی نام وری کے لیے صرف ایک مصحفیؔ کا نام نامی کافی ہے.

غیورؔ نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا یعنی ان کی عمر ابھی محض چار برس کی ہوئی تھی کہ ان کی زندگی اس غم ناک حادثے سے دوچار ہوئی جس نے ان کی تمام تر داستانِ حیات کو خون میں ڈبو دیا اور اس کے اثرات سے وہ کبھی پیچھا نہ چھڑا سکے یعنی ان کی والدہ انھیں روتا بلکتا چھوڑ کر راہیِ ملکِ بقا ہوگئیں ۔ یہی سانحہ کیا کم تھا کہ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ ابھی غیورؔ کی والدۂ مرحومہ کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا کہ ان کے والد نے عقدِ ثانی کر لیا اور پھر سوتیلے رشتے کی مکروہ تاریخ کا ہر باب دُہرایا گیا ۔ غالبًا یہی وہ مخصوص وجہ ہے کہ غیورؔ نے اپنی اس دور کی زندگی کے واقعات سے گریز کیا ہے۔ ہر چند کہ غیور کو ان کے دادا نیز چچا کی محبتیں حاصل تھیں لیکن سمندر کے پیاسے کی تشنگی شبنم کے قطروں سے کب بجھتی ہے ۔

حالات کی اس سنگینی اور ناساعدت کی وجہ سے غیور کی ابتدائی تعلیم کا نظم بھی ڈھنگ سے نہ ہو سکا اور انھوں نے لشتم پشتم کسی طرح مڈل پاس کیا ۔ یہ غیور کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں مولانا سلطان احمد مسلم سا فاضل اجل اور

کامل الفن استاد میسر آگیا جس نے تمام تر توجہ و شفقت غیور کی تعلیم و تربیت پر نچھاور کردی اور قلیل عرصہ میں غیور کو منشی اور منشی کامل کے امتحانات کے پُل صراط سے اگلی پچھاڑ کر گزار دیا اور ان امتحانات میں کامیابی کی وجہ سے غیور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مکتب عدل پور تاج میں مدرس مقرر ہو گئے۔ غیور کے لیے یہ بڑا سہارا تھا، مگر غیور نے حد درجہ غیور طبیعت پائی تھی اور وہ نہ اپنی تعلیم کی اس منزل سے مطمئن تھے نہ ذریعہ معاش کے اس پیشہ سے اس لیے انھوں نے محنتِ شاقہ جاری رکھی اور دن بھر کی محنت و مشقت سے چور ہو کر بھی رات کے نو بجے شعیب احمد حزیں کی خدمت میں انگریزی پڑھنے کے لیے جانے لگے اور اپنی کوششوں سے پرائیویٹ طور پر امتحان دے کر انٹرنس پاس کیا۔ اس کامیابی نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور مظفر نگر جاکر انھوں نے معلمی کی تربیت (ٹریننگ) کا کورس بھی پورا کیا۔ اس کے بعد غیور دہرہ دون اسلامیہ ہائی اسکول میں اُردو فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے سانحہ نے تمام ملک کی فضا کو مسموم کر دیا تھا، دہرہ دون اس سے محفوظ کیونکر رہتا۔ لہٰذا جب حالات وہاں بھی دگرگوں نظر آئے تو غیور بھاگم بھاگ امروہہ لوٹ آئے۔ اگست ۱۹۴۷ء سے نومبر ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ غیور کے لیے پھر ابتلا و آزمائش کا زمانہ تھا۔ بالآخر غیور کا تقرر انصار جونیر ہائی اسکول امروہہ میں انگریزی ٹیچر کی حیثیت سے ہو گیا اور دسمبر ۱۹۴۷ء سے انھیں پھر یک گونہ سکون حاصل ہوا۔

۱۹۴۸ء میں میونسپل بورڈ امروہہ میں صیغۂ تعلیم میں اٹینڈنس افسر کی جگہ خالی ہوئی۔ غیور نے قسمت آزمائی کی اور یوں دسمبر ۱۹۴۸ء میں مذکورہ عہدہ پر ان کی تقرری ہو گئی اور اسی عہدے سے ریٹائرمنٹ لی۔

اگست ۱۹۴۹ء میں غیور کے شفیق جدِ امجد کا انتقال ہو گیا اور یوں غیور کے سر سے اس شفیق ہستی کا سایہ بھی اُٹھ گیا، جو گاہے ماہے غیور کی اشک شوئی کے نقطۂ نظر سے باغنیمت تھا۔ اسی سال دسمبر ۱۹۴۹ء میں غیور کی شادی بھی ہوئی اور بایں عالم ہوئی کہ غیور اچھی طرح خود کفیل بھی نہ تھے۔ طرّہ یہ کہ بعد شادی انھیں حالات میں غیور کو اپنا چولھا چوکا بھی الگ کرنا پڑا، مگر غیور اس نہج سے بھی خوش نصیب تھے کہ انھیں شریکِ حیات بہت صابرہ و شاکرہ ملی۔ بقول جناب شاہد:-

"دو سال کی ٹریننگ کی مدت ان کی شریکِ حیات کا کرشمہ ہے۔ غیور کی کرشمہ سازی کا دخل اس میں بہت ہی کم ہے۔ بیوی نے شوہر پرستی کا دو سال تک وہ ثبوت دیا جس کی مثال گرد و پیش میں مشکل سے ملے گی۔ انھوں نے انتہائی تنگ دستی کی بنا پر اپنی صحت بگاڑ لی، لیکن عزتِ نفس کی دولت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی اہلیہ پرورشِ غم کا سلیقہ شاید ان سے زائد ہی رکھتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شریکِ حیات کی سلیقہ مندی نے غیور کو غموں کو انگیز کرنے کا حوصلہ بخشا ہے۔" ۵۳

میں نے ابتدائی سطور میں اعتراف کیا ہے اور پھر اقرار کرتا ہوں کہ غیور نے اپنے حالات، مصائب اور بیماریوں وغیرہ سے متعلق جو کچھ اپنے خطوط میں بیان کیا ہے اس کے سوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بظاہر ان کی زندگی اتنی الم ناک معلوم ہوتی تھی کہ کچھ کرید کر پوچھنے کا یارا مجھے کبھی نہ ہوا۔ محض اس وجہ سے کہ اس سے شاید ان کا دکھ اور زیادہ ہوگا۔ اس طرح ان کی وفات سے کچھ قبل تک مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ماشاءاللہ صاحبِ اولاد ہیں۔

چنانچہ پچھلے اگست میں جب یہ معلوم ہوا کہ بسببِ علالت غیور صاحب اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے سے لے کر لکھنے پڑھنے تک سے معذور ہیں تو میں نے ان کی خیر خیریت سے آگاہی کے لیے آئی۔ ایم کالج امروہہ کے استاد ڈاکٹر امام مرتضیٰ صاحب سے درخواست کی اور ان کے اس جواب نے مجھے یک گونہ حیرت میں ڈال دیا کہ غیور صاحب کے فرزند امروہہ میونسپل بورڈ میں ملازم ہیں۔ مزید تحیّر کے عالم میں غرق کر دیا محبی مولانا تابش مہدی کے اس خط نے :-

محترم بھائی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

۱۳ر نومبر کو میرے شفیق دوست اور استاد، بھائی جناب سید غیور حسن صاحب نے ہمیں داغ مفارقت دے دیا۔

انا للہ الخ

یہ خبر یقیناً آپ کے لیے بھی المناک ثابت ہوگی اس لیے کہ آپ کا بھی ان سے ایک تعلق تھا اور مرحوم بھی آپ سے تعلقِ خاطر رکھتے تھے...... ممکن ہو تو آپ بھی بھائی غیور حسن صاحب کے صاحبزادگان کو ایک تعزیتی خط لکھ دیں،



ہند نژاد امریکی سائنسداں ڈاکٹر ظفر اقبال نے گذشتہ دنوں قیام وطن کے دوران گورنر اترپردیش جناب محمد عثمان عارف سے ملاقات کی۔ تصویر میں (دائیں) وہ گورنر صاحب سے محو گفتگو ہیں۔ ساتھ میں (بائیں سے) آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے سابق اردو پروڈیوسر مسٹر شفاعت علی صدیقی اور اردو تعلیم مشاورتی بورڈ حکومت اترپردیش کے رکن ڈاکٹر سعادت علی صدیقی بھی نظر آ رہے ہیں۔



وزیر اعلا
شری ویر بہادر سنگھ
۲۳ جنوری ۱۹۸۸ء
کو سچیوالیہ (اینکسی
لکھنؤ) میں وسطی
کمان جی۔ او۔ سی
انچیف لیفٹنٹ
جنرل سمیع خاں
سے
محو گفتگو ہیں



وزیر اعلا اتر پردیش
شری ویر بہادر سنگھ
۳۰ر جنوری ۱۹۸۸ء
کو لکھنؤ میں
مہاتما گاندھی کے
یوم شہادت پر اُن کے
مجسمے کی گل پوشی
کر کے انھیں
خراج عقیدت پیش
کرتے ہوئے ۔

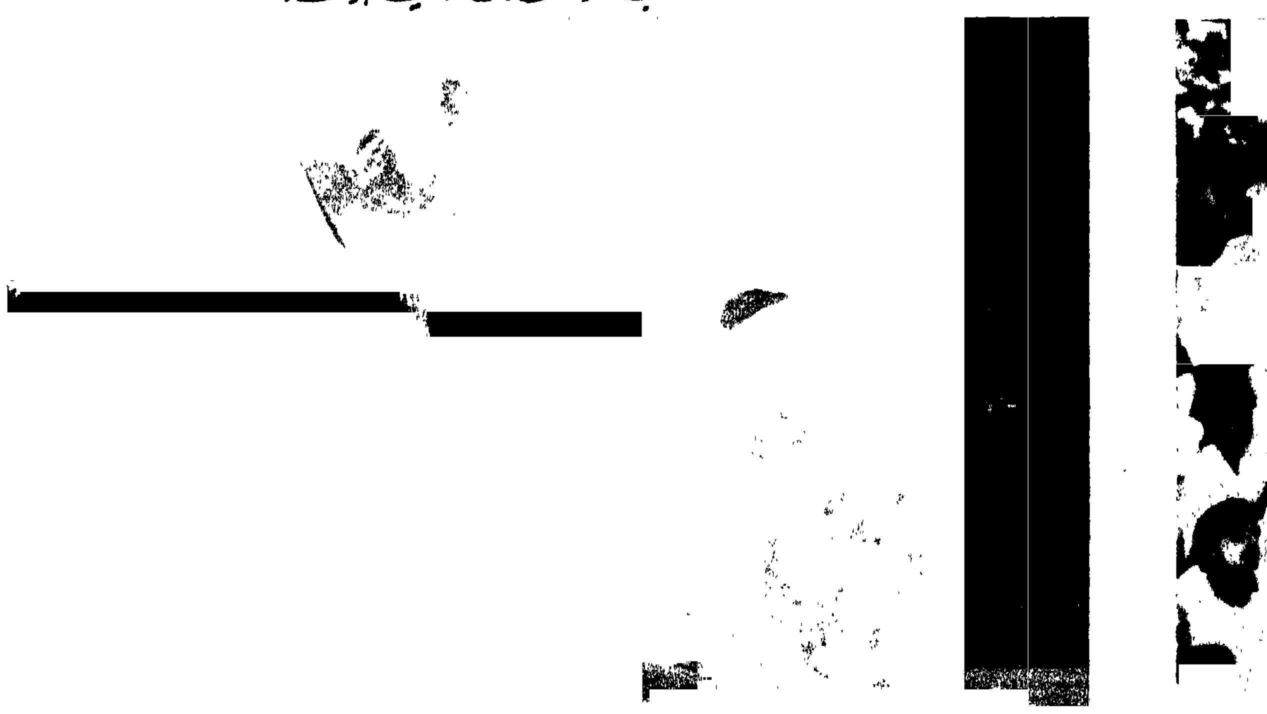
وزیر اعلا
شری ویر بہادر سنگھ
۲۶ر جنوری ۱۹۸۸ء کو
پھول باغ کان پور میں
ایک عظیم الشان جلسۂ عام
کو خطاب
کرتے ہوئے





وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ ۸ر جنوری ۱۹۸۸ء کو دھیان چند ہاکی اسٹیڈیم (لکھنؤ) میں دوسرے اندرا گاندھی بین اقوامی گو
ہاکی ٹورنامنٹ کے موقع پر کھلاڑیوں سے ملاقات کرتے ہوئے۔

وزیر تعلیم شری سبط رضی ۲۹ر جنوری ۱۹۸۸ء کو رو ندرالیہ لکھنؤ میں سٹی مانٹیسری اسکول کی سالانہ تقریبات کے موقع پر اولین مقام حاصل کر
طلبا کو انعامات دیتے ہوئے۔





ست برائے اطلاعات شریمتی دیپاکول ۲۰ جنوری ۱۹۸۰ء کو کرامت حسین مسلم گرلس انٹر کالج (لکھنؤ) میں بزم ادب کی جانب سے منعقدہ پروگرام کے موقع پر طالبات کو انعامات تقسیم کرتے ہوئے۔

ن کی جانب سے لکھنؤ میں ۱۳ دسمبر ۱۹۸۰ء کو منعقدہ شعری نشست کا ایک منظر۔ تصویر میں (بائیں سے) ڈاکٹر سراج ساحل، عبرت صدیقی، عمر انصاری، والی آسی، حفیظ سلمانی، رشید قریشی اور شاہ جہاں بانو یاد نظر آ رہی ہیں۔



ان کے صاحبزادے سید توصیف حسن اور سید تنویر حسن ان کے ساتھ رہتے تھے۔ سید توقیر حسن اور سید توحید حسن الگ تھے۔"

آپ کا بھائی

۲۸/۱۱/۸۶ء تابش مہدی

اگر حضرت غیور حسن مرحوم کی اولادِ حقیقی کا ذکر کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں اس خط کا حوالہ نہ دیتا، اس لیے کہ برادرم غیور نے اپنے آخری چند خطوط میں جس کرب، اذیت، تنہائی اور کس مپرسی کا اظہار کیا ہے ان کے پیشِ نظر چار چار فرزندانِ ارجمند کی موجودگی میرے نزدیک بڑی عبرت ناک ہے۔

غیور حسن مرحوم کے دو خطوط مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۸۷ء اور ۱۸ اگست ۸۷ء کا مختصر اقتباس ان کے آخری ایام کے حالات پر روشنی ڈالنے کو پیش کرتا ہوں:

"آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا لیکن طویل بیماری نے جسم اور ذہن دونوں کو اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آجکل مکمل طور پر قیدِ تنہائی کے روح فرسا احساس سے دوچار ہوں۔ شروع میں تو احباب اور قرابت مند مزاج پرسی کو آتے رہتے تھے اب انھوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ آخر کوئی کب تک دنیا داری نبھاتا۔ ؟ غالب نے کہا تھا:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سب کچھ گھر ہی میں مل گیا۔ اب نہ کوئی ہمسایہ ہے نہ پاسبان، نہ کوئی بھی خواہ ہے نہ ہمراز، اور سامنے یہ منظر کہ ؎

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مجھے احساس ہے کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے لیکن آپ اتنی دور ہیں کہ بس کڑھ ہی سکتے ہیں کر کچھ نہیں سکتے۔ صرف ایک خط و کتابت کا سلسلہ ہے لیکن خط لکھنا بھی میرے لیے کوہ کنی سے کم نہیں۔ آپ کے خطوط سامانِ تسکین ہوتے ہیں۔ کچھ احباب نے تو شاید مجھے جیتے جی مردہ سمجھ لیا ہے۔"

"آپ کا خط مل گیا تھا۔ میں آپ کی محبت کا معترف ہوں اور قدر کرتا ہوں لیکن میرے بھائی اب تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ چند روزہ ہے۔ آج پورا ایک مہینہ ہو گیا لیکن ابھی تک تکلیف سے چھٹکارا نہیں۔ اُٹھنے بیٹھنے کی اجازت تو مل گئی ہے لیکن چل پھر نہیں سکتا۔ چند قدم چلنے سے پھر تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے یہ خط اپنے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں کہ نہ معلوم کون سا خط آخری ہو۔ گو جانتا ہوں کہ آپ کو اسکے پڑھنے میں (بدخطی کی وجہ سے) زحمت ہوگی۔ علاج برابر چل رہا ہے لیکن کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اب تو کسی کی دعا ہی کام کر جائے تو کر جائے اس لیے دعا کیجیے۔ مجھے اپنی زندگی سے تو زیادہ محبت نہیں لیکن کچھ فرائض کی ادائگی کی فکر ضرور ہے ان سے عہدہ برآ ہو جاتا تو کوئی فکر نہ تھی۔ میری طرف سے اطمینان رکھیں جب تک لکھنے کی سکت ہے آپ کو حالات سے مطلع کرتا رہوں گا۔ جب خط پہنچنا بند ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ لکھنے والا اس دنیا میں نہیں ہے۔"

افسوس میرا نادیدہ شفیق بھائی اب دنیا میں نہیں۔ امروہہ سے جن دو حضرات مولانا شہباز امروہوی اور سید غیور حسن کی وجہ سے تعلق تھا وہ ٹوٹ گیا۔ دونوں چل بسے اور ہم مرنے کو زندہ رہ گئے۔ چونکہ اس خاکسار کو تاریخ گوئی سے بھی شغف رہا ہے اس لیے غیور بھائی کی تاریخ کے لیے بھی فکر کی اور داشتہ آید بکار کے لیے یہ تاریخی بیت ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ؎

برائے سال وفاتش چو فکر کردم من
ز غیب گفت کسی "سید غیور حسن"

۱۴۰۸ھ

غیور حسن نے شاعری بھی کی اور نثر بھی لکھی، لیکن اپنی نجی زندگی کے واقعات کی طرح اپنی قلمی کاوشوں کو بھی تہہ در تہہ پردوں میں اس طرح چھپایا کہ انھیں جو شہرت ملنی چاہیے تھی وہ نہ مل سکی۔ یہاں تک کہ لوگ مدت تک غیور حسن کے نام سے بھی ناواقف رہے اور کیونکر واقف ہوتے کہ ایک مدتِ مدید تک کبھی شمیم امروہوی رہے، کبھی اسد جمیل عزیز پوری رہے اور کبھی کیف السلمی رہے۔

غیور نے دوسروں کا خاکہ لکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہمزاد سے بعالم خواب اپنا خاکہ بھی لکھا۔ ان کی تصنیف "حُلیے اور خاکے" کا درج ذیل اقتباس ان کی قلمی کاوشوں کی اجمالی تصویر پیش کرتا ہے :-

"نعتوں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا، میلاد شریف کی ایک کتاب لکھی، سیرت پاک پر ایک رسالہ تالیف کیا۔ یہ تینوں کتابیں گپتا برادرس دہلی نے شائع کیں۔ تیس علمی، ادبی اور اصلاحی مضامین لکھے جن میں سے تین شائع ہوئے باقی مضامین دو ضخیم کاپیوں پر پھیلے ہوئے تھے اور یہ دونوں کاپیاں ایک رسالہ کے دفتر میں رکھی ہوئی تھیں کہ وہاں سے چُرالی گئیں۔ اس طرح میری دو سال کی محنت خاک میں مل گئی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ مضامین چھپیں گے .... شاید میری موت کے بعد کسی دوسرے کے نام سے۔ دو رپورتاژ بھی لکھے جو "نرالی دنیا" دہلی اور "نئی نسلیں" دہلی میں شائع ہوئے — افسانے کتنے لکھے مجھے یاد نہیں لیکن وہ سب مختلف رسائل میں شائع ہوئے کچھ غیور حسن کے نام سے، کچھ اسد جمیل عزیز پوری کے نام سے، کچھ شمیم امروہوی کے نام سے اور کچھ کیف المسلمی کے نام سے، یہ چاروں میرے قلمی نام تھے۔ ان کے علاوہ اٹھائیس جاسوسی ناول لکھے یہ ناول گپتا برادرس کھاری باؤلی دہلی نے ماہنامہ جاسوس میں مختلف ناموں سے شائع کیے۔ ناموں سے مجھے غرض بھی نہ تھی مجھے روپے چاہیے تھے اور وہ مجھے ہر ماہ مل جاتے تھے۔" ۵۴

بقول حکیم کلب علی شاہد، غیور نے اپنی قلمی کاوشوں کا باضابطہ آغاز ۱۹۴۳ء میں مضمون نویسی سے کیا۔ تصانیف کی مذکورہ تفصیلات کے علاوہ ۱۹۵۵ء میں غیور نے قرآن مجید کے اولین دس پاروں کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا تھا اور بقول خود انھوں نے ایک رومانی ناول بھی لکھا :-

"میں نے ایک رومانی ناول بھی لکھا تھا۔ ناول مختصر تھا اور میری زندگی کا آئینہ دار رہی نہیں، میرے فن کا حاصل بھی۔ یہ ناول بھی ایک دوسرے شخص کے نام سے شائع ہوا۔ مگر میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ میں نے اس سے رازداری کی قیمت وصول کر لی تھی۔" ۵۵

ظاہر ہے کہ اگر اس ناول کا نام اور اس کے فرضی مصنف کا نام معلوم ہو جائے تو غیور کی کہانی غیور کی زبانی بہ آسانی معلوم ہو جائے۔ لیکن تحقیق کی یہ زحمت کون اُٹھائے گا؟

مذکورہ بالا ادبی و نیم ادبی کاوشیں ہی غیور کو زندہ رکھنے کو کافی تھیں لیکن حق یہ ہے کہ ان کی تخلیق غیور کے حالات کی مجبوری تھی اور انھیں غیور کا فن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ادبی دنیا میں غیور کی ناموری کا سبب ان کی خاکہ نگاری ہے جسے انھوں نے بہت تاخیر سے اپنایا مگر اس طرح اپنایا کہ بس اسی کے ہو کر رہ گئے۔ غیور اپنے اندر کے چھپے ہوئے خاکہ نگار کو خود نہیں پہچانتے تھے اس نے اپنی شناخت خود کرائی۔ ہوا یہ کہ غیور نے اپنے اُستاد محترم علامہ شہباز امروہوی پر ایک مضمون لکھا اور اسے ایک ادبی نشست میں سُنایا۔ اتفاق سے مولانا مرحوم کا یہ خاکہ بہت پسند کیا گیا اور ہر طرف سے داد و تحسین کے شور نے غیور کے اندر سوئے ہوئے خاکہ نگار کو بیدار کر دیا اور غیور اس کے بعد پے در پے امروہہ کی چھوٹی بڑی، ادبی، سماجی، سیاسی شخصیتوں کے خاکے لکھتے گئے اور یہ تمام خاکے مقبول ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ملک کے مقبول خاکہ نگار جناب مجتبیٰ حسین معترف ہیں کہ غیور نے ان کا خاکہ اس وقت لکھا جب انھوں نے مجتبیٰ صاحب کو دیکھا تک نہ تھا اور یہ خاکہ مجتبیٰ صاحب کو جب سنایا تو ان کا تاثر غیور کی خاکہ نگاری کے تعلق سے عرفی کے اس شعر کے مصداق تھا ؎

چناں رقصید عرفی بر در بُت خانہ کز حسرت
برہمن گفت کایں کافر چہ استادانہ می رقصد

اُردو کی قدیم تاریخ، تذکروں، مثنویوں، سوانح عمریوں میں کہیں کہیں خاکہ نگاری کے اجزائے ترکیبی کی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں اور پہلی بار یہ جھلکیاں زیادہ واضح انداز میں مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ حضرت علامہ شبلی سیرت نگاری میں یوں اُلجھے کہ خاکہ نگاری کی طرف کما حقہٗ توجہ نہ کر سکے لیکن یہ جھلک ان کی تصانیف میں بھی ملتی ہے۔ حالی کی حیات جاوید اور ناصر علی کے انشائیوں میں بھی ان کے اندر کا چھپا ہوا خاکہ نگار کبھی کبھار سر اُبھارتا

نظر آتا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اس فن کو اس کے تمام تر لوازمات کے ساتھ اُردو ادب میں پہلی بار لاکھڑا کیا۔

خاکہ نگاری کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ خاکہ نگار کے ذہن میں کوئی خاص متعین شخصیت نہیں ہوتی، یا ہوتی بھی ہے تو اپنے عمومی کردار کی وجہ سے علامتی (TYPE) بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد کے ابن الوقت، سرشار کے خوجی، امتیاز علی تاج کے چچا چھکّن، فرحت کے مرزا پھویا، شوکت تھانوی کے مرزا۔ رشید احمد صدیقی کے پاسبان، لیل اور انجم مان پوری کے میر کلّو خواہ ان کے اپنے زمانے میں کوئی حقیقی کردار بھی رہے ہوں لیکن اپنے عمومی کردار کی وجہ سے وہ آج بھی ہمارے گرد و گرد نظر آتے رہتے ہیں۔

دوسری طرح کی خاکہ نگاری مخصوص و متعین شخصیتوں کی خاکہ نگاری ہے، اور اس کی زد پر ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے سماج میں مرکز توجہ بن گئی ہوں۔ ایسی شخصیتوں پر قلم اٹھانا مشکل تر اس لیے ہے کہ ایسے لوگوں سے گوناگوں تعلقات خاکہ نگار کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ محبت، نفرت، عقیدت، احترام، رشک، حسد، رواداری، جانب داری اور خود متعلقہ شخصیت کی علمی، مذہبی، سماجی اور سیاسی پوزیشن بھی قلم کی روانی کو سست یا تیز کرنے کا موجب بن سکتی ہیں۔

غیور حسن نے خاکہ نگاری کی یہی مشکل ترین راہ اپنے لیے منتخب کی، اور فن کارانہ دیانت داری کا ایسا مظاہرہ کیا کہ بڑے چھوٹے اکثر صاحب الرائے صاحب الرائے ان کے فن کے معترف ہوئے۔ چنانچہ جناب مجتبیٰ حسین صاحب رقمطراز ہیں:۔

> "ہمارے یہاں خاکہ نگاری کے دو طریقے مروج ہیں ایک طریقے میں اچھے خاصے انسان کا بُت بنایا جاتا ہے اور دوسرے میں بُت کو توڑ کر انسان کو برآمد کیا جاتا ہے۔ غیور صاحب بُت گری اور بُت شکنی کے چکر میں نہیں پڑتے وہ سیدھے سادے انداز میں کسی شخصیت کے پرتو دکھاتے چلے جاتے ہیں (اس عمل میں کسی کا بُت بنے یا ٹوٹے اس سے انھیں کوئی مطلب نہیں .... خاکہ نگاری کا یہ دیانت دارانہ طریقہ بہت دقت طلب ہے۔ اس میں وہ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے اور ایک دیانتدار خاکہ نگار کی طرح شخصیت کے اچھے بُرے دونوں پہلو دکھا دیتے ہیں۔" ۳۵

غیور نے چھوٹے بڑے متعدد خاکے لکھے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا، زیادہ تر امروہہ کی مذہبی، علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیتوں کو مرکز توجہ بنایا۔ ان میں سے قریباً ڈیڑھ درجن لوگوں کے خاکے کتابی شکل میں ۱۹۸۰ء میں بنام "ح خ" (حلیے اور خاکے) شائع ہوئے۔ "آئینہ خانہ" کے نام سے اُن کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ مرتب تھا جو تاہم تحریر شائع نہ ہو سکا۔ ان کے خطوط شاہد ہیں کہ تیسرا مجموعہ "تنگڑا" کے نام سے بھی وہ طبع کرانا چاہتے تھے۔ شاید یہ فریضہ ان کے فرزندانِ ذیشان ادا کر سکیں۔ نہ بھی کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ جس طرح اُردو ادب میں مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر"، رشید احمد صدیقی کی "ہم نفسانِ رفتہ"، شوکت تھانوی کی "شیش محل"، مولانا عبدالماجد دریا بادی کی "معاصرین" اور خواجہ احمد فاروقی کی "یادِ یار" زندہ و پائندہ ہیں، اسی طرح غیور کی "ح خ" بھی زندہ رہنے والی تصنیف ہے۔ بلکہ غیور نے اوّل اوّل صرف امروہوی شخصیتوں پر قلم اٹھا کر نہ صرف متعلقہ اشخاص کو زندگیٔ دوام عطا کی بلکہ ضمناً امروہہ کے علم و ادب، تہذیب و ثقافت کی ترجمانی کر کے اسے بھی زندگیٔ جاوداں بخش دی ہے۔

آخر میں چند سطور میں جی چاہتا ہے کہ غیور کے قلم کی شگفتگی کے بھی چند نمونے پیش کر دوں تاکہ نفس مضمون کے پیش نظر قارئین کے ذہن میں اگر اضمحلالی کیفیت پیدا ہوئی ہو تو اس کا ازالہ ہو سکے۔

غیور کی قوتِ مشاہدہ کی دلیل یہ ہے کہ داڑھیاں آپ نے بھی بہت دیکھی ہوں گی، میں نے بھی بہت دیکھی ہیں۔ مولوی کی داڑھی، سادھوؤں کی داڑھی، سیاسی بازی گروں کی داڑھی، ٹیگور کی داڑھی، سر سید کی داڑھی، بلگانن کی داڑھی، ہوچی منہ کی داڑھی، ونوبا بھاوے کی داڑھی، چندر شیکھر کی داڑھی اور یہ کہ راج نرائن کی داڑھی مگر ہوتا یہ رہا ہے کہ داڑھی دیکھ لی سو دیکھ لی مگر حضرت غیور نے داڑھی کا مشاہدہ کتنے عمق کے ساتھ کیا ہے ملاحظہ فرمایئے۔ علامہ شہباز کی داڑھی کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> "آپ نے داڑھی اس التزام کے ساتھ رکھی کہ وہ کسی مسلک، فرقے یا عقیدے کا ٹریڈ مارک معلوم نہ ہو، بس ایک عام سی داڑھی۔ نہ بریلویوں کی طرح لمبوتری، نہ دیوبندیوں

کی طرح مدور، نہ جماعت اسلامی والوں کی طرح مختصر، اور نہ
ناظر خیامی کی طرح شاعرانہ۔"

ایک بار ہوا یہ کہ جناب شوق امروہوی نے پاکستان سے غیور کے پاس خط لکھا جس میں حکیم صیانت اللہ، حکیم کلب علی اور یہاں تک کہ خود اپنی بیوی تک کی شکایت لکھی کہ یہ لوگ انھیں خطوط نہیں لکھتے۔ غیور نے جواباً گلفشانی کی۔۔۔۔۔

"حکیم صیانت اللہ صاحب طبیب کم "سیاسی" زیادہ ہیں۔ ظاہر ہے سیاسی لوگ بولا کرتے ہیں لکھا نہیں کرتے۔ جہاں تک حکیم کلب علی صاحب کا تعلق ہے وہ کسی مریض کو نسخہ تک لکھ کر نہیں دیتے، خط کیا لکھیں گے۔ اب رہ جاتی ہیں آپ کی بیوی تو حاشا للہ انھیں میں نے نہیں بہکایا۔"

سید سخی حسن نقوی کے خاکے میں رقمطراز ہیں:۔

"ان کا ہاتھ رخسار پر تھا۔ چہرے سے شدید تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا، کیوں؟ کیا بات ہے؟ کیا رخسار میں کچھ تکلیف ہے۔ انھوں نے بڑی کمزور آواز میں جواب دیا "میری وزڈم ٹوتھ اکھڑ گئی ہے۔ بہت تکلیف ہے" میں نے برجستہ کہا۔ "اوہ! بڑا افسوس ہے۔ پہلے ہی کون سی زیادہ تھی جو اب باقی رہ گئی ہوگی۔"

حکیم مسعود علی صدیقی کے خاکے میں لکھتے ہیں:۔

"وہ ٹوپی کبھی نہیں اوڑھتے۔ شاید یہ عمل حفظ ما تقدم کے طور پر ہے۔ کیونکہ سیاسی آدمی کی ٹوپی کبھی بھی اتر سکتی ہے۔"

انھیں کے بارے میں یہ اقتباس بھی کم دلچسپ نہیں:۔

"انجام کار کچھ نہ بن سکے صرف حکیم جی بن کر رہ گئے۔ حکیم بھی اس لیے نہیں کہ انھوں نے طب بطور فن سیکھی ہے بلکہ ان کے والد مرحوم ایک طبیب تھے۔ انھوں نے پسماندگان کے لیے جہاں دو مکان چھوڑے ہیں ایک ٹائٹل بھی چھوڑا ہے اور وہ ہے حکیم جی۔ یہ ٹائٹل ان کے نام کے ساتھ اس طرح چپک گیا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ لوگ صرف حکیم جی کہیں نام نہ لیں، لیکن نام لیں اور حکیم جی نہ کہیں یہ ہرگز ممکن نہیں۔ چنانچہ غیر تو غیر ان کے بیوی بچے بھی انھیں حکیم جی کہہ کر پکارتے ہیں۔"

احمد حسین سیفی کی شاعری پر اظہار خیال اس انداز میں کرتے ہیں:

"رہا بعض معترضین کا یہ اعتراض کہ سیفی صاحب کا روایتی انداز عصر جدید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، تو مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ عصری تقاضے آخر ہیں کیا؟ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ پکاسو اور روڈن کا آرٹ الورا اور اجنتا سے عظیم ہے یا اقبال اور غالب کی شاعری محمد علوی اور ندا فاضلی سے گھٹیا ہے۔ یا پھر گورنمنٹ ہاؤس کا فن تعمیر تاج محل سے زیادہ حسین ہے۔"

افسر حسن بیگ افسر کے خاکے میں "شعر" پر خامہ فرسائی یوں کرتے ہیں:

"اب شعر موزونیت سے نہیں ترنم سے پہچانا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں نظم و نثر، نثر و نظم بن کر تو من شدی من تو شدم کے درجہ تک پہنچ چکی ہے۔"

اور سرفراز عثمانی سے متعلق لکھتے ہیں:۔

"وہ سگریٹ بہت پیتا ہے لیکن اس کے پسندیدہ برانڈ کا نام آج تک کسی کو نہیں معلوم، کیونکہ اس کے قریب ترین دوستوں نے بھی کبھی اس کو سگریٹ خریدتے نہیں دیکھا۔"

غالب نے فرمایا تھا ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اور کشاکش حیات سے رہائی حاصل کر کے غیور نے بند غم سے بھی بالآخر نجات پالی ؎

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مہدی پرتاپ گڈھی
معرفت ایگزیکیٹو انجینیر
اریگیشن ڈویژن
پرتاپ گڑھ

اُتر پردیش

تاج کا جلوہ گہ ناز ہے اتر پردیش
ہاں لبِ گنگ کا اعجاز ہے اتر پردیش

اس کی آغوش میں تہذیبوں نے جینا سیکھا
مے اخلاص یہیں لوگوں نے پینا سیکھا

کرشن کی دھرتی ہے یہ، ہونٹوں پہ اسکے گیتا
اس کے آنگن میں کبھی رام نے تھا جنم لیا

یہی دھرتی جو ہوئی گنگ و جمن سے سیراب
بطن سے اس کے نکلنے لگے نجم و مہتاب

اس کی مٹی سے ہوئے لال و جواہر پیدا
کیا اس دھرتی نے آزاد سا رہبر پیدا

اس کی ندیوں کے تقدس کی قسم کھاتے ہیں لوگ
اس کے سنگم پہ گنہ دھونے چلے آتے ہیں لوگ

دیش ہے جسم تو سَر اس کا ہے اتر پردیش
ہاتھ اگر ملک، ہنر اس کا ہے اتر پردیش

جنگ آزادی کے شعلے اسی دھرتی سے اُٹھے
ایک آہنگ پہ جاں دینے جیالے نکلے

یہیں تعمیر و ترقی کے ہوئے ہیں اعجاز
ہوئے کتنے ہی ہنرور بھی یہیں سرافراز

چار چاند اور لگایا نئے منصوبوں نے
پائی ہے ایک نئی زندگی دیہاتوں نے

آیا ٹھکرائے ہوئے طبقوں کو جینے کا شعور
حسنِ تعلیم نے پھیلایا ہے جھونپڑیوں میں نور

زندگی اب نہ مقید رہی ایوانوں میں
ہوگئی رقص کناں کھیتوں میں کھلیانوں میں

وہ زمینیں کہ جو بنجر تھیں ہوئی ہیں شاداب
جانفشانی نے کھلا رکھے ہیں بیہڑ میں گلاب

اس کی تقدیس پہ ہے صبحِ بنارس صدقے
اہلِ دل بھولے نہیں شامِ اودھ کے قصے

ڈاکٹر محبوب راہی

غزل

کبھی کسی پہ کوئی انکشاف مت کیجے
گناہ کیجے مگر اعتراف مت کیجے

رہی نہ یہ بھی تو پھر کیا رہے گا اپنے پاس
دلوں سے اپنے کدورت کو صاف مت کیجے

ہمارا جرم وفا ہے، گناہگار ہیں ہم
گناہگاروں کو ہرگز معاف مت کیجے

دیار اور بھی تکمیلِ شوقِ دید کو ہیں
بس اک اسی کی گلی کا طواف مت کیجے

زمانے بھر سے بغاوت بجا، مگر سنیے
خود اپنی ذات سے تو انحراف مت کیجے

خیال و فکر پہ یہ بندشیں معاذ اللہ
کہ بات بات میں یوں شین قاف مت کیجے

کچھ اکتساب غنیمت ہے میر و غالب سے
مگر ہمیشہ انھیں کا طواف مت کیجے

جو چاہے کیجے دنیائے فکر و فن میں مگر
مزاجِ نقد و نظر کے خلاف مت کیجے

وہی کہ حاشیہ بردار آپ کے جو ہیں
وہ چاہے جو بھی کہیں اختلاف مت کیجے

ہر ایک بات میں الجھاؤ ہو ضرور کوئی
کوئی سی بات ہی صاف صاف مت کیجے

خیال کوئی ہو کیجے رقم مگر راہیؔ
اصولِ شعر کے ہرگز خلاف مت کیجے

ڈاکٹر کیف رضوی

غزل

تجھ کو ہر سانس پر سلام کیا
زندگی تیرا احترام کیا

یہ بہاروں کو بھی نہیں معلوم
بوئے گل نے کہاں قیام کیا

عکس ہر چند کوئی ابھرا نہیں
پھر بھی آئینے کو سلام کیا

جن کے پیکر میں روشنی ہی نہیں
ان چراغوں کو میرے نام کیا

لفظ جب گفتگو میں ڈھل نہ سکے
خامشی نے بہت کلام کیا

پانی کی فطرتیں بھی کیا کہیے
رنگوں کو بھی اسیرِ دام کیا

نقش حیرت ہیں منزلیں اے کیفؔ
ہم نے راہوں کو تیز گام کیا

ایم اے قدیر

ڈی۔ ۹۰۹ کریلی کالونی
الہ آباد

غزل

تجھ کو معلوم ہے انجام ہے فانی تیرا
رنگ ڈھل جائے گا اک روز جوانی تیرا

اے ندی عارضی سیلاب پہ اِترا نہ بہت
تیرے چہرے سے اُتر جائے گا پانی تیرا

پیکرِ حُسن پہ کھلتا ہے بہت رنگِ تضاد
ہونٹ ہیں سُرخ ترے جسم ہے دھانی تیرا

کبھی ٹھہرے ہوئے پانی میں نظر دوڑانا
دیکھنے کو تجھے مل جائے گا ثانی تیرا

جس کا ادراک فرشتوں سے بھی مستور رہا
منکشف مجھ پہ ہوا رازِ نہانی تیرا

یہ سند تجھ سے تعلق کی بھلا کیا کم ہے
یاد ہے مجھ کو ہر اک قول زبانی تیرا

مان جا ورنہ کہیں کا نہیں چھوڑے گا قدیرؔ
ہر گھڑی مشغلۂ شوخ بیانی تیرا

افسانہ

نیاز قومی (ملیگ)

تماشہ درپن کا !

نگار خانے سے نکلی تو گلاب کی کیاری میں اُلجھ گئی۔ آنگن میں لگے گلاب کے پودے کی مٹ میلی پُرانی شاخ پر اس کی عمر کی کھُردری لکیریں اُبھر آئی تھیں لیکن اس کی کوکھ سے نکلی سُرخی مائل کونپل اپنی بہار پر تھی جس کے ایک سرے پر مخملی پتیوں کے بیچ ایک نازک کلی بھی پھوٹ نکلی تھی۔

کبھی مجھ پر بھی گلاب کی اسی کونپل کی طرح بہار آئی تھی۔

میں تیرھویں سال میں قدم رکھنے والی تھی کہ میری ماں بیمار پڑ گئی اور بستر سے ایسے لگی کہ پھر اُٹھنے کا نام ہی نہ لیا۔ دن رات ماں کی تیمار داری میں لگے لگے میں اپنے آپ کو ہی بھُول گئی تھی۔ مجھے یہ خبر بھی نہ لگ پائی کہ بچپن نے کب اور کہاں میرا ساتھ چھوڑ دیا۔

اچانک بدن میں کمان کی طرح تناؤ محسوس کرنے لگی اور میری گداز پنڈلیوں میں میٹھا میٹھا درد شروع ہو گیا۔ سر کے بال بھی اُلجھے اُلجھے تھے۔ اسی حال میں ماں کے پاس ان کے بستر پر بیٹھی تھی۔

" رات دن میرے کارن تھک کر چور ہو جاتی ہے میری بیٹی "!

ماں نے پیار سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

" تیرا سر میلا ہے بیٹی ۔۔ فرصت مل جائے تو اچھی طرح نہا لینا "

آخر کار فارغ ہو کر میں نے جی بھر کے غسل کیا تو مجھے ایک انوکھی تازگی کا احساس ہوا۔

جھیل کے پانی میں بھیگے ہوئے کنول کی طرح۔

اپنے بھیگے ہوئے بدن کو باریک چادر میں لپیٹے غسل خانے سے ملحق کمرے میں کھڑی بالوں کا پانی جھٹک رہی تھی کہ اچانک میری نگاہ قد آدم آئینے پر پڑی ۔۔۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے گھور رہا تھا۔

مجھے لگا جیسے سچ مچ کوئی کنول کھلا ہو آئینے میں۔

شرما کر میں نے آئینے سے آنکھیں پھیر لیں اور لپک کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں اپنے دل میں اندر ہی اندر اِتر رہی تھی۔

کون جانے یہ میرے دل کی آواز تھی یا واقعی آئینہ ہی بول اُٹھا۔

" ذرا میرے قریب آؤ۔"

میں دبے پاؤں آئینے کے پاس گئی۔ میرا قیامت خیز پیکر دیکھ کر آئینہ دم بخود تھا، اور زبانِ حال سے گویا کہہ رہا تھا:

" اس انمول خزانے کو سنبھال کر رکھنا۔"

شیشے میں ڈھلا ہوا مرمریں سڈول بدن اور گورے گالوں پر جھلکتی گلاب کی سرخی۔ !

آبدار موتی جیسے دمکتے مکھڑے پر نرگسی آنکھوں میں سموئی ہوئی حیا کی جھیل۔!

گیلے بالوں کے چھپکے سے بھیگتی چادر کی سلوٹوں کے درمیان کسے ہوئے شباب کے انگارے۔!

میں نے شرما کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے تن بدن میں سما گئی۔

جلدی جلدی کپڑے بدل کر دوپٹہ سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر آئی تو ماں بولی:۔

"کہاں کھوئی ہوئی تھی بیٹی! کب سے آواز دے رہی ہوں تجھے۔"

"غسل خانے میں تھی ماں۔ سر دھو کر بال سکھا رہی تھی ۔۔۔"

میں نے کہا۔

—— اور میں نے دیکھا کہ ماں کے ہونٹوں پر ایک نحیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے نقاہت بھری آواز میں کہا:

"نظر نہ لگے"

اور شرما کر میں نے دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

ماں کی حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی اور میرا انگ انگ مجھ پر بوجھ ہوتا جا رہا تھا۔ ماں کی دیکھ بھال میں مجھے بناؤ سنگار کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ کبھی آتے جاتے آئینہ مجھے ایک لمحہ کے لیے روک لیتا تو اس سے منہ موڑ کر گزر جاتی۔

ایک دن تو اس نے میرے ڈوپٹے کا کونہ ہی تھام لیا۔ میں اسے چھڑانے لگی تو مسکراتے ہوئے آئینے کو کہتے سُنا۔

"اب تو بن بادل برسات ہو رہی تم پر! چڑھتی ہوئی ندی پر جیسے ہر روز ایک ساون برس جاتا ہو۔"

اور میں اپنے آپ میں ڈوب گئی۔

اسی وقت میں نے سنا کر ماں میرے باپ سے کہہ رہی تھی:

"ان پڑھ ہے تو کیا ہوا، چاند جیسی میری بیٹی ہے۔ سورج جیسا دولہا ڈھونڈھنا اس کے لیے۔"

ماں کی حسرت بھی پوری نہ ہوئی اور وہ چل بسی۔

کچھ دن بعد میری شادی کی بہار آ ہی گئی۔ 'چاند کے ٹکڑے' کو 'سورج کی تھالی' میں سجانے کی بہار۔

ہاتھوں میں مہندی رچانے سے لے کر میرے شباب پر اس کا رنگ چڑھنے تک!

چہل پہل۔ ہنسی قہقہوں —— اور شور شرابے سے بے خبر اپنے گھونگھٹ میں آنکھیں جھکائے میں کہیں آسمان پر اڑ رہی تھی۔ ماں کا آنگن چھوڑ کر اپنی نئی زندگی کی دہلیز پر اپنے دل کی دھڑکنوں سے دستک دیتی ہوئی سسرال کی ڈیوڑھی میں آگئی۔

جب میرے دل کی دھڑکنوں کو سہارا ملا تو میری آنکھ لگ گئی۔

آنکھ کھلی تو سیج باسی ہو چکی تھی۔ پھولوں کی لڑیاں جگہ جگہ سے مسل کر ٹوٹ گئی تھیں۔

—— جیسے میرا بدن ٹوٹ رہا تھا۔

اپنے آپ کو اکیلا پا کر میں نے انگڑائی لی۔ پھر یکایک شرما گئی۔ میں اکیلی نہیں تھی۔ ایک آئینہ یہاں بھی تھا۔ اس کی شریر نگاہوں سے مجھے حجاب آگیا۔

—— اس آئینہ نے بھی مجھ پر نگاہیں جما رکھی تھیں۔

"تمہارے اُلجھے ہوئے بالوں کی لٹ ماتھے پر بکھر رہی ہے۔"

"جوڑے کے پھول کی پنی تو بستر پر ہی پڑی رہ گئی۔"

"تمہاری آنکھ کا کاجل پھیل گیا ہے اور ہونٹوں کی لالی کہیں کہیں سے اُچٹ گئی ہے۔"

"گلے میں چمپاکلی کی لڑیاں آپس میں ابھی تک الجھی پڑی ہیں۔"

—— اور اس طرح ٹوک ٹوک کر آئینے نے میرا بکھرا ہوا سنگار پھر سے درست کرا دیا۔

چاند اور سورج ایک دوسرے کو گلے لگاتے رہے اور آہستہ آہستہ حجاب اُٹھتا رہا۔ جیسے جیسے میری مہندی کا رنگ پھیکا پڑتا رہا —— ہم دونوں کے درمیان بے تکلفی بڑھتی گئی۔ ایک دن ہمت کر کے دل کی بات زبان پر لے ہی آئی۔

"تم تو بہت پڑھے لکھے ہو اور میں ان پڑھ ...!"

میں اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ انھوں نے مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔

"چاند کی کرن پر گلاب کی پنکھڑی سے لکھی کتاب کو پڑھاتا کون۔؟ پڑھنے والوں کے بھی ہوش اُڑ گئے ہوتے۔"

ان کی زبان سے اتنا سُن کر میرے سینے میں ہزاروں پھول کھل گئے اور میرے دل کا کانٹا نکل گیا۔

ایک دن وہ کمرے میں اکیلے بیٹھے کاغذوں میں کھوئے ہوئے تھے میں چائے لے کر اچانک پہنچ گئی تو وہ چونک پڑے اور جلدی جلدی کاغذوں کو ایک طرف سمیٹنے لگے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"میری سہیلی کہتی تھی کہ تم بہت اچھی کہانیاں لکھتے ہو۔"

چائے کی پیالی میں شکر گھولتے ہوئے میں نے شرما کر پوچھا۔
"بس لکھتا رہتا ہوں۔ کیا اچھی کیا بُری "۔ انھوں نے مسکرا کر کہا۔
"مجھے بھی کوئی اپنی کہانی سناؤ"۔ میں نے کہا۔
"میرے قریب آکر بیٹھو۔ کچھ ہنسو بولو۔ کہانی سُن کر کیا کرو گی ــــ؟
تمھیں اچھی نہ لگی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا"۔

میرے ماتھے سے زلفوں کی لٹ کو ٹالتے ہوئے وہ میری بات بھی ٹال گئے۔ مجھے اندر ہی اندر کچھ عجیب سا لگنے لگا۔

ایک بار تو میں مچل ہی گئی اُن کی کہانی سننے کے لیے۔ پھر انھوں نے میرا سر اپنی آغوش میں لے کر بڑے چاؤ سے ایک کہانی پڑھنا شروع کی کہانی ختم ہونے سے پہلے ہی میرے چہرے کا رنگ اُترنے لگا میں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے مجھے اور بھی جکڑ لیا۔
میں بے جان سی پڑی رہی اور کہانی نہ جانے کہاں ختم ہو گئی۔

"کون تھی یہ مہ لقا؟" میں نے تلملا کر پوچھا ــــ" ریل کے ڈبے میں ملی اور ایسا جادو کیا کہ تم اس کے کوٹھے تک پہنچ گئے ــــ اتنا لگاؤ ــــ ایک بازاری عورت سے ــــ کیا یہی کہانی تھی میرے نصیب میں۔؟"

میں آگ اُگلتی رہی اور وہ مُسکراتے رہے۔

"کتنی بھولی ہو تم۔ منھ چُوم لینے کو جی چاہتا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہونٹ بڑھائے ہی تھے کہ میں نے ہتھیلی سے اپنا منھ چھپالیا۔
وہ بولے "افسانے حقیقت نہیں ہوتے میری جان۔ سماج کو صرف ایک پیغام دیتے ہیں"۔

لیکن ان کی یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی اور میرے دل میں ایک وہم سا بیٹھ گیا۔ میں اُداس اُداس سی رہنے لگی۔

میری مہندی کا رنگ اُتر چکا تھا۔ زندگی سیج اور سنگار سے ہٹ کر چولھے چکی سے قریب ہو چلی تھی۔
ایک دن میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ دل بہت اُداس تھا ــــ آئینے پر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔
"یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔؟ کنگھی نہ چوٹی، نہ وہ بناؤ سنگار،
نہ آنکھوں میں چمک نہ چہرے پر دمک!

ــــ ایک چھوٹی سی کہانی نے بے حال کر دیا! زندگی کی اتنی لمبی داستان کیسے جھیلو گی۔؟"

آئینے سے اُبھرا ہوا یہ سوال جیسے میرے دل میں اتر گیا۔ جیسے تیسے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دھیرے دھیرے دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگی۔
وہ دفتر چلے جاتے تو میں اکیلے گھر میں رہتی۔ اپنے بناؤ سنگار سے زیادہ اب میں گھر کو سجانے سنوارنے میں لگی رہتی۔ شام کو وہ آتے تو ہم لوگ تھوڑا بہت ہنس بول لیتے۔
اور صبح شام کی یہ آنکھ مچولی زندگی کا غم غلط کرتی رہی۔

ماگھ پوس کے جاڑے کی رات تھی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ دفتر سے واپسی پر چائے پینے کے بعد سے ہی وہ خاموش تھے۔ کھانے پر بھی وہ بے دلی سے بیٹھے اور جلدی اٹھ گئے۔ میں بستر میں لیٹی، خاموشی ٹوٹنے کا انتظار کرتی رہی اور وہ میز پر بیٹھے قلم اور کاغذوں کی دنیا میں گم کسی کہانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ بتی جل رہی تھی اور میں کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔ ان کو کچھ بھی ترس نہ آیا تو آخر کار میں نے ہی خاموشی توڑی۔

"بتی بجھا دوں؟"

"میں لکھ رہا ہوں"۔

ابھی دیر تک لکھو گے۔؟"

"شاید"۔

"چائے بنا دوں۔؟"

انھوں نے پھر خاموشی اختیار کر لی۔ میں اٹھی اور چائے بنا کر لائی۔ پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"چائے"۔

"تم نہیں پیو گی؟" انھوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈال کر پوچھا۔
"نہیں"۔ میں نے اپنے آپ کو ان کی باہنوں میں سونپتے ہوئے کہا۔

"بہت رات ہو گئی ہے"۔

شاید انھوں نے میرے اندر کی اُلجھن کو بھانپ لیا تھا۔ چائے ختم

کرکے میرے اُٹھے، بتی بجھائی اور میرے ہی بستر میں گھس گئے۔
"کوئی کہانی لکھ رہے تھے نا؟" ان کے بالوں میں اپنی انگلیاں ڈالتے ہوئے میں نے پوچھا۔
ایک چھوٹی سی کہانی تھی "۔۔ کچھ دیر رک کر وہ پھر کہنے لگے ۔۔۔
" ایک غریب باپ نے برسوں اپنا پیٹ کاٹ کر اپنی اکلوتی بیٹی کو پڑھایا لکھایا وہ کالج میں پڑھتی تھی تب ہی سے آنچل میں مہندی کے پتے چن چن کر اپنے خوابوں میں رنگ بھرتی رہی مگر جہیز کی تیز دھوپ میں اس کے ارمانوں کی کلیاں سوکھ گئیں ۔ سینے پر پتھر رکھ کر اس نے اپنے سہاگ کا سپنا ہی توڑ دیا۔ وہ اسکول میں پڑھانے لگی ۔۔۔۔ اور اپنے باپ کا ہونہار بیٹا بن گئی ۔"
میرے دل کو پھر ایک جھٹکا سا لگا۔
لگتا ہے اب کوئی استانی چھا گئی ہے ان کے دل و دماغ پر ۔۔۔
یہ سوچ کر میرے تن بدن میں کپکپی سی پیدا ہوگئی۔
دھیمے دھیمے ان کے بالوں میں رینگتی ہوئی میری انگلیاں ٹھہر گئیں اور پھر ہاتھ سرک گیا۔ میں نے منھ پھیر کر دوسری طرف کروٹ لے لی ۔ وہ چپکے چپکے مجھے چھیڑنے کی کوشش کرتے رہے مگر میں برف کی سل کی طرح پڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد مایوس ہو کر وہ سو گئے۔
میری آنکھوں سے آنسو ڈھلکتے رہے اور میں سوچ میں ڈوبی جا رہی تھی ۔
.... " دو ٹکے کی اُستانی کے مقابلے میں مجھے طعنہ دیا ہے انھوں نے ۔۔۔ میرے باپ کی دولت کا ۔۔۔ اور میرے ان پڑھ ہونے کا ۔۔" میری آنکھوں سے آنسو اُمنڈتے ہی رہے ۔
ان کی کہانیوں میں مجھے اپنی سوت کا روپ اُبھرتا نظر آنے لگا تھا ۔۔۔ میں بلکتی رہی اور رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی ۔
صبح ہمارے گھر کا سارا ماحول اُداس تھا۔ صرف آئینہ مسکرا رہا تھا میری بدحالی پر !
" جوانی کے رنگین سپنوں سے بھری گلابی آنکھیں، آرزوؤں اور تمناؤں کے خون میں کب تک ڈوبی رہو گی ؟"
آئینے نے پھر مجھے احساس دلایا، اور میں پھر اپنے دل کو ٹٹولنے لگی ۔۔۔ آخر کیوں یہ ہلچل مچ جاتی ہے میرے دل میں ان کی کہانیاں سن کر!

۔۔۔ گلی کوچے اور بازار میں جنم لینے والی ان کی کہانیوں میں، میں کبھی نہیں پائی ۔۔۔ اور میرے حسن و شباب کے پیکر میں دھڑکتے دل کی زبان وہ سمجھ نہیں پائے!
چاند کو سورج کی چوکھٹ پر سجانے کی یہ رنگولی ہی رچائی گئی تھی ؟
میں اس گھر کے طاق میں رکھے اس گلدستے کی طرح ہو کر رہ گئی ہوں جس کی پنکھڑیاں وقت گزرنے کے ساتھ کملانے لگتی ہیں اور پتے ایک ایک کرکے نڈھال ہونے لگتے ہیں۔
پاؤڈر ، لالی اور بندی کے ڈبے سمیٹ کر سنگار میز میں دفن کرتے ہوئے میں نے جھٹکے سے دراز بند کی تو چوڑیوں کا ایک گچھا پھسل کر فرش پر بکھر گیا۔
آئینہ تھرتھرا اُٹھا۔
آئینے میں جھانکتا ہوا میرا وجود ہلنے لگا۔

دھوپ چھاؤں جیسی زندگی!
کبھی بے کیف دوپہر کا سناٹا ۔۔۔ کبھی اُداس راتوں کی بھول بھلیاں ۔
میرا دل بھاری بھاری رہنے لگا۔
میرے پاؤں بھی بھاری ہوگئے۔
میں میکے چلی آئی ۔ یہاں بھی جی اُچاٹ تھا ۔ جیسے تیسے دن پورے ہوئے ۔۔۔ سورج اور چاند کے گھروندے میں ایک ستارے کا جنم ہوا۔
لڑکی پیدا ہونے پر سب کے چہرے اتر گئے۔ لیکن میں خوش تھی کہ میری جیت ہوگئی۔ میری بیٹی میری ہی طرح خوبصورت ہے ۔ لیکن وہ میری طرح ان پڑھ نہیں رہے گی ۔ میں اسے خوب پڑھاؤں گی ، لکھاؤں گی اور وہ اپنے باپ سے بھی اچھی کہانیاں لکھے گی ۔ تب ہی تو زندگی کی بساط پر میری ہاری ہوئی بازی جیت میں بدلے گی !!

ایک دن ماں کے نگار خانے میں بیٹھی اپنی بیٹی کو دودھ پلا رہی تھی کہ پھر میری نگاہ اپنے پرانے قدِ آدم آئینے پر پڑی ۔۔۔ کتنا گرد آلود ہو گیا تھا!
اور وہ میری طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا:
"کتنی پھیکی پڑ گئی ہے تمہاری رنگت!"

(باقی صہ ۳۹ پر

غزل

وقار طاہری

۲۳/۹۹ اے۔ نادر روڈ
چمن گنج۔ کانپور

وہ تنگ دستی وہ حال اُس کا
مگر ہے دولت جمال اُس کا

میں غرقِ حیرت ہوں اس طلب پر
تمام صحرا سوال اُس کا

نہ بند ہو نیم خواب آنکھو!
ابھی تو ہے احتمال اُس کا

تمام جنگل میں بات اُس کی
طیور اس کے غزال اُس کا

ادائیں منکر ضرورتوں کی
بدن سراپا سوال اس کا

نہ کر سکی کچھ بھی مرتے دم تک
یہ گردشِ ماہ و سال اس کا

وقار سب اس کی ہی عطا ہے
عروج اس کا زوال اُس کا

رئیس انصاری

پھول سے نازک بدن والے بھی پتھر ہوگئے
حادثے اس شہر کا جب سے مقدر ہوگئے

پھر دلوں کے دشت میں اُڑنے لگی نفرت کی دُھول
چاہتوں کے لہلہاتے کھیت بنجر ہوگئے

گھر کے دروازے پہ جو پودے لگائے تھے کبھی
رفتہ رفتہ وہ مرے قد کے برابر ہوگئے

چھپ رہی ہیں روز تصویریں ہر اک اخبار میں
جب سے ہم اجڑے ہوئے قصبے کا منظر ہوگئے

تم سند حاصل نہ کر پائے کسی اسکول سے
ہم پڑھے لکھوں کی صحبت میں سخنور ہوگئے

جانے کتنے لوگ اس دُنیا میں ہم جیسے رئیسؔ
شہرتوں کی خواہشوں میں گھر سے بےگھر ہوگئے

ڈاکٹر آفاق فاخری

بوسٹ جلال پور
فیض آباد

سرِ محفل کوئی سچ بات کہنا
چراغوں کی لوؤں پہ ہاتھ رکھنا

عذابِ جاں نہیں تو اور کیا ہیں
تمھارے ہجر میں دن رات کرنا

ہماری زندگی اس عہدِ نو میں
کہ جیسے ریت پہ کچھ حرف لکھنا

ہوا میں سیٹیاں بجنے لگی ہیں
دریچے، کھڑکیاں سب بند رکھنا

سفر میں تم ہو اندھے جنگلوں کے
مری یادوں کے جگنو ساتھ رکھنا

کتابِ زندگی آساں نہیں ہے
بہت دشوار ہے چہروں کا پڑھنا

وہ دیکھو کتنا اچھا لگ رہا ہے
وہ ننھے ہاتھ سے تتلی پکڑنا

بہت دشوار ہے آفاق صاحب
زبانِ میر میں اِک شعر کہنا

افسانہ

شمع

تحسین عابدی
معرفت انعام حسن عابدی ایڈوکیٹ
نورگنج، شاہ گنج۔ الہ آباد

"میں کہتی ہوں آخر شمع کو کب تک یوں ہی سر پر بٹھائے رکھو گے ؟ پہاڑ جیسی لڑکی کیا ساری عمر ہمارے سر پر سوار رہے گی۔ ؟" نوراں نے کچھ گرم لہجے میں شوہر سے کہا۔

"تو میں کیا کروں ؟ روز تم اسی بات پر مجھ سے جھگڑا کرتی ہو۔ میرا تو جینا حرام ہو گیا ہے۔ بیٹی بدنصیب ہے تو اس میں میرا کیا قصور ؟ کہو تو اسے زہر دے دوں.... یا پھر میں خود ہی کچھ کھا کر سو رہوں"۔ جاوید میاں جھنجھلا اُٹھے اور پھر اخبار پڑھنے میں معروف ہو گئے۔ گویا صرف یہ کہہ کر انھوں نے اپنے فرض سے نجات پائی۔

"اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ مگر تم...."

"کہہ دیا دماغ مت چاٹو"۔ جاوید میاں نے غصّے سے اخبار میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا کروں ؟ کہو تو شمع کو زہر دے دوں اور ساری مشکلیں حل ہو جائیں"۔

"زہر دو یا آبِ حیات..... لیکن یہ میرا آخری فیصلہ ہے اگر شمع کے لیے اب کوئی اچھا لڑکا نہیں ملا تو میں کسی اندھے یا لنگڑے سے بھی اس کی شادی کرنے میں نہیں جھجکوں گی"۔ نوراں پان منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"تم اپنی بیٹی کے لیے ایسی باتیں کر رہی ہو شمع کی ماں .... کیا وہ اندھے اور لنگڑے کے قابل ہے ؟ کیا بُرائی ہے اس میں ؟ خوبصورت ہے پڑھی لکھی ہے۔ خدا کے فضل سے کوئی عیب نہیں....... اور تم کہتی ہو کہ ....."

"مانتی ہوں کہ یہ ساری اچھائیاں اس میں موجود ہیں، مگر پھر بھی وہ ہماری جان کے لیے عذاب بنی بیٹھی ہے"۔ نوراں بات کاٹ کر بولی۔

"لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں ؟ یہ دنیا لڑکی کی خوبیوں کو نہ دیکھتے ہوئے صرف پیسہ دیکھتی ہے۔ اپنی حیثیت کو دیکھتے ہوئے ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ شمع کو کوئی اچھا لڑکا ملے گا"۔ جاوید میاں نے بے بسی سے گردن ہلا دی ـــــ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں یہ لڑکی ہے یا ہماری جان کی دشمن"۔

شمع دوسرے کمرے سے اپنے والدین کی یہ گفتگو خاموشی سے سُن رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہو گئی۔ وہ اپنے آنچل کو منہ میں بھر کر چھت پر بھاگ گئی۔ یہ کام اب اس کی زندگی کا ایک لازمی کام بن گیا تھا۔ وہ ہر روز اپنے والدین سے اسی طرح کی گفتگو سُنتی اور اپنی قسمت پر آنسو بہاتی، مگر پھر بھی خاموش رہتی، آہیں بھرتی مگر اُف نہ کرتی۔ خدا اس سے کیسا امتحان لے رہا ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ اس سے بڑھ کر اب اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ ماں باپ اسے اپنا دشمن سمجھنے لگیں۔ ـــــ عذاب سمجھنے لگیں ـــــ !! اس کی وجہ سے روز اس کے والدین کے درمیان تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو کیا وہ اسی لیے پیدا ہوئی ہے کہ ماں باپ کی زندگی میں زہر گھول دے۔ ان کی ہنستی مسکراتی زندگی میں آگ لگا دے۔ ان کے ہونٹوں سے تبسم چھین لے ـــــ ! ان خیالوں میں کچھ دیر گرفتار رہنے کے بعد شمع کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن شمع جب سو کر اٹھی اور نیچے اترنے کے لیے سیڑھیوں پر جیسے ہی پاؤں رکھے اچانک گھر میں پھر ایک ہنگامہ سُن کر اس کے پاؤں وہیں ٹھٹھک گئے۔ اسے اپنے والد کی تیز آواز سُنائی دی۔

"ایک تو یہ منحوس لڑکی پہلے ہی ہماری جان کے لیے عذاب بنی ہوئی

تھی اوراب تم مجھے چوبیس گھنٹے چلاچلاکر پاگل بنادوگی۔ زہر دے دو مجھے اس زندگی سے تو مرجانا ہی بہتر ہے۔"

"زہر تو اب میں کھاؤں گی۔" نوراں زاروقطار رونے لگی۔

"یاالٰہی مجھے اسی دن کے لیے زندہ رکھا تھا؟ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔"

"ارے نوراں بہن روتی کیوں ہو۔؟" دروازے سے داخل ہوتی ہوئی احمدی نے سب کو چونکادیا۔

"روؤں نہ تو کیا کروں۔؟ پہاڑ جیسی لڑکی ......"

"اس بے قصور اور بے زبان لڑکی کو کیوں کوستی ہو نوراں۔؟ خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ جلدی سے آنسو پونچھو اور ایک خوش خبری سنو۔!"

اس کے بعد وہ نوراں کو ایک رشتے کے بارے میں بتانے لگی اور کہاکہ آج شام کو کچھ لوگ شمع کو دیکھنے آرہے ہیں۔

شمع یہ خبر سُن کر بے حد خوش ہوئی۔ اسے خوشی اس بات کی ہوئی کہ اب اسے اپنے والدین کی نفرت بھری نگاہ، ڈانٹ پھٹکار اور طعنوں سے نجات مل جائے گی۔

شام کو چند لوگ شمع کو دیکھنے آئے اور اسے پسند بھی کرلیا۔ لیکن بات پکی کرنے سے پہلے انھوں نے جاوید میاں کے سامنے یہ شرط رکھی کہ لڑکے کو اسکوٹر بھی ملنی چاہیے۔ جاوید میاں نے اس وقت تو فوراً حامی بھرلی لیکن یہ شرط پوری کرنا ان کے امکان میں نہ تھا۔ وہ اسی الجھن میں گھرے نوراں سے گفتگو کر رہے تھے اور شمع دوسرے کمرے سے ماں باپ کی گفتگو سُن رہی تھی۔ اس کے دل پر گہری چوٹ لگی اور وہ بے اختیار تڑپ اٹھی۔ اس کا جی چاہاکہ وہ فوراً جاکر اپنے ابا حضور کے قدموں پر گر پڑے اور گڑگڑاکر ان سے التجا کرے کہ وہ اس کی شادی کسی اندھے، لولے، لنگڑے سے کردیں لیکن خدا کے لیے یہ نہ کریں۔ وہ اتنے پیسے کہاں سے لائیں گے۔؟ مگر وہ یہ بھی نہ کرسکی۔ شرم وحیا نے اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دیں۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے لیکن آواز نہ نکل سکی۔ آنکھوں کے موتی فرش پر گرنے لگے۔ اور وہ ایک بے بس شمع کی مانند جلتی رہی۔! سچ مچ شمع کی مانند۔! جو جلتے جلتے ختم ہوجاتی ہے مگر شکوہ گلہ نہیں کرتی۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی اور آخر وہ دن بھی آگیا جب شمع سُرخ جوڑے میں ملبوس، شرماتی ہوئی اپنی سسرال پہنچی۔ مگر سسرال میں قدم رکھتے ہی طعنوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ شب وروز اس کو اسکوٹر نہ ملنے اور جہیز کم ملنے کے طعنے ملتے۔ شمع ان کی باتیں سنتی۔ لیکن جواب میں لبوں کو جنبش تک نہ دیتی۔

ابھی اس کی شادی کو صرف ایک ہی مہینہ گزرا تھا۔ اس کی سسرال میں صرف تین افراد تھے اس کی ساس، اس کی نند روشنی اور اس کا شوہر عمران۔ ایک دن پلان کے مطابق عمران کسی کام کے بہانے نینی تال چلاگیا۔ تیسرے دن وہاں سے ٹیلی گرام آیا جس میں عمران کے کسی کھائی میں گرکر ہلاک ہوجانے کی اطلاع تھی۔ اب کیا تھا۔ ساس اور نند نے رو روکر سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ شمع اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ چند ہی دنوں میں وہ مہینوں کی مریض نظر آنے لگی۔ پھول سا چہرہ کمھلاکر رہ گیا۔ ساس اور نند نے اسے "منحوس" کا خطاب دے دیا۔

"منحوس .... چڑیل کھاگئی میرے بیٹے کو ....!" ساس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تم نے اس گھر میں قدم رکھتے ہی اسے دوزخ بنادیا بھابی۔ تم منحوس ہو.... منحوس۔!!" نند نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ نہیں!! میں منحوس نہیں ہوں۔" شمع تڑپ اٹھی۔

"ہائے ہائے! اب تو زبان بھی لڑاتی ہے۔؟" ساس نے آنکھیں دکھائیں۔ "لعنت ہے تیرے گھر والوں پر .... جب بیٹی کا کہیں ٹھکانا نہ لگا تو دھوکا دے کر جھوٹا وعدہ کرکے اس منحوس کو ہمارے سر تھوپ دیا۔"

"ابا کی غلطیوں کی سزا مجھے مت دیجیے امی جان!" شمع کے لہجے میں التجا تھی۔

"خبردار۔! اگر امی جان سے زبان درازی کی تو زبان کھینچ لوں گی۔ شرم نہیں آتی تمھیں! ایک تو جہیز نہیں لائیں۔ ہمارے بھیا کو کھاگئیں اور اس پر سے بڑھ چڑھ کر باتیں بناتی ہو۔" روشنی نے کہا۔

"خدا کا خوف کھاؤ روشنی! ایک دن تمھیں بھی سسرال جانا ہے۔ میری طرح۔" شمع نے عاجزی سے کہا۔

"کیا کہا ؟ اب تو میری بیٹی کے بوسے کی بھی تمنا کرنے لگی" ساس ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔

"خدا نہ کرے امی جان ! میں کسی کی برائی نہیں ..."...

"نکل جا ! اب تیرا ٹھکانا اس گھر میں نہیں" ساس آپے سے باہر ہوتی ہوئی بولی۔

"میں کبھی نہیں جا سکتی۔ یہ میرا گھر ہے۔ اب تو یہاں سے میرا جنازہ ہی جائے گا"

ماں بیٹی کو شمع کی باتیں کسی زہریلے تیر کی طرح لگیں، اور وہ ایک ساتھ شمع پر پل پڑیں۔ شمع نے اب تک سب کچھ برداشت کیا تھا، لیکن مار پیٹ کی یہ ذلیل حرکت وہ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے خواب میں بھی اس بات کی امید نہ کی تھی۔ اس نے سوچا وہ اپنے والدین کے پاس چلی جائے گی۔ اس کو دیکھ کر ماں اسے سینے سے لگا لے گی۔ اس کا غم ہلکا ہو جائے گا۔

وہ سفید لباس میں لپٹی، غم و الم کی صورت بنی اپنے والدین کے گھر پہنچی۔ ماں باپ نے اس کی بدنصیبی پر دو چار آنسو بھی بہائے۔ چند روز اسی طرح گزر گئے۔ اب شمع نے خود کو کافی حد تک بدل ڈالا تھا۔ وہ پچھلی باتوں کو بالکل بھول جانا چاہتی تھی۔ ان باتوں کو اس نے اپنے دماغ سے نکال بھی دیا۔ لیکن پھر اچانک ایک دن اس نے اپنے والدین کے درمیان ایسی گفتگو سنی جس سے اس کے دل کو پھر گہری چوٹ لگی۔

"پتہ نہیں کیسی بدنصیب بیٹی خدا نے ہم کو دی ہے" جاوید میاں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔

"اس سے زیادہ تو ہم بدنصیب ہیں جو ہمیں ایسی بیٹی ملی۔ کسی نہ کسی طرح شادی بھی ہوئی تو پھر ہمارے سر پر آ کر بیٹھ گئی۔ معلوم نہیں یہ چڑیل کب دم لینے دے گی" نوراں آنسو پی کر بولی۔

"میں تو کہتا ہوں اس کمبخت سے صاف صاف کہہ دو کہ اس کی سسرال ہی اب اس کا گھر ہے۔ ہزار زیادتیاں اس کے ساتھ کی جائیں، لیکن اب اسے ہر حال میں سب کچھ برداشت کرنا چاہیے اور وہیں رہنا چاہیے" جاوید میاں نے کہا۔

"اگر حیا نام کی کوئی چیز اس میں ہوتی تو جوتیاں کھا کر بھی وہاں سے یہاں نہ آتی۔ اس نا سمجھ کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ سب طعنے دیں گے کہ میکے میں پڑی رہتی ہے۔ سسرال میں کوئی عزت نہیں"

شمع نے والدین کی باتیں سنی اور انھیں اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ شمع سے چلے جانے کو کہیں بلکہ وہ خود ہی ان کی اجازت لے کر سسرال چلی گئی۔

وہاں پہنچ کر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور سہمی سہمی سی اندر دیکھنے لگی۔ لیکن اندر کا نظارہ دیکھتے ہی وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور دیوار کے سہارے چپک کر کھڑی ہو گئی۔

اس کا شوہر عمران سامنے بیٹھا زور زور سے ہنس رہا تھا۔

"کیسا بے وقوف بنایا" وہ بولا۔

"امی جان نے تو رونے کی اتنی اچھی ایکٹنگ کی بھائی جان کہ بس کیا بتاؤں" روشنی چہکتے ہوئے بولی۔

"چلو ایک بڑی مصیبت سے نجات مل گئی۔ آخرکار وہ اپنے گھر چلی گئی" امی جان نے ٹھنڈی سانس لی۔

"لیکن اب زیادہ خوش بھی نہ ہوں۔ بس جلدی سے دہرہ دون چلنے کی تیاری کیجیے۔ ٹھیک سات بجے شام کو یہ گھر چھوڑ دینا ہے" عمران بولا۔

"ہمیشہ کے لیے" نند نے قہقہے لگائے۔ "اور پھر دہرہ دون میں میری نئی بھابھی آئے گی بہت سارا جہیز لے کر"

"ارے بیوقوفو! دروازہ تو بند کر دو" امی جان آواز دبا کر بولیں۔

روشنی جیسے ہی آگے بڑھی، شمع اندر چلی آئی۔ اسے دیکھ کر تینوں کے ہوش اڑ گئے۔ چہرے سفید پڑ گئے۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔ شمع نے ایک بار سب کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اب کیا ہوگا۔ ؟" امی جان گھبرا کر بولیں۔

"اب بہتر یہی ہے کہ اس کو زہر دے دیں۔" عمران نے مشورہ دیا۔

"لیکن بھائی جان! اس کے ماں باپ جب اس کے بارے میں پوچھیں گے تو ہم کیا جواب دیں گے۔ ؟" روشنی نے کہا۔

"اس کے ماں باپ کو اس کی کب پروا رہتی ہے۔ جب ہم یہ شہر ہی چھوڑ دیں گے تو وہ ہمیں کیسے ڈھونڈیں گے۔ ؟ ہم لوگوں کو ڈھونڈنا ان کے لئے آسان نہیں" عمران نے جواب دیا۔

اس کے بعد تینوں نے شمع سے معافی مانگی اور اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اب اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کبھی نہیں ہوگا۔ ان کی باتیں سن کر شمع زار و قطار رونے لگی اور روتی ہی چلی گئی۔ عمران نے موقع اچھا دیکھا اور امی جان کی طرف اشارہ کیا۔ امی جان نے فوراً اشارے کو پہچانا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک پیالے میں دودھ لے کر شمع کے پاس گئیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"دو مت بیٹی۔ ہم نے تم کو بہت دکھ پہنچایا ہے۔ ہم سب تم سے معذرت کے خواہاں ہیں۔ آنسو پوچھو اور یہ دودھ پی لو!"

شمع نے اس طرح ان کا چہرہ دیکھا گویا وہ یہ چال سمجھ گئی ہو — اور سچ مچ ایسا ہی تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس دودھ میں زہر ہے۔ یہ جان کر شمع میں جیسے ایک نئی زندگی آ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے پیالہ ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

"امی جان! آج آپ اتنی محبت سے مجھے دودھ دے رہی ہیں بھلا میں کیسے انکار کر سکتی ہوں" یہ کہہ کر جیسے ہی اس نے پیالہ ہونٹوں سے لگایا، نہ جانے کیوں امی جان کانپ گئیں اور انھوں نے چیخ کر کہا۔

"ٹھہرو شمع ..... یہ مت پیو" ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ "میں کسی کی جان نہیں لے سکتی — میں قاتل نہیں ہو سکتی؟"

"قاتل — ؟!" سب کچھ جانتے ہوئے بھی شمع نے اس طرح پوچھا جیسے وہ کچھ نہیں جانتی۔

"ہاں بیٹی ..... اس میں زہر ہے۔ اسے مت پیو۔ آخر مجھے خدا کے گھر بھی جانا ہے۔ خدا نے مجھے بھی بیٹی دی ہے۔ ایک بیٹی کی ماں ہوتے ہوئے آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تو بھی کسی کی بیٹی ہے — بے گناہ ..... بے قصور" انھوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے روشنی کی طرف دیکھا اور پھر شمع کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ بیٹی — (روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے) ایک دن یہ بھی تیری طرح اپنی سسرال جائے گی — اور پھر اس کو ان گناہوں کی سزا ......" امی جان رونے لگیں۔

"امی جان! حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کو اس وقت مجھ سے زیادہ روشنی کا خیال ہے۔" شمع آنسو پی کر بولی۔

"نہیں بیٹی ایسا مت کہو۔ لاؤ یہ پیالہ مجھے دے دو"

شمع نے پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"شمع ..." امی جان گھبرا کر چیخیں۔

"شمع کو مت روکیے امی جان۔ شمع کو تو ایک دن ختم ہونا ہی ہے۔ وہ جلتے جلتے پگھل کر ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے جل جانے کے بعد ایک ایسی سحر ہوگی جو سب کے دامن میں مسرت کے پھول بکھیر دے گی۔ آپ کے دامن میں — میرے والدین کے دامن میں — اس دنیا میں میری ضرورت کسی کو نہیں ہے۔ اب میں اپنی حیات کی کانٹوں بھری راہوں کو طے کر چکی ہوں — الوداع ....!"

اس سے پہلے کہ پیالہ اس کے ہاتھ سے کوئی چھینتا، اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ زہر پی لیا اور کسی کٹے ہوئے درخت کی مانند فرش پر گر پڑی وہ موت کے منھ میں جا چکی تھی، لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک پُرسکون مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ★★

تماشا درپن کا —— صفحہ ۴۴ کا بقیہ

"کیسے حلقے پڑ گئے ہیں آنکھوں کے گرد۔!"

"چپاتی کی لوئی کی طرح ڈھل گئی تمھاری جوانی۔!"

گردن جھکا کر میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی تو شرما کر میں نے چھاتی سے لگی اپنی بیٹی کو آنچل میں چھپا لیا۔

وہ سو گئی تھی۔ اسے بستر میں ڈال کر میں پھر آئینے کے قریب آئی۔ اپنے آنچل سے آئینے کی گرد صاف کی۔ آئینہ چمکنے لگا — لیکن میرے رُوپ کا نکھار واپس نہیں آیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے آئینہ میرا روپ رنگ پی گیا۔

وہی آئینہ! — جس نے مجھ کو میرے حسن پر چڑھتے ہوئے کندن کی آب و تاب کو اس طرح دکھایا کہ میں نے خود اپنے آپ کو موہ لیا، اور ایسا کھوئی اپنے آپ میں کہ اس کے آگے کچھ اور جاننے، کچھ اور سمجھنے کی پروا ہی نہیں کی۔ بچپن سے ہی میں کورے کاغذ کی رنگین پتنگ کی طرح آسمانوں میں اڑنے لگی تھی —

غزلیں

رشید قریشی

ستم کے ذکر سے اوراق بھر گئے کہ نہیں
چڑھے ہوئے تھے جو دریا اتر گئے کہ نہیں

جو لوگ ناپنے نکلے تھے وقت کے قد کو
وہ لوگ اپنی حدوں سے گزر گئے کہ نہیں

اندھیری رات اگرچہ طویل تھی پھر بھی
اندھیری رات کے بادل بکھر گئے کہ نہیں

جو لوگ سوچ کے ہر آدمی سے ملتے تھے
وہ لوگ اپنے ہی سائے سے ڈر گئے کہ نہیں

مرے شعور نے قوموں کو دی ہیں تہذیبیں
مرے شعور سے رستے سنور گئے کہ نہیں

وہ سب کی بگڑی بنانے گھروں سے نکلے تھے
وہ لوگ لوٹ کے اپنے بھی گھر گئے کہ نہیں

سوال یہ نہیں کیسے سوال ہیں یارو!
سوال یہ ہے کہ دل میں اتر گئے کہ نہیں

یہ اور بات کہ رستے بڑے کٹھن تھے رشید
فرازِ دار سے ہنس کر گزر گئے کہ نہیں

ساجد خیر آبادی

آرڈیننس کلوتھنگ فیکٹری
شاہ جہاں پور۔

کیا کہوں میں اس کی چاہت کا صلہ کیسا ملا
خشک سب دریا ملے جلتا ہوا صحرا ملا

بیتے لمحوں کی کہانی بھول سکتا ہی نہیں
عمر کے ہر موڑ پر مجھ کو ترا سایہ ملا

ان گنت خونی مسائل کی ہوا ایسی چلی
رنج و غم کی گرد میں لپٹا ہر اک چہرہ ملا

آہ و زاری، برہمی، افسردگی، بے چارگی
اس کے در سے جو ملا مجھ کو بہت اچھا ملا

اک عجب احساس کی لذت سے میں تھا ہمکنار
موڑ وہ آیا اچانک خود کو میں تنہا ملا

تیرے چہرے پر لکھی ہے تیرے غم کی داستاں
اپنے چہرے سے کسی کا اب نہ تو چہرا ملا

●

پورنما مہ جبین

اشتراک دیکلی۔ قاضی پور خورد
گورکھ پور

بتاؤں کیا کہاں اب گھر ہے میرا
کہاں گم خواب کا منظر ہے میرا

ٹھہر جاتا ہے جو پلکوں پہ آ کر
سہیلی اب یہی جھومر ہے میرا

حنا بے رنگ سی ہونے لگی تھی
لہو میں تر بتر خنجر ہے میرا

جسے آنسو سمجھتا ہے زمانہ
وہی انمول سا گوہر ہے میرا

ہوا میں بکھری بکھری سی یہ زلفیں
مگر زیرِ زمیں پیکر ہے میرا

اسے اے مہ جبیں کیا ہو گیا ہے
خفا مجھ سے دلِ مضطر ہے میرا

●●

ادارہ

یو۔پی اقلیتی مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن کی جانب سے

دیہی عورتوں اور بچّوں کے لیے فلاحی اسکیمیں

برق رفتاری سے بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے بے روزگاری عموماً سب ہی طبقے کے لوگوں کے لیے اور خصوصاً اقلیتی طبقے کے لیے ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ عورتوں کے لیے تو خاص طور سے یہ ایک پیچیدہ سوال بن کر رہ گئی ہے کہ کس طرح عورتوں کو روزگار فراہم کیا جائے کہ وہ مالی اعتبار سے خوش حال ہوکر اپنی، اپنے خاندان اور بچّوں کی اقتصادی حالت درست کرسکیں۔ عورتوں کی کچھ مخصوص پریشانیاں اور ذمہ داریاں بھی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) عورتوں کی شرح اموات مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ یہی صورت حال لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی ہے۔ پیدائش کے ایک سال کے اندر ایک ہزار میں اگر لڑکیاں ۱۷۰ مرتی ہیں تو لڑکے صرف ۱۲۰ مرتے ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ ناخواندہ ہیں۔

(۲) ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اگر سو میں ۴۷ مرد پڑھے لکھے ہیں تو عورتیں ۲۵ ہی پڑھی لکھی ہیں۔

(۳) لڑکی کی ولادت کو خاندان میں بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ ان کو صرف امور خانہ داری سکھائے جاتے ہیں۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو گود لینا بہلانا اور ان کی دیکھ بھال کرنا لڑکی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بیماری میں ان کا کم خیال کیا جاتا ہے تعلیم اور کھانے پینے پر بھی لڑکوں کے مقابلے میں کم خیال کیا جاتا ہے۔

(۴) اگر عورتیں ملازمت کرلیتی ہیں تو گھر میں بھی سارا کام انھیں کو کرنا پڑتا ہے جیسے وہ سکنڈ کلاس شہری ہوں۔

(۵) عورتوں کی سب سے اہم ذمہ داری بچّوں کی پرورش ہے، ان کی گود کو بہترین تعلیم گاہ کہا جاتا ہے۔ دبیر صاحب نے تو کہا ہے ؏

زیرِ قدمِ والدہ فردوس بریں ہے

بہرحال اگر کسی ملک کو یا قوم کو ترقی کرنا ہے تو صرف ایک ہی صنف یعنی مردوں کے لیے ہی ترقیاتی پروگرام بنا لینے ہی سے ملک و قوم کی مکمل ترقی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ نصف آبادی تو عورتوں کی ہے۔

ایسا دیکھا گیا ہے کہ فلاح و بہبودی کی اسکیموں میں عورتوں کی جگہ دس فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتی اس لیے ضروری ہے کہ عورتوں کے لیے اسپیشل اسکیم چلائی جائے۔ حکومت نے اسی لیے پورے ملک کے ۱۵ ضلعوں میں "ڈی۔ ڈبلو۔ سی۔ آر۔ اے" اسکیم چلائی ہے۔ یوپی کے سات ضلعے بستی۔ دیوریا۔ سلطان پور۔ اٹاوہ۔ باندہ۔ الہ آباد اور گورکھپور میں خاص طور سے عورتوں اور بچّوں کی فلاح و بہبود کی یہ اسکیم چلائی جارہی ہے۔

اس اسکیم کے دائرۂ عمل میں دیہی عورتیں شامل ہوسکتی ہیں جن کی اقتصادی حالت ٹھیک نہیں ہے اور جن کے خاندان کی سالانہ آمدنی ۳۵۰۰ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ جن کنبوں میں عورت ہی آمدنی کا ذریعہ ہے ان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ان شرائط کو پورا کرنے والی اقلیتی طبقے کی عورت بھی اس اسکیم سے مستفید ہوسکتی ہے۔ عورتوں کو قومی بنکوں سے قرض دیا جاتا ہے بلاکوں سے مارجن منی کی رقم چھوٹ کے طور پر دی جاتی ہے۔

اقلیتی طبقے کی وہ عورتیں جو غریبی کی سطح سے اوپر ہیں ان کو بھی بنک قرض دے سکتا ہے اگر وہ مارجن منی مجموعی قرض کا چوتھائی حصّہ خود جمع کردیں

اگر وہ عورتیں مارجن منی نہیں جمع کر سکتی ہیں تو اس کارپوریشن نے "مارجن منی قرض اسکیم" بھی تیار کی ہے۔ ساڑھے سات فی صد سالانہ شرح سود پر یہاں سے قرض دے دیا جاتا ہے، جس سے وہ بنکوں سے قرض حاصل کر سکیں۔ ان سبھی باتوں سے واقف کرانے کے لیے ضلعوں میں معلوماتی کیمپ منعقد کیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی چند مفید اسکیموں کو تفصیل کے ساتھ بتایا جا رہا ہے جنھیں عورتیں بآسانی چلا سکتی ہیں اور اپنی مالی حالت سدھار سکتی ہیں۔

سوئٹر بننے کی اسکیم

وقت کی بچت کے لیے اب مشین سے سوئٹر بننے کا رواج بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی مانگ اور فائدہ کے لیے سوئٹر بننے کے کام کا شمار اب گھریلو صنعتوں میں ہونے لگا ہے۔ شہروں کے علاوہ گاؤں میں بھی یہ کام آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل لاگت آتی ہے۔

(۱) مشین اور اوزار

(الف) سوئٹر کی مشین	۳,۵۰۰/- روپے
(ب) فرنیچر کرسی میز لوہے کی	۳۰۰/- روپے
(ج) بورڈ اور ہاتھ کے اوزار	۲۰۰/- روپے
	۴۰۰۰/- روپے

(۲) خام مال کی ضرورت

(الف) ۴۰ کلو اون (۹۰ روپیہ کلو کی شرح سے):	۳۶۰۰/- روپے
(ب) بٹن وغیرہ	۵۰/- روپے
	۳۶۵۰/- روپے

(۳) روزگار

(الف) جانکار عورت (خود) کی تنخواہ	۵۰۰/- روپے
(ب) ایک ملازم لڑکا	۳۰۰/- "
	۸۰۰/- روپے

(۴) سوئٹر بننے کے دیگر اخراجات

(الف) پیکنگ	۲۰/- روپے
(ب) بھتہ	۸۰/- "
	۱۰۰/- روپے

(۵) ایک ماہ کے لیے کاروباری سرمایہ

(الف) خام مال نیز دوسرے اخراجات	۴+۳+۲
	۴۶۵۰/- روپے

(۶) مجموعی اخراجات کی رقم جو بینک سے بطور قرض حاصل ہوئے:

(الف) مشین وغیرہ	۴۰۰۰/- روپے
(ب) کاروباری سرمایہ	۴۵۵۰/- روپے
	۸۵۵۰/- روپے

(۷) فروخت ایک ماہ میں

ایک سو سوئٹر ۷۰/- روپے فی سوئٹر کی شرح سے ۷۰۰۰/- روپے

(۸) فائدہ:	۷۰۰۰/- روپے
اخراجات (—)	۴۵۵۰/- روپے
منافع:	۲۴۵۰/- روپے

(۹) قرض کی بنک کو ۲ سال میں ادائیگی

(الف) ہر ماہ اصل	۳۵۰/- روپے
(ب) ہر ماہ سود	۱۱۰/- "
	۴۶۰/- روپے

اس طرح اس ۴۶۰/- روپے کی رقم کو ہر ماہ بینک میں جمع کرنے کے بعد بھی عورتوں کو ہر ماہ ۱۹۹۰/- روپے کی آمدنی ہو سکتی ہے اور ۵۰۰/- روپے تنخواہ بھی ملتی رہے گی۔ دو سال بعد قرض ادا ہو جائے گا اور تنخواہ ملا کر عورتوں کو ماہانہ ۲۹۵۰/- روپے کی آمدنی ہو سکتی ہے۔ سبھی تیار شدہ سوئٹر سردیوں میں کم قیمت اور اچھا اون ہونے کی وجہ سے فوراً فروخت ہو جائیں گے۔

کینوس کے تھیلے بنانے کی اسکیم

یہ اسکیم بہت آسان ہے۔ عموماً ہر گھر میں سبھی عورتیں کچھ نہ کچھ سلائی کا کام جانتی ہیں، صرف ایک ہفتے کی کٹنگ کی تربیت لے کر تھیلے آسانی سے تیار کیے جا سکتے ہیں۔

اچھے کینوس اور کم قیمت ہونے سے فروخت میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ مندرجہ ذیل تفصیل لاگت کے بارے میں دی جا رہی ہے:

(۱) مشین اور اوزار

(الف) سلائی کی مشین — -/۱۰۰۰ روپے

(ب) اوزار- قینچی- فیتہ — -/۲۰۰ "

-/۱۲۰۰ روپے

(۲) خام مال کی ماہانہ ضرورت

(الف) چار سو میٹر کینوس (۲۵ روپے فی میٹر کی شرح سے) — -/۱۰،۰۰۰ روپے

(ب) گوٹ کا کپڑا، ڈورا — -/۶۰۰ روپے

(ج) بھوا، فٹنگ کا سامان — -/۴۰۰ "

-/۱۱،۰۰۰ روپے

(۳) روزگار

(الف) جانکار عورت (خود) — -/۵۰۰ روپے

(ب) ایک ملازم — -/۳۰۰ "

-/۸۰۰ روپے

(۴) دیگر اخراجات

(الف) پیکنگ — -/۴۰ روپے

(ب) بھتہ — -/۱۶۰ "

-/۲۰۰ روپے

(۵) ایک ماہ کے لیے کاروباری سرمایہ

(الف) خام مال اور دیگر اخراجات ۲ + ۳ + ۴ } -/۱۲،۰۰۰ روپے

(۶) مجموعی لاگت (مع مشین) کی رقم جو بینک سے بطور قرض لینا ہے

(الف) مشین پر — -/۱۲۰۰ روپے

(ب) کاروباری سرمایۂ فروخت — -/۱۲،۰۰۰ "

-/۱۳،۲۰۰ روپے

(۷) فروخت ایک ماہ میں

ایک ہزار تھیلے -/۱۵ روپیہ فی تھیلے کی شرح سے } -/۱۵،۰۰۰ روپے

(۸) ایک ماہ میں فائدہ

(الف) فروخت — -/۱۵،۰۰۰ روپے

(ب) پیداواری لاگت (-) — -/۱۲،۰۰۰ "

-/۳۰۰۰ روپے

(۹) بینک کا قرض -/۱۳۲۰۰ روپے دو سال میں ادائیگی

(الف) اصل ہر ماہ — -/۵۵۰ روپے

(ب) سود ہر ماہ — -/۱۴۰ "

-/۶۹۰ روپے

اس طرح اسکیم کے لیے قرض کو دو سال میں ادا کرنے کے لیے -/۶۹۰ روپے کی قسط بینک میں جمع کرنا پڑے گی۔ اس کو نکال دینے کے بعد ہر ماہ -/۲۳۱۰ روپے کی آمدنی ہو سکتی ہے اور ۲ سال کے بعد قرض ادا ہو جانے پر نیز اپنی تنخواہ جوڑ کر -/۳۵۰۰ روپے ماہانہ کی آمدنی ہو جائے گی۔

پلاسٹک کے کھلونے بنانے کی اسکیم

بچوں کے لیے کھلونے بھی بہت ضروری ہیں۔ اس سے ان کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ ان کو آسانی سے بہلایا جا سکتا ہے اور ان کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور ہر غریب و امیر شخص کو اپنے بچوں کے لیے کھلونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہروں کی طرح قصبوں اور گاؤں میں بھی اس کا رواج دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے مٹی کے کھلونوں کا چلن بہت زیادہ تھا۔ جس کا شمار اچھی دستکاریوں میں ہوتا تھا۔ لوگ ڈرائنگ روم میں ان کا استعمال کرتے تھے مگر یہ کھلونے جلد ٹوٹ جاتے تھے اس لیے انھیں لوگ کم خریدتے تھے۔ پلاسٹک کے کھلونوں نے اب مٹی کے کھلونوں کی جگہ لے لی ہے۔ اقلیتی طبقے کی گھریلو عورتوں کے لیے یہ ایک باعزت پیشہ بن سکتا ہے۔ اس اسکیم کے لیے بہت زیادہ لاگت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آمدنی و خرچ کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے:

(۱) مشین اور اوزار

(الف) انجکشن مولڈنگ مشین — -/۱۸۰۰ روپے

(ب) مختلف قسم کی ڈائیاں — -/۱۲۰۰ "

-/۳۰۰۰ روپے

(۲) کاروباری سرمایہ

(الف) پلاسٹک مولڈنگ پاؤڈر ۱۷۰ کلوگرام نیول
۱۲/ روپے فی کلو کی شرح سے : ۲۰۴۰/- روپے
(ب) مختلف رنگ ۶۰/- روپے
۲۱۰۰/- روپے

(۳) روزگار

(الف) ایک جانکار عورت (خود) ۵۰۰/- روپے
(ب) ایک ملازم ۳۰۰/- "
۸۰۰/- روپے

(۴) دیگر اخراجات

(الف) بجلی ۱۰۰/- روپے
(ب) پیکنگ و آمد و رفت ۱۰۰/- "
۲۰۰/- روپے

(۵) ایک ماہ کا خرچ

(الف) خام مال ۲۱۰۰/- روپے
(ب) اجرت۔ ملازم ۸۰۰/- "
(ج) دیگر اخراجات ۲۰۰/- "
۳۱۰۰/- روپے

(۶) مجموعی اخراجات (مع مشین) کی رقم جو بطور قرض بینک سے لینا ہے:

(الف) مشین ۳۰۰۰/- روپے
(ب) کاروباری سرمایہ مد ۵ ۳۱۰۰/- "
۶۱۰۰/- روپے

(۷) ایک ماہ کی متوقع فروخت

(الف) کل ۱۵۰ گرس (۲۱۶۰۰) کھلونے
فی کھلونا بیس پیسے کی شرح سے
گرس کی قیمت ۲۸/۸۰ روپیہ
اور ۱۵۰ گرس کی قیمت } ۴۳۲۰/- روپے

(۸) کھلونوں سے ایک ماہ میں فائدہ

(الف) قیمت کھلونا ۴۳۲۰/- روپے
(ب) لاگت (-) ۳۱۰۰/- "
۱۲۲۰/- روپے

(۹) بینک سے ۶۱۰۰/- روپے کے قرض کی دو سال میں ادائیگی

(الف) اصل رقم ۲۵۵/- روپے
(ب) سود کی رقم ۶۵/- "
۳۲۰/- روپے

پلاسٹک کے کھلونے بنانے کی اسکیم پر لیا گیا بنک قرض دو سال میں ادا کرنے کے لیے تین سو بیس (۳۲۰/-) روپے کی ماہانہ قسط دینا پڑے گی جو ہر ماہ کے دکھائے گئے فائدے مد نمبر ۸ سے گھٹ جائے گی۔ دو سال تک ۹۰۰/- روپے کا ماہانہ فائدہ ہو سکتا ہے لیکن اگر اپنی تنخواہ پانچ سو روپے ماہانہ شامل کر دی جائے تو ہر ماہ ایک عورت کو گھر بیٹھے ۱۴۰۰/- روپیہ مل سکتا ہے اور دو سال کے بعد قرض ادا ہو جائے گا قرض کی قسط اس آمدنی میں جوڑ لینے پر ۱۷۲۰/- روپے ماہانہ کی آمدنی ہو سکتی ہے۔ **

غزل

غلام ناشیؔ
۸۰۔ منشی نور محمد لین
ہوڑہ

سایۂ آفتاب ختم ہوا
منظروں کا شباب ختم ہوا

کل سناؤں گا پورا افسانہ
آج تو ایک باب ختم ہوا

چھلکے ہونٹوں سے عشرتوں کے گیت
آسماں کا عتاب ختم ہوا

اپنی ہر سانس ہے ابھی مقروض
کیسے ناشیؔ حساب ختم ہوا

ظہیر کانپوری
۲۰/۸۰ ۔ کلی بازار کانپور

غزل

ایک ہنگامہ ہے ہنگامۂ محشر جیسا!
گھر کے اندر بھی وہی شور ہے باہر جیسا

ایک قطرہ بھی نہیں ہونٹ بھگونے کیلئے
دیکھنے میں نظر آتا ہوں سمندر جیسا

دشمنوں کا نہ کرو ذکر کہ وہ دشمن ہیں
دوستوں کا لب و لہجہ بھی ہے پتھر جیسا

ہم تو تبدیلیٔ منظر کے لیے آئے تھے
ہائے صحرا کا تو منظر ہے وہی گھر جیسا

روند ڈالا ہے ہمیں وقت نے ورنہ یارو
کبھی چہرہ تھا ہمارا بھی گلِ تر جیسا

مجھ کو خاموش ہی رہنے دو تقاضہ ہے یہی
وقت آئے گا تو کھل جاؤں گا دفتر جیسا

شباب کاسگنجوی
این ۔ آر ۔ بریلی

غزل

مری دیوانگی پر جب کوئی الزام آتا ہے
تو لوگوں کی زباں پر آپ ہی کا نام آتا ہے

مجھے فرصت نہیں دیتی ہیں دل کی الجھنیں ورنہ
الجھنا تجھ سے بھی سلسلے گردشِ ایام آتا ہے

مقدر پر بھروسہ ہے عمل کی آخری منزل
مقدر ہی نہیں عزم و عمل بھی کام آتا ہے

وفا کرنا کسی سے اور امیدِ وفا رکھنا
وفا کی نیک نامی پر بڑا الزام آتا ہے

صدا ناقوس کی آئے کہ آوازِ اذاں آئے
ہمیں دونوں طرف سے ایک ہی پیغام آتا ہے

بظاہر شکل و صورت میں تو سب انسان ہیں لیکن
وہی ہے آدمی جو آدمی کے کام آتا ہے

تدبّر راہ کے ہر موڑ کا ضامن نہیں ہوتا
کہ گاہے طائرِ دانا بھی زیرِ دام آتا ہے

شباب آتی ہے ان کی یاد بھی راحت فزا ہو کر
جہاں دل میں خیالِ گردشِ ایام آتا ہے

خاموش قنوجی

غزل

یوں نفرتوں کے زہر کو پھیلا رہے ہیں لوگ
صدیوں کی رسم و راہ سے کترا رہے ہیں لوگ

کیا دُنیا کر رہی ہے نظر اس سے پھیر کر
سارے جہاں میں اپنے ہی گن گا رہے ہیں لوگ

چہرے کا حسن و نور بڑھانے کے باوجود
تاریکیاں دلوں میں فزوں پا رہے ہیں لوگ

شرمندہ جس سے غالب و مومن کی رُوح ہو
اندازِ فکر آج وہ اپنا رہے ہیں لوگ

اپنی نظر سے آپ ہی خاموش گر گئے
اپنے کیے کی آپ سزا پا رہے ہیں لوگ

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "کواکب"

مصنف: ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی قیمت: ساٹھ روپے

ملنے کا پتہ: کتب خانہ انوریہ۔ خانقاہ تکیہ کاظمیہ۔ کاکوری لکھنؤ

عصر حاضر میں محققین کی جو نئی نسل ہمارے سامنے آئی ہے اس میں ڈاکٹر مسعود انور صاحب کا نام بہت نمایاں ہے۔ عربی ادب میں ریسرچ کا کام جاری رکھتے ہوئے ان دانش وروں اور علمائے عظام کے کارناموں کو وہ منظر عام پر لائے جو گم نامی کے گوشے کو پسند کر کے تصنیف و تالیف میں منہمک رہے۔

زیر نظر کتاب میں شامل مضامین میں سات ایسے حضرات کو منتخب کیا گیا جو کسی نہ کسی شعبہ علم میں سر آمد روزگار رہے۔ حضرت قاری نظام الدین شیخ تھکاری کے، جو موصوف کے جد اعلیٰ تھے، حالاتِ زندگی مسعود انور صاحب نے بڑی تفصیل سے لکھے ہیں اور اس سلسلے میں تمام متعلقہ معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ انھیں شخصیتوں میں قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں بھی تھے، جو تمام ملک کے قاضی القضاۃ تھے اور جملہ قاضیوں کا تقرر ان کے ذمہ تھا۔ انھیں کواکب میں حضرت مولانا عنایت احمد صاحب بھی شامل ہیں جو انگریزوں کے خلاف پہلی جنگِ آزادی میں شریک ہوئے جس کی پاداش میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے لیے کالے پانی بھیج دیا گیا اور جب ایک انگریز افسر کی فرمائش پر انھوں نے تقویم البلدان کا اردو میں ترجمہ کیا تو وہ ان سے اتنا متاثر ہوا کہ قید فرنگ سے چھڑا لایا۔ ان مشاہیر میں حضرت قلی شاہ قلندر بھی تھے۔ جن کی تصنیفات تصوف، سیرت اور اخلاق پر آج بھی مستند حیثیت کی حامل ہیں۔

الغرض جس شخصیت پر ڈاکٹر مسعود انور صاحب نے قلم اٹھایا ہے اس کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے اور ان مشاہیر کی حیات کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ اس طرح مسعود انور صاحب نے تمام مفید اور مطلوبہ معلومات کو یکجا کر کے مستقبل کے محققین کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ زیر تبصرہ کتاب اس سلسلے میں ایک مفید ریفرنس بک ثابت ہوگی۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے اور کاغذ بھی اعلیٰ قسم کا استعمال ہوا ہے۔ خصوصاً سرورق نہایت جاذب نظر ہے۔

——— مُعینُ الدّین حسن علوی

نام کتاب "سمتِ سفر"

مصنف، ناوک حمزہ پوری قیمت: بارہ روپے

ملنے کا پتہ، قوس اردو لائبریری۔ حمزہ پور، ڈاک خانہ شیر گھاٹی۔ گیا

"سمت سفر" جناب ناوک حمزہ پوری کے افسانوں کا مجموعہ ہے اس میں ان کے بارہ مختصر افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے سادہ اور روایتی انداز کے ہیں۔ جن میں عام طور پر پرانی کہانیوں کا سا لطف ہے ناوک صاحب اپنے ان افسانوں کی روشنی میں اردو کے گزشتہ پچاس سال کے افسانوی ادب سے زیادہ متاثر نظر نہیں آتے۔ ان کے افسانے آجکل کی پیچیدہ نفسیات اور افسانوی ٹیکنیک سے بھی دور ہیں۔ مگر ان میں بہت سے جدید افسانوں کی طرح لایعنی تفکرات، خام خیالیاں اور زبان و بیان کی خامیاں نہیں ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ افسانے بے کیف نہیں، جو بڑی بات ہے کتابت، طباعت اور کاغذ اوسط درجہ کے ہیں۔

ذکی کاکوروی

نام کتاب: "سفرنامہ"

مصنف: ڈاکٹر افضال احمد۔ قیمت پندرہ روپے

ملنے کا پتہ، سہیل پبلشرز۔ ۲۰۶ ڈیوڑھی آغا میر۔ لکھنؤ

ڈاکٹر افضال احمد ہمارے شہر کے جانے پہچانے ادیب ہیں اپنی گوشہ نشینی کے باوجود ادب اور اس کے حوالے سے اکثر ان کی خدمات کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔

یہ سفرنامہ ڈاکٹر افضال احمد کے سفرِ پاکستان کا ایک دل کش اور خوبصورت آئینہ ہے۔ انھوں نے اپنے اس سفر میں جو کچھ دیکھا جو جانا اور پہچانا اس کو جوں کا توں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ سفرنامہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم بھی ڈاکٹر افضال احمد کے ساتھ ساتھ ہیں وہ جہاں جا رہے ہیں اور جس سے ان کی ملاقات ہو رہی ہے ہم بھی وہیں ہیں اور وہ ہم سے بھی مل رہا ہے۔

سفرنامے میں جہاں ڈاکٹر افضال احمد نے اپنے رشتہ داروں اور ملنے والوں کا ذکر کیا ہے وہیں ان ادبی انجمنوں اور جلسوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کے اعزاز میں کیے گئے یا جن میں انھوں نے شرکت کی۔ ہندستان اور پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں میں روابط ہونا ایک تہذیبی ورثہ ہے۔ ڈاکٹر افضال احمد نے پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں سے مل کر اس تہذیبی و رشتے کی جڑوں کو اپنے خلوص اور محبت سے جو قوت بخشی ہے اس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

سفرنامے کی عبارت سادہ اور سلیس ہے اس میں کوئی ابہام یا الجھاؤ نہیں ہے۔ عام قاری بھی اس کو پڑھ کر آسانی سے حظ اٹھا سکتا ہے۔

———— وقار ناصری

نام کتاب: اُردو ادب اور بنگالی کلچر

مصنف: شانتی رنجن بھٹاچاریہ   قیمت: بارہ روپے

ملنے کا پتہ: مغربی بنگال اُردو اکاڈمی۔ ۱۷، سندری موہن ایونیو کلکتہ ۱۴

مغربی بنگال کے جن اُردو ادیبوں نے عزت، شہرت اور توقیر حاصل کی ہے ان میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا نام خاصا جانا پہچانا ہے وہ عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر لکھتے ہیں اور ہندستان کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے اردو اخبارات و رسائل میں ان کے مضامین نمایاں طور سے شائع کیے جاتے ہیں شانتی رنجن جس موضوع کو منتخب کرتے ہیں بڑی محنت سے کام کرتے ہیں۔

انھوں نے اُردو صحافت اور بنگال میں اُردو ادب سے متعلق امور پر خاص طور سے بہت کچھ لکھا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں انھوں نے مغربی بنگال میں اُردو کی تیز رفتار ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی کامیابی سے یہ بتایا ہے کہ اُردو میں بنگالی زبان اور ماحول سے مستفید ہونے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔

اس کتاب میں پانچ مضامین شامل ہیں جو بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون "اُردو اور بنگلہ زبان کا باہمی رشتہ" بڑا مفید اور دلچسپ ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو نے بنگالی زبان کے کیسے کیسے محاورات اور الفاظ کو اپنے اندر سمو لیا ہے اور اردو کے کون کون الفاظ اور محاورے بنگالی زبان میں مستعمل ہیں۔ ایک زبان کے الفاظ جب دوسری زبان میں داخل ہوتے ہیں تو کبھی کبھی بڑی دل چسپ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر معنی بدل جاتے ہیں کبھی تلفظ بگڑ جاتا ہے۔ یہ سب باتیں اس مضمون میں تفصیل سے آ گئی ہیں۔

دوسرا مضمون "اردو شاعری اور بنگالی کلچر" واضح کرتا ہے کہ اُردو شاعری ماحول سے ہمیشہ متاثر رہی ہے اور اس میں مختلف تہذیبوں کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ اس مضمون میں بنگال کے اُردو شعرا کی خدمات کا بھی ذکر ہے۔ وحشت کلکتوی کی ادبی خدمات کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ پرویز شاہدی، رفیق خاور، سید لطیف الرحمان، اشک امرتسری، حشمت فتح پوری، علقمہ شبلی، اولیس احمد دوراں، جذب انولوی، واحد آزادی، راشد مونگیری، اختر حمید خاں اختر، ہلال صدیقی، اصغر راہی، حافظ مقبول نظر، نوشاد نوری، رونق نعیم، سالک لکھنوی، شمیم انور، ریاض الدین حیدر ریاض، پیغام قریشی، کوثر عظیم آبادی، مختار صدیقی، جنید طاہری اور نازش سکندرپوری وغیرہ کے کلام کے اقتباسات دے کر

یہ بتایا گیا ہے کہ اُردو شاعری نے بنگالی ماحول سے پورا استفادہ کیا ہے۔

"بنگلہ دیش کا اُردو ادب اور بنگالی کلچر" میں بنگلہ دیش کے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ بنگلہ دیش سے نکلنے والے اُردو اخبارات، رسائل و جرائد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں کا بھی ذکر ہے۔

اس کتاب میں اردو کے نامور اور صف اوّل کے افسانہ نگار لطیف الدین احمد اکبرآبادی پر بھی ایک مضمون شامل ہے۔ اس مضمون کو ذرا طول دینے کی ضرورت تھی۔ لطیف احمد اکبرآبادی کے حالات اور تصانیف کا ذکر تفصیل سے ہو جاتا تو بڑا اچھا ہوتا۔

اس کتاب کا آخری مضمون ہے "بنگال سے متعلق اردو کے دو عظیم ناول"۔ اس ضمن میں مصنف نے فضل احمد کریم فضلی کے ناول "خونِ جگر ہونے تک" اور قرۃ العین حیدر کے ناول "آخرِ شب کے ہم سفر" کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ وہ ناول ہیں جن میں بنگال کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔ مضمون خاصا دقیع ہے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی یہ کتاب ہر لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے جسے مغربی بنگال اُردو اکاڈمی نے بڑے سلیقے اور نفاست سے شائع کیا ہے۔ صاف ستھری اجلی کتابت، سفید کاغذ اور آفسیٹ کی طباعت کے باوجود کتاب کی قیمت صرف بارہ روپے ہے۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: اعتقاداتِ سرسیّد اور شرر بدایونی
مصنف: طیب بخش بدایونی۔ قیمت: دس روپے
ملنے کا پتہ: پیلی کوٹھی، محلہ سوتھا۔ بدایوں

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سر سید احمد خاں نے جدید علوم و فنون کے حصول کے لیے مدرسۃ العلوم کے قیام نیز اس میں مذہبی تعلیم دیے جانے کا اہتمام کرنا چاہا تو قدامت پسند علما نے اس تحریک کی مخالفت زور و شور سے کی۔ کیونکہ انھیں خوف تھا کہ انگریزی اور علوم جدیدہ سے مشرقی تہذیب دم توڑ دے گی اور مغربی تہذیب کو پنپنے کا موقع ملے گا۔

سرسید کے مخالفین میں حاجی امداد علی، حاجی علی بخش خاں شرر بدایونی اور اکبر الٰہ آبادی کا نام لیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سر سید نے اپنے مقصد کے تحت کھینچ تان کر زمانے کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر لکھی تھی۔ اس تفسیر اور رسالہ تہذیب الاخلاق کی بدولت سر سید کے عقائد کھل کر لوگوں کے سامنے آگئے تھے، اس لیے مخالفتوں کا ایک دور شروع ہو گیا تھا۔

بعد میں جب سر سید کے خیالات میں تبدیلی اور اعتقادات میں کسی حد تک درستی ہوئی تو باشندگانِ ملک نے مدرسۃ العلوم کے قیام اور مذہبی تعلیم کے اہتمام میں سر سید تحریک کی بھرپور اعانت کی۔ سر سید کے مخالفین علومِ جدیدہ کے خلاف نہیں تھے۔ بلکہ سر سید کے مخصوص عقائد سے انھیں خوف تھا کہ کہیں علی گڑھ کے مدرسے میں تعلیم پانے والے طلباء بھی سر سید کی طرح نہ ہو جائیں۔

طیب بخش بدایونی نے بڑی ایمان داری اور خلوص کے ساتھ سر سید کی زندگی کا دوسرا رُخ پیش کیا ہے جس سے لوگ عموماً واقف نہیں تھے یا دیدہ و دانستہ اس رُخ سے پہلو تہی کرتے تھے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ کتابت و طباعت بھی اچھی ہے۔

——— نثار اعظمی

نیا دور

جلد ۴۲ نمبر ۱۱

فروری ۱۹۸۸ء

فہرست

اِیڈیٹر: —— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: —— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر: —— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: —— ۴۷۱۰۸

پبلشر اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

اپنی بات

وزیر اعلا اتر پردیش شری ویر بہادر سنگھ نے، جو ریاست کے وزیر مالیات بھی ہیں، ۲۶ فروری ۱۹۸۸ء کو ۸۹-۱۹۸۸ء کا بجٹ ریاستی اسمبلی میں پیش کیا۔ اس بجٹ کی بھی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بھی کسی نئے ٹیکس کی تجویز نہیں رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مالیاتی نظم و ضبط اور مستحکم مالیاتی بندوبست کے نتیجے میں موجودہ مالیاتی سال کے اختتام پر خسارہ کا نظرثانی شدہ تخمینہ بنیادی تخمینوں سے کم ہے۔ مالیاتی وسائل کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ سرکاری سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے کام کی، زیرو بجٹنگ سسٹم کے تحت انتظامی محکموں میں تشکیل شدہ کمیٹیوں کے توسط سے پیش رفت ہوئی ہے۔ اس طرح ۲۳۳ء۶۶ کروڑ روپے کا جو خسارہ بجٹ میں دکھایا گیا ہے، وہ گھٹ کر ۱۹۹ کروڑ روپے رہ گیا ہے۔

غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں زیادہ سے زیادہ کفایت شعاری اور سرکاری بقایاجات کی وصولی موثر ڈھنگ سے کرنے پر زور دیا گیا ہے جس سے تخمینی خسارہ پورا ہونے کی توقع ہے۔

بجٹ میں کسانوں، کم آمدنی والے اور کمزور طبقوں کی فلاح و ترقی پر خاص زور دیا گیا ہے۔ بیس نکاتی پروگرام کی عمل آوری میں اتر پردیش نے تمام ملک میں دوبارہ اولین مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس کے تحت ۸۹-۱۹۸۸ء میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام سے ۶ء۲۳ لاکھ افراد مستفید ہوں گے۔ قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین مزدور روزگار گارنٹی اسکیم کے تحت ۱ء۵۱ لاکھ انسانی یوم کے بقدر روزگار مہیا کیا جائے گا اور ۲۲ ہزار چھوٹے صنعتی واحدے قائم ہوں گے۔

۸۹-۱۹۸۸ء کے لیے ۳۰۵ لاکھ میٹرک ٹن اناج کی پیداوار کا نشانہ رکھا گیا ہے (یاد رہے کہ اس وقت اتر پردیش تمام ملک میں اناج کی پیداوار کے سلسلے میں سرفہرست ہے)۔

اتر پردیش کے زائرین حج کے لیے نئی دہلی میں جملہ سہولتوں سے آراستہ ایک "حج ہاؤس" کی تعمیر کرانے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔

وفیات

اُردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمت انجام دینے والی شخصیتیں یکے بعد دیگرے اُٹھتی جا رہی ہیں اور المیہ یہ ہے کہ ان شخصیتوں کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کے پُر ہونے کے امکانات نظر نہیں آ رہے ہیں۔

گزشتہ دنوں اُردو کے نامور افسانہ نگار ستیش بترہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ وہ ایک طویل عرصے سے افسانے لکھ رہے تھے، جو ہندوپاک کے مشہور و ممتاز رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ اکثر و بیشتر نیا دور کو بھی وہ اپنے قلمی تعاون سے نوازتے تھے۔ بہ سلسلۂ ملازمت وہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں قیام پذیر رہے۔ لکھنؤ میں بھی وہ ایک عرصے تک رہے۔ ان کا افسانہ پڑھنے کا انداز بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ افسانہ پڑھتے وقت وہ خود افسانے کا کردار بن جاتے تھے۔

شری رام رکھا مل خوشتر گرامی بھی گزشتہ دنوں چل بسے۔ اپنے رسالے "بیسویں صدی" کے توسط سے انھوں نے اُردو زبان و ادب کی بڑی نمایاں خدمت انجام دی، جس کے مستقل طنزیہ کالم "تیر و نشتر" نے خصوصی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ "بیسویں صدی" تعدادِ اشاعت اور مقبولیت کے اعتبار سے ہندوستان میں اُردو کا دوسرا سب سے بڑا ماہنامہ ہے۔

لکھنؤ کے جواں سال ادیب، شاعر اور افسانہ نگار شہنشاہ مرزا بھی گزشتہ دنوں ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے، نثری نظمیں بھی کہیں، تنقیدی مضامین اور فیچر وغیرہ بھی لکھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "تنقیدی تجزیے" کے نام سے اور نثری نظموں کا مجموعہ "سنگ لرزاں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں وہ بہت سرگرم رہتے تھے۔ خاص طور سے نئے ادب اور نئی شاعری کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں وہ بہت فعال تھے۔

ادارہ نیا دور ان شخصیتوں کی رحلت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔

غزلیں

فضا ابن فیضی

جمال پورہ - مئو ناتھ بھنجن

میں اپنی آگہی بھر لکھ رہا ہوں
جو قطرے کو سمندر لکھ رہا ہوں

ازل سے جس کے پیچھے قید ہوں میں
اسی دیوار کو در لکھ رہا ہوں

بدن کی خاک سے لپٹا ہوں، لیکن
ہوائے جاں کو شہپر لکھ رہا ہوں

مری آنکھوں میں نیندیں ہیں اسی کی
جسے خوابوں کا پیکر لکھ رہا ہوں

خمارِ ذوقِ بینش کچھ تو اترا
اب آئینے کو پتھر لکھ رہا ہوں

جو خود اپنے ہی پس منظر میں گم ہے
اسے منظر بہ منظر لکھ رہا ہوں

وہی ہم تم، وہی ہجرت کا موسم
کھنڈر کے نام اک گھر لکھ رہا ہوں

ابھرتے ہی نہیں آواز کے نقش
نہ جانے کس ورق پر لکھ رہا ہوں

معانی کے یہ نامہ بر پرانے
میں لفظوں کو کبوتر لکھ رہا ہوں

بہ ایں آشوبِ فن، اتنا بہت ہے
کہ کم از کم برابر لکھ رہا ہوں

وہی باتیں جو لکھی جا چکی ہیں
ذرا لہجہ بدل کر لکھ رہا ہوں

توجہ چاہتا ہوں دوستوں کی
جو میں خود کو مکرر لکھ رہا ہوں

فضاؔ سودا یہی ہے سب کے سر میں
کہ میں اگلوں سے بہتر لکھ رہا ہوں

شمیم جے پوری

کاشانۂ محمود - بنی سرائے
میرٹھ

اب کی بار سفر کس درجہ مشکل ہے بنجاروں کا
شیشے کا سامان سروں پر رستہ ہے کہساروں کا

صبح ہوئی تو صحنِ چمن میں لالہ و گل کی خاک ملی
ساری رات بجائے شبنم مینھ برسا انگاروں کا

کس کو دوست سمجھ لیں یارو کس کو ہم دشمن سمجھیں
آج بہت مشکل ہے جینا ہم سے دنیا داروں کا

ان کے سائے سے بچ کر چل کیا جانے کب گر جائیں
کوئی بھروسہ نہیں ہے راہ رواں اونچی دیواروں کا

سبزہ و لالہ و گل سے پوچھو کیسے ہوئی تعمیرِ چمن
خوں تو بہایا ناداروں نے نام ہوا زرداروں کا

آج غمِ دوراں نے ہم سے لطفِ شبِ غم چھین لیا
ورنہ کل تک ہم سے بھی تھا رشتہ چاند ستاروں کا

سارے مسیحا عیش میں گم ہیں کیسا علاج اور کیسی دوا
اب بستی میں پوچھنے والا کوئی نہیں بیماروں کا

میری تباہی کو تو لوگو اک مدت گذری لیکن
اب بھی کتابِ دل پہ لکھا ہے اک اک احساں یاروں کا

اہلِ وفا اب ذکرِ صنم بھی کرتے ہوئے شرماتے ہیں
جب سے قتلِ عام ہوا مقتل میں وفا کے ماروں کا

آج شمیمؔ وہ بھیڑ کے ڈر سے گھر میں سہما بیٹھا ہے
اک طفلِ نادان جو کل تک رسیا تھا بازاروں کا

ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتحپوری
صدر شعبۂ اردو
مہاتما گاندھی پوسٹ گریجویٹ کالج
فتح پور

عالمی ادب کا پہلا مکتوب

عالمی ادب کے پہلے مکتوب کے تعین سے پیشتر مناسب ہوگا کہ مکتوب کے خدوخال واضح کر دیے جائیں۔ خط کو عربی زبان میں کتاب یا مکتوب، فارسی میں نامہ اور ہندی میں پتر یا چٹھی کہتے ہیں۔ مصباح اللغات میں کتاب اور مکتوب کی معنوی حد بندی اس طرح کی گئی ہے:

"کتاب (مع م) جس میں لکھا جائے، خط، صحیفہ، فرض، حکم، اندازہ، جمع کُتُب، کُتْب۔ مفعہ۔ خط۔ ج۔ مکاتیب[1]"

فرہنگ آصفیہ میں خط کی معنوی صراحت اس طرح کی گئی ہے:

"خط۔ ع۔ اسم مذکر، (۱) نوشتہ، لکھت، تحریر، نوشت ـــہ

استرا منہ پہ جو پھرنے نہیں دیتا ہے بجا
محو دیندار سے کیونکر خط قرآں ہوتا
(ناسخ)

(۲) دستاویز، تمسک، سند، قبالہ
(۳) لکیر، لائن، دھاری، ڈنڈیر ـــہ

بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی
کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا
(غالب)

(۴) اقلیدس۔ وہ لکیر جس کا طول ہو اور عرض و عمق نہ ہو۔
(۵) نامہ، مکتوب، چٹھی، شقہ، پتری، رقعہ ـــہ

آگئے اک نامۂ دلدار دیا
خط مشکین رقم یار دیا
(مومن)

(۶) ڈاڑھی، ریش، سبزۂ رخسار ـــہ

کم ہوا خط شعاعی سے فروغِ آفتاب
کچھ نہیں غم گر خطِ رخسارِ جاناں بڑھ گیا
(ناسخ)

(۷) ہاتھ کا لکھا ہوا نستعلیق۔ دستخط
(۸) نشان۔ علامت[2]
(۹) حجامت۔ اصطلاح"

خط کی بابت مولوی عبدالحفیظ بلیاوی اپنی لغت میں رقمطراز ہیں:-

"خط، تحریر، کتابت، لبارا ستہ، خطّ (ن) خطّاً بالقلم۔ لکھنا۔ عربی میں اس کے لیے لفظ کتاب اور مکتوب مستعمل ہے۔"[3]

محمد عبداللہ خویشگی "فرہنگ عامرہ" میں لکھتے ہیں،

"خط (خَطّ۔ خَطْ) نوشتہ، چٹھی، نامہ، طرز تحریر، ڈاڑھی مونچھ، لمبی لکیر جس میں عرض اور عمق نہ ہو۔ جمع، خطوط۔"[4]

"مکتوب۔ (مَکْ تُوب) لکھا ہوا خط، تحریر۔ جمع، مکاتیب مکتوبات۔"[5]

"نامہ۔ لکھا ہوا خط، چٹھی۔ جمع: نامجات۔"[56]

جہاں تک نامہ یا مکتوب کو تعریف کے حصار میں مقید کرنے کا سوال ہے، تو اس کی حد بندی سیدھی سادی اور مختصر ہے۔ خط اس تحریر کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کاتب اپنے مکتوب الیہ کو اپنے دل کی بات پہنچاتا ہے۔ اس کے چار متعلقات و منسلکات ہیں؛

(۱) کاتب یا مکتوب نگار　　(۲) مکتوب الیہ

(۳) نوشتہ (تحریر)　　(۴) نامہ بر

جن میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ مقصود بالذات اور بقیہ دو مقصود بالغیر ہوتے ہیں۔ تحریر کی حیثیت ذریعۂ اظہار کی، اور نامہ بر کی حیثیت وسیلہ اور واسطہ کی ہے۔ اس طرح نوشتہ دو آدمیوں کے بیچ کی گفتگو ہے جس میں تحریر کان یا زبان کے فرائض انجام دیتی ہے۔ کاتب مکتوب کے واسطے سے کچھ کہتا ہے اور یہاں تحریر زبان کا کام کرتی ہے اور مکتوب الیہ تحریر کی وساطت سے کچھ سنتا ہے اور یہاں تحریر کی حیثیت کان کی ہو جاتی ہے۔ خط کسی نہ کسی ضرورت کے تحت صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ خط جو برائے تفنن طبع لکھا جائے، خط نہیں، انشائیہ ہے، برجستگی، بے تکلفی، شخصی اظہار، سچائی، سادگی اختصار، خلوص، جامعیت اور معصومیت ایک اچھے خط کے خاص جوہر ہیں۔

شیلے نے خط کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خط عام طور سے مکتوب نگار (پہلا آدمی) اور مکتوب الیہ (دوسرا آدمی) کے بیچ تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہے۔"[57]

سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے؛

"خط کیا ہے۔ آپس میں دو آدمیوں کی بات چیت"[58]

تنقیدیں میں ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

"خط حسن اتفاق کا نام ہے۔ خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنتے جاتے ہیں۔ خط لکھتے وقت صرف دو انسانوں کی خودی بیدار ہوتی ہے، صرف دو انسان زندہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ساری دنیا غنودگی کے عالم میں ہوتی ہے۔"[59]

ڈاکٹر عبدالحق کے لفظوں میں:-

"خطوں میں وہ صداقت و خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہاں بچپن کی سی سادگی سے انسان بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں، جنھیں نہ انشاء کی صورت مسخ کر سکتی ہے اور نہ تشبیہات و استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحہ پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت، ہر خیال اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔"[60]

ڈاکٹر شہناز انجم نے خط کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے،

"مختصر، جامع اور مؤثر تحریر، جس میں سرگوشی اور ہمکلامی کی کیفیت پائی جاتی ہے، وہ خط کہلاتا ہے۔"[61]

مکتوب کی بابت اس قدر تمہید کے بعد جب اصل موضوع کی طرف پیش قدمی کی جاتی ہے تو سب سے پہلے ڈاکٹر خورشید الاسلام کا نظریہ سامنے آتا ہے جنھوں نے خطوط نویسی کے رشتہ کو سیسرو سے منسلک کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مکتوب نگاری کی ابتدا سلطنت روم کے سائے میں ہوئی۔ روم کی زندگی کی جھلکیاں اور اس کی معاشرت کی پرچھائیاں دیکھنی ہوں تو سسرو کے مکاتیب دیکھیے۔"[62]

دوسرا نظریہ، جس سے اس نظریہ کا خود بخود بطلان ہو جاتا ہے، ڈاکٹر شہناز انجم کا ہے، جس کو انھوں نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور تفسیر سورۂ یوسف منظوم مطبوعہ مطبع نظامی کان پور ۱۲۸۰ھ کے حوالے سے اپنے تحقیقی مقالہ "ادبی نثر کا ارتقاء" میں اس طرح ظاہر کیا ہے:-

"یعقوبؑ نے شاہ مصر کے نام عبرانی زبان میں خط لکھ کر اپنے بیٹوں کو بھیجا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہ بادشاہ مصر کو یہ خط دیں اور یوسفؑ و بنیامین کو تلاش کریں۔"

موصوفہ نے اس خط کا زمانہ ۱۸۶۸ ق.م / ۱۸۶۶ ق.م متعین کیا ہے۔ ڈاکٹر شہناز انجم کا مرقومہ بالا نظریہ بھی تحقیق کی کسوٹی پر درست

نہیں نکلتا۔ ڈاکٹر موصوفہ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس خط کا متن ان کے سامنے نہیں ہے اور پھر امکانات و توقعات کے دھندلکے میں فیصلہ بھی صادر فرما دیا کہ یہ نجی خط ہوگا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ڈاکٹر موصوفہ کی عبارت من و عن نقل کر دی جائے۔

"اگرچہ اس خط کا متن ہمارے سامنے نہیں، مگر واقعہ کی نوعیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ براہ راست اور نجی خط ہوگا، کیونکہ مکتوب نگار کے پیش نظر کسی سیاسی مقصد کا حصول نہیں اور مذہب کی تبلیغ یا وعظ و نصیحت کا معاملہ بھی پیش نظر نہیں۔ واقعہ کی کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک مضطرب اور دل گرفتہ باپ کے دل کی پکار ہے، جس کو وہ خط کی صورت میں حاکم مصر کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ اپنے بے گناہ بیٹے کو بری کرا سکے۔ یعنی اس خط میں نہ صرف یہ کہ دو فریق مکتوب نگار اور مکتوب الیہ نظر آتے ہیں بلکہ یہ بھی علم ہوتا ہے کہ مکتوب نگار نے اپنے ذاتی معاملہ کے پیش نظر یہ خط تحریر کیا اور اس خط میں عوام یا اجتماعی زندگی سے متعلق کوئی مسئلہ یا واقعہ پیش نہیں کیا ہوگا۔" [4]

مندرجہ بالا اقتباس اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس باب میں ڈاکٹر موصوفہ کی ساری تگ و دو ظن (Surmise) اور اندازہ اٹکل (Conjecture) پر مبنی ہے۔ جبکہ تحقیق کی شرع میں ظن، اندازہ اور اٹکل شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تحقیق کی شرع میں بغیر کسی مضبوط دلیل یا ٹھوس بنیاد کے نہ نیا نظریہ تعمیر کرنا روا ہے اور نہ کسی مروجہ نظریہ کو توڑنا ہی جائز ہے۔ یہاں معقول وجوہ و علل کے سہارے نئے بت بنتے اور پرانے بت ٹوٹتے ہیں۔ کسی چیز کی اصلیت، واقعیت یا اس کی موضوعیت کا پتہ لگانے کے لیے معروضی انداز، صحت مند، متوازن اور ہوش مند ذہن نیز غیر جانبدار طریقوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اس طرح داخلی و خارجی اور نفسیاتی و ماحولی شہادتوں نیز ان کے چھان پھٹک سے مثبت یا منفی نظریہ فیصل ہو کر خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ تحقیق کی راہ میں نظریے بنائے نہیں جاتے بلکہ شواہد و براہین کی روشنی میں خود بخود منکشف ہو جاتے ہیں، فیصلے صادر نہیں کیے جاتے، خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کی طرف منسوب خط کو اصلیت و واقعیت اور موضوعیت و خود ساختگی کی کسوٹی پر کسنے سے پیشتر بہتر ہوگا کہ ذیل میں محولہ بالا مکتوب کا متن بعینہٖ نقل کر دیا جائے۔

"من یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحٰق
ذبیح اللہ بن ابراھیم خلیل اللہ إلی
عزیز مصر۔ امابعد فانا اھل البیت
موکل بنا البلاء اماجدی نشدت
یداہ و رجلاہ و رمی لہ فی النار
لیحرق فنجاہ اللہ تعالیٰ وجعلت النار
علیہ برداً وسلاما و اما ابی فوضع
علیٰ قفاہ السکین لیقتل فغداہ اللہ
تعالیٰ و اما انا فکان لی ابن وکان
احب الاولاد الی فذھب بہ اخوتہ
الی البریۃ ثم أتونی بقمیصہ ملطخًا
بالدم وقالوا قد اکلہ الذئب
فذھبت عینای من بکائی علیہ ثم
کان لی ابن کان اخاہ من امہ وکنت
أتسلی بہ فذھبوا بہ ثم رجعوا و
قالوا: انہ سرق وانک حبستہ لذالک
وإنا اھل البیت لا نسرق ولا نلد
سارقاً فان رددتہ علی و الا دعوت
علیک دعوۃ تدرک السابع من
ولدک، والسلام"۔ [5]

ترجمہ: یہ خط اللہ کے بندے یعقوب ولد اسحاق، جو خدا کے ذبیح ہیں، ولد ابراہیم، جو خدا کے دوست ہیں، کی طرف سے عزیز مصر کے نام ہے۔ بہرحال

ہم لوگ آزمائشوں کے دور میں ہیں۔ میرے دادا کے ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے تھے اور ان کو جلا ڈالنے کی خاطر آگ میں ڈال دیا گیا تھا۔ اللہ نے ان کو نجات دی اور آگ کو ان کے لیے ٹھنڈا اور ان کو صحیح و سالم رکھنے والا بنا دیا۔ میرے باپ کی گردن پر چھری رکھ دی گئی تاکہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ اللہ نے ان کو بھی بچا لیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میرا ایک لڑکا تھا، جس کو میں سب سے زیادہ چاہتا تھا، اس کو اس کے بھائی جنگل لے گئے پھر میرے پاس اس کی خون سے لت پت قمیص لائے اور کہنے لگے کہ اس کو بھیڑیا لے گیا۔ اس کے لیے رونے کی وجہ سے میری آنکھیں چلی گئیں۔ پھر میرا ایک لڑکا تھا، جو ماں کی جانب سے اس کا بھائی تھا اور میں اس سے تسلی حاصل کرتا تھا، اس کو وہ لوگ لے گئے پھر لوٹ کر آئے اور انھوں نے کہا کہ اس نے چوری کی اور آپ نے اس جرم کی پاداش میں اس کو روک لیا ہے۔ ہم لوگ چوری نہیں کرتے اور نہ کوئی چور پیدا کرتے ہیں۔ آپ اس کو واپس کر دیں ورنہ میں ایسی بددعا کروں گا جو آپ کی سات پشت تک چلتی رہے گی۔ اور سلام ہو۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف منسوب یہ مکتوب قابل استناد نہیں ہے۔ اس کی صداقت و واقعیت مندرجہ ذیل وجوہ و علل کی بنا پر مشکوک ہے اور یہی وجوہ و علل اس کی اصلیت و واقعیت کو مجروح کرنے اور خط کو ساقط المعیار بنانے کے لیے کافی ہیں۔

معرض بحث مکتوب کی بابت جہاں تک مثبت نتیجہ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں خارجی شہادتیں ہماری مدد کرنے میں قطعی طور پر ناکام ہیں۔ ظہور اسلام سے پیشتر کے واقعات سے منسلک کسی معروضہ کے اثبات یا انکار میں سب سے بہتر شہادت قرآن کریم سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس نامہ کو لے کر جب دریائے تحقیق کا شناور قرآن کریم کے سمندر میں غوطہ زنی کا شرف حاصل کرتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ وہاں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ مفصل طور پر ایک مستقل سورہ کی شکل میں موجود ہے۔ اور اس میں مخصوص واقعہ یعنی بنیامین کو عزیز مصر کا روکنا اور اس کی مکمل نوعیت بھی درج ہے۔ لیکن اس تفصیل کے باوجود قرآن کریم میں کسی مکتوب کی ترسیل کا کوئی خفیف سا اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ جبکہ سورہ نمل میں حضرت سلیمان اور بلقیس کے تذکرہ کے دوران نامۂ سلیمان، ذریعۂ ترسیل، نامۂ مبارک کا متن، مکتوب الیہا اور مکتوب الیہا پر نامہ کے اثرات کی صراحت بالتفصیل مرقوم ہے۔

احادیث میں بھی حضرت یعقوب اور عزیز مصر کے درمیان کسی نامہ کا تذکرہ نہیں ملتا۔ حضور صلعم کے مکاتیب مقدسہ کی تعداد خاصی ہے اور مکتوب نگاری کی بابت آپ کی وقیع اور بابرکت رائیں بھی مشعل راہ کی حیثیت سے کتب احادیث میں درخشاں و تاباں ہیں۔ تفاسیر کی طرف رجوع کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ جلالین و مدارک نامۂ یعقوبؑ کی بابت ساکت اور جامد ہیں۔ "روح المعانی" میں جو بہت بعد کی تفسیر ہے اور جس کے مصنف ابوالفضل شہاب الدین سید محمود کا سن وفات ۱۲۷۰ھ ہے کشاف مصنفہ علامہ جار اللہ زمخشری کے حوالہ سے اس مکتوب کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ہر دو کتب تفسیر میں نامۂ معرض بحث اور اس کا متن (Text) "قیل" لفظ کے ذریعہ منقول ہے، جو بذات خود مقتبس کے ضعف کی طرف غمازی کرتا ہے۔ تفسیر کی دونوں محولۂ بالا کتابوں نے کسی بھی مستند یا غیر مستند ذریعہ کو بطور حوالہ استعمال نہیں کیا اور اس "قیل" کا قائل پردۂ خفا سے باہر نہ نکل سکا۔ اس طور پر خارجی شہادتیں نامۂ یعقوب کی اصلیت و واقعیت کو متحقق نہیں کرتیں اور جہاں تک داخلی نفسیاتی و ماحولی شہادتوں کا سوال ہے تو وہ بھی مکتوب کی اصلیت و واقعیت کو ثابت کرنے کے بجائے اس کے موضوع اور خود ساختہ ہونے کی طرف واضح اشارے کرتی ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) نامۂ معرض بحث کا آغاز، ایک نبی کے مکتوب ہونے کے باوجود خدا کے نام سے نہیں کیا گیا جبکہ طریقۂ متداولہ کی بنا پر کفار قریش تک اپنے مکاتیب کی ابتدا باسمک اللّھم سے کرتے تھے۔

(۲) نامہ میں حضرت اسحاق کو ذبیح اللہ لکھا گیا ہے، جبکہ حضرت اسحاق قطعی طور پر ذبیح اللہ نہیں ہیں۔ ذبیح اللہ ان کے بڑے بھائی حضرت اسمٰعیل ہیں۔ واقعۂ ذبح کے وقت حضرت اسحاق کی ولادت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسمٰعیل و اسحاق دونوں عبرانی الفاظ ہیں جن کے عربی مبادل بالترتیب سمیع اللہ اور ضحاک ہیں۔ معالم التنزیل میں مرقوم ہے کہ حضرت اسمٰعیل کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کے والد محترم بچہ مانگتے وقت اسمع یا ایل یا ایل کہتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر حضرت اسمٰعیل کی ولادت کے وقت ۹۹ سال اور حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت ۱۱۲ سال تھی[۱۱] اسحاق کے ساتھ "ذبیح اللہ" کی صفت کا اتصاف اس بات کو منکشف کرتا ہے کہ محولہ بالا مکتوب خود ساختہ اور موضوع ہے۔

(۳) انبیائے کرام کا کلام اور ان کے خطوط نہایت موجز اور مختصر ہوتے ہیں۔ بلقیس کے نام حضرت سلیمان کا خط محفوظ ہے جو اختصار اور جامعیت میں مثالی حیثیت رکھتا ہے، جبکہ حضرت یعقوبؑ کی طرف منسوب محولہ بالا خط بے جا طول کا شکار ہے اور حشو و زوائد سے مملو ہے۔

(۴) معرضِ بحث خط کا اسلوب جذباتی اور اس کا اندازِ بیان استحصالانہ ہے، جس میں "پدرم سلطان بود" کے ذریعہ مکتوب الیہ کو متاثر کرنے بلکہ مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کاوش کی گئی ہے کہ نسبی انعامات و نوازشات کا سہارا لے کر اپنے لڑکے کی برأت ثابت کی جائے جبکہ مکتوب نگار کے جد امجد سے خداوند قدوس نے صاف صاف فرما دیا تھا کہ لاینال عہدی الظالمین (میرے عہد کو ظالم نہیں پاتے) یہ اس وقت فرمایا گیا تھا جب مکتوب نگار کے جد امجد نے اپنی ذریت کے لیے عہد امامت کی التجا کی تھی۔ ذاتی شرافت اور نسبی شرافت کے مابین علت و معلول یا سبب و مسبب کے قبیل کا کوئی رشتہ یا علاقہ نہیں ہے۔

(۵) کان لی ابن کان اخاہ من امہ کی ترکیب محل نظر ہے۔

بنیامین حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی تھے۔ اس مختصر سے مفہوم کو معرضِ تنقیح خط میں اتنی لمبی ترکیب (میرا بیٹا، جو اس کی ماں کی جانب سے اس کا بھائی ہے) سے ادا کیا گیا ہے، جس سے خط کی معنویت و غرابت اور اس کی موضوعیت کی غمازی ہوتی ہے۔

(۶) کوئی شخص محض ذاتی معلومات یا شخصی تجربات کے سہارے اپنے خانوادے کے ہر فرد یا کسی مخصوص فرد کی جانب سے معصیت یا کسی خاص وقت میں کسی مخصوص حالت کے تحت، کسی مخصوص ناگفتہ بہ فعل یا حرکت کے سرزد ہو جانے کی ادعائی نفی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انبیائے عظام کے علاوہ کوئی شخص معصوم نہیں ہے۔ نبی آخرالزماں نے اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ زہرؓا سے فرمایا تھا کہ اے فاطمہ تم کو نبی کی بیٹی ہونا کچھ بھی فائدہ نہ دے گا۔ نبی علیٰ وجہ التمام اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ مکتوب میں جس قسم کا دعویٰ کرتے ہوئے نبی کو دکھلایا گیا ہے یعنی "انا اھل البیت لا نسرق" وہ نبی کے شایانِ شان نہیں ہے۔ مزید برآں اس مکتوب کے بین السطور سے واضح ہوتا ہے کہ مکتوب نگار یوسف و بنیامین کے علاوہ اپنے دوسرے بیٹوں کو دروغ گو، سازشی اور حیلہ ساز سمجھتا ہے اسی لیے اس نے یوسفؑ کو بھیڑیے کے کھا جانے والی بات اور بنیامین کی چوری اور اس کی پاداش میں ان کی حبس والی بات کو قالوا (انھوں نے کہا) کے زمرہ میں رکھا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ پہلے والی بات میں ابنائے یعقوبؑ عمدی دروغ گو اور سازشی تھے اسی لیے بھیڑیے والی بات کو سن کر حضرت یعقوبؑ نے ان کی تردید کرتے ہوئے "بل سولت لکم انفسکم امراً فصبرٌ جمیل"[۱۲] (یہ سب تمھاری سازش اور اپنے دل سے تراشی ہوئی باتیں ہیں، بہرحال میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں) کہا تھا۔

(۷) محولہ بالا نامہ میں فقرہ "لا نلد سارقاً" بھی تحقیق کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا۔ خالق کائنات کے علاوہ کسی ذات کے بس میں پیدائش ہی نہیں، چہ جائیکہ صالح اور غیر صالح اولاد پیدا کرنا۔ یہ خدا کی قدرت و مصلحت ہے کہ وہ آدمؑ کے

گھر قابیل، نوحؑ کے گھر کنعان اور آذر کے گھر ابراہیمؑ پیدا کرتا ہے۔ مجوزہ مکتوب نگار کے جدامجد حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت بارگاہ خداوندی میں یہ دعا کی تھی کہ اس عہد امامت میں جو ان کو منجانب اللہ تفویض کیا جا رہا ہے ان کی ذریت کو بھی شامل کر لیا جائے، تو خداوند قدوس نے واضح طور پر فرما دیا تھا کہ "لاینال عہدی الظالمین" جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اولاد ابراہیم میں عادل اور ظالم دونوں ہوں گے اور ظالم عہدۂ امامت سے محروم رکھے جائیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دوسرے مقام پر اپنی دعا میں خاص طور پر الفاظ "ربّ اجعلنی مقیم الصلوٰۃ ومن ذرّیتی ربّنا وتقبّل دعاء" میں "من" کے ذریعہ تبعیض پیدا کی ہے۔ کیونکہ خدا نے ان کو بتلا دیا تھا کہ ان کی ذریت میں کفار بھی ہوں گے۔ معروضات سابقہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی اس قسم کا جملہ نہیں بول سکتا کہ "ہم چور نہیں پیدا کرتے"۔ یہ کہنا کہ ہمارا لڑکا چور نہیں ہے محل نظر نہیں ہے، لیکن یہ کہنا کہ ہم چور نہیں پیدا کرتے یقیناً محل اعتراض ہے اور خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اس کا منسوب الیہ کوئی نبی ہو۔

(۸) انبیائے کرام کے افعال و اعمال خالصۃً لوجہ اللہ ہوتے ہیں وہ خاص اپنی خاطر کسی کو بددعا نہیں دیتے۔ طائف میں لہولہان ہو جانے پر بھی نبی آخر الزمانؐ نے مجرموں کو بددعا نہیں دی بلکہ عذاب کی پیشکش پر بھی ان کے لیے عذاب کو پسند نہیں فرمایا۔ محولہ بالا نامہ میں بنیامین کو واپس نہ کیے جانے پر ایسی بددعا کی بات کی گئی ہے جس کا نفوذ پشت در پشت ساتویں اولاد تک چلے گا۔ متعلقہ فقرہ شیوۂ پیغمبری کے خلاف ہے۔

(۹) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لڑکے کی گردن پر چھری قربانی کی خاطر رویائے صادقہ کے تحت رکھی تھی، جس کو قتل اور فدیہ کو نجات سے تعبیر کرنا محلِ نظر ہے۔

(۱۰) عزیز مصر نے دوران قحط خانوادۂ یعقوبؑ کی کافی مدد کی تھی اور غلہ کے ساتھ ان کی پونجی بھی واپس کر دی تھی، جس کا اعتراف ابنائے یعقوبؑ بھی کر چکے تھے، ایسے اور اتنے بڑے محسن کے لیے وہ الفاظ جو محولہ بالا مکتوب میں استعمال کیے گئے ہیں، قرین عقل اور قرینِ قیاس نہیں ہیں۔ بالخصوص ان حالات میں کہ ابنائے یعقوب نے یعقوبؑ کو بنیامین کے سامان میں سے سرکاری پیمانہ کی برآمدگی کی بات بتلا دی تھی اور عزیز مصر نے سزا بھی وہ دی تھی جو تعزیراتِ شام اور خانوادۂ یعقوبؑ کے قوانین کے عین مطابق خود ابنائے یعقوبؑ کے بیان کردہ اصول کے تحت تجویز کی گئی تھی۔

(۱۱) مکتوب کا خاتمہ سلام پر کیا گیا ہے، جبکہ مکتوب نگار، مکتوب الیہ کے دین و مذہب سے قطعاً نابلد ہے بلکہ اوّل الذکر موخر الذکر کو واجب القتل بھی سمجھتا ہے۔

اس امر کے انکشاف کے بعد کہ حضرت یعقوبؑ کا محولہ بالا خط دنیائے ادب کا پہلا خط نہیں کہا جا سکتا، سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر آخر عالمی ادب کا پہلا خط کون سا خط کہلائے گا۔ دستیاب مواد کی روشنی میں وہ خط حضرت سلیمانؑ کا خط ہے جو انھوں نے ملکۂ سبا، بلقیس کے پاس ہُدہُد پرندہ کے ذریعہ ارسال کیا تھا۔ خط کا متن حسبِ ذیل ہے:—

من عبداللہ سلیمٰن بن داؤد
الیٰ بلقیس ملکۃ سبا
بسم اللہ الرحمن الرّحیم۔ السلام
علیٰ من اتبع الھدیٰ امابعد فلاتعلوا
علیٰ و اتونی مسلمین ؏

("یہ خط اللہ کے بندہ سلیمان بن داؤدؑ کی طرف سے سبا کی ملکہ بلقیس کے نام ہے۔
اس اللہ کے نام سے آغاز کرتا ہوں، جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اس پر سلامتی ہو، جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ بہر حال تم مجھ سے سرکشی نہ کرو اور میرے پاس فرمانبردار ہو کر آجاؤ۔") ۱

قرآن حکیم میں حضرت سلیمانؑ کے اس مکتوب کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

إذهب بكتابي هذا فالقه اليهم ثم
تول منهم فانظروا اذا يرجعون ، قالت
يا ايها الملؤ إني القي إلي كتاب كريم
انه من سليمن و انه بسم الله الرحمن
الرحيم ، ألا تعلوا علي واتوني مسلمين[۲۱]

ترجمہ، حضرت سلیمانؑ نے ہدہد سے کہا، میرا یہ خط لے کر جاؤ اور اس کو ان کی طرف ڈال دو، پھر ان کے پاس سے ہٹ جاؤ۔ اس کے بعد دیکھو وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ بلقیس کہنے لگی: اے دربار والو! میرے پاس ایک عزت کا خط ڈال دیا گیا ہے۔ یہ خط سلیمان کی جانب سے ہے۔ خط کا آغاز خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے ہے (اس میں لکھا گیا ہے) یہ کہ میرے مقابلہ میں زور نہ کرو اور حکم بردار ہو کر میرے سامنے چلی آؤ۔"

علامہ جاراللہ زمخشری نے بھی "کشاف" میں حضرت سلیمانؑ کے مکتوب کا متن نقل کیا ہے جو "جلالین" اور "مدارک" سے منقول مذکورہ بالا مکتوب سے بعینہ مطابقت کرتا ہے۔[۲۲]

اس خط کا نامہ بر ہدہد پرندہ تھا۔ نامۂ سلیمان پر بحث کرتے ہوئے کشاف نے لکھا ہے کہ انبیائے کرام کے مکاتیب مختصر و موجز ہوتے ہیں۔ صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ انبیائے عظام کے خطوط ایجاز و اختصار پر مبنی ہوتے ہیں۔ علامہ زمخشری نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت سلیمٰن نے خط کو مشک سے لکھ کر اس کو سیل مہر کیا تھا۔ ہدہد اس خط کو لے کر جب بلقیس کے پاس پہنچا، تو وہ اپنے محل میں سو رہی تھی۔ بلقیس کی عادت تھی کہ وہ دروازے بند کر کے کنجیوں کو اپنے سرہانے رکھ کر سوتی تھی۔ ہدہد بلقیس کے دارالاقامت میں روشن دان کے ذریعہ داخل ہوا اور خط کو چت لیٹی ہوئی بلقیس کی گود میں ڈال دیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ بلقیس ہدہد کے اڑنے پر گھبرا کر جاگ گئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ جس وقت ہدہد خط کو اپنی چونچ میں دبائے ہوئے آیا تو بلقیس کے اردگرد اس کا لشکر اکٹھا تھا۔ ہدہد کچھ دیر تک فضا میں اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا رہا اور لوگ اس منظر کو دیکھتے رہے۔ جب بلقیس نے اپنا سر اٹھایا تو ہدہد نے اس کی گود میں حضرت سلیمان کا نامہ مبارک ڈال دیا۔

بلقیس تبع ابن شراحیل حمیری کی اولاد سے ہونے کے ناطے عربی النسل تھی اور لکھنا پڑھنا بخوبی جانتی تھی۔ اس نے اپنے مشیروں سے مشورہ لیا اور بالآخر حضرت سلیمان کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئی۔ حضرت سلیمان کی مادری زبان عبرانی اور بلقیس کی زبان عربی تھی۔ نامۂ سلیمان کس زبان میں تھا؟ اس بارے میں اتنے زیادہ اختلافات ہیں کہ چھان پھٹک سے بھی کوئی مستند نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ حضرت سلیمانؑ پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے اور ان سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ سورۂ نمل میں خدا نے حضرت سلیمانؑ سے کہلوایا ہے:

علمنا منطق الطير[۲۳]

"ہم کو پرندوں کی بولیاں سکھلائی گئی ہیں"

اور عملی طور پر چیونٹی اور حضرت سلیمان نیز ہدہد اور پیغمبر موصوف کے مابین محادثت دکھلائی گئی ہے اور ان کی گفتگو سے ہم کو واقف کرایا گیا ہے ممکن ہے کہ اس زمانہ میں پرندوں کی بولیاں اور ان سے واقفیت ایک علمی حیثیت کی حامل ہو۔ جہاں تک ہدہد کی نامہ بری کا مسئلہ ہے تو بعض جانوروں کا خاص حاسہ انسان اور دوسرے جانوروں کی بہ نسبت تیز ہوتا ہے۔ ہدہد کی بابت مشہور ہے کہ وہ جس جگہ زمین کے نیچے پانی قریب ہو، محسوس کر لیتا ہے۔ زمین میں جس جگہ مٹی کے نیچے کینچوا ہو وہ اس کو محسوس کر کے فوراً نکال لیتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی دو ایک بالشت زمین کھودتا ہے، تب وہاں سے کینچوا نکلتا ہے۔ عہد وسطیٰ میں کبوتروں کی نامہ بری کافی مشہور ہے اور عہد حاضر میں جانوروں سے بہت سارے مفید کام لیئے جاتے ہیں۔

ماقبل کی معروضات سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں،

۱۔ خط کی مکتوب الیہا کا نام بلقیس تھا
۲۔ وہ پڑھی لکھی عورت تھی
۳۔ وہ تبع ابن شرحیل حمیری کی پشت سے ہونے کی وجہ سے عربی نسل کی خاتون تھی۔

۴۔ خط کا متن بہت مختصر تھا۔
۵۔ خط مشک سے لکھا گیا تھا۔
۶۔ خط سربمہر تھا
۷۔ مکتوب نگار منطق الطیر کا عالم تھا اور پرندوں سے گفت و شنید کرتا تھا۔

ماسبق میں خط کی بابت محققین کی وقیع رایوں اور خط کے بنیادی متن کو مدنظر رکھ کر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حضرت سلیمان کا معرض بحث خط، ایک مثالی خط ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس مکتوب کی بابت فرمایا ہے کہ

" دنیا میں ایسا مختصر اور پرمعنی مکتوب کسی کو نہیں لکھا گیا جیسا کہ حضرت سلیمان کا یہ خط جو قرآن میں مذکور ہے، نہایت ہی مختصر اور نہایت ہی بلیغ اور پرمعنی ہے۔" [۲۳]

اس موقع پر اس حقیقت کا انکشاف بے محل نہ ہوگا کہ مکتوب نگاری کی دنیا کا مختصر ترین جوابی خط خلیفہ ہارون رشید کا وہ خط ہے جس کا مکتوب الیہ نغفور رومی تھا۔ نغفور نے اپنی ماں کے انتقال کے بعد اپنے خط میں خلیفہ ہارون رشید کو جزیہ دینے سے انکار کیا تھا اور خلیفہ سے ان رقوم کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا، جو اس کی ماں کے زمانہ میں ادا کی گئی تھیں۔ مکتوب کے متن کو میرے استاد محترم حضرت علامہ عبدالوحید صاحب دام ظلہ نے تاریخ الخلفاء کے حوالہ سے نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، من ہارون
امیرالمومنین الی فغفور کلب الروم
قد قرأت کتابك یا ابن الکافرہ والجواب
ماتراہ لا ماتسمعہ

" اس خدا کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ یہ خط امیرالمومنین ہارون کی جانب سے روم کے کتے نغفور کی طرف ارسال ہے۔ اسے کافرہ کے بچے! میں نے تیرا خط پڑھ لیا ہے اور اس کا جواب یہ ہے جو تو دیکھے گا نہ کہ وہ جو تو سنے گا۔"

حضرت سلیمانؑ کی ولادت حضرت عیسیٰؑ سے ۱۰۳۳ سال قبل اور ان کی وفات عیسیٰؑ سے ۹۷۵ سال قبل ہوئی۔ ان کی تخت نشینی کا سن ۱۰۱۵ ق۔م ہے۔[۲۴] ان معروضات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ حضرت سلیمان کا یہ خط یقیناً ۱۰۱۵ قبل مسیح کے بعد کا ہے۔ اس مکتوب کی مکتوب الیہا کی بابت مرقوم ہے کہ وہ ۹۵۰ ق۔م میں آپ کے دست اقدس پر مشرف بہ اسلام ہوئی تھیں۔[۲۵] مکتوب الیہا، مکتوب نگار کی دعوت پر، جو مکتوب مندرجہ بالا کے موجز متن میں مذکور ہے، ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تھیں اور اسلام لائی تھیں۔ اس لیے اس خط کا زمانہ ۹۵۰ ق۔م یا اس کے آس پاس متعین ہوتا ہے۔

اس طور پر اس جائزہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ عالمی ادب کا پہلا خط حضرت سلیمان کا معرض بحث خط ہے اور جب تک اس سے پیشتر کا کوئی خط پردۂ خفا سے باہر نکل کر منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہوتا، عالمی مکتوباتی ادب میں اولیت کے تخت پر اسی خط کی حکمرانی چلتی رہے گی۔ ☆☆

حواشی

۱۔ مصباح اللغات۔ مولوی عبدالحفیظ بلیاوی ص ۱۲
۲۔ فرہنگ آصفیہ ج ۲۔ مولوی سید احمد دہلوی۔ ترقی اردو بورڈ۔ اڈیشن ۱۹۷۴ء ص ۱۹۹
۳۔ مصباح اللغات ص ۱۸۴
۴۔ فرہنگ عامرہ۔ محمد عبداللہ خویشگی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۳۰۳
۵۔ فرہنگ عامرہ ص ۵۰۴
۶۔ فرہنگ عامرہ ص ۵۳۲
۷۔ ڈکشنری آف ورلڈ لٹریچر ۱۹۴۳ء
۸۔ مکاتیب مہدی۔ مرتبہ مہدی بیگم ۱۹۳۸ء، گورکھپور ص ۳
۹۔ تنقیدیں، ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ انجمن ترقی اردو ہند ص ۱۱
۱۰۔ مقدمات عبدالحق حصہ دوم، مرزا محمد بیگ ۱۹۳۱ء۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد ص ۹۸

(باقی ص ۱۷ پر)

نثار عباسی
"گوشۂ عافیت" ۳/۸۳ [illegible] بی
کریلی ہاؤسنگ اسکیم ۔ الہ آباد

مولانا ابوالکلام آزاد

جس کو کہتے ہیں کلامِ نیک نام
جنگِ آزادی کا تھا وہ اک امام

تھا لب و لہجے میں اس کے اک وقار
اس کی ہر تحریر تھی اک شاہکار

تھا سیاست کا وہ اک روشن چراغ
رکھتا تھا بیشک وہ اک اعلیٰ دماغ

قومی یک جہتی کا تھا رُوحِ رواں
ناز جس پہ کرتا ہے ہندوستاں

تھا مترجم کلامِ ایزدی کا
صاحبِ دل، صاحبِ علم و ذکا

اس کی کاوش "البلاغ" و "الہلال"
اس کی تحریروں کا وہ جاہ و جلال

وہ صحافت کی بہارِ بے خزاں
جس سے تھا گلزار صحنِ گلستاں

جنگِ آزادی کا وہ عزمِ جواں
اس کا تھا ممنونِ منت بے گماں

تھا وہ بے شک صاحبِ علم و کمال
اس کا اندازِ خطابت بے مثال

تھا نہایت پُرکشش طرزِ بیاں
اس کی تحریروں میں تھا عزمِ جواں

وہ "غبارِ خاطر" اس کا الاماں
اس کا وہ طرزِ بیاں سوزِ نہاں

اس کی تحریروں میں کیسا بانکپن
"تذکرہ" اس کا سپن اندر چمن

ہے دُعا گو یہ نثارِ خستہ جاں
جنتُ الفردوس ہو اس کا مکاں

ذکی پروانہ
رِچھا ۔ ضلع بریلی

سرحدی گاندھی

وہ سر تا بہ پا آتش، وہ شعلہ بجاں رہبر
انسان کی حُرمت کا سودا نہ کیا جس نے
تا عمر رہا قائم جو اپنے موقف پر
دُنیا کے خداؤں کو سجدہ نہ کیا جس نے

میزانِ عدالت پر، دربارِ حکومت میں
حق گوئی و بیباکی آئین رہا جس کا
طاقت کے مقابل میں تانے رہا سینے کو
سرِ اہلِ زمانہ کے در پر نہ جھکا جس کا

پابستہ رہیں جس کے سنگین گزرگاہیں
طوفانِ حوادث کا شکوہ نہ کیا جس نے
حالات کی سختی کو سہتا رہا سختی سے
خودداری و غیرت کو رسوا نہ کیا جس نے

وہ گاندھئ سرحد تھا، جاں کوش مجاہد تھا
ہر سانس اخوت کا پیغام بنا جس کا
'لو حق و صداقت کی آواز دباؤ تو!'
سفاک جہاں کو یہ چیلنج رہا جس کا

رمیش چندر دویدی
بینک روڈ، الہ آباد

فراق کی شاعری اور چشمہ

عظمت اور اہمیت کی شناخت تو ممکن ہے مگر اسے الفاظ کے لباس میں پیش کرنا ناممکن۔ ہم جسے عظیم یا اہم کہتے ہیں وہ ہماری زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں کرسکتا۔ وجود کے لیے جدوجہد (Struggle for Existence) کے ڈارون کے اصول میں عظیم اور اہم کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پرنس کروپاٹکن نے بالکل ٹھیک ہی کہا تھا کہ جیسے جیسے انسانی سماج ترقی کے راستے پر بڑھتا جائے گا وجود کے لیے جدوجہد بدلتی جائے گی۔ وجود کے لیے جدوجہد کی شکل میں زندگی کے مسئلے دراصل معاشی بے روزگاری اور امن و سکون سے تعلق رکھنے والے مسئلے نہیں ہیں بلکہ زندگی کا بنیادی اور حقیقی مسئلہ خود زندگی ہے۔

وجود ایک حقیقت ہے۔ کیا یہ ایک معنی خیز حقیقت ہے؟ جان اسٹوارٹ مل نے اپنی سوانح عمری کے ابتدائی حصے میں اس مسئلے کو اٹھایا ہے۔ میریڈتھ نے زندگی کے رموز کو وجدان اور عرفان سے حاصل آسودگی میں پایا تھا۔ اپنشدوں میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جسے پانے کے بعد کچھ بھی پانے کی آرزو نہیں باقی رہ جاتی، اسی کو (اپنشد کی زبان میں) تتوماسی (Tatwmass) کہتے ہیں یعنی تم وہی ہو، اور اس حقیقت کو جاننے اور پانے کے بعد انسان خود وہی حقیقت بن جاتا ہے ؏

"آگ میں تنکے جو بھی پڑ جاتی ہے بن جاتی ہے آگ"

وجود کا ثبوت خود وجود ہی ہے۔ وجود عظیم سے بھی عظیم تر اور بلند سے بھی بلند تر ہے۔ شاعری وجود کو وجود کی شکل میں سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

کانٹ نے ایک بہت واضح اور گہری بات کہی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ بنیادی طور پر دنیا کا بہ ظاہر علم ہمیں زمان اور مکان میں نظر آنے والی اور ایک دوسرے سے بے تعلق اور منتشر چیزوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ دنیا بے ترتیب، بے شمار، منتشر اور بکھری ہوئی چیزوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ بکھراپن اور بے ترتیبی اور الگ الگ نظر آنے والی چیزیں انسانی فکر اور شعور میں ڈھلنے کے بعد ایک اکائی بن جاتی ہیں اور وحدت الوجود کا منظر پیش کرتی ہیں۔ یہی احساس وحدت الوجود کا تصور کا سہارا لے کر فنون لطیفہ کو جنم دیتا ہے۔ خارجی طور پر جدا، بے تعلق اور الگ الگ لگنے والی چیزوں کے دل میں چھپی ہوئی داخلیت اور حقیقت دنیا کی اکائی یا وحدانیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے فراق کا یہ شعر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

میں ایسا وقت ہوں جس کا کبھی گھٹنا نہیں ممکن
میں وہ شب ہوں ستاروں کو بھی جس میں نیند آئے

شاعری کائنات کے دل میں گونجتی ہوئی غنائیت یا ترنم ہے۔ کارلائل نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ

"Poetry is musical Thought"

چیزوں کی شکل دل یزداں میں اٹھنے والی لہروں کی باہری شکل ہے غیب و شہود کا ملاپ ہے۔ اسی کو ہندو فلسفے میں نراکار خدا کا ساکار روپ کہا گیا ہے۔ ..عظیم فن کار جب ظہور چاہتا ہے تو شاعری جنم لیتی ہے۔ سارا اختلاف، بے گانگی اور جداگانہ انداز اکائی کے بھیس بدلنے کا نام ہے۔ اپنشد

جیسے تتوامسی کہتا ہے اس کا مطلب ہے تم وہی ہو یعنی تم مختلف شکلوں سے ہر بھی ہو اور تم نام اور روپ کی دنیا بھی ہو ۔

نجات کا مطلب ہے مختلف رنگوں کی کائنات کے پیچھے چھپی ہوئی وحدانیت کا علم، تجلیوں کو جلوہ بخشنے والے جلووں کا علم۔ اسی حقیقت کی رفت کا اشارہ اور اسی حقیقت کی کچھ جھلکیوں کا نام شاعری ہے۔ تمام حسن وجود کا ایک ادنیٰ سا پرتو ہے ۔

عشق مجنوں نیست ایں کار من است
حسن لیلےٰ عکس رخسار من است

جدید طبیعات میں بتایا گیا ہے کہ دنیا یا کائنات شعور کا ایک خاکہ ہے ۔ اگر ہم ایک دھاگے کے سرے میں آگ لگا کر تیزی سے گھمائیں تو ایک حلقہ بن جائے گا۔ گھومنے والی آگ نہیں دکھائی دے گی ۔ ٹھیک اسی طرح یہ عظیم کائنات ذروں کے دل کی تھرتھراہٹ کا یا رقص کا مظاہرہ یا نمود یا ہندو دیومالا کے مطابق شیو (SHIVA) جب جلال میں آکر رقص کرتے ہیں تو یہ کائنات منتشر ہو کر ذروں میں بکھر جاتی ہے جسے فنا کہتے ہیں۔ اور وہی شیو جب اعتدال کے ساتھ عشق و محبت میں رچا بسا رقص شروع کرتے ہیں تو مردہ ہستی کے دل میں پھر سے حرکت پیدا ہونے لگتی ہے اور منتشر ذرے پھر زندگی بخش سلیقے اور تخلیقی انداز میں گھل مل کر سوئی ہوئی کائنات کو جگانے لگتے ہیں جسے ہم وفا اور تخلیق کہتے ہیں۔ اسی لیے شیو لفظ کے معنی ہیں مبارک۔ نٹراج شیو کے تخلیقی اور زندگی بخش رقص میں ان کے اٹھتے گرتے قدموں سے پیدا ہوئے تال میل کا نام شاعری ہے۔ فراق کا یہ شعر بھی کچھ اسی جانب اشارہ کرتا ہے ؎

اک قوت ہے غیر مرئی
خلقت ہے اسی کی تھرتھراہٹ

فراق اکثر کہا کرتے تھے کہ شاعری کے لیے مادّے کی طہارت کا احساس بہت ضروری ہے۔ شاعر جب اس حقیقت کو محسوس کرنے لگتا ہے تو اس کا شعور تصور کی مدد سے عظیم شاعری تخلیق کرنے لگتا ہے ۔

"شاعری زندگی تو ہے ہی زندگی بخش بھی ہے۔ زندگی خود کوئی منجمد یا بندھی ٹکی شے نہیں ہے۔ زندگی لامحدود ہے اور شاعری زندگی میں اس طرح ڈوب جانے کا نام ہے کہ ہم جب بھی ڈوب کر ابھریں تو ہمیں ایک نئی زندگی اور تازگی محسوس ہو۔ یہی احساس ہماری زندگی کو باسی پن سے بچائے رہتا ہے۔ رسوم و قیود کی دنیا کے بوجھ کو ہلکا کرتا رہتا ہے" ؎

تھی زندگی میں کبھی صبح نو کی تازہ دمی
شعور پر نہ رسوم و قیود کا تھا غبار

اگر شاعری ہمیں ایسا محسوس نہ کرائے تو ہماری زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب بن کر رہ جائے ۔

فراق میں یہ شعور اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب وہ ٹھیک سے بول بھی نہیں پاتے تھے، پڑھنے لکھنے کی بات تو دور رہی ۔ اس بات کا اشارہ ہمیں ان کی نظم "ہنڈولہ" میں ملتا ہے۔ یہ نظم ایک طرح سے شاعر کی سوانح عمری ہے۔ اس میں فراق نے اپنے بچپن اور اس پر اثر ڈالنے والی بہت سی چیزوں اور واقعات کا بڑا ہی خوبصورت تذکرہ کیا ہے ۔ ویسے فراق اپنی باتیں کم کرتے تھے ۔ بینک روڈ پر بیٹھے بیٹھے ایک دن فراق نے اپنے بچپن کا ذکر شروع کیا،

"میرے ذہن میں بچپن کی کچھ یادیں محفوظ ہیں جنھیں تمھیں سنا رہا ہوں۔ بظاہر میں بھی دوسرے بچوں کی ہی طرح تھا، ان کے ساتھ کھیلتا پھرتا تھا اور کبھی کبھی پڑھا لکھا بھی کرتا تھا مگر میرے بچپن کی کچھ ایسی خصوصیات تھیں جو دوسرے بچوں سے بالکل جداگانہ تھیں۔ میری ماں کا کہنا ہے کہ میں ایسے آدمی کی گود میں نہیں جاتا تھا جو بدصورت اور ناگوار ہو۔ بدصورتی سے مجھے خدا واسطے کا بیر تھا۔ احساس جمال میرے لیے وبال جان بن گیا تھا اور یہ میرے لیے ایک بڑی آزمائش تھی جب کبھی میں تازہ روپ رنگ والوں کو دیکھتا تو ایسا محسوس ہوتا تھا ان کے جمال کی آنچ میری ہڈیاں پگھلا دے گی مجھے چھوٹے بڑوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ فطرت کے مناظر قصے، کہانیاں، واقعات و خیالات مجھے چپ چاپ کسی تصوّر میں محو کر دیتے تھے اور میری حالت

سادھی میں بیٹھے ہوئے یوگی کی سی ہو جاتی تھی۔ دُنیا کی ہر چیز مجھ میں مانوسیت کی کیفیت پیدا کر دیتی تھی میرے لیے یہ مانوسیت اور رمزیت ایک اکائی بن گئی تھی جسے تقسیم کر سکنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اسطرح مانوسیت اور رمزیت کا ملا جلا احساس بیک وقت مجھے آسودگی بھی دیتا تھا اور مجھے جھنجھوڑ کر بھی رکھ دیتا تھا۔ یہی آسودگی اور خود کو ہلا کر رکھ دینے والا احساس شاعری کا سرچشمہ ہے۔"

فطرت کے مناظر، گاؤں کی پگڈنڈیاں، ہرے بھرے کھیت باغ، باغیچے، کیڑے مکوڑے، چرند پرند، ہوا اور بارش، بدلتے ہوئے موسم، رات اور دن کا ہر پہر و ہر لمحہ، نباتاتی دُنیا، تاروں بھری رات کا سناٹا، پہاڑ اور ان کی وادیاں، تالابوں میں تیرتی اور زندگی کی مستی میں اچھلتی ہوئی مچھلیاں، جانوروں کے بچوں کی اُچھل کود، کھیت کی کیاریوں میں بہتا ہوا پانی، دریا کی روانی، گھروں اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، فرصت کے وقت میں پیڑوں کے سائے میں آرام کرنے والے مزدور، لوری گاتی ہوئی مائیں ـــــ وغیرہ وغیرہ نے فراقؔ کے شعور کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ اسے تہہ دار، بھرپور اور مالامال کر دیا۔

فراقؔ کے لیے فطرت ایک روحانی حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ ان کے خیالات، ان کی روح، ان کا ذہن، ان کی فکر، ان کا تصور، ان کا فلسفہ سبھی کچھ فطرت کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ تھا۔ فطرت یا نیچر کے ساتھ اس قدر ہم آہنگی اور اس قدر محویت ہی ان کے خیالات اور ان کی شاعری کا سرچشمہ ہے۔ فراقؔ نیچر میں ایک جیتا جاگتا وجود دیکھتے تھے۔ ان مصرعوں میں فراقؔ کا عقیدہ، مذہب اور ان پر نیچر کا گہرا اثر صاف دکھائی دیتا ہے ؎

وہ دوپہر کا سمے، درجۂ تپش کا چڑھاؤ
تھکی تھکی سی فضا میں وہ زندگی کا آثار
ہوا کی بنسیاں سب وادیوں میں بجتی ہوئی
وہ دن میں بڑھتے ہوئے سائے، سہ پہر کا سکوں
سکوت شام کا، جب دونوں وقت ملتے ہیں
غرض جھکتے ہوئے سرمئی مناظر پر
مجھے گمان پرستانیت کا ہوتا تھا

ہر ایک چیز کی وہ خوابناک اصلیت
مرے شعور کے چلمن سے جھانکتا تھا کوئی
لیے ربوبیتِ کائنات کا احساس
ہر ایک جلوے میں غیب و شہود کا وہ ملاپ
ہر اک نظارہ اک آئینہ خانۂ حیرت
ہر ایک منظرِ مانوس ایک حیرت راز
کہیں رہوں کہیں کھیلوں کہیں پڑھوں لکھوں
مرے شعور پہ منڈلاتے تھے مناظرِ دہر
میں اکثر ان کے تصور میں ڈوب جاتا تھا

میری نظر میں فراقؔ کی بلند ترین تخلیق ان کی نظم " ہنڈولہ" ہے اس نظم میں عظمت یا بلندی کہاں چھپی ہے یہ بتانا بڑا مشکل ہے۔ نظم کی زبان بڑی خوبصورت ہے۔ خیالات میں پاکیزگی اور طہارت کے ساتھ ساتھ ایک رمزیت اور محویت کی فضا ساری نظم پر چھائی ہوئی ہے۔ " ہنڈولہ " بے شمار اور لامحدود فضاؤں اور آسمانوں میں ایک دریچہ کھولتی ہے جس سے ہم دل کائنات کی ایک جھلک پاتے ہیں " ہنڈولہ" کائنات کے داخلی اور خارجی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہیں سے شاعری کی گنگا کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ " ہنڈولہ" فراقؔ کی تہہ دار شخصیت اور ان کی شاعری کی روح تک پہونچنے کا راستہ ہے۔ اس نظم کے ذریعہ فراقؔ کائنات اور وجود کی الوہیت اور پاکیزگی سے ہمارا تعارف کراتے ہیں جو ہر شے کے اندر چھپی ہوئی ہے لیکن جو کبھی کبھی باہر بھی جھانک پڑتی ہے یہی فراقؔ کی شاعری کا سرچشمہ ہے ؎

علی الصباح افق کی وہ تھرتھراتی بھنویں
کسی کا جھانکنا آہستہ پھوٹتی پو سے

ہوش میں کیسے رہ سکتا ہوں آخر شاعرِ فطرت ہوں
جھومنے لگے سترنگے جھرمٹ سے جب وہ انگلی مجھے بلائے

جو ہونٹوں تک ترے محدود رہتی ہے سحر ہوتے
افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے

پو پھٹتی ہیں مشرق میں ہنسی کے پھول کھلتے ہیں
افق کو کوئی چنچل انگلیوں سے گدگداتا ہے

فراق کی شاعری اور خاص طور پر ان کی نظم "ہنڈولہ" مادی دنیا میں ایسی الوہیت اور رمزیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نازک پھولوں اور بچوں کی مسکراہٹ کی شکل میں نمودار ہوتی رہتی ہے۔ اسی راز کا اظہار فراق کی شاعری کی بنیاد ہے ؎

اے ماں کائنات مجھ میں آجا
اے رازِ صفات و ذات مجھ میں آجا
سوتا سنسار جھلملاتے تارے
اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آجا

رقص میں پیکرِ رنگیں کا لچکنا ساقی
انگ کے لوچ میں کل راگنیاں جھومتی ہیں

تاروں کو ہواؤں کو فضاؤں کو سُلا کے
اے رات کوئی آنکھ ابھی جاگ رہی ہے

بہت آہستہ اٹھتی ہے نگاہِ شاعرِ فطرت
رُخِ ہستی سے چادر سی مگر سرکا ہی جاتی ہے

فراق کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم ہم تو ہیں ہی، ہم سب کچھ ہیں۔ جب تک ہم ان کی شاعری کے مطالعے میں غرق رہتے ہیں۔ دنیا غائب رہتی ہے۔ ہماری نظروں میں ہمارا وقار اور ہمارا قد کئی گنا بڑھ جاتا ہے ؎

میں اس دنیا کی ہر ہستی کا ہوں سرمایۂ ہستی
مری ہی ذات سے سب ہیں یہاں نشو و نما پاتے
میں ہوں اہلِ فلک اہلِ زمیں کی رفعت و پستی
جو آخر کار میری ذات میں ہیں محو ہو جاتے
بصیرت، عقل، ہمدردی، صداقت اور خدا ترسی
شجاعت، خوف، ہستی نیستی، نیکی، ریاکاری
سکونِ قلب، دُکھ سُکھ، نیک نامی اور بدنامی
مرے ہی نور کی کرنیں ہیں یہ کیفیتیں ساری
نرالا پن ہوں میں ہی دہر کی ہر فردِ ہستی کا
دلِ ہر ذرّۂ ناچیز میں سازِ اناالحق ہوں
ہوں میں ہی کفر میں انداز شانِ حق پرستی کا
کہ ہر بکھرے ہوئے شیراز کا میں ہی تسلسل ہوں!

بچپن ہی سے فراق کے دل و دماغ میں ہندستانی فلسفہ اور ہندستانی تہذیب و تمدن کے لیے گہری محبت پیدا ہو گئی تھی۔ بھارت کے لوک گیت قصے، کہانیاں، دیومالائیں، تیوہار اور رسم و رواج ان سب کا ان کی زندگی پر گہرا اثر تھا، زبان کی خوبصورتی کی پرکھ ان کے مزاج میں تھی، چاہے وہ انگریزی زبان ہو یا ہندی اور اُردو۔

میور سنٹرل کالج میں آ جانے کے بعد فلسفہ، تاریخ اور ادب میں فراق کی دل چسپی بہت بڑھ گئی تھی۔ مغربی فلسفہ میں دل چسپی کی وجہ سے افلاطون اور برگسان کے علاوہ انھوں نے دوسرے فلسفیوں اور ادیبوں کی تصنیفات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت اعلا درجہ کے شاعر اور ویدانتی تھے ان کا گھر صوفیوں و فقیروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شعر و ادب، فلسفہ، ویدانت، رامائن اور گیتا پر کھل کر باتیں ہوتی تھیں۔ اس ماحول نے فراق کے شعور پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ فراق صاحب تلسی داس کو اس دنیا کا سب سے بڑا شاعر مانتے تھے اور اپنی شاعری پر تلسی داس کا گہرا اثر تسلیم کرتے تھے۔ ایک بار تلسی داس اور شیکسپیر کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:۔

"Shakespeare is Life like but Tulsidas is Life giving"

ہندی کے عظیم شاعر سمترا نندن پنت کے ساتھ گفتگو کے دوران ایک مرتبہ فراقؔ نے کہا تھا کہ ـــــ "تلسی داس بھکت نہیں بلکہ خود بھگتی تھے"۔ پنت جی دیر تک فراقؔ کے اس جملے کی تعریف کرتے رہے۔ زندگی اور فلسفہ کے گہرے سے گہرے نکات کو فراقؔ بول چال کی زبان میں بڑے خوبصورت طریقہ سے بیان کردیتے تھے۔ ایک شام اپنی رہائش گاہ بنک روڈ پر بیٹھے بیٹھے فراقؔ نے ادب کے بارے میں یہ لافانی جملہ کہا تھا:۔

"Literature is the realization of bestness of the univers"

"ادب کائنات کی بہتری کا احساس ہے۔"

فراقؔ وجود کے دل میں بیٹھ کر شاعری کرتے تھے اور وہی ان کی شاعری کا سرچشمہ تھا۔ فراقؔ کی شاعری چاروں طرف پھیلے ہوئے سکوت کی زبان اور ترجمان تھی ؎

شاعری بس اسی کا ہے اظہار
ربط پنہاں جو کائنات سے ہے

یہ شعر فراقؔ کے کسی دیوان میں نہیں ملتا۔ انھوں نے مجھے یہ شعر سنایا تھا۔ غزل پوری کرنے کا ان کا ارادہ تھا، مگر افسوس ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ غزل مکمل نہ ہوسکی۔ ✱✱

اس کے بعد کا شمارہ "یادِ رفتگاں" نمبر ہوگا جو مولانا صباح الدین عبدالرحمان، خواجہ احمد عباس فکر تونسوی۔ احمد جمال پاشا۔ راجندر سنگھ بیدی، زیب غوری۔ خوشتر گرامی نشور واحدی اور نازش پرتاب گڑھی وغیرہ کے حیات اور کارناموں پر مشتمل ہوگا۔

ـــــ ادارہ

عالمی ادب کا پہلا مکتوب صفحہ ۱۱ کا بقیہ

ا؎ ادبی نثر کا ارتقاء۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی صفحہ ۲۶۱
۲؎ تنقیدیں صفحہ ۱۴
۳؎ ادبی نثر کا ارتقاء صفحہ ۲۶۵
۴؎ ایضاً صفحہ ۲۶۵
۵؎ کشاف۔ مصنفہ علامہ جاراللہ زمخشری مطبوعہ مطبع لیسی کلکتہ ۱۲۴۶ھ صفحہ ۶۶۵۔ روح المعانی تیرھواں جز۔ مصنفہ مفتی بغداد العلامہ ابوالفضل شہاب الدین السید محمود الالوسی البغدادی ص ۴۷ و ۴۸ مصر درب الاتراک رقم۔
۶؎ معالم التنزیل بحوالہ جلالین ص ۲۰۹ بر حاشیہ نمبر ۲۹
۷؎ پارہ ۱۳ سورہ یوسف ثلث قرآن حکیم
۸؎ پارہ ۱۔ سورہ بقرہ بعد ثلث قرآن حکیم
۹؎ پارہ ۱۳، سورہ ابراہیم قرآن حکیم
۲۰؎ جلالین۔ جلال الدین سیوطی و جلال الدین محلی۔ مطبوعہ مطبع اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب بالمقابل آرام باغ لاہور صفحہ ۳۱۹ و مدارک ص ۱۶۰
۲۱؎ قرآن کریم پارہ ۱۹ سورہ نمل
۲۲؎ کشاف ص ۱۰۲۵
۲۳؎ قرآن کریم پارہ ۱۹ سورہ نمل
۲۴؎ درس بخاری، علامہ شبیر احمد عثمانی، محررہ مولانا عبدالوحید صدیقی، ناشر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات) سن اشاعت ۱۴۰۰ھ صفحہ ۲۰
۲۵؎ درس بخاری ص ۲۰
۲۶؎ فرہنگ آصفیہ جلد سوم صفحہ ۹۵
۲۷؎ تلمیحات، محمود نیازی۔ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ صفحہ ۲۵۸

غزلیں

وفا ملک پوری
پرنیا سٹی (بہار)
٨٥٤٣٠٢

جیئے مَلَک کی طرح اور نہ جانور کی طرح
بشر وہی ہے جو زندہ رہے بشر کی طرح

جو ایک آشیاں برباد کی نشانی تھا
وہ آشیاں بھی جلا میرے بال و پَر کی طرح

اسی سے بزم میں ہے روشنی بھی خوشبو بھی
جو دل ہے شمع کی صورت کبھی اگر کی طرح

ہوائے گرم کے جھونکوں سے چوب خشک ہوئے
کبھی تھے ہم بھی چمن میں ہرے شجر کی طرح

رہا نہ عہدِ ترقی میں فرقِ عیب و ہنر
کہ لوگ عیب بھی کرتے ہیں اب ہنر کی طرح

ہے اُن کی طعنہ زنی سے دل و جگر زخمی
جنھیں سنبھال کے رکھا دل و جگر کی طرح

پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں مسافرانِ حیات
کہ ہے یہ منزلِ ہستی بھی رہ گذر کی طرح

حقیر سمجھو نہ اشکِ وفا کے قطروں کو
پلے ہیں یہ صدفِ چشم میں گہر کی طرح

وفاؔ تھے گوشۂ مرقد سے پہلے ہی مانوس
اب آ کے لیٹے ہیں اس گھر میں اپنے گھر کی طرح

شباب للت
وزارت اطلاعات و نشریات
حکومت ہند
ریلوے بورڈ بلڈنگ۔ شملہ

ہر اک قدم پہ اسے فتح مند کر یا رب
مرے وطن کا علم سر بلند کر یا رب

تو بے بسوں کا مجھے دردمند کر یا رب
مرے نصیب کو یوں ارجمند کر یا رب

وہ گر چکا ہے کچھ اس کو بلند کر یا رب
مرے حریف کی روزی دو چند کر یا رب

میں لے سکوں بھی تو دشمن سے انتقام نہ لوں
تو دست و پا کو مرے بے گزند کر یا رب

ہوس شعار ہیں آنکھیں تو سیر نظری بخش
ہمارے دل کو قناعت پسند کر یا رب

میں بک نہ جاؤں کہیں مصلحت کی منڈی میں
کچھ اور بھی مری قیمت بلند کر یا رب

رسائیاں ہوں ستاروں سے ماورا میری
شعور و فکر کو میری کمند کر یا رب

مری حیات اگر اک کھلی کتاب نہیں
عدم کے تو اسے جزدان میں بند کر یا رب

گناہ گار سہی پھر بھی تیرا بندہ ہے
شبابؔ پر نہ درِ فیض بند کر یا رب

جعفر ملیح آبادی
دبیر الدولہ گیٹ، چوپٹیاں
لکھنؤ-۳

سلطنتِ بہمنیہ کا بانی
حسن گنگو
قومی یک جہتی کا درخشندہ ستارہ

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے جہاں قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کا علم ہوتا ہے، وہاں بعض دلچسپ کرداروں اور عجیب و غریب شخصیتوں سے واقفیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایسی عجیب و غریب تاریخی شخصیتوں کی طویل فہرست میں حسن گنگو کا نام بھی شامل ہے۔ حسن گنگو کی ذات کو قدرت نے گوناں گوں خوبیوں سے آراستہ کیا تھا اور وہ حوصلہ مند اور بہادر بھی تھا، دانا و عاقل بھی، دیندار ایماندار مسلمان بھی، نیک دل اور جفاکش انسان بھی اور خوب رُو جوان بھی، اپنے انھیں اوصاف کے باعث وہ خادم سے مخدوم اور ذرّے سے آفتاب بن گیا، اس نے زندگی کی ابتدا ایک برہمن گنگو کے خدمت گار کی حیثیت سے کی، مگر دکن کا تاجدار بن کر دنیا سے رخصت ہوا۔

مؤرخین اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں کہ غیاث الدین تغلق کے عہد میں گنگو برہمن نام کا ایک شریف النفس منجم دہلی میں رہا کرتا تھا۔ شہنشاہ کے دربار میں اس کی بڑی آؤبھگت تھی۔ شہزادہ محمد تغلق اس کی بہت عزت کرتا تھا اس کا ایک مسلمان خدمت گار تھا جس کا نام حسن تھا، اس کے ساتھ وہ بہت مہربانی اور محبت سے پیش آیا کرتا۔ حسن اکثر مالی مشکلات میں گرفتار اور تنگدستی کا شکار رہتا، ایک دن جب وہ پریشان تھا تو اس نے اپنے آقا گنگو سے کہا کہ میری گذر بسر بہت مشکل سے ہوتی ہے، میرے لیے کوئی ایسا بندوبست کر دیجئے کہ میری ضروریاتِ زندگی آسانی سے پوری ہوسکیں، اس کی استدعا پر گنگو کا دل پسیج گیا اور اس نے نواحِ دہلی میں ہی ایک قطعہ زمین، ایک جوڑی بیل اور کاشت کاری کے کام میں مدد کرنے کے لیے دو مزدور دیے اور کہا کہ تم اس زمین پر کھیتی باڑی کرو اس سے جو آمدنی ہو اس سے اپنی ضرورتیں پوری کرتے رہو۔ حسن نے گنگو کی اس عنایت کا شکریہ ادا کیا اور زمین پر کھیتی باڑی شروع کر دی، ایک دن مزدور زمین میں ہل چلا رہے تھے کہ ناگاہ ہل کی نوک کسی چیز میں پھنس گئی کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی، مزدوروں نے حسن کو اطلاع دی، زمین کھودی گئی تو ایک بہت بڑا برتن برآمد ہوا جس کا ڈھکن زنجیر سے بندھا ہوا تھا، ہل کی نوک اسی زنجیر میں پھنس گئی تھی، برتن کھولا گیا تو اس میں سونے کے سکّے لبالب بھرے ہوئے تھے، یہ دیکھ کر مزدوروں نے خوش ہو کر حسن کو مبارک باد دی اور کہا کہ تمھاری غریبی پر ترس کھا کر خدا نے تمھیں کثیر دولت کا مالک بنا دیا، حسن نے مزدوروں کو جواب دیا، یہ زمین میری ملکیت نہیں ہے گنگو کی ہے۔ یہ خزانہ اس کی زمین سے برآمد ہوا ہے اس لیے اس کا مالک بھی گنگو ہے۔ یہ کہہ کر تمام سکّوں کو لے کر گنگو کے پاس پہنچ گیا اور اس سے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ گنگو اس کی ایمانداری سے بے انتہا خوش ہوا اور اس کی بڑی تعریف کی۔ دوسرے دن صبح شہزادہ محمد تغلق سے ملاقات کر کے سارا واقعہ اس کے گوش گذار کیا۔ محمد تغلق کو حسن کی ایمانداری اور سچائی پر بہت حیرت ہوئی اس نے حسن کو بلوا کر اپنے باپ سلطان غیاث الدین تغلق کے روبرو پیش کیا، سلطان غیاث الدین

بھی حسن کی اس بات سے بہت متاثر ہوا۔ اُسے شاہانہ انعام و اکرام سے نوازا اور ایک صدی امرا کے زُمرے میں داخل کر لیا۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد گنگو برہمن نے حسن سے کہا تمھاری قسمت کا زائچہ بتاتا ہے کہ ایک دن تم بہت عزّت اور ناموری حاصل کروگے اور ایک عظیم منصب اور عہدے پر فائز ہوگے۔ مگر مجھ سے وعدہ کرو کہ جب خدا تم کو کوئی عظیم عہدہ عطا کرے تو میرے نام کو بھی اپنے نام کا ایک جزو بنا کر لکھا کرنا تاکہ تمھارے نام کے ساتھ میرا نام بھی امر ہوجائے، دوسرا وعدہ یہ کرو کہ خزانچی کے عہدے پر مجھے رکھوگے اور میرے بعد میری اولاد کو، کسی اور کو نہیں۔ حسن نے گنگو سے صدق دل سے یہ دونوں وعدے کرلیے۔

اسی دوران ایک اور واقعہ رُونما ہوا جس نے حسن کے تابناک مستقبل سے متعلق گنگو برہمن کی مندرجہ بالا پیش گوئی کی تائید کردی، واقعہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا کے آستانے پر، ایک دن ہر خاص وعام کی دعوت تھی، دوسرے بےشمار لوگوں کے ساتھ شہزادہ محمد تغلق بھی شریک تھا۔ حسن بھی وہاں پہنچا مگر بہت تاخیر سے، سب شرکا کھانے سے فارغ ہوکر جاچکے تھے۔ یہ حال دیکھ کر حسن کو اندر جانے میں تامل ہوا اور وہ سوچنے لگا کہ اب اندر جاؤں یا نہ جاؤں مگر حضرت نظام الدین اولیا کو اپنے انوار باطن سے حسن کی موجودگی کا علم ہوگیا انھوں نے اپنے ملازم کو حکم دیا کہ باہر ایک نہایت شریف اور نیک شخص کھڑا ہے اُسے میرے پاس لے آؤ، حسن جب آیا تو حضرت نے بہت محبت و شفقت کا برتاؤ کیا اور اس کی مزاج پرسی کی اور روٹی کا ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: کھانا ختم ہوچکا ہے مگر میں اپنی روٹی میں سے ایک ٹکڑا تمھیں دے رہا ہوں یہ ٹکڑا درحقیقت دکن کی حکمرانی کا تاج ہے جو ایک دن تمھارے سر پر جگمگائے گا۔ حسن حضرت نظام الدین کی زبان مبارک سے یہ پیش گوئی سن کر بےانتہا خوش ہوا اور اُسی وقت سے دکن کا تاجدار بننے کا خواب دیکھنے لگا۔

کچھ زمانے بعد غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوگیا اور تختِ سلطنت پر اُس کا بیٹا محمد بن تغلق جلوہ افروز ہوا۔ محمد تغلق اپنی بعض عجیب وغریب حرکتوں اور تلوّن مزاجی کے باعث تاریخ میں سنکی بادشاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بادشاہ ہوجانے کے بعد ایک مرتبہ وہ دکن گیا اور وہاں جاکر اس نے اپنے استاد تغلق خان کو دولت آباد کا حاکم مقرر کرکے یہ فرمان جاری کردیا کہ جس کا دل چاہے خواہ افسر ہو یا امیر تغلق خاں کے ہمراہ دولت آباد میں قیام کرسکتا ہے۔ حسن کی دلی مراد بر آئی اس نے شہنشاہ کے اس فرمان کو فالِ نیک سمجھا اور دوسرے امرا اور افسروں کے ساتھ دہلی سے دکن روانہ ہوگیا۔ وہاں حسن کو بطور جاگیر ایک بہت بڑا علاقہ تفویض کردیا گیا۔

اسی دوران محمد تغلق کی سختیوں سے تنگ آکر اُمرا نے بغاوت کردی جس پر جھلّا کر اس نے باغیوں کو بے دریغ قتل کروانا شروع کردیا، بہت سے امرا مارے گئے، باقی جان بچا کر بھاگے اور دکن جاکر رہنے لگے۔ دکن کے امرا نے ان باغیوں کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ تغلق خاں نے جب یہ دیکھا تو اپنی جگہ اپنے بھائی عالم الملک کو حاکم بنا کر دہلی روانہ ہوا اور وہاں پہونچ کر محمد تغلق کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ محمد تغلق کو جب تمام حالات معلوم ہوئے تو اس نے سوچا کہ ایک صدی امرا کا گروہ جو اس کی مرضی کے خلاف شاہی مجرموں کو پناہ دے رہا ہے اُسے دکن سے دہلی بلا لیا جائے اور ان کی جگہ دوسرے امرا کو بھیج دیا جائے، چنانچہ اس نے اِس مقصد کی تکمیل کے لیے احمد لاچین قزلباش بیگ، اور ملک علی وغیرہ کو عالم الملک کے پاس روانہ کردیا اور تنبیہ کے طور پر ان لوگوں کے ہاتھ یہ فرمان بھی بھیجا کہ دکن کے تمام ایک صدی امرا گجرات میں جمع ہوجائیں کیونکہ وہاں اُن کی ضرورت ہے۔ یہ شاہی فرمان پاکر پہلے تو ایک صدی امرا نے کچھ دن ٹال مٹول میں گزارے پھر چار ہزار سپاہیوں کے ہمراہ احمد لاچین کی قیادت میں گجرات روانہ ہوئے۔ راستے میں احمد لاچین نے کچھ ایسی باتیں کیں جس سے ان امرا کو شبہ ہوا کہ ہمیں کسی سازش کے تحت گجرات لے جایا جارہا ہے تاکہ باغیوں کو پناہ دینے کے جرم میں ہم سب کو قتل کردیا جائے۔ چنانچہ ان تمام امرا نے آپس میں مشورہ کرکے گجرات جانے کا ارادہ منسوخ

کر دیا اور اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس ہوگئے۔ احمد لاچین نے ان کو روکنا چاہا مگر تصادم میں مارا گیا۔

ان امرار کے ساتھ ساتھ دکن کی رعایا بھی محمد تغلق کے غیظ و غضب اور سختیوں سے پریشان ہو چکی تھی اس لیے رعایا بھی ان کے امراء کی خیر خواہ اور ہم نوا بن گئی جس کے نتیجے میں ایک ایسی بغاوت نے جنم لے لیا جسے ختم کرنا کسی کے بس کی بات نہ رہی، شاہی فوج بری طرح ناکام ہوئی اور سارے دکن پر ایک صدی امرار کا تسلط ہو گیا۔ ان لوگوں نے اپنے ایک ساتھی اسمٰعیل فتح خاں کو ناصر الدین شاہ کا خطاب دے کر دکن کا سلطان بنا دیا۔ حسن گنگو کو ظفر خاں کا خطاب ملا۔ اور کئی پرگنوں کا انتظام اس کے سپرد کر دیا گیا۔ حسن گنگو بہرول رائے کو جو محمد تغلق کی طرف سے گلبرگہ کا حاکم تھا۔ ختم کر کے خود گلبرگہ کا حاکم بن گیا۔ اس وقت محمد تغلق گجرات میں تھا، جب اسے دکن کے یہ حالات معلوم ہوئے تو شاہی لشکر لے کر دولت آباد پہنچا۔ دکن کا نیا حکمراں ناصر الدین شاہ بھی دولت آباد کے قلعے سے نکل کر، افغانوں، راجپوتوں اور دکنی سپاہ کا لشکر لے کر شاہی فوج کے مقابل صف آرا ہو گیا، اس جنگ میں دکنی لشکر کا پلہ بھاری تھا مگر اچانک ایک سالار نور الدین کے تیر لگا اور وہ گھوڑے سے زمین پر آرہا، یہ دیکھتے ہی اس کے چھ ہزار سپاہی میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے، اس منظر نے دکنی لشکر کے علم بردار کو دہشت زدہ کر دیا اس کے ہاتھ سے جھنڈا چھوٹ گیا، جب جھنڈا بلند نہ دیکھا تو دکنی سپاہی سمجھے کہ شاید ناصر الدین شاہ نے شکست قبول کر لی ہے اس پر تمام سپاہی بھاگ نکلے، اس افراتفری میں شام ہو گئی جس کی وجہ سے جنگ بند کر دی گئی۔ رات کو ناصر الدین شاہ نے اپنے امرار کے ساتھ صورتِ حال پر غور و خوض کیا، بعد غور و خوض یہ طے پایا کہ ناصر الدین شاہ حسب ضرورت فوج لے کر دولت آباد کے قلعے کی حفاظت کرے اور حسن گنگو ایک لشکر لے جا کر گلبرگہ کے قلعے کی حفاظت کرے، نصف شب گزرتے ہی اس منصوبے پر عمل شروع ہوا، حسن گنگو گلبرگہ کی طرف اور باقی امرار اپنے اپنے علاقوں کی جانب کوچ کر گئے۔ صبح ہوئی تو محمد تغلق نے میدان جنگ کو دشمن کی فوج سے خالی پایا، جب اسے یہ معلوم ہوا کہ حسن گنگو اپنے لشکر کے ساتھ گلبرگہ کی طرف جا رہا ہے تو محمد تغلق نے اس کے تعاقب میں شاہی فوج کو روانہ کیا۔ بیدر پہنچنے پر حسن گنگو کا شاہی فوج سے مقابلہ ہوا۔ حسن گنگو کی مدد کے لیے تلنگانہ کے راجہ نے پندرہ ہزار پیادے بھیج دیے، نیز ناصر الدین شاہ نے بھی پانچ ہزار سوار اور روپیہ پیسہ حسن گنگو کے پاس بھجوا دیا۔ اس امداد سے حسن گنگو کی طاقت میں نمایاں اضافہ ہو گیا اور اس نے بہت اطمینان و اعتماد کے ساتھ شاہی لشکر سے جنگ شروع کر دی، شاہی فوج کو بُری طرح شکست ہوئی اس کے نامی گرامی جنرل اور افسر مارے گئے۔ اس جنگ کا سارا مالِ غنیمت اور فوج لے کر حسن گنگو ناصر الدین شاہ کی مدد کے لئے دولت آباد پہنچا۔ محمد تغلق کسی ضرورت کے تحت دولت آباد سے جا چکا تھا۔ اس کے امرار اور فوج موجود تھی مگر حسن گنگو کی آمد سے یہ سب اتنے خوف زدہ ہوئے کہ قلعہ کا محاصرہ چھوڑ کر دہلی اور گجرات کی طرف فرار ہو گئے۔

حسن گنگو کے ان کارناموں سے ناصر الدین شاہ اور خواص و عوام سب ہی بہت متاثر ہوئے، ناصر الدین شاہ تو اس حد تک متاثر ہوا کہ اُس نے حسن گنگو کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے اس فیصلے سے امرار کو آگاہ کر کے انھیں رضامند بھی کر لیا، چنانچہ حسن گنگو کے شاہِ دکن ہونے کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا، تخت نشینی کی تاریخ نکلوانے کے لیے مسلمان نجومی اور ہندو پنڈت طلب کیے گئے، دونوں گروہوں میں تاریخ پر اختلاف ہوا تا دیر آپس میں بحث و تکرار ہوتی رہی، بالآخر حسن گنگو نے ہندو پنڈتوں کی ہی بتائی ہوئی تاریخ کو قبول کر لیا، اس طرح ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ بروز جمعہ سلطان قطب الدین کی تعمیر کردہ مسجد میں حسن گنگو کے سر پر سلطنت دکن کا تاج رکھ دیا گیا اور اب اس کا نام سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی مشہور ہوا۔

حسن گنگو نے بادشاہ بنتے ہی اپنے جملہ ہمدردوں، ہوا خواہوں اور محسنوں کے ساتھ بہت فیاضانہ سلوک کیا۔ ان کو اعلیٰ منصب

(باقی ص[illegible] پر)

شجاع فرشی
۱۸ - دیار حبیب
بنسی - جہانگیر آباد
بھوپال

الگنی

(خاندانی منصوبہ بندی کے پس منظر میں)

الگنی کل تلک جو خالی تھی
روشنی کی لکیر جیسی تھی
پینگیں لیتی ہوئی خلاؤں میں
جیسے اپنے مدار میں تنہا
رقص کرتا ہو کوئی سیارہ

مل گئی اس کو اک نئی پوشاک
لمس میں جس کے تھی نمو کی بہار
ساری تنہائیاں وہ بھول گئی
خواہشیں سب کلی سے پھول بنیں
کیف و مستی ہزار لذت و رنگ
جسم و جاں کی فضا میں اڑتے رہے
بارشیں برسیں پھول پھل آئے

لذتوں میں غموں کو بھول گئی
اور موسم نے پھیر لیں آنکھیں
آج وہ اپنی خواہشوں کے طفیل
غنچہ و گل سے لد گئی ہے بہت
ایک ہو کر وہ بٹ گئی ہے بہت

اس کے احساس میں تھکن سی ہے
اب تو جیسے وہ بے بدن سی ہے
گو بظاہر بہت بھلے تھے دن
لطف آغاز کے سلونے دن
یادِ ماضی مگر عذاب ہے اب
کیف و مستی تمام خواب ہے اب

سرخ، پیلے، سفید گل بوٹے
ننھے منے شریر سے بادل
دل کے ٹکڑے یہ پیار کے تحفے
دل میں کانٹوں کے جیسے چبھتے ہیں
راحتیں اب کہاں ملیں گی انھیں

کاش دو تین گلبدن ہوتے
اپنے گھر میں نہ پھیلتا جنگل

شاہد رضا
۶۰ - مہند جنگلہ
شاہجہاں پور

غزل

گر چاہتے ہو پیار کے یہ سلسلے رہیں
اتنا قریب آؤ کہ کچھ فاصلے رہیں

پرواز کرنا کتنا ہی دشوار ہو مگر
طائر یہ چاہتا ہے سدا پر کھلے رہیں

چہرہ ترا اداس ہے کیوں میرے واسطے
ممکن ہے میرے بعد نہ یہ مسئلے رہیں

اک ایک کر کے جائیں تو واپس نہ آئیں گے
ہم کو یہ چاہیئے کسی پرچم تلے رہیں

آ اے غمِ حیات تجھے معتبر کروں
دل میں کسی کی یادوں کے کیوں قافلے رہیں

آسانیاں جو ہوں گی تو کیسے جیوں گا میں
دشواریاں یہی ہوں یہی مرحلے رہیں

اک برگِ زرد رکھ لیا میں نے کتاب میں
شاہد ہزار پھول چمن میں کھلے رہیں

یاور علی بیگ

مخدوم محی الدین اور ان کی شاعری

"سرخ سویرا"، "گلِ تر" اور "بساطِ رقص" مخدوم کے شعری سفر کے تابندہ اور پائندہ نقوش ہیں جو ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ یہ اس لیے بھی ہماری سانسوں میں بسے رہیں گے کہ مخدوم کو تہہ صلیب جینا عزیز رہا اور مرتے دم تک ان کا رشتہ زندگی اور سماج کے کرب کے ساتھ استوار رہا۔ ان کا تمام شعری سرمایہ سیاسی اور سماجی محسوسات کا آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری خلوص اور عمل کی شاعری ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں ان کی زندگی پر چھائی رہیں۔ مخدوم دراصل محنت، محبت اور انسان دوستی کے کاز کو فروغ دینے والے خوش آیند مستقبل کے جویا شاعر تھے۔ لفظوں کا یہ خالق اور معنی کا مسیحا آتش نوائی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی چشم نگراں بھی رکھتا تھا جو اسے اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی ۸۰ ویں سالگرہ کے موقع پر آیئے ہم ان کی عظمت کا اعتراف کریں اور دیکھیں کہ اشتراکی نظریات کے قائل ہونے کے باوجود ان کے افکار میں کیسی اور کتنی بے باکی ہے۔ وہ سیاست کا میدان ہو یا وادیِ حسن و عشق ہر جگہ انھوں نے خشک ٹہنیوں سے برگ و بار اگائے ہیں اور کہیں خشکی کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔

حیدرآباد کے ایک معمولی گاؤں میں پیدا ہوکر ایک چار سالہ بچے کو یتیمی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ بچپن بچپن کی طرح گزارنے کا موقع میسر نہ آیا۔ آنکھیں مل کر جب ذرا ہوش کے ناخن لیے تو اردگرد غربت کا مہیب اندھیرا تھا۔ مذہبی ماحول نے کچھ حدود میں باندھا اور مجبوراً مسجد کی جاروب کشی اور اِدھر اُدھر کے ٹکڑوں پر اک عمر بسر ہوئی۔ تعلیمی سلسلہ جوں توں چلتا رہا کہ ایک دم حصار ٹوٹا اور ذہن متجسس شہر لے آیا جہاں رفاقت کے نام پر خلا ہے — بے سروسامانی مونس و دمساز ہے اور افلاس سرپرست۔ تعلیم کا ایک دَور مکمل ہوا لیکن ضروری تو نہیں کہ تعلیم معاش کی ضمانت بھی دے دل کچھ اور ہی چاہتا ہے لیکن دماغ کچھ اور ہی فیصلہ کر بیٹھتا ہے اور اب سامنے وسیع و عریض میدان ہے۔ عوامی جد و جہد کا، سیاسی سرگرمیوں کا۔ مزدوروں کی شیرازہ بندی کا اور عوامی تحریک کی رہنمائی کا۔ دیکھتے دیکھتے یہ میدانِ سیاست میدانِ کارزار بن جاتا ہے اور پھر افراتفری۔ تیغ و تفنگ۔ آگ۔ گولہ۔ بارود پولیس اور اس کے مظالم۔ دست بدست مقابلے۔ کھیتوں پر ناجائز قبضے۔ کسانوں پر جبر و تشدد۔ عوامی نظم و نسق کی تباہی و بربادی۔ کیمپ۔ چھاونی۔ قتل۔ خون۔ غارت گری۔ پھانسیاں جسمانی اور ذہنی اذیتیں۔ نت نئے بھیس میں ریاکاری۔ مخبری پابندیاں مجبوریاں۔ رہائی۔ قید و بند اور ان سب میں مخدوم پیش پیش ہیں۔ ہر تجربہ نیا اور ہر دن نیا تماشا۔ جو ایک زندگی سے کم نہیں اور اب وہ نام جو گمنامی کی اندھی وادیوں میں پوشیدہ تھا۔ مخفی تھا، ایک ایسا نام بن کر ابھرتا ہے۔ جسے لاکھوں افراد اپنا نام جانتے ہیں۔

مخدوم کی شاعری کا آغاز نظم "پیلا دوشالہ" سے ہوا۔ یہ مزاحیہ انداز کی ایک کوشش ہے۔ جو جلد ہی سنجیدگی میں بدل گئی۔ فضا میں حسرت کی غزل کا جادو اور ان کے معصوم عشق کی

تازہ کاری پھیلی ہوئی تھی۔ اختر شیرانی اور جوش کی رومانی انقلابیت اور گھن گرج کی تیز لہریں ساحلِ ادب و شعر پر سر پٹک رہی تھیں۔ مخدوم بھی کچھ عرصہ اس کی لپیٹ میں آئے لیکن جلد ہی انھوں نے ان دونوں کو طاق پر رکھ دیا۔ اس لیے کہ وہ عشق میں سطحیت سے ہٹ کر جذبے کی گہرائی اور فکر کی کارفرمائی کے قائل تھے۔ افلاطونی عشق بھلا انھیں کیا راس آتا وہ تو گوشت پوست کے محبوب میں یقین رکھتے تھے ؎

فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں

ان کے ابتدائی شعری جذبات بھی اپنے ہمعصروں سے مختلف اور چونکا دینے والے تھے۔ یہ جسمانیت کا براہِ راست تجربہ ہے جو جوش اور اختر سے بالکل ہٹ کر ہے۔ مخدوم محبت کے تعلق سے غیر فطری اور بیمار تصورات کو شاعری میں برتنے کے قائل کبھی نہ ہو پائے۔ وہ تو محبت کی تقدیس اور معصومیت پر جان چھڑکتے ہیں۔ مخدوم کا عشق، زندگی کا تصور اور سماجی کشاکش کا شعور ان کے ذہن ہی کی طرح صحت مند ہے اس لیے وہ نہ تو تاج محل کو استحصال کی علامت سمجھ سکے اور طوائفوں کے قدموں پر سجدہ کرنے کو انقلابیت کا نام دے سکے اور نہ ہی سجدوں کو چوکھٹوں پر سجانے کی تلقین کر سکے۔ ان کی حدود زندہ رہنے والی شاعری کی حدود ہیں وہ وقتی اور ہنگامی موضوعات پر کچھ لکھنے سے حتی الوسع گریز کرتے ہیں۔ مخدوم کا شعورِ حیات ترقی یافتہ صحت مند۔ توانا اور حقیقت پسندانہ ہے۔ وہ وجود کے عرفان اور زندگی کے مظاہر سے کما حقہ آگاہ تھے۔ انقلاب اور نام نہاد گھن گرج اور محبت کے سہمے ہوئے تصور کو مخدوم بیمار اور علیل تصور جانتے اور مانتے تھے۔

مخدوم کے ذہنی سفر کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل پر رجائی رومانیت ہے۔ دوسری منزل پر زندگی کے تلخ حقائق سے ٹکرا کر رومانی تصورات اور مذہبی عقائد کا حصار ٹوٹتا ہے۔ بے نام خلش اور بیم و رجا میں لپٹی اداسی اور افسردگی قنوطیت کی حدوں کو پھاند کر شعورِ غم تک پہنچتی ہے۔ روح بھٹکتی سی محسوس ہوتی ہے اور تیسری منزل پر انھیں مارکسزم کا نظریہ مل گیا۔ یعنی مخدوم کی زندگی اور فکر کا سفر روحانی بھی ہے انقلابی بھی، سماجی بھی اور سیاسی بھی۔ لیکن ہر جگہ وہ انتہاپسندی سے محفوظ ہیں۔ وہ پہلے ترقی پسند ہیں جن کی نظموں میں ایمان کی طاقت۔ عمل کی ہم آہنگی سچائی، خلوص۔ لگن اور یقین کی آنچ صاف جھلکتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بے نام جد معاش۔ بے رنگ تنگ و دو محرومیوں۔ ناکامیوں تشنہ آرزوؤں۔ نا آسودہ خواہشوں۔ مجروح خوابوں اور مقتول مقاصد کی تڑپ اور کسک نے ایک زندہ علامت بنا کر مخدوم سے اردو ادب کی بے لوث خدمت کرائی ہے۔ کاش اسمبلی سے جیل تک اور عملی سیاست میں ان کی عمرِ عزیز کے بہت سے سال تلف نہ ہوئے ہوتے۔ ان کی شاعری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

ابتدائی رومانی لہجہ ؎

بات کیا تھی ذکر کس کا تھا کہ ہنگامِ نشاط
مسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

بھرنے لگے بازو تو ہوئے بندِ قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

اور پھر ؎

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

دلوں کی تشنگی جتنی دلوں کا غم جتنا
اسی قدر ہے زمانے میں حسنِ یار کی بات

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے

ان سب اشعار میں تاثیر کی وہ یکجاں اور متنوع فضا ہے جس نے نشاطیہ اور افسردہ دونوں لہجوں کو مدغم اور مربوط کر لیا ہے۔

ابتدا ہی سے مخدوم کے اندازِ بیان کی تازہ کاری نئے



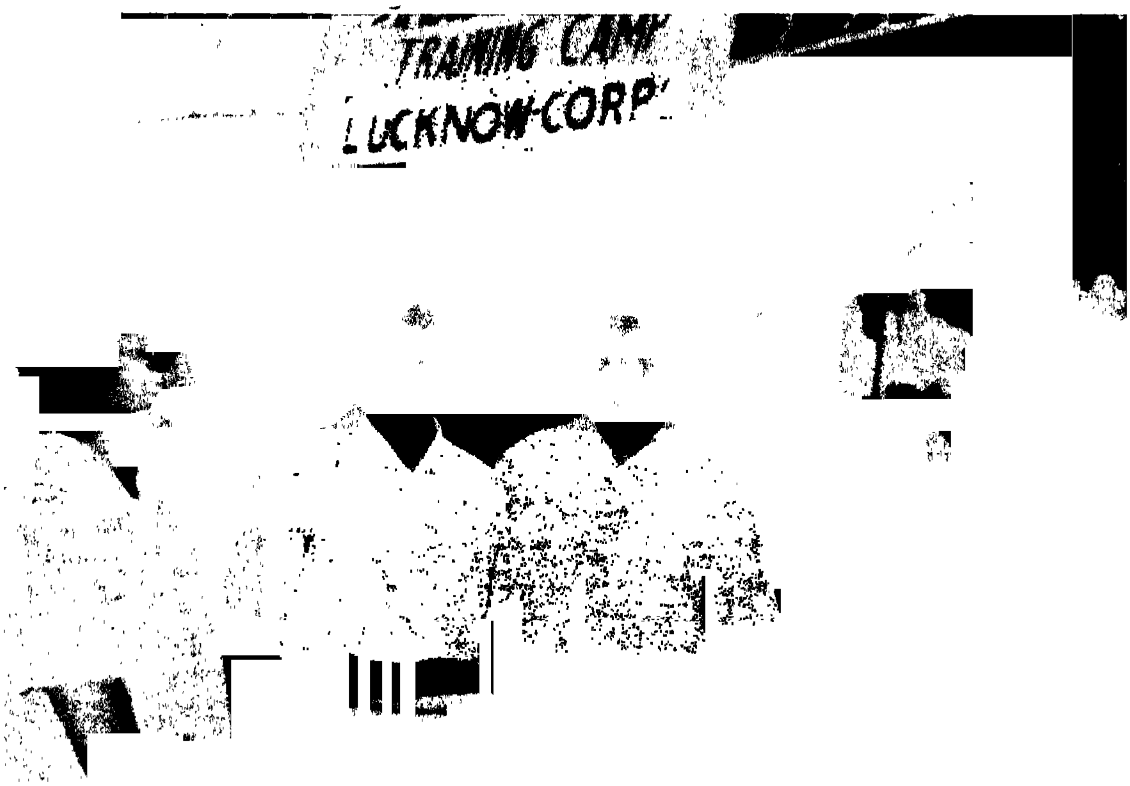
گورنر اترپردیش جناب محمد عثمان عارف ۱۶ر جنوری ۱۹۸۸ءکو دھیان چند اسٹیڈیم (لکھنؤ) میں دوسرے اندرا گاندھی بین اقوامی گولڈ کپ ہاکی ٹورنامنٹ کے فائنل میچ کے کھلاڑیوں سے ملاقات کرتے ہوئے۔



وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ ۱۸ر جنوری ۱۹۸۸ءکو بیچوالیہ (انیکسی، لکھنؤ) میں امریکی سفیر رائے ہنڈ شری گنتھر ڈون سے گفتگو کرتے ہوئے



وزیر پارلیمانی امور ڈاکٹر عمار رضوی ۱۳ر جنوری ۱۹۸۸ کو لکھنؤ کے اموسی ہوائی اڈے پر ملیشیا کے ڈپٹی کنگ سلطان احلان
محب الدین شاہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔

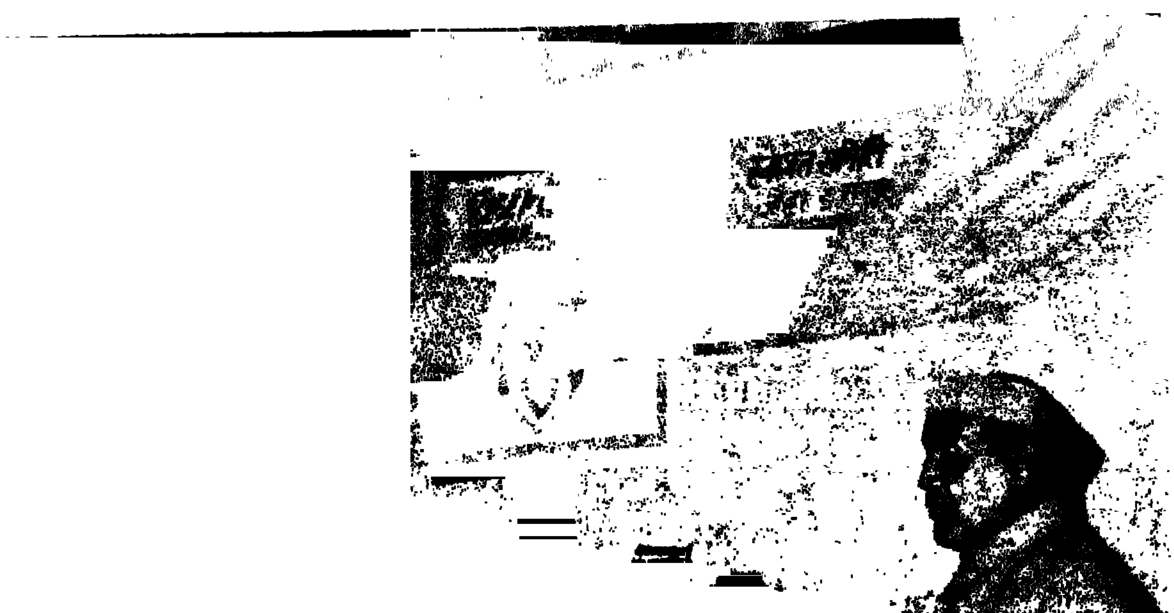


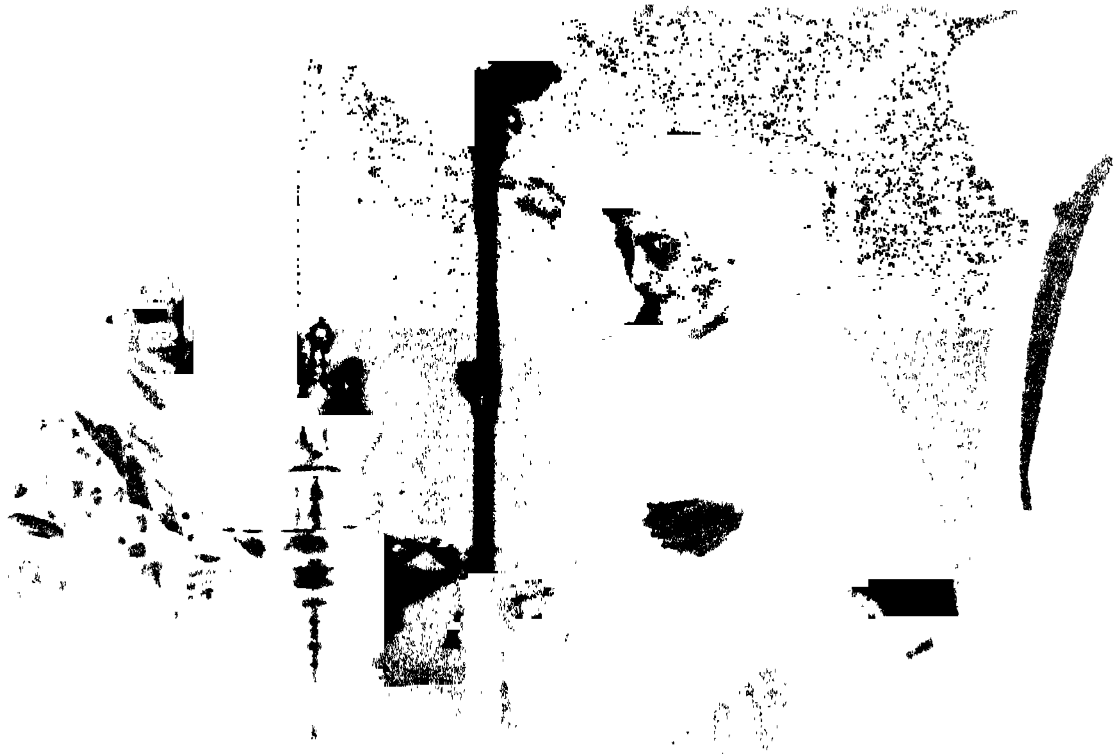
شری
بار رضی
۱۹۸۸ء کو
ایمبولنس
نگ کیمپ
تقریب
تقسیم
ے۔



وزیر ریاست
برائے اطلاعات
وثقافتی امور
شریمتی دیپاکول
۵ رفروری کو
للت کلا اکیڈمی
(لکھنؤ) کی آرٹ
گیلری میں سوویت
دستکاری نمائش
کا افتتاح کرنے
کے بعد نمائش
دیکھتے ہوئے

وزیر محنت شری سعید الحسن ۱۰ر جنوری ۱۹۸۰ء کو رام پور میں مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں منعقدہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے
تصویر میں حافظ محمد صدیق (ایم پی) اور جلسہ کے کنوینر خان قمر اقبال وغیرہ بھی نظر آرہے ہیں۔





وزیر ریاست برائے اطلاعات و ثقافتی امور شریمتی دیپا کول ۱۰ فروری ۱۹۸۸ء کو رویندرالیہ (لکھنؤ) میں کل ہند رقص و موسیقی تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے۔

جواں سال ادیب، شاعر اور افسانہ نگار شہنشاہ مرزا کی یاد میں ۱۳ جنوری ۱۹۸۸ء کو یوپی اردو اکیڈمی ہال (لکھنؤ) میں منعقدہ جلسہ کا ایک منظر، جس میں (دائیں سے بائیں) جناب عمر انصاری، ڈاکٹر ولی الحق انصاری، پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی، اقبال مجید، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر انیس اشفاق اور قمر آغا (مائک پر) نظر آرہے ہیں۔



لہجے کے امکانات کی نشان دہی کرتی ہے۔ مترنم بحروں اور لفظوں کی داخلی موسیقیت اور نغمگی کے خوش گوار تاثر کے لئے "مسافر" "مستقبل" "تارے" "سپاہی" "چارہ گر" اور "جنگ آزادی" جیسی نظمیں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی اور ہمیشہ ہی بار بار پڑھی جائیں گی۔ "گل تر" میں رومان پرور سیاسی شعور کی کارفرمائی ہے۔ ہر نظم میں رقص کی کیفیت داخلی تجربے کی آنچ نغمگی اور غنائیت ہے۔ یہاں لہجے کی تلاش ہے۔ "سرخ سویرا" رومانی تخلیقی سفر کی مثال ہے۔ "گل تر" کی نظموں میں شاعرانہ آن۔ شعری سج دھج۔ نفس مضمون اور اس کی حقیقت پسندانہ ندرت اور جمالیاتی کیفیت ہے۔ "بساط رقص" ان دونوں کی ترقی یافتہ اور زیادہ سلجھی ہوئی شکل ہے جس میں وقت زیریں لہروں کی طرح کارفرما ہے۔ احساس میں شدت اور جذبے میں آتش نوائی آگئی ہے۔

مخدوم کے یہاں عشق و زندگی۔ سیاست اور شاعری کا رشتہ فطری اور صحت مند ہے۔ ۱۹۵۰ء تک جبکہ ان کے ہم عصروں کا شعری ارتقا جیسے ختم سا ہو گیا تھا۔ اور جب ان کے موضوعات محدود اور نظریات بے جان ہو گئے تھے۔ تمام ہنگامی۔ وقتی اور نام نہاد انقلابی موضوعات کی اہمیت ختم سی ہو گئی تھی۔ شاعری میں وقتی اور سستی گھن گرج کا سارا بھرم کھل گیا تھا۔ وقتی سحر کاری کا سارا طلسم جب ٹوٹ چکا تھا اور یہ سب اپنے کو دہرانے لگے تھے ایسے وقت میں بھی مخدوم کا تخلیقی سفر تمام نہیں ہوا اور نہ ان کے موضوعات کے تنوع میں فرق آیا برخلاف اس کے ان کی آواز نے ہم عصروں کی آواز کو دبا کر اپنی عظمت، اہمیت اور حیثیت کا لوہا منوالیا۔

مخدوم کی بیشتر غزلیں اور نظمیں عصری مسائل اور فکری رویوں کی ترجمان ہیں ان کا خلاق ذہن انسانی زندگی کے سارے مسائل میں دل کے ساتھ دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔ نئے تصورات اور تجربات کی تلاش اور پرانے نظریات پر کھنے کا عمل آخری لمحے تک ان کے یہاں جاری رہا۔ دراصل ترقی پسند تحریک کو فن کے آداب مخدوم ہی نے سکھائے ہیں آئیے ہم ان کے آگے سر تسلیم خم کریں۔

--

حسن گنگو

ص۱۲ کا بقیہ

عطا کیے اور انعام و اکرام سے نوازا۔ اس کے علاوہ حسن نے اپنے محسن دیرینہ گنگو سے کیے ہوئے وعدے کو بھی وفا کیا یعنی اُسے دہلی سے بلوا کر خزانۂ شاہی کا مختار بنا دیا اور اُس کے نام کو اپنے نام کا جزو بنا کر تمام طغروں اور شاہی فرمانوں میں اِس طرح لکھوانے لگا "کمترین بندۂ سبحانی حضرت علاء الدین حسن گنگو بہمنی"۔ بعض تاریخوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ حسن نے گنگو کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ اُس دَور کے برہمن کسی کے وہاں بھی ملازمت کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے، گنگو پہلا برہمن تھا جس نے یہ قدیم روایت توڑ کر ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت اختیار کی۔ حسن کی وصیت کے مطابق اس کے بعد اس کے جانشینوں نے گنگو کی اولاد ہی کو ہمیشہ شاہی خزانے کا مختار بنایا۔ حسن گنگو کو شروع ہی سے ہندوؤں سے قلبی لگاؤ تھا، گنگو برہمن تو خیر اُس کا محسن ہی تھا اس کے ساتھ حسن نے جو مراعات کیں وہ اُس کا اخلاقی فرض تھا۔ مگر اس نے دوسرے ہندوؤں کو بھی اعلیٰ مراتب عطا کیے، اس کے تمام پہاڑی قلعوں میں ہندو فوج ہی تعینات تھی۔ اس کے دربار میں ہندو امراء کی خاص تعداد پائی جاتی تھی۔

المختصر، سلطنت بہمنیہ، بانی حسن گنگو گیارہ سال سے کچھ زیادہ مدت تک بہت کامیابی کے ساتھ حکومت کر کے، ۶۷ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی اولاد لگ بھگ پونے دو سو برس تک دکن پر حکومت کرتی رہی۔

غزلیں

چندر پرکاش جوہر بجنوری

۲۰۔ ریوا بلڈنگ لیڈر روڈ
الہ آباد - ۳

کہیں ہے گرمیٔ خورشید انجمن کے لیے
کہیں حیات ترستی ہے اک کرن کے لیے

بجھا سکے نہ کبھی کوئی روشنی جس کی
اک ایسی شمع جلاؤ ہر انجمن کے لیے

ہیں جیسے ساقی و میخانہ لازم و ملزوم
وطن ہے میرے لیے اور میں وطن کے لیے

چلے جو ساتھ مسلماں کے ہے وہی ہندو
وہی ہے شیخ جو کام آئے برہمن کے لیے

نظر نے کہہ بھی دیا اُٹھ کے حالِ دل لیکن
زباں ترستی رہی گرمیٔ سخن کے لیے

فقط گلوں سے نہیں رونقِ چمن جوہر
چمن میں خار بھی ہیں زینتِ چمن کے لیے

●●

جنید حزیں لاری

ڈی آر ایم آفس۔ کمرشیل برانچ
این۔ ای ریلوے۔ وارانسی

بن گیا ہے میرے خوابوں کا مقدر آئینہ
عکس ہے محفوظ اندر اور باہر آئینہ

حسن کے پرتو سے آخر اس قدر روشن ہوا
دیکھ لیجے، بن گیا صد رشکِ جوہر آئینہ

دستِ قدرت نے اسے چمکا دیا برسات میں
دھل کے پانی سے ہوا ایک ایک منظر آئینہ

اک نئے موسم کی آمد ہے شگوفے کھل اٹھے
سامنے رہنے لگا ان کے برابر آئینہ

دل مرا حیرت میں ہے تصویرِ دنیا دیکھ کر
غرقِ حیرت ہے مگر اس دل سے بڑھ کر آئینہ

حسنِ سیرت پر ہے قائم حسنِ صورت کی نمود
تابشِ معنی سے ہے فکرِ سخنور آئینہ

میں سے آ چاہوں مگر کس طرح چاہوں اے حزیں
اس کا جلوہ برق ساماں، اس کا پیکر آئینہ

●

ڈاکٹر تسخیر فہمی

نظروں میں سماؤ کبھی دل میں سماؤ
اے زہرہ جمالو! مجھے تم یوں نہ ستاؤ

کیا تم نے بھی اس شوخ کی زلفوں کو چھوا ہے
یہ راز بتاؤ مجھے گلشن کی ہواؤ

یہ طنز ہے صیاد کا اربابِ قفس پر
بیٹھے ہوئے اب خیر گلستاں کی مناؤ

کیوں شہر میں ہر شخص کے چہرہ پہ ہے وحشت
کیوں سوگ میں بیٹھے ہو تمدن کے خداؤ

کچھ اور بڑھے عشق کی راتوں میں اجالا
کچھ اور دیئے درد کے پلکوں پہ سجاؤ

ہونے کو ہیں پھر زخم ہرے دیدۂ دل کے
اتنا بھی نہ چھیڑو مجھے ساون کی ہواؤ

کچھ اور تو مقدور تمہارا نہیں فہمی
رستہ میں کسی شوخ کے آنکھیں ہی بچھاؤ

●

ڈاکٹر ناہید عارف
معرفت جعفر ملیح آبادی
دبیر الدولہ گیٹ، چوپٹیاں
لکھنؤ ۳

"شہیدِ ناموس"

ایک غیر معروف مثنوی

اردو شاعری میں مثنوی ایک اہم صنف شمار کی جاتی رہی ہے ہر دور میں متعدد شعراء نے اس پر قلم اٹھایا ہے۔ مگر انیسویں صدی عیسوی مثنوی کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں جو اس دور کے ماحول کے زیر اثر عموماً عشقیہ کہانیوں پر مبنی تھیں یا پھر مذہبی رنگ لیے ہوئے تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد حالات کے زیر اثر عشقیہ مثنویوں کی مقبولیت کم ہو گئی اور اس کی جگہ تاریخی، سیاسی، اخلاقی، اصلاحی مثنویوں نے لے لی۔ اس کے ساتھ ایک المیہ یہ بھی رہا کہ ان بے شمار اردو مثنویوں میں بہت سی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مثنویاں زمانے کی نگاہوں سے اوجھل رہیں اور آج کی دنیا ان سے ناواقف ہے۔ ایسی ہی غیر معروف مثنویوں میں ایک مطبوعہ مثنوی "شہیدِ ناموس" مجھے دستیاب ہوئی ہے جس کے شاعر شاد ملیح آبادی مرحوم ہیں اور جو ۲ اپریل ۱۹۴۲ء میں اردو اکادمی لوہاری دروازہ دین محمدی پریس لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

یہ عشقیہ مثنوی ۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں شاد ملیح آبادی کی تصویر ہے، اس کے بعد مثنوی کے تعارف کے سلسلے میں شاعر نے چند سطور لکھی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی کی کہانی عرب کے ایک نوجوان "کعب" کے عشق کی سچی کہانی ہے جو کسی زمانے میں رسالہ زمانہ کانپور میں شائع ہوئی تھی جو شاعر کو بہت پسند آئی تھی اور انھوں نے اس کہانی کو نظم کے سانچے میں ڈھال دیا۔ مگر یہ کہانی رسالہ 'زمانہ' کے کس شمارے اور کس سنہ میں شائع ہوئی تھی، شاعر نے اس کی کوئی نشاندہی نہیں کی ہے۔

ص۳ پر جوش ملیح آبادی کی اس مثنوی کے بارے میں رائے بھی درج ہے:

> "میں نے مثنوی شہید ناموس کو بہت غور سے پڑھا۔ زبان اور بیان کے نقطہ نظر سے یہ مثنوی بہت ہی قابل قدر ہے اور اثر کے لحاظ سے اس کی یہ کیفیت ہے کہ دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس کی اشاعت سے اردو ادب میں نہایت معقول اضافہ ہوگا۔"

شاعر نے اس مثنوی کے ۱۵ عنوانات قائم کیے ہیں،

(۱) آغاز (۲) کعب و زہرہ کی گفتگو (۳) دیدارِ یار (۴) افشائے راز (۵) جدائی (۶) نقوشِ محبت (۷) ترکِ وطن (۸) صحرا نوردی (۹) شکستِ رقابت (۱۰) محسوسات کا تصادم (۱۱) صحرا میں (۱۲) عارفانہ راز و نیاز (۱۳) سراغ گم گشتہ (۱۴) نظارۂ آخر (۱۵) الوداعی سلام۔

ان ۱۵ عنوانات کے تحت ۲۹۳ اشعار ہیں جو ص۹ سے ص۷۱ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مثنوی کا مطالعہ کرنے کے بعد مثنوی کی کہانی اس طور پر سامنے آتی ہے:—

"کعب مدینہ کا ایک خوبرو نوجوان تھا، اس کی بیوی زہرہ جو نہایت خوبصورت ہے ایک روز غسل کر کے دھوپ میں اپنے بال سکھا رہی تھی کہ کعب گھر میں داخل ہوا۔ بیوی پر جب اس کی نظر پڑی تو وہ مبہوت رہ گیا۔ اسے زہرہ اس عالم میں بے حد حسین نظر آئی اور وہ اس کے حسن کی مدح سرائی کرنے لگا۔ اپنی تعریف سن کر زہرہ نے کہا کہ تم میرے حسن کی کیا تعریف کرتے ہو اگر تم میری بہن سلمیٰ کو دیکھ لو تو شاید تم پاگل ہو جاؤ۔ کعب کو سلمیٰ کی بات کا یقین نہیں آیا۔

مگر کچھ دنوں کے بعد جب سلمیٰ اس کے گھر مہمان آئی اور کعب کی نظر اس پر پڑی تو وہ واقعی بہت حسین نظر آئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ کچھ دن کے بعد جب سلمیٰ واپس چلی گئی تو کعب کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ وہ عجیب ذہنی کش مکش کا شکار تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ سلمیٰ کی محبت بھی اس کے دل و دماغ میں سرایت کر چکی تھی۔ اس ذہنی کش مکش نے اسے آخرکار گھر چھوڑ کر جنگلوں کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا۔

اس حادثے نے زہرہ کے ہوش و حواس کھو دیئے۔ اس کی ڈھارس بندھانے اور دل جوئی کے لیے سلمیٰ بھی وہاں آگئی۔ کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ آخرکار دونوں بہنوں نے طے کیا کہ کعب کو تلاش کیا جائے چنانچہ دونوں بہنیں کعب کے چھوٹے بچے کو ساتھ لے کر در در کی خاک چھانتی رہیں مگر کہیں کعب کا پتہ نہیں چلا۔ ایک دن ایک کھنڈر میں رہنے والی کسی ضعیفہ سے دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اس ضعیفہ نے کہا کہ میں کچھ اور نہیں بتا سکتی۔ مگر ہاں رات کو سناٹے میں اسی جنگل سے ہائے سلمیٰ ہائے سلمیٰ کی آواز آیا کرتی ہے۔ اسی دوران کعب کا بچہ کھیلتا ہوا جنگل کی طرف چلا گیا۔ اتفاق سے کعب کی نظر اپنے بیٹے پر پڑ گئی دوڑ کر اس نے اپنے بیٹے کو اٹھا لیا اور جنگل میں آنے کا سبب پوچھا بچے نے ساری کہانی سنا دی اور کہا کہ اماں اور خالہ کھنڈر میں موجود ہیں۔ بچے کے اصرار پر کعب اس کے ہمراہ کھنڈر پہونچا۔ اور جیسے ہی سلمیٰ پر نظر پڑی وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اور چند لمحوں میں جاں بحق ہو گیا۔" اس طرح کعب کی موت پر یہ کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کہانی سچی ہو یا طبع زاد، مگر بے جان ضرور ہے۔ اسلامی معاشرے میں کسی مرد کا اپنی بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن پر فریفتہ ہو جانا معیوب سمجھا جائے گا۔ یہ دعویٰ کرنا بھی یقیناً مشکل ہے کہ اس نوع کا واقعہ مسلم سماج میں اجنبی ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ مسلمانوں کا ذہن نہ اسے آسانی سے قبول کر سکتا ہے نہ کوئی مسلمان اسے پسندیدہ نگاہ سے دیکھے گا۔

ایسی بے جان اور کمزور کہانی کو شاد ملیح آبادی نے اپنی مثنوی کا موضوع کیوں بنایا یہ تو وہ جانیں مگر انھوں نے اپنے زور قلم اور انداز بیان سے اس میں دل کشی ضرور پیدا کر دی ہے۔

مثنوی کی زبان سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ برمحل مناسب تشبیہات محاورات کا استعمال کیا گیا ہے اور جذبات کی مناسب الفاظ میں عکاسی کی گئی ہے۔ مثنوی "زہر عشق" یا "بہار عشق" کی طرح عریاں نگاری سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ شروع سے آخر تک بات مہذب پیرائے میں کہی گئی ہے۔

مثنوی کے ابتدائی اشعار میں شاعر نے کعب کی تمام سیرت کو بہت خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے ؎

کعب نامی اک عرب کا نوجواں
خوش جمال و خوش دماغ و خوش بیاں
جس کی فطرت میں تھا مضمر سوز و ساز
پاک طینت، پاک باطن، پاک باز
سر سے پا تک درد کا افسانہ تھا
اپنی شمع بزم کا پروانہ تھا

عشق کی پرخار وادی میں قدم رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس وادی میں داخل ہونا جواں مردوں کا کام ہے۔ یہاں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو سر سے کفن باندھ کر اور جان دینے کا حوصلہ لے کر آتے ہیں۔ شاد ملیح آبادی نے انھیں خیالات کو بڑے دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

عاشقی ہے شیر دل مردوں کا کام
اس سے گر باہر ہوا ہے ننگ نام
پہلے سر دے پھر قدم آگے بڑھا
جان دینا ہو تو اس کوچے میں آ

کعب کی بیوی زہرہ کے حسن کی تعریف میں جو اشعار کہے گئے ہیں وہ
مرقع سازی اور منظر نگاری کا بہترین نمونے ہیں۔

غسل کرکے ایک دن وہ دل ربا
بال بکھرائے بصد ناز و ادا
صحن میں محو خرام ناز تھی
ہر ادا اک محشر انداز تھی
کاکل شب رنگ کو مستانہ وار
یوں جھٹکتی تھی ادا سے بار بار
انگلیاں پانی سے ہو جاتی تھیں تر
گرتے تھے موتی سے قطرے خاک پر
غسل کی خنکی تھی رخ پر جلوہ گر
ابر کی چادر سے نکلا تھا قمر
رخ پہ تھی رخشندگی جذبات کی
چاندنی تھی یا بھری برسات کی
آنکھ اٹھاتی تھی کچھ اس انداز سے
رس ٹپک پڑتا تھا چشم ناز سے

اس عالم میں زہرہ کو دیکھ کر کعب جب اس کی تعریف کرتا ہے ان اشعار میں شاعر کے زور قلم کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیرا عشوہ محرم راز حیات
تیرا خندہ نغمۂ ساز حیات
ابر تابندہ تیری زلف سیاہ
برق رخشندہ تیری نیچی نگاہ

اسی طرح ایک باحیا، شریف دوشیزہ اچانک کسی مرد کا سامنا ہونے پر جس فطری گھبراہٹ سے دوچار ہوتی ہے اس کی منظر کشی شاعر نے بڑے نفسیاتی ڈھنگ سے کی ہے۔ جب کعب اور سلمیٰ کا اچانک سامنا ہوا اور دونوں کی آنکھیں چار ہوتے ہی سلمیٰ پر جو گھبراہٹ طاری ہوئی اس کا عکاسی کرتے ہوئے شاد کہتے ہیں۔

سامنا ہوتے ہی وہ ناز آفریں
ڈر گئے یوں جھکی کہ زلفیں کھل گئیں
کملا گئی یوں بل نظر جیسے پڑی
جیسے مرجھائے ہوا سے پنکھڑی
پیکر ناز و ادا تھرا گیا
جھک گئیں آنکھیں پسینہ آگیا
آ کے جب رخ کو پسینہ دھو گیا
اور بھی چہرا گلابی ہو گیا

کعب شریعت کی رو سے سلمیٰ سے شادی نہیں کر سکتا تھا اور بیوی کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا، چنانچہ اسی کشمکش نے اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وطن چھوٹنے پر کسی انسان کو جو دکھ ہوتا ہے اور ایسے موقعوں پر انسان جس جذبۂ غم سے دوچار ہوتا ہے اس سے کعب بھی دوچار تھا۔ شاعر نے کتنے مؤثر انداز میں اس کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

دل نہ کیوں روتا کہ چھٹتا تھا چمن
تھا زباں پر بے کسی میں یہ سخن
اے چمن کی خفتہ کلیو! الوداع
اے وطن کی پاک گلیو! الوداع
اے محبت کے نگینے السلام
اے مبارک پیارے مدینے السلام

اسی طرح کعب گھر چھوڑ کر کسی صحرا میں سکونت اختیار کر لیتا ہے اور وہاں دن رات آہ و بکا کرتا رہتا ہے۔

ادھر سلمیٰ اور زہرہ جب کعب کی تلاش میں نکلتی ہیں تو جنگل میں کعب اور اس کے ننھے بچے کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ کم سن بچہ کعب سے جس انداز میں گفتگو کرتا ہے وہ نفسیات سے کتنی مطابقت رکھنے اور دل کو بے قابو کر دینے والی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

باپ کو دیکھا جو غم گیں و ملول
پھینک کر معصوم نے کرتے کے پھول
گفتگو کرنے کو یوں کھولی زباں
اچھے ابا گم گئے تھے تم کہاں

آپ رُوٹھے تھے رُلانے کے لیے
آئی ہیں اماں منانے کے لیے

"نظارۂ آخر" کی سُرخی کے ساتھ مثنوی کا آخری اور المناک منظر پیش کرتے ہوئے شاد نے اپنی بہترین شعری صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کر دیا۔ اس منظر کے جملہ اشعار یہاں اس لیے پیش کیے جا رہے ہیں کہ یہ منظر اس المیہ داستان کا نچوڑ ہے اور ہر شعر اپنی جگہ پُر اثر اور ایک دوسرے سے جُڑا ہوا ہے ؎

دوڑتا اتنے میں طفلِ لالہ فام
پہنچا ماں کے پاس دینے یہ پیام
آج آبا کو ہم اپنے پا گئے
اٹھو اماں جان بابا آ گئے
سُن کے یہ زُہرہ کی باچھیں کھل گئیں
غش سے سلمیٰ نے بھی آنکھیں کھول دیں
خاک سے دونوں اُٹھیں دیوانہ وار
چشم و ابرُو سے تھی وحشت آشکار
کعب کا دلبند بن کر رہنما
آگے آگے مسکراتا ہو لیا
پیچھے پیچھے وہ چلیں با چشمِ تر
ٹھوکریں کھاتی ہوئی ہر گام پر
ہو رہی تھیں رنج گلابی اُنگلیاں
عارضوں پر اشکِ حسرت تھے رواں
کیا ہوا رُکنے لگا کیوں اے قلم
خون رونا کھینچ کر تصویرِ غم
داد دے بیچارگی کی اے خدا
ٹوٹتا ہے بے کسوں کا آسرا
آہ اٹھی جیسے ہی دونوں کی نظر
کعب کو دیکھا سسکتا خاک پر
پیٹ کر منھ اس کی زوجہ بدنصیب
گر پڑی شوہر کے قدموں کے قریب

ماں کو یوں دیکھا جو مصروفِ بکا
طفلِ کم سن رو کے یہ کہنے لگا
کیا پھر اماں تم سے غصہ ہو گئے
دیکھتے ہی تم کو بابا سو گئے
طفل سے کہنے لگی وہ دل فگار
میں ترے باباکے سونے کے نثار

کعب کو اس حالت میں دیکھ کر سلمیٰ کا جو حال ہوا اس کا بیان اس انداز سے کیا گیا ہے ؎

زندگی کے نام سے جی ہٹ گیا
غم سے سلمیٰ کا کلیجہ پھٹ گیا
آنسوؤں سے ہو گئے رُخسار تر
رکھ لیا بیمار کا زانو پہ سر
جسم دُہرا ہو گیا وہ آہ کی
کعب کے چہرے پہ روکر جھک گئی
آنکھ کھولی یار کی آواز سے
کعب نے دیکھا عجب انداز سے
جان لب پر ہو تو پھر کیسی حیا
منھ پہ منھ سلمیٰ نے رو کر رکھ دیا
ایک مدت سے تھی جس کی آرزو
نزع میں پوری ہوئی وہ آرزو
نیند کے جھونکے اسے آنے لگے
سانس اُکھڑی ہونٹ تھرّانے لگے
عشقِ صادق کام اپنا کر گیا
اک نظر سلمیٰ پہ کی اور مر گیا

صفحہ ۶۸ پر شاعر نے "الوداعی سلام" کی سُرخی کے تحت کعب کی تعریف و توصیف میں چند اشعار پیش کیے ہیں ؎

السّلام اے خستۂ سوز و گداز
السلام اے کشتۂ شمشیرِ ناز

(باقی صـ۴۸ پر)

غزلیں

ڈاکٹر سعید ؔ عالم
قانون گو پورہ۔ بہرائچ

ہر ایک شخص مرے غم سے بے خبر ہے میاں
دلِ حزیں ابھی محتاجِ یک نظر ہے میاں

یہ اور بات کہ اہلِ نظر نہیں کوئی
ہماری شام کی آغوش میں سحر ہے میاں

چٹکتے غنچوں کی مانند اس کا کچھ کہنا
سمجھ سکو تو یہی حرفِ معتبر ہے میاں

اگرچہ پھول سے ہونٹوں سے پھول ہی برسے
مگر عجیب سا دل پر مرے اثر ہے میاں

ہمارے شہر میں سایہ تلاش کرتے ہو
ہمارا شہر تو ویرانیوں کا گھر ہے میاں

مرے لبوں کا تبسم تو سب نے دیکھا ہے
جو دل پہ بیت رہی ہے کسے خبر ہے میاں

سعید کو اسی بستی سے واسطہ ہے ابھی
زمیں جہاں کی ہر اک سمت بے شجر ہے میاں

شفیع اللہ خاں راز ؔ آبادی
ایس این کالج۔ کٹرہ پرُدل خاں۔
اٹاوہ

برف کی سِل پگھل رہی ہے جناب
آگ پانی میں جل رہی ہے جناب

آدمی نے وہ زخم کھائے ہیں
زندگی، خوں اُگل رہی ہے جناب

محوِ حیرت ہے آگ کا دریا
ناؤ کاغذ کی جل رہی ہے جناب

ریگ زاروں میں جشنِ عشرت ہے
ریت سونا اُگل رہی ہے جناب

رات میں لہلہاتے سبزے پر
سُرخ مچھلی اُچھل رہی ہے جناب

جن کو آکاش نے ابھارا تھا
ان کو دھرتی نِگل رہی ہے جناب

جانتے ہیں جو راز کی باتیں
ان پہ تلوار چل رہی ہے جناب

●

پی این ایس کپور ھمدم ؔ کاشمیری
پرتاپ نواس نمبر ۳۰ ریزیڈنسی روڈ
جموں۔ توی

وہ دل چُرا کے جہاں شادماں چلے ہے میاں
وہیں سے شہر میں اک داستاں چلے ہے میاں

وہ جب قریب سے گزرا تو مجھ کو ایسا لگا
لیے گلوں کا کوئی کارواں چلے ہے میاں

وہ جب رُکے تو قدم وقت کے ٹھہر جائیں
چلے تو ایسے کہ موجِ رواں چلے ہے میاں

کسر اُٹھا نہیں رکھتا وہ ظلم ڈھانے میں
کہ زور جس کا بھی جتنا جہاں چلے ہے میاں

کہاں خلوص کا چھیڑا ہے تذکرہ یارو
یہاں تو قصۂ سود و زیاں چلے ہے میاں

کبھی کبھار تو ایسا بھی وقت آئے ہے
سکوت لب پہ نگاہوں سے ہاں چلے ہے میاں

جناب آپ کے ھمدم کا اب یہ عالم ہے
کہ جس طرح سے کوئی نیم جاں چلے ہے میاں

شاداب ذکی بدایونی
ذکی منزل، [illegible] بدایوں

ظرافت

ظریف اوّل "دیوانجی"

دُنیا کے ادب کی تاریخ اُٹھاکر دیکھی جائے تو کم و بیش ہر زبان میں ظرافت کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں. ہندستان میں لطیفہ گوئی، بزلہ سنجی، چُٹکلے، چیستاں، ہزل، ریختی، ضلع جگت، تمسخر، ہجو وغیرہ قدیم ظرافت کی مثالیں ہیں. ان سب کا مقصد صرف تفریح ہی تھا. اس زمانے کے مزاح نگاروں میں ملّا دوپیازہ، انشاءاللہ خاں، خسروؔ، نعمت خاں، سوداؔ، بیرکینؔ، جعفر زٹلی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں. ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے وہ زندگی کے ساتھ چلتا، بڑھتا اور سنورتا ہے زندگی میں ہونے والے اتار چڑھاؤ ادب میں بھی حسبِ ضرورت تبدیلیاں پیدا کردیتے ہیں. زندگی کے انقلابوں کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی انقلاب پیدا ہونے لگا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ظرافت کا رنگ بھی نئے سانچوں میں ڈھلنے لگا. جو ظرافت صرف ہنسی مذاق اور تفریح کا ایک ذریعہ تھی اس سے تمسخر کے ساتھ ساتھ اصلاح کا کام بھی لیا جانے لگا. کیونکہ دیگر اصناف کے برعکس طنز و مزاح کے پردے میں اصلاح اور تعمیر کی باتیں زیادہ آسانی سے کہی اور سمجھائی جاسکتی ہیں. طنز و مزاح اگرچہ ساتھ ساتھ بولے جاتے ہیں مگر طنز اور مزاح میں نمایاں فرق ہے. اس کا جزوِ اول نہایت ضروری ہے. اس کے ذریعہ قوموں کی بگڑی ہوئی حالت سدھاری جاسکتی ہے. ان میں پنپنے والے غیر ضروری رسم و رواج کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے، دلوں میں مذہبی الفت پیدا کی جاسکتی ہے. عوام کو ملک و قوم پر نثار ہونے کی ترغیب دی جاسکتی ہے. طنز میں ظاہری طور پر ہنسی مذاق کی باتیں تو ضرور ہوتی ہیں مگر غور کرنے پر اس میں ایسے تیر و نشتر نظر آتے ہیں جو انسانی ذہن کو متاثر کیے بنا نہیں رہتے. طنز و مزاح کے جزوِ آخر سے صرف شگفتگی اور تفریحِ طبع ہی مقصود ہے.

اُردو میں باضابطہ طور پر طنز و مزاح کا اعلیٰ معیار غالبؔ نے قائم کیا. انھوں نے اپنے اشعار اور خطوط میں بے تکلفی، شگفتگی اور ظرافت کے جو نمونے پیش کیے، ان کی مثال کسی اور زبان کے ادب میں ملنا مشکل ہے. غالبؔ کی ان خصوصیات کی وجہ سے مولانا حالیؔ نے انھیں "حیوان ظریف" لکھا ہے. غالبؔ کے بعد ظرافت کو فروغ دینے کا کام "اودھ پنچ" نے کیا. "اودھ پنچ" کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین (جو خود بھی مزاح نگار تھے) مقرر ہوئے. اس رسالے نے زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور بلاشبہ اس میں شائع ہونے والی تخلیقات اُردو طنز و مزاح کے ارتقا کی راہ میں سنگِ میل ثابت ہوئی ہیں.

"اودھ پنچ" کے ذریعہ جن فن کاروں کو شہرت ملی ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریفؔ، پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ، اکبرؔ الہ آبادی، نواب سید محمد آزادؔ، منشی جوالا پرشاد برقؔ، منشی علی احمد شوقؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں. ان میں سب سے زیادہ شہرت اکبرؔ الہ آبادی کے حصے میں آئی. اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اکبرؔ الہ آبادی شوخی اور زندہ دلی کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے اور ان کا ذہن ایک مصلح کا ذہن تھا، اسی وجہ سے ان کی ظرافت بامقصد تھی. "اودھ پنچ" جو ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا تھا، ۱۹۱۳ء میں بند ہوگیا، مگر دو سال بعد ہی ۱۹۱۵ء میں شیخ ممتاز حسین عثمانی کی ادارت میں دوبارہ جاری ہوا. اس بار شہرت پانے والوں میں جو نام سرِ فہرست ملے

وہ ظریف لکھنوی کا ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے عبدالسلام خورشید صاحب فرماتے ہیں:

" اس بار لکھنے والوں میں صرف ایک شاعر کا نام
یاد رکھنا چاہیے اور وہ سید مقبول حسین ظریف ہیں
جنھیں محاکات میں کمال حاصل ہے۔"

(سوونیر مئی ۱۹۶۷ء صفحہ ۱)

سید مقبول حسین ظریف نے ۲۴ر فروری ۱۸۷۰ء مطابق ۲۲ر ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ بروز جمعرات شب کے ۱۱ ½ بجے محلہ مولوی گنج لکھنؤ کے ایک ایسے گھر میں آنکھیں کھولیں جو ذی علم اور زندہ دل باپ سید فضل حسین، فاضلِ جید چچا مولانا سید حسین اور ممتاز شاعر اور سلیم الطبع بھائی سید علی نقی صفی جیسے اہلِ علم کا مسکن تھا۔ ظریف کی پرورش زندہ دل اور خوش مزاج باپ کی آغوش میں ہوئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بچپن ہی سے شوخ، چنچل اور بے باک تھے۔ ظریف کی تعلیم کا آغاز اسی سال ہوا جس سال سر سید نے علی گڑھ میں کالج قائم کیا اور لکھنؤ میں طنز و مزاح کے علمبردار "اودھ پنچ" کا اجرا ہوا۔ وہ مبارک سال ۱۸۷۷ء کا تھا۔

ظریف نے اردو فارسی کی درسی کتابیں حضرت صفی اور مولوی سید محمود واثق لکھنوی سے پڑھیں۔ سنسکرت اور ہندی کی معمولی تعلیم پنڈت رتن لال سے حاصل کی (جو ان کے پڑوسی تھے) کچھ انگریزی بھی پڑھی۔ اس ابتدائی تعلیم کے علاوہ ان کے شوقِ کتب بینی اور اہلِ علم کی صحبت نے ان کی علمی صلاحیت کو چار چاند لگا دیئے۔ ۱۸۸۵ء میں شہزادہ سلیمان قدر بہادر کی سرکار میں میر منشی مقرر ہوئے۔ اور تین سال ہی میں آپ شہزادے کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۴ء تک نواب سید اصغر حسین صاحب کی ریاست مہند و عراق کے انتظامات میں مصروف رہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک کا زمانہ ریاست عالیہ محمود آباد کی ملازمت میں گزرا۔ ظریف کی شادی ۱۸۹۶ء میں لکھنؤ کے ایک باعزت گھرانے میں میر علی امجد صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔

ظریف کی شخصیت بے شمار خوبیوں کا مجموعہ تھی، ان خوبیوں میں ایک دوست نوازی بھی تھی۔ انھوں نے اپنی صدارت میں "تفریح الاحباب کلب" کے نام سے ایک انجمن قائم کی جو اپنی نوعیت کی پہلی انجمن تھی۔ اس انجمن کے ممبر ظریف کے احباب ہی تھے۔ یہ لوگ ہفتہ میں ایک بار اتوار کو ایک جگہ جمع ہو کر شعر و شاعری، لطائف اور مختلف موضوعات پر گفتگو سے ایک دوسرے کو محظوظ کیا کرتے تھے۔ اس انجمن کی شرائط میں ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ گفتگو میں زبان و بیان کی غلطی کرنے والے پر کچھ جرمانہ عائد کیا جائے جس کو دعوت وغیرہ میں صرف کیا جاتا تھا۔

ظریف نے ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۷ء بروز پنجشنبہ رات کو دو بجے وفات پائی اور محلہ کھجوہ لکھنؤ کے ایک باغ میں سپردِ خاک کیے گئے۔ حضرت صفی لکھنوی نے اپنے چھوٹے بھائی کی موت پر اشکبار آنکھوں سے دلی کیفیات کا اظہار اس طرح فرمایا ؎

جو اٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شورِ محشر اٹھا کے اُٹھا
ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رُلا کے اُٹھا

ظریف کے انتقال پر سیکڑوں اہلِ علم و ادب نے اپنے تعزیتی مراسلے بھیجے ان میں سے کچھ حضرات نے منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ حضرت صفی نے مندرجۂ ذیل قطعہ تاریخ بھی کہا جو ظریف کے لوحِ مزار پر کندہ ہے ؎

رفت وقتیکہ ظریف از دنیا   صفی آمد ز درِ خلد ندا
مرحبا سید مقبول حسین
زائرِ سبطِ رسولِ الثقلین

۱۹۳۷ء

ظریف کی شاعری کا آغاز ۱۸۸۰ء میں سنجیدہ شاعری سے ہوا۔ ان کی مشقِ سخن میں اضافہ ان ہفتہ وار نشستوں سے ہوا جن کا اہتمام ۱۸۸۸ء میں صفی لکھنوی نے اپنے گھر پر کیا تھا۔ حضرت صفی کے مشورے پر ہی ظریف نے مزاحیہ رنگ اور ظریف تخلص اختیار کیا۔ ظریف کو ۱۸۸۹ء میں پہلی مرتبہ لکھنؤ کے ایک بڑے مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ مشاعرہ مندرجہ ذیل طرح پر منعقد ہوا تھا۔

" تمنا ہے کسی کی تیغ ہو اور اپنی گردن ہو"

اس طرح میں ظریف نے مزاحیہ غزل کہی، جس میں پرانی شاعری پر نہایت لطیف طنز کیے۔ غزل کا مقطع بطور نمونہ درج ہے ؎

ظریف انصاف سے کہہ دو وہ عاشق ہو کے چوہا ہے
زمینِ قصرِ جاناں میں جو یہ چاہے کہ مسکن ہو

سنہ ۱۹۰۰ء میں ظریف کے گھر میں آگ لگ جانے کی وجہ سے ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ نذرِ آتش ہوگیا، ان کی زندگی میں ان کا مجموعۂ کلام شائع نہ ہوسکا۔

ظریف کے انتقال کے بارہ سال بعد ۱۹۴۹ء میں ان کا مجموعہ کلام بعنوان "دیوانجی" شائع ہوا۔ جس کی اشاعت کا بار راجہ محمد امیر خاں والی ریاست محمود آباد نے اٹھایا۔

حضرت صفی نے ظریف کے کلام کو یکجا کرکے مفید تشریحی نوٹ تحریر فرمائے "دیوانجی" میں موجود کلام کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے حصّے میں غزلیں، دوسرے حصے میں سلام، سہرے، قطعہ تاریخ، رباعیات، تخمیس، قطعات، مثنوی اور نوحے ہیں اور تیسرے اور آخری حصّے میں متفرق موضوعات پر نظمیں ہیں۔ ممتاز حسین جون پوری نے کتاب ہذا پر بہت طویل اور جامع مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تعزیتی مراسلے بھی شامل ہیں جو ظریف کی موت پر لوگوں نے ارسال کیے تھے۔ پانچ سو چار صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ صفدر پریس لکھنؤ میں چھپا۔ ظریف نے جن اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ان میں سے کچھ پر مختصر تبصرہ پیش ہے۔

غزلیں

ظریف کی غزلوں پر دو طرح کے اشعار ملتے ہیں، ایک قسم کے اشعار تو وہ ہیں جن میں عاشق کی موہوم کمر، مبتذل خیالات، زبردستی کی قافیہ پیمائی والی شاعری کی ظرافت کے پردے میں اصلاح کی گئی ہے۔

اس طرح کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

رات بھر کیوں چین سے سونے نہیں پاتے ظریف
یادِ جاناں کیا ہے کھٹمل ہے کہ مچھر دیکھئے

مختصر تعریفِ حسن و عشق ہے بس اس قدر
کچھ نہیں ہے شاعروں کے جھوٹ کا طومار ہے

دہن غائب، کمر معدوم اس پر حُسن کا دعویٰ
حسیں ایسا اگر ہو تو عجائب گھر کے قابل ہے

دوسری قسم کے اشعار وہ ہیں جو محض ہنسنے ہنسانے کے لیے کہے گئے ہیں آپ بھی لطف اُٹھائیے ؎

وہ سمجھتے ہیں کہ گھٹوا کے بنے آئینہ رو
میں سمجھتا ہوں انھیں مونڈ لیا نائی نے

اس کے علاوہ ظریف نے غزلوں کے ذریعہ معاشرتی اور اخلاقی اصلاح پر بھی زور دیا ہے۔ نمونے کے طور پر کچھ اشعار دیکھیے ؎

حشر میں جائے گا ہر شخص قلی کی صورت
سر پر لادے ہوئے اعمال کی گٹھری ہوگا

گتھ گئے یوں ظریف دو مُلّا
مرغ لڑتے ہیں جیسے پالی میں

نظمیں

انھوں نے اپنی نظموں سے بھی اصلاح کا کام لیا۔ انھوں نے مذہبی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کے لیے نظمیں کہیں۔

جس طرح اکبر الٰہ آبادی نے اپنے کلام سے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کا کام لیا اسی طرح ظریف نے بھی اپنی نظموں کے ذریعہ مغرب پرستی کے خلاف آواز بلند کی، مثلاً

مساوات اس کو کہتے ہیں نئی تہذیب کیا کہنا
کہ یکساں ہوگئی صورت زنانی اور مردانی

ظریف مذہب میں نمائش کے خلاف تھے۔ حالانکہ مراسم عزاداری اور ماتم کے خلاف نہیں تھے، لیکن رسوم کی اصلاح چاہتے تھے جس کے لیے انھوں نے "بے فکری شیعیانِ ہند"۔ "تنقید شیعہ ادارت" وغیرہ نظمیں لکھیں "بے فکری شیعیانِ ہند" کے دو شعر دیکھیے ؎

تھیٹر کی دھنوں میں نوحہ خوانی کام ہے اپنا
عزاداری اسی کا نام ہے رقّت سے کیا مطلب

حسینؑ ابنِ علیؑ کے نام پر ہم رونے والے ہیں
ہمیں اس برگزیدہ ذات کی سیرت سے کیا مطلب

ظریف کی نظموں کے ذکر کے ساتھ ان کی مبسوط نظم "شہر آشوب" کا ذکر ہونا بہت ضروری ہے جو ان کی ایک شاہکار نظم ہے۔ اس نظم میں دیوہ شریف

کے ایک مشاعرے میں، ایک شاعر کی غزل سُن کر دیہاتی کے تاثرات دیکھیے ؎

اک کبڑیا سُن کے یوں کرنے لگا اظہار رائے
یہ تو ساعر تھا بھسڈی اور بڑھیا کوئی آئے
جو محفل میں مُلعت کا اشوک کی نکنا دکھائے
ہم سے سوکھیوں کے دل پر کچھ رعاب اپنا جمائے
ڈانٹ کے للکار کے ہر ایک مے پیل میں پڑھے
جو محفل مو کہے پہ کہہ ڈالیے مُکابلُ میں پڑھے

ان کی نظموں میں "موم دول" "شامتِ الیکشن" "سیاحتِ ظریف" "مثنوی باد ہوائی" اور "مہاجن نوازی" وغیرہ خاص طور سے قابلِ تعریف ہیں۔

قطعۂ تاریخ

ظریف نے مختلف موقعوں پر قطعۂ تاریخ بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے اس میدان میں بھی دامنِ ظرافت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ۱۳۲۷ھ میں پیدا ہونے والے ایک بچے کی تاریخ کس طرح نکالی ہے ملاحظہ فرمایئے ؎

تاریخ لکھ دو ایک الف کھونس کر اے ظریف
مولود بوم زادہ ہے آغا کہیں جسے

۱۳۲۶+۱

۱۳۲۷ھ = ۱۹۰۹ء

قطعات

ظریف نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے — مہاراجکمار صاحب محمود آباد کے صاحبزادے کی پیدائش کے موقع پر ظریف نے اس قطعہ کے ذریعہ مبارکباد دی ؎

تقویت دے گا مہاراجہ کے تخت و تاج کو
چاند سا بیٹا مبارک ہو کنور مہاراج کو
پالنا نادار لایا ہے پئے نذرِ امیر
زر تصدق کے لیے ممکن نہ تھا محتاج کو

رُباعیات

انھوں نے قطعات کے ساتھ ساتھ رُباعیاں بھی کہی ہیں۔ رُباعی جیسی مشکل صنف میں بھی ظریف نے ظرافت کے اعلا نمونے پیش کیے ہیں۔ حکیم صاحب آغا فاضل نے اپنے یہاں منعقدہ ایک مجلس میں انڈے تقسیم کیے۔ اس بات کو ظریف نے اڑا لے اور رُباعی کہہ ڈالی ؎

دشمن نہ تیرا کبھی تجھے غچّا دے
اللہ سخاوت کا صلہ سچّا دے
ہر طرح سے ہم تیرے دعاگو ہیں حکیم
انڈے بانٹے خدا تجھے بچّہ دے

ان کی شاعری سے متاثر ہو کر اکبر الٰہ آبادی نے بالکل صحیح کہا تھا کہ "ظریف اپنی قسم کے منفرد شاعر ہیں"۔

ڈاکٹر انجم رعنا

غزل

زمیں پر چاند کا سودا ہوا ہے
زمانے کو الٰہی کیا ہوا ہے

خدا حافظ تری محفل کا واعظ
یہاں ہر شخص ہی بہکا ہوا ہے

نظر پہنچی جہاں اُٹھی تمہاری
وہیں اک حشر سا برپا ہوا ہے

ہزاروں آپ نے وعدے کیے ہیں
کوئی وعدہ کبھی پورا ہوا ہے

ملے ہیں جب سے ہم رعنا کسی سے
نظامِ زندگی بدلا ہوا ہے

غزلیں

عرفی آفاقی

2-C/10 ریلوے کالونی، بادشاہ نگر
لکھنؤ

ہے جیسا آج کہاں کل دکھائی دیتا ہے
سمیٹ لو جو ہر اک پل دکھائی دیتا ہے

یہ تابشیں کہ نہ آئے نظر وہ چہرہ تک
یہ ظلمتیں کہ بس آنچل دکھائی دیتا ہے

وہ حل خود اپنی جگہ اک سوال ہوتا ہے
سوال کا جو کوئی حل دکھائی دیتا ہے

چمک اٹھا تھا کنارہ کہ دیکھتا کیا ہوں
اک اور سامنے جنگل دکھائی دیتا ہے

الٰہی خیر! بیاباں یہ وہ ہے ظلمت کا
جہاں چھلاوہ بھی مشعل دکھائی دیتا ہے

چھٹے یہ تشنہ لبی کا غبار تب دیکھو
ابھی تو خیر سے بادل دکھائی دیتا ہے

ہے اس ہجوم میں سچا فقط وہی اک شخص
جو کل ہجوم کو پاگل دکھائی دیتا ہے

اختر شاہجہانپوری

رنگین چوپال
شاہجہانپور

حالِ دل جس پہ رقم ہے میرا
کیا وہی دیدۂ نم ہے میرا

لوگ ہیں محوِ قصیدہ گوئی
شکوہ لکھنے کو قلم ہے میرا

سب کو تسلیم خدائی اس کی
دوستو وہ جو صنم ہے میرا

منزلِ راہِ وفا سر کرلو
ضَو فِشاں نقشِ قدم ہے میرا

میری دستار بھی اس کے سر پر
اور ہاتھوں میں علم ہے میرا

جس سے باغی ہوں اسی کے آگے
سرِ تسلیم بھی خم ہے میرا

میں تو فن کار ہوں یوں بھی اختر
ساری دُنیا کا الم ہے میرا

قمر سنبھلی

۱۵۳۸ - نئی سڑک
دہلی

یہ کچھ اس کو ملتا صلہ، اختیار میں کب تھا
وہ شخص اہلِ طلب کی قطار میں کب تھا

ہم اپنی آنکھوں کی شمعیں جلا کے رکھ آئے
چراغ کوئی تری رہ گزار میں کب تھا

وہ دُھوپ اوڑھ کے گھر سے نکل پڑا اپنے
سکون اُسے شجرِ سایہ دار میں کب تھا

ہم انتظار بھی کیا کرتے گرد چھٹنے کا :
کوئی نشان ہی واضح غبار میں کب تھا

وہ دُھوپ چھاؤں کا مرکز، کہ گھر کہیں جس کو
ہمارے نام کا تیرے دیار میں کب تھا

کھلی فضاؤں میں اُڑتا تھا فکر کا شاہین
میں قید لمحوں کے سنگیں حصار میں کب تھا

کیا ہے کام جو تیزی نے اس کے لہجے کی
قمر کمال وہ خنجر کی دھار میں کب تھا

افسانہ

ایک شہد کی مکھی اور تتلی

ایم، کوٹھیاوی راہی
ایڈیٹر اشتراک ڈیلی
قاضی پور خورد۔ گورکھ پور

کشتی نما طاق کے جالوں میں پھنسی ایک شہد کی مکھی مر رہی تھی ـــــ پھندا گلے میں ڈالنے سے پہلے روناں نے جالے کو نوچ کر مرتی ہوئی مکھی کو آزاد کرایا ـــــ اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر میز پر پڑے اس دل زدہ کاغذ کو دیکھنے لگی، جس پر خودکشی کی وجہ لکھنے سے گریز کیا گیا تھا ـــــ

" میں ہوش و حواس میں ہوں اور اپنی مرضی سے جان دے رہی ہوں۔ اس خودکشی کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے جو میں لکھنا نہیں چاہتی۔ وجہ جاننے کی کوشش کر کے میری روح کو مزید صدمہ نہ پہنچایا جائے۔ میری آخری رسومات میرے شہر کے بجائے اسی شہر میں ادا کی جائیں۔"

اس کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا، جب اس نے پھندا گلے میں ڈال لیا ـــــ رسی کا دوسرا سرا پنکھے سے باندھ دیا گیا تھا ـــــ خود اسٹول پر کھڑی تھی، اس طرح کہ سوئچ تک ہاتھ آسانی سے پہنچ سکتا تھا ـــــ جسے آن کر کے وہ اسٹول سے اُچھلنے والی تھی۔ اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ جان نکلتے وقت پتہ نہیں ان آنسوؤں کا کیا ہوگا۔ ڈھلک کر گالوں پر بہنے لگیں گے یا پپوٹوں ہی پر پھیل کر رہ جائیں گے جنھیں لاش اتارنے والے پونچھیں گے ـــــ جان نکلنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

دس بج رہے تھے، چھت سے لٹکا ہوا بلب تیز پاور کا تھا۔ ہوسٹل کے اس چھوٹے سے کمرے کی ہر چیز صاف نظر آرہی تھی ـــــ اچانک ممی کی صورت نگاہوں میں پھر گئی، اور پھر گلے میں پڑا پھندا جلنے لگا۔ اس نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اُسے چھُوا تو لگا یہ پھندا نہیں سانپ ہے، جس نے اس کی ایک انگلی کو ڈس لیا ہے۔ اس کے منھ سے ہلکی سی 'اُف' نکل گئی۔ وہ انگلی اس نے ہونٹوں میں دبالی ـــــ ممی صدف کا سر دباتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اس نے پھندا تھوڑی دیر کے لیے گلے سے نکال لیا اور اسٹول سے اُتر کر، میز پر پڑے دل زدہ کاغذ کے نیچے، بچی جگہ پر جلدی جلدی لکھنے لگی:

" ممی! مجھے کیا پتہ تھا کہ میرے دوست صدف کو جو میرا ہم جماعت بھی ہے 'تم کیوں پوچھا کرتی ہو؟ مجھے کیا خبر تھی ممی کہ وہ بھی تمھیں کیوں پوچھا کرتا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا ممی کہ صدف جو مجھ سے محبت کرتا ہے' تمھیں اپنانا چاہتا ہے، شاید اس لیے کہ تم بھی اسے دل و جان سے چاہتی ہو ـــــ میں نے صدف کی ڈائری پڑھ لی ہے اور وہ خطوط بھی جو تم نے اس کو لکھے ہیں۔

ممی! صدف تم سے کتنا قریب ہے اور تم اس سے کتنی قریب ہو، یہ سب مجھے تمھارے ان خطوط نے بتا دیا ہے جو تم نے اسے مختلف اوقات میں لکھے ـــــ صدف میری رعنائیوں پر شاعری کرتا ہے اور تم اس سے اپنی تشنہ تنہائیوں کی پیاس بجھاتی ہو ـــــ اس سے میری

محبت پاکیزہ ہے۔ مگر تم اور وہ آپس میں ایک ناپاک رشتے سے منسلک ہو ـــــ ممی! یہ ایک ناقابلِ برداشت صدمہ ہے، جس کا اظہار میں اپنی جان دے کر کر رہی ہوں ـــــ میری رقیب ممی! مجھے معاف کرنا اور صدف کو یہ مت بتانا کہ روناں نے سب کچھ جان لیا ہے۔ اس کی ڈائری اور تمہارے خطوط میں نے پڑھ لیے ہیں۔"

کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی جو دیوار کے اوپری حصے میں کھلتی تھی ـ دروازہ اس نے اندر سے بند کر رکھا تھا۔ البتہ سلاخوں والی اس کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے، جس سے چاندنی اندر بھی آ رہی تھی۔ مگر ہوا شام ہی سے بند تھی۔ گرمی بہت تھی، دوسرے موت کی بھی گرمی تھی، جس سے نازک اندام روناں سر سے پیر تک پسینے میں بھیگی ہوئی تھی ـــ پنکھا اس نے چلایا نہیں کہ آج اس پنکھے سے موت کی ہوا آنی تھی ـــــ وہ پھر تپائی پر چڑھ گئی، اس کا سانس زور زور سے پھولنے لگا۔ تازہ لکھی ہوئی عبارت بلب کی تیز روشنی میں یہاں سے بھی نظر آ رہی تھی۔ جس کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی ـــ اس نے ہاتھ بڑھا کر پنکھے کے سوئچ کو چھوا ـــــ اور اس نے پھر پھندا گلے میں ڈال لیا ـــــ

اچانک ایک خیال آیا:

" اس صورت میں نکلنے والی رُوح قیامت تک زمین پر بھٹکتی رہتی ہے ـــ!"

" ٹھیک ہے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائی ـــــ " چڑیل ہو جاؤں گی بس یہی نا" ـــــ

پھر ایک خیال آیا:

" چڑیلوں کی شکل بڑی ڈراؤنی ہوتی ہے" ـــــ

وہ پھر زیرِ لب بڑبڑائی ـــ " ممی کی صُورت سے زیادہ تو نہیں ـــ!"

پھر ایک خیال سوال بن کر اس کے دماغ میں در آیا ـ" چڑیل جیسی صورت والی ممی نے صدف جیسے شرمیلے شخص کو اپنی طرف کیسے مائل کر لیا؟ ـــــ پھر اس نے سوچا ـ" میری خوبصورتی کا جواب نہیں، میری شخصیت لاثانی ہے۔ پھر صدف نے ممی کو مجھ پر ترجیح کیسے دے دی ـــ مجھ میں کیا نہیں جو ممی میں اس نے پایا ....."

پھر اسے یاد آنے لگا ـــ کئی بار ایسا ہوا، خود صدف نے اس نے مجھے کھینچ لینا چاہا تھا، مگر میں نے اسے جھٹک دیا تھا ـــــ مرد کی یہ کمزوری صدف میں بھی ہے۔ اُف صدف!" ـــــ

وہ پھر زیرِ لب بڑبڑائی ـــــ " اگر ایسا ہی تھا تو میں اپنی محبت کی خاطر اس حد کو بھی پھلانگ سکتی تھی، غلطی میری ہی تھی ..... ہاں میری ہی، اور اب میں اس غلطی کا خمیازہ بھگتنے کے لیے خودکشی کر رہی ہوں .... خودکشی ...... !"

اس نے آنسوؤں کو روکنا چاہا، مگر وہ بے اختیار ہو کر چھلک ہی پڑے ـــــ وہ اسٹول پر کھڑی سسکتی رہی اور سسکتے سسکتے پھر اس نے پھندے کو ٹٹولا اور جلدی سے گلے میں ڈال کر ہاتھ سوئچ کی طرف لے گئی ـــــ اچانک ہوا چل پڑی، ایک تیز جھونکا کمرے میں بھی آگیا ـــــ وہ دل زدہ کاغذ اڑ کر اسٹول کے پاس چلا آیا۔ روناں نے پھر پھندا ہٹایا، اسٹول سے اُتری، وہ دل زدہ کاغذ اٹھایا، میز کی طرف بڑھی....

اور پھر کوئی کھٹ کھٹ دروازہ پیٹ رہا تھا...... پیٹے جا رہا تھا..... اس نے جلدی سے کاغذ کو دراز میں ٹھونسا ـــــ اور "کون ہے؟" کہتی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔

تار والا تھا ـــــ

روناں سکتے میں آگئی۔

اسٹول، پنکھا، پھندا ـــــ اب تینوں کچھ عجیب سے لگے ـــــ

پھر جیسے وہ اسٹول ایک طرف لڑھکا ہوا اور پنکھا تیزی سے گھومتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔!

ٹوٹے گلدان کا پھول چُوسنے والی ممی کی زبان آدھی سے زیادہ باہر نکل آئی تھی ـــــ گردن، پھندے میں کس چکی تھی ـــــ

اور وہ خود صدف کی چھکول میں ـــــ

ممی مر چکی تھیں ـــــ

ـــــ تار میں ان کا اچانک 'ہارٹ فیل' ہو جانے کی اطلاع تھی ـــ!!

**

بدرالدین بدرؔ
مٹیا برج۔ کلکتہ ۱۸

غزل

عرصے بعد وہ گھر لوٹا ہے تھوڑا اشکہ لایا بھی ہوگا
آنگن میں جب دھوپ بھری ہے مٹھی بھر سایہ بھی ہوگا

کون یہاں سنتا ہے کس کی سب کے پاس ہے بے خبری
چہروں کی اس بھیڑ میں شاید خوف بھرا لمحہ بھی ہوگا

خوش نظری سے دیکھنے والی راہوں میں سناٹے ہیں!
رات کو دن لکھا تھا جس نے حرفِ غلط لکھا بھی ہوگا

اسکی بھیگی آنکھوں میں بھی چاند ابھر کر ڈوبے ہوں گے
جب سے خواب پہ پہرے بیٹھے ہر شب وہ جاگا بھی ہوگا

اپنے فن میں وہ یکتا تھا زنجیروں سے جوڑتا تھا
سہما سہما جینے والا قسطوں میں مرتا بھی ہوگا

میرے گھر کی ساری باتیں ہمسایوں میں عام ہوئیں
دیواروں کے پار سے کوئی کمرے میں جھانکا بھی ہوگا

جاوید اکرم
۱۰/۱۔ سول لائنس
فتح گڑھ

دعا

ماں دعائیں کرتی ہے
رات دن نمازوں میں
اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر
اچھی نوکری پائے
اچھی زندگی پائے
اس کے پھول جیسے ہونٹ
مسکراہٹیں چومیں
اس کے ننھے منے ہاتھ
خوشیوں کے ورق کھولیں
اس کے سرمئی سپنے
کہکشانی ہو جائیں۔!

ماں دعائیں کرتی ہے
رات دن نمازوں میں
اس کا بیٹا دنیا میں
اس زمیں کے ماتھے پر
چاند بن کے روشن ہو
اس کا بیٹا دنیا میں
اک مثال بن جائے
دنیا بھر کی اچھائی
اس کے دل میں بھر جائے۔

یہ مگر خیالوں کی
اک حسین دنیا ہے
جس میں پھول کھلنے سے
پہلے سوکھ جاتے ہیں
مفلسی کے ہاتھوں سب
خواب ٹوٹ جاتے ہیں

ماں!!
مگر دعاؤں کی
شمع
گل نہیں کرتی۔!!

ہندی افسانہ

یوگیندر سنگھ
ترجمہ: سہیل کاکوروی

شیطان

روی کے آتے ہی چوراہے پر بیٹھا پان والا کچھ سہم سا گیا کچھ لوگ دوکان کے پاس سے ہٹ کر ادھر اُدھر ہو گئے۔ اس کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ اس نے سامنے کھڑے ایک بہت بھیانک شکل کے آدمی کو بلایا اس سے کچھ کہا۔ سننے والا بھی خوفزدہ تھا اس نے ہر بات پر ہاں میں ہی گردن ہلائی، پان والے نے بغیر مانگے اس کی طرف پان کی کچھ گلوریاں بڑھادیں گھر پہنچ کر روی نے گھنٹی بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دروازہ کھولا اور فوراً ہی آنکھیں جھکائے اندر چلی گئی۔

روی کمرے میں آیا اس نے آئینہ میں خود کو دیکھا اس کی نظریں اپنی نظروں سے ملیں اور وہ کچھ سوچنے لگا۔

روی اندھیرے میں گنگناتا ہوا زینے پر چڑھتا چلا گیا، چھٹی منزل کے فلیٹ نمبر ۹ کے صدر دروازے پر ٹھہر کر وہ مٹا اور شیشے کے بارے شہر کو سونے کی تیاری میں دیکھ کر کچھ سہم سا گیا۔ اچانک اس کی انگلی کال بیل پر پہنچ گئی ایک لمبی گھنگھناہٹ پرسکون ماحول کو چیرتی چلی گئی۔

"کون "؟ اندر سے ایک عورت کی آواز آئی۔

"میں ہوں روی، ممی "

"کہاں تھے اب تک ؟"

"وی سی آر دیکھ رہا تھا سنہا انکل کے گھر میں "

"کس سے پوچھ کر گئے تھے ؟" آواز میں غصہ اور تلخی تھی۔

"پاپا سے کہہ دیا تھا "

" دروازہ نہیں کھلے گا "

" دروازہ کھول دیجئے "

" وہ تو نہیں کھلے گا "

اس کی چھوٹی بہن نے اندر ہی اس عورت سے گذارش کی "ممی دروازہ کھول دیجئے روی دادا بھوکے ہوں گے "

"تجھے ہی کاٹ کر کھلا دوں گی ہاتھ بھر کی زبان بہت چلنے لگی ہے "

وہ کچھ اور بولنے کو تھی کہ چٹاخ کی ایک آواز نے روی کو ہلا دیا اور وہ تھوڑی دیر بے بس کھڑا رہا پھر اس کے دل میں چھوٹی بہن کے گال پر چٹاخ سے پڑے طمانچے کی آواز سے چنگاریاں دھواں دینے لگیں اور وہ باپ نظروں کے سامنے ابھرا جس نے نہ تو روی کا اس وقت باہر ہونا محسوس کیا اور نہ اس کی بہن کی اذیت کو۔ اس کے دماغ میں وہ کمرہ ابھر آیا جہاں نئی ماں نے اس کے باپ کے دماغ کی ساری نسیں بیکار کر دینے کے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ کمرہ، اس کے در و دیوار کالے ناگ کی طرح روی کو روز ڈستے تھے کہ اس کمرے سے نکل کر وہ باپ نہیں اجنبی بن جاتا اور ایک شیطان اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر ناچا کرتا تھا وہی باپ کہ جو کہا کرتا تھا شادی بچوں کے لیے کر رہا ہوں۔ کون سنبھالے گا ان بچوں کو۔ میں تو بینک چلا جاتا ہوں۔ سبھی نے ہمدردی کی تھی بچوں کو سینے سے لگا کر پیار کیا تھا سب ماں باپ

بننے کو تیار تھے اس کی اپنی ماں نے مرنے سے پہلے کہا تھا روی پاپا کو تنگ مت کرنا۔ روپا کا دھیان رکھنا۔ تبھی وہ چودہ سال کی اس عمر میں ہی سوچنے کی حالت میں آکر اپنی عمر سے کئی سال بڑا ہو گیا تھا اور وہ روپا کا دھیان نہیں رکھ پاتا تھا۔ روپا روز مار کھاتی تھی اور دس سال کی کچی عمر میں اس پر سمجھداری کا عذاب نازل ہو گیا تھا وہ اپنے روی دادا سے بہت پیار کرتی تھی۔

اس دن اسکول میں دوپہر کے کھانے کی چھٹی ہوئی، سبھی بچے اپنا اپنا ٹفن نکال کر اِدھر اُدھر ساتھیوں میں مل بانٹ کر کھانے لگے۔ روی اپنے کلاس ہی میں بیٹھا تھا۔ اجے اس کے ساتھ پڑھتا تھا وہ ادھر ہی آ نکلا۔

"کیوں روی۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" اجے روی سے بہت پیار کرتا تھا۔

"ٹفن نہیں لائے؟" ماں سے پھر کھٹ پٹ ہو گئی؟ آؤ چلیں۔"

روی اسی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ "چلو آؤ میرے پاس جو کچھ ہے وہی ہم دونوں کھا لیں گے" اجے نے اتنا کہا اور روی کو گھسیٹ کر کلاس سے باہر لے گیا روی اداس سا اپنے کلاس کے پانچ چھ لڑکے لڑکیوں کے بیچ بس اجے کا ساتھ دے رہا تھا۔ نٹ کھٹ رما نے روی کو جھنجھوڑا اس پر بھی روی کچھ نہیں بولا "کیوں روی اتنے چپ کیوں ہو"؟ رما سنبھل کر بولی۔ شیلا نے بات کاٹ دی "دوسری ماں نے ستایا ہوگا، کیوں روی؟" تیسرے ساتھی نے پوچھا "یہ سوتیلی مائیں ستاتی اور ظلم ہی کیوں کرتی ہیں؟ ان کا عورت والا کومل دل کہاں چلا جاتا ہے جس میں ممتا بھری ہوتی ہے۔"

"ایسا مت کہو" شکتی نے زور دے کر کہا۔

"میری بھی دوسری ماں ہے، مجھے ذرا بھی چوٹ لگے وہ رو پڑتی ہے بہت پیار کرتی ہے مجھے۔ گھر پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو جائے تو دروازے پر کھڑی میری راہ دیکھتی رہتی ہے اور پھر میرے پہنچنے پر کوئی سوال کرنا تو دور الٹے مجھے چومنے لگتی ہے۔"

"سب ایسی نہیں ہوتیں۔" تیسرے ساتھی نے کہا۔

"ارے مجھے مارے ڈانٹے کچھ بھی کرے لیکن روپا تو بہت چھوٹی ہے وہ تو بات کا مطلب بھی نہیں سمجھتی اس کو کیوں مارتی ہے، عجیب سے سناٹوں میں رہتی ہے وہ۔ نہ جانے کیا سوچا کرتی ہے دس برس کی بچی گھر بھر میں جھاڑو لگاتی ہے پوچھا کرتی ہے اور باسی کھانا آدھا پیٹ کھاتی ہے اور دوسری ماں کا اپنا لڑکا ٹیکسی پر اسکول جاتا ہے۔ ٹانی آدھی کھا کر پھینک دیتا ہے اور چھوٹا ہو کر بھی روپا کو مارتا ہے" روی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ماں بگاڑ رہی ہیں۔ انھیں کی شہ پر کرتا ہے" اجے نے کہا ___

"اور ماں کس کی شہ پر کرتی ہے؟" روی کا سوال خود جواب تھا۔

"وہ ماں سے زیادہ ظالم ہے۔"

سبھی چپ ہو گئے اور ٹفن اٹھا کر کلاس میں چلے گئے۔ اسکول کی چھٹی کے وقت اجے نے روی سے کہا۔

"چلو آج میرے ساتھ میرے گھر چلو"

"نہیں آج نہیں۔"

"دیکھو روی ہمت سے کام لو سب ٹھیک ہو جائے گا"

روی بغیر کچھ کہے دوسری سمت چلا گیا۔

کچھ دن بعد اس کا اسکول جانا بھی کم ہو گیا۔ پڑھنے سے اس کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ حالانکہ وہ سمجھتا تھا کہ جو راستہ اس نے اپنایا ہے دنیا کی نظروں میں وہ غلط ہے، ایک دن اجے اس سے ملا۔ اس نے اسے سمجھایا بھی لیکن روی! وہ اپنے آپ میں تھا ہی نہیں۔ "بھگوان کی دیا سے سب ٹھیک ہو جائے گا اسکول آیا کرو" اجے نے کمزور لفظوں سے روی کے دماغ

پر اثر ڈالنا چاہا۔ اس نے صرف اتنا کہا "مجھے اکیلا چھوڑ دو اجے میں جہاں ہوں جیسا ہوں ٹھیک ہوں مجھے کسی بھی حال میں مر جانے دو کیونکہ میرے گھر میں ایک مرد کی مردانگی ایک عورت کے چونچلوں سے روندی جا چکی ہے میں اپنی اس حالت پر اپنے اس رویے سے بالکل شرمندہ نہیں ہوں۔

" میری ماں رہی نہیں باپ ہو کر نہیں ہے اب میں کسی طرح اپنے ہونے کا ثبوت دوں گا میں بہت الجھا ہوں مجھے اور نہ الجھاؤ۔"

اجے مایوس ہو کر چلا گیا۔

اور اسی دن اس کی ماں کے رشتہ کے ایک بھائی آگئے وہ کئی دن رہے ایک دن انھوں نے روپا سے اپنے کمرے میں جھاڑو لگوائی اور .... روپا کی چیخ نکل گئی، روی اسی وقت کہیں سے آگیا ان کا بھاری بھر کم جسم سڑک پر دور تک لڑھکتا چلا گیا روی کے ہاتھوں میں فولاد کی سی طاقت آگئی تھی جس کا اندازہ بہتوں نے کیا۔

اور اس دن سے اس نے ہر اس بازو پر وار کیا جو بُری نیت سے اس کی طرف بڑھا اور پھر بُری نیت سے اٹھنے والی نظریں جھکتی چلی گئیں۔ اب گھر میں روی کے ہونے پر سناٹا چھایا رہتا باپ نے دھمکیوں سے کام لینا چاہا گھر سے نکال دینے کو کہا لیکن روی کی آنکھیں اس کے عمل سے زیادہ خطرناک ہو گئی تھیں اس لیے پتا جی کے بہت سے جذبوں نے بھی کھل کھیلنا چھوڑ دیا تھا روپا کے تن پر نئے کپڑے دکھائی دینے لگے تھے اور گھر میں ایک نوکرانی بھی آگئی تھی۔

" روی دادا سریندر انکل الہ آباد سے آ رہے ہیں"

بہت دیر سے کھویا ہوا روی روپا کی آواز پر حقیقت کی دنیا میں آگیا۔ آج بہت دنوں بعد وہ سوچ کی وادیوں میں پہونچ گیا تھا۔

"کب آ رہے ہیں ری ؟" روی نے یونہی پوچھ لیا ورنہ وہ کسی کے آنے جانے کا کوئی اثر نہ لیتا تھا "آج شام کو۔"

اور روی جینس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہیں نکل گیا۔

.... شام کو سریندر انکل آگئے۔ روپا بڑی خوش تھی سریندر انکل بہت ہنسانے تھے بہت زمانے کے بعد آئے تھے وہ۔ اسی بیچ اجے آگیا وہ روی کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ اتنے میں سریندر انکل بھی پیچھے پیچھے آگئے "ارے آپ کب آئے انکل"؟

" آج ہی آیا۔ روی تمھارے ساتھ نہیں تھا"؟

..... انھوں نے اجے سے پوچھا۔

"نہیں"

اور پھر اجے سریندر انکل کے ساتھ بیٹھ گیا۔

سریندر انکل اس سے بھی بہت پیار کرتے تھے ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں اور بہت دیر تک ہوتی رہیں چہروں کے رنگ بدلتے رہے اجے کے جانے کے بعد سریندر انکل نے سگریٹ جلا لی۔

رات گیارہ بجے روی آیا اور آکر سریندر انکل سے ملا اور وہیں اس کا کھانا آگیا۔ پہلے عام باتیں ہوتی رہیں پھر وہ اہم بات پر آگئے اور مشفقانہ انداز سے بولے۔

" زندگی اس لیے نہیں ملی کہ اسے یوں برباد کیا جائے روی!"

" پھر اسی طرف لوٹ جاؤں کہ جدھر ہر قدم پر حالات میرا راستہ روکیں۔ نہیں انکل! کوئی نہیں تھا بچانے والا جب میں انسان تھا اور شیطان مجھ پر وار کرتا تھا اب شیطان کو مغلوب کرنے کے لیے میں شیطان بن گیا، مجھے ایسا ہی رہنے دیجیے کیونکہ لوہا لوہے سے ہی کٹے گا۔"

اور سریندر انکل چپ ہونے پر مجبور ہو گئے۔

●••

نسیم ساغر
آر ۳۲۰، گارڈن ریچ
کلکتہ

غزل

سیلِ موجِ بے کراں، بے رحمیاں حدِّ نظر
ساحلِ خستہ اناکی دھجیاں حدِّ نظر

ایک پتھر کیا اُگا میرے کفِ بے جان میں
آئینوں نے بھی سنبھالیں کرچیاں حدِّ نظر

میں جہاں سے اُٹھ کے آیا تھا اسی منظر میں ہوں
خشک تھی شاخِ بلندی پستیاں حدِّ نظر

واقعہ یہ ہے ہوا سے ہو گئی تھی رسم و راہ
اس لیے بکھری ہوئی ہیں تیلیاں حدِّ نظر

دُور منزل، راہ پُر خم، آبلہ پائی کا وار
حوصلوں کے بخت میں ویرانیاں حدِّ نظر

پہلے اس نے سونپ دی ساری نگہداری مجھے
پھینک دیں جنگل میں پھر چنگاریاں حدِّ نظر

جن پہ ہم چھوڑ آئے ہیں ساغر لڑکپن کے نقوش
ڈھونڈتی ہیں آنکھیں وہ پگڈنڈیاں حدِّ نظر

صدف جعفری
۲۶، زکریا اسٹریٹ
کلکتہ ۷۳

خیالِ خام

آج چہرے کی لکیریں
زرد پتوں کی ادا سے
آئینہ دکھلا گئیں
سمجھا گئیں
کہ نقشِ باطل کے سوا
یہ زندگی کچھ بھی نہیں
ہنستا لڑکپن
اشک کے دامن میں جی کر
گردِ منزل بن گیا
گُم ہو گیا
اور بعد اس کے
نوجوانی کا زمانہ
سَو مُرادوں کا فسانہ
دھڑکنوں کا آشیانہ
اجنبی رستے پہ چل کر
زخم کتنے کھا گیا
احساسِ غم میں ڈھل گیا

وہ پھُول، خوشبُو، چاند، تارے
بادلوں کے سائے سائے
جو سدا سپنے رہے
مٹتے رہے!

اب تو دل یہ چاہتا ہے
چہرے کی مُردہ لکیریں
مٹھیوں میں بھر کے اپنی
آسماں پر پھینک دیں
اور پھُول، خوشبو، چاند تارے
بادلوں کے سائے سائے
ہم سجا کر زندگی میں
مسکرائیں، گنگنائیں

پر یہ ممکن تو نہیں ہے
کہ خیالِ خام ہے یہ!

●●

شاہنواز قریشی

افسانہ

روشنی تیز ہے

میرے شہر کے ماحول میں بڑا ٹھہراؤ ہے۔ فضا میں ایک سکوت سا ہے۔ اسی سکوت اور اسی ٹھہراؤ کے ماحول میں میں نے زندگی کرنا سیکھا۔ یہیں آنکھیں کھولیں اور خواب دیکھے۔ میرے یہ خواب، میری اپنی ہی ذات تک محدود نہیں تھے۔ ان کا تعلق دوسروں سے بھی تھا۔ میرے گرد و پیش سے بھی تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح کے خواب دیکھنا ایک فیشن ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ فیشن رہا ہو۔ میں یہ نہیں جانتا کہ میرے خواب اس فیشن کا حصّہ تھے کہ نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے خواب مَرے نہیں ہیں، بکھر ضرور گئے ہیں۔ اور یہ بکھراؤ مجھے دس سے پانچ بجے تک کا قیدی بنا گیا ہے اور اب میں اسی قید کے سہارے جی رہا ہوں۔ میں اب بھی اسی کوشش میں رہتا ہوں کہ اپنے بکھرے خوابوں کو یکجا اور محفوظ کر لوں۔ تاکہ یہ کبھی ٹوٹنے نہ پائیں۔ میں نہیں جانتا میرے خوابوں کی تعبیر کیا ہے؟ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ یہ بکھرے خواب بھی میرا ساتھ نہ چھوڑیں۔

"لیکن دوست! تمھارے خواب تمھیں اس شہر سے بہت دُور لے گئے ہیں۔

"تم نے بھی اسی شہر میں، ٹھہراؤ اور سکوت کے اسی ماحول میں زندگی کرنا سیکھا تھا۔ یہیں آنکھیں کھولی تھیں اور خواب دیکھے تھے۔

تم نے بھی دس سے پانچ تک کی قید کے سہارے برسوں زندگی کی ہے۔ اس شہر میں بھی اور وہاں بھی جہاں تم اب ہو۔

لیکن جہاں تم اب ہو وہاں نہ دن ہوتا ہے نہ رات نہ شام، وہاں تو بسوں کی سیٹ سے سورج طلوع ہوتا ہے۔"

جہاں تم ہو وہاں سب نے اپنی آنکھوں کو سروں کے خول سے نکال کر جیبوں میں ڈال لیا ہے۔ اور وہاں کیا ہے۔؟ کھوے ہیں، کولھے ہیں، پنڈلیاں ہیں، ٹانگیں ہیں اور .... فائیو اسٹار ہوٹل، نائٹ کلب، آرکسٹرا اور کانوں کو پھاڑ دینے والی چیختی موسیقی۔ اور زمین پر رینگتے بے حس سمندر۔ عمارتوں کو نگلتی عمارتیں۔ اور ان سب کے بیچ تم نے ایک دن دس سے پانچ تک کی قید سے رہائی حاصل کر لی اور ایک ایسے طویل راستے پر چل پڑے جہاں دور دور تک کوئی شجر سایہ دار نہیں ہے۔ جو تمھیں تیز اور چلچلاتی دُھوپ سے بچا سکے۔!

خوابوں کا سفر...... ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو تک...... دوسرے اسٹوڈیو سے تیسرے اسٹوڈیو تک اس طرح یہ سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ تیز اور چلچلاتی دھوپ میں بھی خوابوں پر تھکن نہیں آئی۔ لیکن دیکھو روشنی اتنی تیز ہے کہ کیمرے اندھے ہو گئے ہیں....

تم اس بے شجر راستے پر اتنے آگے جا چکے ہو کہ اب لوٹ

اس افسانے میں ندا فاضلی کی نظم "بمبئی" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

نہیں سکتے۔ اور نہ تمھیں لوٹنا چاہیے۔ لیکن تمھیں اپنی آنکھیں محفوظ رکھنا ہیں ـــــ!

کیا محفوظ رکھ پاؤ گے۔؟

ہو سکتا ہے کل ہی کوئی ساعت تمھیں بھی اپنی آنکھوں کو سر کے خول سے نکال کر اپنی جیب میں ڈال لینے پر مجبور کر دے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کل کی کوئی ساعت تمھیں اپنے گرد و پیش کے رینگتے ہوئے بے حس سمندروں کا کوئی حصہ بنا دے۔ تو کل کی ان ساعتوں سے خود کو بچا پاؤ گے۔؟

فائیو اسٹار ہوٹل، نائٹ کلب، آرکسٹرا، کانوں کو پھاڑ دینے والی چیختی موسیقی۔ خوبصورت چہرے، اجلی چمکتی رنگا رنگ پوشاکیں ڈسکو اور دور دور تک گلابوں کے چمن ..... کیمرے اندھے ہو گئے ہیں۔ کیمروں کو بینائی دے سکو گے؟

یہ دیکھو! میرے گھر کے پاس ایک چھوٹی سی تنگ و تاریک کوٹھری میں ایک سلونی عورت اپنے دو بچوں اور بوڑھی ماں کے ساتھ اپنی آنکھوں میں روشن خواب سجائے جانے کب سے جی رہی ہے۔ یہ عورت اپنے گرد و پیش سے بے نیاز اپنی کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھی کسی کی راہ تکا کرتی ہے۔ اس کے روشن خوابوں اور اس کے انتظار نے اس کے بدن میں دھرتی جیسی کشش پیدا کر دی ہے۔ لیکن کوئی کیمرہ اس طرف نہیں دیکھتا۔ کیمرہ ہی کیوں، ہم بھی تو اس کی طرف نہیں دیکھتے۔

اور دیکھو، اس ادھیڑ اور نحیف و لاغر عورت کو، جسے جینے کے لیے جھوٹے برتنوں کا سہارا لینا پڑا۔ یہ خاموش عورت جس کی آنکھیں مجھے ہمیشہ لبریز نظر آئیں۔ میں نہیں جانتا جانے کب سے جھوٹے برتنوں کے سہارے زندگی کر رہی تھی۔ ایک دن بس اتنا جان سکا کہ نسوں میں دوڑتی ندی راستہ بدل کر اس کے منھ سے جاری ہو جاتی ہے۔ اور ۔۔۔ پھر ۔۔۔۔ ایک دن نسوں میں دوڑتی ندی بے آب ہو گئی اور اسے جھوٹے برتنوں کے سہارے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

لیکن اسے بھی کوئی کیمرہ دیکھ سکا، نہ ہم .... روشنی اتنی تیز ہے کہ کیمروں کے ساتھ ہماری بینائی بھی شاید جاتی رہی ہے۔

یہ روشنی کم ہو جائے تو شاید کیمروں کے ساتھ ہماری بینائی بھی واپس آجائے؟ کیا یہ روشنی کم کر سکو گے؟ لیکن یہ سب کیسے کرو گے؟ بلندیوں سے نیچے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی ـــــ!

"آدھا رشلا" کا کہانی کار کتنی بلندی پر نظر آیا تھا۔ لیکن جب اس نے اپنی آنکھوں کو سر کے خول سے نکال کر جیب میں ڈال لیا تو تمھیں یقیناً یاد ہوگا کہ کشمکش کی جگہ اس کے چہرے پر کیسا ٹھہراؤ اور کیسا اطمینان آگیا تھا۔؟!

لیکن "آدھا رشلا" کا کہانی کار ہو، تم ہو یا میں ـــ کیا ہم سچ مچ بلندی پر ہیں؟ سچ مچ آدرش وادی ہیں۔؟ ہو سکتا ہے ہوں ـــ پر جا ہے کتنی ہی بلندی پر ہوں کتنے ہی آدرش وادی ہوں۔ یہاں ہوں یا وہاں ـــ سچائی یہ ہے کہ ہم سب کل کی ان ساعتوں کے منتظر ہیں جب ہمیں اپنی آنکھوں کو سر کے خول سے نکال کر جیبوں میں ڈال لینے کا فن آجائے اور پھر ہماری آنکھیں جیبوں ہی میں پڑی رہیں۔ **

غزل

حسن کاظمی
۴۴۲ - ہمایوں باغ
کان پور

یہ سچ اس کا پتہ کوئی نہیں ہے
نہ کہہ دینا خدا کوئی نہیں ہے
ہر اک گوشے میں باتیں ہیں اسی کی
جسے پہچانتا کوئی نہیں ہے
یہ کس نے غم دیا کس نے مسرت
تمھیں ہو دوسرا کوئی نہیں ہے
لبوں کی مسکراہٹ دیکھتے ہیں!
دلوں میں جھانکتا کوئی نہیں ہے
یہ پتھر کس طرف سے آرہے ہیں!
یہاں تو آشنا کوئی نہیں ہے
چلوں تو دوریاں ہی دوریاں ہیں
بظاہر فاصلہ کوئی نہیں ہے
سڑک پر حادثے ہوتے ہیں لیکن
ٹھہر کر دیکھتا کوئی نہیں ہے

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

نام کتاب: شمیم
شاعر: شمیم جے پوری قیمت: تیس روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی

غزل کی اہمیت اور عظمت کے بارے میں اب دو رائیں نہیں کم و بیش سارے ناقدین اس کے قائل نظر آتے ہیں۔ دراصل تیز رفتار صنعتی زندگی نے جہاں فاصلوں کو کم کیا ہے وہاں وقت کو بھی گھٹا دیا ہے ایسے میں ادبیات کا دائرہ لازماً سمٹا ہے۔ بہر نوع اردو غزل شکوک و شبہات کی فضا میں بھی ایک نئی انگڑائی کے ساتھ اپنا جادو جگاتی نظر آتی ہے۔ داغ نے جس غزل کی بنا ڈالی جگر تک آتے آتے وہ کچھ سے کچھ ہو گئی۔ سلاست، روانی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ گہرائی اور گیرائی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس وقت مجھے یادگار تسکین و جگر جناب شمیم جے پوری کا خوبصورت اور دیدہ زیب مجموعہ "شمیم" اظہار خیال کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ مجموعہ شمیم صاحب کی نفاست و خوش سلیقگی کا آئینہ دار ہے۔ کلاسیکی غزل کی مثبت اور صالح روایات کو شمیم جے پوری نے سلیقہ کے ساتھ برتا ہے۔

میں اپنے طور پر اس مجموعۂ کلام کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا مگر پیش لفظ پڑھنے کے بعد ارادہ بدل گیا۔ وہ یوں کہ یہ مرہون منت ہے محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا۔ پیش لفظ انتہائی قیمتی اور جامع ہے جس میں مولانا فرماتے ہیں:۔

> " اردو میں جدیدیت کی تحریک سے کچھ پہلے جن سربرآوردہ غزل گو شعرا نے اردو غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا اور تعمیری رُخ عطا کیا ان میں اصغر، فانی کے بعد مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، شفیق جون پوری اور روش صدیقی بہت ممتاز ہیں۔ جگر خاتم المتغزلین جگر نے غزل کو جو نئی معنویت اور نئی جہت عطا کی اس کا جواب نہیں ــــ انھوں نے غزل کو جو کچھ دیا ہے جسے "ورائے شاعری چیزے دگر" کہا گیا ہے انھوں نے غزل کو جس طرح حقیقت و مجاز، زہد و رندی مستی و ہشیاری، جنون و حکمت اور بے خودی کا آئینہ دار بنایا وہ لافانی حیثیت رکھتا ہے۔"

پھر آگے چل کر یہ جملے آتے ہیں:

> "آج کل جگر اور تسکین کے رنگ میں غزل کہنے والوں میں شمیم صاحب کو پہلا مقام دینا ہوگا۔ وہ اب اس شعری روایت کے وارث و امین اور ان محترم شعرا کے جانشین ہیں۔"

ایک اور اقتباس دیکھیں:

> "شمیم صاحب کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی و صفائی، روانی و بے تکلفی، شستگی و شیفتگی ہے۔ اس میں عموماً مشکل الفاظ اور دشوار ترکیبوں سے بچا گیا اور آسان، عام فہم اور مروجہ شعری پیرایۂ زبان اختیار کیا گیا۔ یہ سادگی کہیں کہیں ممتنع کو پہنچ گئی ہے دیکھنے میں بالکل آسان مگر کہنے میں بہت مشکل ــ دوسری خصوصیت (جس کا تعلق بھی کلام کے ظاہری اور خارجی پہلو سے ہے) زبان کی چاشنی اور حلاوت، نرمی اور لطافت ہے۔ انھوں نے بہت نازک اور سبک الفاظ استعمال کر کے غزل کی نزاکت و نفاست کو برقرار رکھا ہے۔ وہ غزل کے آداب سے واقف ہیں جس کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ نامانوس، کرخت اور بے ڈول الفاظ سے پرہیز کیا جائے اور وہ زبان و لہجہ اختیار کیا جائے جو غزل کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ اور جس میں ذرا بے احتیاطی کے سبب تغزل کا معیار باقی نہیں رہتا۔

شمیم صاحب اس سیاق میں قادر الکلام واقع ہوئے ہیں۔ وہ غزل کی زبان اور اس کے لہجے کے رمز آشنا اور نکتہ شناس ہیں جس کی وجہ سے ان کے کلام میں نغمگی و شیرینی، دلکشی و رعنائی، سلاست و حلاوت، ایک متوازن آہنگ اور ایک مترنم کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔" حضرت مولانا کے چند جملے اور
'جہاں تک غزلوں کی معنویت اور داخلی پہلو کا سوال ہے۔ اس میں بھی شمیم صاحب نے اصغر و جگر اور رونق و تسکین کی روایت برقرار اور غزل کی آبرو باقی رکھی ہے۔ عامیانہ اور سوقیانہ انداز اور ابتذال سے دامن بچایا ہے اور مجاز کو اس طرح برتا ہے کہ حقیقت دور نہیں رہ جاتی۔"

پیش لفظ کے ان اقتباسات کے بعد آئیے! شمیم جے پوری کے کچھ اشعار سے محظوظ ہوتے چلیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعۂ کلام مقبول و محبوب ہوگا اور وہ تا دیر اسی طرح گیسوئے غزل سنوارتے رہیں گے نیز تشنہ کامانِ غزل کو سیراب و سرشار کرتے رہیں گے ؎

ترے سوا کوئی موضوعِ گفتگو ہی نہیں
عجیب حال ہے ترکِ تعلقات کے بعد

دیکھ کر اُن کی نگاہِ لطف اک مدت کے بعد
کیا بتائیں کیا خیال آیا کہ آنسو آ گئے

اب حوصلۂ ترکِ ملاقات کرے ہے
اتنا سا دل اور کتنی بڑی بات کرے ہے

ذرا بھی جس کی وفا پر یقین آیا ہے
قسم خدا کی اسی سے فریب کھایا ہے

اک نظر کے لیے ساری عمر
عمر بھر کے لیے اک نظر

جنھیں حسرت بہت تھی زندگی کی
انھیں کو مار ڈالا زندگی نے

کسی پہ بار نہیں نازہائے نیم شبی
بڑے سکون سے سوتے ہیں میرے ہمسائے

ترے فراق نے شائستہ کر دیا ورنہ
غمِ حیات کے لمحے بہت گراں ہوتے

جادۂ عشق کی شاید کوئی منزل ہی نہیں
زندگی ختم ہوئی اور سفر باقی ہے

میں راہِ عشق کا تنہا مسافر
کسے آواز دوں کوئی نہیں ہے

——— رباب رشیدی

نام کتاب: نقوشِ ہستی شاعر: ذکی تانگانوی
قیمت: چوبیس روپے ملنے کے پتے: ذکی منزل۔ محلہ سوتھا۔ بدایوں۔ ماڈرن بک ڈپو سبزی منڈی بدایوں

حضرت ابرار حسنی گنوری کے حلقۂ تلامذہ کے ایک رکن جناب ذکی تانگانوی جن کی شاعری بدایوں کی ادبی فضا میں پروان چڑھی ایک سنجیدہ، پرخلوص اور وضع دار انسان ہیں۔ "نقوشِ ہستی" جس میں چند نظمیں اور قطعات بھی شامل ہیں کے جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ ذکی صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے شعری روایات اور قدیم ادبی اقدار کو ترجیح دی ہے لیکن وہ عہدِ حاضر کے مسائل، زمانے کے بدلتے ہوئے ماحول اور سماجی تقاضوں سے بے خبر نہیں ہیں۔ علم نجوم میں دخل کے باعث ان کے مشاہدے میں وسعت بھی ہے اور وہ مستقبل کی پیشین گوئی کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔

ان کے اندازِ فکر اور لب و لہجے میں داغ اسکول سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ "نقوشِ ہستی" زندگی محبت ہے اور محبت خدا کی تفسیر بھی ہے اور ترغیبِ عمل بھی۔ شاعر نے زندگی کو مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے دیکھا سمجھا اور برتا ہے۔ ذکی صاحب کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ اور آہنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ تاہم اپنے انداز اور اظہار میں انھوں نے وہ تاثر پیدا کیا ہے کہ آپ بیتی اور جگ بیتی گلے ملتی دکھائی دیتی ہیں بقول ڈاکٹر حامدی کاشمیری "وہ اپنے دور کے آشوب کا سامنا کرتے ہوئے غم، بیچارگی، افسردگی اور اضطراب کے جذبات سے آشنا ہوئے

ہیں یہ ان کے سچے محسوسات ہیں جو شخصی سطح پر وارد ہوئے ہیں اور ذکی صاحب انھیں ساحل، طوفان، آشیان، صیاد، بیاباں، چارہ گر، منزل اور بہار کے روایتی استعاروں میں اسیر کرتے ہیں ان کا کلام محبت، صبر، خلوص اور اخوت کی انسانی قدروں کی پامالی کے خلاف ایک خاموش احتجاج ہے" چند اشعار نمونتہً پیش ہیں :

بزمِ گردوں کے سسکتے ہوئے تاروں کو سلام
جو مجھے صبحِ درخشاں کی خبر دیتے ہیں

خزاں رسیدہ گلوں کی زباں سمجھتا ہوں
انھیں سے موسمِ گُل کا مجھے پیام ملا

خزاں بیکار ہی بدنام ہے اہلِ گلستاں میں
گلوں کے چاک دامن کر گئی جب بھی بہار آئی

دستِ جنوں بہار کا یوں اہتمام ہو
دامن دکھائی دے نہ گریباں دکھائی دے

کیوں ذکرِ اہلِ جہاں گوش برآواز نہ ہو
ان کی روداد ہے شامل مرے افسانے میں

—— سلطان احمد نادمؔ

غزل

ندیم راعی

چودھری اولس محل شہید
مرادآباد

نفرت و تعصب کی کھیتیاں جلادیں گے
بستیاں محبت کی چارسو بسادیں گے

برف پوش وادی میں آگ کے سمندر ہیں
ایک دن زمانے کو یہ بھی ہم بتادیں گے

دیکھتے ہیں وہ ہم کو خشمگیں نگاہوں سے
ہم انھیں محبت کا آئینہ دکھادیں گے

سوچتے رہے برسوں داستانِ غم اپنی
وہ ملے اگر تنہا ہم انھیں سُنادیں گے

یوں تو ہم وفاؤں پہ اے ندیمؔ نازاں تھے
کیا خبر تھی تعزیریں اور وہ بڑھادیں گے

شہیدِ ناموس

ص ۳۰ کا بقیہ

السّلام اے بستۂ زُلفِ حبیب
السلام اے خفتہ بخت و خوش نصیب

السلام اے مبتلائے دل فگار
اے ہلاکِ جلوۂ روئے نگار

پھر 'خاتمے' کی سُرخی کے تحت ابنِ آدم سے مخاطب ہوکر شاعر فلسفۂ موت و زندگی ان مؤثر الفاظ میں بیان کرتا ہے ؎

ہوش میں، ابنِ آدم ہوش میں
زندگی ہے موت کی آغوش میں

رُوح کو فرصت نہیں آرام کی
کش مکش میں عالمِ اجسام کی

مطلبِ دل زندگی میں فوت ہے
وصل کہتے ہیں جسے وہ موت ہے

ان اشعار سے شاد ملیح آبادی کی قادر الکلامی اور زورِ بیان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے. مجموعی طور پر یہ مثنوی معیاری مثنویوں میں شمار کی جاسکتی ہے.

**

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۲ نمبر ۱۲

مارچ ۱۹۸۸ء

ایڈیٹر: ——— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: ——— شاہنواز قریشی

فون { ایڈیٹر: ——— ۴۳۰۵۹ رہائش: ۷۴۳۴۸

جوائنٹ ایڈیٹر: ——— ۴۷۱۰۸

پبلشر اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک رُوپیہ
شرحِ سالانہ: دس رُوپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

اپنی بات

ہندستان ایک ایسا ملک ہے، جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے لوگ بڑی تعداد میں اس ملک میں رہتے آئے ہیں۔ چنانچہ بجا طور پر اس ملک کو کثرت میں وحدت کی جیتی جاگتی تصویر کہا جاتا ہے۔ زبانوں، مذاہب اور تہذیبوں کے فرق کے باوجود اس ملک کی دھرتی اور اس کی مٹی نے یہاں کے تمام باشندوں کو وطنی اور انسانی بھائی چارے کے مضبوط دھاگے میں ہمیشہ باندھے رکھا ہے۔ اگرچہ بعض بیرونی طاقتوں نے اس ملک کے رہنے والوں کے درمیان دوری اور خلیج پیدا کرنے کی کوششیں کیں لیکن اتحاد و یک جہتی کے جذبے نے ان کے ناپاک ارادوں کو ہمیشہ ناکام بنا دیا۔ چنانچہ ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا اتحاد ہی ہماری طاقت رہا ہے اور ترقی و خوش حالی کے راستے پر ہم جس طرح اور جتنا آگے بڑھے ہیں، وہ ہم آہنگی اور یک جہتی کی بدولت ہی ممکن ہوا ہے۔

ہمارے ملک میں جو سماجی اور سیاسی نظام کارفرما ہے، وہ ہمارا اپنا تشکیل کردہ ہے۔ خاص طور سے سیاسی نظام جو پارلیمانی جمہوریت پر مبنی ہے اسے اس عظیم ملک کے عوام نے اپنایا ہے۔ اس صورت میں ہم پر کچھ زیادہ ہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تمام ملک میں ہر سطح پر اتحاد و اتفاق اور بھائی چارے کا ماحول قائم رکھنا ہماری خصوصی ذمہ داری بلکہ فرض اولین ہے۔ اس ذمہ داری کی تکمیل اور اس فرض کی انجام دہی کی غرض سے ہماری ریاستی حکومت بھی ہمیشہ فعال اور سرگرم عمل رہی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے اترپردیش میں ایک علاحدہ محکمہ قومی یک جہتی قائم کیا گیا اور مختلف سطحوں پر یک جہتی کونسلوں کی تشکیل کی گئی۔ ان یک جہتی کونسلوں اور اقلیتی کمیشن کی سفارشات کو محکمہ قومی یک جہتی عملی شکل دیتا ہے اور اردو کی بقا و ترقی کے لیے عملی اقدامات بھی کرتا ہے۔ محکمۂ قومی یک جہتی شہری حقوق تحفظ ایکٹ کی دفعات کو نافذ العمل کرنے کا کام بھی انجام دیتا ہے اور ان دفعات کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا بھی دلاتا ہے۔ شہری حقوق تحفظ ایکٹ کے تحت چھوت چھات ایک جرم ہے۔ چنانچہ تمام عدالتوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ مذکورہ ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں کے سلسلے میں تعزیری کارروائی کو اوّلیت دیں۔

اس ملک اور ریاست کے تمام باشندوں کے درمیان اتحاد اور بھائی چارے کو مستحکم بنانے کی غرض سے فعال اور سرگرم عمل رہنے والے افراد اور اداروں کو حکومت کی جانب سے مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔

اقلیتوں کے تحفظ اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے پندرہ نکاتی پروگرام وضع کیا تھا۔ اس کی عمل آوری کے لیے بھی اترپردیش میں موثر اقدامات کیے گیے ہیں۔ اقلیت کے لوگوں کو کاروبار سے لگانے اور ملازمتیں فراہم کرنے سے متعلق معاملوں میں بھی موثر کارروائی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہدایات بھی جاری کی جا چکی ہیں جن پر سختی سے عمل درآمد بھی کرایا جا رہا ہے کہ درجہ چار کی اسامیوں اور پبلک سروس کمیشن کے دائرہ اختیار سے باہر تیسرے درجے کی اسامیوں کے لیے مقرر کردہ سلیکشن کمیٹیوں میں اقلیتی فرقے کا ایک نمائندہ ضرور رکھا جائے اور اگر متعلقہ محکمے میں ایسا کوئی افسر نہ ہو تو ضلع کے کسی دوسرے دفتر میں تعینات اس فرقے کے افسر کو ضلع مجسٹریٹ نامزد کرے۔ اگر متعلقہ ضلع میں بھی ایسا کوئی افسر نہ ہو تو متعلقہ ڈویژن میں تعینات کسی افسر کو ڈویژن کے کمشنر کے توسط سے سلیکشن کمیٹی میں نامزد کیا جائے۔

اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو زراعت اور تجارت کے لیے مالی اور تکنیکی امداد دینے کے واسطے اترپردیش میں ایک اقلیتی مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن بھی سرگرم کار ہے۔ یہ کارپوریشن جو کام انجام دے رہا ہے اس میں مارجن منی قرض اسکیم، صنعت کاروں کی تربیت، بلا سودی سرکاری امدادی قرض، بن باد کی برآمد، نیز پولیس اور پیرا ملٹری خدمات میں بھرتی کے لیے قبل تربیت وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام اقدامات سے بلاشبہ اقلیتوں کی فلاح و ترقی کے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اقلیتی فرقوں کے لوگ آگے بڑھیں اور مذکورہ بالا اسکیموں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

فضا ابنِ فیضی
مئوناتھ بھنجن

غزل

بے خط و خال سا، اک چہرہ اٹھا لائے تھے
عکس چھوڑ آئے تھے، آئینہ اٹھا لائے تھے

اسی سرمہ سے رہا دیدۂ بینا روشن
کچھ غبارِ شبِ اندیشہ اٹھا لائے تھے

سارے ہمسائے ہیں برہم، غلطی تھی اپنی
دھوپ کے شہر میں کیوں سایہ اٹھا لائے تھے

راستہ روک لیا، بن کر اسی نے دیوار
دشت میں، گھر سے جو دروازہ اٹھا لائے تھے

زندگی اپنی رہی پیاس کا صحرا، پھر بھی
ہم سمندر کو جزیرے پہ اٹھا لائے تھے

آگ برسائیں گے بادل، یہ خبر تھی کس کو
دیکھ کر ٹھنڈی جگہ، خیمہ اٹھا لائے تھے

نفسِ تازہ بھی ہے، نکہتِ رفتہ جیسا
کون سا گذرا ہوا لمحہ اٹھا لائے تھے

گھر میں رہ کر بھی نہ اعصاب سے اتری وہ تھکن
بوجھ تھی فرصتِ یکشنبہ، اٹھا لائے تھے

جل بجھے خود ہی کوئی بات جو منھ سے نکلی
لفظ چن لائے تھے، یا شعلہ اٹھا لائے تھے

رگِ احساس پہ جب چوٹ پڑی تو یہ کھلا
چوب خامہ کی جگہ، تیشہ اٹھا لائے تھے

اب کہاں رکھیں، ہم ان تازہ خراشوں کو فضا
اپنے حصہ کا تو خمیازہ اٹھا لائے تھے

مظفر حنفی
۳۵۸، باٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

غزل

دل بیچارے سے مت پوچھو، جادو ہے کیا ان کے پاس
یہ سوکھی دھرتی کا پروا، امرت برکھا ان کے پاس

پیڑ کسی کے، پھول کسی کے، خوشبو سائے ان کے ہیں
ترسی ترسی آنکھیں اپنی، موتی سچا ان کے پاس

پیارے پنچھی اس آشا پر چل چل کر میں جھیل گئے
رستے میں ہے، آتا ہوگا چنچل جھرنا ان کے پاس

رات بڑی بخشش والی تھی، چہرے دیکھئے ڈال گئی
اوس ہماری امیدوں پر، صبح کا تارا ان کے پاس

یہ ہے میرے خون کی شوخی، وہ چنگاری جذبے کی
تتلیِ آنچل پر لہرائی، جگنو چمکا ان کے پاس

ان کے بارے میں کچھ کہنا میری گستاخی ہوگی
مدت سے گروی رکھا ہے میرا بٹیا ان کے پاس

ان کی شکایت، ان کے شکوے، اکثر کرتے رہتے ہو
اور مظفر ہم نے تم کو اکثر دیکھا ان کے پاس

اکبر حیدری کاشمیری
۳۳۸ نرنگ گڑھ ، سرینگر ، کشمیر

حسرت اور مشاہداتِ زندانِ فرنگ کا ایک ورق

حسرت نے ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں ان کا حلیہ یوں تھا۔ چھوٹا قد، لاغر بدن، گندمی رنگ، چیچک کے مٹے ہوئے داغ، داڑھی کسی قدر گھنی، فراخ پیشانی، کلابتونی ٹوپی، پرانی وضع کے چارخانے کا انگرکھا، مشروع کا تنگ پاجامہ جس کے پائنچے ٹخنوں سے اونچے، عینک اور چھڑی اضافہ کیجئے۔ ایک بڑا پاندان ساتھ رہتا تھا۔ لڑکوں میں "خالہ اماں" کے نام سے مشہور تھے۔ کالج میں ان کے نام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ ان ایام میں وہ خوش عقیدہ مسلمان تھے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی زندگی کا نصب العین تھا۔ ابھی ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ خالہ اماں کے بجائے اب فضل "مولانا" ہوگئے۔ اسی زمانے میں سید سجاد حیدر نے "انجمن اردوئے معلیٰ" کی بنیاد ڈالی تھی۔ انجمن کے تحت ہر اتوار کو ایک خاص مقام پر اہلِ ذوق کا اجتماع ہوتا تھا اور لوگ نظم ونثر کے تازہ پھول نذر کرتے تھے۔ حسرت کی غزلیں مشاعرے کی جان اور مضامین نثر کی روح رواں خیال کئے جاتے تھے۔ بہت ہی قلیل عرصے میں مولانا اور اردوئے معلیٰ لازم و ملزوم ہوگئے۔ [1]

۱۵ر اکتوبر ۱۹۰۲ء کو اسٹریچی ہال علی گڑھ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ اس میں دوسرے شعراء کے علاوہ میر مہدی مجروح اور امیر اللہ تسلیم نے بھی اپنا کلام سنایا۔ مجروح نے جو غزل پڑھی تھی وہ ان کی زندگی کی آخری غزل تھی۔ اس میں وہ شعر تھے جن کا مقطع یہ ہے :

یوں شعر کو کہنا بہت آسان ہے مجروح
پر ہے روشِ غالبؔ اعجاز بیاں اللہ

مشاعرے میں حسرت نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ انگریزوں کی نظرِ عنایت ان پر ہر وقت رہتی تھی۔ اگلی صبح مارلیسن کا عتاب نازل ہوا۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے مشاعرے میں اخلاق سے گرے ہوئے اشعار سنائے تھے۔ اسی زمانے میں شملے میں علی گڑھ کرکٹ ٹیم نے کسی انگریزی کلب سے بازی لی۔ حسرت جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی بیٹ نہ چھوا تھا نہ گیند پھینکا تھا ایک شکستہ حال کنستر لئے ہوئے اور تیل کو حوالۂ خاک کر کے سب سے آگے آگے اپنا کوک بجاتے ہوئے نواب محسن الملک کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرنسپل نے ان کا نام فردِ سیاہ میں درج کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں حسرت یونین کلب کے سکریٹری ہوگئے۔ مارلیسن، مسٹر پننگ اور مسٹر براون نے مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کرکے زمانۂ تعلیم ختم ہوا تو وظیفۂ قانونی کے لئے مولانا نے درخواست دی۔ مارلیسن نے روکی اور بورڈنگ ہاؤس سے نکالا۔

---

[1] زمانہ۔ کانپور بابت دسمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۷۷ تا ۲۹۱، حسرت موہانی از عنانی خاں۔

[2] اردوئے معلیٰ علی گڑھ بابت یکم اگست ۱۹۰۳ء۔ پشت سرورق۔

مولانا حسرت نے اردوئے معلّٰی کا رسالہ جولائی ۱۹۰۳ء میں نکالنا شروع کیا۔ فروری ۱۹۰۴ء میں وہ کانگریس سے وابستہ ہوگئے، اور اس کے حق میں لکھنے لگے۔ اپریل ۱۹۰۶ء کے اردوئے معلّٰی میں صفحہ ۱۰ میں "مسلمان اور کانگریس" کا مضمون ایک مسلمان کے نام سے شائع کیا۔ مضمون میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ کانگریس کو مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیئے۔ غرضیکہ ۱۹۰۴ء میں وہ بمبئی کے کانگریس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور سورت کانگریس تک وابستہ رہے۔ سورت کانگریس کے اختلاف کے بعد تلک کی رہبری میں کانگریس سے الگ ہوگئے۔

مولانا کانگریس کے بڑے سرگرم کارکن تھے۔ ماہ جنوری ۱۹۰۷ء کے اردوئے معلّٰی میں صفحہ ۱۲ میں "نیشنل کانگریس کا اکیسواں اجلاس" کے تحت لکھتے ہیں کہ :-

"اگر ہندو اخبار کم ازکم "ہندوستانی اخبار" کی پالیسی اختیار کریں اور مسلمان اخبار "پیسہ اخبار" کو نمونہ قرار دے لیں تو وہ اپنی قومی حقوق کی حمایت پر قائم رہ کر بھی دوسری قوموں کی دلآزاری سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ چند روشن خیال مسلمان جو اب تک کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔ مثلاً حاجی موسیٰ خان رئیس دتاولی علی گڑھ اور شیخ عبداللہ صاحب بی۔ اے ایل۔ ایل بی مستند پیشوایان کانگریس مثلاً سر فیروز شاہ مہتا، مسٹر گوکھلے اور مسٹر تلک سے پرائیوٹ طور پر ملیں تو ہم کو قطعی یقین ہے کہ ان کے دلوں سے کانگریس کی جانب سے تمام شکوک ان فرشتہ خصال بزرگوں کی صاف دلی اور بے تعصبی کے اثر سے خود بخود محو ہوجائیں اور مسلمان بلاخطر کانگریس میں شریک ہونے لگیں"۔

اردوئے معلّٰی کے ابتدائی پرچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نیشنل کانگریس دو گروہوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک فریق نرم اور دوسرا فریق گرم۔ فریق نرم کا رجحان انگریزوں کی طرف تھا اور وہ محدود آزادی کا خواہاں تھا۔ برعکس اس کے فریق گرم مکمل آزادی کا حامی تھا۔ حسرت فریق گرم کے علمبردار تھے۔ موصوف اردوئے معلّٰی بابت ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۲۹ تا صفحہ ۳۹ میں "فریق نرم کی بعض غلط فہمیاں" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :-

"ہم بلاخوف تردید کہتے ہیں کہ جب تک ہمارے مطالبوں کا دائرہ تنگ تھا اس وقت تک عرضداشتوں اور شکایت ناموں سے بھی کچھ کام نکلتا رہا لیکن جبکہ ہم نے سوراج کو اعلانیہ اپنا پولیٹکل مذہب بنا لیا ہے تو اب بھی گداگری کی قدیم پالیسی پر قائم رہنا اول درجے کی نادانی ہے۔ کیا معنی کہ جب یہ بات صریحاً عقل کے خلاف ہے کہ کوئی شخص کسی سائل کو اپنی تمام جائداد محض اسکے سوال پر بخوشی دے تو ہم انگریزوں سے کس بنا پر اس کی امید کرسکتے ہیں کہ وہ محض ہماری درخواست پر حکومت کے تمام اہم فوائد سے برضامندی دست بردار ہوجائیں گے۔ اب تو اگر ہمیں اپنی بات کا ذرا بھی پاس ہو تو بجائے ریزولیوشن پاس کرنے کے دفاعی مزاحمت کی پالیسی پر کاربند ہونا چاہیئے۔ اور عرضداشتیں پیش کرنے کو اس وقت تک ملتوی کردینا چاہیئے جب تک کہ ملک میں اتنی قوت پیدا نہ ہوجائے کہ ہماری عرضیاں جبری مطالبوں کی قائم مقام کہی جاسکیں لیکن فریق نرم کو خوف ہے کہ ایسی کارروائی سے انگریز ناراض ہوجائینگے"۔

حسرت نے اردوئے معلّٰی نمبر ۳، جلد ۹ بابت ستمبر ۱۹۰۸ء

کے صفحہ ۵۰ میں ایک پولیٹکل غزل شائع کر کے تہلکہ مچایا غزل چھپتے ہی زبان زد عام ہو گئی تھی اور اس کی تاثیر سے لوگوں میں آزادی کا ولولہ پیدا ہو گیا۔ غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حب وطن مست خواب دیکھئے کب تک رہے

تا بہ کجا ہو دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا
خلق خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

خدمت باطل میں ہے فرقۂ نرم آج کل
حق سے اسے اجتناب دیکھئے کب تک رہے

بال تلک کا جو ہیں درپئے اظہار حق
باغی و مفسد خطاب دیکھئے کب تک رہے

دولت ہندوستان قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

حسرت آزاد پر جور غلامان وقت
از رہ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

حسرت تلک کے دل و جان سے معتقد تھے۔ تلک ہی پہلے شخص تھے جو آزادی ہند کی خاطر سب سے پہلے قید کئے گئے تھے۔ حسرت نے اردوئے معلی بابت ستمبر ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۹ میں مسٹر تلک کی سالگرہ کے موقع پر ۱۰ شعر کی ایک غزل شائع کی تھی۔ چند شعر قابل ذکر ہیں ؎

اے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن

سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزند ہند
خدمت ہندوستان میں کلفت قید محن

ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو
اے تلک قائم رکھے تا دیر رب ذوالمنن

تلک کی موت پر کہتے ہیں ؎

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک مہاراج تلک آزادوں کے سرتاج تلک

جب تک وہ رہے دنیا میں رہا سب کے دلوں میں زور اس کا
اب رہ کے بہشت میں نزد خدا حوروں پہ کریں گے راج تلک

اپریل ۱۹۰۹ء کے اردوئے معلی کے صفحہ ۴۲ میں حسرت کا ایک مضمون "الٰہ آباد میں غلاموں کا جلسۂ کنونشن" شائع ہوا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ فریق نرم کے فیروز شاہ مہتا، مسٹر درچا، مسٹر گوکھلے، مسٹر کھرے، سریندر ناتھ بنرجی، ڈاکٹر گھوش اور دادا بھائی نوروزجی، وطن پرستوں یعنی فریق گرم کے صرف اس بنا پر دشمن تھے کہ وہ لوگ یعنی وطن پرست حریت کامل کے دعویدار اور غلامی سے بیزار تھے۔

ایک اور جگہ نومبر ۱۹۰۹ء کے ص۱۲ اور ص۱۳ میں حسرت "اردوئے معلی کی پالیسی" بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"رہنمایان فریق نرم، پیروان مسلم لیگ اور بانیان ہندو کانفرنس! اہل ہند دوامی محکومی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ہمارے انتہائی عروج کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام یا محکوم سے خوشحال محکوم ہو جائیں۔ یہ لوگ آزادی ہند کی خواہش کو خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ان کا دائرہ خیال اور اس لئے دائرۂ عمل بھی نہایت تنگ اور محدود ہے ان کی روش دنیا کی رفتار حریت کے خلاف اور اس لئے قطعی طور پر غیر یقینی اور نا قابل قبول ہے اردوئے معلی کو ان لوگوں کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ مرحوم مصطفیٰ کامل پاشا "مفتوح قوموں اور ملکوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی پالیسی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی تمام ہمت کے ساتھ حریت کامل کے دوبارہ حاصل کرنے کی سعی میں مصروف ہو جائیں۔ پس جس شخص کی پالیسی اس سے کچھ بھی مختلف ہو اس کی نسبت سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بھی خواہان وطن کے گروہ سے یقیناً خارج ہے۔"

مصر کے انقلابی جواں سال لیڈر مصطفےٰ کامل پاشا کا انتقال ۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ہوا۔ حسرت نے "آزادی مصر پر مصطفےٰ کامل پاشا کی اسپیچ" ۴۵ صفحوں میں اردوئے معلےٰ میں الگ رسالے کی صورت میں بغیر کسی نام کے شائع کیا۔ اردوئے معلےٰ کا یہ شمارہ نادر و نایاب ہے۔ اس کی عدم دستیابی کی وجہ سے لوگوں کو کافی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ راقم حروف کو خوش قسمتی سے اس کا مکمل شمارہ دستیاب ہوا۔ یہ پہلے علی اصغر بلگرامی کے کتب خانے میں تھا۔ بعد ازاں کشمیر یونیورسٹی کی اقبال لائبریری میں اردوئے معلےٰ جنوری ۱۹۰۸ء کے ساتھ مجلد ہے۔ اس جلد میں فروری تا اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے بھی شامل ہیں۔ اردوئے معلےٰ کے اس خصوصی شمارے میں کہیں تاریخ نہیں درج کی گئی ہے۔ سرورق پر عبارت ذیل درج ہے:

"آزادیٔ مصر پر مصطفےٰ کامل پاشا کی اسپیچ از اردوئے معلےٰ علی گڑھ نیشنل لٹریچر پبلشنگ سوسائٹی سیالکوٹ کے لئے قومی پریس سیالکوٹ میں باہتمام سید لمان شاہ چھپی۔
تعداد اشاعت دو ہزار۔ قیمت مفت۔

بقول سید سلیمان ندوی صاحب مضمون مذکور حسرت کا نہ تھا مگر مقدمہ قائم ہونے پر حسرت نے اس کو خود اوڑھ لیا اور باوجود اصرار کے اس کے لکھنے والے کا نام نہیں بتایا۔ جہاں تک کان میں پڑی ہوئی بات اس وقت یاد آتی ہے خیال آتا ہے کہ یہ مضمون اعظم گڑھ کے مشہور شاعر وکیل اقبال سہیل کا تھا جو انہی کی طرح شعر و سخن اور سیاسی مذاق کا اتحاد رکھتے تھے۔[۳۵] حسرت نے مصطفےٰ کامل پاشا کی تقریر شائع کرکے انگریزوں کے سامنے گویا اپنا سیاسی نقطۂ نظر پیش کیا۔ حسرت کے ایک ایک جملے سے انگریزوں کے خلاف نفرت ٹپکتی ہے۔ صفحہ ۲۷ میں مصطفےٰ کامل کی زبان سے لکھتے ہیں:

"انگریز ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی برائیوں کو بھلائیاں کر دکھائیں۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ انھوں نے ہمارے جو حقوق چھین لئے ہیں اور ہمارے ملک پر جو غاصبانہ اور جابرانہ قبضہ کر رکھا ہے اور ہم کو اختیارات سے محروم کر دیا ہے اس پر تالیاں بجائیں؟ اگر انگریزوں کے ملک پر کوئی اجنبی قوم اسی طرح بالجبر قابض ہو جاتی تو کیا وہ ایسا ہی کرتے جیسا کہ وہ ہم سے چاہتے ہیں؟"

اس کے بعد اردوئے معلےٰ نمبر ۴ جلد ۱۰ بابت اپریل ۱۹۰۸ء میں صفحہ ۱۴ سے صفحہ ۱۹ تک "ایک مسلمان طالب علم از علی گڑھ" کی جانب سے "مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی" کا مضمون حسرت نے شائع کیا۔ اس میں بھی انگریزوں کی بے لاگ نکتہ چینی کرنا مقصود تھا چنانچہ صفحہ ۱۷ میں لکھتے ہیں کہ:

"مصر میں انگریزوں نے ۱۹۰۸ء تک رہنے کا وعدہ کیا تھا اور انگلستان کی عزت کا حلف اٹھایا تھا۔ مگر آج جاتے ہیں نہ کل بلکہ روز بروز قدم جماتے جاتے ہیں۔ اس پر بھی بس نہیں کرتے بلکہ مصر کی قومی ترقی اور نموئے بلی کو بھی غارت اور تباہ کرنا چاہتے ہیں .... تعلیم کے انتظامی مناصب کا بندوبست انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ غور کا مقام ہے کہ انگریز مصر کی ضروریات کو کیا خاک سمجھ سکتے ہیں اور ملکی زبان سے نابلد اشخاص تعلیمی مسائل کی مقامی دقتوں کو کیوں کر حل کر سکتے ہیں .... انگریز جنھیں برسوں ہندوستان میں جھک مارتے گزر جاتے ہیں اردو تک ٹھیک نہیں بول سکتے۔ ان سے یہ کیونکر توقع کی جائے کہ ان لوگوں کو مصر کا چند روزہ قیام زبان عربی کا ماہر بنا دے گا جس کے نکات اور رموز سوائے اہل زبان کے کوئی شخص چاہے کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو نہیں جان سکتا۔"

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ انگریز حسرت پر طالب علمی کے زمانے

[۳۵] نگار لکھنؤ حسرت نمبر جلد ۲۱ بابت جنوری فروری ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱۸۔

سے ہی علی گڑھ میں نگاہ جمائے ہوئے تھے۔ ان کے قلم و زبان سے ہمیشہ ڈرتے تھے اور ان کے خلاف کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ان دونوں مضامین کی اشاعت سے حسرت نے اپنے آپ کو حب الوطنی کے جوش میں گوناگوں مصیبتوں میں ڈال دیا اور دونوں مضامین سرکار کی نظر میں حسرت کے تختۂ مشق کے لئے باغیانہ ٹھہرے۔ انگریزوں نے برٹش سرکار کیلئے حسرت کو خطرناک گردانا۔ ان کے خلاف کئی انگریز نواز لوگوں نے گواہی دی جن میں نواب وقار الملک بھی شامل تھے۔ چنانچہ ۲۳ر جون ۱۹۰۸ء کو حسرت گرفتار کئے گئے، ان پر فوجداری مقدمہ دائر کیا گیا اور بعلت سڈیشن (بغاوت) داخل حوالات ہونا پڑا۔ ۴ر اگست کو دو سال کے لئے قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ حسرت نے جیل کی سرگذشت "مشاہداتِ زندانِ فرنگ" کے تحت یکم جنوری ۱۹۱۰ء کے اردوئے معلّٰی میں شائع کرنے کا آغاز کیا اور جنوری ۱۹۱۱ء کے شمارے تک مسلسل تیرہ قسطوں میں مکمل کیا۔

حسرت نے "مشاہدات زندان فرنگ" کو علیحدہ کتابی صورت میں بھی شائع کیا تھا۔ اب یہ کتاب گویا عنقا معلوم ہو رہی ہے اور اردوئے معلّٰی کے پرچے بھی ناپید ہیں۔ اتفاق خوش قسمتی سے میرے پیش نظر اردوئے معلّٰی کے متعلقہ شمارے ہیں جن میں "مشاہدات زندان فرنگ" بالاقساط شائع ہوئے تھے۔ حسرت نے قیدخانے کے دردناک حالات کچھ اس طرح بیان کئے ہیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ مولانا حسرت روزانہ ایک من گیہوں چکی میں پیس پیس کر قید فرنگ سے کیوں کر بچ نکلے۔ ہم ذیل میں "مشاہدات زندان فرنگ" کا خلاصہ خود حسرت کی زبان سے ہی بیان کرتے ہیں تاکہ ایک جگہ محفوظ رہ سکے اور یہ کہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر حسرت کی بیش بہا قربانی کا اندازہ بھی ہو سکے۔ خلاصے میں ایک لفظ بھی ہماری طرف سے نہیں لکھا گیا راقم حروف سے مراد حسرت ہے۔

"۲۳ر جون ۱۹۰۸ء کو گرفتاری کے وقت راقم حروف کی شیرخوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی۔ بیوی نے سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعہ دوسرے ہی دن ہمت افزا خط بھیجا کہ "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔" جب تک مقدمہ چلتا رہا بیوی ہر ہفتہ آیا کیں۔ چالیس دن تک مقدمہ کے دوران جیل میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد ۴ر اگست ۱۹۰۸ء سے قید سخت کا آغاز ہوا۔ کچہری سے جیل واپس پہونچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا اور ایک کرتا، ٹوپی پہننے کے لئے ایک ٹکڑا ٹاٹ کا اور ایک کمبل بچھانے اوڑھنے کے واسطے مرحمت ہوا۔ ان چند چیزوں کے سوا اور کوئی چیز رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ جیل کی سخت ترین مشقت "چکی" سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا۔ ۱۳ر اگست علی گڑھ جیل سے الٰہ آباد سنٹرل جیل منتقل کئے گئے۔ وہاں ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا۔ حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی ہے۔"[1]

راقم حروف علی گڑھ جیل سے الٰہ آباد سنٹرل جیل تک ٹرین میں سلاخدار ہتھکڑیاں پہنے ہوئے بھیجا گیا۔ جیب میں ایک پیسہ تک نہ تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں قیدیوں کی خوراک کے لئے ایک آنہ فی روز کے حساب سے جو رقم ملتی ہے وہ بھی نہیں دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے چنوں کے سوا اور کچھ کھانے کو نہ ملا۔ تین بجے سہ پہر کو ٹرین علی گڑھ سے روانہ ہو کر قریب شام ٹونڈلے پہنچی۔ جہاں اتفاق سے انڈین ٹیلی گراف کا

---

[1] اردوئے معلّٰی علی گڑھ بابت جنوری ۱۹۱۰ء صفحہ ۹ تا ۱۰ و اردوئے معلّٰی بابت مارچ ۱۹۱۰ء ص ۸ تا ۹

ایک پرچہ دستیاب ہوگیا۔ دس بارہ روز سے چونکہ کوئی اخبار دیکھنے کو نہ ملا تھا اس لئے اس کا ایک ایک حرف بڑے شوق اور اضطراب کے ساتھ پڑھا۔ اس روز کے بعد پھر آخر مدت تک اور کسی اخبار کی صورت نہ دیکھی۔ اور جیل میں یہی ایک تکلیف سب سے زیادہ محسوس ہوئی۔ زمانۂ حوالات کے آتے ہوتے اخباروں کتابوں اور کپڑوں کی ایک گٹھری بھی ہمراہ تھی۔

ایک روز والد مرحوم علی گڑھ جیل میں ملنے آئے لیکن ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی لیکن کیا کیا جائے۔ ؎

این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

تھوڑی دیر کے بعد جیلر صاحب نازل ہوئے اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں اور کاغذوں ماسوائے دیوان حافظ اپنے سامنے جلوا کر خاکستر کر دیا اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر ہوا۔ دفتر میں مجھ کو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہوگے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیجے جاؤ گے اور وہاں مار کر خاک کر دئیے جاؤ گے۔ حاضری دفتر کی زحمت سے نجات حاصل ہونے پر سفری بیڑیاں کٹوانے اور وزن درج رجسٹر کرانے کی غرض سے قطار میں بیٹھنا پڑا۔

صبح کو آدھ پاؤ چنے بطور ناشتہ دئے جانے کا حکم تھا لیکن ہم کو ڈیڑھ چھٹانک سے زیادہ نہیں ملتے تھے۔ ناشتہ کے بعد ۱۱ بجے کھانے میں جوار، باجرہ، ماش اور گیہوں کے مخلوط آٹے کی کچی روٹیاں ملتی تھیں۔ ان میں گیہوں کی مقدار سے کچھ ہی کم مٹی یا چونا ملا ہوتا تھا۔ جیل کی سخت مشقت سے مٹی تو کیا کنکر پتھر بھی ہضم ہوتے تھے۔ ان کچی روٹیوں کا وزن سات چھٹانک سے کم ہوتا تھا۔ روٹی کے ساتھ کھانے کے لئے دوپہر کو ابلی ہوئی بے دلی ارہر عموماً بے روغن و مرچ ملتی تھی اور شام کو چولائی کا ساگ۔ جس کی ادنیٰ صفت یہ ہے کہ پھینک دئیے جانے پر کوّے بھی اسے نہیں سونگھتے ہیں؎

مجھے الٰہ آباد جیل میں بارک نمبر ۴ میں رکھا گیا تھا۔ یہاں کے تمام قیدیوں اور برقندازوں کو راقم کے متعلق پہلے ہی سے خفیہ احکام پہونچ چکے تھے کہ نئے قیدی سے نہ کوئی ملے نہ بات کرے ذاکر برقنداز بارک نے جو اپنی سختی اور بدزبانی کے لئے تمام جیل میں بدنام تھے۔ مزید احتیاط کی غرض سے راقم کا بستر عین اپنی نشست کے سامنے لگوایا تاکہ ہر وقت کافی نگرانی آسانی کے ساتھ ہو سکے

رمضان المبارک کی آمد آمد سے مسلمان قیدیوں میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی۔ اسلامی اخوت کا جیسا زبردست اثر میں نے اس موقع پر زندان فرنگ میں محسوس کیا اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ ہماری بارک میں جتنے قیدی مسلمان تھے تقریباً ان سب نے روزہ رکھنے اور سحر و افطار کے وقت یکجا ہوکر کھانا کھانے کا انتظام کر لیا تھا جس سے بے سر و سامانی کی حالت میں بھی اسلام کی شان مساوات و اخوت سادگی کے عجیب و غریب عالم میں نمودار ہوتی تھی جس کا اثر ہم سب کے حتیٰ کہ ذاکر کے دل نے بھی قبول کیا۔ چنانچہ ایک روز مجھ سے ملے۔ بلا تقریب مخاطب ہوکر بولے کہ " بھائی صاحب! میری جانب سے سختی کا خوف آپ اپنے دل سے نکال دیجئے۔ مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ میں کچھ نہ کروں گا،

؎ اردوئے معلیٰ بابت اپریل [illegible] صفحات [illegible]

بلکہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو یا جو تکلیف ہو مجھ
سے بلا تکلف کہہ دیجئے گا " جن لوگوں کی مشقت
چکی خانے میں تھی، ان کو رمضان میں سب سے
زیادہ دشواری پیش آئی کیونکہ جلد جلد پانی پینا
چکی پیسنے کے لوازمات میں داخل ہے۔ علاوہ بریں
بے کھائے پیئے ایک من گیہوں پیسنا یوں بھی کچھ
آسان کام نہیں لیکن اکثر مسلمان بہادروں نے
باوجود ان تمام سختیوں کے روزہ ترک نہ کیا۔ رحمتِ
الٰہی نے بھی ہم لوگوں کو فراموش نہیں کیا۔ کیونکہ
لوگ یہ دیکھ کر تعجب کرتے تھے کہ دن میں دس
دس بیس بیس بار پانی پینے والے ایک بار بھی پانی
پیئے بغیر اتنی سخت محنت کس طرح کر لیتے ہیں۔

الغرض ایک ایک دن کر کے ماہِ رمضان
بھی ختم ہونے کو آیا اور آخری جمعہ کو ضلع بجنور کے
ایک قیدی میر مظفر حسین صاحب فوق برقنداز کی
تحریک پر نماز ادا کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ راقم
حروف نے زبانی خطبہ اور اسی وقت کے لکھے
ہوئے چند الوداعی اشعار پڑھ کر نماز پڑھائی ؎

الوداع اے ماہِ رمضاں الوداع
الوداع اے مونس جاں الوداع

عین راحت تجھ سے تھی تکلیف قید
اے انیس اہل زنداں الوداع

عید کے روز تھوڑی دیر کے لئے تمام مسلمان قیدیوں کو
اجازت ملتی تھی کہ وہ جیل اسپتال میں جمع ہو کر نماز
پڑھ لیں۔ چنانچہ اس روز بھی پرانی تکلیف[۵۱]، نئی تکلیف[۵۲]
اور نئے احاطے[۴۸] سے سب لوگ آئے تھے۔ لیکن ہمارے
احاطے کے وارڈر نے اپنی معمولی سختی سے کام لے کر
ہم لوگوں کو احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہ دی
مجبوراً ہم ۶۰ ـــ ۷۰ لوگوں کو علیحدہ نماز پڑھنا پڑی۔
میں نے نماز کے بعد وعظ بھی کہا جس میں تمام فرائضِ
اسلام اور فریضہ صوم کی خوبیاں بیان کی گئیں[۴۹]

مختصر یہ کہ رمضان شریف کا پورا مہینہ مجھ کو چکی
ہی پیسنے میں گذرا۔ مجھے تقریباً سال بھر ایک من
آٹا پیسنے کی اس سخت مشقت سے سابقہ رہا جو عام
طور پر دیگر قیدیوں سے بھی ایک ماہ سے زیادہ نہیں
لی جاتی ہے۔ الٰہ آباد سنٹرل جیل میں چکی کی مشقت
سب سے زیادہ سخت ہے کیونکہ وہاں رام بانس
یا ہاتھی چنگار کوٹنے کی مشقت موجود ہی نہیں ہے۔
جو چکی سے بدتر سمجھی جاتی ہے اور جس کی نسبت ہر
جیل میں یہ شعر قیدیوں کی زباں زد ہے ؎

جیل خانے کا برا رویہ کسی کا یار نہیں
رام بانس کی کڑی مشقت سے تو انکار نہیں

ایک دن وارڈ کے کہنے پر میرے جوڑیدار نے چکی
پیسنے میں ڈھیل سے کام لیا اور اس موقع پر صرف
میری پیشی[۵۰] ہوئی یعنی مجھ سے کہا گیا کہ دس سیر غلہ
پیسنے سے رہ گیا ہے۔ اس ناکردہ جرم کے عوض
مجھے دو دن کے لئے رات کو ہتھکڑیاں ڈالنے کی
سزا تجویز ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ سے
سب حال کہہ دوں لیکن برقنداز کو پیٹی اتار کر

---

۵۱ جیل کی اصطلاح میں پرانی تکلیف اسے کہتے ہیں جس میں عارضی طور پر نئے آئے ہوئے قیدی یا جنگ جو و شورہ پشت لوگوں کے علاوہ قید تنہائی بسر کرنے کے لئے ہر ہفتہ کچھ قیدی آتے جاتے رہتے ہیں۔

۵۲ نئی تکلیف اسے کہتے ہیں جس میں زیادہ تر کمسن اور نوجوان قیدی رکھے جاتے ہیں جو گورنمنٹ پریس برانچ میں کام کرتے ہیں۔

۴۸ نیا احاطہ۔ جس میں زیادہ تر دو تین یا زیادہ مرتبہ کے سزا یافتہ قیدی رکھے جاتے ہیں
پرانا احاطہ۔ اس میں زیادہ تر یکبارہ قیدی رہتے ہیں۔

۴۹ اردوئے معلیٰ بابت جون ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۹ (قسط ۲)

۵۰ جب کسی قیدی سے جیل میں کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو اس کیلئے مزید سزا تجویز کی جاتی ہے۔ اسے جیل کی اصطلاح میں پیشی کہتے ہیں۔

زد و کوب پر آمادہ پاکر میں نے خاموشی اختیار کی اور معاملے کو خدا کے سپرد کیا۔" [1]

"صبح سے شام تک چکی پیسنا بجائے خود ایک مشکل کام تھا لیکن راقم حروف کے لئے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لے کر آخر تک کوئی کتاب یا رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ شب و روز میں جس کا تقریباً کل وقت شغل نوشت و خواند میں گزرتا ہو اسے دفعتاً ان تمام دلچسپیوں سے یک قلم عرصۂ دراز کے لئے علحدہ کر دینا کتنے بڑے جبر کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو تاکید کر دی تھی کہ کاغذ، پنسل کتاب یا اخبار تک اس شخص کی کسی طرح دسترس نہ ہو سکے۔ اس خاص سختی کے سبب چکی پیسنے کے دوران میں جتنے شعر خیال میں آتے تھے انھیں کئی کئی دن تک بکوشش تمام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔

جیل میں ہر دوسرے یا تیسرے مہینے چکی پیسنے والوں کا معائنہ خاص اسی غرض سے ہوا کرتا ہے کہ جو قیدی وزن میں کم ہو گئے ہوں یا جن کو چکی پیستے کئی مہینے گزر چکے ہوں وہ کسی دوسرے آسان کام پر بھیج دیئے جائیں۔ راقم حروف کے زمانے میں بھی چار بار ایسے معائنے ہوئے جن میں تقریباً تمام پرانے ساتھیوں کی مشقتیں تبدیل کر دی گئیں لیکن یہ کمترین جہاں تھا وہیں رہا۔ ایک بار جیلر نے خاص کر میرے لئے تبدیلیٔ مشقت کی سفارش بھی کی کہ اس پر سپرنٹنڈنٹ کو میرے وزن کے غیر معمولی کمی [1] سے بھی آگاہ کیا لیکن سپرنٹنڈنٹ کی قساوت قلب نے اس کی جانب بھی کچھ توجہ نہ کی اور میرے ٹکٹ کو واپس کر دیا۔ قیدیوں کو بلا وجہ جیل میں اتنا مارا پیٹا جاتا تھا کہ ان کے جسم زخمی ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس کی شکایت کرتا تو اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈلوائی جاتی تھیں۔" [2]

اتفاقی طور پر پیٹ میں درد پیدا ہو جائے یا بخار آجانے کا عذر کرکے اگر کوئی شخص کام کرنے سے عذر کرتا تو شفاخانے بھیجے جانے کے بجائے یقیناً اسے اول تو وارڈ اور بعد ازاں نائب جیلر کے ڈنڈوں کی سخت مار برداشت کرنا پڑتی تھی۔ قید خانے میں انگریز سے انگریزی میں گفتگو کرنا گستاخی پر محمول کیا جاتا تھا۔ ایک دن میں نے کوشش کی تھی کہ ایک ہندوستانی وارڈ اسی کے اشارے سے مجھ پر حملہ آور ہوا ناچار خاموشی اختیار کی۔ جس دن انسپکٹر جنرل جنڈیل صاحب معائنے کے لئے جیل میں آتے تھے تو اس دن قیدیوں پر مصیبت آجاتی تھی اور تمام قیدی اس سے بلائے ناگہانی کی طرح لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ بابو گنگا پرشاد صاحب ورمانے صوبجات متحدہ کی کونسل میں اردوئے معلے کے "مشاہدات زنداں" کے بارے میں سوال اٹھایا تھا کہ قیدیوں کے ساتھ سختی کی جاتی تھی۔ انسپکٹر جنرل نے کہا کہ ان مضامین کی کوئی وقعت نہیں ہے اور نہ ان کے متعلق کوئی تحقیقات کی گئی اور نہ آئندہ کی جائے گی۔ اگر کوئی قیدی جیل میں مر جاتا تو اس کی موت مکھی کی موت کے برابر ہوتی۔" [3]

---

[1] اردوئے معلے بابت جولائی ۱۹۱۰ء قسط ۵ صفحہ ۱۲-۱۴

[1] داخلۂ جیل سے قبل راقم حروف کا وزن ۱۳۲ پونڈ تھا لیکن اُس وقت صرف ۱۰۸ پونڈ باقی رہ گیا تھا۔ [2] اردوئے معلےٰ نمبر ۸ جلد ۱۱ بابت اگست ۱۹۱۱ء

[3] اردوئے معلےٰ نمبر ۹ جلد ۱۱ بابت ستمبر ۱۹۱۱ء صفحہ

• ۲۳ر جون ۱۹۰۸ء کو اردوئے معلیٰ پر مقدمہ بغاوت قائم ہوا۔ مجسٹریٹ علی گڑھ نے میرے مقدمے میں سزا دہی کے سارے اختیار ختم کر دیئے تھے۔ یعنی دو سال قید سخت اور پانچ سو روپے جرمانہ۔ زیادہ کا اگر انھیں اختیار ہوتا تو شاید اس سے بھی دریغ نہ کرتے ہائی کورٹ سے قید کی میعاد گھٹ کر دو سال سے ایک ہی سال رہ گئی لیکن جرمانہ بدستور قائم رہا جس کے عوض چھ مہینے کی قید سخت کو ملا کر گویا فی الجملہ ڈیڑھ برس کی سزا باقی رہی۔ حکام جیل مطمئن تھے کہ کم از کم ڈیڑھ برس تک تو یہ شخص ہمارے قابو میں ہے جتنی سختی اس کے ساتھ چاہیں کرلیں۔ چنانچہ ابتدائے قید سے لے کر دس ماہ تک برابر چکی پسوانا غالباً اسی اطمینان کی بنا پر تھا۔ اگر میعاد قائم رہتی تو ڈیڑھ سال برابر مجھ کو چکی پیسنا پڑتی لیکن دوران قید میں والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے بھائی صاحب کو مجبوراً کسی نہ کسی صورت سے زر جرمانہ ادا کرنا پڑا کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جو قلیل جائداد ورثاً مجھ کو پہونچی تھی وہ بھی مجسٹریٹ علی گڑھ کے حکم سے نیلام کر دی جاتی اور سرکاری نیلام جس بے دردی اور بے پروائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کا نمونہ اسی مقدمہ میں لوگوں کے پیش نظر ہو چکا تھا کہ زر جرمانہ کے عوض میں اردوئے معلیٰ کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت تین چار ہزار روپیوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ صرف ساٹھ روپے میں برباد کر دیا گیا۔ علی گڑھ میں ہر شخص آگاہ تھا اور اس لئے غالباً مجسٹریٹ علی گڑھ بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ ایڈیٹر اردوئے معلیٰ ایک فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ایسی حالت میں اس پر پانچ سو روپیہ جرمانہ کرنا اصولِ انصاف و انسانیت کے کہاں تک موافق یا مخالف ہے۔ اس کا فیصلہ ہم ناظرین کے ذمے چھوڑتے ہیں۔ اس جرمانے کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلیٰ کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہونچایا تھا جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے، دواوینِ شعرا، وغیرہ کے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلوں میں بھر بھر کے اس طرح سے لے گئے جیسے کہ لوگ لکڑی یا بھس لے جاتے ہیں ان کتابوں کی فہرست بنانا تو درکنار کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری اس کا ذکر کرتے ہمارا دل دکھتا ہے"[۱۴]

حسرت دوسری مرتبہ ۱۹۱۶ء میں بغاوت کے جرم میں قید کئے گئے پہلے نینی جیل اور اس کے بعد پرتاب گڑھ اور پھر الہ آباد میں پہونچا دیئے گئے[۱۵] اسی اخبار نے اپنی ایک اشاعت میں "بیگم حسرت کی مساعی" کے تحت لکھا ہے کہ:

"مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی کو مصیبت سے نجات دلانے کی غرض سے جو مردانہ سعی و جہد ان کی باہمت اہلیہ کی طرف سے ظہور میں آرہی ہیں وہ ہزار گونہ تحسین و آفرین کی مستحق ہیں۔ بیگم صاحبہ موصوفہ تحریر فرماتی ہیں کہ "میں آخر اکتوبر میں میموریل ہز آنر کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے آگرہ گئی مگر ان کا پروگرام بدل گیا۔ واپس آئی اب دوبارہ ۸ر نومبر کو پھر جاکر آنریبل سید آل نبی صاحب کے ذریعہ سے میموریل لفٹنٹ گورنر کو روانہ کر دیا۔

---

۱۴ اردوئے معلیٰ نمبر ۱۰ جلد ۸ بابت اکتوبر ۱۹۱۱ء قسط ۲ ص ۹ تا ۱۲

۱۵ اخبار شیعہ کالج نیوز لکھنؤ مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۶ء ص ۱۱ (دسمبر ۱۹۱۸ء میں رہا ہوگئے تھے۔ ا۔ ح)

اور جیلر وغیرہ نے خلاف قاعدہ کچھ سختیاں حسرت پر
کی تھیں جس بنا پر حسرت نے ، محرم سے برابر روزے
رکھے ۔ برائے نام دودھ پی لیا تاکہ روزہ صحیح ہے
اس کی تفصیل بھی میں نے لکھوائی تھی پھر وہاں سے
واپس علی گڑھ ہو کر اسی روز الہ آباد روانہ ہو گئی ۔
حسرت نے عہد کیا تھا کہ میں تا وقتیکہ فیصلہ صحیح
میرے موافق نہ ہوگا کھانا نہ کھاؤں گا ۔ آخر وہاں
جاکر حسرت سے ملی ۔ بہت کمزور پایا ۔ ۲۰ پونڈ وزن
گھٹ گیا ۔ خیر میں نے ایک عرضی مفصل لکھی اور
چونکہ کونسل کے چار ممبر وہاں موجود تھے ان سب کی
رائے لی کہ مجھے جلسے میں عرضی پیش کردوں گی ۔
ان لوگوں کے رضامند کرنے میں مجھے سخت جدوجہد
کرنا پڑی اور انتہائی مجبوری کے بعد آنریبل رضا
علی اور آنریبل نواب عبدالمجید وغیرہم اس پر
آمادہ ہوئے کہ ہم لوگ پیش کریں گے ۔ آپ بھی
چلئے ۔ موقعہ ہوگا مل لیجئے ۔ بہرحال آخر وقت تک
ان لوگوں کو پیش کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی ۔ مگر
میں کمرۂ کونسل کے باہر گاڑی میں موجود تھی اور برابر
تحریر کے ذریعہ ان کو مجبور کرتی رہی ۔ خیر پیش کیا
امید ہے کوئی نتیجہ نکلے ۔ میموریل بھی ان کو مل گیا
ہے ۔ زیر غور ہے ۔ آج ہی واپس الہ آباد سے
آئی ہوں ۔ جیلر وغیرہ اب سب ٹھیک ہو گئے کھانا
حسرت کو اچھا ملتا ہے ۔ "۱۱۵

آخر کار ۱۹۱۶ء کے آخر میں رہائی کے بعد حسرت
نے علی گڑھ کے رسل گنج میں ایک چھوٹی سی
دوکان میں ایک سودیشی اسٹور کھول دیا جس میں
اپنی بساط کے اعتبار سے موٹا اور سوتی کپڑا وغیرہ
رکھ لیا تھا اور اسی پر بیوی گزارہ کرنے لگی تھی ۔

۱۱۵ اخبار شیعہ نیوز کالج لکھنؤ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۱۶ء ص ۹ ملوکہ شیعہ کالج لکھنؤ ۔

یہاں کام نہ چلا تو کانپور جاکر رہ پڑے اور وہیں
دوکان کھول لی ۔

شرر لکھنوی بیگم حسرت کو حسرت کے ساتھ مصیبتیں اٹھانے کیلئے
یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں :

" شہید وطن سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی کی
بیگم صاحبہ جس مردانہ اولوالعزمی سے شوہر کی وفاداری
کے ساتھ ملک کی قومی و ادبی خدمتیں انجام دے
رہی ہیں نہایت ہی قابل داد ہے ۔ اسلام کی پچھلی
صدیوں میں ایک ایسی بیوی بھی نہ نظر آئے گی
جس نے اس دلیری و ہمت سے قسمت کی بے رخیوں
کو برداشت اور جفا شعار زمانہ کا مقابلہ کیا ہو ۔
بیگم صاحبہ ممدوحہ کے اس جوانمردانہ استقلال کی
داد دینا ہر ہندی مسلمان اور ہر ہندی نژاد کا
فرض عین ہے ۔ اور سچی داد یہ ہے کہ ان کی اشاعتوں
کی مربی گری اور ان کی اعلیٰ کتابوں کی نہایت
فیاضی کے ساتھ خریداری کی جائے "۱۱۶

پنڈت کشن پرشاد کول حسرت کے دوستوں میں تھے ۔ ان کا کہنا ہے
کہ حسرت جیل میں تھے اور ان کی بیوی مالی مشکلات کے باعث
پریشان تھیں ۔ میں علی گڑھ گیا اور بیگم حسرت سے ملنے کی خواہش ظاہر
کی جس مکان میں وہ رہتی تھیں کچا پکا چھوٹا سا مکان تھا ۔ بیگم
حسرت نے مجھے ایک کمرے میں جہاں پرانی دری بچھی تھی بٹھا دیا ۔
میں نے کہا کہ اگر منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا انتظام کیا جائے
وہ خوددار تھیں اور میری بات سے متفق نہ ہوئیں ۔ البتہ کہا کہ حسرت
کی کچھ کتابیں بکوائیں تو بہتر ہے ۱۱۷

دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا
اجلاس میں شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی بھی موجود تھے ۔
وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ :

۱۱۶ دلگداز ۔ لکھنؤ نمبر ، جلد ۱۹ بابت جولائی ۱۹۱۶ء ص ۱۵۳

۱۱۷ نگار لکھنؤ ، حسرت نمبر ص ۵۴ جنوری ، فروری ۱۹۵۲ء

"میں نے پنڈال میں دیکھا کہ مولانا حسرت اور مہاتما گاندھی کے درمیان رسہ کشی ہو رہی ہے۔ ایک طرف گاندھی جی اور ان کے دیگر رفقاء اس بات پر مصر تھے کہ سردست برٹش تاج کے زیر سایہ آزادی کی طلب کی جائے اور دوسری طرف مولانا حسرت موہانی تھے جو کامل آزادی کا ریزولیوشن پاس کرانا چاہتے تھے۔ حسرت کو سب نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے اور سیدھے اسٹیج کی طرف روانہ ہو گئے اپنا آزادی کامل کا ریزولیوشن لیکر۔ — اسٹیج اونچا تھا اور حسرت پستہ قامت آدمی تھے۔ میں نے سہارا دے کر ان کو اسٹیج پر چڑھایا اور جب انھوں نے آزادی کامل کا ریزولیوشن پیش کیا تو پنڈال میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔" ۵۹

اس واقعہ کی تائید سید سلیمان ندوی صاحب سے بھی ہوتی ہے۔ مرحوم لکھتے ہیں کہ:-

"جب حسرت نے اجلاس میں مکمل آزادی کی تجویز پیش کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی غیبی گولا آکر پڑا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی وغیرہ بھی گھبرائے اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی خود مختاری کا پہلا اعلان حسرت موہانی کی زبان سے ہوا" ۶۰

سید صاحب مرحوم یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب کانگریس کا اجلاس ختم ہوا تو بڑے بڑے لیڈر فرسٹ کلاس ٹرین میں سوار ہوئے اور میں نے دیکھا کہ حسرت اپنی بیوی کے ساتھ تھرڈ کلاس میں ایک بڑے ہجوم کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ مٹی کا لوٹا ساتھ تھا۔ کھانا بھی مٹی کے برتنوں میں تھا۔ حسرت نے ۱۹۰۴ء میں اپنے کو کانگریس سے وابستہ کیا اور بمبئی سیشن میں فریق گرم کے ساتھ کانگریس کے اجلاس میں بطور ڈیلی گیٹ شریک ہوئے لیکن ۱۹۰۷ء میں جب کانگریس کے سورت کے سیشن میں فریق نرم حاوی ہونے لگا تو آپ نے تلک کے ساتھ کانگریس سے استعفیٰ دیا۔ پھر کوئی دس برس کے بعد کانگریس میں شریک ہوئے اور پہلے سے زیادہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ بالآخر ۱۹۲۱ء میں کانگریس چھوڑ دیا۔

۱۹۲۲ء میں حسرت پھر بغاوت کے جرم میں سابرمتی احمدآباد کے جیل میں قید کر لئے گئے۔ انھی ایام میں مئی ۱۹۲۲ء میں بیگم حسرت نے "انتخاب حسرت" مرکنٹائل پریس کانپور سے شائع کیا۔ انتخاب پر حسرت نے سابرمتی جیل میں نظر ثانی کی تھی۔ بیگم حسرت دیباچہ انتخاب میں لکھتی ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ مولانا کی گرفتاری کی وجہ سے یہ کتاب بیش قیمت اضافات' اصلاحات سے محروم ہو گئی لیکن پھر بھی انھوں نے سابرمتی جیل میں غیر معمولی انہماک سے کام لے کر اس پر ایک حد تک نظر ثانی کر لی۔

در اصل حسرت نے ۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ احمد آباد کا خطبۂ صدارت پیش کیا جس پر ۱۱ اپریل ۱۹۲۲ء کو دفعہ ۱۲۴ الف اور ۱۳۱ کے ماتحت گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ پنجاب کے مشہور اردو رسالہ "صوفی" پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات کے ایڈیٹر ملک محمد الدین نے اپریل ۱۹۲۲ء کے پرچے میں صفحہ ۵ میں "زندان احمد آباد میں ایک زبان حقیقت بیان" کے تحت حسرت کی ایک غزل پانچ اشعار میں درج کی ہے۔ یہاں دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

مرا ایماں عجب کیا ہے جو ایمان تصوف ہے
تصوف جان مذہب عاشقی جان تصوف ہے

گناہ اپنا نہیں ثابت خطا کے پھر بھی ہیں قائل
ادب کا ہے یہی شیوہ یہی جان تصوف ہے

"صوفی" کے اسی شمارے کے صفحہ ۲۰ میں "نوائے حسرت" کے تحت یہ عبارت بھی درج ہے:-

(سابرمتی جیل سے مولانا سید حسرت موہانی کا تازہ ترین کلام)

اس میں ۹ شعر ہیں۔ مطلع یہ ہے ؎

ناہرادل کہ شاد کام کرو   کرم اپنا کبھی تو عام کرو

۵۹ یادوں کی برات ص ۲۹۸ ۱۹۷۰ء ایڈیشن

۶۰ نگار۔ حسرت نمبر ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۲

اردو کا ایک رسالہ "تمدن" دہلی محمد عباس حسین قاری کی ادارت میں نکلتا ہے۔ ستمبر[۲۰] ۱۹۲۴ء کے شمارے میں صفحہ ۱۱ میں عبارت ذیل درج ہے !۔

"مولانا حسرت موہانی رہا ہو گئے"۔

"اسے سب تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا حسرت سے زیادہ اپنے خیال کے لئے کسی نے مصائب برداشت نہیں کئے۔ لیڈروں میں ان سے زیادہ کسی کی زندگی عبرت انگیز نہیں۔ اس بے لوث سچے اور کوہ وقار لیڈر کے حالات زندگی اور حالاتِ اسیری پڑھنا چاہتے ہو تو ذیل کی دو کتابیں دیکھو "حالات حسرت" "مشاہدات زندانِ فرنگ"۔

حسرت نے سودیشی تحریک کا علم بھی بڑے جوش و خروش سے اٹھایا تھا۔ کانپور میں خود بھی ایک سودیشی اسٹور قائم کیا تھا اور دوسرے مقامات پر متعدد سودیشی دکانیں قائم کرائیں انھوں نے آخر عمر تک کوئی ولایتی چیز استعمال نہیں کی۔ یہاں تک کہ اردوئے معلی کے لئے ولایتی کاغذ ترک کر کے دیسی کاغذ استعمال کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت مسلم لیگ کے حامی تھے اور لیگ کے ہی ٹکٹ پر پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ لیکن ان کے انداز درویشانہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ ممبروں کی آرام دہ کشادہ اور پر فضا قیام گاہ نہ ٹیلیفون نہ موٹر نہ تفریح نہ دعوت نہ دید و باز دید۔ ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے تھے ممبر پارلیمنٹ کے دوران دہلی میں ایک غیر معروف شکستہ مسجد میں چٹائی پر قیام رہتا تھا۔ فرش پر آس پاس اخبارات، کاغذات اور فائلیں۔ وقت آیا تو دوکان پر آکر کھانا کھا لیا۔ کاغذات جھولے میں ڈالے پارلیمنٹ پہنچ گئے۔ راستہ اکثر پیدل ہی طے کرتے اور موقع جان پڑتا تو پارلیمنٹ میں ایسی دو ٹوک اور بے لاگ تقریر کرتے کہ در و بام گونج اٹھتے[۲۱]۔ رشید احمد صدیقی صاحب ان کی حق گوئی کے بارے میں

مزید کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اردو پی ایچ ڈی کا زبانی امتحان لینے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ سفر خرچ کا بل فارم دستخط کے لئے پیش کیا گیا تو بولے یہ فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسا۔ میں تو تھرڈ کلاس میں سفر کیا کرتا ہوں۔ دراصل میں دہلی جا رہا تھا۔ پروگرام ایسا رکھا تھا کہ یہاں اتر پڑوں اور امتحان لے کر آگے بڑھ جاؤں پھر یہ کرایہ کیسا۔ ٹھہرنے کا الاؤنس کیوں۔ طعام و قیام تو آپ کے ہاں رہا۔

مولانا سید سلیمان ندوی حسرت کی حق گوئی کے بارے میں کہتے ہیں کہ !۔

"حسرت کے واقعات پر نظر کر کے ان کی شان حضرت ابوذر (غفاری) کی نظر آتی ہے جن کی نسبت رسولؐ اللہ نے فرمایا "ابوذر سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی"۔ سچ یہ ہے کہ اس عہد پُر فریب میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہ چمکی۔ اسی طرح حضرت ابوذر کے بعد یہ قول نبوی بھی ان پر صادق آتا ہے کہ ابوذر کی حق گوئی نے اس کو زندگی میں تنہا چھوڑ دیا اس کا کوئی ساتھی نہ رہا اور اس لئے اس مقدس فقرہ کا مورد بھی حسرت کی ذات تھی۔ حسرت! تو تنہا آیا تھا۔ تنہا رہا، تنہا گیا۔ البتہ تیری نیکی شرافت، تیرا اخلاص اور حسن عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہیں اور وہی تیرے رفیق آخرت ہیں"[۲۲]۔

حسرت جب ۱۹۰۸ء میں قید فرنگ میں ڈال دئے گئے تو انھوں نے چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی تھی۔ جیل میں ہی کہتے ہیں ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اگر جیل میں ان کے پاس کوئی کاغذ یا قلم ہوتا تو ایک دیوان مرتب کیا ہوتا۔ ان کی جیل میں بار بار برہنہ تلاشی لی جاتی تھی کہ آیا ان کے

۲۱؎ ماہنامہ "آجکل" دہلی بابت اکتوبر ۱۹۵۱ء مضمون نگار۔ رشید احمد صدیقی

۲۲؎ نگار لکھنؤ۔ حسرت نمبر ص۱۱۱ بابت جنوری و فروری ۱۹۵۲ء

۲۰؎ حسرت ۱۳ اگست ۱۹۴۲ء [illegible]

پاس کوئی کاغذ کا پرزہ یا پنسل وغیرہ تو نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز نائب جیلر نے سارے چکی خانے کے قیدیوں کی تلاشی لی تو اتفاق سے ایک غزل کا مسودہ جس کو میں نے ٹوپی میں چھپایا تھا اس کے لئے پریشان ہوا کہ اب کیا کروں۔ بہاری قیدی نے مجھ سے فوراً پوچھا کہ اگر کوئی کاغذ کا پرزہ ہے تو مجھ کو دیدیجئے میں اسے چھپالوں گا۔ وہ پرزہ بہاری نے لے کر نہ معلوم کہاں غائب کیا کہ برہنہ تلاشی لئے جانے کے بعد پھر کہیں سے نکال کر مجھ کو واپس کر دیا[23]

الٰہ آباد سنٹرل جیل میں حسرت نے جو غزلیں ۱۹۰۹ء تک رہائی کے وقت لکھی تھیں۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"یہ کل غزلیں دن بھر چکی پیسنے کے اثنا میں کہی جاتی تھیں اور بوقت شام ایک قیدی دوست (میر مظفر صاحب فوق) کو لکھوا دی جاتی تھیں جو بحیثیت برقنداز نسبتاً زیادہ آزاد تھے اور مخصوص طور پر زیر نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے کاغذ پنسل بھی اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔ راقم کی رہائی کے بعد وہ دوست بھی رہا ہوئے اور ان چند غزلوں کے سوا جو کسی طرح ضائع ہو گئیں تھیں۔ لیکن میر مظفر حسین صاحب متوطن ضلع بجنور کے همراه سے (جو خود بھی الٰہ آباد جیل میں قید تھے اور اب رہا ہو گئے ہیں) کل ردیفوں میں غزلیں تیار کی گئیں اور اس طرح ایک مختصر دیوان مرتب ہو گیا۔ اردوئے معلے کے پرچوں میں غزلوں کی ابتدا سے پہلے یہ عبارت درج ہوتی تھی۔

"غزلیات حسرت موہانی نوشتہ زندان فرنگ"

ذیل میں ان غزلوں کے مطلع درج کئے جاتے ہیں۔ تعداد شعر

(۱) ردیف ا۔ لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزو سپاس کا — ۶

[23] اردوئے معلیٰ بابت دسمبر ۱۹۱۰ء ۱۳ تا ۱۵
[24] اردوئے معلیٰ بابت اکتوبر ۱۹۱۰ء صفحہ ۲۲

(۲) رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا — ۵ شعر
(۳) تجھ سے وہ بڑا شوق سے اور تونے نہ جاتا[25] — ۶
(۴) مطلع کرم خوردہ ہے۔ ذیل میں دوسرے شعر کا دوسرا مصرع
قصد اک مدت سے ہم رکھتے ہیں گورکھپور کا — ۸
(۵) دل کو خیال یار نے مخمور کر دیا — ۷
(۶) ہم نے کس دن ترے کوچے میں گذارا نہ کیا — ۷
(۷) آزادیٔ ہند کی خواہش کو مقبول خواص و عام کیا[26] — ۵
(پولیٹکل نامکمل)
(۸) (ردیف ب) صحبت اہل عشق و شغل شراب — ۱۰
(۹) (ردیف ت) جانفزا تھی کس قدر یارب ہوائے کوئے دوست — ۷
(۱۰) آج سن کر میرے نالوں کو ز راہ التفات — ۹
(۱۱) (ردیف ج) لیگ یہ لایا ہجوم ساغر و پیمانہ آج[27] — ۱۳
(۱۲) (ردیف ح) اے غم عشق اے متاع فلاح — ۷
(۱۳) (ردیف خ) خون بے جرمی سے اپنی دیکھکر تلوار سرخ — ۵
(۱۴) (ردیف د) دشوار ہے اے ملامت لے پند — ۷
(۱۵) (ردیف ذ) کچھ درد دل سے بڑھکے ہے درد جگر لذیذ — ۵
(۱۶) (ردیف ر) صبر مشکل ہے ضبط ہے دشوار — ۸
(۱۷) —— اب تو اٹھ سکتا نہیں آنکھوں سے بار انتظار[28] — ۱۱
(۱۸) (ردیف ز) چلتا ہے روز دورے ارغواں ہنوز — ۱
(۱۹) (ردیف س) ہے مضطرب ہنگامۂ فصل بہار اب کی برس — ۸
(۲۰) (ردیف ش) پیمان وفا کر فراموش — ۵
(۲۱) —— سب ہیں تیری انجمن میں بے ہوش — ۵
(۲۲) (ردیف ص) یورپ میں جیسے پھیل گئی ہے وبائے حرص — ۲
(۲۳) (ردیف ض) جان وفا شعار کو شکوۂ غم سے کیا غرض — ۲
(۲۴) (ردیف ط) دل ہے غرق شادمانی جان سیراب نشاط — ۱۲
(۲۵) (ردیف ظ) کچھ ہم کو عجب گریۂ مستی میں ملاحظہ[29] — ۷

[25] اردوئے معلیٰ نومبر ۱۹۰۹ء ص ۲ [26] اردوئے معلیٰ دسمبر ۱۹۰۹ء ص ۱۹
[27] اردوئے معلیٰ جنوری ۱۹۱۰ء ص ۱۹ [28] اردوئے معلیٰ فروری ۱۹۱۰ء
[29] اردوئے معلیٰ بابت مارچ ۱۹۱۰ء ص ۱۸۔

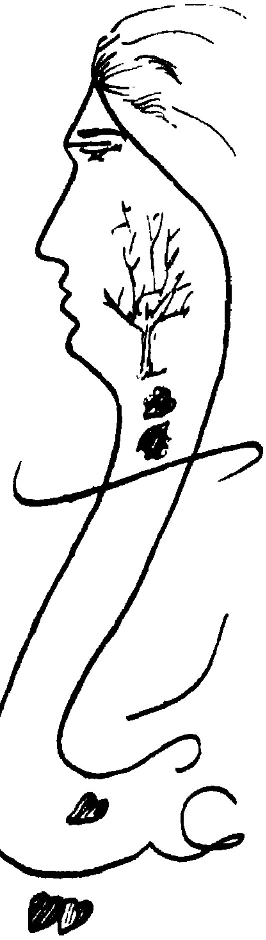
(بقیہ ص ۲۹ پر)

بی۔اے بہادر
محشر بریلوی
۴۶۶ بی۔ ریلوے اسٹیڈیم کالونی گورکھپور

دیوارِ تعصب کی گرا دو یارو
یہ نقش کدورت کا مٹا دو یارو
جو گرم ہواؤں نے لگا رکھی ہے
اس آگ کو مل جل کے بجھا دو یارو

توقیر زمانے کی گھٹانے والو
معیار زمانے کا گرانے والو
سمجھے گا کسی روز زمانہ تم سے
یہ خوب سمجھ لینا زمانے والو

بہہ جائے جو آنکھوں سے وہ کاجل کیا ہے
ٹھکرا دے جسے پاؤں وہ پائل کیا ہے
اس دور کی تہذیب سے پوچھو یہ سوال
سینے سے ڈھلک جائے وہ آنچل کیا ہے



پیری میں جوانی کی کسک باقی ہے
بیتے ہوئے لمحوں کی جھلک باقی ہے
ہے سارا بدن ضعف کا مارا لیکن
سوکھی ہوئی شاخوں میں لچک باقی ہے

سانچے میں ترے پیار کے ڈھل جاتا ہوں
بندش سے ہر اک غم کی نکل جاتا ہوں
دیتا ہے کوئی مجھ کو سہارا ہر آن
گرتا ہوں پھر اٹھتا ہوں سنبھل جاتا ہوں

شبنم کی ہر اک بوند کو شعلہ سمجھا
گلشن کے ہر اک پھول کو کانٹا سمجھا
اس سے بھی بڑی اچھی نبھائی ہم نے
جس نے نہ کبھی اچھوں کو اچھا سمجھا

جب رات فضاؤں میں سیاہی گھولے
جب بادِ صبا بندِ قبا کے کھولے
اس وقت تخیل کے شبستانوں میں
پائل کبھی چھنکے کبھی کنگن بولے

صغیر احسنی
۷۰، پیرزادگان مظفرنگر

عِلمِ لغات اور بذلہ گوئی

کہا جاتا ہے کہ جس طرح کوئی خطۂ زمین روئیدگی کے بغیر نہیں رہتا، اسی طرح کوئی زبان بغیر نظم (شعر و شاعری) نہیں رہ سکتی۔ دراصل شاعری یا نظم گوئی کا جذبۂ لطیف ایک فطری شے ہے جو خالق کائنات ہر خطۂ ارض کے ذی شعور اور حساس انسانوں کی طبیعتوں میں کم و بیش ودیعت فرماتا ہے چنانچہ جب کسی حساس انسان کے دل و دماغ شدتِ رنج و غم یا عیش و مسرت سے متاثر ہوتے ہیں تو بسا اوقات غیر ارادی طور پر وہ اپنے جذبات کا اظہار حسب استعداد کسی شاعر کے شعر سے یا خود اپنے ایسے الفاظ میں کرتا ہے جن سے شاعرانہ تخیلات کی عکاسی ہوتی ہے۔

فنونِ لطیفہ میں شعر و شاعری ایک اہم ترین درجہ و حیثیت رکھتی ہے شعرار۔ ادبار۔ اور حکمار کے کلام میں اسی وجہ سے بذلہ سنجی، خوش طبعی اور ظرافت کی دلچسپ و لذیذ چاشنی ملتی ہے۔ یہ بھی مسلّمہ حقیقت ہے کہ زبان کا خزانہ شعرار، ادبا، علمار، اور حکمار کی ذہنی اختراع سے ہی وسعت پذیر ہوتا ہے اس لیے اس میں مزاح کی آمیزش ناممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم بعض الفاظ کی ساخت و پرداخت میں خصوصاً بعض اشیار کے ناموں میں بذلہ سنجی اور ظرافت کا پہلو پاتے ہیں یعنی ان کی وجہ تسمیہ کی بنیاد لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی پر ہے مثلاً ہم ایسے متعدد الفاظ کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

(۱) "سپستاں" ایک پھل کا نام ہے جس کو ہندی میں لھسوڑا کہتے ہیں۔ یہ لفظ اصل میں "پستانِ سگ" تھا جو صنعت مقلوب سے "سگ پستاں" ہوا۔ کثرتِ استعمال سے صرف "سپستاں" رہ گیا۔ خشک لھسوڑے کی شکل سگ (کُتیا) کے پستانوں سے قطعی مشابہ ہوتی ہے۔ اسی لیے اطبائے خوش مزاج نے اس چیز کو دیکھ کر یہ لفظ تراشا۔

(۲) "گاؤزباں" یا "لسان الثور"۔ یہ ایک بوٹی کے پتے ہیں جن کو ہر اردو داں "گاؤزباں" کے نام سے بخوبی جانتا پہچانتا ہے۔ "گاؤ" فارسی میں اور "ثور" عربی میں گائے یا اس کے نر (بیل) کو کہتے ہیں۔ ان پتوں کی شکل و ہیئت بالکل گائے یا بیل کی زبان (جیبھ) سے مشابہ ہوتی ہے لہٰذا اس صوری مشابہت کی وجہ سے ان پتوں کا نام "گاؤزباں" یا "لسان الثور" تجویز کیا گیا ہے۔

(۳) "لسان العصافیر" یا زبانِ کنجشک" عربی میں "زبان" کو "لسان" کہتے ہیں۔ اور "عصافیر" "عصفور" کی جمع ہے۔ عصفور عربی میں "چڑیا" کو کہتے ہیں اور "کنجشک" فارسی میں چڑیا کو کہتے ہیں" لسان العصافیر" یا "زبان کنجشک" کے لغوی معنی چڑیوں کی زبان ہیں۔ لیکن "لسان العصافیر" یا "زبان کنجشک" جس چیز کا نام ہے وہ چڑیوں کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ ایک نباتاتی شے ہے جو بطور دوا کام آتی ہے جس کو ہندی میں "اندرجو" کہتے ہیں۔ چونکہ اس کی شکل چڑیوں کی زبان سے مشابہت رکھتی ہے اس لیے اطبائے خوش مزاج نے اس کو "لسان العصافیر" یا "زبانِ کنجشک" سے موسوم کیا اور یہی نام داخلِ لغات ہو گئے۔ اس لفظ کے متعلق ایک پُر لطف واقعہ سنئے۔

راقم الحروف اپنے عنفوانِ شباب میں ایک طبی نسخے کے اجزا لینے کے لیے ایک عطار (دوافروش) کی دکان پر پہنچا نسخے میں ایک دوا کا نام "لسان العصافیر" بھی لکھا تھا۔ اتفاق سے عطار بھی نیم خواندہ تھا اسے معلوم نہ تھا کہ "لسان العصافیر" کس چیز کا نام ہے اس کا دوسرا نام کیا ہے۔ راقم الحروف اس لفظ کے لغوی معنی جانتا تھا راقم الحروف نے

عطار سے کہا کہ اس کے معنی تو یہ ہیں مگر اس کا دوسرا نام مجھے نہیں معلوم لیکن یہ مسلّمہ ہے کہ طبیب نے اس نسخے میں "چڑیوں کی زبان" نہیں لکھی ہے بہرحال عطار نے راقم الحروف سے کہا کہ کسی طبیب سے یہ معلوم کیجیے کہ یہ "لسان العصافیر" کیا چیز ہے تو میں نسخے کے اجزا دے سکوں گا۔ لہٰذا راقم الحروف شہر کے ایک معمر اور مشہور طبیب صاحب کے پاس پہنچا اور نسخہ دکھا کر ان سے عرض کیا کہ حضرت یہ "لسان العصافیر" کس چیز کا نام ہے؟ یعنی اس کا دوسرا نام کیا ہے؟ طبیب صاحب نے بڑے وثوق سے فرمایا کہ "چڑیوں کی زبان" میں نے عرض کیا حضرت "لسان العصافیر" کے لغوی معنی تو بے شک "چڑیوں کی زبان" ہیں مگر یہ تو کوئی اور چیز ہوتی ہے۔ ورنہ جس مریض کے لیے حکیم صاحب نے یہ نسخہ تجویز کیا ہے وہ "چڑیوں کی زبان" کسی حالت میں کبھی استعمال نہ کرے گا اور نہ حکیم صاحب ایسی چیز اس کے لیے تجویز کر سکتے تھے۔ یہ کسی اور چیز کا نام ہے یہ فرما دیجیے کہ یہ کیا چیز ہے؟ مگر وہ معمر طبیب صاحب طیش میں آگئے اور مجھے ڈانٹ کر فرمایا بتا تو دیا چڑیوں کی زبان اور کیا بتائیں۔ ادھر میرا اصرار قائم رہا ادھر طبیب صاحب برابر خفا ہو کر فرماتے رہے۔ "چڑیوں کی زبان" بالآخر میں ان طبیب صاحب کی قابلیت کا قصیدہ پڑھتا ہوا ایک اور طبیب صاحب کے پاس پہنچا اور ان سے یہ عقدۂ لاینحل حل کرنے کی پیش کش کی انھوں نے برجستہ فرمایا "اندرجو" کو کہتے ہیں تب میری پریشانی دور ہوئی۔

(۴) "عنب الثعلب" یا "روباہ تربک" یا "انگور شغال" یہ تینوں ایک ہی چیز کے نام ہیں جس کو ہم "مکوہ" کہتے ہیں یہ ایک بوٹی کے چھوٹے چھوٹے گول پھل ہیں جو بحالتِ خام سبز اور پختہ ہو جانے پر سرخ ہو جاتے ہیں۔ اس چیز کو لومڑی اور گیدڑ شوق سے کھاتے ہیں اس لیے یہ چیز مذکورہ بالا ناموں سے موسوم ہوئی۔ "عنب" اور "تربک" عربی میں انگور کو کہتے ہیں "ثعلب" "لومڑی" کو اور "شغال" "گیدڑ" کو کہتے ہیں۔

(۵) "ڈیلٹا" کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ یونانی زبان کا ہے۔ انگریزی اور ہماری زبان میں بھی اس کا کوئی مترادف لفظ نہیں آتا۔ یہی بولا جاتا ہے

جغرافیہ کی اصطلاح میں "ڈیلٹا" اس تکون (مثلث نما) زمین کو کہتے ہیں جو کسی دریا کے سمندر میں گرنے کے مقام پر دریا کی کئی دھاریں ہو جانے سے پانی کی دھاروں کے درمیان (Δ) شکل میں خشک رہ جاتی ہے یونانی "حروف تہجی" میں ایک حرف "ڈیلٹا" کے نام سے ہے جس کی شکل تحریر میں (Δ) ہوتی ہے کسی زمانہ میں کچھ یونانی کشتی میں سوار ہو کر "بحرۂ روم" میں سیر کرتے ہوئے "مصر" کے ساحل تک "دریائے نیل" کے "بحرۂ روم" میں داخل ہونے کے مقام پر آگئے وہاں یونانیوں نے دریا کی دھاروں کے درمیان کچھ خشک زمین اپنی زبان کے حرف "ڈیلٹا" کی شکل میں دیکھی تو ان کی زبان سے بے ساختہ "ڈیلٹا" نکلا چنانچہ اسی وقت سے وہ تکون زمین جو دریا کے سمندر میں گرنے کے مقام پر دو دھاروں کے درمیان خشک رہتی ہے "ڈیلٹا" کے نام سے مشہور ہو گئی۔

(۶) خاکشی۔ خاکشو یا خوب کلاں۔ یہ زرد سرخی مائل رنگ کے تخم خشخاش سے بھی چھوٹے تخم ہوتے ہیں جو بطور دوا استعمال کیے جاتے ہیں ان بیجوں کا یہ حقیر ترین وجود دیکھ کر کسی خوش طبع نے خاکشی۔ خاکشو (خاکسی) اور کسی ظریف نے "خوب کلاں" (اچھا بڑا) طنزیہ کہا۔ لہٰذا اس چیز کے یہی نام مشہور ہو گئے۔

(۷) "یارِ غار" جب حضرت سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم" نے مکّہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو اول بوقتِ شب بیت النبی سے چل کر آپ نے "غار ثور" میں قیام فرمایا تھا۔ آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکرؓ تھے جنھوں نے "غار ثور" کو صاف کر کے اپنے زانو کو تکیہ بنا کر رسولؐ اللہ کو آرام فرمانے کے لیے لٹا لیا تھا۔ اور خود جاگتے رہے تھے۔ غرضیکہ قیام غار ثور میں حضرت ابوبکرؓ" نے نہایت جانفشانی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حق رفاقت ادا کیا تھا اسی باعث حضرت "ابوبکرؓ" کو "رفیق غار" کے لقب سے موسوم کیا گیا فارسی میں "یارِ غار" زبان زد خاص و عام ہوا اور اب ہر سچے رفیق اور مخلص دوست کو "یارِ غار" کہا جانے لگا۔

(۸) "لسان الحمل" "حمل" عربی میں بھیڑ بکری یا ہرن کے بچے

کو کہتے ہیں " لسان الحمل " کے لغوی معنی بھیڑ بکری یا ہرن کے بچے کی زبان ہوئے۔ لیکن یہ ایک بوٹی موسومہ " بارتنگ " کے پتے ہیں جن کی شکل بھیڑ بکری یا ہرن کے بچوں کی زبان (جیبھ) سے مشابہت رکھتی ہے اسی وجہ سے اس کو " لسان الحمل " کہا گیا ہے۔ ہمارے یہاں اطبا " بارتنگ " ہی کہتے ہیں۔

(۹) " ورق الخیال " حشیشۃ الفقرات۔ بھنگ نامی ایک بوٹی ہے جس کو سرور اور نشے کے لیے بعض لوگ استعمال کرتے ہیں اس کے استعمال کے بعد آدمی کے خیالات میں " ہیجان " اور " لہر " سی پیدا ہوتی ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ شخص آسمان میں اڑ رہا ہے اسی وجہ سے اس کے ایک مرکب کا نام " معجون فلک سیر " ہے چونکہ بھنگ کے استعمال سے خیالات میں ہیجان و ولولہ پیدا ہوتا ہے اس لیے اس کو " ورق الخیال " یا حشیشۃ الفقرات کہا گیا ہے۔ حشیش عربی میں " بوٹی " کو کہتے ہیں فقرات فقرہ کی جمع ہے جس کے معنی لہر بھی ہے۔

(۱۰) " حمام " (بہ تشدید میم اول) عرب گرم غسل خانہ کو اور حمام یا حمامہ (بغیر تشدید میم) کبوتر (پرند) کو کہتے ہیں جو امراض باردہ فالج وغیرہ میں مریض کو کھلایا جاتا ہے۔ چونکہ کبوتر میں حرارت زیادہ ہوتی ہے قرین قیاس ہے کہ اسی مناسبت معنوی یا مزاج کی ہم آہنگی کے باعث کبوتر (پرند) کا نام عرب نے حمام یا حمامہ تجویز کیا ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ خالق کائنات نے عجائبات عالم کی آرائش کے لیے مختلف الخیال، مختلف الطبائع حیوانات پیدا کئے ہیں بعض ضلع جگت اور بازاری پھکڑ اپنے مسخرے پن کا جب اظہار کرتے ہیں تو مذاق لطیف کثیف یا مدح و قدح کا امتیاز بالائے طاق رکھ دیتے ہیں مگر بعض سنجیدہ مزاج بذلہ گو، شائستگی اور مذاق لطیف کی حدود سے تجاوز نہیں فرماتے۔

(۱۱) " خرگوش " ایک مشہور چوپایہ جو بلی جیسا ہوتا ہے۔ مگر اس کے وجود اور جسامت کے لحاظ سے اس کے گوش (کان) بہت بڑے مثل " خر " (گدھے) کے کان کے ہوتے ہیں اسی لیے بذلہ سنج انسانوں نے اس کا نام " خرگوش " تجویز کیا ہے۔

(۱۲) " شتر مرغ "۔ پرندوں میں خاصہ بڑا ایک پرند ہے جو شکل میں شتر (اونٹ) سے ملتا جلتا ہے۔ اسی لحاظ سے اس پرند کو شتر مرغ نامزد کیا گیا ہے۔

(۱۳) " ناگ پھن " کے معنی بادی النظر میں سانپ کا پھن کہے جا سکتے ہیں مگر دراصل یہ ایک پودا ہوتا ہے جس کے پتے کف دست جیسے دبیز اور خاردار ہوتے ہیں جو سانپ کے پھن سے مشابہت رکھتے ہیں اسی وجہ سے اس پودے کا نام " ناگ پھن " مشہور ہوا ہے۔

(۱۴) " سمندر سوکھ " ایک بیلدار بوٹی کا نام ہے جو تالابوں میں خوب پھولتی پھیلتی ہے۔ اس پر سفید قدرے گلابی مائل پھول آتے ہیں اس کے تخم سیاہ رنگ کے " رائی " سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں جو اطبا امراض جریان وغیرہ میں استعمال کراتے ہیں۔ یہ تخم بھی سمندر سوکھ کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بوٹی تالاب وغیرہ میں پھیلتی رہتی ہے اور پورے تالاب یا پانی کے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور تالاب کا پانی خشک کرتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت یہ بڑے سے بڑے تالاب کو خشک اور ختم کر دیتی ہے۔ اس کی یہی خاصیت مدنظر رکھتے ہوئے اس کا نام " سمندر سوکھ " تجویز کیا گیا ہے۔

(۱۵) " اونٹ کٹارا " یا " شتر خار " یہ ایک خود رو خاردار پودا ہے جو کسی قدر " ستیاناسی " کے پودے سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس پر خاردار گول پھل آتے ہیں۔ چونکہ اس پودے کو اونٹ یعنی شتر رغبت سے کھاتا ہے اس لیے ظریف لوگوں نے اس کو شتر خار یا " اونٹ کٹارا " نام عطا کیا ہے۔

(۱۶) " کمرکس " یہ درخت ڈھاک کا گوند ہے جس کو " ڈھاک کی کنی " بھی کہتے ہیں اس کو اطبا " سیلان الرحم " اور " جریان " کے مریضوں کو استعمال کراتے ہیں ان امراض کو ختم کر کے یہ گوند " کمر " یعنی " پشت " کو تقویت پہنچاتا ہے لہٰذا خوش مزاج اطبا نے اس گوند کا نام " کمرکس " بھی تجویز کیا ہے۔

(۱۷) " گوش ماہی " کے لفظی معنی " مچھلی کے کان " ہیں دراصل یہ " صدف " یعنی سیپ کا ایک نام ہے۔ چونکہ " صدف " یا " سیپ " کی شکل گوش (کان) سے مشابہ ہوتی ہے اور صدف یا سیپ اور ماہی (مچھلی) دونوں دریا میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی مناسبت سے کسی ظریف نے صدف کا نام " گوش ماہی " تجویز کیا جو مشہور ہو گیا۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

عشرت دھولپوری

انسانیت کے رشتے

چلو یہ عہد کریں آؤ یہ قسم کھائیں
تم اپنے گھر میں مناؤ گے عید کی خوشیاں
ہمارے گھر میں دِوالی منائی جائیگی
یہ بھول جائیں کہ ہم نے کبھی کو خنجر سے
خود اپنے باغ کے پھولوں کا خوں نچوڑا ہے
خود اپنی بہنوں کے مہندی رچائے ہاتھوں سے
نہ جانے کتنی ہری چوڑیوں کو توڑا ہے
چلو یہ عہد کریں آؤ یہ قسم کھائیں
زمیں کو اپنی سجا دیں گے آسماں کی طرح
کچھ اس طرح سے کہ رہزن کو راستہ نہ ملے
قدم قدم سے ملا دیں گے کارواں کی طرح
چلو یہ عہد کریں آؤ یہ قسم کھائیں
زمیں پہ بکھرے ہیں تسبیح کے جو یہ دانے
پروئیں گے انھیں انسانیت کے رشتوں میں
کہ لوگ گاندھی و گوتم کو جب بھی یاد کریں
ہمارا نام بھی لیں امن کے فرشتوں میں

چلو یہ عہد کریں آؤ یہ قسم کھائیں
تم اپنے گھر میں مناؤ گے عید کی خوشیاں
ہمارے گھر میں دِوالی منائی جائیگی

جائیلے عشرت

غزل

کیا خبر تھی خاکِ نخلِ آرزو ہو جائے گا
فصلِ گل آتے ہی قتلِ رنگ و بو ہو جائے گا

گرمیٔ دل کے لیے جاؤ نہ سورج کے قریب
منجمد کچھ اور نبضوں میں لہو جائے گا

طاقِ مژگاں سے اٹھا پھینکو یہ روشن شب چراغ
شہریارِ کہکشاں بے آبرو ہو جائے گا

کون کہہ سکتا تھا میرا کر کے خونِ آرزو
چشمِ گیتی میں وہ اتنا سرخرو ہو جائے گا

شب گزیدو! میں تو جل جاؤں تمہارے واسطے
کیا مرے جلنے سے روشن چار سو ہو جائے گا

فصلِ گل افروز کا عشرتؔ نہ کیجیے تذکرہ
پتہ پتہ گلستاں کا زرد رُو ہو جائے گا

ڈاکٹر احسن بیگ
صدر شعبۂ اردو
جواہر لال نہرو پوسٹ گریجویٹ کالج
بارہ بنکی۔

اقبال سہیل کی قومی شاعری

اقبال سہیل کے کلام میں سیاسی بیداری بیسویں صدی کے اوائل میں نظر آتی ہے۔ بعد ازاں زمانہ اور حالات کے تقاضوں نے اس شعور کو پختگی عطا کی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ملک کے اندر مختلف تحریکوں نے جنم لیا، جن کا نصب العین مادر ہند کی تعمیر و ترقی تھا۔ یہ دور اس لحاظ سے بھی کم اہمیت کا حامل نہیں کہ سیاسی اور اجتماعی شعور میں پختگی کے ساتھ قوم کے لوگوں نے نئے حالات کو قبول کرنے اور آزادی کو حاصل کرنے کے لیے جس قسم کی جد و جہد کی ضرورت تھی وہ پوری کرنے کی کوشش کی۔ آریہ سماج، برہمو سماج اور سرسیّد کی تحریک سب اسی دور کی مرہونِ منّت ہیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ کا وجود بھی اسی عہد میں ظہور پذیر ہوا۔ علامہ شبلی نعمانی کے فیضِ تربیت نے اقبال سہیل کو اس قابل بنایا کہ وہ ان تحریکوں سے واقفیت کے ساتھ ان کے مقاصد کی تہ تک پہنچ سکیں۔ ۱۹۰۶ء میں انھیں مولانا حسرت موہانی سے قربت حاصل ہوئی جو آزادی کے علمبرداروں میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ اس زمانے میں اقبال سہیل مولانا حمید الدین فراہی کے ساتھ علی گڑھ میں مقیم تھے۔ چنانچہ انھیں وحید الدین سلیم سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور اس طرح انھیں ایک اہم علمی و ادبی شخصیت سے فیض حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی زمانے میں انھیں خواجہ الطاف حسین حالی سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ اس طرح سہیل کی ذہنی تربیت کو پروان چڑھنے کے خاطر خواہ مواقع میسّر ہوئے۔

سہیل کے استاد علامہ شبلی نعمانی نے سرسید کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی کے لیے مسلمانوں کے اندر ایک نئی روح پھونکی۔ شبلی چاہتے تھے کہ آزادی کی تحریک میں مسلمان دیگر قوموں کے شانہ بہ شانہ چل کر انقلاب کے پرچم کو بلند کریں۔ سہیل شبلی کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوئے۔ پہلی جنگِ عظیم نے انقلاب کو ایک نئی جلا بخشی جو حقیقی معنوں میں بغاوت و انقلاب کی منزلِ اوّل ہے۔ اسی زمانے میں جلیان والا باغ کا دل دہلا دینے والا سانحہ وقوع پذیر ہوتا ہے اور برطانوی جبر و تشدد کے ہیبت ناک سائے ملک کو اپنی گرفت میں لینے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔ پورے ملک میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اسی دور میں ترکِ موالات کی تحریک تیز تر ہوتی نظر آتی ہے۔ سہیل نے اس موقع پر اپنے جذبات کا اظہار جس موثر طریقہ سے کیا ہے ان کی ایک غزل کے چند اشعار سے اس کی وضاحت ہو سکتی ہے ؎

سنائیں کس کو الٰہی غمِ نہاں اپنا
اس انجمن میں نہیں کوئی پاسباں اپنا
ملا نہ بے خبری میں کہیں نشاں اپنا
سراغ ہم نے لگایا کہاں کہاں اپنا
مٹایا ہم نے محبّت میں خانماں اپنا
نہ ہو سکا مگر اب بھی وہ بدگماں اپنا

نہیں ہے خوفِ اسیری سے ہمّتِ پرواز
ہمیں تو کنجِ قفس ہے یہ آشیاں اپنا

یہ غزل مکمل طور پر سیاسی کیفیات و میلانات سے ہم آہنگ ہے۔ اپنی غزلوں میں سیاسی حقائق کے متعلق اقبال سہیل خود فرماتے ہیں۔

" بھئی میں کسی پر عاشق ہوا نہیں اور تصوّف کا دلدادہ ہونے کے باوجود صوفی بھی نہیں ہوں۔ میں نے تو غزل میں سیاسی حقائق بیان کیے ہیں۔"

اقبال سہیل کی اسی غزل کا ایک لاجواب شعر ہے جو سیاسی تاثرات کا ترجمان ہے اور تغزل سے مربوط بھی ہے

الٰہی خیر کہ صیاد لے کے دستۂ گل
چلا ہے آج سجانے کو آشیاں اپنا

جب ملک کے عظیم سپوتوں اور جانبازوں نے آزادی کی تحریک کو تیز تر کیا تو سہیل نے وطن کے ان جاں نثاروں کو عزم و ہمّت، شوکت و قوت اور شجاعت و بے باکی کے ذریعہ اپنے مقاصد کی تکمیل کی تلقین کی ہے

دو تیلیاں قفس کی ہیں ان کی بساط کیا
مُرغِ اسیر! ہمّتِ مردانہ چاہیے

ساقی سبو بدوش ہے اے ذوقِ تشنہ کام
دستِ طلب میں جراتِ رندانہ چاہیے

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے
بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

قفس میں دیتے ہو کیا طعنِ سُست پروازی
فضا کھلی ہوئی ملتی تو امتحاں ہوتا

سہیل حالات کی نزاکتوں سے کبھی غافل نہیں رہے۔ برطانوی حکومت کی عیاریاں، فرقہ پرست عناصر کی شاطرانہ چالیں، مسلم لیگ اور کانگرس کی کشاکش، قوم کے سپوتوں میں جدوجہد آزادی کا جذبہ، جمہوریت کی بحالی کا تصوّر اور ملک کی تعمیر و ترقی کا احساس غرضیکہ بیشتر سیاسی واقعات اور سماجی کیفیات ان کی غزلوں کو بقائے دوام بخشتے ہیں ؎

خیال اُن کے، سخن میرا، زباں اُن کی، دہن میرا
بہار اُن کی، چمن میرا، گل اُن کے، گلستاں میرا

ہم نشیمن کو کبھی رو دیں تو خطا ہوتی ہے
پھونک ڈالیں وہ چمن بھی تو ہنر کرتے ہیں

صیاد! مژدہ باد، عنادل میں چل گئی!
اب کش مکش میں فکر کسے آشیاں کی ہے

انجامِ وفا بھی دیکھ لیا اب کس لیے سر خم ہوتا ہے
نازک ہے مزاجِ حُسن بہت سجدہ سے بھی برہم ہوتا ہے
یہ آگ دہکتی ہے جتنی، اتنا ہی دھواں کم دیتی ہے
احساس ستم بڑھ جاتا ہے تو شورِ فغاں کم ہوتا ہے
تاراجِ نشیمن کھیل سہی صیاد مگر اتنا سُن لے
جب عشق کی دُنیا لٹتی ہے تب حُسن کا ماتم ہوتا ہے

سہیل ہندوستان کی تقسیم کی شدت سے مخالفت کرتے تھے۔ انھوں نے یہاں کے عوام کو قومی یک جہتی اور اتحاد کے جذبے سے سرشار کیا۔ فرقہ پرست عناصر کی تخریبی سرگرمیوں کی کھُل کر مذمت کرتے تھے۔ وہ اس احساس کا درس دیتے تھے کہ یہ تفرقے انگریزی حکومت کی حکمت عملی کا نتیجہ ہیں تاکہ وہ اپنی حکومت کی بنیادوں کو ملک کے گوشہ گوشہ میں مستحکم کر سکیں۔ وہ امن و آشتی، اخوت و محبت اور صلح کُل کے علمبردار تھے، اور انگریزی حکومت کی شرانگیزیوں اور ریشہ دوانیوں پر تنقید کرنے سے احتراز نہیں کرتے تھے۔ اس تنقید میں تغزل کی رعنائیاں بھی ہیں اور طنز سے بھرپور نشتر زہر آگیں بھی ؎

تقسیمِ گل پہ بحث عنادل میں چھڑ گئی
گلزار لٹ رہا ہے کچھ اس کی خبر نہیں

پہنچی یہاں بھی شیخ و برہمن کی کشمکش
اب میکدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا

اُٹھائے ہیں یہ فتنے نرگسِ غمّاز نے ورنہ
نہ بُت سے شیخ کو ضد ہے نہ کعبے سے برہمن کو

وہ چشمِ فتنہ گر ہے ساقیِ میخانہ برسوں سے
کہ باہم لُٹ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

خدا سمجھے بُتِ سحر آفریں سے
گریباں کو لڑایا آستیں سے

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جاپان اور جرمنی کے درمیان قتل و غارت گری، کشت و خون اور انسانیت کی ہلاکت کا بازار گرم تھا۔ انگریزوں نے جاپان اور جرمنی کے سفاکانہ عزائم کے پس پردہ ہندستانی عوام کی آزادی اور حریت کے جذبے کو سرد کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ سہیل نے انگریزی حکومت کے ان خطرناک منصوبوں سے ہندستانی عوام کو آگاہ کیا اور ان کے ناپاک عزائم کو یوں بے نقاب کیا ؎

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے، اسیرِ غم اب تو چھوٹ جائے
چمن کو لوٹا ہے باغباں نے تو آ کے گل چیں بھی لوٹ جائے
ستم بھی ہوگا تو دیکھ لیں گے کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے یہ مہربانی کا جھوٹ جائے
بلا سے قزاق آ کے لوٹیں یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اچک لے شاہیں تو غم نہیں ہے قفس تو کمبخت ٹوٹ جائے

حصولِ آزادی کے بعد ملک کو جن حالات و کیفیات سے دوچار ہونا پڑا، اس کی مرقع آرائی سہیل نے نہایت بے باکی سے کی ہے اور اس کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ ان غزلوں میں عوام کے جذبات کو پیش کر کے سہیل نے صرف ہمدردی کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ ان کے درد و کرب، غربت و افلاس، مایوسی و محرومی اور ان کی ذہنی کشمکش کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے یہ ان کا ذاتی غم ہو اور اس غم کو جب شاعرانہ پیکر میں ڈھالتے ہیں تو سارے عالم کا غم بن جاتا ہے ؎

آئی شبِ غم کے بعد سحر، غم ناک رہا پھر بھی منظر
وہ غنچہ و گل کا ہنس ہنس کر شبنم کو رُلانا کیا کہیے
پیچھے ہیں قدم آگے ہے نظر جاتا ہے کدھر، جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمتِ سفر رفتارِ زمانہ کیا کہیے

اقبال سہیل کے کلام کے تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حصولِ آزادی سے قبل اور بعد کی بہت سی قومی، سماجی اور سیاسی تلخیاں ان کے اشعار میں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ انھوں نے آزادی کی تحریک کے رموز و نکات کو اپنے کلام میں پیش کر کے عوام کے جذبات کو منظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں سے واقفیت رکھتے ہوئے نئی قدروں اور وطن کے نئے پیچیدہ مسائل سے باخبر ہیں۔

سہیل کے کلام میں حب الوطنی کے جذبات بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان میں انسانیت کی بقا اور تحفظ کا احساس اور جمہوری قدروں سے دل چسپی کا جذبہ اپنی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ وہ انسانی شرافت اور آزادی، امن و آشتی اور اتحادِ قومی کے محرک ہیں۔ ہندستان کے تمام فرقوں کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ متحد ہو کر ملک کے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کے حل کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کریں جس سے سبھی فرقے اپنی تہذیب، زبان اور کلچر کو زندہ رکھتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کر سکیں۔ اس طرح کثرت میں وحدت کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے گا ؎

مل جل کے برنگِ شیر و شکر، دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیب کا سنگم ہوتا ہے
(اقبال سہیل)

طاہرہ تلہری

غزل

آپ دھوکہ کھا گیا یا مجھ کو دھوکہ دے گیا
چند پیسوں میں نجومی تاجِ دنیا دے گیا

وقتِ رخصت کر گیا تجدیدِ اقرارِ وفا
جاتے جاتے اور اک زخمِ تمنا دے گیا

ابرِ آوارہ کی صورت چلچلاتی دھوپ میں
دو گھڑی ہی کو سہی آیا تو سایا دے گیا

بات بس اس ساقیٔ ایثار پیشہ کی کرو
آپ پیاسا رہ کے جو پیاسوں کو دریا دے گیا

چین دل کا لٹ گیا اور اڑ گئی آنکھوں کی نیند
اے مرے غمخوار تو اچھا دلاسا دے گیا

بہہ گئے گاؤں کے گاؤں ہو گئیں فصلیں تباہ
ہائے کتنے زخم اک سیلاب دریا دے گیا

روشنی وہ ہے کہ طاہرؔ کچھ نظر آتا نہیں
شہر کا سورج تو آنکھوں کو اندھیرا دے گیا

بشیر فاروقی

غزل

بات نکلی تو سبھی رشتے پرانے نکلے
ایک دھاگے سے بندھے سارے گھرانے نکلے

منزلیں سخت ہوئیں، راستے دشوار ہوئے
اور کچھ دن مرے جینے کے بہانے نکلے

مشعلیں چھین لو! وہ ہاتھ قلم کر ڈالو
مشعلیں لے کے جو شہروں کو جلانے نکلے

کوئی دریا ہو سرابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ہم بھی کس دشت میں پیاس اپنی بجھانے نکلے

آندھیاں آتی ہوئی لوٹ گئی ہیں لوگو!
ہم تو جب اپنے چراغوں کو جلانے نکلے

آپ نے دیکھ لیا کیا تھا جن ہے یہ وقت
کس کے سر قرض ہے اور کون چکانے نکلے

لوگ حالات سے سہمے ہوئے بیٹھے ہیں بشیرؔ
کون اب گھر سے یہاں کس کو بچانے نکلے

ڈاکٹر شکیب ایاز
۲۱۔ گزری بازار
پٹنہ سٹی ۸۰۰۰۰۸

اُردو کا ایک گمنام شاعر جے گوپال لال ماتھر محشرؔ عظیم آبادی

ادب، تہذیب کی ایک شق ہے۔ شعر گوئی یا سخن سنجی، طرز معاشرت میں احترام کا درجہ رکھتی ہے۔ گویا کسی عہد کی نامعلوم زندگی کی دریافت کا ایک ذریعہ ادب بھی ہے۔ اردو شاعری اس لحاظ سے اہم بھی ہے اور مؤثر بھی۔ اس نہج سے اس کا مطالعہ قدر اور قدر مشترک کا حصول ہے۔ چونکہ اردو کا خمیر صوفیوں نے تیار کیا۔ اس کے خاکے ان کے ہاتھوں نے بنائے لہذا اسی حسن زائیدگی نے اس کے مزاج کو کشادگی عطا کی۔ اس لئے بھی وسعت نظری کے درجات انھیں کی صحبتوں میں طے کئے۔

کوئی زبان، کوئی ادب، کسی ایک قوم، مذہب اور علاقہ میں محدود نہیں رہتا۔ جو اس کا ہوا، وہ اس کے ہو کے رہے۔ عظیم آباد کی مرکزیت نے کتنے ہی ہندو ادیب و شاعر فارسی و اردو کے پیدا کئے۔ اس کی تفصیلات تذکروں اور کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ چندر بھان برہمن، راجہ رام نرائن موزوں، نند لال گویا، رام نرائن حاجی پوری، اجاگر چند الفت، لالہ رام چند فرحت، راجہ پیارے لال الفتی رائے بیجناتھ پرشاد غنیمت، کنور سکھراج بہادر رحمتی، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق جیسے فارسی کے ادبار و شعرار کا شمار اکابرین میں ہوتا ہے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے اردو کو بھی اظہار کا ایک ذریعہ بنایا۔ "تذکرہ اردو شعرائے بہار" اور "موج گنگ" کے مطالعے نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوؤں نے اردو کے ساتھ حسن سلوک کیا۔ یہ کوئی سیاسی دباؤ کا نتیجہ نہ تھا۔ ہندوؤں نے حمد، نعت، منقبت اور مرثیے بھی لکھے۔

شاید اردو ہندوستان میں اپنے نہج پر اسی لئے زندہ ہے کہ وہ ہر تقسیم کی تردید کرتی ہے۔ اس کی موت کی پیش گوئیاں کرنے والے انفسیاتی مریض ہیں۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے اردو کے لئے عملاً کچھ نہ کیا یا مصلحتاً کنارہ کش رہے۔ انھیں خود اپنی تحلیل نفسی کرنا ہوگی۔

اسی اردو کے ایک گمنام ہندو شاعر جے گوپال لال ماتھر محشرؔ عظیم آبادی ہیں۔ یہاں ان کی شاعری کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ کیونکہ ان کے تذکرے سے "ہندو شعرار بہار" اور "موج گنگ" خالی ہیں۔ پہلے محشرؔ کے مجمل سوانحی حالات دیئے جا رہے ہیں اور پھر ان کا مختصر کلام اور اس کے متعلق تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

جے گوپال لال ماتھر[۲] نام، تخلص محشرؔ، مولد و وطن دیوان محلہ پٹنہ سٹی۔ محشرؔ کے والد کا نام مدن گوپال لال ماتھر تھا۔

١٩٥٣ میں فوت ہوگئے اس وقت ان کی عمر ٦٣ سال تھی۔ اس کے مطابق ١٨٩٠ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

محشر عظیم آبادی نے محمڈن اینگلو عربک اسکول (قائم شدہ ١٨٨٤ء) سے میٹرک پاس کیا اور بعد میں میڈیکل سائنس کی تعلیم حاصل کی۔

محشر کو اسٹیج سے بھی دلچسپی تھی۔ انھیں اداکاری میں کمال حاصل تھا۔ غالباً ١٩٢٥ کی بات ہے پردیپ بلب فیکٹری کے مالک ڈِنے بابو کی کوٹھی موسوم بہ "دول پورہ کوٹھی" میں ایک ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ اس میں محشر نے ایک سود خور کابلی کا رول اس خوش اسلوبی سے ادا کیا کہ ناظرین غصے سے بپھر گئے اور اسٹیج پر جوتیاں پھینکنے لگے۔ ڈِنے بابو بولے "یہ اداکاری کا کمال تھا" پٹنہ سٹی کے جتنے ڈراما کلب تھے ان سب سے ان کی وابستگی تھی۔

محشر کو موسیقی سے بھی شغف تھا۔ بابو کٹ گرد سے اس فن میں مہارت حاصل کی تھی۔ پٹنہ سٹی میں جب بھی محفل موسیقی برپا ہوتی۔ محشر کی شرکت لازمی تھی۔

محشر عظیم آبادی کی بیاض شعر میں صرف آٹھ غزلیں، اور چھ رباعیاں درج ہیں۔ یہ بیاض، محشر کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ شروع کے اوراق پر پانی گر جانے کی وجہ سے حروف مدھم ہوگئے ہیں لیکن پڑھے جا سکتے ہیں۔ بیاض محشر کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ انکے عہد میں طرحی مشاعرہ کا رواج تھا۔ بعض بعض مشاعروں سے سنین اور تاریخیں مل جاتی ہیں۔ طرح کے مصرعے اور مشاعروں کے نام بھی اس بیاض سے ظاہر ہیں۔ محشر نے یہ بھی لکھا:

"تصنیف کردہ جے گوپال لال ماتھر متخلص بہ محشر"

محشر کی بیاض شعر سے یہ بھی مترشح ہے کہ ان کے معاصرین ہندو شعراء مشاعروں میں سرگرم حصہ لیتے تھے۔ مثلاً ایک جگہ درج ہے:

"غزل مشاعرہ بتاریخ ١١ جون ١٩٢٥ء بمکان بابو بلدیو بہاری ماتھر حفیظ"

اسی بیاض میں ایک اور جگہ تحریر ہے:

"مشاعرہ بہ مکان بابو رگھو نندن داس بتاریخ ١١ اکتوبر ١٩٢٥ء"۔

داس برادر، دیوان محلہ میں رہتے ہیں۔ بقول پروفیسر سید عسکری صاحب، ان کے ہاں اردو فارسی کا وافر ذخیرہ تھا۔ اہل خاندان کے مطابق پروفیسر سید حسن عسکری صاحب کی ایما پر اہم کتابیں کتب خانہ اشرفیہ پٹنہ منتقل ہوئیں تھیں۔

مذکورہ حوالوں سے ظاہر ہے کہ عظیم آباد (پٹنہ) میں ہندو حضرات بھی مشاعرے کرتے تھے اور حسب روایت طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اردو شاعری سے دلچسپی تھی۔ زبانِ اردو اور مشاعرہ ان کا تہذیبی سرمایہ تھا۔

محشر، منشی میر محمد باقر، باقر عظیم آبادی کے ممتاز شاگرد اور بھانجے سید حسن شیدؔ کے شاگرد تھے۔ بیاض میں درج دو رباعیوں میں اس کا اعتراف موجود ہے:

گر مکتب فن میں طفل ابجد ہوں میں
ہم مرتبۂ صاحبِ دستہ مد ہوں میں
کیوں ہو نہ ظہوری و نظیری کا گماں
جاروب کش درگہ سید ہوں میں

پھولوں میں بہار جاودانی ہوں میں
بلبل کی زباں میں خوش بیانی ہوں میں
اللہ رے فیض بارگاہِ سید
محشر اسی دریا کا تو پانی ہوں میں

محشر کے اشعار کے مطالعہ سے ان کی کہنہ مشقی ظاہر ہے ان کی زبان شستہ اور مضامین پیش پا افتادہ ہیں۔ بیاض میں درج غزلیہ اشعار کی تعداد اور دیگر تفصیل اس طرح ہیں:

پہلی غزل : کل اشعار پندرہ
مصرع طرح :
لطف آنند باغ میں ہے گلشن کشمیر کا
غزل کے چند منتخب اشعار :

دل میں سماتا ہے کسی کی شوخیٔ تقریر کا
کرشمے ہیں وہ ادائیں کام گویا تیر کا

ہے عظیم آباد کے کانوں میں پھولوں کی بہار
اک نمونہ ہے یہ خطہ گلشن کشمیر کا

تو نے جو لکھا مرے حق میں وہی ہو کر رہا
تیرا خط شاید نوشتہ ہے مری تقدیر کا

پتلیوں کی طرح سے اس میں ہے وہ جلوہ نما
میری آنکھیں بھی ہیں گویا چوکھٹا تصویر کا

دوسری غزل : کل اشعار پندرہ :
طرح : کب تک کوئی فراق کے صدمے سہا کرے
چند منتخب اشعار :

کوئی امید بھی نہ ہو تم سے خدا کرے
تم ایسے بیوفاؤں کا کون آسرا کرے
گھبرا گیا ہے قصۂ الفت سے جی مرا
کب تک غزل کے پرزے میں دکھڑا کہا کرے
کچھ بھی مدد کرے جو مرا پیکر خیال
آنکھوں کے سامنے ترا نقشہ رہا کرے

تیسری غزل : کل اشعار سترہ ۔
طرح : غیر کو میرے جلانے کے لئے پیدا کیا
چند منتخب اشعار :

اے جمال یار کب تھی تاب نظارہ مجھے
عین احساں ہے اگر اس شوخ نے پردہ کیا
یہ نہ سمجھے کوئی جوروں کی سزا ملتی نہیں
اس کے آگے آگیا جس شخص نے جیسا کیا

چوتھی غزل : کل اشعار انیس ۔
طرح : درج نہیں ۔
چند منتخب اشعار :

زمانہ مرے حال سے بے خبر ہے
سرہانے فقط بیکسی نوحہ گر ہے
خدا کے ہی پہنچائے پہنچوں عدم تک
کہ ہے وقت کم اور لمبا سفر ہے
جھڑی اشک حیرت کی ہوتی نہیں کم
ان آنکھوں کی برسات آٹھوں پہر ہے

پانچویں غزل : کل اشعار پندرہ
طرح : اس نازنیں کو شوق ہے ہلکی شراب سے
چند منتخب اشعار :

سنبھلا گیا نہ پھر دل پر اضطراب سے
انگڑائی لیتے اٹھے جو وہ فرش خواب سے
تھی یہ ادا بھی دید کے قابل پس وصال
مجھ سے ملائی آنکھ نہ اس نے حجاب سے
دل لے کے میرا آپ چلے جاتے ہیں کہاں
فرمائیے، میں پوچھ رہا ہوں جناب سے

چھٹی غزل : کل اشعار تیرہ
طرح : کیا معطر ہے پسینہ پھول سے رخسار کا

اللہ اللہ ری تجلی اللہ اللہ ری ضیا
آفتاب حشر ہے ہر ذرہ کوئے یار کا
کب کسی سے رک سکے گا گریۂ بے اختیار
تھامنا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا

ساتویں غزل : کل اشعار چھ
طرح : درج نہیں ۔

منتخب شعر:

ہے محشرؔ ان کا ملنا سہل جب تک گھر پہ بیٹھے ہیں
نہ پھر تھامے تھمیں گے وہ، اگر ان کے قدم نکلے

آٹھویں غزل: کل اشعار نو

طرح: قمقمہ ان کا رہے اور میری پچکاری رہے

نیند میں بھی اس کے رخ کی آئینہ داری رہے
لطف جب ہے خواب کی حالت میں بیداری رہے

میکشوں کو رنگ دے اپنی شراب عشق سے
آج ساقی بادۂ احمر کی پچکاری رہے

آؤ اے محشرؔ! چلو بھٹی سے لے آئیں شراب
آج ہے ہولی کا دن کچھ شغلِ میخواری رہے

"بہار میں اردو کے ہندو شعراء" کے موضوع پر ہنوز تحقیق کی از سرِ نو ضرورت ہے۔ مرحوم سید فصیح الدین بلخی کی کتاب 'ہندو شعرائے بہار' نقش اول ہے۔ اس میں اضافے کی گنجائش ہے اور اسے دوبارہ شائع کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

حواشی:

(۱) موج گنگ (تذکرہ شعرائے ہند ابتدائے شاعری تا انیسویں صدی) از جوہر دیوبندی۔ مطبوعہ محبوب پریس دیوبند ۱۹۸۳ء

(۲) محشرؔ کے صاحبزادے ڈاکٹر کرشن گوپال ماتھر سے ان کے حالات راقم السطور کو میسر آئے۔ ان کی بیاض شعر بھی ان ہی سے ملی۔ ڈاکٹر کرشن گوپال ماتھر بھی اردو میں شعر کہتے ہیں۔ اردو پڑھتے ہیں۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا۔ اس اسکول میں گھر کے بعد اردو پڑھی۔ بعد میں ہندی کی طرف توجہ کی چند افسانے اور مضامین ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۳) سید حسن سیدؔ کے متعلق راقم السطور کا مطبوعہ مقالہ معاصر شمارہ ۳۸ دیکھئے۔ اس وقت 'کلیات سیدؔ' میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

★

حسرت: .... (صفحہ ۱۶ کا بقیہ)

(۲۶) (ردیف ع) الوداع اے ماہِ رمضان الوداع ، شعر
(۲۷) (ردیف غ) دل نہ تھا رنجِ ہجرِ یار کا داغ ۵ ،
(۲۸) (ردیف ف) وہ شوخ عجب کیا ہے مجھ سے جو نہیں واقف ۵ ،
(۲۹) (ردیف ق) تجھ سے حسن و جمال دو جہاں کی رونق ۸ ،
(۳۰) (۔) وصل کی شب رواں ہے سوئے فراق[۳۰] ۷ ،
(۳۱) (ردیف ک) محروم طرب ہے دلِ دلگیر ابھی تک ۹ ،
(۳۲) (ردیف گ) بکھرے رخِ روشن پہ جو ہیں گیسوئے شبرنگ ۷ ،
(۳۳) (۔) عہدِ مستی کے اب کہاں وہ رنگ ۶ ،
(۳۴) (ردیف ل) از بسکہ حسن یار ہے خوبی سے جانِ دل ۵ ،
(۳۵) (ردیف م) روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام[۳۱] ۰ ،
(۳۶) (ردیف ن) کام لوں ناکامیوں سے عشق کا کتنا کروں
(۳۷) ــــ آوارۂ دشتِ جستجو ہیں۔ ۶ ،
(۳۸) ــــ بدل لذتِ آزار کہاں سے لاؤں ۷ ،
(۳۹) (ردیف و) اثرِ عشق سے نکلیں جو تمہارے آنسو[۳۲] ۷ ،
(۴۰) (ردیف ہ) قابو میں نہیں ہے دلِ شیدائے مدینہ ۷ ،
(۴۱) (ردیف ی) نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے ۷ ،
(۴۲) ــــ لایا ہے دل پر کتنی خرابی ۹ ،
(۴۳) ــــ اور تو پاس میرے ہجر میں کیا رکھا ہے[۳۳] ۱۱ ،
(۴۴) ــــ دل کو تری دزدیدہ نظر لے کے گئی ہے ۶ ،
(۴۵) ــــ نہ ہوا اس کی خطاپوشی پہ کیوں نازِ گنہگاری ہے[۳۴] ۱۹ ،
(۴۶) ــــ ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی ۱۱ ،

اوپر کی ان تمام غزلوں کو حسرتؔ نے "گلدستۂ حسرتؔ" کے نام سے ایک الگ مجموعے میں شائع کیا تھا۔ اس کا اشتہار اردوئے معلی بابت دسمبر ۱۹۱۰ء کے صفحہ ۲۲ میں کیا گیا تھا۔

---

۳۰ اردوئے معلی اپریل ۱۹۱۰ء ص۱۹ ۳۱ اردوئے معلی مئی ۱۹۱۰ء ص۱۹
۳۲ اردوئے معلی جون ۱۹۱۰ء ص۱۹ ۳۳ اردوئے معلی جولائی ۱۹۱۰ء ص۱۹
۳۴ اردوئے معلی اگست ۱۹۱۰ء ص۱۹

غزلیں

سندر سروپ سریواستو
ریٹائرڈ پرنسپل، ۶۰/۷ سیوانی فتح پور ۲۱۲۶۰۱

وحشتِ نظّارگی تھی ہر طرف اور میں نہ تھا
جانے کیا دیوانگی تھی ہر طرف، اور میں نہ تھا

ہر طرف جام و سبو ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے
قطرہ قطرہ تشنگی تھی ہر طرف، اور میں نہ تھا

خندہ زن برقِ تپاں تھی ہر گل و خاشاک پر
شعلہ شعلہ زندگی تھی ہر طرف، اور میں نہ تھا

کھو گئے تھے لوگ سب دیر و حرم کی راہ میں
لحظہ لحظہ بندگی تھی ہر طرف، اور میں نہ تھا

خون کے دھبے پڑے تھے ہر در و دیوار پر
اک عجب دیوانگی تھی ہر طرف، اور میں نہ تھا

ہر طرف انسانیت دم توڑتی، روتی ہوئی
زخمی زخمی زندگی تھی ہر طرف، اور میں نہ تھا

لوگ تھے سہمے ہوئے وحشی درندوں سے سروپ
اک عجب بیچارگی تھی ہر طرف، اور میں نہ تھا

اختر شاہجہاں پوری
نگین چوپال - شاہجہاں پور

مجھ کو منظور مدعی ہونا
ہے مگر شرط منصفی ہونا

کمتری کا یقیں دلاتا ہے
خود کو احساسِ برتری ہونا

تیرگی کے پہاڑ سے بہتر
ایک جگنو کی روشنی ہونا

کتنا بے فکرِ زادِ راہ سے ہوں
کام آیا مرا سخی ہونا

رفتہ رفتہ سبھی کو راس آیا
گھر کا ماحول ماتمی ہونا

طبعِ نازک پہ ہے گراں اختر
میری آنکھوں کا شبنمی ہونا

طاہر فتحپوری
۱۹۰ - بی - چاند شاہ تکیہ
فتح پور - ۲۱۲۶۰۱

تیری دیوانگیٔ شوق کی تفسیر کے ہیں
وہ نشانات جو اتری ہوئی زنجیر کے ہیں

رخ بدلتے ہوئے حالات کی تصویر کے ہیں
کبھی تقدیر کے قائل کبھی تدبیر کے ہیں

یہ محبت، یہ مروت، یہ اخوت کے پیام
اقتباسات یہ سارے مری تحریر کے ہیں

دوستو! تم ہی بتاؤ تمہیں ہوگا معلوم
زخم کیسے یہ مرے جسم پہ شمشیر کے ہیں

ہم نے دیکھا تھا کبھی خوابِ مسرت طاہر
منتظر تب سے اسی خواب کی تعبیر کے ہیں

مسعود اختر
۶۹۸، آزاد کالونی۔ گلی ۲ ساؤتھ اسلام آباد
(میرٹھ)

انشائیہ

جہالت کی حمایت میں

لفظ جہل ہر چند کہ جہالت کا منبع ہے لیکن لغات کشوری، فیروز اللغات، کریم اللغات اور جامع اللغات میں اس کے معنی ناواقفیت، بے وقوفی، بے تمیزی، نادانی اور اجڈپن کے بتائے گئے ہیں۔ اردو لغت نویسوں کی نظر میں ناخواندہ شخص جاہل نہیں ہو سکتا البتہ انگریزی لغات میں جہالت کو Illiteracy اور Ignorance کی پوشاکیں پہنا کر اس اہتمام سے پیش کیا گیا کہ اس کے ڈانڈے بھولپن سے جا ملے اور اس طرح بے پڑھا لکھا اور پڑھ لکھا اور ان پڑھ بھی جاہلوں کے زمرے میں شمار کیا جانے لگا۔

جہالت ایک ازلی و ابدی جذبہ ہے جو اس جہانِ فانی پر پوری طرح سے غالب و حاوی ہے۔ ماہرینِ جہالت کے بقول یہ ایک شمع ہے جسے کچھ عقل کے دشمن علم کی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں۔ یہ عالم، فاضل و عزت مآب جُہلا حضرات کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ اس جہانِ رنگ و بو میں جو بھی چہل پہل اور سرگرمی ہمیں نظر آتی ہے۔ وہ انہیں عظیم المرتبت شخصیات کے دم سے ہے۔ خدا کی سرزمین پر بسنے والے ہر انسان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اگر جہالت دنیا سے اٹھ گئی تو ہم سب کی زندگی میں اکتاہٹ اور کھوکھلاپن در آئے گا اور ہم آپسی گفتگو کے موضوعات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ یہ جہالت کی نہیں ہم سب کی موت ہوگی۔

علم کا پروپیگنڈا کرنے والے حضرات نہایت سبک اندازی سے کہتے ہیں "علم حاصل کرو کہ علم ہی تمہارے سینوں کو کشادہ کرے گا"۔ لیکن یہ سادہ لوح انسان اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ حصولِ علم کی بات کہہ کر انہوں نے علم سے منسلک لامتناہی ضروریات کا دروازہ ہم پر کھول دیا ہے جوتے، فیتے، موزے، نیکر، ٹائی، پتلون اور قمیص (غرضیکہ یونیفارم کے سبھی لوازمات) بستہ، کاپی، کتابیں، قلم، درسگاہ، ٹیچرز، پرنسپل، انتظامیہ، مینیجر چندے، فیس، جھگڑے، ٹنٹے اور ....

اور آپ جہالت کی طرف دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کرتے والا، پاجامے والا، تہہ بند والا، نیکر والا، پگڑی والا، چھوٹا ہو یا بڑا۔ بوڑھا ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد، سڑکوں پر، چوراہوں پر، گلیوں میں، محلوں میں، چوپالوں پر، دہلیزوں پر جہالت سے بہرہ ور ہو رہا ہے، بنا کسی درسگاہ کے، بغیر کسی نظم و نسق کے، بنا کسی فیس کے۔ اور آپ یہ جان کر شاید حیران ہوں کہ اشاعتِ جہالت کا یہ عالم ہے کہ کینسر کے جراثیم کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

علم جبکہ آج اپنے انتہائی عروج پر ہے۔ علماء و فضلاء کی یہ روشنی جہلا حضرات کے لئے مسرت و شادمانی کا باعث ہے جس کے تحت وہ صرف اور صرف حرف شناسی کو معیار مان کر لوگوں کو ڈگریاں تفویض کر رہے ہیں۔ ایک جاہل کے مطابق یہ شگون نیک ہے اس سے جہالت کو کسی بھی قسم کا گزند پہنچنے کا کوئی احتمال نہیں بلکہ اس سے جہلا کی تعداد میں مزید اضافہ ہی ہوگا۔

مضمون کی مناسبت سے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہم دورِ جاہلیت کے حالات کو اپنے اس مضمون کا حصہ بناتے لیکن عصرِ حاضر کے حادثات و واقعات کے انبار نے ہمیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ ہم اس دور کی تاریخ کے

اوراق الٹتے۔ لیکن ہم ایک جری اور دہشت گرد تاتاری سپہ سالار آغا ئی خان کے "جہالت کی حمایت میں" یہ الفاظ درج کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ملاحظہ کیجئے :

" جاوداں نیلے آسمان کے دیوتا ان عالموں کو تباہ برباد کریں جنہوں نے ہمیں علم کے حصول کی طرف راغب کیا۔ جب تک ہم نے علم حاصل نہیں کیا تھا، اپنے بڑے بڑے مسائل کسی تذبذب کے بغیر حل کر لیا کرتے تھے لیکن جب سے ہم نے لکھ پڑھ لیا ہے ہمارے مزاج میں مآل اندیشی، تذبذب اور شکوک کسی متعدی اور مہلک مرض کی طرح سرایت کر گئے ہیں۔ یہ متمدن لوگ جسے علم کہتے ہیں، ایک قسم کا زہر ہے جو انسان کی نس نس میں اتر کر اس کے اوصافِ مردانہ کو زنگ کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ وہ کاہل، مکار، مصلحت اندیش اور ضرورت سے زیادہ کتابی بن کر رہ جاتا ہے۔

نظریۂ جہالت کے علمبرداروں کا یہ قول بھی صداقت پر مبنی ہے کہ "خواتین خزینۂ جہالت کی سب سے بڑی امین ہیں۔

اس قول کی سچائی پر شاید ہم یقین نہ کرتے لیکن ہمارے ایک دوست کی والدہ نے اسے پایۂ ثبوت تک پہونچا دیا۔ ہمارے دوست کی والدہ اپنے ہونٹوں اور اپنی آنکھوں میں خوشی کے جذبات سمائے ایک دن ہمارے گھر وارد ہوئیں، اور ہماری اہلیہ کے ہاتھوں میں مٹھائی کا ایک چھوٹا سا ڈبہ تھماتے ہوئے بولیں۔

" لے بی بی منھ میٹھا کر لے۔"

" کس خوشی میں اماں ؟ " اہلیہ نے سوال کیا۔

" ارے لاڈو۔ آج میرے پوتے نے پہلی گالی دی ہے۔" بڑی بی گویا جھومتے ہوئے بولیں۔

" اللہ اس کی عمر میں برکت دے۔" اہلیہ نے منھ میں مٹھائی رکھتے ہوئے دعا دی اور جہالت کا نتیجہ مٹھائی کی شکل میں برآمد ہوتے دیکھ کر ہم نے بھی مندرجہ بالا قول کی صداقت پر یقین کر لیا۔

جہالت سے جڑے کثیر لوگوں کی بستی میں ایک چھوٹا سا گھر ہمارا بھی ہے۔ ہمارے پڑوسی الف کے نام لٹھ شاہی مہر چھاپ یعنی انگوٹھا ٹیک لیکن ساٹھ پاور لوموں کے مالک۔ ایک دن بولے۔

"بہت پڑھے لکھے بنتے ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ تین روپے پچیس پیسے میٹر کے حساب سے ستاون تھان کتنے کے ہوئے یہ خیال رکھنا تھان سولہ میٹر کا ہے۔ اس میں آٹھ پاؤ کپڑا کم ہے اور دو فیصد کی کٹوتی بھی ہے۔"

ان کا یہ امتحان سوال سن کر پہلے تو ہمارے دماغ میں سناٹا، اور آنکھوں کے سامنے دھواں چھا گیا لیکن ذرا اوسان بجا ہوئے تو ہم نے جیب سے پین نکالا اور کاغذ کے لئے منے کو آواز دی۔ وہ کاغذ لایا تو ہم پڑوسی سے بولے۔

" ہاں جی ـــ! ستاون تھان، کتنے روپئے میٹر سے ؟" ہم نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولے۔

" میاں ابھی تو تم کاغذ، قلم ہی سنبھال رہے ہو۔ پھر لکھو گے، ضرب دوگے، گھٹاؤ گے، جوڑو گے تب کہیں جاکر جواب دو گے۔ میاں عالم، فاضل صاحب ہم نے حساب لگا بھی لیا۔ ستاون تھان دو ہزار آٹھ سو اٹھانوے روپئے چونتیس پیسے کے ہوے۔"

" مگر ـــــــ !" ہم کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے ہماری بات کاٹ دی۔ بولے۔

" بس اسی اگر مگر میں تو رہ جاتے ہو تم لوگ۔ میں جاہل لیکن دیکھ لو۔ کتنا بڑا کاروبار ہے میرا۔ کتنے نوکر ہیں۔ تم جیسے چار لکھے پڑھے تو میرے منیم ہیں۔"

اب ہم ان کی اس بات کا کیا جواب دیتے۔ چپ رہے، لیکن دل ہی دل میں قائل ہوتے رہے۔

فلسفۂ جہالت کے ایک شدید حامی، جو کہ ہماری ہی گلی کے باشندے ہیں، تعلیم یافتہ لوگوں سے نہایت الرجک ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زیورِ علم سے آراستہ ہوتے ہی آدمی اپنی برادری سے کٹ جاتا ہے۔ یہ حضرت جب کبھی ترنگ میں ہوتے ہیں تو جہالت کے اسرار و رموز ہم پر منکشف کرتے ہیں۔ یہ رموز خیال آفرینی اور نکتہ سنجی کے اعلیٰ نمونے ہوتے ہیں۔ اِن حضرت کے مطابق عالم، فاضل حضرات کو اللہ جل شانہٗ کا دیدار نصیب نہیں ہوگا۔ ہمارے استفسار پر انہوں نے یہ دلیل دی کہ ان لوگوں کو بالا بالا ہی جنّت کا سرٹیفکٹ دے کر جنّت میں داخل کر دیا جائے گا صرف

(باقی صـ۴۳ پر)

احترام اسلام

۴/۵۴ - اترسوئیا - الہ آباد ۳

ایک رُخ سے گلستاں در گلستاں ہے زندگی
دوسرے رُخ سے مگر صحرا نشاں ہے زندگی

حل طلب ہے آج بھی یہ مسئلہ در مسئلہ
کس قدر پوشیدہ ہو کتنی عیاں ہے زندگی

چھا گیا ہے اقتدارِ نامرادی کس قدر
ہر نئے خواب سے دامن کشاں ہے زندگی

ہے کبھی پیچیدگیٔ معنوی کا سلسلہ
اور بجائے خود کبھی شرحِ بیاں ہے زندگی

اب مشینیں فلسفہ ہیں، اب مشینیں اعتقاد
اب یقیناً کارخانوں کا دھواں ہے زندگی

مٹ رہی ہے ایک پوری نسل اس ارمان میں
کاش وہ بھی کہہ سکے جنت نشاں ہے زندگی

حسرت الاکرام کے الفاظ میں لے احترام
"امتحاں ہے، اک مسلسل امتحاں ہے زندگی"

کشفی لکھنوی

شاہی مسجد - راج بھون لکھنؤ

حدودِ وہم و گماں سے گذر گئے کہ نہیں
مسافر اپنے وطن لوٹ کر گئے کہ نہیں

ہوا کے سامنے آنے کا دیکھ لو انجام
ورقِ صحیفۂ گل کے بکھر گئے کہ نہیں

طویل عمر طلب کرنے والے لوگوں کو
طویل عمر ملی پھر بھی مر گئے کہ نہیں

بڑا غرور تھا اپنی بہادری پہ جنہیں
شکستِ دل کی صدا سن کے ڈر گئے کہ نہیں

پیامِ موت ہے نازک مزاج ہونا بھی
یہ پھول بادِ خزاں سے بکھر گئے کہ نہیں

پھر اس نے مجھ کو مرے نام سے پکارا ہے
گذرتے وقت کے لمحے ٹھہر گئے کہ نہیں

ستم نصیبوں کی دلجوئی کے لیے کشفی
لگی تھی آگ جدھر تم ادھر گئے کہ نہیں

پنکج سرحدی

۷۔ اے شاہانہ کالونی بریلی

آتشِ عشق کو اس طرح ہوا دے کوئی
پھر سرِ دار انا الحق کی صدا دے کوئی

بخش کر اپنے تصور کا حسیں عکسِ جمال
دل ہے پتھر اسے آئینہ بنا دے کوئی

تیر کر پار نکلنا تو کوئی بات نہیں
ڈوب کر پار نکلنا بھی سکھا دے کوئی

جستجو میں میں بھٹکتا ہوں ازل سے جس کی
کاش اس جانِ تمنا کا پتہ دے کوئی

نرگس و لالہ و سوسن کی طلب ہے کس کو
خار و خس ہی مرے دامن میں سجا دے کوئی

رقص کرتی ہوئی آئی جو صبا پھول ہنسے
کاش شبنم کو بھی اک بار ہنسا دے کوئی

میری روٹھی ہوئی نیندوں کو منا کر پنکج
اپنی آغوشِ محبت میں سلا دے کوئی

غزلیں

طاہرہ [illegible]
گلشن اقبال [illegible] - ۵
کراچی پاکستان

افسانہ

اندھیرے کا گھاؤ

آدھی رات کی خاموشی پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ سنسان اور تاریک سوئی ہوئی گلیوں اور کوچوں میں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے کتے یوں بھونک رہے تھے جیسے وہ اس خاموشی اور سرد رات کے اندھیرے سے گھبرائے ہوئے اور لحافوں کی گرمی میں تھکن اور میٹھی نیند میں ڈوبے ہوئے گاؤں کے باسیوں کو جگا دینا چاہتے ہوں۔

پسینے کی مانند آسمان کے ماتھے پر ننھے ننھے ستاروں کے قطرے یوں جھلملا رہے ہیں جیسے گاؤں کے معصوم بچے سورج غروب ہونے کے بعد گلیوں میں کھیلتے کودتے اور شور مچاتے ہیں۔

اب سے کچھ دیر پہلے تک یہ ویران گلیاں آباد تھیں کتے بے جان دیواروں کی طرح خاموشی کے ساتھ شور مچاتے بچوں کو دیکھ رہے تھے۔

حجرے میں گاؤں کے سارے مرد آکر بیٹھ گئے تھے۔ اور ان کے درمیان چلم ایک خوبصورت نیجکے (ناچنے والے لڑکے) کی طرح رقص کر رہی تھی۔ چلم کی گڑگڑاہٹ محفل میں زندگی کی حرارت پیدا کر رہی تھی اس کی نے سے دھواں نکل کر ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔

رباب زیدی گل کی آغوش میں پڑا تھا اور جمعہ خان کی پاٹ دار آواز میں گونجتے ہوئے ٹپے کے بول "یا قربان" کی لے سے لے ملا کر ایک ترنگ اور امنگ بن کر مجلس میں شریک لوگوں کے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔

بڑے پہاڑوں کے ہیبت سائے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ایک خوفناک اندھیرے کو جنم دے رہے تھے...... رات کا اندھیرا جوان ہو رہا تھا.... زر محمد کی سرخ گائے باڑے میں جگالی کر کے اب گلے میں بندھی گھنٹی کے ساتھ سو چکی تھی۔ اور گھروں میں مٹی کی دیواروں میں بنے ہوئے طاقوں میں تیل کی بتیوں کے گل راکھ ہو کر بکھر چکے تھے۔ گھروں کی مرغیاں دیواروں کی منڈیروں پر اپنے پروں میں سر چھپائے خود سے بے خبر ہو چکی تھیں اور مٹی کے بنے چولہوں میں انگارے سرد ہو کر کسی مردے کی طرح راکھ کا کفن اوڑھ چکے تھے۔ اب حجرے میں سوئے بوڑھے زماں خان کے جوان خراٹوں کے کوئی آواز نہیں تھی۔ فردوس خاں بھی تھکن کا بوجھ اٹھائے بان کی چارپائی پر سو چکا تھا۔

دن بھر کی تھکی ماندی محنتی زندگی نیند کی سیج پر سوئی ہوئی تھی۔ رات تاریک لبادہ اوڑھے ویران گلیوں میں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے آوارہ کتوں کے ساتھ جاگ رہی تھی۔

جبار خاں نے آنکھیں کھولیں تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ تھوڑی دیر سو چکا ہے "کہیں وہ ......" نامکمل بات اس کے خیال کے ٹیڑھے راستے میں اپنی منزل تک پہنچ سکی وہ عجلت، خاموشی اور احتیاط کے ساتھ اٹھا چپل پہننے کے بجائے ہاتھوں میں اٹھا لیے اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگا اس نے دروازے کے پٹ زنجیر سے آزاد کیے اور آہستگی سے کھولنے لگا۔ لیکن دروازے کے پٹ جنگلی تیتر کی طرح آواز دینے لگے اور بوڑھے گل زماں نے یوں آنکھیں کھولیں جیسے خوفناک خواب سے جاگا ہو پھر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر کسی سائے کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کی کمزور نظر اندھیرے سے ٹکرا کر واپس اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی جب اسے کچھ دکھائی نہ دیا تو سرہانے رکھی نسوار کی ڈبیہ اٹھائی اور ایک چٹکی نکال کر نچلے ہونٹ اور دانتوں کے درمیان رکھ لی پھر دونوں

ہونٹوں کو اس طرح بند کیا جیسے اس نے اپنی بیٹی خارو کے سرکش اور جوان بدن کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہوں۔ جبار خاں دروازے کے کھلے ہوئے پٹ کے ساتھ یوں چپک گیا جیسے اپنے وجود کو تاریکی میں جذب کر دینا چاہتا ہو۔ وہ کافی دیر تک پتھر بنا زماں خاں کے سو جانے کا منتظر رہا۔ اور نیم وا دروازے میں سایہ بن کر ستاروں کی مدھم روشنی کا راستہ بند کئے کھڑا رہا۔

زماں خاں نے لیٹے لیٹے ایک طرف لوار بھرا تھوک اتنے زور سے پھینکا کہ جبار خاں نے گھبرا کر دروازے کے دونوں پٹ مضبوطی سے تھام لیے۔

ایک آواز اور ابھری۔ تھکن سے چور فردوس خاں کروٹ بدل کر خوابوں میں کسی سے جھگڑنے لگا۔ زماں خاں نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دیں۔ مگر نظر اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے لگی۔ اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے لوار بھرے تھوک کے چھینٹے صاف کئے اور اپنی جوان بیٹی خارو کی زہر بھری جوانی سے بے پرواہ ہو کر یخ بستہ اور ٹھنڈی رات میں گرم رضائی میں سر سے پیر تک خود کو ڈھانپ لیا پھر جلد ہی اس کے خراٹے حجرے کے اندھیرے میں سوئے ہوئے سناٹے سے باتیں کرنے لگے۔

خارو آئی ہو گی اور اس سرد اندھیرے سے ڈر کر چلی گئی ہو گی۔ راستہ ٹٹولتے ہوئے اس نے سوچا۔ اور دیواروں کے ساتھ سایہ بن کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جب قبرستان کی طرح سوئے ہوئے گھروں کے بند دروازوں کے سامنے سے گزرتا ہوا بڑے کوچے سے نکل کر کنویں کے پاس پہونچا تو اس نے مدھم روشنی میں اندھیرے کی چادر اوڑھے ایک سائے کو چلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنی نظروں کے چراغ روشن کر کے دل کی دھڑکن اور مسرت پر قابو پانے کی کوشش میں اپنے قدم بڑھائے اور جب وہ جوان بیوہ کی طرح سسکیاں بھرتے ہوئے پیپل کے درخت کے نیچے سے گذرا تو اس نے سوچا۔

"خارو میری منتظر ہے۔ میں کہہ دوں گا کہ حجرے میں تیرا بوڑھا باپ تیری جوانی کے بجائے میری نگرانی کرتا رہا اسلیے دیر ہو گئی" اور پھر زیر لب کہا۔

"جوان بیٹیوں کے بوڑھے باپ کم بخت آرام سے سوتے بھی نہیں"

ابھی اس نے سرگوشی بھرے لہجے میں خارو کو آواز بھی نہیں دی تھی۔ ابھی اس کے سخت سردی سے کانپتے ہوئے ہاتھ خارو کے شعلے جیسے رخساروں کی حدت محسوس بھی نہ کر پائے تھے۔ بیتابی کے ساتھ اٹھتے ہوئے تیز قدموں نے ابھی لمحوں کا فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ سیاہ رات کے پتھر سے اس نے ٹھوکر کھائی اور اس کی پگڑی اندھیرے میں لپٹی ہوئی خاک پر گر پڑی۔

"یوسف تم آ گئے؟"

اس جملے کی آندھی میں اس کے وجود کے درخت سے جذبات کے پتے گرنے لگے۔ گلیوں میں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے کتے بھونکنے لگے۔ اور اس کا وجود ایک تنکے کی طرح اڑ کر ٹھہرے ہوئے بدبودار پانی کی سطح پر تیرنے لگا۔ اس کی عزت و وقار اور عزت کا اونچا قلعہ مسمار ہونے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے ساتھ اس کا باپ "زریں شاہ" چاک گریباں، ننگے سر، گردن جھکائے شرمندہ شرمندہ سا کھڑا ہے۔

اس نے ابھرتی اور ڈوبتی سانسوں کے درمیان سمٹی اور پھیلتی نظروں سے دیکھ لیا کہ پیپل کے درخت سے ذرا فاصلے پر زماں خاں کے بیٹے یوسف کا انتظار کرنے والی اس کی بہن ہے۔ ★

قلمی معاونین سے

گذارش ہے کہ اپنی تخلیقات فل اسکیپ کاغذ کے ایک جانب چوڑا حاشیہ چھوڑ کر صاف صاف تحریر کریں اور تخلیقات کی اصل کاپی ہی ارسال کریں نیز ان کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں :۔

—: ایڈیٹر

غزلیں

عرش صہبائی
ایڈمنسٹریٹو آفیسر دوردرشن کیندر
سری نگر۔

یوں بکھرا ہوں راہ میں بکھرا ہوا
جیسے کوئی پیڑ ہو سوکھا ہوا

اب نہیں ملتا ہے کوئی نقش بھی
آرزو کا شہر اک صحرا ہوا

وہ مروت۔ وہ محبت وہ خلوص
آج ان قدروں کو لیکن کیا ہوا

اس سے مل کر بدگمانی مٹ گئی
وہ بھی تھا حالات میں جکڑا ہوا

ڈھل گیا اک عمر کا گرد و غبار
آج رو لینے سے جی ہلکا ہوا

مجھ میں مل کر منجمد ہو جاؤ گے
میں سمندر ہوں مگر ٹھہرا ہوا

کیا کہوں ٹوٹے ہیں کتنے خواب عرش
زندگی کا راز جب افشا ہوا

آفاق فاخری
جلالپور۔ ضلع فیض آباد یو۔پی

لوگ یہ کیسی سزا دیتے ہیں
مجھ کو جینے کی دعا دیتے ہیں

میں جلاتا ہوں، وفاؤں کے چراغ
آپ دامن کی ہوا دیتے ہیں

نام آتے ہی زباں پر تیرا
لوگ افسانہ بنا دیتے ہیں

ہم تو زہراب کے سائے میں بھی
شہد کی فصل اگا دیتے ہیں

ہم تو پتھر کے جگر کا رشتہ
آئینے سے بھی ملا دیتے ہیں

وہ گذر جائیں جدھر سے آفاق
اس طرف پھول کھلا دیتے ہیں

ایوب اثر
شاہجہاں پور

نبھانا اس کو بھی رسمِ وفا نہیں آتی
پکارنے کی ہمیں بھی ادا نہیں آتی

گھرا ہے ایسے مکانوں کے بیچ گھر میرا
کسی طرف سے بھی تازہ ہوا نہیں آتی

لگائے خود ہی تو آنگن میں کیکٹس تم نے
گلہ یہ کیا مہکتی صبا نہیں آتی

کہاں سے سیکھا ہے دل توڑنے کا فن اے دوست
ہزار چور ہو شیشہ، صدا نہیں آتی

ادھر تو چاند سا خط بھی نہیں ملا اُس کا
کہ جس کی یاد میں یادِ خدا نہیں آتی

اُسی پہ لوٹ کے آتا ہے نامراد یہ دل
وہ جس کے حصّے میں خوئے وفا نہیں آتی

دعا قبول ہو کیا ترکِ دوستی کی اثر
کہ دل کی راہ سے ہو کر دعا نہیں آتی

ڈرامہ

ہردیال واستو اشبنم
حسن گنج باولی۔ عالم نگر روڈ
لکھنؤ۔ ۴

قصر کے رات دن

افراد:

ریٹائرڈ۔ عمریں: ۵۸ سال کے اوپر
علی جعفر: ریٹائرڈ انسپکٹر
مرزا صاحب: " تحصیل دار
چمن لال: " جیلر
کوتوال صاحب: " سپرنٹنڈنٹ پولیس
کمشنر صاحب: " کمشنر

سب ریٹائرڈ افراد کی پوشاکیں جداگانہ ہیں کافی ڈھیلی ڈھالی۔ کچھ مسلے ہوئے اونچے پائنچے والے پینٹ، کوئی پیوند لگے ہوئے کپڑوں میں ملبوس، کوئی ہیٹ بغل میں دبائے ہوئے۔ کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا تو کسی کے ہاتھ میں چھڑی، کسی کی داڑھی بڑھی ہوئی۔ کسی کا چہرہ صاف۔

صبح کا وقت

مندر میں بجتے ہوئے گھنٹوں اور مسجدوں سے بلند ہوتی ہوئی اذان کی آواز۔ درختوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ۔ پارک میں مرزا صاحب کے ہاتھ میں ایک ورق، جیسے وہ پڑھ رہے ہیں اور مزے لے لے کر سر ہلا رہے ہیں۔ سامنے سے ڈنڈا نما چھڑی لیے ہوئے علی جعفر صاحب آتے ہیں اور اسی بنچ پر بیٹھتے ہوئے....

علی جعفر: اجی مرزا صاحب کیا مطالعہ ہو رہا ہے۔

مرزا صاحب: کچھ نہیں ڈپٹی صاحب، اس بنچ پر ایک ورق پڑا تھا
ایسا معلوم ہوتا ہے اس ورق میں کسی مونگ پھلی والے نے کل شام کسی کو مونگ پھلیاں دی ہیں۔ اس میں کسی شاعر کا کلام چھپا ہے۔ کلام کیا ہے ہم آپ جیسے ضعیف العمر لوگوں کا ایک نقشہ ہے۔ وہی پڑھنے میں مشغول تھا۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

علی جعفر: کیا فرمایا ہے مرزا صاحب۔

مرزا صاحب: سنیے ؎

جسم سکڑا، حال بگڑا اور ٹوٹے دانت بھی
روشنی آنکھوں کی کانوں کی سماعت بھی گئی

" اور سنیے ؎

کیا قیامت ہے کہ جب انسان ہوتا ہے ضعیف
بیٹیاں بیٹے بھی ہو جاتے ہیں سب اکثر حریف

علی جعفر: تحصیلدار صاحب! کسی حد تک یہ کیفیت صحیح بھی ہے۔
دیکھیے مجھے بھی ایک شعر اسی موضوع پر یاد آیا ؎

وقتِ پیری دوستوں کی بے رخی کا کیا گلہ
بچ کے چلتے ہیں سبھی گرتی ہوئی دیوار سے

مرزا صاحب: واہ وا۔ کیا تسلی بخش شعر ہے۔

ڈپٹی صاحب: ضعیفی کا عالم کچھ ایسا ہی ہوتا ہے
کسی نے خوب کہا ہے ؎

اپنے بیگانے ہوئے ختم ہوئی رسم و راہ
اس ضعیفی میں کرے کون بھلا ہم سے نباہ

علی جعفر: خوب! حقیقت ہے کہ شاعروں نے بھی بہت کچھ کہہ ڈالا ہے اور مستقبل کی حقیقت بیان کر کے رکھ دی۔

مرزا صاحب: ؎ ہر گناہ سے توبہ کر لی جب جوانی ہو چکی
زاہدو! جنت میں جانا کوئی تم سے سیکھ لے

علی جعفر: مرزا صاحب! بھئی یاد تو آ ہی جاتی ہے۔ وہ جس صورت بھی ہو۔ اکبر صاحب کا کلام ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شباب آخر ہے بزم عیش کی بس یاد آتی ہے
جوانی خواب میں آتی ہے بس شمع سحر ہو کر
نظر کے سامنے ہے شام ناکامی کا سناٹا
جوانی ولولوں کی ڈھل رہی ہے دو پہر ہو کر

آگے کا شعر یوں ہے ؎

ضعیفی زور پر آئی، ہوئے بے دست و پا اکبر
کیا بچوں سے بدتر ہم کو پیری میں جواں ہو کر

چمن لال: (خراماں خراماں ان کے درمیان آ کر ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے) "اچھا! تو آج شعر و شاعری کا بازار گرم ہے، کیا ہی لطف آج ہوتا اگر داروغہ صاحب بھی تشریف فرما ہوتے۔ ماشاء اللہ کیا حافظہ قدرت نے عطا فرمایا ہے۔

مرزا صاحب: آئیے چمن لال جی۔ آج آپ کو تنہا دیکھ کر ان کے بارے میں دریافت کرنے ہی والا تھا۔ خیر آپ کے ہمراہ نہ ہو کر بعد میں تشریف لا رہے ہوں گے۔

چمن لال جی نہیں مرزا صاحب۔ آج وہ شاید نہیں آ سکیں گے۔ میں حسب معمول آج جب ان کی کوٹھی کی طرف گیا تو وہ گیٹ پر ہی مغموم سے کھڑے نظر آئے۔ شاید وہ میرے منتظر تھے میں نے ان کی افسردگی دیکھ کر وجہ دریافت کی تو بولے رات کو جھبرا اچانک بیمار ہوا اور صبح ہوتے ہوتے اس نے دم توڑ دیا۔

علی جعفر: ارے وہی جھبرا جو ان کے ہمراہ روز آیا کرتا تھا واہ وا کیا ہی خوبصورت ہستی تھی۔ داروغہ صاحب کے اشارے پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ کسی نے غریب کو زہر تو نہیں دے دیا۔

چمن لال۔ میں نے بھی یہی شک ظاہر کیا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے دو منٹ بعد فرمایا آپ جائیں۔ آج میں نہ جا سکوں گا۔

مرزا صاحب: ہاں صاحب ؎

دل کو جس دم خوشی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی

علی جعفر: گزریں حیات کے دن کیونکر ہنسی خوشی میں
ہیں مخمصے ہزاروں دو دن کی زندگی میں

چمن لال: ہاں صاحب ؎

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے

علی جعفر: بے چارگی ہے پھر بھی صبر کے جذبے کی قدر کرنی ہوگی ایک غزل کے دو اشعار سنیئے۔ کہا ہے ؎

کل ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کیے
کاروان عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کیے
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں لٹتا رہا ہم ناتواں دیکھا کیے

چمن لال: مگر جناب واقعہ تو یہ ہے کہ اس زندگی کا کیا لطف ہے بقول کسی شاعر کے ؎

لرزتے دست و پا ہیں اور بہت مشکل ہے گویائی
ہے سرتاپا مرصع ضعف سے ساری توانائی

مرزا صاحب: بلا شبہ۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب محسوس ہوتا ہے مگر ضعیفی تو ضعیفی ہے۔ وہ کہاں معاف کرنے کی۔

علی جعفر: لطف کی بات تو ہے کہ یہ انسان کو بھی محسوس ہوتا ہے جب وہ ادوار منزلیں طے کرتا ہوا، عالم ضعیفی میں پہونچتا ہے

اور ہر بات پر توبہ کا سہارا لینے لگتا ہے۔ کسی چیز کی تمنا ہی نہیں رہتی۔

چمن لال: اجی صاحب! پھر بھی عبرت کہاں ہوتی ہے۔

علی جعفر: حقیقت تو یہی ہے اور ہم یہی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

چمن لال: ضعیف العمری کا عالم وہ ہوتا ہے جب توانائی جواب دے جاتی ہے تو بس اپنی ہی فکر رہتی ہے۔

مرزا صاحب: جی ہاں وہ لاچاری کا ایک عالم ہے ہر احساس کے ساتھ مجبوری شاملِ حال ہوتی ہے۔ (تینوں کو محوِ گفتگو دیکھ کر کوتوال صاحب یک کراں کے درمیان آتے ہی گویا ہوتے ہیں)

کوتوال: ۔۔ ؎ کنارے پر لگا دے ڈوبنے والے سفینوں کو

چمن لال: آیئے آیئے تشریف لایئے

مرزا صاحب: آپ کیا آئے گویا بہار آئی۔ آج طبیعت کچھ موزوں معلوم ہوتی ہے۔

علی جعفر: یہی کہنا چاہیے۔ ورنہ تو جناب جب کبھی دولت خانے پر دستک دی، یہی سننے کو ملا کہ مکان پر نہیں ہیں کہیں گئے ہیں۔

چمن لال: میرا خیال ہے دو ہفتے بعد آج آپ تشریف لائے ہیں۔ ہم لوگ آپ کی اس غیر حاضری پر سمجھ بیٹھے تھے کہ آپ اس روز کی چھوٹی سی بات کو لے کر کنارہ کش ہو گئے ہیں۔

کوتوال: صاحبان ؎ حیاتِ عارضی صدقے حیاتِ جاودانی پر
خفا ہونا ہی تو اب زیست کی صورت سمجھتے ہیں
غم و غصہ دکھانا اک دلیلِ ناتوانی ہے
جو ہنس کے چوٹ کھاتی ہے اسے طاقت سمجھتے ہیں

مرزا صاحب: دیکھا آپ نے؟ یہی کچھ اوصاف ہیں جن کی بنا پر ہم لوگ آپ کو یاد کرتے ہیں۔ ارے

انھیں کے دم سے درخشاں ہیں محفلوں کے چراغ
زمانہ صحبتِ اربابِ فن کو ترسے گا
غنیمت جانیے مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

علی جعفر: اسی کو انشا نے یوں فرمایا ہے ؎

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

چمن لال: ہاں صاحب ؎

چلے آتے ہیں یا ل بیٹھتے ہیں وقتِ پیری ہے
فقط کچھ روز ہی رہنا ہے اب نام و نشاں اپنا

کوتوال: ایک شعر یہ بھی سنیے۔ کلام کس کا ہے یہ تو مجھے پتہ نہیں مگر کیا خوب کہا ہے ؎

آن پہنچی سرِ گردابِ فنا کشتیِ عمر
ہر نفس بادِ مخالف کا ہے جھونکا ہم کو

سب ایک آواز میں: اچھا شعر ہے۔ حقیقت بیان کر کے رکھ دی

کوتوال: اور اس شعر کے مفہوم پر غور فرمائیں ؎

اب میں دنیا سے ہو کے بیگانہ
اک تماشہ ہوں یا کہ دیوانہ

مرزا صاحب: ارے میاں۔ سارے جھگڑے ہیں زندگانی تک
ہم اگر ہیں تو بکھیڑے بھی ہیں
غالب نے بھی اس شعر میں خوب کہا ہے ؎
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(اسی اثنا میں کمشنر صاحب آجاتے ہیں)

کمشنر صاحب: یارو! میرا سلام قبول کیجیے۔ آج یہاں آنے کی نیت نہ تھی پھر بھی اس بیت کے سہارے چلا آیا کہ کل شب کو گانٹھوں میں انتہا کا درد تھا۔ محترمہ کو آواز دی، انھوں نے فوراً مالش کا تیل گرم کیا اور گانٹھوں میں اچھی طرح

مالش کی، تب جاکے افاقہ ہوا اور میں اس قابل ہوگیا
کہ یہاں آسکا۔ کیا کروں آئے بغیر رہ بھی نہیں جاتا۔ اخبار
بینی کے بعد اب یہی ایک صحبت باقی رہ گئی ہے۔ جہاں
اچھا وقت گزر جاتا ہے۔

مرزا صاحب: کمشنر صاحب پھر بھی۔

کمشنر صاحب: بھائی مرزا میں نے بارہا کہا ہے کہ آپ مجھے اب اس
طرح نہ خطاب کیا کیجیے۔ سادے طور پر بس چودھری
کہہ کر مخاطب کیجیے وہی کافی ہے۔ اس طرح خطاب
کرنے سے رعونت کی بو آجاتی ہے جس سے اب
کوسوں دور ہوگیا ہوں۔

مرزا صاحب: معافی چاہتا ہوں۔ یہ غلطی عمداً نہیں کرتا۔ خیر عرض یہ
ہے کہ آج یہاں شعر و شاعری کا بازار گرم ہے۔ آپ تاخیر
سے تشریف لائے ورنہ اچھے اچھے شاعروں کا کلام
سننے کو ملتا۔ آپ بھی تو شعر و سخن کے دلدادہ ہیں، خوب
لطف لیتے ـــ حسب حال اشعار سنائے گئے ضعیفی
اور آخرت پر۔

کمشنر صاحب: بہت خوب! مجھے دوسروں کا کلام سننے کا بڑا شوق
ہے۔ ورنہ خود شاعری کبھی نہیں کی۔ کوئی کوئی شعر یاد
رہ جاتا ہے۔ مثلاً ؎

کسی بیکس کے بگڑے حال پر ہنسنا نہیں اچھا
خدا جانے ہماری زندگی کس حال میں گزرے

سب ایک آواز میں۔ واہ جناب۔ خوب۔ واہ

غنچوں کے مسکرانے پہ کہتے ہیں ہنس کے پھول
اپنا کرو خیال ہماری گزر گئی

مرزا صاحب: قطع کلام کی معافی۔ مگر یہ بھی سمجھنے کی چیز ہے کہ
پھول کی اہمیت ہی کیا ہوتی ہے۔ ایک شعر یاد آیا ـــ
عرض ہے ؎

کل کلی کھل کے ہوگئی تھی پھول
پھول کمہلا کے آج خاک ہوا

ایک آواز: واقعی کسی چیز کا وجود ہی کیا ہے

کمشنر صاحب: لکھنؤ میں کمپنی باغ کے قریب ایک کوٹھی میں ایک
فقیر شری سرکار سوامی رہا کرتے تھے۔ ع
تھی فقیری میں امیروں کی طرح جائے نشست
صبح و شام لوگ وحدانیت پر ان کا بیان سننے جایا کرتے
تھے۔ وہ فقیر کیا تھے۔ زبردست عالم تھے۔ اردو، ہندی
فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی پر اچھی خاصی دسترس
رکھتے تھے۔ شعر و شاعری سے بھی شوق تھا۔ ان کے کچھ
اشعار سنیے ؎

گردش دنیائے دوں کا ہے نرالا بندوبست
حوصلے اس سے جوان و پیر کے رہتے ہیں پست
شاہ ہو یا ہو گدا ہو اہلِ زر یا بے نوا
موت کی ہے وہ زبردستی کہ سب ہیں زیردست

چمن لال: (آہ بھر کر) آخری منزل ہر جاندار کی وہی ہے۔

مرزا صاحب: جسم خاکی روح کا از بسکہ زنداں خانہ ہے
مائلِ پرواز میرا طائرِ دیوانہ ہے

کمشنر صاحب: یہ لیجیے کسی شاعرہ کا بھی ایک شعر سنیے ؎

ہائے حالات وائے مجبوری!
آنکھ بھیگی ہے مسکراتی ہوں

علی جعفر: خوب خوب! اب استقلال کو برقرار رکھتے ہوئے کسی
نے خوب کہا ہے ؎

درد ہیں دل میں سیکڑوں لیکن
آنکھ پُرنم کبھی نہیں ہوتی

کمشنر صاحب: یہ ہمارے احساسات پر منحصر کرتا ہے۔ غالب کا بھی
ایک شعر یوں ہے ؎

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

مرزا صاحب: مگر صاحب بموجب اس شعر کے ؎

لاشے کو مرے رکھنا ذرا دیکھ بھال کر
لپٹی ہوئی کفن سے کوئی آرزو نہ ہو

کوتوال: واہ واہ! کفن پر ایک شعر مجھے یاد آیا ؎

سلائے گی ہمیں خاک وطن آغوش میں اپنی
نہ ہمدم کی ہوس ہم کو نہ محتاج کفن ہم ہیں

علی جعفر: اچھا صاحبان! اب تو دھوپ اچھی خاصی پھیل گئی اور ناقابلِ برداشت بھی ہو رہی ہے۔ چنانچہ آج کی نشست برخاست کی جائے۔

مرزا صاحب: میں سمجھتا ہوں جناب داروغہ صاحب کے گھر ہوتے ہوئے چلیں۔

(سب داروغہ صاحب کے گھر جانے کے لیے ایک سمت کو روانہ ہوتے ہیں)۔

(ڈراپ)

دوسرا سین

افراد		عمریں ۵۸ سال کے اوپر
۱۔ علی جعفر	———	ریٹائرڈ انسپکٹر
۲۔ چمن لال	———	ریٹائرڈ جیلر
۳۔ مرزا صاحب	———	ریٹائرڈ تحصیلدار
۴۔ کمشنر صاحب	———	ریٹائرڈ کمشنر
۵۔ داروغہ صاحب	———	ریٹائرڈ داروغہ

[سب ریٹائرڈ افراد کی پوشاکیں جداگانہ، کچھ کے کپڑے بہت ڈھیلے ڈھالے۔ کسی کی پینٹ اونچی، کسی کا کوٹ پیوند لگا ہوا۔ کسی کے ہاتھوں میں ڈنڈا، کوئی چھڑی لیے ہوئے۔ کسی کی داڑھی کم کسی کی زیادہ۔ چپلوں اور جوتوں کی حالت بھی یہی۔ کوئی پرانی پوشاک میں جو اب اس قدر ڈھیلی ہو گئی ہے کہ ٹنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی ہیٹ بھی لگائے ہوئے ہے۔

صبح کا وقت، چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کاؤں کاؤں کی آوازیں دور سے آتی ہوئی اذان اور مندر کے گھنٹوں کی آواز]

(ایک پارک کے بینچ پر علی جعفر صاحب بیٹھے ہیں)

علی جعفر: اِدھر جناب جیلر صاحب! اِدھر

چمن لال: (نزدیک آکر) انسپکٹر صاحب۔ بہت خوب۔ آج آپ یہاں تشریف فرما ہیں، فوارے کا نظارہ لے رہے ہیں۔ میں جب پارک میں داخل ہوا اور حسب معمول اپنے لوگوں کی جائے نشست یعنی ان بنچوں پر نظر کی اور کوئی بھی نظر نہ آیا، تو میں سمجھا کہ پارک میں میں ہی پہلا آنے والا شخص ہوں اور آج مرزا صاحب سے بازی لے گیا۔

علی جعفر: جی جیلر صاحب۔ آج پہلے آنے والے شخص نہ آپ ہیں نہ مرزا صاحب، آج بندہ نے بازی ماری۔ اپنے صاحب یہ تو ایک صحبت باقی رہ گئی ہے جس کے لیے علی الصبح ہی گھڑی کی سوئی پر نظر جاتی ہے بلکہ کہنا چاہیے آخرِ شب پو پھٹنے کا منتظر رہتا ہوں۔

چمن لال: ذرا اُدھر نظر کریں سبزہ زار پر دوڑ لگانے والے وہ دو افراد غالباً ہم سے بھی پہلے آئے ہیں۔ شاید بورڈنگ کے اسٹوڈنٹس ہیں۔ ہاں اور وہ لیجیے اس گیٹ سے جناب کمشنر صاحب داخل ہو کر تشریف لا رہے ہیں۔ شاید انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔

علی جعفر: (آہ بھر کر) اپنا بھی ایک زمانہ تھا۔ جب بلاناغہ علی الصبح چھ سات میل کا دوڑتے ہوئے چکر لگا کر طلوع آفتاب سے پہلے ہی آکر مکان پر دم لیتا تھا۔ اور اب یہ عالم ہے کہ یہاں تک آگئے تو گویا بہت آگئے۔ بڑھاپے کی کمزوری نے آدبوچا اور بقول کسی شاعر کے کبھی ہم تھے ناز و ادا والے ؎

دُنیا کی محفلوں سے تنگ آگیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

چمن لال: واہ جناب! دل بجھنے کی بھی کیا بات کہی۔ بس عمر کا تقاضہ کہیے۔

علی جعفر: جب صحت جواب دے جائے، جسمانی کمزوریاں آگھیریں تو دل بیچارہ کیا کرے، وہ بھی مُردہ ہو جاتا ہے ؎

جوانی خواب کی سی بات ہے دنیائے فانی میں
مگر یہ بات کس کو یاد رہتی ہے جوانی میں

کمشنر صاحب، صاحبان تسلیمات! آج آپ لوگ وہاں سے یہاں بقول جگر جناب ؎

جلوے مری نظر میں تو کون و مکاں کے ہیں
چھپ کر وہ مجھ سے جائینگے ایسے کہاں کے ہیں

چمن لال، ابی صاحب یہ جعفر صاحب ہی سے کہیئے جن کا مقولہ بموجب اس شعر کے ہے ؎

ایک مرکز پہ نہیں آج کی دنیا کا نظام
اپنے ہر خواب کے سانچے کو بدلتے رہیئے

کمشنر صاحب: (ہنس کر) بہت خوب! بہت خوب!

چمن لال، آج مرزا صاحب تشریف نہیں لائے۔ کل مجھ سے فرما رہے تھے کہ اب دونوں گھٹنوں میں درد رہنے لگا ہے اور چلنے پھرنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

علی جعفر، اس عالم ضعیفی میں اب ہونا بھی کیا ہے۔ آپ کو ضعف معدہ کی شکایت، خان صاحب کو دمہ کی شکایت قاضی صاحب کی بینائی کمزور، حاجی صاحب کو دردِ سر کی شکایت۔ کسی کو لو بلڈ پریشر، کسی کو ہائی۔

کمشنر صاحب، بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ مجھے ہی دیکھئے ؎

حالانکہ چھن گئی مری آنکھوں کی روشنی
دُنیا سمجھ رہی ہے ابھی دیدہ ور مجھے

چمن لال، آیئے آیئے مرزا صاحب! پہلے یہ فرمائیں کہ آپ کے گھٹنوں کا درد کیسا ہے۔ ویسے ظاہر ہے کہ آپ اس جماعت میں ایسے شخص ہیں جو ہمیشہ سب سے پیشتر یہاں آجاتے ہیں۔ تاخیر کی وجہ صرف آپ کا درد ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب: درد اپنی جگہ بدستور ہے۔ ہاں کم و بیش ہوتا رہتا ہے مگر اس تاخیر کی وجہ میرا درد نہیں۔ آپ لوگ شاید واقف ہی نہیں۔ ارے صاحب کل سر شام ہی سے میرے علاقہ میں کرفیو لگ گیا تھا۔ خدا غارت کرے ان لفنگوں کو جو وقتاً فوقتاً ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں کہ عوام کی زندگی دوزخ ہو جاتی ہے۔ وہ تو کہیے فوری انتظام پولیس کی طرف سے ہو گیا اور بات بڑھو نہیں پائی۔

کمشنر صاحب: ارے ہاں سننے میں آیا تھا۔ پھر آپ کیسے تشریف لے آئے۔ کیا کرفیو صرف شب بھر کے لیے تھا۔

مرزا صاحب: ارے صاحب کچھ نہ پوچھیے۔ تمام شب بیداری میں گزری۔ صبح کو معلوم ہوا کہ ہمارے محلہ کا مغربی علاقہ کرفیو سے محفوظ ہے۔ جب اطمینان کر لیا، تب مکان کی پشت کی جانب سے نکل کر گھنٹہ گھر کی طرف سے وسیع سڑک کو کراس کر کے سرائے کے اندر سے ہوتا ہوا یہاں آسکا ہوں۔ کیا کہا جائے۔ یہ ملاقات اور نشست مانند ایک نشہ کے ہے یا یوں تصور فرمایئے کہ گویا ایک ٹانک ہے۔

(سب ایک ساتھ ہنس پڑتے ہیں)

چمن لال: بلاشبہ یہاں آنے اور ملنے جلنے سے تھوڑا اچھا وقت گزر جاتا ہے۔ فرصت اور بے فکری کے ان لمحات میں ضعیفی کی زندگی بھی خوش گوار معلوم ہوتی ہے۔ ویسے مکان پر یا ہماری طرف کم از کم کوئی ایسا عدیم الفرصت نہیں جو ہمارے ساتھ وقت گزارے۔

علی جعفر، اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ ہر فرد بشر بچہ ہو یا بوڑھا۔ شہری ہو یا دیہاتی کنٹرول اور کرفیو آرڈر کے نام سے واقف ہے۔ پہلے یہ سب کوئی جانتا ہی نہیں تھا کم سے کم اپنے ملک کے لوگوں کے لیے تو میں کہہ ہی سکتا ہوں۔

مرزا صاحب، یہی نہیں لوگ ایک دوسرے سے کتنے خلوص سے ملتے تھے۔ خواہ وہ کسی مذہب اور ملت کے ہوں تعصب کا نام ہی نہیں جانتے تھے۔ لوگوں میں انسانیت تھی

سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا فرض
اولین سمجھتے تھے۔ مگر ہائے وہ زمانہ کتنی جلد رخصت
ہوگیا۔

چمن لال: اجی مرزا صاحب۔ اب انسان ہی بدل گیا ہے۔ خود
پرستی اور خود غرضی کے جذبات اس میں اس طرح سرایت
کر گئے ہیں کہ اب اسے اشرف المخلوقات کہنے کا جواز
نظر نہیں آتا۔

علی جعفر: ہاں صاحب ؎

کیا زمانہ ہے کہ یاروں میں مروت نہ رہی
رہ گیا رشک مگر دل سے محبت نہ رہی
جو دھرم پہ بیتی دیکھ چکے ایماں پہ جو گزری دیکھ چکے
اس رام رحیم کی دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے

کمشنر صاحب: آپ لوگ باور کریں نہ کریں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میرا وطیرہ
ہر جگہ یہی رہا ہے کہ ؎

نہ تو ہندو کبھی دیکھا نہ مسلماں دیکھا
میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا

اکثر منصبی فرائض کے سلسلے میں مجھے مختلف وارداتوں کے
جائے وقوع پر جانے کا اتفاق ہوا ہے اور میں یقینی
طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ایسے واقعات کے پس پشت مدعا
کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

مرزا صاحب: اس میں کیا شک ہے آپ کی معلومات اس سلسلے
میں یقیناً قابل اعتبار ہوں گی۔

کمشنر صاحب: مدعا ہوتا ہے لوٹ مار کرنا یا دشمنی کا بدلہ لینا۔

چمن لال: یہ دنگے لوٹ کھسوٹ کے لیے ہوتے ہیں اور ان
میں بے گناہ مارے جاتے ہیں، کتنے ہی بچے یتیم
ہوجاتے ہیں کتنی عورتیں بیوہ ہوجاتی ہیں۔

مرزا صاحب: میرا تو عقیدہ ہے کہ پروردگار عالم ایسے افراد کو
کبھی معاف نہیں کرے گا جو ایسی حرکتیں کرتے ہیں

چمن لال: بالکل صحیح کہا آپ نے، گناہوں کی سزا ضرور ملے گی۔

کمشنر صاحب: سزا دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان
کے دل و دماغ کو صحیح راستے پر لایا جائے۔

علی جعفر: آپ لوگوں کو اس کا علم تو ہے ہی کہ گزشتہ دنگے میں
چوراہے پر کی عالیشان پیلی کوٹھی کو اسی پاگل پن نے نذر آتش
کر دیا تھا اور اس کی خاک سیاہ دیواریں اس خونچکاں
نظارے کی آج بھی یاد دلا رہی ہیں۔

چمن لال: اور وہ سب کچھ ہوا، لوٹ کھسوٹ کے بعد اول اول تو
دوکانوں پر حملے ہوئے، پھر لوگ کوٹھی کی طرف لپکے۔ یہ واقعات
میرے چشم دید ہیں۔ ہائے ہائے کیا عجیب منظر تھا ___
دیوانے جانوروں کی طرح بے تحاشہ دوڑ رہے تھے
عورتوں، بچوں کی وہ چیخ و پکار آج بھی کانوں میں گونج رہی
ہے۔ خدا کی پناہ!

کمشنر صاحب: وہ نقشہ کم و بیش میری نظر میں بھی ہے۔ ذمہ دار
سرکاری عہدے پر مامور ہونے کی وجہ سے جب میں
پولیس کی ایک بڑی جماعت لے کر بلوائیوں کی سرکوبی
کے لیے موقع پر گیا ہوں، تو کیا عرض کروں۔ خدا ہی بہتر
جانتا ہے۔ میری جو حالت تھی، خاص کر ان لوگوں کو دیکھ کر
جو تڑپ رہے تھے بے بسی کے عالم میں آگ کے
شعلوں میں۔

علی جعفر: کوٹھی کے بالائی حصے سے آگ کے شعلے آسمان
چھو رہے تھے اور جگہ جگہ سڑک پر اور دکانوں پر لاشیں
پڑی ہوئی تھیں، ایسا میں نے سنا ہے۔

مرزا صاحب: آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ کوٹھی کے مکینوں میں
سے صرف ایک فرد محفوظ رہ گیا کسی طرح اور وہ آج افلاس
کی زندگی گزار رہا ہے۔
لیکن داروغہ صاحب۔ آج آپ بالکل دم بخود ہیں، گویا
ہمارے درمیان ہیں ہی نہیں۔ آخر معلوم تو ہو کن خیالوں
میں گم ہیں۔؟

داروغہ صاحب: ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

علی جعفر: چلیے خیر زبان مبارک کھولی تو۔ مگر طویل خاموشی کا راز پھر بھی راز ہی رہا۔

داروغہ صاحب: کیا عرض کروں ؎

میں بھی اس گلشن کا ہوں اک پھول مرجھایا ہوا
وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
اب وقتِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

کمشنر صاحب: گویا کہ صرف آپ ہی کی ہستی ہے جس نے دنیا دیکھی ہے، بقیہ یہاں جو اور سفید ریش ہیں وہ دوسری دنیا کے بسنے والے ہیں۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے وہ کہیئے تو مناسب ہے یعنی کہ ؎

ہمیشہ سے دنیا کا یہ حال ہے
عجائب طلسموں کا جنجال ہے

داروغہ صاحب: اسی پیرائے میں سمجھ لیجیے،

چمن لال: ؎ عدم سے آئے دنیا میں عدم کو پھر چلے اُلٹے
ہزاروں منزلیں طے کیں نہ یاں ٹھہرے نہ واں ٹھہرے

کمشنر صاحب: جناب میں تو یہ جانتا ہوں کہ ؎

مسافر ہیں بشر سارے جہاں میں
وہیں جائیں گے سب آئے جہاں سے

چمن لال: اجل کی نیند آجاتی ہے آخر سننے والوں کو
قیامت کا اثر پاتا ہوں دُنیا کی کہانی میں

داروغہ صاحب: جناب دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے الگ رہنا میرا شعار رہا ہے۔

علی جعفر: اچھا صاحب۔ لیجیے اچھی خاصی دھوپ پھیل گئی۔ چلیے انشاءاللہ کل پھر لیں گے۔

مرزا صاحب: ہاں ہاں چلیے۔ اس طرح بہرحال ہم لوگوں کا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔

چمن لال: (جاتے ہوئے) ؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے **

علم لغات اور بذلہ گوئی (بقیہ صفحہ ۲۰ کا)

(۱۸) "عروسک" یا "کرمِ مخمل"۔ موسم برسات شروع ہوتے ہی زمین میں سے چھوٹے چھوٹے سرخ مخمل کے ٹکڑوں کے مانند جانور نکلتے ہیں جو اپنے شوخ رنگ کی وجہ سے نہایت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ہندی میں ان جانوروں کو "بیر بہوٹی" کہتے ہیں ان کا شوخ سرخ رنگ اور مخمل جیسا رواں دیکھ کر ہر ذی شعور خوش مزاج ان کو عروسک یا کرم مخمل۔ بیر بہوٹی یقیناً کہے گا۔ ان کے نام کی یہی وجہ تسمیہ ہے۔ جو بالکل بجا ہے۔

جہالت کی حمایت میں: (صـ۳۲ کا بقیہ)

گناہ گار ہی اللہ کے سامنے پیش ہوں گے اور اس کے دیدار کا شرف حاصل کریں گے۔

ایک دن ان حضرت کے دماغ میں نہ جانے کیا سودا سمایا کہ دنیا کی زبوں حالی کا رونا رونے لگے، بڑھتے ہوئے جرائم اور کرپشن پر اظہارِ تشویش کرنے لگے۔ بولے۔

"اجی ہم نے پڑھے لکھے لوگوں سے سنا ہے۔ "ہر کمال را زوال"۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی چیز اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے شروع کیا جی بس زوال ہی ہو جاتا ہے۔ دنیا میں لڑائی جھگڑے فساد، چوریاں رشوت بازی، زناکاری بڑھتی جا رہی ہے لیکن یہ عالم، فاضل لوگ نیکی اور سچائی کی تحریک دیتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو اللہ کے خوف اور قیامت کو ڈراتے رہتے ہیں، ہر سال دو چار آدمیوں کو نیک بنا دیتے ہیں۔ اجی میں پوچھتا ہوں یہ لوگ اگر یہ کام نہ کریں تو چوری، ڈکیتی، رشوت اور اسی قبیل کی تمام برائیاں اپنے کمال کو پہنچ جائیں گی، اور پھر ایک دم ہوگا انکا زوال۔ تب جلے گا کوسوں کوسوں چراغ اور پھر اس کے بعد شروع ہوگا نیکی اور سچائی کا دور۔

پروین کیف

شانوں پہ بکھر جائیں زلفیں تو گھٹا لکھنا
آنچل کوئی لہرا کر میرا تو صبا لکھنا
ہے یاد مجھے اب تک اجلی سی ہتھیلی پر
مہندی کی لکیروں سے بس نام ترا لکھنا
دن بیت گئے کتنے خط کوئی نہیں آیا
سرزد ہوئی ایسی بھی کیا ہم سے خطا لکھنا
کہہ سکتی ہے چہرے کی بدلی ہوئی رنگت بھی
افسانہ محبت کا بے حرف و صدا لکھنا
محرومئ قسمت بھی اک مرگِ مسلسل ہے
مرنے کی تمنا ہے جینے کی دعا لکھنا
یہ شہر ہی تھا اپنا پروین سکوں پرور
کیوں اس میں حوادث کا طوفان اٹھا لکھنا

اشعر علیگ

پھر سنور سکتی ہے اپنی زندگانی دیکھنا
اک نئے انداز سے قدریں پرانی دیکھنا
آج کل تو آسماں بھی میرے اوپر تنگ ہے
دوستوں کی بھی ذرا اب مہربانی دیکھنا
اس جہاں میں جو بھی آیا ہے فنا ہو جائیگا
بس یہی جلوے گا غیر فانی دیکھنا
زلف شانوں پر بکھیرے وہ چمن میں آگئے
ہو گئے چہرے گلوں کے زعفرانی دیکھنا
وقت کٹ جاتا ہے اشعر اب تو اس انداز سے
رات دن ہر چیز میں اس کی نشانی دیکھنا

جاوید برقی

دریا سے جب تک نہ ملے اک قطرہ قطرا ہے
جب دریا سے مل جائے پھر قطرہ دریا ہے

ہر دروازہ کہہ دیتا ہے آگے بڑھ جاؤ
کون یہ سوچے مانگنے والا کتنا بھوکا ہے

شہزادو آنکھیں کھولو اور ہوش میں آ جاؤ
اب سورج شب کی آنکھوں میں ڈوبنے والا ہے

جانے کون سا بدلہ لینے اب کے یہ دریا
ایسے وقت میں آیا جب صحرا پر پہرا ہے

گاؤں تو سارا سیلابوں میں ڈوب چکا جاوید
لیکن گاؤں میں رہنے والا اب بھی پیاسا ہے

سنجے مسرا شوق

غزل

حال کھلتا نہیں تجھ پر میرا
میرا دشمن ہے مقدر میرا
کیوں کہیں پیاس بجھانے جاؤں
میری آنکھیں ہیں سمندر میرا
بن ہی پایا نہ بگڑ ہی پایا
جانے کیا ہے مقدر میرا
بے وفائی وفا سے اچھی ہے
چرچا ہوتا تو ہے گھر گھر میرا
نوکری چھوڑ دی جب سے میں نے
مجھ سے بیزار ہے گھر بھر میرا
کام بن بن کے بگڑ جاتے ہیں
مجھ سے آگے ہے مقدر میرا
محفلِ شعر و سخن میں اے شوق
ذکر ہوتا ہے برابر میرا

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب "فیضانِ مصطفےٰ"

شاعر: محمد عثمان عارف نقشبندی   قیمت: چالیس روپے

ناشر: بیدل اکیڈمی - عارف منزل - بیکانیر - راجستھان

جناب عارف نقشبندی کا پہلا مجموعۂ نعت و منقبت "عقیدت کے پھول" ۱۹۸۱ء میں طبع ہو کر ارباب ذوق و صاحبان دل سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب موصوف کا دوسرا مجموعہ نعت و منقبت بعنوان "فیضانِ مصطفےٰ" ان کے جذبہ و وجدان کا آئینہ دار بن کر ہمارے مذاق سلیم کو دعوت سرمستی سرشاری دے رہا ہے۔ آنحضور صلعم کی ہمہ گیر شخصیت اور رحمۃ للعالمین کا فیضان زمان و مکان تک پھیلا ہوا ہے۔ صحابہ کرام اور بزرگانِ دین آپ کے ہی فیضِ بابرکت سے منور ہوئے۔ اور اس طرح دنیا میں رشد و ہدایت کا سلسلہ چلا۔ اس لیے نعت و منقبت کے اس خوبصورت اور دیدہ زیب گلدستہ کو "فیضان مصطفےٰ" کا عنوان دینا ذوقِ کامل کی دلیل ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں حمد اللہ کے لیے ہے۔ نعت سرورِ کائنات کے لیے اور منقبت اکابرینِ ملت کے لیے ہے۔ ان سب کی حدود اور دائرے ہیں۔ جن کا پاس ازبس لازمی ہے۔ سارے ضابطوں کو نظر میں رکھنا نیز ساری نزاکتوں کا لحاظ کرنا شاعر کا فرضِ اولیں ہے۔ یہ وہ سفر نہیں کہ آنکھ بند کیے بڑھتے چلے جاؤ۔ یہاں ہر قدم پر شعور و فکر کو بیدار رکھنے کی ضرورت ہے۔ تب کہیں منزل کے نشانات نظر آتے ہیں ورنہ گمراہی و تاریکی شاعر کا مقدر بن جاتی ہے۔ نعت کا معاملہ کہیں زیادہ مشکل ہے۔ عربی و فارسی اور اردو میں نعت مستقل صنفِ ادب کی حیثیت رکھتی ہے۔ نعت کی مقبولیت کا بڑا انحصار جذبۂ انکسار میں چھپا ہوا ہے۔ نعت گوئی کی سعادت توفیق کی بات ہے۔ بڑے سے بڑا شاعر نعت کہتے وقت لرزاں نظر آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب اللہ کو اونچی آواز میں بات کرنا بھی نبی کریم صلعم کے حضور ناپسند ہے اور اس صورت حال پر وحی آجاتی ہے۔ سرکار کی تعریف میں کچھ کہنا کتنا دشوار تر ہے یعنی ذرا بے خیالی میں ادھر سے ادھر ہوئے اور کام سے گئے۔

"فیضانِ مصطفےٰ" کا شاعر حساس و درد مند دل رکھتا ہے۔ مجموعہ کا پیش لفظ و دیباچہ خود شاعر نے لکھا ہے جو اس کی خود شناسی کا مظہر ہے۔ انتہائی عجز و انکسار سے وہ اپنی بے بضاعتی و بے چارگی کا حمد و نعت کی بلندیوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اقرار کرتا ہے کہ جہاں اوصاف سرنگوں اور عظمتیں سربسجود ہوں وہاں کچھ عرض کرنا اپنی نجات کا باعث اور نشاطِ روح و طمانیت قلب کا سبب تو ضرور بن سکتا ہے ورنہ ممدوح کی ذاتِ والاصفات کے سامنے سب ہیچ ہے۔ وہ جب حمد سے آغازِ سخن کرتا ہے تو کہتا ہے ؎

تری امداد سے مشکل ہر اک آسان کی میں نے
ترے فضل و کرم سے ہی بنائی زندگی میں نے
وہی اوّل وہی آخر، وہی ظاہر وہی باطن
ہر اک پہلو ہر اک صورت سے دنیا دیکھ لی میں نے

یا پھر ؎

دل سے جب کہا جائے لا الٰہ الا اللہ
ہر طرف نظر آئے لا الٰہ الا اللہ

اسلام میں لا الٰہ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہ کی منزل ہے یہ دونوں جز مل کر زندگی کا ایک ایسا دستور بن جاتے ہیں جو ابدی حقیقت کی طرح دو جہاں کو اپنی گرفت میں لیے ہے اسی لیے شاعر کہتا ہے ؎

لاکھوں سلام مرحبا صلِّ علیٰ محمدؐ
مظہر ذاتِ کبریا صلِّ علیٰ محمدؐ

کام ہے ان کا صبح وشام پڑھتے ہیں آپ پر درود
حوریں، فرشتے، انبیاء، صلِّ علیٰ محمدؐ

خداوند قدوس نے اپنے فضل وکرم سے جن کو دیارِ مقدس کی ضیا باریوں سے مشرف کیا ہے ان کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ عارف صاحب بھی ان خوش بختوں میں شامل ہیں۔ جب وہ وہاں کے مناظر کو اپنے شعروں میں ڈھالنے کی سعی کرتے ہیں تو مرقع نگاری چمک اٹھتی ہے اور ایک عجیب کیفیت پڑھنے والوں پر طاری ہوجاتی ہے۔ جیسے ؎

طوفانِ رنگ ونور ہجومِ جمال میں
گم ہوگیا ہے ذوقِ نظارا کہیں جسے

شانِ جلال ہے کہیں شانِ جمال ہے
کعبہ کہیں جسے کہ مدینا کہیں جسے

خدا کا پیمبرؐ کا گھر دیکھ آئے
مقاماتِ روح و نظر دیکھ آئے

وہ سلمانؓ مولا کا باغِ بہشتی
وہ ذو معجزے کے شجر دیکھ آئے

وہ محراب منبر مصلّٰے نبیؐ کا
جھکاکر جہاں اپنا سر دیکھ آئے

اس مجموعہ میں اس طرح کے اشعار بکثرت ہیں جو شاعر کے سوزوگداز قلبی کی ترجمانی کرتے ہیں اور انتہائی مؤثر ہیں۔ عارف صاحب پرتکلف اندازِ بیان سے عموماً گریز کرتے ہیں اور اپنی خاندانی روایات کا پوری طرح احترام کرتے ہیں جو داغ سے بالواسطہ وراثت میں ان تک پہنچی ہیں یعنی ژولیدہ بیانی سے احتراز، سادگی و پرکاری پرزور فارسی تراکیب سے دوری نیز شعریت و روزمرہ کا خیال۔

"فیضانِ مصطفےٰ" کا انتساب والدین کے نام ہے۔ ان کے والد بیدلؔ بیکانیری خود ایک قادرالکلام وبلندپایہ شاعر تھے۔ مذہبی رجحان کی تربیت میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس لیے انتساب حق بحق دار رسید کے مصداق ہے۔ اب چند شعر نمونے کے طور پر تحریر کررہا ہوں اور یہ آرزو رکھتا ہوں کہ عقیدت کے یہ پھول مقبولِ بارگاہ ختم المرسلین ہوکر سدا بہار ہوجائیں۔

نمونۂ کلام:

سامنے گنبدِ خضرا کے درود اور سلام
پڑھنے والے تری بخشش کا پتا دیتا ہے
کس کی قدرت کا کرشمہ ہے حرم میں ظاہر
کون انوار سے ماحول سجا دیتا ہے

چلو ہم بھی اسی داتا کے گھر پر مانگنے جائیں
جہاں دامن کو پھیلائے ہوئے خلقِ خدا آئے
عنایت کی نظر اٹھے جدھر بھی کشتِ ویراں پر
وہیں ابرِ کرم برسے وہیں گھر کر گھٹا آئے

عارف نہ پوچھو روضۂ انور کی روشنی
تسکینِ روح و ذوقِ تماشا کہیں جسے

اس روئے زمیں پر طیبہ کے کوئی بھی نہیں سرکار بڑی
دنیا کے شہنشہ بن کے گدا دامانِ طلب پھیلاتے ہیں

یہ شرف ذاتِ گرامی کے سوا ملتا نہیں
انبیاءؑ ملتے ہیں ختم الانبیاءؐ ملتا نہیں

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیٹھے بیٹھے خلوت میں
جھڑی لگتی ہے اشکوں کی مدینا یاد آتا ہے

——— دیاب رشیدی

نام کتاب:- "چاندنی کے پھول"

شاعر: مومن خاں شوق قیمت : سولہ روپئے

ملنے کا پتہ : اشرف ولا، ۱۱-۳-۲۳۳، روبرو جامع مسجد ملے پلی، حیدرآباد ۱

مومن خاں شوق نئے اسلوب کے فن کار ہیں۔ لیکن انھوں نے دنیائے شعروادب میں بدلتے موسم کا اثر اسی حد تک قبول کیا ہے جتنا ادب کے لیے صحت افزا ہے۔ ان کے یہاں عصری رجحانات کے ساتھ مثبت شعری روایات اور ماضی کی صحت مند اقدار کا احترام بھی ملتا ہے ——— وہ انسان کے دکھ، درد، اخلاقی قدروں کی شکست وریخت، روحانیت کے زوال، معاشی بحران اور موجودہ تہذیب پر نوحہ گر ہیں لیکن مایوس نہیں ہیں بلکہ حوصلہ کی آنکھ سے حادثات وواقعات کا جائزہ لیتے ہیں۔

ان کا لہجہ غم ناک ہے لیکن شائستگی اور رچاؤ سے بھرا ہوا ہے ان کی نظمیں 'صحرا میں دیا'، 'آج کے نام' 'زندگی کے نام'، 'صبح کی منزل کی جانب'، 'تنہائی'، 'سراب آشنا'، 'زندگی کوئی کروٹ تو لے' اور 'پھر کیا کریں' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہ ہندی گیت سے بھی متاثر نظر آتے ہیں جس کے ثبوت میں 'برہ کی اگنی'۔ 'نئی برکھا'، 'برہ کی ماری' وغیرہ منظومات پیش کی جاسکتی ہیں۔

یہاں ان کی تین نظمیں مثالاً پیش کی جارہی ہیں:-

زندگی کے نام

لہو لہو حکایتیں
یہ رنجشیں یہ نفرتیں
دلوں سے دل کے فاصلے
غم والم کے سلسلے
شکایتوں کے مرحلے
جو ختم ہوں تو زندگی
مہک چلے، بہک چلے

صبح کی منزل کی جانب

سمیٹو زندگی ایسے
تبسم کی کرن بجھنے نہ پائے
چلو چلتے رہو حسنِ عمل کی رہ گزر پر
صبح کی جانب چلو۔

زندگی کوئی کروٹ تو لے

زندگی، آج کی غم زدہ زندگی
جیسے تپتا ہوا اک صحرا لگے
آرزوؤں کی کرچیں نظر تا نظر
رہ گزر دھند میں جیسے لپٹی ہوئی

شوق نے عصر حاضر کے مسائل پر سوالیہ نشان لگائے ہیں، اور سوچنے کی تحریک دی ہے۔ مجموعی طور پر یہ شعری مجموعہ نور و نکہت کا دلآویز گلدستہ ہے۔ کتابت اور طباعت بھی قابلِ تحسین ہے۔

——— ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ نیا دور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں۔

(۱) مقام اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ :	شری راجیو اروڑا، ہندستانی، یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لاٹوش روڈ لکھنؤ
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ :	شری اشوک پریہ درشی۔ ہندستانی، ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ اتر پردیش۔ لکھنؤ
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ :	شری امیر احمد صدیقی۔ ہندستانی۔ ایڈیٹر۔ نیا دور، محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش۔ لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایہ کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔	نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا

میں اشوک پریہ درشی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

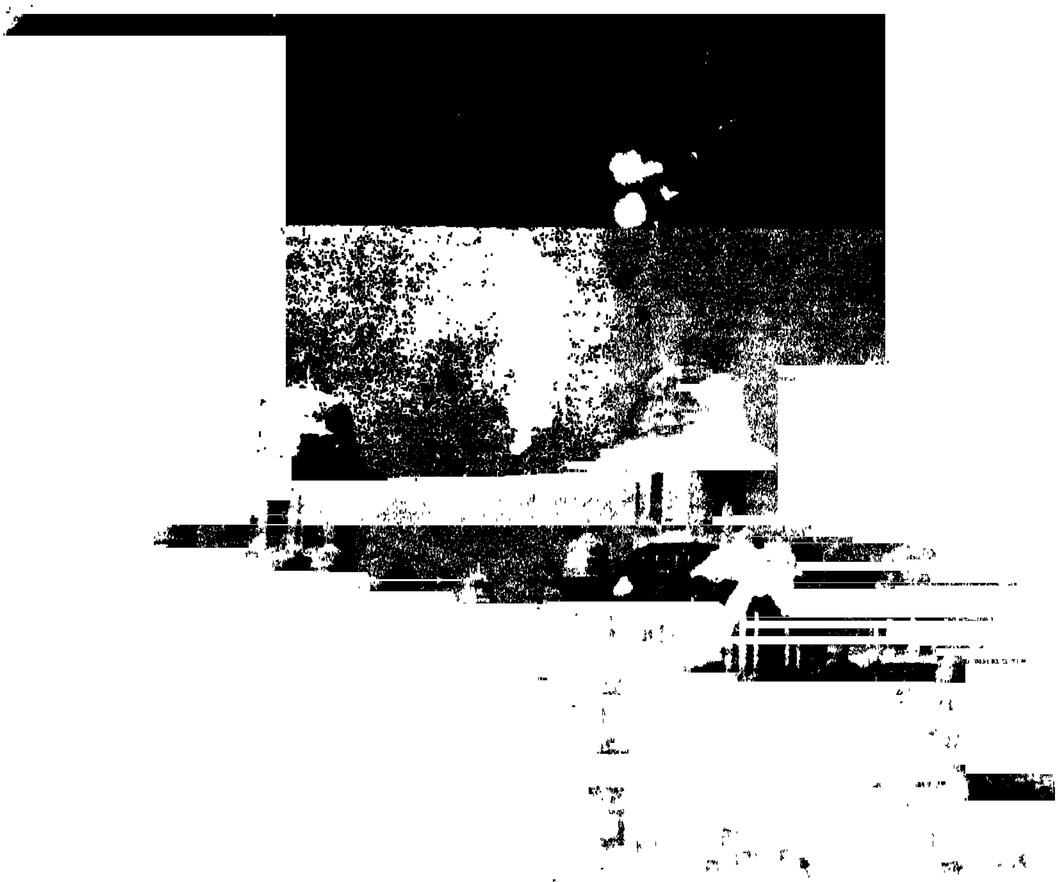
(دستخط) اشوک پریہ درشی (پبلشر)

Vol. 42 No. 12
MARCH 1988
Re. 1.00

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW-226001

Annual Sub
Rs. 10.00



لکھنؤ کا چارباغ ریلوے اسٹیشن